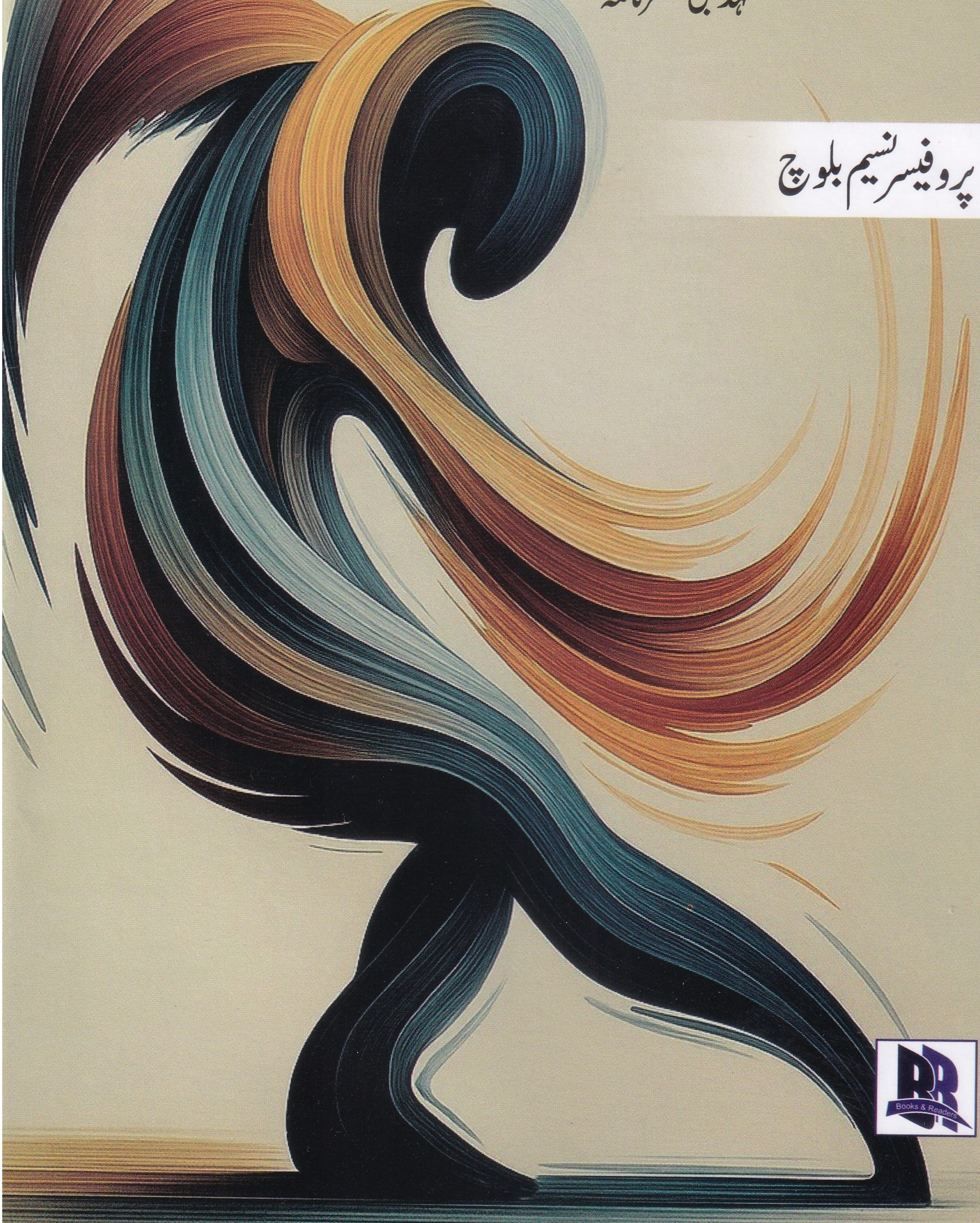
ستلج کی ریت سے لپٹی یادیں

رحیم یار خان، بہاول پور، ساہیوال، لاہور میں گزرے ستر سال کا

تہذیبی منظرنامہ

پروفیسر نسیم بلوچ



ستلج کی ریت سے لپٹی یادیں

رحیم یار خاں، بہاولپور، ساہیوال، لاہور میں گزرے ستر سال کا

تہذیبی منظر نامہ

پروفیسر نسیم بلوچ

بکس اینڈ ریڈرز ملتان

اشاعت: 2025ء

عبدالجبار نے
بھٹو پرنٹنگ پریس لاہور
سے چھپوا کر بکس اینڈ ریڈرز ملتان
سے شائع کی۔

قیمت: 1390/- روپے

ISBN: 978-969-7563-88-3

انتساب

گذشتہ صدی کی ساٹھ کی دہائی کے دوسرے سال کے دوران، جب میں نے گورنمنٹ ہائی اسکول ساہیوال میں چھٹی جماعت میں داخلے کا امتحان کامیابی سے پاس کیا تو میرے والد نے فرطِ مسرت سے میرے ماتھے پر ایک بوسہ ثبت کیا تھا۔ آج بھی اس بوسے کی حرارت میرے وجود میں مہک رہی ہے۔ میں اس بوسے کو اپنی تعلیمی کامیابی کا پہلا استعارہ سمجھتا ہوں اور اپنی زندگی کی تمام یادیں اسی محبت بھرے لمحے اور مقدس لمس کے نام منسوب کرتا ہوں۔

ستلج کی ریت سے لپٹی یادیں

ریت پر جب چلتے چلتے پلٹ کر دیکھا
تو یادوں کی دھندقدموں کے پیچھے پیچھے آتی تھی
ستلج کے کنارے کہیں‌ایک پرانی شام کا سایہ
ابھی تک وہیں رکا تھا
جہاں لفظوں نے پہلی بارکسی خواب کا ہاتھ تھاما تھا
بہاولپور کی گلیوں میں،ساہیوال کی ہوا میں
اور لاہور کی پرانی چھتوں پر
وقت نے مجھے خاموشی سے آواز دی تھی
وہ جو لمحے تھے جو پل تھے
جو دھوپ میں جھلسے خیال تھے
آج سب ایک کتاب کے صفحے بن گئے ہیں۔
یہ یادیں نہیں ...ریت پر لکھی اک صدی کا خواب ہیں۔
جنہیں میں نے باندھ لیا ہے
"ستلج کی ریت سے لپٹی یادیں " میں۔

فہرست

پہلی بات

دراصل یہ گمنامی سے گمنامی تک کے دائرے کے بیچ ایک دیہاتی بچے کی زندگی کا قصہ ہے۔ 1950 کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں پیدا ہونے والا یہ بچہ عمر کے لحاظ سے اب ستر کی دہلیز پار کر کے ستر کے کلب میں شامل ہے۔ بائیس سال کی دیہی خوشبو اور پچاس سال کی شہری زندگی کی گرد، دونوں اس کی ذات میں سانس لیتی ہیں۔قدرت کے لکھے ہوئے ان دیکھے سکرپٹ کے مطابق جوانی کی ساڑھے تین دہائیاں گزارنے کے بعد جب یہ بچہ بزرگی میں جنوبی پنجاب کے شہر بہاول پور سے اپنے شہر اور گاؤں کو بائی پاس کرتا ہوا لاہور آبسا تو اس کے شہر اور گاؤں کے خوابوں نے اسے چین نہ لینے دیا۔خواب جو گزرے لمحوں کو، گاؤں کی پگڈنڈیوں کو اور اپنے شہر اور بچپن کی خوشبو کو مسلسل آواز دیتے تھے۔اس سے پہلے کہ یہ خواب کسی نفسیاتی عارضے کی صورت اختیار کرتے ، اس کے اندر سے ایک مہربان صدا آئی، " لکھو، اظہار کرو، کیتھارسس کرو، اپنی کہانی بیان کرو تب جا کر آسودگی پاؤ گے۔"اس نے روائتی قلم کاغذ کی بجائے لیپ ٹاپ کے کی بورڈ پر اپنی انگلیوں کو اپنے ذہن کی ہارڈ ڈسک سے ہم آہنگ کیا۔اس دوران بڑھاپے کی خفی اور جلی بیماریاں بھی چلتی رہیں اور ذہن کی ہارڈ ڈسک میں موجود یادوں کی فائلوں کی گرد بھی صاف ہوتی رہی جس کا نتیجہ اس کتاب میں موجود سطور کی صورت میں سامنے آیا۔یہ دیہات سے شہر کی طرف مسافت کا بیان بھی ہے۔میں بیچ سے الگ ہوتا ہوں اور آپ 1950 کی دہائی کے گم نام دیہاتی بچے اور آج کے گم نام ''بزرگ'' کی کہانی کو اپنی آنکھوں اور دل سے ملاحظہ کر لیجئے۔

نسیم بلوچ

یکم مئی 2025

وضاحت:

یہ تمام تحریریں گذشتہ تین برسوں کے دوران مختلف اوقات میں وجود میں آئیں اس لیے
ان میں بعض باتوں کی تکرار مل سکتی ہے۔

رحیم یار خان کی گلی سے گزر کر آیا تھا میں

رحیم یار خان کی گلی سے گزر کر آیا تھا میں

(قیام 15 سال)

مجھے قطعی طور پر معلوم نہیں تھا کہ رحیم یار خان کہاں واقع تھا۔ بس اتنا ہی معلوم تھا کہ مرکزی ریلوے لائن (ML-1) پر پنجاب کا آخری ضلع ہے اور ریلوے لائن شہر کو چھو کر گزرتی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس میں رہائش کے دوران ایک دن نہر کی واحد پختہ سڑک کے فٹ پاتھ کی اطراف پر سیاہ اور زرد رنگ کی لائنوں کا پینٹ کیا جا رہا تھا تو کسی نے بتایا کہ ابوظہبی کے حکمران النہیان کا محل رائیونڈ روڈ پر واقع ہے اور چوں کہ وہ عنقریب آنے والے ہیں اور اپنے محل کو اسی راستے سے جائیں گے اس لیے تزئین و آرائش کا کام ہو رہا ہے جو ہمارے ہاں ایسے مواقع پر اکثر ہوتا ہے۔ یہ بھی پتا چلا کہ اسی ''بادشاہ'' کا ایک محل اور شکارگاہ رحیم یار خان میں بھی ہے اور وہ ہر سال شکار کی خاطر وہاں قیام کرتا ہے۔ اس بادشاہ کے نام سے وابستہ چند ایک دلچسپ حکایات پاکستان میں عام تھیں اس لیے اس کا نام سنا ہوا تھا۔ یوں اس شہر کا ایک مبہم سا تصور ذہن میں تھا۔ 13 فروری 1979 کو جاری ہونے والے تقرر نامے میں کالج کا نام" گورنمنٹ بابا فرید کالج" لکھا ہوا تھا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ رحیم یار خان جانے کے لیے صرف ریلوے ٹرین ہی دستیاب ہے۔ ہماری تہذیبی اور معاشرتی روایات میں ریلوے کے سفر کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ بہت سے رسائل میں ایسی کہانیاں اکثر مل جاتی تھیں جو مبینہ طور پر ریلوے کے سفر کے دوران وجود میں آئیں۔ ریلوے کے سفر سے ایک طرح کا رومانس وابستہ تھا۔ ریل کی سیٹی اور لوگوں کو جدا کرنے اور ملانے کا ایک مضبوط تصور ان کہانیوں سے ہی قائم ہوا بلکہ ریلوے وصال اور جدائی کا استعارہ تھی۔

گورنمنٹ کالج ساہیوال کے کلاس فیلو اور دوست میاں اشتیاق احمد نے مجھے رحیم یار خان میں اپنے ایک دوست اور ضلعی بار کے اپنے وقت کے معروف وکیل خلیفہ عبدالرحمان قریشی کے چھوٹے بھائی خلیفہ عبدالمنان قریشی (وہ اب خود بھی وکیل ہیں) کے نام ایک خط دیا جو میرے مجوزہ میزبان تھے۔ پاکستان جیولرز سے نئے اور پرانے صادق بازار چوک تک کی دکانیں ان کی ملکیت تھیں اور ان دکانوں کے پیچھے ان کی رہائش

تھی۔ 20 فروری 1979 کی صبح دس بجے اباسین ایکسپریس پر ساہیوال سے سوار ہوا اور ملتان یا شیر شاہ تک کا تو علم تھا مگر اگلے راستے کے شہروں اور ریلوے سٹیشنوں سے آشنائی تھی نہ ان کے ناموں کا علم۔ لودھراں اور بہاول پور کی لوکیشن کا علم پہلی بار ہوا۔ سمہ سٹہ کے بعد احمد پور شرقیہ بتایا گیا تھا مگر "ڈیرہ نواب صاحب" کا سٹیشن آیا تو یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ جس شہر میں یہ ریلوے سٹیشن تھا وہ تھا تو احمد پور شرقیہ مگر سٹیشن کا نام مختلف ہے البتہ ڈیرہ نواب صاحب اس شہر سے کچھ فاصلے پر کنٹونمنٹ میں واقع ہے جہاں نواب کا محل ''صادق گڑھ پیلس'' اور گورنمنٹ صادق عباس (بوائز) کالج واقع ہیں۔ اس سے آگے لیاقت پور آیا جس کے نام سے میں پہلے واقف تھا کیونکہ یہ نام میں اپنے دادا بہادر خاں بلوچ سے سن چکا تھا جو ایک دوبار یہاں کسی تحصیلدار کو ملنے آ چکے تھے۔ انہوں نے راستے میں کوئی دریا بھی عبور کیا تھا جس کی وسعت اور ہیبت کی باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ خان پور کٹورا کا نام پہلی دفعہ سنا تھا۔ صبح دس بجے کا سفر نو گھنٹوں کے بعد شام سات بجے اس وقت اختتام کو پہنچا جب اباسین ایکسپریس رحیم یار خان پہنچی۔ میری زندگی کا ریلوے کا یہ پہلا طویل ترین سفر تھا۔ اس سے پہلے زیادہ تر ساہیوال سے ملتان اور لاہور کے سفر کر چکا تھا جو زیادہ سے زیادہ اڑھائی گھنٹوں کے ہوتے تھے۔ یہ یقیناً ایک طویل اور تھکا دینے والا سفر تھا مگر جوانی کے اس دور میں جب ہاتھ میں نوکری کا پروانہ بھی تھا، یہ سفر یادگار، تفریح اور ایڈونچر سے بھرپور محسوس ہوا۔ زندگی کے اس دور میں تھکاوٹ سے بھلا کہاں واقف تھے۔ رحیم یار خان کی سرزمین پر میں نے جو پہلا قدم 20 فروری 1979 کو شام سات بجکر چھ منٹ پر رکھا تو وہ 5706 دنوں پر پھیل گیا جنہیں مجموعی طور پر 16 سال تصور کرنا چاہیے۔ میرے پاس سامان تو صرف ایک بیگ پر مشتمل تھا مگر راہنمائی کے لیے میں نے ایک قلی کی خدمات حاصل کیں جس نے مجھے ریلوے روڈ سے پاکستان جیولرز کے عقب میں میزبان کے گھر پہنچا دیا۔ خلیفہ عبدالمنان قریشی نے گھر سے ملحق ایک مہمان خانہ بنا رکھا تھا۔ ان سے متعارف ہو کر انہیں ان کے ماضی کے دوست کا خط دیا۔ اس وقت وہ اپنے دو دوستوں کے ساتھ ٹیپ ریکارڈر پر عطااللہ عیسیٰ خیلوی کے سرائیکی گیت سن رہے تھے۔ ان کے یہ دو دوست محمد اکرم گجر اور خالد سندھو تھے جنہوں نے عیسیٰ خیلوی کے بارے میں جو تاثرات پیش کیے وہ مجھے آج تک یاد ہیں۔ "ریڈیو یا ٹی وی کی بجائے آڈیو کیسٹس کے ذریعے بتدریج مقبول ہونے والے اس گلوکار کی آواز میں کچھ ایسی بات ضرور ہے جو سننے والے کو اپنی جانب راغب کرتی ہے۔ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ مستقبل میں بہت زیادہ سنا جانے والا اور مقبول ترین سرائیکی لوک گلوکار ہوگا۔" اس کے بعد وہ رخصت ہو گئے۔ میزبان کے ہاں کھانا کھایا اور صادق بازار کا چکر لگایا۔ اس وقت صادق بازار کے آخر میں بائیں جانب فائن گارمنٹس والے کونے پر پھلوں کی ایک دکان تھی جہاں سے کنوں کھانا مجھے آج تک یاد ہے۔

اگلے دن صبح کو میرے میزبان نے مجھے اپنے سائیکل کے ذریعے شاہی روڈ براستہ ہسپتال روڈ جو اس وقت ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہسپتال کی عمارت کے دائیں طرف سے سیدھی پائلٹ سکول اور کالج کو جاتی تھی،

کے راستے کالج پہنچایا اور سائیکل میرے حوالے کر دی۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ کالج کا اصل نام "بابا فرید" کی بجائے "خواجہ فرید" سے منسوب تھا جس کی خبر لاہور میں بیٹھے ہوئے کلرک کو نہیں تھی جس نے میرے تقررنامے پر بابا فرید کالج ٹائپ کر دیا تھا۔ جس دن میں نے جوائن کرنا تھا پرنسپل سید اشرف علی شاہ موجود نہیں تھے۔ اس دن کے انچارج پرنسپل فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر عبدالعزیز جاوید تھے جنہوں نے میری جوائننگ پر بڑی خوشی سے دستخط کیے اور یہ تاثر بھی دیا کہ جیسے وہ میری آمد کے منتظر تھے۔ لیجیے جناب میں 21 فروری 1979 کو صبح دس بجے کے لگ بھگ باقاعدہ لیکچرار بن کر گورنمنٹ کی ملازمت میں آ چکا تھا۔ اسوقت کالج کے ہیڈ کلرک چودھری محمد اقبال تھے اور کے بی نسیم اسسٹنٹ تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ (شاید) ملک بھر کے تعلیمی ادارے خصوصاً یونیورسٹیاں اور کالج بند تھے۔ ملک کی سیاسی فضا میں خاصا تناؤ تھا۔ سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو سزائے موت سنائی جا چکی تھی، سپریم کورٹ ان کی اپیل ایک ووٹ کی اکثریت مسترد کر چکا تھا اور قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں کہ اس سزا پر کسی وقت بھی عمل درآمد ہو سکتا تھا۔ پیپلز پارٹی اور خود مسٹر بھٹو اس مغالطے کا شکار تھے کہ جنرل ضیاالحق کبھی سزائے موت پر عمل درآمد نہیں کر سکتا تاہم کسی ممکنہ احتجاج سے بچنے کے لیے جزوی طور پر تعلیمی سرگرمیاں معطل تھیں۔ غیر مقامی اساتذہ تو بہر حال گھروں کو چلے گئے تھے البتہ مقامی اساتذہ تھوڑی دیر کے لیے کالج آ جاتے اور گپ شپ لگا کر چلے جاتے۔ جس دن میں نے جوائن کیا اس دن پروفیسر عبدالعزیز جاوید مجھے ساتھ لے کر کالج کے سامنے واقع پائلٹ سیکنڈری سکول چلے گئے جہاں سکول کی طرف سے کوئی تقریب تھی اور انہوں نے پرنسپل کی نمائندگی کرنا تھی۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں نے سائیکل لیا اور جس راہ سے میرا میزبان مجھے لے کر آیا تھا اسی راہ سے واپس جانے کی کوشش کی مگر ہسپتال کے بعد دائیں کی بجائے بائیں جانب مڑ گیا اور ایک چھوٹی سی نہر کی پل سے سکول بازار داخل ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس پل کا نام "انھے والا پل" تھا جہاں کسی دور میں بینائی سے محروم اندھے لوگ بھیک مانگا کرتے تھے۔ بہر حال میں اصل راستے سے بھٹک چکا تھا اور خاصی کوشش کے بعد میزبان کا گھر تلاش کر پایا۔ میزبان کا مہمان خانہ تو کھلا ملا مگر وہ خود موجود نہیں تھے۔ شام کو ہلکی پھلکی بارش ہونے لگی تو میں پرانے صادق بازار سے جدید بازار اور پھر ڈاکخانہ بازار ہو لیا۔ بائیں جانب ایک ''جالندھر سویٹس'' کے نام سے مٹھائی کی ایک دکان نظر آئی۔ وہاں سے گاجر کا حلوہ کھایا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میرے دوست ظفر علی سیال نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے ماموں جھنگ کے رہائشی محمد فیض سیال جن دنوں خواجہ فرید گورنمنٹ کالج میں فزکس کے استاد تعینات تھے تو وہ ان کے ساتھ رہتے تھے اور یہیں پر کچھ عرصے کے لیے زیر تعلیم رہے اور جھنگ کی زبان سے اشتراک کی وجہ سے بڑی روانی سے سرائیکی جو اس وقت ریاستی کہلاتی تھی، بول سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں تعمیر ملت بوائز ہائی سکول کالونی المعروف بستی امانت علی کے سکول ہی میں قیام پذیر ہیڈ ماسٹر سلطان محمود کو ضرور ملوں جن کا تعلق شورکوٹ کے قریب انہیں کے گاؤں ''خاکی لکھی'' سے تھا۔ میں راستہ دریافت کرتا ہوا لکڑ منڈی سے مبارک

ہوٹل کا موڑ مڑ کر ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ بہت سادہ، نرم گفتار اور کم گو شخص تھے۔ یہ پہلی ملاقات آئندہ کی ملاقاتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ جس راستے سے میں گیا تھا اس کو یاد رکھا اور وراسی راستے سے واپس آ گیا۔ میں پہلے دن جو ایک دفعہ راستہ بھولا تھا تو اس سے کئی اور راستے اور بازار بھی دیکھ لیے، اگلے دن سائیکل پر کالج پہنچا تو راستہ نہیں بھولا بلکہ کالج کی طرف جانے والے ایک دو دیگر راستوں کا بھی علم ہو گیا۔ تعلیمی سرگرمیوں کے تعطل کے باعث موجود اساتذہ پرنسپل آفس اور کالج بلڈنگ کے صدر دروازے کے سامنے والے بڑے چبوترے پر ایک دائرے میں فروری کی تیز اور چمکتی دھوپ میں حسب معمول خوش گپیوں میں مصروف رہتے۔ یہ کالج بطور گورنمنٹ انٹر کالج 1954 میں میونسپل کمیٹی کی عمارت کے تین کمروں میں قائم ہوا تھا، 1955 کے بعد اس کی موجودہ عمارت تعمیر ہوئی اور 1962 میں اس کالج کو ڈگری بنا دیا گیا، خواجہ فرید یہاں کی معروف علمی، روحانی اور ثقافتی شخصیت ہیں۔ خان پور بوجہ جائے تولد خواجہ صاحب (چاچڑاں شریف)، ڈیرہ غازی خاں کالج بحوالہ مٹھن کوٹ (جائے مزار خواجہ صاحب) اور رحیم یار خان بوجہ ضلعی ہیڈ کوارٹر، خواجہ صاحب کے نام سے منسوب کرنے کے لیے ان تین کالجز میں مقابلہ تھا۔ 1973 میں قرعہ فال رحیم یار خان کے نام نکلا اور تب سے اس کالج کا نام خواجہ فرید گورنمنٹ کالج ہے (جواب کالجز کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی کے باعث خواجہ فرید گورنمنٹ گریجوایٹ کالج کہلاتا ہے۔)۔ اس کالج کا کل رقبہ تقریباً 150 ایکڑ ہے۔ اس میں جناح اور فیڈرل کے نام سے دو ہوسٹل تھے۔ 80 یونٹس کا جناح ہوسٹل تو کالج بلڈنگ کی تعمیر کے بہت بعد 1963 میں مکمل کیا گیا، بعد میں اس میں توسیع کی گئی۔ یہ انٹر میڈیٹ کے طلبا کے لیے مختص تھا۔ بھٹو دور میں ملک بھر کے تعلیمی اداروں میں 1976 میں نیشنل سٹوڈنٹس کنسٹرکشن پروگرام کے تحت وفاقی وزارت تعلیم کے زیر نگرانی کالجوں مین رہائشی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے ایک ہی طرز کے متعدد فیڈرل ہوسٹلوں کی تعمیر کی منظوری دی گئی۔ صوبہ پنجاب کے حصے میں کل اکتیس ہوسٹل آئے اور ان میں سے چھ ہوسٹل بہاول پور ڈویژن میں تعمیر کیے گئے۔ 48 یونٹس کا یہ ہوسٹل مرکزی حکومت نے صوبائی محکمہ تعمیرات کے کنٹرول میں دے دیا۔ ایک اطلاع یہ ہے کہ یہ ہوسٹل لیبیا کی حکومت کی طرف سے پاکستان کو بطور تحفہ دیے گئے۔ اسی طرح انقلاب اسلامی ایران سے کچھ عرصہ قبل شہنشاہ ایران نے استعمال شدہ دائیں ہاتھ کے سٹیئرنگ کی حامل ائرکنڈیشنڈ بسوں کا ایک فلیٹ تعلیمی اداروں کو عطیہ دیا جن میں سے خواجہ فرید کالج کو بھی ایک بس ملی تھی۔ فیڈرل ہوسٹل ڈگری کے سٹوڈنٹس کے لیے مخصوص تھا جس میں دو ڈارمیٹریز میں نئے آنے والے تقریباً آٹھ اساتذہ رہتے تھے۔ سیاسیات کے استاد تصدق حسین چودھری فیڈرل ہوسٹل کے نگران تھے۔ ان کا تعلق ساہیوال سے تھا۔ ہوسٹل کی عمارت کی پچھلی جانب کیوبیکل نما بہت تین چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جن میں سے دائیں کمرے میں کیمسٹری کے ناصر محمود اعوان رہتے تھے جب کہ بائیں طرف والا کمرہ بہاول پور کے ایک لیکچرر اسسٹنٹ مسٹر عقیل ہاشمی کے پاس تھا جن کے ساتھ ان کے ساٹھ سالہ کنوارے ماموں بھی رہتے تھے اور صدیقی کہلاتے تھے

البتہ درمیان والا کمرہ خالی پڑا تھا جس پر میں نے قبضہ جما کے اپنا تالا لگا لیا۔اس کمرے میں ایک چار پائی، ایک ٹیبل اور ایک کرسی کل سامان تھا مگر کسی قسم کی الماری نہیں تھی۔اس کام کے بعد میں واپس اپنے میزبان کے پاس آ گیا جنہوں نے چوک بہادر پور میں کوکا کولا کی ایجنسی لے رکھی تھی۔ وہ موٹر سائیکل پر مجھے اپنی ایجنسی دکھانے لے گئے۔ غلہ منڈی کے برابر میں نے چند پرانی طرز کی بسیں دیکھیں جو غالباً ختم ہوتا ہوا جنرل بس سٹینڈ تھا۔موجودہ بلجیم چوک کے سامنے ریلوے پھاٹک تھا جہاں سے گزر کر دائیں جانب لیور گھی ملز اور اس کے ساتھ واقع نہر کا پل گزرنے کے بعد لیور کی رہائشی کالونی تھی۔اس کے بعد چوک پٹھانستان اور خاصا آگے دائیں جانب لغاری بیوریجز نام کی کوکا کولا فیکٹری تھی جس کے بعد چوک بہادر پور آ گیا۔خان پور بائی پاس کا نام ونشاں نہیں تھا۔ لیور والا انڈر پاس زیرِتعمیر تھا جس کے باعث کاشن پر ہر ٹرین چند ثانیے کے رکتی تھی لہٰذا لوگ بغیر سٹاپ والی گاڑی پر بھی سفر کر لیتے اور یہاں جلدی میں اتر جاتے۔ لیور کی دائیں جانب عباسیہ ٹیکسٹائل ملز پورے جوبن پر تھی جس کے تولیے، بستر کی چادریں، تکیوں کے غلاف اور کچھ دیگر اشیا بہترین کوالٹی کی تھیں۔ لیور کی نہر کے کنارے عباسیہ ٹیکسٹائل والوں کے پرتعیش اور بہترین بنگلے اور رہائش گاہیں تھیں۔ فی الحال میں اتنا رحیم یارخان ہی دیکھ پایا۔اس سے اگلے دن میزبان کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کالج ہوسٹل والے کمرے میں شفٹ ہو گیا۔ چند ایک باہر کے اساتذہ جو فیملی کے ساتھ رہتے تھے وہ اس لیے نہیں گئے کہ کالج کسی دن بھی کھل سکتے تھے۔ان میں سے ایک اکنامکس کے استاد جناب محمد بوٹا تھے۔انہوں نے مجھے بتایا کہ " آپ کی تقرری کے احکام کالج میں موصول ہو چکے تھے کہ ایک دن محمد شریف چودھری فارسی کی پوسٹ کے لیے محکمہ تعلیم کا جاری کردہ ایڈہاک تقررنامہ لے کر جوائن کرنے آئے تو اتفاق سے میں پرنسپل آفس میں موجود تھا۔ میں نے پرنسپل صاحب کو مشورہ دیا کہ '' پہلے کمیشن کے منتخب استاد کا انتظار کر لیں اگر وہ مقررہ مدت میں جوائن نہ کریں تو تو پھر ایڈہاک والے کو جوائن کرا لیں۔" اگر وہ صاحب جوائن کر لیتے تو مجھے واپس جا کر اپنے آرڈرز پر نظرِثانی کرانا پڑتی مگر اوپر بیٹھے ہوئے مطلق اعلیٰ سکرپٹ رائیٹر نے میرے لیے رحیم یارخان لکھ دیا تھا۔ میں نے ایک دن کے بعد فیصلہ کیا کہ چوں کہ ہنگامی تعطیلات چل رہی تھیں اور یہاں کوئی کام تھا نہ واقفیت لہٰذا میں 24 فروری کو واپس لاہور چلا گیا جہاں پر ہوسٹل کا کمرہ ابھی میرے پاس ہی تھا۔اپنا کچھ سامان اٹھایا اور کمرہ ایک دوست شاہد زیدی کے حوالے کیا۔ کمرے میں ابھی میرا ایک کارٹن کتابوں کا تھا سوچا اگلی بار لے جاؤں گا مگر وہ اگلی بار کبھی نہ آ سکی کیونکہ نہ شاہد زیدی مل سکا اور نہ کتابوں کا بنڈل۔ چند روز بعد میں ساہیوال اپنے گاؤں چلا آیا۔

ان دنوں ماحول میں ایک طرح کا کھچاؤ اور سنسنی تھی۔ لاہور ہائیکورٹ 18 مارچ 1978 کو ذوالفقار علی بھٹو کو قتل میں اعانت جرم پر سزائے موت سنا چکا تھا۔6 فروری 1979 کو سپریم کورٹ نے بھی مسٹر بھٹو کی اپیل مسترد کر دی تھی۔سرکاری ریڈیو اور ٹیلی ویژن حکومت کے کنٹرول میں تھے۔اخبارات پر ایڈوانس

سینسر شپ عائد تھی۔صرف بیرونی ریڈیو بالخصوص بی بی سی پر ہی لوگوں کا زیادہ انحصار تھا۔24 مارچ 1979 کو چیف مارشل لا ایڈ منسٹریٹر اور مبینہ صدر نے چند بیرونی ممالک اور مقامی وکلا کی طرف سے رحم کی اپیل مسترد کر دی۔ان دنوں یہ بات جنرل ضیاالحق سے منسوب کی جاتی تھی کہ "انسان دو ہیں اور قبر ایک، ہم دونوں میں سے ایک آدمی ہی قبر میں جا سکتا ہے اور وہ ہے مسٹر بھٹو۔'' آخر کار 4 اپریل 1979 کی صبح پونے دو بجے بھٹو کو پھانسی دے دی گئی اور اگلے تین گھنٹے کے اندر 15 لوگوں کی جنازے میں شرکت کے بعد ایک چھوٹے جہاز پر لائی گئی میت سپرد خاک کر دی گئی-اس کے بعد اس خبر کو حکومتی ذرائع ابلاغ سے یک سطری خبر کے طور پر نشر کیا گیا جب کہ بی بی سی سمیت بیرونی اطلاعاتی ذرائع نے یہ خبر تفصیل اور وضاحت سے پیش کی۔حکومتی اقدامات کے باوجود احتجاج کا آغاز ہوا جو سندھ میں زیادہ تھا مگر پنجاب میں ردعمل کم و بیش کنٹرول میں رہا۔ایم آر ڈی کی احتجاجی تحریک تو بہت بعد میں چلی۔اس واقعے کے صرف دو ہفتے کے بعد پنجاب کی حد تک تعلیمی ادارے کھولنے کا اعلان کر دیا۔

غالباً 25 اپریل کو میں ایک دفعہ پھر ساہیوال کے ریلوے سٹیشن سے صبح دس بجے اباسین ایکسپریس پر سوار ہوا اور شام سات بجے رحیم یار خان پہنچ گیا۔اس بار بیگ کے علاوہ بیس کے قریب کتابوں کا ایک بنڈل بھی میرے ساتھ تھا۔اب راستے اور شہروں کے حوالے سے کوئی اجنبیت نہیں رہی تھی۔دوران سفر فلسفے کے استاد جناب پرویز اقبال سے ملاقات ہوئی جو لاہور سے تعلق رکھتے تھے۔ان کو دیکھ کر احساس ہوا کہ دور کا شہر اور یہ طویل سفر محض میرا مقدر ہی نہیں تھے۔میرے سلیکشن بیچ 1978 کی تقرریاں خاصی تاخیر سے ہوئیں تھیں اور اس گروپ کے چھ لوگ مجھ سمیت جوائن کر چکے تھے۔ان میں میرے علاوہ نصر عباس نقوی (راولپنڈی، اردو)، پرویز اقبال (لاہور، فلسفہ) اور ظفر عباس نقوی (کیمسٹری) لاہور، قاضی اعجاز محور (جغرافیہ۔ گوجرانوالہ) مختار احمد عزمی (اردو۔صادق آباد) اور پنجابی کے ارشد میر جن کا تعلق چشتیاں سے تھا، کسی دیگر کالج سے تبدیل ہو کر آئے تھے۔ایک مقامی استاد کے سوا ہم تمام فیڈرل ہوسٹل میں رہتے تھے۔میں ہوسٹل کی پچھلی جانب کے کمرے میں اور باقی استاد نیچے والی دو ڈارمیٹریز میں۔ہمارا آپس کا تال میل بہت اچھا تھا۔ہم تمام ہم خیال اور ہم فکر تھے۔ہم سب نے اپنے تدریسی کیریئر کا آغاز اکٹھے اور اسی کالج سے کیا تھا۔ایک طرح سے ہماری تدریسی تربیت کا آغاز ہو چکا تھا۔ایک تو ہم سب نے استاد بننا چاہا تھا پھر استاد بن کر ہر ایک کے اپنے خواب تھے جو عملی جامہ پہن چکے تھے۔یہ جو ہم لوگ ہوسٹل میں رہتے تھے تو مفت نہیں تھا بلکہ بلڈنگز کے ضلعی ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ایک مجوزہ اور متعین کردہ مخصوص رقم اس رہائش کے عوض ہر ایک کی تنخواہ سے کاٹی جاتی تھی جو خزانے میں جمع ہو جاتی تھی۔

ہنگامی تعطیلات کے خاتمے کے ایک ہفتہ کے اندر اندر سالانہ کھیلوں کا انعقاد کیا گیا جو بہت بھرپور طریقے سے تین دن تک جاری رہا۔اس میں ہماری کوئی نمایاں ڈیوٹیز نہیں لگائی گئی تھیں۔کالج میں ہمارا زیادہ

وقت کلاس، لائبریری اور سٹاف روم میں گزرتا۔ ہاسٹل میں رات کے کھانے کے بعد ہم کالج سے فوجی چوک تک سیر کرنے جاتے۔ دائیں جانب سیٹلائیٹ ٹاؤن تھا جس کے متعدد پلاٹ خالی تھے جب کہ بائیں جانب ریت کے بڑے بڑے ٹیلے تھے۔ تھوڑی سی ہوا سے ریت منہ میں آجاتی۔ چوک (بعد کا نام جگنو چوک) کے بعد ایک بہت بڑا پلاٹ خالی پڑا تھا جہاں بعد میں آرمی پبلک سکول تعمیر کیا گیا۔ بائیں جانب کچی چھاؤنی کی دیوار تھی۔ ایک بار ہم مہاجر کالونی (موجودہ صادق کالونی) میں فزکس کے استاد انوارالحق کے گھر بھی گئے۔ وہاں کوئی ایسا چوک تھا جس کے درمیان کسی پرانے کنویں کا گمان ہوتا تھا، اسی چوک کے ساتھ ان کی رہائش تھی۔ ایک بار زمیندارہ کالونی میں سوشیالوجی کے اصغر روحیل کے گھر گئے۔ دراصل ہمارے یہ دن رحیم یار خان کو جاننے کے دن تھے، شہر میں کوئی قابل ذکر تعلقات تو تھے نہیں۔ کالج سے شہر قریب تھا جہاں پیدل جانا آنا آسان تھا۔ بعض اوقات تو یہ بھی ہوا کہ سیر کرتے کرتے کالج سے چند قدم دور سیٹلائیٹ ٹاون کی آبادی میں موجود احسن سینما جا بیٹھتے۔ اسی طرح کبھی کبھار گلیکسی سینما یا فردوس سینما میں فلم دیکھنے چلے جاتے۔ نشاط سینما اپنے نام ہی کی سڑک پر واقع تھا مگر وہ بہت فرسودہ تھا شاید رحیم یار خان کا پہلا سینما یہی تھا۔ اڈا گلمرگ کے قریب رینبو سینما علاقہ ممنوعہ میں تھا لہٰذا اس میں کبھی کوئی فلم نہ دیکھ سکے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ میں اور قاضی اعجاز محور ایک تانگے والے کے ساتھ معاوضہ طے کرتے کہ وہ جہاں مرضی جس سمت میں جائے مگر شہر ضرور دکھائے، ہم جہاں چاہیں گے اتر جائیں گے۔ اس طرح میں نے اور قاضی اعجاز محور نے خاصا رحیم یار خان شہر دیکھ لیا۔ ہم رحیم یار خان میں لاہور کو یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتے۔ ایک دن لاہور کو یاد کر کے اتنے جذباتی ہو گئے کہ 2 بجے سہ پہر لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں، پرویز اور ظفر کراچی سے آنے والی کراچی ایکسپریس کے ٹائم سٹیشن پر پہنچ گئے۔ اگلی صبح ہم لاہور میں تھے۔ واپسی کی ریزرویشن اترتے ہی کرا لی۔ وہی لاہور، نیو کیمپس اور وہی کمرہ، کیمپس اور نہر کا نظارہ مگر بوجھل دل کے ساتھ دو دن بعد کالج کا وہی کمرہ، وہی تنہائی اور کالج کا ماحول۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرنا چاہوں گا کہ انگریزی کے ایک سینئر استاد اور ریگولر ٹیوشنر شیخ محمد بلال (آج کل مقیم لاہور) سٹاف روم میں میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھے تھے۔ وہ کالج میں کلاسز پڑھانے کے بعد اپنے گھر چلے جاتے جہاں انہیں ٹیوشن پڑھانا ہوتی۔ مجھے کہنے لگے کہ آپ کا کیا تعارف ہے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور یہ بھی واضح کیا کہ میں کافی عرصے سے اسی سٹاف روم کا رکن ہوں۔ کہنے لگے ہاں یاد آیا تو میں نے مومن خاں مومن کے معروف شعر کا کا مصرعہ ثانی پڑھا "میں وہی ہوں مومن مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"۔ سٹاف روم میں ماضی کے دو استادوں کا ذکر اکثر سنا کرتے جو مختلف اوقات میں اس کالج میں کام کر چکے تھے اور اوران کے اچھے اور بہترین استاد ہونے کا تاثر ابھی بھی فضا میں باقی تھا۔ ان میں ایک تو انگریزی کے پروفیسر نسیم صدیقی تھے جو ایس ای کالج بہاول پور چلے گئے اور دوسرے اردو کے ڈاکٹر انوار احمد کوئٹہ سے دسمبر 1972 کے دوران اس کالج میں آئے اور تین سال کے قیام کے بعد زکریا یونیورسٹی

ملتان کے شعبہ اردو میں چلے گئے اور ان کے کالج اور یونیورسٹی کے دور کے شاگرد بھی اس کالج میں بطور استاد کام کررہے تھے۔ ڈاکٹر انوار احمد سے بہت بعد میں واحد ملاقات ہمارے کالج اور ان کے یونیورسٹی کے شاگرد اور اردو کے استاد عبدالمالک شاکر (مرحوم) کے گھر ہوئی اور انہیں جیسا سنا تھا ویسا پایا۔ بائیں بازو کی ترقی پسند سوچ کے حامل یہ انتہائی مقبول استاد اور دانشور آج بھی فیس بک کی مقبول ترین اور متحرک شخصیت ہیں۔

31 مئی 1979 بروز جمعرات فیڈرل ہوسٹل کی چھت پر چاند کی چودھویں کی رات کی مناسبت سے "شب ماہتاب" کے نام سے ایک شعری نشست منعقد کی گئی جس میں مقامی شعرا کے علاوہ خواتین کالج سے پرنسپل اور چند خواتین شاعرا اساتذہ کو بھی مدعو کرلیا گیا۔ ان کو لانے کے لیے کالج بس بھیج دی گئی۔ فیڈرل ہوسٹل کا سالانہ ڈنر بھی اسی رات رکھا گیا۔ بہت اچھی روایت تھی، گرم رات اور رومانی فضا میں بہت اچھی شاعری سننے کو ملی۔ لاہور کی شعری محفلیں یاد آ گئیں۔ اسی دن فیڈرل ہوسٹل کا نام بدل کر اقبال ہال رکھ دیا گیا۔ اگلے دن جمعہ تھا۔ کالج کے شعبہ زوالوجی سے وابستہ پروفیسر رشید احمد انگوی "تنظیم اساتذہ" ضلع رحیم یارخان کے صدر یا امیر تھے اور وہ مدرسہ جامعہ قادریہ میں اپنے بھائی کے پاس رہتے تھے اور مدرسے کی جامع مسجد میں جمعہ کے دن اردو میں خطبہ بھی دیتے تھے۔ انہوں نے کالج کی مخلوط شعری نشست پر اپنی تقریر میں خوب تنقید کی گویا انہوں نے ایک اصطلاح کے مطابق مخلوط اجتماع کے خلاف "جمعہ" لگایا۔ اس اقدام سے رحیم یارخان شہر اور کالج کے عمومی ماحول اور مزاج کو سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ جون کے پہلے ہفتے میں ہی موسم گرما کی تعطیلات کا اعلان کر دیا گیا اور ہم اس سے اگلے دن رات کو اپنے اپنے شہروں اور گھروں میں بیٹھے تھے۔ ان تین ماہ میں ہم نے کالج کو یاد کیا اور نہ کوئی رابطہ رکھا تاہم ماہانہ تنخواہ کے بنک ڈرافٹ ملتے رہے جن کی وجہ سے ساہیوال کے الائیڈ بنک کی ہائی سٹریٹ برانچ میں زندگی کا پہلا بنک اکاؤنٹ کھولا جہاں گورنمنٹ ہائی سکول ساہیوال میں میرے میٹرک کے کلاس فیلو چودھری لیئین افسر تھے۔ یہ اکاؤنٹ صرف تین ماہ کی تنخواہیں وصول کرنے کے لیے ہی استعمال ہو سکا۔ بس یہ احساس تھا کہ نوکری باقاعدہ اور پکی ہے۔ میں یہاں یہ بات واضح کردوں کہ میں تدریسی پیشے سے اتفاقی طور پر وابستہ نہیں ہوا تھا بلکہ میٹرک سے ہی مجھے یہ پیشہ بہت اچھا لگتا تھا اس لیے ایک گونہ اطمینان تھا کہ جس پیشے کی خواہش کی تھی وہ حاصل ہو چکا تھا۔

موسم گرما کی تعطیلات ختم ہوئیں تو کالج کھل گئے۔ سال اول میں داخلے شروع ہو چکے تھے، (تدریس کے حوالے سے میں نے "پاکستان میں کالج کے فارسی استاد کی سرگزشت" کے عنوان سے مضمون لکھا ہے جس میں تمام تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔) یہاں کالج اور شہر کی تاریخ، معاشرتی وتہذیبی اور علمی وادبی پہلوؤں پر بات کروں گا۔ شب مہتاب پر کالج کے ایک خاص مکتبہ فکر کی طرف سے جو رویہ اختیار کیا گیا تھا وہ یہاں کے ماحول کو سمجھنے میں کلیدی حیثیت رکھتا تھا۔ کالج میں سٹاف روم ہی ایک ایسا مرکز تھا جہاں سے ہر قسم کی تدریسی سرگرمیوں کا آغاز ہوتا تھا۔ سائنس کے مضامین از قسم فزکس، کیمسٹری، بیالوجی بشمول جغرافیہ ونفسیات

کے شعبوں کی اپنی تجربہ گاہیں اور تدریسی سٹاف کے دفاتر تھے، ان کے سوا تمام دیگر اساتذہ کا مجلسی مرکز سٹاف روم ہی تھا۔ ٹی کلب یہاں تھی۔ خوب رونق لگی رہتی مگر (کہنے کی حد تک) فکری اور کسی حد تک مسلکی اختلاف کا اظہار اساتذہ کے باہمی رویوں اور تعلقات کار میں واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔ نئے سات سے آٹھ اساتذہ کے آجانے سے سٹاف روم کی فضا بہت متحرک ہو چکی تھی۔ ہم لوگ تو معاشرتی سطح پر ابھی اجنبی تھے اور جو کچھ تعلقات تھے بھی تو کالج کے ہم خیال اساتذہ تک محدود تھے مگر مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ ہم سب مسلمان تھے اور اسلام اور توحید و رسالت کا تصور ہماری نہاد میں تھا، ایمان و ایقان کا حصہ تھا۔ ہم سب ایک ہی نبیؐ کی امت تھے اور باقی اسلامی بنیادی عقائد پر ایمان و ایقان پختہ تھا۔ عبادات میں تھوڑی بہت سستی تو ہو سکتی تھی مگر معاملات میں ہم سب پرجوش تھے بل کہ ہمارا پیشہ تو معاملات کا سرچشمہ تھا مگر کچھ لوگ سیاسی ترجیحات کو مذہب سے ملا کر ایک طرح کی پاکباز زندگی کے ضعم میں مبتلا تھے۔ گروہ بندی جس کی ایک جانب جماعت اسلامی کی ذیلی شاخ مع اپنے سیاسی مقاصد "تنظیم اساتذہ" کھڑی تھی جب کہ دوسری جانب باقی سارے ''مسلمان اساتذہ''۔ بظاہر دین دار سمجھی جانے والی جماعت کا ایک پروپیگنڈا سیل تھا جسے وہ کردار کُشی کے لیے بھی استعمال کرتے تھے۔ مثلاً میں نے کلاس میں طلبا کے سامنے تجویز پیش کی کہ ہم بزم اقبال یا آرٹ اینڈ سٹڈی سرکل یا مجلس حالات حاضرہ قائم کر کے طلبا کی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکتے ہیں۔ میں جس کالج میں پڑھتا رہا تھا وہاں پر یہ تینوں سوسائٹیز موجود تھیں اور ان کے ذریعے ہمارے اساتذہ نے ہماری صلاحیتوں کی بہتر نشوونما کی۔ اگلے دن سٹاف روم میں یہ بات پھیلائی گئی کہ نسیم بلوچ نے طلبا کو اکسایا ہے کہ بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن قائم کی جائے۔ پرنسپل کے پاس بھی یہ بات پہنچا دی جنہوں نے مجھے بلا بھیجا، ان کی بات کرنے سے پہلے ہی میں نے ساری حقیقت کھول کر بیان کر دی جس سے انہیں اصل صورت حال کا علم ہوا۔ تدریس جیسے پیغمبرانہ پیشے سے منسلک افراد کے درمیان ایسی صورت حال دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ جب بھی کوئی نیا سٹاف ممبر آتا تو دونوں گروہ اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے۔ تنظیم اساتذہ کی ذیلی شاخ "تحریک اساتذہ" کے کارکن اساتذہ کے پاس تنظیمی اہداف اور مالی وسائل ہوتے اور کالج کی جناح ہوسٹل میں انہی کا سپرنٹنڈنٹ تھا جس کے باعث وہ نئے آنے والے کے لیے فوراً رہائش و خوراک کا بندوبست کر دیتے تو اگر وہ جماعت اسلامی کے ساتھ اختلاف میں ناپختہ ہوتا تو وہ فوراً ان کے بلاک میں شامل ہو جاتا۔ ایک اور بات جس پر ہم لوگ ہمیشہ حرف گیری کرتے رہے وہ یہ تھا کہ جماعت اسلامی کی فکر کے لوگ خود کو دیگر تمام لوگوں سے زیادہ اسلامی اقدار کے پابند سمجھ کر دیگر باعمل مسلمانوں کو اپنے مسلک پر قائل کرنے کی سیاسی جدوجہد کرتے ہیں بل کہ اس وقت کے پنجاب لیکچرر ایسوسی ایشن (پی ایل اے) کے ووٹوں کی خاطر ایسے لوگوں کو بھی سپورٹ کرتے کہ جن کے ماورائے اخلاق کردار سے ہر کوئی واقف ہوتا گویا کردار جیسا بھی ہو، ووٹ ان کو دو۔ میں گو لبرل اور ترقی پسند سوچ کا حامل تھا مگر میں تعلق کی بنیاد "جماعتی یا غیر جماعتی" کو نہیں بناتا تھا بل کہ کردار و اخلاق

اور عاجزی وانکساری کے حامل انسان میرے لیے اہم تھے۔ میں تعلق کو فروعی اختلافات سے بلند تر رکھنے کا قائل تھا۔

اکتوبر 971 سے 1979 تک کے کامیاب پرنسپل پروفیسر سید اشرف علی شاہ (علیگ) بہاول پور ٹرانسفر ہو گئے۔ انہوں نے یہاں نو سال کا عرصہ نہایت عزت واحترام اور محنت ووقار کے ساتھ گزارا۔ وہ بہت نرم خو اور نرم گفتار تھے۔ وہ جمال ہی جمال تھے۔ انہیں کبھی جلالی کیفیت میں نہیں دیکھا۔ ان کی کامیابی کا راز یہ بھی تھا کہ انہوں نے غیر جانبداری سے ہر کام کے لیے موزوں ترین صلاحیتوں کے اساتذہ سے کام لیا۔ ان کے جانے کے بعد کالج جن حالات سے دوچار ہوا اس پر افسوس کا اظہار ہی کیا جا سکتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے سینئر استاد شعبہ تاریخ پروفیسر محمد سرور زیدی انچارج پرنسپل بنے۔ نومبر کے وسط تک وہ تمام سٹاف کی اس وقت تک کی سالانہ خفیہ رپورٹس بطور رپورٹنگ آفیسر لکھ کر اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو گئے۔ انہوں نے ہر ایک استاد کے بارے میں مثبت ریمارکس دیے تا آنکہ مستقل پرنسپل پروفیسر سید رحمت اللہ شاہ تشریف لائے جنہوں نے پرنسپل کی رہائشگاہ خالی ہونے تک اقبال ہال کے ایک کمرے میں قیام کیا۔ سیاسیات کے استاد اور اقبال ہال کے سپرنٹنڈنٹ تصدق حسین چودھری مقابلے کے امتحان میں کامیابی کے بعد پولیس سروس آف پاکستان (پی ایس پی) جوائن کر چکے تھے اور ان دنوں کیمسٹری کے استاد راجہ محمد بنارس ہوسٹل کے نگران مقرر ہوئے جن کی زبان کے چند جملے دلچسپ ہونے کی وجہ سے لوگوں میں لطف کا باعث بنتے۔ اقبال ہال کے دو وبڑے کمروں میں 8 اساتذہ بھی مقیم تھے۔ نئے پرنسپل عربی ادب کے استاد اور ایک محفل ساز انسان تھے۔ عصر سے مغرب تک ہوسٹل کے لان اور بعد میں اساتذہ کے کسی نہ کسی کمرے میں خوب محفل جمتی، شعر وادب پر مباحث ہو رہے ہوتے۔ وہ ہم نوجوان اساتذہ میں گھل مل جاتے۔ لطائف کی وجہ سے یہ محفل قہقہوں سے بھرپور ہوتی۔ ایک دن انہوں نے ہمیں یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ "سینئر اساتذہ شکوہ کرتے پائے گئے ہیں کہ نیا پرنسپل تو نوجوان اساتذہ کا ہے اور ان کی محفل میں خوش ہوتا ہے۔" پروفیسر رشید احمد انگوی نے اپنی معلمانہ زندگی کی تلخ وشیریں یادیں میں خواجہ فرید کالج کے پرنسپلز کے باب میں سید رحمت اللہ شاہ کے بارے میں لکھا ہے۔ ''شاہ صاحب بہت رونقی انسان تھے۔ لطیفے اور قہقہے ان کی محفل کی جان ہوتے۔ حاضرین محفل میں سے ہی کسی کو نشانہ بنا کر فقرے بازی شروع کر دیتے۔'' بعد میں وہ پرنسپل کی رہائش گاہ میں منتقل ہو گئے۔ نومبر کے آخر میں کالج کے تقریباً تمام اساتذہ اور سال چہارم کے چند طلبا نے پرنسپل کی سربراہی میں آغا خان ایوارڈ یافتہ بھونگ مسجد کا دورہ کیا جس کے بعد گدو بیراج کا بجلی گھر دیکھا اور بیراج کے سرسبز وشاداب لانز میں کھانا کھایا۔ اس دورے کے دوران بھی وہ ہم سب میں گھل مل گئے مگر اس دورے میں کچھ ایسے واقعات بھی ہوئے جن سے پرنسپل نے اپنے احساسات کے تابع رائے قائم کی۔ چوں کہ طلبا کا ہم اساتذہ سے پیار اور احترام کا تعلق تھا تو انہوں نے ہمیں بلا بلا کر ہمارے ساتھ یادگاری فوٹوگرافی کی جب کہ پرنسپل بھی موجود تھے، یہ بات شاید ان کو نہیں بھائی۔

اگلے دنوں یہ بات سامنے آئی کہ پرنسپل سید رحمت اللہ تو بنیادی طور پر جماعت اسلامی کے ہمدرد اور شاید رکن بھی تھے جب کہ ہوسٹل سے منتقل ہونے تک وہ ہم سب کے ساتھ شعروشاعری اور لطائف بازی کے ساتھ مختلف موضوعات پر مباحث میں حصہ لیتے رہے۔اس دوران وہ سب کے بارے میں ایک رائے قائم کر رہے تھے۔اس کے بعد ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے تمام منظر ہی بدل دیا۔

میں کالج اساتذہ کے ایک اہم فورم پنجاب لیکچررز ایسوسی ایشن (PLA) کا پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اس وقت کالجوں میں تین درجاتی سٹاف ہوتا تھا۔صرف لیکچرر، اسسٹنٹ پروفیسر اور پروفیسر کی پوسٹیں ہوا کرتی تھیں۔لیکچرر کی پوسٹیں کلاسیفائیڈ یا مضمون وار ہوتی تھیں جب کہ باقی پوسٹیں نان کلاسیفائید ہوتی تھیں۔ (چار درجاتی فارمولہ میں لیکچرر، اسسٹنٹ پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر اور پروفیسر کی تمام پوسٹیں کلاسیفائیڈ یا مضمون وار ہوگئیں اور اس پر عمل درآمد یکم ستمبر 1990 سے ہوا تو یہ فورم پنجاب پروفیسرز اینڈ لیکچررز ایسوسی ایشن (PPLA) کہلایا)۔دسمبر 1979 کے دوران پی ایل اے کا الیکشن ہونا قرار پایا، خواجہ فرید گورنمنٹ کالج یونٹ میں اس سے پہلے جماعت کی طرف سے عہدیداران کو نامزد کر دیا جاتا مگر نئی فضا میں جمہوری اصولوں کی پاسداری کی خاطر پہلی مرتبہ جماعت کے مقابلے میں الیکشن لڑنے کا بگل بج گیا جسے جماعت کی طرف سے انتہائی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ہمیں سوفی صد یقین تھا کہ ہم نہیں جیتیں گے کیوں کہ جماعت کا افرادی قوت یا نمبروں کے اعتبار سے پلہ بہر حال بھاری تھا۔نیوٹرل اساتذہ کو بھی جماعت نے "سمجھا" دیا۔ہمیں ہارنا تھا سو ہار گئے مگر جماعت کے گروپ نے پی ایل اے کالج یونٹ کے الیکشن کرانے کا بہت برا منایا اور ایسے موقعے کی تلاش میں رہے کہ جب وہ نئے آنے والے اساتذہ کو سبق سکھا سکیں۔پہلے پرنسپل متوازن اور غیر جانب دار تھے مگر اب جب کہ جماعت کا مکمل ہمدرد اور رفیق پرنسپل تھا تو ان سے مطالبہ کیا جانے لگا کہ کالج میں مختلف اہم ذمہ داریوں کو توازن کے ساتھ تفویض کیا جانا چاہیے۔اس بات کا بھی بہت برا منایا گیا۔ایسے ماحول میں زیرزمین کچھ نہ کچھ پک رہا تھا جس کا ادراک کسی کو نہ ہو سکا۔اگلے تین مہینے فعال اور بھرپور تعلیمی سرگرمیوں میں بیت گئے، تعلیمی سال کی نصابی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔بظاہر ہر چیز معمول کے مطابق چل رہی تھی کہ ایک زوردار دھما کا ہوا۔

تنظیم اساتذہ کے ضلعی ناظم اور زوالوجی کے اسسٹنٹ پروفیسر رشید احمد انگوی، دفتری امور کے انچارج اسسٹنٹ پروفیسر عبدالعزیز جاوید اور پرنسپل رحمت اللہ شاہ کی خفیہ اور باہمی مشاورت سے دو خفیہ ڈی او لیٹر تیار کیے گئے۔پہلا خط ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشنز پنجاب کو جس میں انٹر ڈویژنل تبادلوں اور دوسرا خط ڈائریکٹر تعلیمات بہاول پور ڈویژن کو ڈویژن کے اندر تبادلوں کی سفارش کی گئی تھی۔اردو کے نصر عباس نقوی (ڈومیسائل راولپنڈی) کو اٹک کے ایک دیہاتی کالج "نیوڑہ کنجور"، فلسفے کے پرویز اقبال (ڈومیسائیل لاہور) کو گورنمنٹ کالج جہلم، پنجابی کے ارشد میر (ڈومیسائیل بہاولنگر) کو گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازیخان، ظفر عباس

نقوی (ڈومیسائیل لاہور) کو گورنمنٹ انٹر کالج فورٹ عباس اور مجھے کہ جس کا ڈومیسائیل ساہیوال تھا، گورنمنٹ کالج بہاولنگر (جہاں پروفیسر منشاد علی کی ترقی اور ایس ای کالج میں تعیناتی سے سیٹ خالی ہوئی تھی) تبادلے کرا دیئے گئے۔ ردعمل کے طور پر طلبا نے کلاسز کا بائیکاٹ کر دیا۔ طلبا کو سال چہارم کے مرزا عرفان اللہ بیگ (آجکل امریکہ میں) اور نون لیگ کے آجکل کے لیڈر خالد شاہین لیڈ کر رہے تھے مگر یہ جوش کب تک رہتا آخر اسے ختم ہونا تھا۔ چار لوگوں کو تو انتظامیہ نے اپنی طرف سے یک طرفہ فراغت نامے جاری کر دیے۔ میں پرنسپل سے ملا اور ان سے سوال کیا کہ انہوں نے میرا ٹرانسفر کیوں کرایا تو وہ صاف مکر گئے کہ ان کا میرے تبادلے میں کوئی ہاتھ ہے، میں سمجھ رہا تھا کہ وہ سچ نہیں بول رہے مگر ان کا یہ کہنا کہ انہوں نے میرا تبادلہ نہیں کرایا میرے مفاد میں تھا۔ میرا مسئلہ کچھ مختلف بھی تھا۔ ایک تو میں اپنی فیملی مع والدین یہاں سیٹ ہو چکا تھا اور میری شریک حیات بھی سرکاری ملازمت میں تھی لہٰذا میں نے درخواست لکھی کہ میرا تبادلہ ازدواجی بندن (Wedlock) کی بنیاد پر منسوخ کر دیا جائے۔ چوں کہ پرنسپل نے اقرار ہی نہیں کیا کہ میرا تبادلہ انہوں نے کرایا ہے اس لیے میں نے اپنی درخواست برائے تنسیخ تبادلہ ان کے سامنے رکھ دی جس پر انہوں نے تین دلائل دیے کہ میرا قیام ابھی تین سال سے کم ہے۔ ویڈ لاک کا معاملہ ہے اور ورک لوڈ بھی پورا ہے۔ اس 45 سال پرانی درخواست اور سفارشی ریمارکس کی نقل اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ انہوں نے اپنی پر زور سفارش کی ٹائپ شدہ عبارت کے آخر میں ہاتھ سے یہ بھی لکھ دیا کہ اگر ٹرانسفر منسوخ کرنا ممکن نہ ہو تو آخری فیصلے تک اس پر عمل درآمد روک دیا جائے۔ میں یہ درخواست لے کر بیالوجی کے استاد محمد اظہر چودھری کی ہدایت پر ایس ای کالج بہاول پور جا کر زوالوجی کے استاد فروغ جلیل قریشی سے ملا جو مجھے موجودہ ایلیمنٹری کالج کی بلڈنگ میں موجود نظامت تعلیمات بہاول پور میں ڈائریکٹر پروفیسر منور علی خاں کے پاس لے گئے۔ میں نے ان کے سامنے درخواست رکھی جسے پڑھ کر وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ ابھی ہی تو وہ اپنے لکھے ہوئے ڈی او کی بنیاد پر تبادلہ کرا کر گئے ہیں۔ مجھے باہر بھیج کر پرنسپل کو فون کیا پھر مجھے اندر بلا لیا اور ڈائریکٹر نے کہا کہ میں ابھی آپ کا تبادلہ منسوخ نہیں بل کہ اس پر عمل درآمد تا فیصلہ معطل کر رہا ہوں۔ واپسی پر قریشی صاحب نے مجھے بتایا کہ پرنسپل نے فون پر ڈائریکٹر سے کہا تھا کہ تنسیخ تبادلہ کی سفارش میری مجبوری تھی لیکن اسے منسوخ نہیں کرنا۔ اس موقع پر مجھے بتایا گیا کہ سید رحمت اللہ شاہ کے بارے میں کسی پرنسپل نے یہ پین پکچر لکھی تھی، "دو چہروں کا حامل شخص۔" اصل عبارت یہ تھی: "The man with Dual Faces"۔ میرے دوست جا چکے تھے۔ میرے آرڈر منسوخ نہیں پر معطل ہو چکے تھے۔ ایک ابہام برقرار تھا کہ منسوخ ہوں گے یا نہیں۔ اتنے میں موسم گرما کی تعطیلات شروع ہونے سے پہلے آخری روز مجھے اطلاع ملی کہ میرے کیس کے بارے میں کوئی خط بھیجا گیا ہے جو اس روز موصول ہونے کا امکان تھا۔ میں اور انگریزی کے دوست جی این شاکر ڈاک کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ ڈاک آئی تو دو خطوط تھے، ایک میرے نام اور دوسرا پرنسپل کے نام

کانفیڈینشل ۔میرے خط میں یہ مذکور تھا کہ "اگر آپ کا ٹرانسفر منسوخ کرنا ممکن نہ ہوتو آپ اپنی ترجیح کا سٹیشن اور اپنی بیوی کے کوائف بھجوادیں، پرنسپل کے نام لیٹر ہیڈ کلرک کو اعتماد میں لے کر اس کی سٹیپل پن کو احتیاط سے کھولا، میں پڑھتا گیا اور شاکر اس کا متن ٹائپ کرتا گیا۔اس میں پرنسپل سے وضاحت مانگی گئی تھی کہ آپ کے ایک گذشتہ خط کے مطابق لیکچرر مذکور کالج کے لیے مفید نہیں تھے مگر ایک دوسری تحریر کی روشنی میں وہ کالج کے لیے ناگزیر ہیں۔اپنی پہلی رائے کی تردید اور نئی رائے کی تائید کو دلائل سے ثابت کریں۔اسی طرح پن لگا کر ڈاک اندر پرنسپل کو بھجوادی جو کبھی باہر نہ آسکی۔ مجھے پرنسپل کے دو غلے پن پر بہت دکھ ہوا مگر میں مزید اپنی خودداری کو مجروح نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے خاموش رہا۔

مجھے معلوم ہوا کہ گورنمنٹ ترقی تعلیم کالج خان پور میں ایک پوسٹ خالی ہوئی ہے۔وہاں فارسی کے استاد محمد عارف شورکوٹ تبادلہ کرا گئے ہیں۔موسم گرما کی تعطیلات کے بعد کالج کھل چکے تھے اور میرا کیس ابھی تک وہیں تھا جہاں تعطیلات سے پہلے تھا۔میں نے سنا کہ سیاسیات کے استاد اور ربانی ٹیلرز صادق بازار کے مالک غلام مرتضی کے چھوٹے بھائی غلام سرور جو نام کے ساتھ صدیقی بھی لکھتے ہیں، روزانہ کی بنیاد پر خان پور کالج جاتے آتے ہیں۔ میں خصوصی طور پر ان سے ملا تو انہوں نے مجھے بہت تحریک دی کہ روزانہ جانے آنے میں زحمت تو ہے لیکن وہاں کا ماحول بہت پرسکون ہے۔ پرنسپل بہت شریف انسان ہے اور سٹاف میں بہت دوستی اور ہم آہنگی ہے۔کوئی نمایاں گروہ بندی نہیں ہے،خواجہ فرید کالج والی آپادھاپی نہیں ہے۔جانے آنے کی تکلیف کو مائینس کر دیا جائے تو بہترین کالج ہے۔اگر آپ یہاں کسی مخمصے کا شکار ہیں تو خان پور کالج بہترین جگہ ہے لہذا میں نے اسسٹنٹ ڈائریکٹر (ایڈمن) سلطان صاحب کو فون کیا کہ مجھے خان پور کالج بھیج دیں۔وہ کہنے لگے کہ اگر چہ خان پور کے آرڈر ایک دن کی بات ہے مگر میں آپ کی ٹرانسفر کی تنسیخ کی کوشش کر رہا ہوں، میں نے کہا بس آپ کو جو سٹیشن کہا ہے براہ مہربانی اس کے آرڈر کرا دیں۔دو دن کے بعد میرے آرڈر موصول ہو گئے۔ میں نے فراغت نامہ مکمل کیا۔میرے ذمے کالج کی کوئی چیز باقی نہیں یعنی کلیئرنس سرٹیفکیٹ مکمل کیا اور پرنسپل کے پاس چلا گیا۔ کہنے لگے اب آپ ریلیو ہو ہی جاتے، میں نے تمام اہم تیار شدہ دستاویزان کے سامنے رکھ دیں۔انہوں نے پہلو بدلا جیسے میں ان کو فارغ نہ کرنے کی درخواست کروں گا، انہوں نے فوراً دستخط کر دیے۔میں خاموشی سے اٹھ آیا۔ پھر ان سے میری ملاقات کبھی نہ ہو سکی۔1993 کے دوران ان سے خان پور کالج میں ملاقات ہوئی جب وہ ریٹائرمنٹ کے بعد جماعت اسلامی بہاولپور کے صدر تھے۔20 ستمبر 1980 کو میں نے ترقی تعلیم کالج خان پور میں جوائن کیا۔ پہلے میں کالج کے بارے میں بتادوں کہ یہ ایک لو پروفائل، پرسکون اور نیشنلائیزڈ کالج تھا۔اس کے قیام،قومیائے جانے اور سیلاب میں ڈوبنے تک کی بات سن لیجئے۔

''ریاست بہاول پور کے پاکستان سے الحاق کے وقت خان پور شہر میں صرف ایک ہائی اسکول تھا۔

1947 اور 1955 کے درمیانی عرصہ میں اس علاقے کی آبادی میں کافی اضافہ ہوا تو ایک اسکول کو ناکافی سمجھتے ہوئے چند مخلص اور ایثار پیشہ شہریوں نے انجمن ترقی تعلیم کی بنیاد رکھی اور اس کے تحت سٹی تھانہ کے سامنے 6 جولائی 1957 کو پلاٹ حاصل کر کے دو کمرے تعمیر کرائے اور ترقی تعلیم پرائمری اسکول کا آغاز کیا۔ 3 جولائی 1958 کو رجسٹریشن ایکٹ مجریہ 1956 کے تحت انجمن کو رجسٹر کرایا گیا۔ 1960 میں اسے ہائی سکول کا درجہ دے دیا گیا اور چودھری ابراہیم ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ جب یہ ہائی سکول بہت کامیاب ہوا تو انجمن ترقی تعلیم نے سابق ریاست بہاول پور کے معروف استاد اور گورنمنٹ انٹر کالج رحیم یار خان کے پہلے پرنسپل (57-1954) جناب معین الدین حسن قریشی سے رابطہ کیا جن کی سروس کا کیس عدالت میں چل رہا تھا اور وہ ان دنوں فارغ تھے۔ ان سے مل کر کالج کے قیام کے لیے ان کی خدمات حاصل کیں کیونکہ شہر میں کوئی کالج موجود نہیں تھا۔ انہوں نے پہلے مرحلے میں 4 اپریل 1965 کو ترقی تعلیم ہائی اسکول کا چارج سنبھال لیا اور کالج کے قیام کی کوششیں شروع کر دیں۔ انجمن نے اس سلسلے میں ماڈل ٹاؤن خان پور (موجودہ بلڈنگ کی جگہ) میں سوا چھ ایکڑ اراضی بیالیس سو روپے میں خریدی۔ اسی اثنا میں 26 جون 1965 کو اسکول کی عمارت ہی میں فرسٹ ائیر آرٹس کی باقاعدہ کلاسوں کا آغاز کر دیا گیا۔ موسم گرما کی تعطیلات یکم جولائی سے پچیس ستمبر کے بعد اس کے لیے کرایہ کی عمارت حاصل کر کے تدریس کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس دوران کالج کے تعلیمی بلاک میں پانچ کمرے تعمیر کر دیے گئے اور 7 دسمبر 1966، 12 ربیع الاول کے موقع پر کالج کو موجودہ عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ ستمبر 1969 میں انٹر میڈیٹ پری انجینئرنگ کی کلاسیں شروع کر دی گئیں اور 1 لاکھ روپے سے آفس بلاک اور فزکس، کیمسٹری کی تجربہ گاہیں اور اسٹور تعمیر کرائے گئے اور ان کے لیے ضروری سامان خریدا گیا۔ 1970 میں جب پرائیویٹ کالجز آرڈیننس نافذ ہوا تو اس کی تعمیل میں 11 ارکان پر مشتمل ایک گورننگ باڈی تشکیل دی گئی اور کالج کا نظم ونسق اس کے سپرد ہوا۔ 1970 تک یہ کالج انٹرمیڈیٹ کی سطح تک چلتا رہا اور اس میں پری میڈیکل کلاسز کا اجراء کر دیا گیا۔ گورننگ باڈی نے ستمبر 1970 میں ڈگری کا درجہ دے کر سال سوم کی کلاس شروع کر دی اور ساتھ ہی یونیورسٹی سے اس کے الحاق کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس مقصد کے لیے یونیورسٹی کی معائنہ ٹیم نے ستمبر 1971 کے آغاز میں کالج کا معائنہ کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے اس کے مشروط الحاق کی سفارش کی۔ ایم ڈی حسن قریشی کے کیس کا ان کے حق میں فیصلہ ہو گیا تو 1971 میں وہ کالج چھوڑ گئے۔ ان کی جگہ تاریخ کے استاد مختار احمد چودھری نے پرنسپل کا چارج سنبھال لیا۔ پندرہ مارچ 1972 کو مارشل لاء ریگولیشن 118 کے تحت حکومت نے یکم ستمبر 1972 سے کالجوں اور یکم اکتوبر 1972 سے سکولوں کو قومی تحویل میں لینے کا اعلان کر دیا یوں یہ کالج گورنمنٹ کی تحویل میں چلا گیا۔ چوں کہ اس وقت تک پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے اس کے الحاق کا نوٹیفکیشن جاری نہیں ہوا تھا اس لیے گورنمنٹ نے اسے انٹرمیڈیٹ کی سطح تک قبول کیا۔ 22 اکتوبر 1973 میں ہیڈ پنجند کا بند ٹوٹنے سے خان پور شہر بھی پانی

میں ڈوب گیا۔اس بلائے ناگہانی سے کالج بھی بہت متاثر ہوا۔لائبریری کتب، لیبارٹریز، کیمیکلز، فرنیچر اور دوسرا سامان بھی تباہ ہوگیا۔نومبر 1973 میں اس وقت کے وزیر تعلیم نے کالج کا دورہ کیا اور سیلاب سے بحالی کے لیے کچھ گرانٹس دیں تاہم کالج کو مکمل طور پر بحال ہونے میں کچھ وقت لگ گیا۔"

میں 21 ستمبر 1980 کو جب جوائن کرنے پہنچا تو سٹاف کے چند ارکان کالج بلڈنگ کے باہر نیم دائرے کی صورت میں بیٹھے ہوئے تھے۔تعارف کے بعد پرنسپل چودھری مختار احمد نے کہا، " آئیں جناب، تشریف رکھیں، بڑا انتظار تھا آپ کا، مجھے بتایا گیا تھا کہ کوئی خطرناک آدمی آرہا ہے۔" میں نے جواباً کہا، "مجھ سے پہلے اس گلی میں میرے افسانے گئے، جناب آپ بھی یہاں ہیں اور میں بھی، آپ جلد جان لیں گے کہ میں کس قدر خطرناک ثابت ہوتا ہوں یا ادارے کے لیے مفید''۔اس کے بعد میں اور غلام سرور صدیقی ہر روز رحیم یار خان سے کالج جانے آنے لگے۔دلچسپ بات یہ تھی کہ ان دونوں شہروں کے درمیان 42 کلومیٹر فاصلے کے لیے سوائے ٹرین کے کوئی مؤثر مواصلاتی ذریعہ نہیں تھا۔ایک دو بسیں ان شہروں کے درمیان دستیاب تھیں جو بہاول پور تک جاتی تھیں مگر خان پور تک وہ ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچتی تھیں لہٰذا جاتے وقت تو خیبر میل اور اباسین موزوں تھیں مگر واپسی پر خاصی مشکل پیش آتی۔172 ڈاؤن پسنجر ٹرین خانیوال اور سکھر کے درمیان چلتی تھی مگر اس کا کوئی متعین وقت نہیں تھا۔کبھی دو گھنٹے لیٹ یا اس سے کم یا زیادہ اس کا معمول تھا۔ہم نے اس کا نام "لُنڈی ایکسپریس" رکھا ہوا تھا۔کئی بار مال گاڑی کی بریک میں گارڈ کے ساتھ بھی سفر کرنے کا اتفاق ہوا جو رحیم یار خان سے چند میٹر پہلے ویکیوم بریک کا استعمال کرتا جس سے ٹرین کی رفتار کم ہو جاتی اور ہم چلتی ٹرین سے اتر جاتے۔ڈرائیور کو پتا چل جاتا کہ گارڈ کسی دوست کو اتارنے کے لیے بریک لگا رہا ہے تو وہ بھی رفتار آہستہ کر دیتا۔ریلوے کنٹرول پر بیٹھنے والا ایک کامریڈ اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر کسی دوست کے حوالے سے واقف بن گیا تھا اور گاڑی اگر بہت لیٹ ہوتی تو ہم اس کے پاس سیڑھیاں چڑھ کر بیٹھ جاتے اور گپ شپ کے علاوہ کنٹرول روم سے گاڑیوں کی آمدورفت دیکھتے رہتے۔اس وقت ہمیں بہت سی ریلوے کی اصطلاحات یاد ہوگئی تھیں۔مثلاً کسی ٹرین کے بارے میں پوچھنا ہوتا کہ وہ کتنی لیٹ ہے تو کہتے۔''2 ڈاؤن (خیبر میل) کی فورکاسٹ کیا ہے؟ جواب ملتا، 30 منٹ''۔اس کا مطلب ہوتا کہ اصل ٹائم سے 30 منٹ لیٹ ہے۔اسی اے ایس ایم کی وجہ سے مال گاڑی کی بریک میں سفر کا لطف اٹھاتے۔ایک گاڑی پارسل سپیشل بھی ہوتی تھی جو مال گاڑیوں کی ایکسپریس ٹرین تھی اور پھلوں وسبزیوں کی ترسیل کے لیے بھی استعمال ہوتی۔اس میں مال گاڑی کے ڈبوں کے علاوہ دو مسافر بوگیاں بھی لگی ہوتیں۔خان پور جانے والوں میں مختلف محکموں، بنکوں اور کاروبار کے بہت سے لوگ جاتے تھے۔ہم نے مذاق مذاق میں ڈی آر ٹی اے یا ڈیلی ریلوے ٹریولرز ایسوسی ایشن بنالی تھی۔ریلوے سے سفر کے لیے ایک منتھلی سیزنل ٹکٹ یا ایم ایس ٹی (پاس) بنوایا جاتا جس میں آنے جانے کے لیے صرف یک طرفہ پندرہ کرائے وصول کیے جاتے۔ریلوے کے لوگ اتنے واقف بن گئے

تھے کہ ہمیں خود ہی سیکنڈ کلاس سے سلیپر میں بیٹھنے کی دعوت دیتے۔ ریلوے سٹیشن سے کالج کے لیے ہمارے پاس دو راستے ہوتے، ایک براستہ غلہ منڈی، چھوٹی نہر کے کنارے اور ماڈل ٹاؤن۔ اس راستے میں قباحت یہ تھی کہ غلہ منڈی میں سرخ مرچوں کے جگہ جگہ ڈھیر لگے ہوتے تو پریشانی ہوتی، دوسرا راستہ صدر بازار سے سٹی پولیس سٹیشن براستہ ماڈل ٹاؤن تھا۔ بس اسی طرح ایک سال بیت گیا۔ اس ایک سال کے دوران تدریسی کام کے علاوہ لائبریرین کے نہ ہونے سے ناقابل استعمال لائبریری کا چارج مجھے دے دیا گیا تو میں نے تمام الماریوں میں پڑی کتابوں کو موضوعاتی ترتیب دی۔ میری مدد کے لیے رٹائرمنٹ کے قریب درجہ چہارم کا ایک نحیف ملازم موجود تھا مگر سارا کام مجھے خود ہی کرنا پڑا۔ الماریوں پر موضوعاتی ترتیب کے عنوانات لکھوائے۔ تین بند دیوار گیر الماریوں میں سیلاب سے متاثرہ کتب موجود تھیں ان میں سے نصف کے قریب کتب صحیح و سلامت تھیں انہیں متعلقہ الماریوں میں منتقل کیا۔ دیگر کتب میں سے اکثر کو بحال کرایا اور باقی کو سکریپ کرنا پڑا۔ طلبا کو کتب جاری کرنے کی روایت کا آغاز کیا۔ ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔ میں نے جن حالات میں خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان سے گورنمنٹ ترقی تعلیم کالج خان پور تبادلہ کرایا وہ میں تفصیلاً بیان کر چکا ہوں۔ میں جب یہ کالج جوائن کرنے گیا تو پرنسپل نے خصوصی ریمارکس دیے جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں۔ کالج میں وائس پرنسپل اور تحصیل خان پور میں جماعت اسلامی کی تنظیم اساتذہ کے عہدیدار پروفیسر سعید الزماں نے شروع کے ایک مہینے بعد مجھے مخاطب ہو کر کہا۔ ”نسیم بلوچ! جب آپ اس کالج میں آئے تو ہمارے لوگوں نے بہت پروپیگنڈا کیا کہ کوئی خطرناک استاد آ رہا ہے مگر آپ ان لوگوں کی متعصب رائے کے برعکس نکلے۔ آپ بہت شائستہ، مہذب اور فرض شناس انسان ہیں، ہمارے لوگ تعصب میں بہت دور نکل جاتے ہیں۔" میں نے ان تاثرات پر ان کا بہت شکریہ ادا کیا۔

1981-82 کے تعلیمی سال کے دوران غلام سرور صدیقی نے خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان تبادلہ کرا لیا اور میں اب اکیلا رہ گیا تھا۔ پرنسپل نے مجھے واپسی کے لیے الفرید ٹرانسپورٹ کا پاس بنوا کر دیا بل کہ پرنسپل کے کہنے پر بس کمپنی کا مالک یہ پاس خود کالج آ کر دے گیا۔ یہ بس تقریباً ایک اور دو بجے کے درمیان خان پور کے بس سٹینڈ پر پہنچتی اور ایک گھنٹے سے زائد وقت میں رحیم یار خان پہنچا دیتی۔ یوں کالج آنا ریل گاڑی سے اور واپسی بس پر ہونے لگی۔ اس وقت یعنی 1982 کے دوران آج کے گنجان آباد سیٹلائیٹ ٹاؤن خان پور کی سڑکیں بن رہی تھیں۔ ڈویلپمنٹ کا کام بہت سست روی سے شروع تھا۔ میں دین پور چوک جانے کی بجائے نہر کے فوراً بعد دائیں جانب سیٹلائیٹ ٹاؤن کی جانب مڑ جاتا اور بس سٹینڈ کے لیے شارٹ کٹ لگاتا۔ بس کا انتظار بس اڈے پر ایک جنرل سٹور پر بیٹھ کر کرتا۔ باقاعدگی کے ساتھ ایک آم کے جوس والی بوتل پیتا، وہاں پر ریڈیو سے میوزک سنتا رہتا تا آنکہ بس آ جاتی۔ رحیم یار خان میں خان پور اڈا بن چکا تھا اور ریلوے لائن پر اوور ہیڈ پل بھی چالو ہو چکا تھا۔ صادق آباد بائی پاس مکمل ہو کر ارد گرد کی زمینوں کو مہنگا کر چکی

تھی۔خواجہ فرید کالج میں شماریات کے استاد ماموں عباس خاں تھے جن کی زرعی زمین اس نئی سڑک کے ساتھ پڑی تھی۔ابھی یہ سڑک نہیں بنی تھی تو انہوں نے یہ زمین بیچ دی۔صرف ایک سال بعد یہ سڑک بن گئی تو اس زمین کی قیمت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا جس سے وہ بہت دل برداشتہ ہوئے اور وہ ذاتی وجوہ کی بنا پر رحیم یار خان چھوڑ کر راولپنڈی جا بسے۔جماعت اسلامی کے ہمدرد تھے،راولپنڈی بورڈ میں ڈیپوٹیشن پر کنٹرولر امتحانات اور سیکریٹری کے عہدوں پر رہے۔انہوں نے بظاہر رحیم یار خان مڑ کر نہیں دیکھا۔بہر حال بسوں کا شہر میں داخلہ ممنوع تھا اور بائی پاس سے بسیں نئے بس سٹینڈ المعروف سکھر اڈے کی طرف چلی جاتیں۔خان پور اڈے سے رحیم یار خان کے لیے تانگہ سستی اور عام سواری تھی۔صبح گھر سے سائیکل پر آتا اور ریلوے روڈ پر واقع ڈاکٹر عبدالغفور کے کلنک پر سائیکل لاک کر دیتا۔ریلوے سٹیشن قریب ہی تھا۔واپسی پر ریلوے چوک میں تانگے سے اتر کر سائیکل پر واپس گھر پہنچ جاتا۔1981-82 کے سال کے دوران کالج میں یادگار دوروزہ ادبی تقریبات کا انعقاد کیا گیا جس میں مشاعرہ بھی شامل تھا۔اس دوران بہاول پور کے شعرا سے ملنے کا موقع ملا۔سالانہ سپورٹس کے علاوہ این سی سی کی سالانہ پاسنگ آؤٹ پریڈ بھی کالج کے تعلیمی کیلنڈر کا حصہ ہوتی تھی۔

گورنمنٹ ترقی تعلیم کالج خان پور میں مجلّے کی روایت تھی نہ کالج کے خبرنامے کی۔گورنمنٹ کالج ساہیوال میں 1972 میں کالج گزٹ کے نام سے ایک خبرنامے کا پروگروم بنا تو میں کہ جو سال سوم کا طالب علم تھا، مجھے بھی اس کے طلبا پر مشتمل حلقہ ادارت میں شامل کر لیا گیا۔اس کی کتابت بھی ہو گئی تھی مگر وہ طباعت کا مرحلہ طے نہ کر سکا۔گورنمنٹ کالج خان پور کے پرنسپل کو میں نے کالج گزٹ کے نام سے ایک خبرنامے کی تجویز پیش کی جسے قبول کر لیا گیا اور اس طرح صرف چار صفحات پر مشتمل سب سے پہلا کالج گزٹ یا اخبار میری ادارت میں شائع ہوا، ایک طالب علم معاون مدیر تھا۔اس کالج گزٹ پر یکم محرم الحرام 1401 ہجری مطابق 10 نومبر 1980 کی تاریخ درج ہے۔پہلے صفحے پر ابتدائیہ کے نام سے اداریہ جبکہ اگلے دو صفحات کالج کی خبروں اور آخری صفحہ پر پرنسپل کا پیغام درج تھا۔کالج گزٹ یا کالج خبرنامہ شائع کرنا گویا تعلیمی ادارے کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کی تاریخ مرتب کرنا یا انہیں دستاویزی شکل دینے کے مترادف ہوتا ہے۔جو باتیں لکھی گئیں یا چھپ گئیں وہ محفوظ ہو گئیں تو وہ تعلیمی ادارے کی تاریخ بن گئیں۔کالج گزٹ کا پہلا شمارہ تو کتابت شدہ صورت میں پریس سے چھپوایا گیا مگر آئندہ شماروں کا پہلے سکرپٹ تیار کیا جاتا اور اس کے بعد کالج گزٹ کی تختی سٹینسل پر ڈیمانسٹریٹر جناب حافظ طاہر خان بال پوائنٹ کے ساتھ کریدتے، پھر تمام سکرپٹ کو ایک ترتیب کے ساتھ سٹینسل پر کرید کر لکھا جاتا اور سائیکلوسٹائل مشین سے پرنٹ کیا جاتا تھا۔(یہاں یہ یاد دلا دیا جائے کہ مختلف تعلیمی اداروں میں جہاں سائیکلوسٹائل کی سہولت مہیا ہوتی وہاں پر کالج کے داخلی امتحانات کے سوالیہ پرچہ جات اسی پر پرنٹ کیے جاتے تھے) دوسرا شمارہ 10 دسمبر 1980 خاص میٹریل سے بنے ہوئے سٹینسل پیپر پر ٹائپ کروایا گیا۔یہ لیگل سائز کے چار صفحات پر مشتمل تھا۔10 دسمبر 1980 کے اس شمارے

میں اس وقت کے سال اول کے طالب علم اور آج کے پروفیسر ڈاکٹر ایوب ندیم کی ایک غزل بھی شامل ہے۔ اس سے اگلا کالج گزٹ یکم جنوری 1981 کو شائع ہوا۔ یہ شمارہ بھی چار لیگل سائز کے سائیکلو سٹائیل صفحات پر مشتمل تھا۔ فروری اور مارچ 1981ء کو شائع ہونے والے گزٹ کے کل صفحات 8 تھے۔ اس شمارے میں 5 مارچ 1981 کو کالج انتظامیہ، شہریوں اور تحصیل انتظامیہ کے مشترکہ اجلاس کی تفصیل بھی تھی جس کی صدارت اسسٹنٹ کمشنر چودھری نذیر احمد نے کی۔ اس اجلاس میں کالج کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز پر غور کیا گیا۔ 1- کالج کو ڈگری کا درجہ دیا جائے، 2- کالج کے طلبا کے لیے ہوسٹل کا انتظام کیا جائے، 3- کالج کی عمارت میں توسیع، 4- کالج سے ملحقہ بلدیہ کی زمین کالج کو دی جائے، 5- سائیکل سٹینڈ کی تعمیر، 6- کالج کینٹین کی تعمیر، 7- کالج کے گرد چار دیواری کی تعمیر۔ ان تجاویز پر عمل درآمد کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس شمارے کے بعد کالج گزٹ کا سلسلہ موقوف ہو گیا مگر اس کے ان چار شماروں میں کم از کم اس وقت کی مختلف اور ہمہ جہت سرگرمیاں، واقعات اور اہم معلومات کی تاریخ مرتب ہو گئی۔

اگلے مرحلے میں مجھے کالج کا پہلا میگزین نکالنے کو کہا گیا۔ کالج میں میگزین کی روایت تھی نہ اس سے پہلے مجھے ایسا کوئی تجربہ تھا۔ ایک سو صفحات مع فرنٹ اور بیک ٹائٹل تک محدود کر دیا گیا۔ اس وقت کالج میگزین کے لیے بھی ڈیکلیئریشن لینا ضروری تھی اور یہ کام جوئے شیر لانے کے مترادف تھا کیونکہ اس کے حصول کے لیے صوبائی محکمہ اطلاعات سے تمام خط و کتابت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یعنی ڈپٹی کمشنر کے ذریعے ہوتی تھی۔ کالج میگزین کا نام پہلے سے ہی "بانگ سحر" رکھا جا چکا تھا مگر وہ خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان کے میگزین "پیام سحر" کا چربہ محسوس ہوا لہٰذا ڈیکلئریشن کی درخواست میں تین نام تجویز کیے گئے مگر عدم دستیابی کے باعث کوئی نام محکمہ اطلاعات نے منظور نہ کیا۔ "بانگ سحر" پر اکتفا کرتے ہوئے ایک نئی درخواست بھجوا دی گئی۔ نام تو دستیاب تھا مگر جس پریس سے چھپوانا تھا، اس کا ڈیکلئیریشن بھی ڈی سی کی منظوری کے ساتھ بھجوانا لازمی تھا۔ یوں اس کارروائی میں کئی ماہ لگ گئے۔ اس دوران میگزین کے لیے تیاری مکمل ہو چکی تھی جس کی کہانی "کچھ باتیں" کے عنوان سے لکھے گئے اداریہ میں بیان کی گئی ہے۔ اس میگزین کے لیے افتتاحی یا پہلے شمارے کے لیے فرنٹ اور بیک ٹائٹل کے لیے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کی خوبصورت خطاطی کا انتخاب کیا گیا جو معنویت کا حامل تھا۔ اس شمارے کی مجلس ادارت کے لیے سیاسیات کے استاد منظور شاد نے معاونت کی اور اس میگزین کے طالب علم مدیر و نائب مدیر بالترتیب سال دوم کے ایوب ندیم اور سال اول کے ارشد اقبال تھے۔

1982 کی موسم گرما کی تعطیلات ہونے والی تھیں۔ جس پرنسپل نے وائس پرنسپل کی مشاورت سے مارچ 1980 میں ہمارے تبادلے کرائے تھے اب وہ دونوں ڈائریکٹر اور ڈپٹی ڈائریکٹر کالجز تھے۔ 1982 سے یہ ایک نیا سیٹ اپ تھا جس میں سر رشتہ تعلیمات پنجاب کو کالجوں اور سکولوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور اسی طرح ڈویژن کی سطح پر بھی کالج اور سکول کے ڈائریکٹوریٹ الگ کر دیے گئے تھے۔ بہاول پور ڈویژن میں کالجز

ڈائریکٹوریٹ پہلے ماڈل ٹاؤن اے میں قائم کیا گیا جسے بعد میں یونیورسٹی چوک کے قریب کالج روڈ پر اپنی عمارت میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ پہلے ڈائریکٹر کالجز سید رحمت اللہ شاہ اور ڈپٹی ڈائریکٹر کالجز عبدالعزیز جاوید مقرر ہوئے۔1982 میں انہوں نے ڈویژن بھر میں خاصے ٹرانسفر کیے جس میں کچھ پرانی رقابتوں کا رنگ بھی نمایاں تھا۔ایسے میں میرے جیسے لوگوں کا فائدہ ہو گیا اور مجھے واپس خواجہ فرید کالج میں ٹرانسفر کر دیا گیا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ریمارکس کے خانے میں لکھا تھا،"ان کا تبادلہ اس پوسٹ پر کیا گیا ہے جو ان کے خان پور کالج تبادلے کے وقت خالی ہوئی"۔موسم گرما کی تعطیلات کے ساتھ ہی 12 جون کو فارغ ہوا اور اس سے اگلے دن واپس خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان" دو سال پہلے اپنی خالی کردہ سیٹ" پر جوائن کر لیا۔ایک سال کے موسم گرما کی تعطیلات کو شامل کریں تو خان پور کالج میں، میں نے ایک پورا دو سالہ سیشن گزارا۔1980 کے دوران جب میں یہاں آیا تھا تو سال اول کے داخلے مکمل ہو چکے تھے۔ دو سال کے سیشن کے بعد یہی کلاس جب سال دوم کا بورڈ کا امتحان دے رہی تھی تو میں خواجہ فرید کالج واپس آ گیا اس لیے خواجہ فرید کالج کے اس سیشن کے طلبا میرے لیے اور میں ان کے لیے اجنبی تھا البتہ سال 1980 کے طلبا مجھے پہچانتے تھے۔ وہ اب ڈگری کے طالب علم تھے۔ان دو سال کے دوران میں نے بہت کچھ سیکھا۔اگرچہ دو سال کے عرصے کا بیشتر حصہ جانے آنے میں بیت گیا پھر بھی توانائی کی سطح بہترین تھی اور کسی قسم کی تھکاوٹ یا اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوا۔ سفر خود کامیابی اور علم کا بہترین اور مؤثر وسیلہ ہوتا ہے۔خان پور کالج میں اپنے فرائض کو میں نے اپنی بہترین صلاحیتوں اور انتہائی نیک نیتی سے ادا کر کے بہت کچھ حاصل کیا۔ایک تو مجھے کام کرنے کے باقاعدہ مواقع دیے گئے جو شاید خواجہ فرید کالج کے متعصّبانہ ماحول میں نہ مل پاتے اور جب خان پور کالج میں لائبریری کی بحالی سے لے کر انتہائی محنت طلب تکنیک سے تیار ہونے والا کالج کا خبر نامہ اور کالج کی تاریخ کا پہلا کالج میگزین شائع کیا تو کالج انتظامیہ کی طرف سے اسے سراہا گیا۔ میں نے ہمیشہ اپنی ذمہ داری کو شوق و جذبہ (passion) کے ساتھ صد فیصد ادا کرنے کی کوشش کی۔1980-82 کے سیشن کے دوران خان پور کے یہ اساتذہ یا دوست یاد رہ گئے۔انگریزی کے محمد رمضان بھٹی، محمد عبدالطیف اور ثنا اللہ ملک (مرحوم)، اردو کے صفدر نقوی (نردوش ترابی) اور دانش رضا (دونوں اب مرحومین)، تاریخ کے لاہور سے تعلق رکھنے والے عبدالوحید شاہ جنہیں منچن آباد ٹرانسفر کر کے ڈائریکٹ منتخب ہونے والے اسسٹنٹ پروفیسر عبدالغفار (مرحوم) کو لایا گیا۔فزکس میں لاہور کے محمد امین اور رحیم یار خان کے عبدالغفور (یہ آج کل اسلام آباد میں ہیں)، بیالوجی میں جاوید اختر واہلہ (مرحوم) اور میرے سیلیکشن بیچ میٹ محمد طیب، کیمسٹری میں خدا بخش سومرو، شماریات میں الطاف حسین طور، سیاسات میں غلام سرور صدیقی (مرحوم)، ریاضی کے ظفر حسین اور نبی بخش ملک۔(مؤخر الذکر صوبائی انتظامی سروس میں چلے گئے اور ڈی سی کے رینک تک پہنچے)۔ریاضی کے محمد امین (مرحوم۔کرونا)، سوکس کے منظور احمد شاد، اکنامکس کے چودھری منیر احمد ازیزمان۔ اسلامیات کے سعید

الزمان (مرحوم) اور نفسیات کے رانا فاروق مصطفیٰ (مرحوم)۔صحت و جسمانی تعلیم کے مرزا صفدر بیگ (سرگودھا)اور ڈیمانسٹریٹر حافظ محمد طاہر (مرحوم)۔مرحومین کے علاوہ تمام اساتذہ ریٹائر ہو چکے ہیں۔

جب میں نے واپس خواجہ فرید گورنمنٹ کالج جوائن کیا تو سید محمد سرور زیدی پرنسپل تھے،سید رحمت اللہ شاہ سے یہ سینئر تھے لہٰذا ان کے دور میں ان کی طمانیت کی سطح بہتر نہ رہ سکی اور عموماً احتجاج بھی کرتے پائے گئے۔اب وہ خود پرنسپل تھے۔سٹاف کے ساتھ ان کا ربط بہت کمزور تھا۔چوں کہ زیدی صاحب صادق آباد سے آتے جاتے تھے اس لیے اہم ڈاک وغیرہ کا کام نپٹا کر ڈان اخبار میں حصص کا صفحہ پڑھتے۔وہ فاصلاتی سطح پر رہ کر حصص کا کاروبار کامیابی کے ساتھ کر رہے تھے اور ان کی زوجہ محترمہ گورنمنٹ گرلز کالج صادق آباد میں پرنسپل تھیں۔سرور زیدی اکثر کہا کرتے کہ میں زیدی ہوں پر شیعہ نہیں ہوں۔صبح صادق آباد سے بذریعہ ویگن رحیم یار خان پہنچتے،سائیکل احسن ایجنسیز بالمقابل پوسٹ آفس سے اٹھاتے اور کالج آتے،جلد واپسی کرتے اور سائیکل ویگن سٹینڈ پر رکھ کر ویگن پر واپس چلے جاتے۔ان دنوں ان دو شہروں کے درمیاں ڈالے چلا کرتے جن میں انہیں ترجیحاً فرنٹ سیٹ دی جاتی۔کسی گروپ بندی کے قائل نہیں تھے۔رحمت اللہ شاہ کے جانے کے بعد انتظامی سطح پر غیر جانب داری محسوس کی جا رہی تھی۔رحمت اللہ شاہ کا ذکر آیا ہے تو میں ایک دلچسپ بات عرض کرتا چلوں کہ سید اشرف علی شاہ اکتوبر کے آغاز میں چلے گئے تو چارج زیدی صاحب کے پاس آ گیا،اکتوبر تک کی سالانہ خفیہ رپورٹیں زیدی صاحب نے لکھیں۔مجھے انہوں نے مجموعی طور پر "اچھا" ایوارڈ دیا اور پین پکچر بھی بہت اچھی لکھی۔اصولی طور پر ایک پیریڈ کے لیے ایک اے سی آر ایک رپورٹنگ آفیسر ہی لکھ سکتا ہے۔ 1980 کی موسم گرما کی تعطیلات کے دوران مجھے ایک مہر بند لفافہ بذریعہ ڈاک موصول ہوا جس میں اے سی آر کے ریمارکس سے مجھے مطلع (convey) کیا گیا تھا۔زیدی صاحب کے ریمارکس ٹائپ شدہ تھے۔شاہ صاحب نے میری پہلی اے سی آر خراب کرنے کے لیے اپنے ہاتھ سے بُرے ریمارکس زبردستی اور اے سی آر کے قواعد ضوابط کے خلاف شامل (insert) کر دیے۔''ایک حیلہ جو نوجوان، جوشیلا سوشلسٹ۔'' (An evasive young man, zealous Socialist) یہ اصولی بات ہے کہ ایک مدت کی اے سی آر صرف ایک رپورٹنگ آفیسر ہی لکھ سکتا تھا مگر پنجابی زبان میں اسے "لچ تلنا" کہتے ہیں۔ایسا انہوں نے ان تمام اساتذہ کی سالانہ رپورٹوں کے ساتھ کیا جن کے انہوں نے تبادلے کرائے تھے۔اب واپس زیدی صاحب کی طرف آتے ہیں۔پروفیسر محمد سرور زیدی کالج کے انتظامی امور میں لاپروا ثابت ہوئے تھے۔سٹاف کے درمیان پہلے کی طرح گروہ بندی اور متعصّبانہ فضا میں شدت آ گئی تھی۔اس وقت ڈاکٹر رشید احمد بہاول پور ڈویژن کے ڈائریکٹر کالجز تھے۔شکایت ملنے پر وہ رحیم یار خان آئے اور انہوں نے سٹاف روم میں سٹاف سے خطاب کیا اور کہا کہ آپ لوگ "بندے" بن جائیں ورنہ میں سخت کارروائی کروں گا۔ان کے بعد پرنسپل زیدی صاحب کی باری تھی سو وہ اپنے خطاب میں یکسر مختلف انداز اختیار کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے" آپ لوگ گروہوں سے

ماورا ہو کر کام کریں اور کالج انتظامیہ کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ دیں۔ اگر مجھے آپ سے شکایت ہوئی تو میں اوپر لکھوں گا تو ہی آپ کے خلاف کارروائی ہوگی۔ اگر میں مطمئن ہوں گا تو آپ کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا''۔ سید سرور زیدی جیسا دبنگ پرنسپل ہی ڈائریکٹر کی موجودگی میں یہ بات کر سکتا تھا۔ ایک دن حسب معمول زیدی صاحب ڈان اخبار میں حصص کے مطالعہ میں گم تھے کہ ڈپٹی کمشنر ملک محمد اکرم آ گئے اور ان کے سامنے بیٹھ گئے۔ انہیں خبر ہی نہ ہو سکی۔ کسی سٹاف ممبر نے انہیں بتایا کہ جناب مہمان آئے ہوئے ہیں۔ اخبار ایک طرف کیا تو ڈی سی نے ان کو سلام کیا۔ یہ کہنے لگے کہ آپ کو کہیں پہلے بھی دیکھا ہے۔ بتائیں کیسے آنا ہوا۔ ڈی سی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور کہنے لگے کہ میں ادھر سے گزر رہا تھا تو سوچا کہ آپ سے ملتا جاؤں۔ اجازت دیجئے میں چلتا ہوں۔ زیدی صاحب نے بیٹھے بیٹھے ہی ان سے ہاتھ ملا کر ڈی سی کو رخصت کر دیا۔

پروفیسر زیدی کی پرنسل شپ میں کالج میں ایک ایسا المیہ وجود میں آیا جو کالج کی تاریخ کا ایک سیاہ باب بن گیا۔ احسن انجینیئرز کے مالک کا اکلوتا بیٹا مجیب احسن کالج کا طالب علم تھا۔ طلبا کی باہمی لڑائی میں وہ شدید زخمی ہو گیا۔ زیدی صاحب کو بتایا گیا تو یہ پراکٹوریل بورڈ کے چیئرمین کو ہدایات دے کر گھر روانہ ہو گئے۔ مجیب احسن کو کالج سے ملحقہ ہسپتال وقت پر نہ پہنچایا جا سکا اور بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اس کی بنیادی وجہ کالج انتظامیہ کی نااہلی اور غیر ذمہ داری ہی قرار پائی۔ مجیب احسن کے والد رو رو کر یہی کہتے رہے کہ کاش میرے بیٹے کو چند قدم پر موجود ہسپتال پہنچا دیا جاتا۔ کالج انتظامیہ نے اپنی نالائقی سے میری دنیا اجاڑ دی!! یہ واقعہ پرنسپل زیدی کے تبادلے کا باعث بن گیا۔ چار سو کنال پر پھیلا ہوا خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خاں اپنی سہولتوں اور مرکزیت کی وجہ سے ایک بہترین تعلیمی "برانڈ" کا نام تھا جو ضلع بھر کے طلبا کے لیے پرکشش تھا۔ صادق آباد اور خان پور کے کالجوں میں ڈگری کلاسز نہیں تھیں تو ان شہروں کے طلبا ڈگری کی تعلیم کے لیے اسی کالج سے رجوع کرتے۔

یہاں میں ایک اور بات کی نشان دہی کرتا چلوں کہ فزکس، کیمسٹری، ریاضی، بیالوجی، انگلش اور اردو مضامین کے اساتذہ بہت بڑے "ٹیوشنرز" بننے کی طرف رواں دواں تھے اور اسی رجحان نے دس سال کے بعد کالج کو "ٹیوشن لابیز" میں بدل دیا اور پھر ایسا دور بھی آیا کہ طلبا کی سہولت کے لیے پری میڈیکل اور پری انجینئرنگ اور لازمی مضامین کے اساتذہ اپنی لابیوں کے مطابق اپنے مکان کرائے پر دے کر ایک دوسرے کے قریبی ہمسائے بن گئے تا کہ طلبا و طالبات کو ٹیوشن کے لیے تمام مضامین کے اساتذہ کا ''سیٹ'' ایک ہی محلے یا سڑک پر دستیاب ہو سکے۔ اسی دور کا ایک دلچسپ واقعہ بھی سنتے جایئے۔ جنرل سوار خان پنجاب کے گورنر تھے۔ وہ رحیم یار خان کے دورے پر آئے تو ان کا ہیلی کاپٹر پائلٹ کی غلطی سے کالج کے ساتھ واقع مخدوم حسن محمود سٹیڈیم کے ہیلی پیڈ پر اتر گیا۔ طلبا نے یہ دیکھا تو وہاں اکٹھے ہو گئے۔ جنرل صاحب بہت خوش ہوئے اور سمجھے کہ طلبا میرے استقبال کو آئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ کا کوئی مطالبہ ہے۔ طلبا نے کہا کہ ہمارے کالج

میں ہوسٹل کی بہت کمی ہے۔انہوں نے اپنے اے ڈی سی کو نوٹ کروایا اور جلد ہی ہوسٹل کی منظوری کا ڈائریکٹو موصول ہو گیا جس کا پی سی ون منظور کرایا گیا اور جون 1985 میں یہ ہوسٹل مکمل ہو گیا جسے ڈگری کے طلبا کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ اس ہوسٹل کا نام لیاقت ہال رکھا گیا۔ دسمبر 1982 میں سٹوڈنٹس یونین کے آخری انتخاب ہوئے، اس کے بعد پابندی لگا دی گئی۔ پی ایل اے کے الیکشن کے دوران خوب مہم چلا کرتی۔ انتخاب کے دن پولنگ ایجنٹ کے طور پر اپنے گروپ کی طرف سے میری ڈیوٹی لگائی جاتی۔ گنتی کے دوران در آنے والی ٹینشن کو میں اپنے طریقے سے تحلیل کر دیا کرتا۔ میری اعتدال پسندی اور بہتر اخلاق، معاشرتی اور علمی رویے سے جماعت سے وابستہ بہت سے اساتذہ سے میرے بہت اچھے تعلقات رہے۔ 3 جولائی 1985 کو وائس پرنسپل اور 1954 کے سیلیکشن بیچ سے تعلق رکھنے والے فارسی کے استاد عبدالعزیز جاوید ریٹائر ہو گئے۔ وہ یقیناً ایک بڑے سکالر تھے لیکن میرے جیسے لبرل لوگوں کے سخت خلاف تھے بلکہ وہ اس حد تک چلے جاتے کہ ذاتی مجلس میں یہ کہتے پائے گئے کہ ایسے لوگوں کو نجانے کیوں سیلیکٹ کر لیا جاتا ہے۔ انہیں 1980 کے تبادلوں کا محرک یا ماسٹر مائینڈ بھی تصور کیا جاتا رہا ہے مگر میں نے ان کی بزرگی اور علمیت کے پیش نظر ان کا ہمیشہ احترام کیا۔

سید محمد سرور زیدی کے تبادلے کے بعد معاشیات کے اسسٹنٹ پروفیسر سید الطاف الحق بخاری کو پرنسپل کا اضافی چارج دے دیا گیا۔انہوں نے 5 جون 1985 کو چارج سنبھالا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے بڑے جوش و جذبے کے ساتھ کام کا آغاز اور نئی روایات قائم کرنے کا عزم ظاہر کیا۔انہوں نے ہر ممکن غیر جانبداری سے کام لینے کی کوشش کی۔ ان کا مضمون معاشیات تھا اور اس کی تدریس میں باقاعدگی کے حوالے سے ان کے نام کے آگے ہمیشہ سوالیہ نشان لگا رہا مگر پرنسپل کا اضافی چارج ملنے کے بعد ان کے اندر کا منتظم جاگ اٹھا۔انہوں نے اساتذہ کی غیر تدریسی اور اضافی ڈیوٹیز میں دونوں گروہوں میں توازن قائم رکھنے کی کوشش کی اور " کسی کام کے لیے موزوں فرد" کو بھی بنیاد بنایا۔ان کی کوشش تھی کہ نئے اور ریگولر پرنسپل کی آمد سے پہلے وہ اپنے یادگار نقوش مرتب کریں۔ 31 اکتوبر 1985 کو کل پاکستان مشاعرے کا انعقاد، کالج گزٹ کی باقاعدہ اشاعت کا آغاز۔ مختلف قومی اور مذہبی اہمیت کے دنوں کی مناسبت سے تقاریب کا انعقاد، کھیلوں اور ٹورنامنٹس میں باقاعدگی اور 30 مارچ 1986 کو کانووکیشن کے انعقاد سے کالج کی تدریسی اور غیر تدریسی فضا متحرک ہو گئی۔ ان کے پہلے دور میں 28-27 نومبر 1985 کو دو روزہ سائنسی نمائش کے انعقاد نے کالج کو شہریوں کے بہت قریب کر دیا۔ اگرچہ اس سے ایک ماہ قبل مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں کالج ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی، اسی طرح سائنسی نمائش کے دو دنوں میں شہریوں کی بہت بڑی تعداد نے سائنسی نمائش کو دیکھا اور اس اقدام کی دل کھول کر تعریف و تحسین کی گئی۔ ان کی ہدایت پر میں نے بطور مدیر کالج گزٹ کا آغاز کیا۔ ستمبر 1985 سے شروع ہونے والا سفر تین تعلیمی سالوں پر محیط ہو گیا۔ یہ کالج ڈویژن بھر میں دوسرا بڑا

کالج ہے اس لیے یہاں فنڈز کی کمی کا مسئلہ نہیں تھا اور کالج گزٹ کے نام سے خبرنامے کی تعداد اشاعت بھی طلبا کی تعداد کے مطابق خاصی معقول تھی۔ طریقِ کار یہ تھا کہ پہلے شمارے کا مسودہ تیار کیا جاتا جو کاتب کے حوالے کر دیا جاتا۔ پھر کاتب کے پاس بیٹھ کر کاپی جوڑنے اور اس کی سرخیوں سمیت زیادہ سے زیادہ تزئین و آرائش کی کوشش کی جاتی۔ یہ تمام عمل میں ذاتی نگرانی میں مکمل کراتا۔ تمام نئے تصورات کو اس میں سمونے کی کوشش کی جاتی۔ ایک بہتر پہلو یہ تھا کہ طباعت سے پہلے مرحلے کی تکمیل کے لیے کسی پیشہ ور کاتب کی بجائے کالج ہی کے ایک سابق طالب علم سید عابد علی کی خدمات حاصل تھیں۔ وہ تخلیقی ذہن کا مالک تھا اور جدت پر مبنی تجاویز کو مکمل طور پر سمجھ لیتا تھا اور عمل بھی کرتا تھا۔ اس ضمن میں ان سے اچھی ذہنی ہم آہنگی قائم ہو گئی۔

خواجہ فرید گورنمنٹ کالج کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اساتذہ کی گروپ بندی کی وجہ سے حساسیت کا ماحول تھا اور پرنسپل کو دونوں گروپوں کی وجہ سے پھونک پھونک کر کوئی بھی اقدام اٹھانا پڑتا تھا۔ مثلاً کالج گزٹ کو لے لیں۔ اس کو بڑی احتیاط سے مرتب کیا جاتا اور یوں سمجھیں کہ سیلف سینسر سے کام لیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ کالج بس کو کے ایل پی روڈ پر اس وقت حادثہ پیش آیا جب کچھ اساتذہ تبلیغی اجتماع میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ مقصد تو بس کے حادثے کی خبر دینا تھی، ساتھ سبب بھی بتانا تھا تو دوسرے فریق نے فوراً اعتراض کیا کہ اگر یہ خبر دی گئی ہے تو ہمارے لاہور میں ہونے والے جلسے کی خبر بھی دی جائے جس میں اسی کالج کے اساتذہ نے بھی شرکت کی تھی۔ پرنسپل نے ادارت کے لیے مجھے مقرر کیا تھا، جب میں نے چار شمارے کامیابی کے ساتھ نکال لیے اور گزٹ مقبول ہونے لگا تو دوسرے گروپ نے پرنسپل سے کہا کہ گزٹ کی ادارت میں ہمارے گروپ کا استاد بھی رکھیں۔ جب پرنسپل نے مجھے مسئلہ بتایا تو میں نے ایک ایسے استاد کو رکھا کہ جو میرا شاگرد بھی تھا اور اب کولیگ بھی۔ اس نے مجھے کہا کہ جناب میرا صرف نام آئے گا، کام تو پہلے کی طرح آپ ہی کریں گے، میرا نام تو محض بھرتی کا ہو گا تاکہ شکایت کنندگان مطمئن ہو سکیں اور اس طرح میں ہی حسبِ معمول کام کو آگے بڑھاتا گیا۔ ہر شمارہ ایک ارتقائی عمل کے تحت پہلے سے بڑھ کر ضخیم، تزئین و آرائش کا مرقع اور اطلاعات اور مواد کی رو سے پہلے سے بہتر ہوتا اور اس طرح اپریل 1985 سے مئی 1986 تک کے تعلیمی سال کے دوران 8 شمارے شائع ہوئے اور یوں پہلی جلد مکمل ہو گئی۔

کالج گزٹ کی پہلی جلد یا پہلے سال کے ابھی سات ماہانہ شمارے شائع ہوئے تھے کہ کالج کے ریگولر پرنسپل برکت علی سہروردی نے انیسویں گریڈ میں بطور پروفیسر ترقی کے بعد 30 اپریل کو خواجہ فرید گورنمنٹ کالج کے نئے پرنسپل کا چارج سنبھال لیا۔ اس سے قبل وہ گورنمنٹ (انٹر) کالج بہاول پور کے پرنسپل تھے اور اس کالج کا اضافی چارج ابھی ان کے پاس تھا۔ جمات اسلامی گروپ کے لیے ان کی شخصیت متنازعہ تھی۔ ان کے بارے میں ان کے آنے سے پہلے ہی مشہور کر دیا کہ ایک خطرناک شخص پرنسپل بنا کے لایا جا رہا ہے۔ یہ بات میں پہلے بھی کر چکا ہوں کہ کالج کیڈر ابھی تین درجاتی تھا۔ لیکچرر کی پوسٹیں کلاسیفائیڈ تھیں جب کہ اسسٹنٹ

پروفیسر گریڈ اٹھارہ اور پروفیسر گریڈ 19 نان کلاسیفائیڈ تھیں۔ ڈگری کالج کے پرنسپل کی سیٹ 19 ویں سکیل کے پروفیسر کی تھی۔ سید الطاف الحق بخاری اسسٹنٹ پروفیسر اور وائس پرنسپل تھے لیکن انہوں نے انچارج پرنسپل کی حیثیت سے لاجواب کارکردگی دکھائی تھی۔ پروفیسر سہروردی کا اپنا منفرد انتظامی اسلوب تھا، اگرچہ وہ جماعت کے گروہ کے کبھی پسندیدہ شخصیت نہیں ہوسکتے تھے مگر انہوں نے اس بات کی کبھی پروا نہیں کی۔ وہ اپنے انداز میں کالج کی ترقی میں مصروف ہوگئے۔ انہوں نے دونوں گروپوں کے اساتذہ میں ڈیوٹیز کا توازن برقرار رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ انہوں نے کالج کے خبرنامے " کالج گزٹ " کی روایت کو سراہتے ہوئے اسے جاری رکھنے کی ہدایت کردی اس طرح اپریل تا مئی 1986 کا شمارہ ان کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر سہروردی نے سب سے پہلے ضابطہ ہائے اخلاق برائے طلبا، والدین، صدر ہائے شعبہ جات، اساتذہ، ڈیوٹی آفیسرز اور ہاؤس سسٹم و ٹیوٹوریل گروپ سکیم جاری کیے۔ سوسائٹیز کی تشکیلِ نو اور انفراسٹرکچرل اقدامات کی طرف توجہ دی۔ اسی سال کالج کے بیالوجی کے ایک قابل استاد اور ہمارے پیارے دوست جناب اظہر چودھری 8 جولائی 1986 کو وفات پا گئے۔ پروفیسر سہروردی نے ان کی یاد میں کالج میگزین میں ان کے لیے گوشہ مختص کرایا تاکہ ان کی یادیں اس کالج کی تاریخ بن جائیں۔ تنظیمِ نو کے تحت اکیڈیمک، فنانس، سپورٹس اور ہم نصابی سرگرمیوں کے وائس پرنسپل پہلے چار سینئر اساتذہ کو مقرر کیا۔ 1987 کے پروموشن ٹیسٹ میں پوزیشن ہولڈرز کو پاکستان کے مختلف شہروں کا مطالعاتی دورہ کرایا۔ سہروردی صاحب کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے۔ نئے نئے آئیڈیاز متعارف کراتے۔ ان کے دور میں کالج کے انفراسٹرکچر میں نہ صرف بے حد اضافہ ہوا بل کہ پہلے سے موجود سہولتوں کی کوالٹی کو بہتر بنایا گیا۔ ان کا ایک ذاتی منی ٹائپ رائٹر تھا جس پر کچھ نہ کچھ ٹائپ کرتے رہتے تھے۔ 1987 میں ڈاکٹر عبدالغفور بلوچ کا انتقال ہوا تو چوں کہ وہ کالج کے مستقل ڈونر تھے اور انہوں نے میانوالی قریشیاں کے مخدوم ایم پی اے یا ایم این اے سے بھی گرانٹس لے کر دیں اس لیے اس سال یعنی 1988 کے کالج میگزین میں ان کے لیے بھی گوشہ مختص کیا گیا۔ بنیادی طور پر وہ ایک محنتی اور ہمہ وقتی پرنسپل تھے۔ ان کی سوچ اور عمل کا محور کالج اور اس کی تعلیمی اور فزیکل ترقی تھی۔ ان کا دور کالج کے لیے بھرپور اور بہترین رہا۔ کالج میں کتابوں کی نمائش سے شہر کا سارا پڑھا لکھا طبقہ اکٹھا کرلیا۔ ان کے تین سال کے تین پراسپیکٹس میں نے عام روش سے ہٹ کر لکھے جن میں اتنی معلومات تھیں کہ اسے پھینکنا آسان نہیں تھا بل کہ ہوسٹل کے پراسپیکٹس کی روایت کا بھی آغاز کیا جنھیں پسند کیا گیا۔ ایک بار ان کی طرف سے ایک قسم کی جرات کا مظاہرہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کالج میں کسی وجہ سے ایجی ٹیشن ہوئی تو چھٹی کی گھنٹی بجوانے کی بجائے یہ طلبا میں گھس گئے اور انہیں کلاسز میں جانے کی تاکید کی اور تھوڑی دیر کے بعد تدریسی سرگرمیاں بحال ہوگئیں۔ وہ شام کو بھی کالج آکر دفتر کا کام کرتے رہتے۔ اس کے بعد موسم گرما کی تعطیلات برائے سال 1986 کا 7 جون سے آغاز ہوگیا۔ موسم گرما کی تعطیلات ختم ہوئیں اور داخلے مکمل ہوگئے تو مجھے کالج کا خبرنامہ شروع کرنے

کی تاکید کی۔ 87-1986 کے تعلیمی سال میں دوسرے سال یا دوسری جلد کے 8 شمارے شائع کیے گئے جن میں کئی شمارے 50 صفحات تک بھی پہنچ گئے۔ تیسرے تعلیمی سال کے دوران بھی کالج گزٹ کی روایت جاری رہی۔

تین سال کے دوران کل 300 صفحات پر مشتمل کالج گزٹ کی تین جلدوں اور 18 شماروں کی یہ ضخامت کالج کی تاریخ کا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ یہ کام جنون کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ پہلے شمارے سے آخری شمارے تک کتابت و کیلی گرافی کی تخلیقیت کے ساتھ ساتھ اس کے مطالعاتی مواد کی کوالٹی میں ایک ارتقائی عمل نظر آتا ہے۔ سکرپٹ سے طباعت تک کے تمام مراحل کی ایک ایک سطر میں مدیر کا جنون اور کام سے وابستگی اور مکمل لگن نظر آتی ہے۔ کمپیوٹر کا دور دور تک نام نہیں تھا۔ 300 صفحات کے کالج گزٹ کے یہ تمام شمارے خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان کی تین سال کی تاریخ کا معتبر حوالہ بن چکے ہیں۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ کالج گزٹ کے آخری شمارے کے دوران پرنسپل پروفیسر برکت علی سہروردی تبدیل ہو گئے اور پروفیسر سید الطاف الحق بخاری پہلے کی طرح انچارج کے برعکس مستقل یا باقاعدہ پرنسپل کے طور پر مقرر ہوئے۔

خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان ضلع بھر میں اپنے مئوثر تعلیمی کیلنڈر اور اس کے تحت وقوع پذیر ہونے والی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کے لیے بہت معروف تھا۔ تعلیمی سال کے دوران متنوع قسم کی سرگرمیاں جاری رہتیں۔ کلاسوں کے علاوہ مختلف تقاریب کے ذریعے شام تک کالج میں خوب رونق لگی رہتی۔ اس کے کھیل کے میدانوں میں کہیں طلبا فٹ بال یا ہاکی اور کرکٹ کھیل رہے ہوتے جب کہ کالج ہال میں بیڈمنٹن کا کھیل جاری رہتا۔ بین الجماعتی ٹورنامنٹ، بورڈ اور یونیورسٹی کی بین الکلیاتی کھیلوں کی اپنی اہمیت ہوتی۔ کالج کی تین ہوسٹلیں تھیں جن میں جناح ہوسٹل برائے انٹرمیڈیٹ طلبا میں مختلف سرگرمیوں کے نتیجے میں ایک سالانہ تقریب ہوتی، اس تقریب کا ایک منفی پہلو یہ تھا کہ اس میں سٹاف کے لیے مزاحیہ تحائف دیے جاتے۔ چوں کہ یہ ہوسٹل زیادہ تر جماعت کے ہمدرد سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے زیر انتظام رہا اس لیے اس موقع پر دیے گئے تحائف میں ان کے مخالف اساتذہ کے لیے تضحیک کا پہلو نمایاں ہوتا، جب میں نے یہاں 1979 میں جوائن کیا تو یہاں کے اساتذہ کے ذریعے پرائیویٹ ٹیوشن کا رواج پڑ چکا تھا اور مستقبل قریب میں یہ ایک بڑے مظہر (Phenomenon) کے طور پر سامنے آیا جس کا ذکر میں نے انہی سطور میں کہیں کیا ہے۔

میں نے ابتدا میں بتایا تھا کہ جماعت اسلامی کا گروہ پروفیسر سہروردی کا مخالف تھا اور وہ کسی ایسے موقعے کی تلاش میں تھے کہ ان کو یہاں سے شفٹ کرایا جائے۔ کالج کے سینئر سٹاف میں بخاری صاحب اور فزکس کے حشمت علی اسلم نے تمام مدت کے دوران پرنسپل کی کھل کر حمایت کی تھی اس لیے مخالف گروہ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ چوں کہ سید الطاف الحق بخاری کی 19 ویں گریڈ میں پروموشن ہو چکی تھی لہٰذا انہوں نے ہی پرنسپل بننا تھا۔ بخاری صاحب کالج میں واقع شیخ زاید کی تحفے میں ملی ہوئی مسجد کے خطیب تھے اور انہیں اس کا

ماہانہ معقول مشاہرہ ملتا تھا۔ وہ خود بھی مالی طور پر انتہائی آسودہ آدمی تھے۔ بخاری صاحب نے مسجد کی اسائیمنٹ کے لیے کسی اور کو رکھا ہوا تھا۔ پرنسپل جناب سہروردی نے ابوظہبی کے پاکستانی پی آر او اور ابوظہبی پیلس کے امام اور خطیب علامہ اللہ بخش قادری الازہری کو لکھ بھیجا کہ ایک سرکاری ملازم دو نوکریاں نہیں کر سکتا۔ بخاری صاحب کا مشاہرہ بند کر کے کسی اور مستحق کو مسجد کے خطیب کا کام دے دینا چاہیے تاکہ ایک چولھا اور جل سکے۔ علامہ قادری ازہری بخاری صاحب کے دوست تھے اس لیے وہ خط بخاری صاحب کے پاس پہنچ گیا اور بخاری صاحب ان کے مخالفین سے مل گئے۔ طرفہ تماشا یہ ہوا کہ دوسرے سینئر استاد حشمت علی اسلم بخاری صاحب کے بہترین دوست اور شاید پیر بھائی تھے، بتایا گیا کہ پروفیسر سہروردی نے ان کے خلاف بھی کارروائی کے لیے ڈیپارٹمنٹ کو لکھ دیا۔ ہم نے کئی بار پوچھا کہ کیا انہوں نے حشمت صاحب کے خلاف کچھ لکھا ہے تو وہ اقرار نہیں کرتے تھے۔ جماعت والے بہت ہشیار تھے، انہوں نے کچھ لوگوں کی ڈیوٹی لگائی کہ ان کے ٹائپ رائیٹر کے استعمال شدہ کاربن پیپر جمع کیے جائیں پھر کاربن پیپر پر لکھے گئے الفاظ یا عبارت کو ڈی کوڈ کیا جائے۔ آخر کار حشمت صاحب کے خلاف لکھا جانے والا خط استعمال شدہ کاربن پیپرز کی مدد سے ڈی کوڈ (decipher) کر کے انہیں دکھا دیا گیا۔ اس طرح یہ دونوں سینئر اساتذہ نے جماعت کے ساتھ مل کر ان کے خلاف درخواست بازی شروع کر دی۔ اس وقت کے ڈائریکٹر ایجوکیشن کالجز بہاول پور ڈویژن قاضی عبدالرحمان نے رحیم یار خان کا دورہ کیا۔ وہ کالج میں پائے جانے والے کھچاؤ کے پس منظر میں کارفرما حقائق جاننا چاہتے تھے۔ کالج کی رہائش گاہ میں مقیم اکنامکس کے استاد جناب محمد بوٹا نے چند دوستوں کی ملاقات اپنے گھر میں ان سے کرائی۔ بات کرنے کا قرعہ میرے نام نکلا اور میں نے کہانی کے رنگ میں بالترتیب تمام حقائق کہہ سنائے جس سے ان کو پس منظر کا علم ہوا۔ دوستوں نے بیان کی بڑی داد دی مگر شام تک ساری روداد ان کے مخالفین کے پاس جا چکی تھی جس کا خمیازہ مجھے مستقبل قریب میں بھگتنا تھا۔ پروفیسر سہروردی کے ساتھ ایک اور اختلاف بھی تھا جس کے بارے میں کم لوگ جانتے ہیں۔ ابوظہبی کے حکمران سلطان النہیان نے جہاں خواجہ فرید گورنمنٹ میں شاندار مسجد اور بے مثال پبلک لائبریری کا تحفہ دیا وہاں ضلع رحیم یار خاں کے انٹر کر کے میڈیکل اور انجینئرنگ میں جانے والے طلبا کے لیے غالبًا ابوظہبی سکالرشپ کے نام سے دس وظائف بھی جاری کیے جن کی مدت پانچ سال کی تھی اور اس وظیفے کے لیے انتخاب پرنسپل کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ یہ وظائف آغا حسن عابدی کے بی سی سی آئی بنک کے توسط سے تقسیم ہوتے تھے۔ سہروردی صاحب کے آنے کے بعد ان وظائف پر حاصل ان لوگوں کی اجارہ داری بھی جاتی رہی۔ اس کا بھی انہیں بہت کلک تھا۔ شاید اب وہ وظائف ختم کر دیے گئے ہیں اور ابوظہبی والے مسجد کے خطیب، مؤذن اور لائبریرین کو جو ماہانہ اعزازیہ اور مسجد کی مرمت کے لیے گرانٹ دیتے تھے وہ بھی کبھی کے بند ہو چکے ہیں۔

1988 کی این سی سی پاسنگ آؤٹ پریڈ کے مہمان خصوصی ڈائریکٹر بہاول پور ڈویژن تھے۔ میں

کمنٹری اور انا ؤنسمنٹ پر تھا۔ جیسے ہی تقریب شروع ہوئی تو مخالفین کی رہنمائی میں پہلے سے تیار شدہ پروگرام کے مطابق جماعت کے ہمدرد طلبا نے سہروردی صاحب کے خلاف شدید نعرہ بازی شروع کر دی۔ ڈائریکٹر نے اس بات کا بہت برا منایا اور ایک شنید کے مطابق سہروردی صاحب کو ڈیرہ نواب کالج شفٹ کرا دیا جہاں درخواستوں کی روشنی میں ان کے خلاف ایک انکوائری کی روشنی میں دو اضافی ترقیاں ضبط ہوئیں مگر بعد میں بحال کر دی گئیں اور سہروردی صاحب وہیں پر ریٹائر ہوئے۔ بہاول پور منتقلی کے بعد میری ان کے گھر ایک دو ملاقاتیں ہوئیں۔ بعد میں ان کے بارے میں سنا کہ بیٹے کے پاس کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ کچھ عرصے بعد ان کی رحلت کی خبر سنی۔ کالج گزٹ پر کی گئی محنت کی وہ اکثر میری تحسین کرتے تھے۔ جس طرح اساتذہ میں تحقیق و تدریس کی دونوں خوبیاں کم ہی یکجا دیکھی جا سکتی ہیں اسی طرح سربراہان ادارہ میں کچھ تدریسی اور کچھ انفرا سٹرکچر کے شعبوں پر زیادہ محنت کرتے ہیں، دونوں شعبوں میں توازن اور یکساں محنت کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے اس طرح اگر پروفیسر سہروردی کو دیکھا جائے تو ان کا زور زیادہ تر انفرا سٹرکچر کی ترقی اور توسیع پر رہا۔ ایک دن میں نے دوران گفتگو کہہ دیا کہ جناب آپ نے انفرا سٹرکچر پر زیادہ زور دیا جب کہ تدریسی سرگرمیاں زیادہ فعال نہیں رہ سکیں۔ میری بات سن کر سنجیدہ سے ہو گئے اور خاموشی اختیار کی۔ ان کے مقابلے میں سید الطاف الحق بخاری نے انچارج شپ کے دوران انفرا سٹرکچر کی طرف کم دھیان دیا اور کلاسز کو چیک کرنے کا ایک جاسوسی کا نظام وضع کرنے کے ساتھ ساتھ درجہ چہارم کے ایک ملازم حق نواز کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ ہر پیریڈ کے آغاز میں اساتذہ سے خالی کمروں کے نمبر لکھ کر لایا کرے سو اس نے ایسے ہی کرنا شروع کر دیا۔ خالی کمروں کو ٹائم ٹیبل کی روشنی میں چیک کر کے ان اساتذہ کے نام لکھے جاتے جن کے کمرے مبینہ طور پر خالی ریکارڈ کیے جاتے۔ پھر پرنسپل باری باری ان اساتذہ کو بلا کر ان سے وضاحت طلب کرتے۔ چند اساتذہ کا جواب ہوتا کہ وہ اتفاقی رخصت پر تھے۔ چند کہتے کہ میں کلاس ہی میں تھا میرا کمرہ خالی نہیں تھا، دیگر کہتے کہ میں دو چار منٹ دیر سے پہنچا اس سے کیا فرق پڑتا ہے، نصاب تو میں اپ ٹو ڈیٹ پڑھا رہا ہوں۔ درجہ چہارم کے ملازم حق نواز کی اہمیت دو چند ہو چکی تھی اور چند سٹاف کے ارکان اسے کہتے: حق نواز صاحب، میں تو کلاس میں حاضر تھا یا ایک دو منٹ ہی لیٹ تھا آپ نے میرا کمرہ ناحق خالی لکھ دیا۔ حق نواز صورت حال سے لطف لینے لگا اور چند اساتذہ نے پس منظر میں اس سے تعلق استوار کرنے شروع کر دیے جس کے انکشاف کے بعد یہ طریق کار ترک کر دیا گیا۔ بخاری صاحب کے حوالے سے ایک اور واقعہ خاصا دلچسپ تھا جسے ان سے منسوب کیا گیا۔ ان کے کسی سابق طالب علم یا شاید رحیم یار خاں سے باہر کے کسی دوست نے ان کو پیش کش کی وہ گتے کا کارخانہ قائم کریں جس کے لیے وہ انویسٹ منٹ کرنے کو تیار ہیں۔ ضروری کارروائی کے بعد صادق آباد بائی پاس پر کہیں کارخانے کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اب اس کارخانے کے لیے سکریپ کی ضرورت پڑی تو انہوں نے درجہ چہارم کے ملازمین کو سکریپ جمع کرنے کی ذمہ داری لگا دی جو مبینہ طور پر سکریپ جمع کرنے کے لیے سارے

شہر میں پھیل گئے۔ اسے افسانہ تصور کر لیا جائے مگر یہ البتہ حقیقت ہے کہ گتے کی کیمیکل ریسپی کے لیے انہوں نے شعبہ کیمیا کے چند اساتذہ کی خدمات ضرور حاصل کیں۔ ان کے بارے میں اس رائے کا اظہار بھی کیا گیا کہ بخاری صاحب اپنے مضمون اکنامکس کے خوب اور بہتر استعمال کا ہنر جانتے تھے۔

اس وقت سید الطاف الحق بخاری انیسویں گریڈ میں ترقی پا کر اسی کالج میں پروفیسر کی ایک اور موجود سیٹ پر ایڈجسٹ ہو چکے تھے لہٰذا پروفیسر سہروردی کے بعد انہوں نے ریگولر پرنسپل کا چارج سنبھال لیا۔ یاد کریں کہ میں نے ڈائریکٹر کے سامنے جو حقائق من و عن رکھے وہ بخاری اینڈ کمپنی کو بہت برے لگے اور میرے بارے میں ایک طرح کا مخالفانہ تاثر ان کے ذہن میں جاگزین ہو چکا تھا۔ سید الطاف الحق بخاری تقریباً ایک سال انچارج پرنسپل رہے تو انہوں نے کالج کو پورا ٹائم دیا اور بہت اچھے نقوش چھوڑے۔ پروفیسر سہروردی جب ریگولر پرنسپل بنے تو یہ وائس پرنسپل بن گئے۔ اب جب یہ تدریس کی طرف لوٹے تو اپنا پرانا اُسلوب اختیار کر لیا۔ کالج میں ان کی تدریسی موجودگی کم ہو گئی تھی۔ ترقی تو پہلے پا چکے تھے اور کالج میں پروفیسر کی دوسری سیٹ پر ایڈجسٹ ہو چکے تھے۔ دو اڑھائی سال کے بعد اب کی بار وہ ریگولر پرنسپل بنے تو ان کا انچارج شپ والا رویہ نہیں رہا تھا۔ پروفیسر سہروردی جاتے جاتے پہلے تین سینئیر اساتذہ کی سالانہ خفیہ رپورٹس میں برے ریمارکس دے گئے جنہیں ڈی پی آئی کالجز ہی ختم کر سکتا تھا۔ اس گروپ کی خوش نصیبی کہ نومبر 1989 میں پروفیسر سعدیہ خاور چشتی ڈی پی آئی کالجز مقرر ہوئیں۔ وہ تصوف کی طرف بہت زیادہ مائل تھیں اور فیصل آباد والے بابا جی سالا روالے کی مرید تھیں لہٰذا انہیں خواجہ فرید گورنمنٹ کالج کے پرنسپل نے رحیم یار خان نے کی طرف سے دعوت دی گئی۔ وہ جب یہاں تشریف لائیں تو ان کو تحصیل صادق آباد کے قصبے بھونگ کی آغا خاں ایوارڈ یافتہ معروف ترین مسجد دکھائی گئی اور شاید ایک دو معروف ترین مزاروں پر ان کے سجادہ نشینوں سے استقبال بھی کرایا۔ رحیم یار خان کی میونسپل کمیٹی کے ہال کی چھت پر مرکری ٹیوبوں سے کلمہ طیبہ لکھ کر ہال پر خاصی بلندی پر لگایا گیا تھا جو رات کو روشن ہوتا تو بہت دور سے نمایاں نظر آتا۔ ادھر سے گزرتے ہوئے جب ڈی پی آئی کی نگاہ اس پر پڑی تو انہوں نے بہت زیادہ پسند کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ آئندہ دنوں میں ویسی ہی مرکری ٹیوبوں کی تکنیک سے لکھا ہوا کلمہ طیبہ ڈی پی آئی کالجز لاہور کی عمارت پر لگا دیا گیا۔ اس طرح سینئر اساتذہ کی سالانہ خفیہ رپورٹوں سے قابل اعتراض ریمارکس کو حذف کر دیا گیا۔ اب یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ڈی پی آئی کالجز کی عمارت پر کلمہ طیبہ کی تنصیب کے اخراجات متعلقہ سینئر اساتذہ نے برداشت کیے یا انہیں کالج کے فنانسز میں ایڈجسٹ کیا گیا۔ بہر حال ہر وہ استاد جو پروفیسر سہروردی کی حمایت میں تھا اس کے لیے ان کے دل میں نرم گوشہ نہیں رہا تھا۔ میں جب ڈائریکٹ سیلیکشن کے ذریعے اسسٹنٹ پروفیسر بنا تو خیال یہ تھا کہ اپنی یہیں کی سیٹ اپ گریڈ کرا لوں گا۔ وقت سے پہلے ہی انہوں نے میرے کسی دوست کو کہا کہ " نسیم بلوچ اب بھول جائے کہ وہ اس کالج میں رہے گا۔" پیغام مجھے مل چکا تھا لیکن وڈلاک کی بنیاد پر سیٹ اپ

گریڈ کرنے کی میری درخواست پر پرزور سفارش بھی کردی لیکن مجھے گورنمنٹ کالج علی پور میں پوسٹنگ کا آرڈر موصول ہوا۔ مجھے کسی نے بتایا کہ ڈی پی آئی (کالجز) پنجاب میں ایک سجاد حسین نقوی نامی سپرنٹنڈنٹ ایڈمن ہے وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ میں لاہور گیا اور اپنے یونیورسٹی کے ایک دیرینہ دوست ظفر علی خاں سیال ایڈووکیٹ سے ملا۔ وہ پکے اور سچے مومن تھے اور 1977 کے دوران پنجاب یونیورسٹی میں امامیہ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (ISO) کے بانی صدر رہ چکے تھے۔ انہیں سارا ماجرا کہہ سنایا۔ انہوں نے اپنے ایک مومن رہنما جو ہیڈ ماسٹر ایسوسی ایشن کے عہدیدار تھے، کو ساتھ لیا اور نقوی صاحب سے ملے۔ مجھے انہوں نے سمجھا دیا کہ ہم مومنین جب ملتے ہیں تو ہمارا اپنا ایک گفتگو اور رویے کا پروٹوکول ہوتا ہے۔ تم نے ہماری نقل میں کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالنا کیونکہ ہم نے آپ کو بطور مومن متعارف کرانا ہے اور پھر ان سے کام کہنا ہے۔ نقوی صاحب کے پاس پہنچے تو سلام دعا کے بعد ان سے کہا گیا کہ یہ ہمارا مومن بھائی ہے، یہ ڈائریکٹ سیلیکٹ ہوا ہے اور اس کو رحیم یار خان کے کالج میں رکھنا ہے۔ انہوں نے فوراً ایک فائل ملاحظہ کی اور بتایا کہ وہاں تو سیٹ نہیں ہے البتہ خان پور کالج میں ایک "اپ گریڈڈ" پوسٹ ہے۔ اگر پنجاب کے وزیر تعلیم سے یہ جملہ لکھوا کے لے آئیں کہ "انہیں گورنمنٹ کالج خان پور میں اسسٹنٹ پروفیسر کی اپ گریڈڈ پوسٹ پر تعینات کر دیا جائے" تو ہم علی پور کالج کے آرڈر منسوخ کر کے خان پور میں ان کی پوسٹنگ کر دیں گے۔ اب بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھنے والی کیفیت بن گئی۔ مجھے یاد آیا کہ میری برادری کے ایک ایم پی اے اور پارلیمانی سیکرٹری سردار مراد خان بلوچ یقیناً مل جائیں گے کیونکہ اسمبلی کا سیشن چل رہا تھا۔ میں مارچ 1989 کے وسط کی بات کر رہا ہوں۔ میں ان سے ملا تو وہ بہت خوش ہوئے اور ڈائریکٹ سیلیکشن پر مبارک باد دی۔ وہ ایک غیر معمولی انسان اور ہماری برادری کے لیے خدا کا عطیہ تھے۔ با اخلاق، مہذب اور سب کے کام آ کر خوش ہونے والے۔ مجھے ہمیشہ وہ اہمیت دیتے کہ ہماری قوم کا نوجوان آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے لہٰذا وہ جب بھی ہمارے گاؤں آتے تو مجھے خاص طور پر ملتے۔ انہوں نے کہا کہ کل اسمبلی ہال آ جائیں، وزیر تعلیم سے لکھوا لیں گے، میں اسمبلی ہال پہنچا تو باہر سے مجھے خود لینے آئے، اسمبلی کا اجلاس تو ختم ہو چکا تھا لیکن کچھ لوگ اسمبلی ہال میں موجود تھے اور وزیر تعلیم سردار ذوالفقار کھوسہ سے فائلوں پر دستخط کرا رہے تھے اور وہ ہر پانچ منٹ کے بعد کہتے جاتے کہ یارو مجھے نماز تو پڑھ لینے دو۔ میری باری آئی تو انہوں نے میری بات سنی ادھ سنی کر کے درخواست پر یہ الفاظ لکھ دیے۔ "پابندی ہٹنے کی صورت میں تقرری کی جائے" اس سے تو میرا مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ کہا کچھ لکھا گیا کچھ، یہ واقعہ 28 مارچ 1989 کا ہے۔ سردار مراد خان نے میری درخواست لے کر اپنی فائل میں رکھ لی۔ اگلے سات دن تک میں لاہور خوار ہوتا رہا لیکن وزیر تعلیم نہ مل سکے۔ کبھی وہ ڈیرہ غازیخان جا رہے ہوتے، کبھی وہ وزیر اعلیٰ پنجاب نواز شریف کے لیے وزیر اعظم بے نظیر بھٹو سے مذاکرات کی تیاری میں اسلام آباد جا رہے تھے۔ 4 اپریل 1989 کا دن تھا، میں پیپلز ہاؤس میں ان کے پاس دیگر لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا تو انہوں نے میرا

تعارف اپنے بیٹے محمد ایوب خاں سے کرایا جو آرمی میں لیفٹیننٹ تھے۔(بعد میں وہ کرنل ریٹائر ہوئے اور باپ کے کامیاب جانشین بنے) سردار مراد خان نے مجھے کہا کہ آپ رحیم یار خان چلے جائیں، میں اس پر دستخط کرا کر آپ کے متعلقہ آفس میں جمع کرادوں گا۔اسی اثنا میں انہیں پیغام ملا کہ وزیر تعلیم ڈی ایچ اے کے اپنے گھر میں موجود ہیں اور دو بجے کی پرواز سے ملتان جا رہے ہیں۔اپنی فائل لا کر دستخط کرالیں۔وہ فوری طور پر مجھے سیکریٹریٹ میں وزیر تعلیم کے دفتر لے گئے اور ان کے پی اے سے مطلوبہ الفاظ لکھوا کر مہر لگوالی اور کہا کہ میں دستخط کرانے جا رہا ہوں، آپ پیپلز ہاؤس میں انتظار کریں۔آپ کی درخواست پر سب سے پہلے میں دستخط کرا کے فوراً ڈرائیور کے ہاتھ بھیج دوں گا، پھر میں باقی درخواستیں پر دستخط کرالوں گا۔ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ان کا ڈرائیور صرف میری درخواست لے کر آیا کیونکہ سردار مراد خان نے میری درخواست پر دستخط کرا کر اسے واپس بھیج دیا تاکہ میں اس پر ضروری کاروائی کرالوں۔اس مومن سپرنٹنڈنٹ نے پھر بھی تقرری آرڈر کو جاری کرنے میں دو ہفتے سے زیادہ لگا دیے۔آخر ایک دن کالج کے ایڈریس پر گورنمنٹ کالج خان پور میں میری تقرری کے آرڈر موصول ہو گئے اور میں نے اگلے دن یعنی 27 اپریل 1989 کو خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان میں 6 سال، 10 ماہ اور 15 دن کا عرصہ گزارنے کے بعد گورنمنٹ ترقی تعلیم گورنمنٹ کالج خان پور میں روزانہ جانے آنے کی بنیاد پر جوائن کرلیا۔اس کالج کو الوداع کہتے وقت مندرجہ ذیل سٹاف کے ارکان یاد رہ گئے۔

اردو کے مختار احمد عزمی (آجکل لاہور) رحیم بخش شاہین، عبدالمالک شاکر (مرحوم۔خاصا عرصہ ڈپٹی ڈائریکٹر کالجز رہے)، جاوید الحق سندھو (امریکہ) نذر حسین جعفری (مرحوم) محمد اکرم حجازی (مرحوم)، اسلامیات کے محمد یونس، سعید احمد سعید (مرتب تاریخ رحیم یار خان)، محمد خالد رضا (ایس ای کالج بہاول پور میں پرنسپل رہے) انگریزی کے رستم الرحمٰن (مرحوم)، شیخ بلال احمد (لاہور)، محمد صدیق ناصر (مرحوم)، محمد اکرم چودھری (لاہور) خالد حمید خان (ملتان) ملک غلام سرور، باٹنی کے عبدالحمید چودھری (مرحوم خواجہ فرید کالج کے پرنسپل رہے) محمد رضا اللہ (مرحوم۔پی ایل اے پنجاب کے پہلی بار جماعت اسلامی کے خلاف جیت کر صدر بنے) محمد ارشد، پنجابی کے احمد علی گورایہ (بہاول پور)، تاریخ کے شبیر احمد ملک (مرحوم)، طاہر محمود اختر، تعلیم صحت وجسمانی چودھری علی محمد، محمد اسلم، ریاضی کے چودھری علی احمد (مرحوم)، غلام محمد، (مرحوم) زوالوجی کے رشید احمد انگوی (مرحوم۔جماعت اسلامی کے تعلیمی ونگ کے مستقل ترجمان رہے۔ان کا اخلاقی رویہ بظاہر شاندار تھا اور جماعت اسلامی سے وابستگی اور کمٹ منٹ اٹوٹ تھی) طارق ندیم قریشی، جغرافیہ کے مظہر حسین محسن، نفسیات کے اعجاز احمد سیال (مرحوم) شماریات کے غلام صغیر بخاری (مرحوم)، طیب اقبال۔سیاسیات اور شہریت کے سید عترت حسین کاظمی (مرحوم) غلام سرور صدیقی (مرحوم)، محمد ابرار حسین کانجو، عربی کے محمد فاروق احمد، علم التعلیم کے شمیم صادق جاوید (صادق آباد)۔عمرانیات کے عبدالحمید چیمہ، محمد امجد چودھری، فلسفہ

کے سید شمشاد علی ترمذی (لاہور) فزکس کے حشمت علی اسلم، محمد اکرم، الٰہی بخش لاشاری (مرحوم) محمد انوار الحق (مرحوم) شاہ جہان محمود (مرحوم) منور حسین، عبدالغفور (اسلام آباد) کیمسٹری کے نور احمد سانگی، ناصر احمد محمود اعوان، پرویز کامران، محمد ابرار فاروق (مرحوم)، ظفر اقبال (مرحوم)، محمد امتیاز، اکنامکس کے محمد بوٹا (لاہور) محمد ابراہیم چودھری، محمد ایوب راہی۔ 1989 کے اوائل میں سید الطاف الحق بخاری (معاشیات) نے باقاعدہ پرنسپل کا چارج سنبھال لیا تھا۔ چند سال پہلے ڈاکٹرز ہسپتال لاہور سے گھٹنوں کے آپریشن کے بعد انستھیز یا سے واپس نہیں آ سکے۔ ان کے گھر والوں کے مطابق آپریشن کے کافی گھنٹے بعد دل کے دورے سے انتقال کر گئے۔) میں ایک بار کالج گیا تو بخاری صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ مجھے کہنے لگے کہ مجھے اب تک آپ کا نعم البدل نہیں مل سکا۔ اب میں ان کی اس بات کو کیا معنی دیتا۔

یکم ستمبر 1990 سے محکمہ ہائر ایجوکیشن کالجز ونگ میں چار درجاتی فارمولہ نافذ ہوا تو تمام پوسٹیں کلاسیفائیڈ یا مضمون وار ہوگئیں۔ اس وقت کہیں بھی واقفیت کی بنا پر اسسٹنٹ پروفیسر کی سیٹ رکھوائی جا سکتی تھی اور دوستوں نے کہا بھی کہ آپ کی سیٹ خواجہ فرید گورنمنٹ کالج میں رکھوا دیتے ہیں مگر میں نے انکار کر دیا اور اگلے تقریباً پانچ سال میں نے گورنمنٹ کالج خان پور جانا آنا قبول کیا مگر اپنی خودداری یا عزت نفس کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ پھر خان پور میں ایسا دل لگا کہ روزانہ کا جانا آنا ایک طرح کی آسودگی بن گیا، جانے آنے میں کوئی کلفت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بس گرمیوں میں بادل کا ایک سایہ تھا کہ جو سر پر سایہ فگن رہتا اور سردیاں تو بہرحال خوبصورت موسم ہوتا ہی ہے۔ انسانی تعلقات کی خوب صورت جہتوں سے آشنا ہوا۔ ایسے لگتا تھا کہ جیسے استعاراتی انداز میں " گورنمنٹ ترقی تعلیم کالج" نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی ہو۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ رحیم یار خان اب بس، اسی کالج میں ہی رہنا ہے یا پھر آگے کا سفر کرنا ہے!!!

اس بار جب میں نے جوائن کیا تو حسب معمول پرنسپل مختار احمد چودھری ہی تھے۔ میں نے پہلے ہی انہیں مطلع کر دیا تھا لہٰذا مل کر بہت خوش ہوئے۔ اس گزرے عرصے میں ان سے تعلق کی ایک باقاعدہ صورت رہی۔ وہ جب بھی رحیم یار خان آتے تو ضرور ملتے۔ جسمانی طور پر وہ دھان پان سے تھے اور بولتے وقت ان کا لہجہ کبھی اونچا نہیں ہوا۔ کالج کے قومیائے جانے کے وقت انجمن ترقی تعلیم کے تحت 15 مارچ تا یکم ستمبر 1972 کے مطلوبہ عرصہ کے دوران پرائیویٹ کالج کے پرنسپل تھے اس لیے پرنسپل کے درجے کا ہی ان کا گزٹ نوٹیفیکیشن ہوا تھا۔ انہیں پیدائشی پرنسپل کہا جاتا تھا کیونکہ 12 ستمبر 1971 سے 30 مئی 1987 تک کا ان کا سولہ سال پر مشتمل پہلا دور (spell) تھا۔ چوں کہ کالج 1984 سے ڈگری ہو چکا تھا اور پرنسپل کی پوسٹ 19 ویں سکیل کی ہوگئی جس پر ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تقرری ہوگئی۔ چوہدری صاحب کو بطور اسسٹنٹ پروفیسر اور وائس پرنسپل 14 ماہ تک ستانے کا موقع مل گیا۔ 14 جولائی 1988 میں وہ تازہ دم ہو کر دوبارہ (انچارج) پرنسپل بن گئے۔ 26 دسمبر 1992 کو لیہ سے فزکس کے اسسٹنٹ پروفیسر عبدالمجید چودھری جو بنیادی طور پر

خان پور کے رہائشی تھے، یہاں جوائن کیا۔ وہ دراصل ایک مقبول اور کامیاب ٹیوشنر تھے۔ مختار احمد چودھری کا دوسرا دور ساڑھے تین سال سے زیادہ کا تھا۔ عبدالمجید چودھری کی ترقی بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر مختار صاحب سے پہلے ہوگئی تو انہیں پھر ستانے کا موقع مل گیا اور عبدالمجید چودھری نے پرنسپل کی سیٹ سنبھال لی لیکن وہ ایک سال سے بھی کم عرصے میں ریٹائر ہو گئے۔ مختار احمد چودھری نے 1993 کی ابتدا ہی سے 2000 تک سات سال کا آخری طویل دور مکمل کیا۔ گویا انہوں نے تقریباً ستائیس سال کا عرصہ پرنسپل کی حیثیت سے گزارا۔ چودھری صاحب بنیادی طور پر اندر سے ایک مکمل شریف، کم ہمت لیکن محنتی انسان تھے بل کہ کالج کے دیر سے ڈگری نہ بننے کا ذمہ دار انہیں تصور کیا جاتا تھا کیونکہ اس صورت میں انہیں ہلنا (Dislocate) تھا جیسا کہ بعد میں دو بار ہوا بھی۔ ان کی یاداشت بہت کمال کی تھی۔ ان سے کہا ہوا کام تو ہو جاتا لیکن ان کے کام کرنے کا اُسلوب ان کے مزاج کے تابع تھا جس سے وقتی طور پر کوفت محسوس ہوتی۔ وہ کالج کے فنانسز کے حوالے سے خاصے محتاط تھے اور فنڈز اور بجٹ کو قواعد وضوابط اور مجوزہ طریق کار کے مرحلے سے گزارتے حتیٰ کہ ان کے بارے میں ایک آڈٹ آفیسر کو یہ کہتے سنا گیا کہ بڑی کوشش کے بعد انہیں تعداد پوری کرنے کے لیے معمولی سے اعتراض ملتے جو پہلی میٹنگ ہی میں ختم ہونے والے ہوتے لیکن دو تین واقعات ایسے ہوئے جن سے معلوم ہوا کہ وہ واقعی بہت "شریف آدمی" ہیں۔ خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان میں انگلش کے استاد حمیداللہ شیخ ایڈ ہاک لیکچرار تھے۔ انہوں نے وکالت بھی کر رکھی تھی اور بھلے وقتوں میں کبھی ایم اے انگلش بھی کیا ہوا تھا۔ وکالت تو نہ چل سکی لیکن ایک ایمرجنسی بیج میں اساتذہ کی کمی پوری کرنے کے لیے ایڈ ہاک پر ڈویژن کی سطح پر بھرتی ہوئی جس میں انگریزی کے تھرڈ ڈویژن والوں کی بھی سنی گئی اور آں جناب کی پوسٹنگ رحیم یار خان ہوگئی۔ کچھ معلوم اور نامعلوم وجوہات کی بنیاد پر ان کا تبادلہ ان کے اپنے شہر خان پور کرا دیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ پرنسپل کسی ضرورت مند استاد کو کالج فنڈز سے قرض دے دیتے تھے جو استاد ماہانہ کٹوتی سے حساب برابر کر دیتا تھا۔ شیخ صاحب نے بھی ایسا قرض لے لیا مگر واپس نہیں کرتے تھے۔ جب بھی ان سے مطالبہ کیا جاتا تو وہ کہتے کہ یہاں پوری حکومت پاکستان عالمی بنک کی مقروض ہے، میں نے قرض لیا ہے تو کونسا گناہ کیا ہے۔ جب ہوں گے واپس کر دوں گا۔ اس وقت تنخواہ کا بل خزانے سے پاس ہو کر تحصیلدار کے پاس جاتا جہاں سے تحصیل کی سب ٹریژری سے دوبارہ اینوائس بنتی اور نیشنل بنک کی چیسٹ برانچ سے کیش ہوتا۔ شیخ صاحب کا المیہ یہ تھا کہ وہ جب پاس شدہ پے بل لے کر نیشنل بنک جاتے تو ان کا بڑا بیٹا ان کی نگرانی کے لیے ساتھ موجود ہوتا۔ ایک دن بل تحصیل کی سب ٹریژری سے پاس ہو کر بنک پہنچا تو پرنسپل پہلے ہی منیجر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ سنا ہے کہ چوں کہ کالج کے اکاؤنٹس اسی بنک میں تھے تو قرض کی واپسی ممکن ہوگئی۔ انہی دنوں ایک اور شریف النفس استاد نے قرض کے لیے درخواست دی تو پرنسپل نے وہ درخواست رد کر دی۔ بعد میں سنا کہ ایک سیاسی قسم کے طالب علم نے اپنے پروفیسر مذکور سے سے

درخواست پکڑی اور پرنسپل سے پانچ منٹ میں منظور کرا کران کے حوالے کر دی۔

یہ تو دو معمولی واقعات تھے۔ فنانس کے حوالے سے حد سے زیادہ احتیاط کرنے والے اس وقت تک 20 سال کا انتظامی اور مالی قواعد وضوابط کا تجربہ رکھنے والے پروفیسر مختار احمد چودھری کو جون 1994 میں ایک ذراسی بے احتیاطی یا فروگزاشت یا اعتماد نے ایک ایسے بحران میں مبتلا کر دیا کہ سروس اور پرنسپل شپ کے آخری چھ سات سال انہوں نے بہت فکر مندی، دباؤ (stress) اور پریشانی میں گزارے۔ ہر کالج کو میچنگ گرانٹ کے نام سے ایک خاص رقم سالانہ بجٹ میں مختص کی جاتی تھی۔ تصور یہ تھا کہ اتنی ہی رقم کالج اپنے جنرل فنڈ سے اس میں جاری کر کے سپورٹس اوراس سے ملا جلا سامان خریدتا تھا۔ اس سال کالج کو مبلغ سینتیس ہزار کی میچنگ گرانٹ ملی۔ ایک مجاہد نامی لمبا تڑنگا، سات فٹ کا قد، مضبوط حواس کا مالک کلرک تھا۔ اس نے 37000 کا بل بنایا اور پرنسپل سے تمام اہم دستخط کرا لیے۔ اس نے بجٹ ڈاکومنٹ میں تحریف کر کے کچھ اس طرح بنا دیا۔ بجٹ میں رقم کا اندراج یوں تھا RS. 37000 لفظوں میں (Rupees Thousand Thirty Seven Only) اس ہوشیار اور چالاک کلرک نے ایک منصوبے کے تحت اسی قسم کے ٹائپ رائٹر سے اسے یوں بنا دیا: RS.137000 جب کہ لفظوں میں (Rupees one Lac and Thirty Seven Thousand Only) اپنے ترمیم شدہ بجٹ کی فوٹو سٹیٹ کاپی اصل بل کے نیچے رکھ کر پرنسپل سے تصدیق کرا لی اور خزانے کے عملے سے مل کر بل پاس کرا لیا جو سب ٹریژری سے بھی پاس ہو گیا۔ اب مجاہد منتظر تھا اگلے مرحلے کا۔ پرنسپل اپنے ایک دوست پرنسپل کے ساتھ بہاول پور میٹنگ پر جا رہے تھے، انہیں پہلے تاخیر ہو رہی تھی اور جلدی میں تھے۔ مجاہد اسی قسم کے موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے کہا: سر وہ بل پاس ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں، 30 جون نزدیک ہے، کہیں بجٹ سوخت (lapse) نہ ہو جائے، بنک کے اتھارٹی لیٹر پر دستخط کرتے جائیں، پرنسپل نے کھڑے کھڑے دستخط کر دیے اور مجاہد نے اسی روز نیشنل بنک سے کیش نکلوا لیا، بنک کے کیشیئر نے کہا بھی کہ یہ رقم نقد کیوں لے رہے ہو، کالج کے متعلقہ اکاؤنٹ میں جمع کرا دو، اس نے کوئی معقول جواب دے دیا اور رقم کو گھر لا کر رکھ دیا۔ ضلعی دفتر خزانہ میں شاید مخبری ہو گئی کہ یہ فراڈ ہو چکا ہے تو وہ پرنسپل سے مل کر انہیں خبردار کرنے آئے۔ پرنسپل کے چھکے چھوٹ گئے انہوں نے سٹی تھانے میں مجاہد کے خلاف مقدمہ درج کروا دیا اور پولیس کو ساتھ لے کر مجاہد کے گھر چھاپہ مارا تو تمام رقم بازیاب ہو گئی اور مجاہد گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے بیان دیا کہ پرنسپل کی ملی بھگت سے یہ سب کچھ ہوا ہے۔ پرنسپل نے کالج جانا بند کر دیا اور گھر میں بند ہو گئے۔ تین جولائی 1994 کو میں اپنی تنخواہ کا بل کیش کروانے خان پور گیا تو مجھے اس ساری صورت حال کا علم ہوا۔ میں پروفیسر مختار چودھری کو ان کے گھر ملنے گیا تو خاصی دقت کے بعد ان سے ملاقات ہو سکی۔ ان کا مورال بہت گرا ہوا تھا اور خوف زدگی کے عالم میں تھے۔ حسن اتفاق سے سٹی تھانے کا سٹیشن ہاؤس آفیسر گورنمنٹ کالج ساہیوال میں میرا کلاس فیلو رہ چکا تھا اور میں نے سنا کہ بہت جابر قسم کا انسان ہے اور اس سے

کوئی بعید نہیں کہ وہ پرنسپل کو پریشان کرے گا۔ میں اس سے ملا اور میں نے اس سے ایک ہی سوال کیا کہ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پرنسپل میں اتنی جرات ہے کہ وہ فراڈ کر سکتا ہے۔ کہنے لگا، بالکل نہیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ آپ پرنسپل سے کہہ دیں کہ وہ بے شک کالج جایا کریں۔ میں انہیں پریشان کرنے کی بجائے ان کی مدد کروں گا۔ میں نے یہ پیغام پرنسپل کو دیا اور وہ دوبارہ روٹین میں آ گئے۔ دراصل بجٹ کی کاپی کی تصدیق اور اتھارٹی لیٹر کے اجرا کی دستاویز ان کے خلاف جا رہی تھیں۔ بہرحال اگلے سات سال انہیں محکمانہ انکوائریاں بھگتنا پڑیں۔ اینٹی کرپشن جج کی عدالت میں پیشیاں بھگتیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ریٹارمنٹ کے بعد کے کسی سال اس کیس سے جان چھوٹی اور کلرک مجاہد کو سزا ہوئی۔ ان کے ساتھ گویا" یک لحظہ غافل گشتن وصد سالہ منزل دور شد" یعنی ایک لمحے کی غفلت نے منزل کا یک صدی دور کر دیا والا معاملہ ہوا۔

سات سال کے بعد اس بار میں نے اس کالج کو جوائن کیا تو صرف یہی فرق پڑا تھا کہ کالج ڈگری ہو چکا تھا اور کالج ہوسٹل تعمیر کے بعد زیر استعمال تھا۔ اس بار بھی لائبریری کسی مستند لائبریرین سے محروم تھی لہذا پہلے کی طرح مجھے ہی سنبھالنا پڑی تا آنکہ جام طارق جاوید کی صورت میں اسے پیشہ ورانہ مہارت کا حامل لائبریرین نصیب ہوا۔ 1980 کے دوران ڈی پی ای مرزا اصفدر بیگ کے سرگودھا تبادلے کے بعد اسے کوئی ڈی پی ای نصیب نہ ہو سکا تھا اور یہ سیٹ پندرہ سال تک خالی رہی۔ اب کا معلوم نہیں۔ سٹاف کے پرانے مقامی ساتھی بھی تھے اور نئے بھی۔ جس دن میں نے جوائن کیا تو سٹاف کے کچھ دوست برآمدے میں مجلس جمائے بیٹھے تھے۔ عبدالغفار اسسٹنٹ پروفیسر پرنسپل کے بعد سینئر تھے۔ انہوں نے دقت کے ساتھ مجھے پہچانا۔ ان کا پروفیسر مختار سے پرنسپل بننے کا مقابلہ تھا۔ پروفیسر عبدالغفار کی ترقی سے صرف دو دن پہلے پروفیسر مختار کی ترقی اور مکمل پرنسپل کے آرڈر آ گئے جس کے بعد مایوسی کے عالم میں عبدالغفار نے ایس ای کالج بہاول پور تبادلہ کرا لیا اور وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ ان کی بیٹی کی شادی بہاول پور میں ہمارے ہم دیوار ہمسائے محکمہ زراعت کے جناب مشتاق کانجو کے بیٹے ڈاکٹر آصف مشتاق سے ہوئی تھی، شاید ان سے آخری ملاقات بھی اسی شادی میں ہوئی تھی بعد میں ان کی وفات کی خبر سنی۔ پروفیسر عبدالغفار رحیم یار خان کے ایک معروف ڈینٹل سرجن میاں عبدالقیوم کے بڑے بھائی تھے۔ ڈاکٹر صاحب جب لاہور میں ڈینٹل کالج میں پڑھتے تھے تو کچہری روڈ لاہور پر پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے سامنے ان کی ہوسٹل اور ہماری ہوسٹل آگے پیچھے واقع تھیں اور جب ان کی ہوسٹل کا ٹی وی خراب ہوتا تو یہ انڈین فلم کے لیے ہمارے کامن روم میں نظر آتے۔ رحیم یار خان میں ان سے ملاقات بھی رہی۔

آپ کو یہ یاد ہوگا کہ 82-1980 کے دوران جب میں رحیم یار خان سے خان پور جاتا آتا تھا تو صبح کے وقت ساڑھے سات بجے خیبر میل یا ساڑھے آٹھ بجے اباسین ایکسپریس کے بعد کوئی معقول ذریعہ نہیں تھا۔ واپسی پر پسنجر ٹرین یا الفرید والوں کی بس تھی۔ گذشتہ سات سال میں ٹرانسپورٹ کا نظام کئی گنا بہتر ہو چکا

تھا۔ ہائی ایس ویگن کے علاوہ اے سی کوسٹرز بھی دستیاب تھیں۔شروع شروع میں صبح کے وقت موٹر سائیکل جنرل پوسٹ آفس کے سٹینڈ پر کھڑی کرتا اور سامنے واقع ویگن سٹینڈ سے ویگن پر سوار ہو جاتا۔ واپسی بھی ویگن پر ہوتی۔ دو سال کے بعد رحیم یار خان اور بہاول پور کے درمیان اے سی کوسٹر کی سروس شروع ہو گئی۔ اس وقت تک ویگن سٹینڈ خان پور اڈے پر منتقل ہو گئے تھے۔ موٹر سائیکل جامعۃ الفاروق کے سٹینڈ پر پارک کرتا اور اور خان پور اڈے سے ویگن یا کوسٹر پر سوار ہو جاتا۔ خان پور کالج کے پچھلی جانب رحیم یار خان بہاول پور روڈ خاصی آباد ہو چکی تھی۔ واپسی پر اس روڈ پر واقع ایک کاروں کا شوروم تھا۔ ان کے آفس میں بیٹھ جاتا اور وہ اپنے ملازم کو باہر کھڑا کر دیتے، جیسی ہی اے سی کوسٹر آتی وہ روک لیتا اور میں اس میں سوار ہو جاتا۔ مگر ایک بات قابل ذکر ہے کہ ماضی میں مشقت زیادہ تھی مگر بوریت ہوتی تھی نہ تھکاوٹ۔ اب کی بار ٹرانسپورٹ کی شاندار سہولت کے باوجود بوریت بھی ہوتی اور تھکاوٹ بھی۔

گورنمنٹ ڈگری کالج خان پور میں ستمبر 1980 سے جون 1982 کے درمیان کے سیشن کے دوران سائکلو سٹائل کی صورت میں کالج گزٹ کے چار شماروں اور کالج میگزین "بانگ سحر" کا افتتاحی شمارہ نکلا تھا۔ اس بار سب سے پہلے میں نے 1990 کے دوران کالج گزٹ کا پہلا شمارہ کمپیوٹر کمپوزنگ سے اخبار جہاں سائز میں ایک شاندار اخبار کی ہو بہو شبیہ میں شائع کیا جسے لوگوں نے خوشی اور حیرت سے دیکھا۔ پہلے تجربے کی روشنی میں پرنسپل پروفیسر مختار احمد نے 92-1991 کے تعلیمی سال کے دوران کالج میگزین "بانگ سحر" کا شمارہ شائع کرنے کا ٹاسک دیا۔ انہی دنوں کالج کے قیام کو 25 سال مکمل ہو رہے تھے. فیصلہ ہوا کہ "بانگ سحر کا 25 سالہ تاریخ نمبر" شائع کیا جائے۔ اس اچھوتے خیال کو پسند کیا گیا اور اس شمارے کو کالج کے پچیس سالہ تاریخ نمبر کی شکل دے کر اس کو کالج کی اب تک کی تاریخ کے حوالے سے مستقل اور اہم دستاویز کے طور پر تیار کیا جانے لگا۔ ادارتی بورڈ اور پرنسپل نے میری تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے اس کے مشکل پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا۔ بعد میں ادارتی بورڈ کی ایک میٹنگ میں 25 سالہ تاریخ نمبر کا خاکہ تیار کیا گیا اور اس کو بنیاد بنا کر کالج میں حوالہ جاتی ریکارڈ اور دیگر ذرائع کی مدد سے کالج اور اس کے مختلف شعبوں کی تاریخ مرتب کی گئی۔ دوسرے مرحلے میں کالج کے سابق پرنسپل و اساتذہ سے رابطہ قائم کیا گیا۔ بانی پرنسپل پروفیسر معین الدین حسن قریشی نے صرف دو تین یاد دہانیوں کے بعد کمال محبت سے اپنی یادداشتیں لکھ بھیجیں۔ (یہ شاید ان کی زندگی کی آخری تحریر تھی) موجودہ پرنسپل پروفیسر مختار احمد چودھری کے ساتھ ایک طویل نشست میں ان کی یادوں کو اکٹھا کیا گیا۔ کالج کے ایک سابق پرنسپل محترم ڈاکٹر طاہر تونسوی نے متعدد یاد دہانیوں کے باوجود التفات نہیں فرمایا۔ اس طرح موجودہ شمارہ کے پہلے حصے "روشن ماضی" کو مستند اور مفید بنانے میں ایک عرصہ بیت گیا اور یوں دس سال قبل ڈیکلئریشن کے حصول کے باعث افتتاحی شمارے کی غیر معمولی تاخیر اس شمارے کا بھی مقدر بنی۔ موجودہ شمارے کی اشاعت سے متعلق تقریباً ویسے ہی شکوک وشبہات کو جنم دیا اور ادارتی بورڈ کو" میگزین

کب چھپے گا؟ کیا واقعی چھپے گا؟ اب تک کیوں نہیں چھپا" قسم کے سوالات کا سامنا کرنا پڑا۔ مجلّہ کے دوسرے حصے کے لیے نگارشات کے ضمن میں بھی تقریباً دس سال قبل کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ چھوٹے شہروں میں زندگی کا کینوس بڑا محدود ہوتا ہے جہاں زندگی کا بہاؤ سست اور زندگی کے جمود کا شکار ہونے کے باعث تخلیقی اور تحقیقی سرگرمیاں نہایت محدود بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں اور اگر کوئی فرد انفرادی کوشش کرتا بھی ہے تو مناسب اشاعت و ترسیل نہ ہونے کے باعث اس کی کوششیں نامعلوم رہتی ہیں اور اس ماحول میں رہنے والے دیگر لوگوں کے لیے تحریک کا باعث نہیں بن پاتیں۔ ایسے ماحول میں کسی علمی ادبی پرچے کو شائع کرنا اور اس کے علمی ادبی معیار کو پوری طرح برقرار رکھنا خاصا مشکل کام ہوتا ہے اور ان مشکلات کا سامنا اس شمارے کے مرتبین کو بھی کرنا پڑا جس کا یہاں اعادہ کرنا غیر ضروری محسوس ہوتا ہے۔ ادب کسی بھی عہد کے سماج کا سچا عکاس ہوتا ہے۔ کالج بھی ایک سماجی اکائی ہے جہاں ہمارے معاشرے کے نمائندہ رویوں اور رجحانات کا لاشعوری طور پر تبادلہ ہوتا ہے اس لیے اس شمارے کو کالج کی سماجی اکائی کا عکاس بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ بانگ سحر کا 25 سالہ تاریخ نمبر" کو مکمل طور پر جاننے کے لیے اس میں شائع ہونے والے مواد کے پہلے حصے کو دیکھنا چاہیے:۔ روشن ماضی: تاریخ: ☆ تعمیر و ترقی کی داستان (ادارتی بورڈ) ☆ شعبہ جاتی تاریخ (ادارتی بورڈ) ☆ یادیں: بازگشت (ایم ڈی حسن قریشی بانی پرنسپل) ☆ یادوں کا عکس (مختار احمد چودھری پرنسپل) ☆ شہر محبت کی چند یادیں (صفدر علی نقوی سابق استاد اردو) ☆ یادوں کے جھروکے (خواجہ محمد ادریس ایڈووکیٹ) ☆ خود بیتی: داستان کالج بزبان کالج (نسیم بلوچ) ☆ کالج کا تعارف نامہ (زاہد اقبال سال دوم) تاریخ و تہذیب: ☆ خان پور کٹورا ایک عہد ساز شہر (رفیق احمد راحمد صدیقی استاد شعبہ اردو) ☆ بہاول پور تاریخ کے آئینے میں (محمد طاہر استاد تاریخ ایس ای کالج بہاول پور) ☆ رحیم یار خان کے آثار قدیمہ کا مختصر مطالعہ (محمد بدر عبداللہ سال چہارم) تنقید و تحقیق: ☆ ضلع رحیم یار خان کے ادبی رسائل و جرائد (عارف ایوب استاد کامرس کالج رحیم یار خان) ☆ اردو ادب کا مجوزہ مطالعہ (ادارتی بورڈ) ☆ مذاکرہ: ادبی رجحان زوال پذیر کیوں (ادارتی بورڈ) ☆ روبرو: قتیل شفائی کے ساتھ آدھ گھنٹہ (نسیم بلوچ استاد فارسی) ☆ فارسی افسانہ کے بانی جمال زادہ سے گفتگو (ترجمہ نسیم بلوچ) باقی علمی ادبی اور تخلیقی نگارشات کا معیار کسی معیاری جریدے سے کم نہیں تھا۔

اس کالج میں آخری کاوش بانگ سحر کے "ضلع رحیم یار خان نمبر" کی اشاعت تھی جو خالصتاً تحقیقی نوعیت کی دستاویز تھی اور یہ شمارہ اس قدر مقبول ہوا کہ اس کا ایک شمارہ بھی کالج میں موجود نہیں ہے۔ "پیش نامہ" کے عنوان سے اس شمارے کے اداریے سے دو مختصر اقتباسات:۔

''یہ ایک مشکل کام تھا مگر ناممکن نہیں تھا، آپ کو یہ کام غیر معمولی نظر آئے گا کیونکہ اس سے قبل ضلع رحیم یار خان کے بارے میں اس سطح کا کام نہیں ہوا اور جو ہوا وہ حوالہ نہیں بن سکا۔ ہمارا خیال ہے کہ ہم نے بھی

کوئی تیر نہیں مارا، ہم نے صرف اتنا کیا کہ تحقیق و جستجو سے کام لے کر اہم مطالعاتی مواد اکٹھا کر دیا مگر ضلع رحیم یار خان اس سے کہیں زیادہ کا مستحق ہے۔۔۔ یہ کام اس لیے بھی غیر معمولی محسوس ہوگا کہ کالجوں میں تحقیقی رجحان کا فقدان ہے اور یہاں سے شائع ہونے والے مجلّے روایتی انداز کے حامل ہوتے ہیں مگر یہ خصوصی شمارہ اس عام انداز سے ہٹ کر تیار کیا گیا ہے اور یہ اعزاز ضلع رحیم یارخان کے ایک تحصیل ہیڈ کوارٹر کے کالج کے حصے میں آیا ہے جسے قائم ہوئے ابھی تیس برس کا عرصہ ہوا ہے۔ یہ ضلع رحیم یارخان کی باضابطہ تاریخ نہیں ہے۔ یہ اس کے چند معروف پہلوؤں کا احاطہ کرنے والے تحقیقی اور تاثراتی مضامین کا مجموعہ ہے کہ جن کی تیاری میں انتہائی غیر جانبداری سے کام لیا گیا ہے اور تمام تر محققانہ دیانتداری کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ رحیم یارخان میں بسنے والے مختلف لسانی اور تہذیبی گروہوں کے درمیان اس ضلع کی تاریخ اور معاشرت کے بارے میں پائے جانے والے نقطہ ہائے نظر میں اختلاف ہوسکتا ہے مگر ہم نے ایسے موضوعات یا ان کے کسی پہلو کو چھونے کی کوشش نہیں کی کہ جن کے متنازع ہونے کا احتمال ہوسکتا تھا۔ مجلس ادارت کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے یہ کام کر کے ضلع رحیم یارخان سے اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کام میں ان لوگوں کو یقیناً خوبیاں نظر آئیں گی جو اس کو علمی رویے اور مثبت انداز سے دیکھیں گے اور جنہوں نے اسے منفی انداز سے دیکھنے کی ٹھان لی تو ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔۔۔۔ جو لوگ ضلع رحیم یارخان سے ہماری محبت کے ہم نوا ہیں ضلع رحیم یارخان کی تاریخ کو مستند بنانے کا جذبہ اور خواہش رکھتے ہیں ان سے درخواست ہے کہ اگر انہیں ان مضامین میں ایسی اغلاط نظر آئیں کہ جن سے کسی تاریخی حقیقت کے مسخ ہونے کا امکان ہو تو وہ ضرور ہماری اصلاح کریں اگرچہ ہم نے کتابت اور سنین کی غلطیوں کو ہر ممکن درست کرنے کی کوشش کی ہے مگر جن حالات میں یہ شمارہ شائع ہو رہا ہے ان میں کئی اغلاط کے رہ جانے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا لہٰذا ایسی اغلاط کہ جن سے متن متاثر ہونے کا احتمال ہو، ان کی نشاندہی پر بھی مجلس ادارت ممنون ہوگی۔''

اب ایک نظر اس میں ضلع رحیم یارخان کے بارے میں شائع شدہ تحقیقی مضامین پر:۔

تہذیب و تاریخ: ☆ رحیم یارخان کی کہانی ماٰخذات کی زبانی (محمد طاہر)، ☆ رحیم یارخان کے آثار قدیمہ پر ایک نظر (نسیم بلوچ) ☆ سروے رپورٹ ڈاکٹر رفیق مغل (ابن حنیف) ☆ ضلع رحیم یارخان کی تاریخی قدامت کے گواہ قلعے (نسیم بلوچ)، ☆ ضلع رحیم یارخان کے تحصیل ہیڈ کوارٹرز کا تعارف (پرویز صادق) ☆ رحیم یارخان کے اہم شہر اور قصبے (نسیم بلوچ) نشان منزل: ☆ ضلع رحیم یارخان کا نہری نظام آبپاشی (پرویز صادق)، ☆ ضلع رحیم یارخان کی آبادکاری (نسیم بلوچ)، ☆ انجینئر نور علی ضامن حسینی (پرویز صادق) خصوصی تراجم: ☆ ڈائری بہاول خان پنجم 1901 (نسیم بلوچ)، ☆ رحیم یارخان کی ٹاؤن پلاننگ 1952 (نسیم بلوچ) معاشرت: ☆ رحیم یارخان کا معاشرتی و تہذیبی مزاج (نسیم بلوچ)، ☆ یادیں چند (ڈاکٹر خالد قریشی)، ☆ انسان اور شہر (ڈاکٹر عبدالخالق)، ☆ یادش بخیر (حافظ خورشید احمد) سیاست: ☆ ضلع رحیم یارخان

کی اسمبلیوں میں نمائندگی (نسیم بلوچ)، علمی وادبی ورثہ: ☆ضلع رحیم یار خان کا علم وادب (نسیم بلوچ)، ☆ رحیم یار خاں کی ادبی انجمنیں۔1 (زاہد اقبال) رحیم یار خان کی ادبی انجمنیں۔2 (نسیم بلوچ) ☆ رحیم یار خان کے رسائل وجرائد۔1 (عارف ایوب)، رحیم یار خان کے رسائل وجرائد۔2 (نسیم بلوچ)، ☆ رحیم یار خان کی صحافت (نسیم بلوچ)، ☆ رحیم یار خان کا ہائیڈ پارک۔۔۔۔ بزم فیض (نسیم بلوچ)، ☆ میر زاہد کا بیت الحکمت (نسیم بلوچ)، ☆ فرد فرید (رفیق احمد صدیقی)، ☆محسن خان پوری۔۔۔۔ایک ہمہ جہت شاعر (نذر خلیق)، ☆ نادم صابری شخص وشاعر (محمد اجمل بھٹی)، ☆ یادایامے کہ (عبدالعزیز جاوید)، ☆ وے صورتیں الٰہی (محمد اجمل بھٹی)۔☆ جائزے: بہاول پور کی سرزمیں پر ایک نظر (پرویز صادق) ☆ بانگ سحر 25 سالہ تاریخ نمبر۔۔ایک جائزہ محمد اقبال طالبعلم مدیر) ☆ خصوصی انٹرویو: وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور (ڈاکٹر محمد سلیم ملک) ☆ راجہ سعادت مند خان سابق چیف انجینئر آبپاشی بہاول پور سے گفتگو (نسیم بلوچ)

جہاں تک رفقائے کار کا ذکر ہے، مقامی اساتذہ کے علاوہ یہ اساتذہ موجود تھے۔اگر کسی کے نام کے آگے مرحوم ہے تو وہ اس وقت سے لے کر 2025 تا دم تحریر کی معلومات پر مشتمل ہے۔اردو میں نذیر احمد (مرحوم) جاوید اقبال اظہر، رفیق احمد صدیقی (خاصا عرصہ پرنسپل رہے اور 2023 میں ریٹائر ہوئے) عبدالحمید رضوانی، نذر خلیق (اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے "اردو ادب میں سرقہ کی روایت" کے ردعمل میں بالائی پنجاب کی طرف پرواز کر گئے) محمد اجمل بھٹی (ڈاکٹریٹ کی اور خواجہ فرید گورنمنٹ کالج کے پرنسپل رہے) اسلامیات کے سعید احمد (بہاول پور) ثاقب حسن (مختصر عرصہ کے لیے خان پور ولیاقت پور پرنسپل)، غلام محمد قریشی، محمد بخش آسی، (بہاول پور۔مرحوم) انگریزی کے محمد عبداللطیف، محمد اعظم نظامی (سول سروس میں چلے گئے) میاں محمد صدیق، بیالوجی کے جاوید اختر واہلہ (مرحوم) اور محمد طیب، تاریخ کے عبدالغفار (مرحوم) اور رانا محمد ندیم خاں، ریاضی کے محمد امین (مرحوم۔کرونا) نذیر احمد بھٹی (بہاول پور) شوکت علی انجم، سوکس کے عطا محمد قریشی (پرنسپل لیاقت پور کالج رہے)، سجاد حسین شاہ (خانیوال)، سیاسیات گلزار حسین ڈوگرا اور خالد مرتضیٰ شاہ (ڈیرہ نواب) شماریات کے خالد جاوید (بہاول پور) پرویز اختر عامر (مرحوم) عربی کے صداقت علی رندھاوا (خانیوال)، کیمسٹری کے خدا بخش سومرو، عبدالمجید جام مرحوم (دونوں یہیں پر پرنسپل رہے) کیمسٹری کے بابر علی بابر، معاشیات کے ذوالفقار احمد چودھری اور اشفاق حسین (دونوں رحیم یار خان) نفسیات کے رانا فاروق مصطفیٰ (مرحوم۔رحیم یار خان) اور شبیر احمد (رحیم یار خاں) لائبریری سائنس جام طارق جاوید اور ڈیمانسٹریٹر جناب حافظ محمد طاہر خان (مرحوم) اس وقت تک فزکس کی تینوں کی تینوں پوسٹیں خالی پڑی تھیں) مختلف ادوار میں 27 سال تک اسی کالج میں پرنسپل رہنے والے پروفیسر مختار احمد چودھری 2020 میں بوجہ کرونا انتہائی مختصر علالت کے بعد وفات پا گئے)۔26 ستمبر کو میں اس کالج سے فارغ ہوا اور 27 ستمبر 1994 کو گورنمنٹ کالج بہاول پور جوائن کیا اور 5 اکتوبر کو فیملی کے ساتھ مستقل بہاول پور شفٹ ہو گیا۔

ضلع رحیم یار خان کے دو کالجوں میں مجھے کام کرنے کا موقع ملا۔ خواجہ فرید گورنمنٹ کالج کے علاوہ میں نے دو مدتوں پر مشتمل ساڑھے سات سال کا عرصہ گورنمنٹ ترقی تعلیم کالج خان پور میں گزارا۔ خان پور میرے لیے ایک مہربان شہر کا درجہ رکھتا ہے۔ اس شہراور اس کے مضافات کو تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بہت بڑے قد وقامت کا شہر ہے۔ اس کے مزاج میں صوفیوں والا ٹھہراؤ، قناعت اور صبر ہے جس کے باعث طویل تاریخی اور تہذیبی روایات کا امین ہونے کے باوجود اس نے مضافاتی شہروں کے خود پر غلبہ (Overlap) پانے کے باوجود کبھی شکوہ نہیں کیا۔ جس نے بھی اس شہر میں آنا پسند کیا اس نے اسے وسیع القلبی کے ساتھ خوش آمدید کہا اور مجھے تو اس نے اپنے اندر اس طرح جذب کیا کہ دوئی کا کوئی تاثر ہی نہ رہنے دیا۔ جب اس کے موجودہ ضلعی ہیڈ کوارٹر رحیم یار خان کا کوئی واضح وجود ہی نہیں تھا تو خان پور ایک مقتدر شہر تھا۔ علاقے کے تمام انتظامی اور سیاسی امور کا مرکز تھا۔ جب آہستہ آہستہ اس کی مرکزیت منتقل کی جانے لگی تو اس درویش صفت شہر نے تب بھی کوئی واویلا نہیں کیا اور آج جب رحیم یار خان ضلعی معاملات کا مرکز بن چکا ہے تو خان پور نے اس میں اپنا وجود گم نہیں ہونے دیا اور اس نے اپنی شناخت قائم رکھی۔ دوسری بار میرا یہاں آنا اس شہر کو اتنا بھایا کہ اس نے میری شخصیت کو گوناں گوں سرشاریوں سے نوازا اور مجھ پر خود شناسی اور افراد کے باہمی ربط و تعلق کے کئی در وا کیے جس کے باعث میری شخصیت کے تخلیقی جوہر کا ارتقائی عمل نئی جہتوں سے آشنا ہوا جس سے میں ہمیشہ آسودگیوں کی پھوار میں بھیگتا رہا۔ اس لیے یہاں گزرا ہوا تمام عرصہ میرے تحت الشعور کا آج بھی ناقابل فراموش اور ناگزیر حصہ ہے۔

رحیم یار خاں بہاول پور کی تاریخ کا ایک بنیادی اور ناگزیر باب ہے جس کے مطالعے کے بغیر بہاول پور کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ میں نے یہاں کم وبیش سولہ سال گزارے ہیں۔ 21 فروری 1979 سے 20 ستمبر 1980 اور 12 جون 1982 سے 26 اپریل 1989 کے دوادوار خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان اور 21 ستمبر 1980 سے 11 جون 1982 اور 27 اپریل 1989 سے 26 ستمبر 1994 کے دو ادوار میں گورنمنٹ ترقی تعلیم ڈگری کالج خان پور سے وابستہ رہا۔ خان پور روزانہ جانے آنے کو ترجیح دی اور اپنی معاشرتی زندگی کے حوالے سے رحیم یار خان شہر کا انتخاب کیا۔ جب آپ ملازمت کے ضمن میں کسی شہر جاتے ہیں تو ابتدائی تعلقات اپنے رفقائے کار سے قائم ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر فکری ہم آہنگی ان تعلقات کی بنیاد بنتی ہے۔ اس سے پہلے بھی میں نے کہیں لکھا ہے کہ 79-1978 کے میرے سلیکشن بیچ کے تقریبا سات اساتذہ نے آگے پیچھے خواجہ گورنمنٹ کالج رحیم یار خان جوائن کیا تھا۔ اتنی بڑی تعداد میں اساتذہ کے آنے سے ماحول میں ایک طرح کا تحرک پیدا ہو گیا تھا۔ تدریسی سٹاف دو واضح گروہوں میں تقسیم تھا۔ ایک طرف جماعت اسلامی کی ذیلی شاخ "تنظیم اساتذہ" سے وابستہ اور ہمدرد جبکہ دوسری جانب لبرل اور دیگر مذہبی گروپوں کے اساتذہ جنہیں "جماعت مخالف" کہا جا سکتا تھا، جن میں کسی فکری ہم آہنگی کا زیادہ عمل دخل نہیں

تھا۔ پنجاب لیکچررز ایسوسی ایشن کے الیکشن کے دوران یہ گروہ اکٹھا ہو جاتا۔ اگر چہ میں بھی اسی گروہ میں شامل تھا مگر کسی فکری اساس کی جگہ وقتی طور پر ایک گروہ کی شکل اختیار کر لینا میرے نقطۂ نظر سے درست نہیں تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ہمارے آنے کے چند ماہ کے بعد ہی پی ایل اے کے الیکشن ہونا قرار پائے۔ شنید تھی کہ اس سے قبل جماعت کا انتخابی پینل بلا مقابلہ منتخب ہو جاتا تھا جب کہ جماعت کی مخالفت کی بنیاد پر تشکیل کردہ گروپ نے اس الیکشن میں مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ معلوم تھا کہ ہم ہار جائیں گے مگر جمہوری اقدار بھی اہم تھیں۔ ہمارا اس مقابلے کا کہ جس میں ہمارا پینل حسب توقع ہار گیا تھا، جماعت نے اتنا برا منایا کہ جماعت سے شدید ہمدردی رکھنے اور چند ماہ قبل آنیوالے پرنسپل پروفیسر رحمت اللہ شاہ کی ملی بھگت سے بھر پور تعلیمی سیشن کے باوجود ہم پانچ لوگوں کے تبادلے کرا دیے گئے مگر ہم نے انتخاب کے ساکن پانی میں مقابلے کے جو چند کنکر پھینکے تھے ان کے ارتعاش سے الیکشن کی روایت ایسی قائم ہوئی جو آج بھی جاری ہے۔

پہلے دو تین ماہ تو اپنے دوست اور رفقائے کار کے ساتھ رحیم یار خان شہر اور اس کے بازار اور سڑکوں کے تعارف میں گزر گئے۔ ابتدائی طور پر رحیم یار خاں میں مقیم چند رفقائے کار نے اپنے گھروں میں مدعو کیا۔ رحیم یار خان کے معروف قانون دان اور دانشور شیخ عظیم اشرف نے ریلوے روڈ والے گھر میں تمام نئے آنے والوں کو چائے پر مدعو کیا اور وہیں پر شہر کے مشہور طبیب ڈاکٹر عبدالخالق سے ملاقات ہوئی۔ شیخ صاحب کے توسط سے دانشور اور ایڈووکیٹ جی۔ اے طارق اور سابق پارلیمانی رکن محمد حنیف نارو سے تعارف ہوا۔ انہی دنوں ایک کمال کی مدلل گفتگو کرنے والے کامریڈ عبدالوحید بھی مل گئے۔ بہاول پور منتقلی سے قبل تک ان تمام دوستوں سے میل ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ یہ لوگ رحیم یار خان کی تہذیبی زندگی کا استعارہ تھے۔ زندگی کا عجیب رنگ ہے کہ اب تک جن پانچ دوستوں کا میں نے ذکر کیا ہے یہ تمام دنیا میں اپنے عارضی قیام کی مدت مکمل کر کے رخصت ہو چکے ہیں۔ اکتوبر 1979 کے بلدیاتی انتخابات نے مجھے پہلی بار رحیم یار خان شہر سے باہر نکلنے کا موقع فراہم کیا۔ ہم پانچ لوگ اپنے اپنے تھیلے اٹھائے سکھر اڈے سے بس میں سوار ہوئے۔ کے ایل پی روڈ پر باقی دوست راستے میں آنے والے اپنے اپنے مقامات پر اترتے رہے۔ آخر میں شہر سے 40 کلومیٹر دور (براستہ مئو مبارک یہ راستہ 28 کلومیٹر بنتا ہے) شیخ واہن کا پرائمری سکول آیا جہاں مجھے پریذائیڈنگ آفیسر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ وہ الیکشن ڈیوٹی میرے لیے سرائیکی زبان و ثقافت کو جاننے کی کلید ثابت ہوئی۔ شیخواہن سرائیکی علاقے کا ایک قدیم قصبہ ہے جس کی شناخت ایک بس سٹاپ (اڈا)، پرائمری سکول اور ارد گرد کی بکھری ہوئی چھوٹی بڑی بستیاں تھیں۔ چوں کہ یہ ایک مخلوط پولنگ سٹیشن تھا لہٰذا خواتین کے سرائیکی بولنے، ان کے لباس اور رویے سے میں پہلی بار متعارف ہوا۔ بل کہ ایک دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک بوڑھی خاتون میرے پاس یہ شکایت لے کر آئی کہ اس کا ووٹ کوئی ڈال گیا ہے۔ میں نے ٹینڈر ووٹ سے بچنے کے لیے اسے کہہ دیا کہ وہ آپ کے امیدوار کو ہی ڈال گیا ہے۔ وہ خوش ہو کر چلی گئی۔ اگر چہ ہم نے اڈے سے

فروٹ منگوا کر اپنی بھوک مٹائی لیکن پولنگ کے اختتام پر کسی لمبردار قسم کی شخصیت کے ہاں سے کھانا آ گیا۔ زردی نما سالن بظاہر انڈے کی بھجیا لگ رہا تھا مگر جب کھانا شروع کیا تو انڈے کی بھجیا کی شکل میں وہ مچھلی پکی ہوئی تھی جس کے کانٹے بھی ساتھ "رگڑ" دیے گئے تھے لہٰذا وہ کھانا مجھ سے نہ کھایا جا سکا۔ رات کو واپسی کے لیے جیتنے والے مقامی زمیندار کی طرف سے ٹریکٹر ٹرالی مہیا کی گئی کیونکہ جی ٹی روڈ پر واقع ہونے کے باوجود مغرب کے وقت ٹرانسپورٹ ملنی ناممکن تھی۔

اب ایک ایسی ہمہ صفت شخصیت کا تذکرہ کہ جس نے رحیم یار خان کی مقامی سرائیکی کمیونٹی اور سرائیکی حلقوں تک میری رسائی کو ممکن بنایا، ان کی وجہ سے نہ صرف سرائیکی دوستوں میں اضافہ ہوا بل کہ سرائیکی زبان پر میری گرفت بھی مضبوط ہوئی۔ ان کا نام ہے ڈاکٹر عبدالغفور بلوچ۔ ان سے ساتھ صرف سات سال کا رہا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپریل 1987 میں انہیں اپنے پاس بلانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ جس طرح وہ مقامی سرائیکی تھے اسی طرح میں باری دوآب پنجاب کا مقامی تھا اور اس مقامیت کے باعث زبان و ثقافت کا غیر معمولی اشتراک تھا۔ چوں کہ میں نے اپنی بار کی زبان کا لہجہ سنبھال کر رکھا ہوا تھا جو اپنی لغت کے اعتبار سے سرائیکی کے بہت قریب تھا اس لیے مجھے سرائیکی زبان بولنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب اپنے خاندان کے پہلے پڑھے لکھے شخص تھے اوپر سے وہ ایم بی بی ایس کر چکے تھے۔ ان کا کلنک محض ایک طبی جگہ نہیں تھی بل کہ ایک مؤثر سماجی فورم بھی تھا۔ ان سے جو قربت اور دوستی کا تعلق قائم ہوا تو اس میں ان کی شخصیت کا اعجاز تھا۔ ان کے توسط سے سرائیکی زبان اور ثقافت کے علاقوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ خاص طور پر وہ میاں والی قریشیاں والے مخدوموں کے بہت قریب تھے۔ اس قبیلے کے اس وقت کے سربراہ مخدوم نور محمد ہاشمی کی دعوت پر چند بار وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ چوں کہ وہ قومی اسمبلی کے رکن رہ چکے تھے اس لیے ان سے ملاقاتوں میں سرائیکی سیاسی حرکیات جاننے کے مواقع ملے۔ بہاول پور ریاست کی سابق ایلیٹ اور جاگیردار کلاس میں میاں والی قریشیاں کے مخدوم اپنے ہم مرتبہ خاندانوں کی نسبت اعتدال پسند شمار کیے جاتے ہیں۔ ان مخدوموں کی نسبت مؤمبارک سے ہے۔ جمال الدین والی کے مخادیم کے علاوہ رحیم آباد کے لغاری اور شیدانی شریف کے کوریجے اور بھونگ بھارا کے رئیس خاندان بھی سیاسی طور پر بہت نمایاں مقام کے حامل تھے۔ پیپلز پارٹی کے پہلے دور حکومت تک یہاں کی سیاست انہی خاندانوں کی باندی رہی۔ پنجابی آبادکاروں کا طبقہ ابھی سیاسی طور پر ارتقا کے عمل سے گزر رہا تھا۔ ضیاالحق کے شب خون کے بعد اس طبقے کو آگے لانے کے لیے ایسی حلقہ بندیاں کی گئیں جن سے نئی ابھرنے والی پنجابی آبادکار اشرافیہ کے سیاسی افق پر طلوع ہونے کے امکانات بڑھ گئے۔ 1979 کے بلدیاتی انتخابات نے نے ان کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر صاحب خودخان پور کے قریب ایک بستی کے رہنے والے تھے اور محلّہ قمرالدین میں ایک کرائے کے گھر میں اپنی فیملی سمیت رہتے تھے۔ انہوں نے ایک دیوہیکل موٹر سائیکل رکھا ہوا تھا جو ڈاکٹر صاحب کی موٹی جسامت سے

بہت ہم آہنگ تھا۔ وہ جب بھی کسی دعوت یا ملاقات کے لیے دیگر دوستوں کے ہمراہ رحیم یار خان سے باہر جاتے اکثر مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ وہ دوستوں میں مسرتیں اور قہقہے بانٹنے والے شخص تھے۔ ان کی بے وقت رحلت پر میں نے ان کی شخصیت پر ایک خاکہ لکھا جو کالج میگزین "پیام سحر" میں ان کے لیئے مختص گوشے میں شائع ہوا۔ شیخ عظیم اشرف بہاول پور ڈویژن کے ایک سینئر قانون دان تھے جن کی قابلیت اور تجربے کا ہر کوئی معترف تھا۔ ان کا ایک اور وصف جو انہیں زیادہ ممتاز کرتا تھا وہ ان کی علم اور خرد دوستی تھا۔ رحیم یار خان کی ڈسٹرکٹ کورٹس میں پریکٹس کرتے تھے جہاں میں اکثر ان سے ملنے جاتا تھا اور بہت سے لوگوں سے آشنائی ہو گئی۔ جب وہ بہاول پور ہائیکورٹ یا کسی سپیشل کورٹ میں پیشی کے لیے جاتے تو مجھے بھی کبھی کبھار ساتھ لے جاتے۔ راستے میں ان سے خوب گفتگو رہتی اور ان کی وجہ سے میری آگہی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا بل کہ ان کی وجہ سے بہاولپور بار کے بہت سے وکلا سے تعلق بنا۔ رحیم یار خان میں معروف طبیب حکیم حبیب الرحمان کے بڑے صاحب زادے خلیق الرحمان خلیق سے گو تعلق قدرے دیر سے ہوا مگر خاصا دیر پا ثابت ہوا۔ ان کا موسیقی کا ذوق بہت اعلیٰ پائے کا تھا۔ جگجیت اور چترا سنگھ سے انہوں نے ہی مجھے متعارف کرایا۔ ہم ان کی گاڑی میں لمبی ڈرائیو پر نکل جاتے اور گپ شپ کے علاوہ بہترین موسیقی سماعت کرتے۔ محمد رمضان (جانی) ایڈووکیٹ سے بھی قدرے تاخیر سے ملاقات ہوئی۔ وہ لبرل فکر کے علم بردار تھے، ان سے بھی خوب مباحث چلتے رہتے۔
رحیم یار خان جس خطے میں واقع تھا وہاں کالج کے بعد کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور یا کراچی جانا پڑتا تھا۔ غالب رجحان کراچی کا تھا مگر لاہور بھی اتنا ہی دور تھا۔ ضلع بھر کے کالجوں میں مقامی اساتذہ کا تناسب نہ ہونے کے برابر تھا لہٰذا یہ کالج باہر سے آنے والے اساتذہ کے تربیتی مراکز بنے رہے۔ وہ آتے ہی جانے کی کوششوں میں لگ جاتے۔ 1975 کے پنجاب اسمبلی ایکٹ کے تحت ملتان اور بہاول پور میں دو یونیورسٹیوں کو متعارف کرایا گیا جہاں اس علاقے کے متعدد نوجوانوں کے لیے تعلیم کے دروازے کھل گئے اور صرف پہلے پندرہ سال کے دوران اس علاقے کے تعلیمی اداروں میں مقامی اساتذہ کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ دیگر محکمہ جات میں بھی رحیم یار خان کی مخلوط (پنجابی وسرائیکی) آبادی کی کثیر تعداد نظر آتی تھی۔ بہرحال کالج اور شہر میں لوگ آتے جاتے رہے۔ کچھ میری طرح یہاں ٹھکانا بنا لیتے، کچھ اپنے گھروں اور شہروں کو لوٹ جاتے۔ کچھ نے ہمیں بھلا دیا، چند ایک کو ہم یاد نہ رکھ سکے۔ مقامی دوست جن کا تعلق خاص طور پر دیہات سے تھا انہیں شہری زندگی کو اختیار کرنے کے لیے زیادہ محنت کرنا پڑی کیونکہ ان کے دیہات کے عزیز و رشتہ داران کو کچہری و تھانے اور محکمہ مال کے امور میں مدد کے لیے پکارتے، کام ہو نہ ہو، اس کا جواب دینا ضروری ہوتا۔ اس قسم کے دباؤ میں جب میں ان کو دیکھتا تو شکر بھی ادا کرتا کہ میں جو تھانے اور کچہری کے مزاج کا قطعی طور پر حامل نہیں تھا اگر میری پہلی پوسٹنگ اپنے شہر میں ہی ہو جاتی تو میں مقامی اور پہلا ایم اے اور کالج کا استاد اس قسم کے دباؤ سے کیسے نکل پاتا۔ خان پور میں دو مختلف تعیناتیوں کے دوران بھی اس علاقے کو سمجھنے میں مدد ملی۔

ضلع رحیم یار خان کے مقامی وخان پور اور صادق آباد کے کالجوں میں متعدد امتحانات بھی لیے اور حتمی طور پر اپنے امتحان لینے کے اُسلوب کو ایمانداری کے قریب تر رکھا۔ میں نے پہلا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول صادق آباد میں بطور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ لیا۔ حال ہی میں انتقال کر جانے والے بہاول پور سے ریاضی کے استاد عبدالرؤف قاضی سنٹر سپرنٹنڈنٹ تھے۔ وہ شک و شبہ سے بالاتر ایک مکمل ایماندار استاد تھے جن کی شاگردی کا شرف مجھے ملا تھا اور میں نے اپنے پہلے امتحان سے آخری امتحان تک انہی کے اسلوب کو زندہ رکھا۔ اس پہلے امتحان کا ایک واقعہ سن لیجئے۔ سوشیالوجی کا دوسرے ٹائم کا پرچہ تھا اور اتنت بڑے ہال میں کل چھ امیدوار ہمارے سامنے ٹاٹوں پر بیٹھے پرچہ حل کر رہے تھے۔ قاضی صاحب بڑے آرام دہ انداز میں کرسی پر بیٹھے تھے جب کہ ساتھ بیٹھا میں شاید اگلے دن کا سیٹنگ پلان تیار کر رہا تھا۔ ایک امیدوار سے نقل برآمد ہوئی۔ اس کی کاپی اور نقلی مواد میرے پاس تھا اور ہماری طرف سے اسے یہ کہا گیا کہ کمرہ امتحان سے باہر نکل جائے تو اس کا نقل کا کیس نہیں بنائیں گے، بس یہی اس کی سزا ہے، امیدوار منتیں ترلے کر رہا تھا۔ اسی دوران اس نے جھپٹا مارا اور جوابی کاپی اٹھا کر باہر کی طرف بھاگا مگر ہال کا دروازہ اور بغلی کمرے سب بند تھے۔ قاضی صاحب پھرتی سے اس کے پیچھے بھاگے، دروازے بند ہونے کی وجہ سے پکڑا گیا۔ اس کا کیس بھی بنا اور اس کے خلاف ایف ائی آر بھی کٹوا دی گئی۔ میرا دوسرا امتحان 1985 کے دوران گورنمنٹ کالج صادق آباد کے ہال میں تھا جب یہ کالج جی ٹی روڈ پر ایک کمیونٹی سنٹر میں واقع تھا۔ خواجہ فرید کالج رحیم یار خان میں تاریخ کے استاد محمود اختر میرے ساتھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ہم دونوں موٹر سائیکل پر وائرلیس پل کی جانب سے صادق آباد کا وہ راستہ لیتے جو دیہاتوں سے گزر کر چک نمبر 166 / پی کی جانب سے شہر میں داخل ہوتا ہے۔ پہلے راستے میں پڑنے والے حبیب بنک غلہ منڈی برانچ جاتے جہاں سے اس روز کے سوالیہ پرچوں کا بنڈل لے کر سنٹر پہنچتے۔ واپسی پر جوابی کاپیوں کا پارسل بھی بنک میں جمع کراتے اور اسی راستے سے واپس آتے۔ میں نے اب اپنا ایک امتحانی اسلوب بنا لیا تھا۔ امتحان کے پہلے لازمی پرچے کے دن جوابی کاپیاں تقسیم کیے جانے کے بعد میں نے ایک خطاب کی روایت کا آغاز کیا اور نہایت اختصار کے ساتھ میں یہ نکات بیان کرتا۔ "پیارے طلبا۔ امتحان کے آغاز پر میں آپ سے دو تین باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں جن سے میرا اچھا امتحان لینا اور آپ کا پرسکون اور اچھا امتحان دینا ممکن ہو سکے گا۔ پہلی بات یہ کہ میں اللہ تعالی کو حاضر جان کر یہ حلف اٹھاتا ہوں کہ میں امتحان میں نہ خود کوئی فاؤل کھیلوں گا اور نہ کسی کو کھیلنے دوں گا۔ اگر کسی نے کوشش کی اور پکڑا گیا تو معاف نہیں کروں گا اس لیے میں آپ کو پانچ منٹ دیتا ہوں کہ اگر آپ بھول کر کوئی نقلی مواد لائے ہیں تو وہ ہر لائن میں موجود نگران سٹاف کے حوالے کر دیں۔ اگر کسی نے سفارش یا کسی اور ذریعے سے اپروچ کرنے کی کوشش کی تو میں اس لڑکے کی خاص نگرانی کروں گا اور مجھے کسی ایسے تعلق اور دوستی کی قطعی طور پر کوئی ضرورت نہیں کہ جو اس وجہ سے خراب ہو کہ میں نے کرپشن یا بدعنوانی کی اجازت نہیں دی۔" اس مختصر خطاب کے بعد تقریباً سارا امتحان ہی

کنٹرول میں آ جاتا اور پرسکون گزرتا۔ جو اس دعوے پر مکمل اعتبار نہ کر پاتے وہ اپنی کوشش کر کے دیکھ لیتے اور صبر کرتے۔ اسی امتحان کے دوران ایک نگران کے توسط سے مجھے ایک بڑی رقم کی پیشکش کی گئی مگر نتیجہ ان کی اور نگران کی تنبیہ کی صورت میں برآمد ہوا۔ اسی سے وابستہ ایک اور واقعہ مجھے یاد ہے کہ ضلعی دفتر خزانہ کا ایک اکاؤنٹینٹ گل محمد دو دیگر لوگوں کے ساتھ میرے گھر آیا اور مجھے علیحدگی میں کہنے لگا۔ "یہ دو لوگ صادق آباد کے ایک معروف ڈاکٹر نے بھیجے ہیں کہ ہم پروفیسر صاحب کو نئی سوزوکی گاڑی کی چابی پیش کرنے کو تیار ہیں اگر وہ ان کے ایک عزیز کو مطلوبہ نقل لگانے کی اجازت دے دیں۔ میں نے ان سے کہا کہ بڑے افسوس کی بات ہے گل محمد کہ آپ نے بھی مجھے ایسا ویسا سمجھ لیا۔ کہنے لگا کہ میں نے تو انہیں کہا تھا کہ وہ ایسے آدمی نہیں ہیں مگر یہ اِصرار کر کے مجھے لے آئے کہ ایک دفعہ بات کرنے میں کیا حرج ہے!! میں نے یونیورسٹی اور بورڈ کے جتنے امتحان بھی لیے میں نے دیکھا کہ چند امتحانات کو مکمل ایمانداری سے لینے کے لیے باقی امتحانات کی نسبت بہت مشکلات اور محنت درکار ہوتی ہے۔ پہلا انتہائی مشکل امتحان بی کام کا ہوتا ہے۔ سی کام اور ڈی کام میں چوں کہ نقل کی بے محابہ روایت موجود تھی اس لیے بی کام میں امیدوار ویسی ہی توقع رکھتے اس لیے مجھ جیسے نگران کے لیے امتحان میں ہر سمت نظر رکھنا پڑتی۔ دوسرا امتحان بی۔ ایڈ کا تھا، امتحانی ہال میں تمام کے تمام امیدوار اسکول کے اساتذہ ہوتے لہٰذا وہ نقل کو اپنا حق تصور کرتے۔ خواجہ فرید کالج رحیم یار خان کے ہال میں جاری بی۔ ایڈ کے امیدوار کو نقل لگاتے ہوئے پکڑ لیا گیا تو وہ منتیں کرنے لگا کہ میں تو استاد ہوں مجھے معاف کر دیں۔ میں نے کہا کہ آپ کی سزا تو دگنی ہونی چاہیے کہ آپ استاد ہو کر بددیانتی کر رہے تھے۔ وہ پھر بھی منتوں پر مصر ہوا تو میں نے اسے کہا کہ دیکھو، ہال کی امتحانی فضا خراب نہ کرو اور چلے جاؤ، میں تمہارا کیس نہیں بناتا، تمہارے لیے یہی سزا ہی کافی ہے۔ اگر تم باز نا آئے اور ہال سے باہر نہ گئے تو میں تمام بھرے ہوئے ہال کے سامنے آپ کی عزت افزائی کروں گا۔ دو تین ایسے کیس کے ساتھ اسی طرح نپٹنے سے تمام ہال باقی دنوں کے لیے پرسکون ہو جاتا۔ میں نے بطور امتحانی نگران استاد اور پھر منتظم استاد کے یہی دیکھا ہے کہ ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے کام کرنے والے کو انتہائی مشکل کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جب کہ بدعنوانی کے گند سے جیبیں بھرنے والوں کے لیے مادی تحریص و مفاد کے ساتھ ساتھ کام کرنے میں بھی بہت آسانی رہتی ہے۔ میں خودستائی کے تحت خود کو فرشتہ ثابت کرنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کر رہا، میرا عرض کرنے کا مقصد یہ بتانا تھا کہ میں نے ایک مشکل راہ کا انتخاب کیا۔ ادبیات نے جن جمالیاتی اقدار سے مجھے روشناس کرایا تھا اس میں سچائی اور ایمانداری بھی دوامی جمالیاتی قدریں ہیں۔ میں آپ پر اب ایسا انکشاف کرنے جا رہا ہوں کہ جس کے آئینے میں آپ اپنے معاشرے کی بے چہرگی، اخلاقی دیوالیہ پن اور گندگی دیکھ سکتے ہیں اور اس کو جان کر آپ کی طبیعت مکدر بھی ہو سکتی ہے۔ امتحان کے آغاز میں امتحانی ہال میں امیدواروں کو ٹائلٹ جانے کی بہت ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ پہلی دفعہ جب ایک امیدوار نے واش روم کی حاجت کا ذکر کیا تو میں نے اس کے نیفے سمیت اچھی طرح تلاشی

لی، پھر میں نے ٹائلٹ کا چکر لگایا جہاں کتابیں اور نقلی مواد رکھا گیا تھا اسے وہاں سے غائب کیا پھر اس کے ساتھ گیا اور واش روم کے باہر کھڑا ہو گیا۔ متعلقہ مواد تو وہاں سے غائب تھا، اب واش روم کا کیا فائدہ اس لیے وہ بہت جلدی باہر آ گیا۔ اس طریقِ کار کے بعد واش روم جانے کا مطالبہ سامنے نہ آتا۔ ایک روز دو گھنٹوں کے وقفے سے ایک ہی دن اسلامیات اور مطالعہ پاکستان لازمی کے دو دو گھنٹے کے پرچے تھے۔ ایک صاحب کو واش روم کی حاجت محسوس ہوئی تو اجازت کا طالب ہوا۔ میں نے حسب معمول اس کی مکمل تلاشی لی اور پہلے واش روم بلاک کا معائنہ کیا تو ان چھوٹے چھوٹے ''کمروں'' سے اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کی کتب اور نقلی مواد اٹھایا تو میرا سر شرم سے جھک گیا کہ چند نمبروں کی خاطر مقدس اوراق اور نصابی کتب کو کہاں رکھ دیا گیا تھا۔ حیف صد حیف۔

ان دنوں بورڈ اور یونیورسٹی کے مختلف امتحانات کی جوابی کاپیاں جانچ پڑتال کے لیے اساتذہ کو گھروں میں بھیجی جاتی تھیں جن پر اصل رول نمبر ہی لکھے جاتے جس سے اصل جوابی کاپیوں تک پہنچنا بہت آسان تھا۔ یہ صورت حال دیکھتے ہوئے سب سے پہلے پنجاب یونیورسٹی نے 1976 میں ایم اے کے امتحان میں فرضی رول نمبر لگانے کا آغاز کیا۔ جن امیدواروں نے نشانیاں لگائیں حتیٰ کہ جنہوں نے بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی لکھا، ان کے بھی ناجائز ذرائع (UMC) کے کیس بنا دیے گئے مگر سٹوڈنٹس یونین نے وہ کیس ختم کرا دیے۔ بعد میں آنے والے امتحانات میں یونیورسٹیوں اور تعلیمی بورڈز نے فرضی یا Fictisious رول نمبر لگانے شروع کیے تو امیدواروں نے نشانیاں لگانا شروع کر دیں۔ جوں ہی امتحان ختم ہوتے اور پرچے مارک کرنے کے لیے ممتحنوں کے گھروں کو بھیجے جاتے تو اساتذہ (خصوصاً ٹیوشنرز) اور امیدوار یا ان کے سرپرستوں کے قافلے مختلف شہروں کی طرف مطلوبہ پرچوں کے نمبر لگوانے اور بڑھانے کے لیے نکل پڑتے۔ جوابی کاپیوں کے بنڈل کے ساتھ ایک میمونام کا فارم ہوتا جس پر ممتحن کو بھیجی گئی جوابی کاپیوں کے اصل رول نمبر لکھے ہوتے اس لئے میمو دیکھ کر ہی مطلوبہ کاپی کے اس ممتحن کے بنڈل میں ہونے یا نہ ہونے کا پتہ چل جاتا۔ اس سلسلے میں سکول والوں کا اتحاد مثالی ہوتا تھا۔ سکول کے ایک دوست استاد نے بتایا کہ سکول کے اساتذہ کا اس ضمن میں ایک طے شدہ طریقِ کار تھا۔ ہر تحصیل کی سطح پر موجود ممتحن اپنے بنڈل کے میمو کی فوٹو کاپی ایک متعین کردہ استاد کو بھیج دیتے لہذا نمبر لگوانے والے قافلے اس استاد سے ملتے جو میمو کو چیک کر کے انہیں سیدھا متعلقہ ممتحن کی طرف بھیج دیتا۔ انٹر کی کی نسبت میٹرک میں فرضی رول نمبر لگانے کی روایت بہت بعد میں شروع ہوئی۔ ان دنوں یہ بھی معروف ہوا کہ پہلی پوزیشنیں اور اچھے نمبر لینے والے امیدواروں کی اکثریت اساتذہ کے بچوں کی ہوتی تھی۔ خواجہ فرید کالج کے پرنسپل سید برکت علی سہروردی نے کالج کے داخلی امتحان میں مختلف کلاسوں کے پوزیشن ہولڈر طلبا کے لیے انعام کے طور پر لاہور کا ایک ٹور ترتیب دیا اور وہاں سیکریٹری ایجوکیشن سے ملاقات بھی کرائی اور جب انہیں یہ بتایا گیا کہ یہ طلبا کالج کے امتحان میں پوزیشن ہولڈر

ہیں تو انہوں نے فوراً پوچھا: ’’ان میں اساتذہ کے کتنے بچے ہیں؟‘‘ نمبر لگوانے والے قافلوں کی مختلف شہروں میں آمد کا سلسلہ یونیورسٹیوں اور بورڈز کے امتحانات کے پرچے آنے کے بعد شروع ہو جاتا اور اس وقت تک جاری رہتا جب تک کہ پرچے نشان زدہ ہو کر واپس نہ چلے جاتے۔ اس وقت میڈیکل داخلوں کا ٹیسٹ نہیں ہوتا تھا اور ایف ایس سی کے نتائج کی بنیاد پر ہی داخلوں کا میرٹ بنتا تھا۔ ایسے واقعات بھی رپورٹ ہوئے کہ اس طریقے سے نمبر کچھ زیادہ ہی آ گئے تو انہیں کم بھی کرایا گیا مگر اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اس طرح سے نمبر حاصل کرنے والے جب میڈیکل کالجوں میں داخل ہوئے تو نہ چل سکے اور انہیں چھوڑ کر گھر واپس آنا پڑا اور کوئی اور شعبہ اختیار کرنا پڑا۔ اس ضمن میں ایک دو مصدقہ واقعات بتانے پر اکتفا کرتا ہوں۔ میری بیوی کی سگی بھانجی ڈاکٹر صوفیہ نورین (جن کے اب تینوں بچے بھی ڈاکٹر ہیں اور ان کے میاں جناب محمد خالد آج کل بھاشا ڈیم کے پرنسپل انجینئر ہیں) نے اَسّی کی دہائی کے دوسرے نصف میں جب قائداعظم میڈیکل کالج بہاول پور میں میڈیکل میں داخلہ لیا تو ہوسٹل میں ان کی ایک روم میٹ ایک معروف پروفیسر کی بیٹی تھی مگر وہ ڈاکٹر بننے کی طرف مائل نہیں تھی۔ ان کے والد نے چند بار ڈاکٹر صوفیہ نورین سے اسے سمجھانے کو کہا مگر وہ چل نہ سکی اور اس نے بی اے میں داخلہ لے کر ایم اے انگلش کیا۔ اسی طرح رحیم یار خان میں بھی ایک معروف پروفیسر کا بیٹا میڈیکل کالج میں نہ چل سکا تو اسے بزنس کرنے پر لگا دیا گیا۔ کافی برسوں تک یہ سلسلہ جاری رہا تا آنکہ صرف پنجاب کے تعلیمی بورڈز نے مرکزی مارکنگ کا سلسلہ شروع کر دیا جس میں پرچے گھروں میں بھیج کر مارکنگ کرانے کی بجائے بورڈ کی عمارت ہی میں مرکزی مارکنگ کا سلسلہ شروع کر دیا، اگلے مرحلے میں سائنس کے مضامین کے پرچے ایک بورڈ سے دوسرے بورڈز کو انٹر بورڈ مارکنگ سسٹم کے تحت بھیجنا شروع کر دیے۔ جب بہاول پور کے علاوہ رحیم یار خان اور بہاولنگر میں سنٹر بنا کر مرکزی مارکنگ کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر ضلع کے پرچے دوسرے ضلعوں کے سنٹرز میں بھیجے جانے لگے۔ اگلے سالوں میں پرچہ سازی سے نشان زدگی تک کے مراحل کو کافی حد تک فول پروف بنانے کی کوشش کی گئی مگر یونیورسٹی صرف انگریزی لازمی اور چند سائنس کے پرچوں کی مرکزی مارکنگ تک محدود رہی اور وہاں دیگر مضامین کے پرچوں کو نشان زدگی کے لیے فرضی رول نمبروں کے ساتھ اب بھی ممتحنوں کے گھروں کو ہی بھیجا جاتا ہے۔ تعلیمی بورڈ تو اب سوالیہ پرچہ سازی سے لے کر جوابی کاپیوں کی مارکنگ اور نتائج کی تیاری اور اعلان تک تمام نظام ڈیجیٹل کر چکے ہیں۔ پرانے وقتوں میں رزلٹ کے اعلان والے روز ہر شہر سے ایک دو کتب فروش نتیجے کا چھپا ہوا گزٹ خرید کر لے آتے تھے اور بیس روپے میں ایک رول نمبر کا نتیجہ بتاتے تھے۔ اب جس دن نتیجے کا اعلان ہوتا ہے تمام بورڈز کے گزٹ اسی روز پی ڈی ایف فارمیٹ میں ڈیجیٹل ایپس پر دستیاب ہوتے ہیں۔

یہ بات میں نے پہلے بھی کسی جگہ لکھی ہے کہ بہاول پور کی تاریخ سے آگاہ ہونے کے لیے رحیم یار خان کے صدر دروازے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح رحیم یار خان کے بارے میں جاننے سے پہلے بہاول

پور کی تاریخ کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔۔ اٹھارویں صدی کے دوسرے ربع میں رحیم یار خان کا علاقہ شکار پور کے داد پوتروں یا عباسیوں کی جولان گاہ بننا شروع ہوا اور 1751 میں ایک داد پوترہ سردار فضل علی ہلانی نے یہاں کے ویرانے کو اپنا مسکن بنایا اور اس کا نام ''پھل وڈا'' رکھا۔ بعد میں اس کا نام نوشہرہ پڑ گیا جسے 1881 میں ریلوے حکام کی درخواست پر بدلنا پڑا۔ نواب صادق محمد خاں چہارم کے ولی عہد کے نام پر رحیم یار خان رکھا گیا۔ ریاست کے دیگر شہروں اور قصبوں کی طرح یہ شہر بھی ترقی کے مراحل طے کرنے لگا۔ ستلج ویلی پروجیکٹ کی تکمیل اور دوامی اور غیر دوامی نہروں کے ذریعے یہاں ایک زرعی انقلاب آیا اور متعدد آبادکاری سکیموں کے تحت پنجاب سمیت تمام ہندوستان سے لوگ یہاں آباد ہوئے۔ اسی دوران اسے ضلع کا درجہ ملا اور امپرومنٹ ٹرسٹ کے تحت اس کو جدید خطوط پر استوار کیا گیا۔ 1953 تک احمد پور شرقیہ بھی بطور تحصیل اس میں شامل رہا۔ 48-1947 میں یہاں پر پیکجز، لمز یونیورسٹی اور نیسلے کے مالکان سید برادران (سید واجد علی، سید امجد علی اور سید بابر علی) نے عباسیہ ٹیکسٹائل ملز اور لیور وجی ٹیبل گھی اور صابن فیکٹری کے یونٹس لگائے جن میں پبلک کے ساتھ بہاول پور ریاست کے حصص بھی تھے۔ یہ خاندان پاکستان بننے سے پہلے برٹش فوج میں ہمہ قسم کے ٹھیکوں کے کاروبار کے لیے معروف تھا۔ یہ علاقہ کاٹن یا کپاس کا حب بن گیا اور اس کے فروغ کے لیے رابرٹ کاٹن ایسوسی ایشن (RCA) نے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔

اس ضلع کی دوسری تحصیل خان پور کو گڑھی اختیار خاں کے مقابلے میں انیسویں صدی کے پہلے ربع میں آباد کیا گیا اور آئندہ ایک صدی تک اس شہر کو بطور نظامت یا ضلع کا درجہ حاصل رہا۔ یہ وہی شہر ہے جو بہترین کھوئے اور گُٹ کے کٹوروں کے لیے معروف تھا اور خان پور کٹورہ کہلاتا تھا۔ یہیں سے براستہ ظاہر پیر، خواجہ غلام فرید کے شہر اور جائے تولد چاچڑاں شریف تک ریلوے لائن بچھائی گئی۔ کسی نے اس شہر کے نام کے ساتھ لگے سابقے کے حوالے سے یہ توضیح بھی پیش کی کہ یہ دریائے سندھ اور چولستان کے درمیان جہاں واقع ہے جغرافیائی لحاظ سے یہ جگہ کٹورے کی مانند نشیب میں واقع ہے۔ 1973 کے سیلاب میں اس شہر کے ڈوبنے کی وجہ اسی بات کو قرار دیا جاتا ہے۔

رحیم یار خان کی تیسری تحصیل صادق آباد کے بارے میں ایک محقق پرویز صادق کہتے ہیں جب ریلوے سٹیشن قائم ہوا تو یہاں ''صادق ورند'' نام کی بستی آباد تھی جس کے نام پر اس کا نام صادق آباد پڑ گیا۔ اس وقت احمد پور لمہ کو انتظامی لحاظ سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ 1936 میں صادق آباد کو منڈی شہر کے طور پر بسایا گیا اور یہ شہر یزمان، فورٹ عباس، ہارون آباد اور صادق گنج جیسے منڈی شہروں کا ہم عمر ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس زرعی شہر نے فوجی فرٹیلائزر اور متعدد شوگر ملوں کی صورت میں زرعی اور صنعتی شہر کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اس ضلع کی چوتھی تحصیل کا نام لیاقت پور 1952 میں رکھا گیا۔ اس کا پرانا نام چودری تھا اور یہاں محض ایک ریلوے سٹیشن تھا۔ تحصیل ہیڈ کوارٹر نوابوں کا پہلا بسایا ہوا شہر اللہ آباد تھا جسے لیاقت پور منتقل کر دیا گیا۔

اب مجھے اس علاقے اور شہر میں آئے ہوئے 14 سال ہو گئے تھے اور میں یہاں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی مختلف جہتوں سے واقف ہو چکا تھا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اس علاقے کے معاشرتی اور تہذیبی مزاج کا جائزہ لے لیا جائے۔

ضلع رحیم یار خان تہذیبی اور معاشرتی اعتبار سے منفرد اور غیر معمولی حیثیت کا حامل ہے۔ اس کے صحراؤں میں جہاں ہزاروں سالوں کے تہذیبی راز دفن ہیں وہاں یہ زندگی کے جدید ترین اور غالب رجحانات کا مرکز بھی ہے۔ گویا ضلع رحیم یار خان میں انسان کے قدیم سے جدید دور کے معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی سفر کے ارتقائی عمل کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ایک طرف تو عظیم صحرائے چولستان کے ٹیلوں میں زندگی کا فطری اور قدیم انداز اور رنگ موجود ہے جب کہ دوسری جانب زندگی جدید ترین شعور اور انداز کے تحت بھی جلوہ گر ہے۔ یہاں کی تہذیبی زندگی کی تشکیل و ترتیب میں مختلف عوامل نے مختلف ادوار میں اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے۔ موہنجو دڑو اور ہڑپہ سے بھی قدیم تہذیب کے مدفن، ان تہذیبوں کے درمیان اشتراک اور رابطہ، سندھ کے قرب کی وجہ سے لسانی و ثقافتی اشتراک، چولستان کا طرز حیات، دریا کے ساتھ ساتھ قدیم مقامی آبادی کی تہذیبی میراث، مختلف آبادکاری سکیموں کی ترغیبات کے تحت ہندوستان کے مختلف علاقوں اور پاکستان کے مختلف صوبوں اور شہروں سے آبادکاروں کی آمد سے اور تقسیم کے بعد مہاجرین بشمول پنجابی اور اہل زبان (اردو) کے معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی تال میل نے ضلع رحیم یار خان کو منی پاکستان کا درجہ دے دیا ہے۔ ان تمام معاشرتی گروہوں نے اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھی اور عمل اور ردعمل، تغیر پذیری اور باہمی اثر پذیری سے ان کی خوبصورتی میں اضافہ بھی ہوا ہے۔ یہاں کے طرز زندگی، رسم و رواج اور روایات پر زرعی معاشرے کی اقدار اور اسلامی رنگ نمایاں ہے تاہم غیر مسلم بھی اپنی اپنی تہذیبی شناخت کے ساتھ موجود ہیں۔ یہاں پر بسنے والوں کو تین بڑے تہذیبی گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1۔ چولستانی لوگ قدیم اور فطری انداز کے ساتھ چولستان کے صحرائی ٹیلوں کے بیچ بستے ہیں یہ لوگ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بھیڑ، بکریاں، گائے اور اونٹ پالتے ہیں۔ ان کے جانور ٹیلوں پر اگنے والی قدرتی گھاس اور صحرائی و جنگلی جھاڑیاں کھا کر گزارا کرتے ہیں۔ مسلم اور غیر مسلم اقوام پر مشتمل یہ لوگ اپنے جانوروں کو صحرا میں چرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ ہر جانور پر ہر قوم اور قبیلے کا اپنا نشان کندا کر دیا جاتا ہے جس سے اس کی شناخت آسان ہو جاتی ہے۔ یہاں پر پانی غیر معمولی گہرا اور پینے میں ناقص ہے لہٰذا وہ بارش کے اس پانی کو استعمال کرتے ہیں جو مختلف نشیبوں میں واقع ٹوبوں (Pools) میں جمع ہو جاتا ہے۔ یہ عام طور پر اپنی رہائش ٹوبوں کے قریب رکھتے ہیں اور جب موسم گرما میں ٹوبے خشک ہو جاتے ہیں اور چولستان میں موت رقص کرتی ہے تو یہ وہاں سے کوچ کا نقارہ بجاتے ہوئے بنجاروں کی طرح میدانی علاقوں کا رخ کرتے ہیں۔ صحرا میں کنویں کھود کر جانوروں کو پانی پلانے کا تھوڑا بہت رواج رہا ہے مگر وہ پانی انسانوں کے

لیے مضر ہوتا ہے۔ فطرت کے قریب تر انتہائی سادگی سے زندگی بسر کرنے والے یہ لوگ اپنی رہائش کے لیے خاص طرز کے جھونپڑے بناتے ہیں جنہیں وہ گوپا یا چھاوری کہتے ہیں۔ ان جھونپڑوں کی بناوٹ یہاں کی آب وہوا اور موسمی تغیرات کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر چہ ان صحرا نشینوں کے ہاں بھی مختلف لہجے اور بولیاں ملتی ہیں مگر لہجوں کا غالب رجحان مارواڑی زبان کی طرف ہے جو سندھی اور سرائیکی کا مرکب لگتا ہے۔ یہاں کا لباس صحرا کی قدیم روایات کا امین ہے۔ چولستانی مرد تہبند، کرتا اور بڑی بڑی پگڑیاں اور اجرک بطور لباس استعمال کرتے ہیں جو زیادہ تر مقامی سطح پر تیار کیے جاتے ہیں۔ ان کی عورتیں گھگرا، بھوشن اور اجرک کا استعمال کرتی ہیں جو موٹے سوتی دھاگے سے بنائے جاتے ہیں۔ ہاتھوں میں کلائی سے کہنی تک یا اس سے بھی اوپر تک ہاتھی دانت اور اب پلاسٹک کی کڑا نمائی چوڑیاں پہننے کا رواج ہے۔ ان کی پوشاکوں یا لباس کے رنگ بہت تیز ہوتے ہیں۔ صحرا کی کچھ آزمودہ خودرو جھاڑیوں اور درختوں کے پتوں کو بھی خوراک کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ صحت اور تعلیم کی سہولتوں کا وہاں کوئی تصور نہیں۔ ان میں ہر کوئی کسی نہ کسی مرشد پیر یا بزرگ سے جذباتی، مذہبی اور رومانوی وابستگی رکھتا ہے۔ خوراک کے طور پر وہ گائے، بھیڑ، بکری یا اونٹ کا دودھ استعمال کرتے ہیں اور دودھ کے ساتھ اناج کی چپاتی بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ ان کے روٹی پکانے کا ایک منفرد طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ کم پانی کے ساتھ گندھے ہوئے سخت آٹے کی موٹی سی چپاتی بنا کر سورج یا آگ سے گرم کی گئی ریت کے نیچے دبا دیتے ہیں اور کچھ دیر بعد نکال کر مزے لے کر کھاتے ہیں۔ شادی بیاہ اور بچے کی پیدائش کے رسم ورواج سے صدیوں سے چمٹے ہوئے ہیں اور انہیں اگلی نسلوں کو منتقل کرتے چلے آرہے ہیں۔ کچھ عرصہ سے چولستان کے موجودہ صحرائی علاقے کو نہری پانی کے ذریعے آباد کرنے کے منصوبے کے تحت یہاں کی اراضی چولستانیوں میں تقسیم کرنے کے بارے میں سنا جا رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے چولستان ڈویلپمنٹ اتھارٹی قائم کی گئی ہے۔ اس سے ان کے طرز زندگی میں تبدیلیوں کی توقع ہے۔ گرمیوں میں بالخصوص اور سردیوں میں بالعموم چولستان کے صحرا سے نکل کر آباد علاقوں میں محنت مزدوری اور دیگر مروجہ طریقوں سے روزی کمانے کو ترجیح دیتے نظر آتے ہیں مگر یہ چند لوگ ہیں جن کے اندر پرواز کی امنگ ہے مگر اکثریت ایسے چولستانیوں کی ہے جو اپنے پرکھوں سے وراثت میں منتقل ہونے والے طرز زندگی سے الگ ہونے یا اس میں غیر معمولی تبدیلی لانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

2- مقامی باشندے وہ لوگ ہیں جو کئی پشتوں سے اس علاقے میں رہتے چلے آرہے ہیں۔ ان لوگوں کا مسکن زیادہ تر ریلوے لائن اور دریائے سندھ کے درمیان کا علاقہ ہے جہاں وہ صدیوں سے کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہیں۔ جدید نہری نظام سے قبل یہاں پر آبپاشی کے ذرائع میں سیلابی نہریں، دریائی شاخیں یا ان سے تشکیل پانے والی ڈیم نما جھیلیں اور کنویں شامل تھے۔ اس علاقے کا پانی میٹھا اور فصلوں اور جان داروں کے لیے بہت مفید ہے۔ ان لوگوں کے ہاں زرعی زمینوں پر بنائے گئے کنوؤں کے پاس رہائش اختیار

کرنے کا رواج تھا۔ ایک ہی قبیلے کے لوگ چند گھروں پر مشتمل ایک بستی بسا لیتے، گاؤں بسانے کا رواج ان کے ہاں بہت بعد میں آیا بل کہ وہی بستیاں پھیل کر گاؤں بن گئے۔ ایک ایسے گاؤں کا رواج بھی تھا جہاں ضروریات زندگی اور زرعی پیشہ ورانہ ہنرمند دستیاب ہوتے۔ 1866 کے بعد جب اس علاقے میں آبپاشی کے ذرائع کی اصلاح ہوئی تو یہاں کاشتکاری کے رجحان کو فروغ حاصل ہوا۔ اسی دور میں یہاں جاگیردارانہ نظام کی تشکیل ہوئی۔ اس نظام کے مزاج اور خصوصیات نے یہاں کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی پر دور رس اثرات مرتب کیے۔ جاگیردار کی شخصیت کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی اور شعور کا ارتقائی عمل سست روی کا شکار ہوا۔ یہ لوگ جاگیردار کے مفادات کا خیال رکھنا اپنا نصب العین تصور کرتے تھے جس سے ان کی محنت اور صلاحیت کے استحصال کی روایت عام ہوئی۔ چوں کہ یہ علاقہ ریاست بہاول پور کے قیام سے قبل سندھ کا حصہ رہا ہے اس لیے یہاں کے لوگوں کی زبان، رہن سہن اور طرز عمل پر سندھی تہذیب و معاشرت کے اثرات مرتب ہوئے جو اب بھی مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔ یہ لوگ بہت سادہ اور محبت کرنے والے ہیں، طبیعت میں انکساری اور عجز ہے، اسلامی رسم و رواج سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں، یہاں کے معاشرتی ڈھانچے میں سردار کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی عزت کرنا اور اس کے فیصلوں کو ماننا یہاں کی ریت ہے۔ بزرگوں کا احترام کرنا ان کے خمیر میں شامل ہے۔ کسی بھی بزرگ سردار یا اہم شخصیت کو ملتے وقت جھک کر اس کے قدم چھوئیں گے اور زبان کی چاشنی اس پر مستزاد ہوتی ہے، پھر ہاتھ ملائیں گے یا گلے ملیں گے۔ کئی افراد اپنی افتاد طبع کے مطابق دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کریں گے۔ ایک دوسرے کو پکارنے کے لیے لفظ "سائیں یا سئیں" کا استعمال کیا جاتا ہے جو جناب، سرکار یا آقا کا متبادل ہے۔ یہاں کی معاشرتی زندگی میں قبائلی مزاج کا بہت دخل رہا ہے۔ یہاں کے جھگڑوں کا بنیادی سبب زن زر اور زمین ہے۔ کوئی جھگڑا یا تصادم طول بھی پکڑ لیتا ہے جو پشت در پشت چلتا ہے۔ اپنی دین پرستانہ سرشت کے باعث دینی اور مذہبی شخصیات سے غیر معمولی جذباتی وابستگی رکھتے ہیں۔ پیر پرستی اور تعویذ گنڈے کا رواج عام ہے۔ پیر یا مرشد سے بے حد عقیدت کے باعث مزاروں پر جا کر منتیں ماننا عام ہے۔ شادی بیاہ کی رسموں پر زرعی رنگ غالب ہے۔ وٹے سٹے اور خاندانی شادیوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ قبیلے یا قوم سے باہر شادی کرنے کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے جس کے باعث بچوں کی شادیاں کم سنی میں ہی کر دی جاتی ہیں مگر اس میں اب اتنی شدت نہیں رہی۔ خاندانی شادیوں کی رسم میں جائیداد کا اہم کردار رہا ہے، ان کے ہاں دو شادیوں کا رواج ان کی معاشرت کا اہم جزو ہے جب کہ دو سے زیادہ شادیاں کرنے کی رسم اب جزوی طور پر ترک کی جا چکی ہے۔ آبادکاری کے عمل نے ان میں تحریک پیدا کی ہے اور مقامیوں نے بھی آبادکاروں کے شانہ بشانہ کالونی ایریا میں زمینیں الاٹ کرائی ہیں۔ آبادکاروں کے ساتھ مقابلے کے رجحان اور سڑک اور بجلی کی فراہمی نے ان کے شعور میں اضافہ کیا ہے۔ یہ لوگ تعلیم کے فوائد سے آگاہ ہو رہے ہیں۔ شہروں سے رابطہ، شہروں میں منتقلی کے رجحان اور دیگر عوامل کے باعث ان لوگوں

میں تبدیلی کا عمل تیز ہوا ہے۔ کاشتکاری کے قدیم طریقے ترک کیے جا چکے ہیں۔ جاگیرداری نظام کی گرفت نسبتاً کمزور ہو رہی ہے اور مقامی آبادی کا پرانا معاشرتی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ یہ لوگ قدیم تہذیبی میراث کی بنیاد پر جدید دور سے ہم آہنگ ایک نئی شناخت قائم کرنے کے عمل سے گزر رہے ہیں۔

3- آبادکار صحرا میں پھول اگانے والے لوگ ہیں جن کی محنت نے مقامی آبادیوں کو بھی انسپائر کیا اور مقامی لوگوں نے بھی انہیں خوش آمدید کہا۔ ضلع رحیم یار خان میں آبادکاری کے دو مراحل ہیں، پہلا مرحلہ 1870 میں اور دوسرا ستلج ویلی پروجیکٹ کے ساتھ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے وسط سے شروع ہوتا ہے۔ پہلی آبادکاری سے میٹھے پانی کے زون میں یعنی ریلوے لائن سے دریا کے وسطی علاقے میں جنگل نما زمینوں کو صاف کر کے پرانے آبپاشی کے ذرائع کی اصلاح کی گئی۔ دوسری آبادکاری ریلوے لائن کے دوسری جانب شروع کی گئی جہاں چولستان کے صحرا کی پیاس جدید نہری نظام کے تحت آنے والے پانی سے بجھائی گئی تو اس نے خزانے اگلنا شروع کر دیے۔ پہلے 50 سالوں میں لوگ برصغیر کے مختلف حصوں سے مختلف ترغیبات کے تحت آئے جب کہ دوسرے مرحلے کی آبادکاری میں زیادہ تر پنجاب کے مختلف شہروں سے لوگ آ کر آباد ہوئے۔ 1947 اور اس کے چند سال بعد تک یہاں آبادکاروں کی آمد اپنے نکتہ عروج پر پہنچ گئی۔ یہ تمام لوگ اپنے رہن سہن، طور طریقے اور ثقافتیں اپنے ساتھ لائے۔ ان کے ساتھ پنجابی زبان کے مختلف لہجوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان کا اصل لہجہ بھی آیا۔ پنجاب کے آبادکار سادہ طرز زندگی کے حامل اور جفاکش ہیں اور ان کی محنت ہی سے چولستان کے ٹیلے سرسبز و شاداب خطے میں تبدیل ہوئے۔ تمام آبادکاری سکیموں کی شرائط میں ایک مشترک شرط یہ تھی کہ زمین الاٹ کرانے والے لوگ چکوک کے لیے مختص رہائشی احاطوں پر ایک خاص مدت شاید ایک سال کے دوران گھر تعمیر کریں گے اور ان میں رہائش بھی لازمی طور پر رکھیں گے سوائے کسی استثنائی صورت کے، اس کی بھی ڈسٹرکٹ کلیکٹر سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ ان چکوک کو منصوبہ بندی کے تحت بسایا گیا۔ کھلی کھلی سڑکیں نکالی گئیں، ہر چک کے درمیان ایک چھوٹی سی مارکیٹ کے لیے جگہ مخصوص کی گئی اور چک کے باہر کی جانب زرعی پیشہ ورانہ خدمات سرانجام دینے والے ہنرمندوں کی رہائش اور ان کے اڈوں کا اہتمام کیا گیا۔ ان چکوک کی آبادی کی کو مالکِ زمین، مزارع اور زرعی خدمات مہیا کرنے والوں کی کلاسز میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ آبادکاروں کو شروع میں ٹیلوں کو برابر کرتے وقت دقتیں پیش آئیں تاہم ان کی جا فشانی اور مستقل محنت نے سب ممکن کر دکھایا۔ آبادکار مردوں کے شانہ بشانہ ان کی خواتین بھی بعض زرعی امور میں ان کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ غریب کسانوں کی خواتین عموماً پردہ نہیں کرتیں اور گھروں سے منسلک جگہوں پر جانوروں کی دیکھ بھال اور دودھ دوہنے وغیرہ کے کام سرانجام دیتی ہیں۔ یہ لوگ دن میں 10 سے 12 گھنٹے کام کرنے والے ہیں۔ زمین کی ملکیت، مویشی اور دولت ان کے ہاں اچھے سٹیٹس کی علامت ہیں۔ اسلام سے گہری جذباتی وابستگی رکھنے والے یہ لوگ عام طور پر جوائنٹ فیملی سسٹم کے قائل ہیں۔ ان کے ہاں وٹا سٹہ کی

شادی کا رواج بھی پایا جاتا ہے۔ یہ خاندانی شادیوں کو ترجیح دیتے ہیں تاہم اس طبقے کے پڑھے لکھے لوگوں میں یہ بات بنیادی اہمیت کی حامل نہیں رہی۔ جائیداد کے جھگڑے نپٹانے کے لیے مقدمہ بازی کا رجحان رکھتے ہیں۔ان لوگوں کے ہاں شروع سے ہی آگے بڑھنے، کمانے اور ترقی کرنے کی امنگ پائی جاتی ہے لہٰذا یہ لوگ تعلیم کی اہمیت سے آگاہ ہیں۔

کالونی ایریا کے تمام چکوک میں لڑکے اور لڑکیوں کے کم از کم پرائمری سکول موجود رہے ہیں جو اب مڈل اور ہائی سکولوں کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ان چکوک میں صحت وغیرہ کی ابتدائی سہولتیں بھی میسر ہیں۔ عطائی ڈاکٹروں کے یہاں مستقل ٹھکانے ہیں۔ زراعت کے پیشے سے کمائی جانے والی دولت نے ان میں شہروں کی طرف منتقل ہونے کی رجحان کو فروغ دیا ہے اور دیگر تہذیبی گروہوں کی نسبت ان کے ہاں شہروں میں رہائش اور تجارت کا پیشہ اختیار کرنے کا رواج زیادہ ہے۔ زراعت میں میکانکی طریقے اپنانے، شہروں میں منتقلی اور تجارتی امور میں کلیدی کردار اختیار کرنے سے ان کے معاشرتی ڈھانچے میں تبدیلی کا عمل خاصی دیر سے جاری ہے۔ تعلیم کو غیر معمولی اہمیت دینے کے باعث ان کے ہاں شرح خواندگی دیگر کی نسبت زیادہ ہے۔ان کی کوششوں کے باعث زرعی معاشرے کی کوکھ سے صنعتی رجحان جنم لے رہا ہے۔ آبادکاروں میں ایک ثانوی گروپ ایسے مہاجروں کا ہے جو ہندوستان یا پاکستان کے کچھ علاقوں سے منتقل ہوئے مگر انھوں نے زرعی شعبے کی بجائے تجارت، تعلیم، سرکاری ملازمتوں اور متفرق پیشوں سے وابستہ ہونے کو ترجیح دی اور ان میں اردو بولنے والے افراد سرفہرست ہیں۔ان اہل زبان کا زمیندار ہونا کم ہی سنا گیا ہے۔ تمام آبادکاروں کے باعث علاقے میں مقابلے کی فضا قائم ہوئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ تجارت، تعلیم، زراعت اور دیگر شعبوں میں مقامی باشندوں میں بھی آگے بڑھنے کا رجحان عام ہوا ہے

متذکرہ بالا تینوں تہذیبی اور معاشرتی گروہوں میں چولستانی گروہ اپنی ہیئت کے لحاظ سے پسماندہ اور غیر تغیر پذیر ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اس کا جغرافیائی اور صحرائی ارضیاتی ماحول ہے کہ جس کی گود میں یہ تہذیب پروان چڑھی ہے۔ اس میں بیرونی تہذیبوں کے انجذ اب کے خلاف بھرپور مدافعتی قوت موجود ہے یہی وجہ ہے کہ صدیاں گزرنے کے باوجود اس تہذیبی گروہ نے زبان اور سماجی حوالے سے صحرائے چولستان کی طرح اپنی قدیم شناخت برقرار رکھی ہوئی ہے۔ مقامی باشندوں اور آبادکاروں نے البتہ مختلف سطحوں پر ایک دوسرے کے اثرات کو قبول کیا ہے۔ علاوہ ازیں ان دونوں گروہوں نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے اندر تبدیلیوں کا عمل جاری رکھا ہے اور جدید تعلیم، شعور اور ادراک نے ان کی تبدیلیوں کو جذب کرنے کی قوت میں اضافہ کیا ہے۔ اس وجہ سے ضلع رحیم یار خان میں یہ دونوں صدر گروہ ہی نمایاں ہیں جو جدید معاشرتی رجحانات کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ان دونوں غالب گروہوں کے ذریعے تشکیل پانے والی جدید معاشرتی اکائی کا جدید خطوط پر عمرانی جائزہ و تجزیہ دلچسپی کا حامل ہوگا۔ جن اصولوں کی بنیاد پر تجزیہ کیا گیا ہے ان میں کچھ تو

عمومی ہیں اور کچھ کا اطلاق خاص اس علاقے پر ہوتا ہے۔

1۔ضلع رحیم یار خان پر مکمل طور پر زرعی معاشرے کی اقدار کی چھاپ ہے مگر اس کے بطن سے آہستہ آہستہ صنعتی کلچر بھی فروغ پا رہا ہے۔ جدید زراعت اور معیشت میں جدید ٹیکنالوجی پر مشتمل زرعی آلات متعارف ہونے سے فرد کے شعور کا ارتقائی عمل تیز تر ہوا ہے۔

2۔کچھ عرصہ قبل تک یہاں جاگیرداری نظام اپنی کلاسیکل شکل میں موجود تھا جس کے اثرات اب بھی یہاں کی سیاست اور معاشرت پر نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں تاہم جدید معاشرتی عمل و ردِعمل کے سبب صنعتی کلچر کے فروغ نے اس کو غیر مستحکم کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔اسی طرح ایک اور تبدیلی بھی آئی ہے کہ آج کے جاگیردار میں صنعت کار بننے کا رجحان پیدا ہو رہا ہے اور ضلع سے باہر جانے کی بجائے وہ مقامی طور پر صنعتوں میں سرمایہ کاری کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ جاگیرداری کے بتدریج اِضمحلال اور صنعتی ماحول کی نشوونما سے یہاں کے فرد میں اپنے حقوق کا ادراک ہو رہا ہے۔

3۔ذات،قوم اور نسل سے جذباتی اور رومانوی وابستگی یہاں کی معاشرت کا خاصہ ہے۔ کچھ قوموں میں اپنی پسماندگی کا احساس اور نسلی تفاخر شدید تر ہے۔ یہ احساس اس قوم کے افراد کو ایک دوسرے سے وابستہ کرنے پر اکساتا ہے جب کہ کچھ قوموں کے ہاں ترقی یافتہ ہونے کا احساس اپنے گرد حصار کھینچنے کا سبب بنتا ہے۔ذات و برادریوں اور قوموں سے وابستگی کے تحت تعلقات اور رشتے ناطے قائم کرنے کا عام رواج رہا ہے تاہم اب یہ خول ٹوٹنا شروع ہوا ہے اور اب بین الذاتی شادیوں کا رواج آہستہ آہستہ تقویت پکڑ رہا ہے۔اطلاعاتی ذرائع اور جدید تعلیم یہاں کے فرد کی سوچ کو ذاتوں اور برادریوں کی حدود سے باہر کھینچ رہے ہیں۔

4۔چوں کہ یہاں آبادکاری سکیموں کے تحت تقسیم سے بہت پہلے اور اس کے بعد برصغیر کے تمام علاقوں سے لوگ آ کر آباد ہوئے اور وہ اپنی زبانیں اور لہجے بھی ساتھ لائے اس لیے مختلف افراد کا لسانی اشتراک بھی یہاں معاشرتی تعلقات کی بنیاد بنتا ہے بل کہ ضلع رحیم یار خان کے معاشرتی ڈھانچہ میں لسانی اشتراک کی بنیاد پر بھی متعدد سماجی فورم موجود ہیں تاہم جدید شعور کے باعث یہ لسانی حصار اور تعصب کم ہو رہا ہے۔تمام لسانی گروہ ایک دوسرے کی زبان اور بولیاں سمجھنے کے ساتھ ساتھ مقامی طور پر بولی جانے والی زبانوں کو اس قدر اصل (اوریجنل) لہجے کے ساتھ بولتے ہیں کہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

5۔مہاجر ہجرت کر کے جب ایک جگہ آباد ہوتا ہے تو وہ محنت اور لگن سے سرشار ہوتا ہے کیونکہ اسے اپنی زندگی اور اس کے وسائل کا نئے سرے سے آغاز کرنا پڑتا ہے جب کہ مقامی آبادی ہجرت کی تکلیف سے ناآشنا ہوتی ہے۔ایسے میں اپنی محنت کے بل بوتے پر آبادکاروں کا وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھا کر مقامی لوگوں کے مقابلے میں بہتر مالی و معاشرتی مقام حاصل کر لینا قدرتی بات ہے۔ضلع رحیم یار خان میں 1870 سے آبادکاری کا سلسلہ شروع ہوا جو ستلج ویلی پروجیکٹ کی کالونی یا آبادکاری کی سکیموں سے بہت تیز ہو گیا اور 1947 کے بعد

انتہا کو پہنچ گیا۔ جدید طریقہ ہائے معاش سے آباد کاروں نے صحرا کو کھیتوں میں تبدیل کر دیا۔ کالونی ایریا کے چکوک میں زیادہ تر آباد کار آباد ہوئے۔ انہوں نے یہاں کے تجارتی وسائل پر بھی غلبہ حاصل کر لیا اس سے مقامی آبادی اور آباد کاروں کے درمیان لاشعوری سطح پر ایک نفسیاتی تصادم نے جنم لیا اور اس تصادم کا اظہار مختلف مواقع پر ہوتا ہے رہتا ہے خصوصاً بلدیاتی و قومی انتخابات وغیرہ میں مگر یہ اظہار اتنا شدید نہیں ہوتا کہ جس سے یہاں کی معاشرتی زندگی متاثر ہو سکے۔

6 - رحیم یار خان میں طبقاتی معاشرہ مکمل شکل میں موجود ہے اور یہاں مڈل کلاس سے اوپر کے طبقوں میں جانے کا احساس شدید اور عمل تیز تر ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں تجارت کو اولیت دی جاتی ہے کیوں کہ کلاس کی تبدیلی میں تجارت کا پیشہ زیادہ کارگر اور معاون ثابت ہوتا ہے۔ یہاں مڈل کلاس کے الجھاؤ (Complexes) اپنی مکمل شکل میں پائے جاتے ہیں جس کے باعث دیگر شہروں کی نسبت مہنگائی کی شرح نسبتاً زیادہ ہے۔ چند سال قبل بی بی سی ریڈیو لندن نے اپنی ایک رپورٹ میں رحیم یار خان کو اسلام آباد کے بعد دوسرا مہنگا شہر قرار دیا تھا۔ خریداری کے دوران چند پیسوں کے بقایا جات کو وصول کرنا قابل شرم تصور کیا جاتا ہے۔

7 - پاکستان کے دو چار بڑے شہروں کے بعد رحیم یار خان وہ پہلا شہر ہے جہاں دیہات سے شہر کی طرف منتقلی کو زیادہ فروغ حاصل ہوا ہے جس سے شہری آبادی کے حجم میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ مزید برآں گذشتہ تین دہائیوں کے دوران رحیم یار خان کی آبادی میں آٹھ گنا اضافہ ہوا ہے۔ ان سب عوامل سے معاشرتی تعلقات کے نئے معیارات قائم ہوئے ہیں۔

8 - ضلع رحیم یار خان میں زرعی معاشرے کے اثرات کے تحت جوائنٹ فیملی سسٹم کا رواج ہے۔ اس طرح تقریباً ہر گھر میں تین نسلوں کی ٹرائیکا موجود ہے جس سے تضادات، ذہنی ناہمواریوں اور نسلی بُعد کا احساس اور اظہار شدید تر ہے۔ پہلی یعنی بزرگ نسل زیادہ تر ناخواندہ یا کم خواندہ ہے اور قدامت پرستی اور خلائی تسخیر کے عہد سے قبل کے شعور کی حامل یہ نسل غیر سائنسی انداز فکر میں پختہ ہو چکی ہے۔ دوسری یا جوان نسل کے افراد شعوری اور لاشعوری طور پر خلائی تسخیر اور اس کے بعد کے سائنسی انکشافات سے متاثر ہوئے اور ان کا شعور جدید عہد سے ہم آہنگ ہے جب کہ جدید نسل ہر طرح سے جدید شعور کی حامل ہے۔ جدید اور بزرگ نسل میں طرز فکر اور طرز احساس کا غیر معمولی بُعد پایا جاتا ہے۔ ان دونوں نسلوں کے درمیان جوان نسل پُل کا کام کر رہی ہے۔ اس سوشل ٹرائکا کے درمیان پائے جانے والے تضادات کو ہر گھر میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

9 - جدید اطلاعاتی ذرائع اور موسمی تبدیلیوں نے یہاں کے افراد کے طرز فکر، مزاج، محسوسات اور رویوں کی تشکیل میں خصوصی کردار ادا کیا ہے۔

میں نے ضلع رحیم یار خان میں آبادی کے تین صدر گروہوں کی معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی ہیئت (سٹرکچر) بیان کرنے کے بعد نو نکات پر مشتمل اخذ کردہ نتائج تیس سال قبل تحریر کیے تھے۔ تین دہائیوں

کے بعد ان کو نئے سرے سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔۔

رقبے کے لحاظ سے ضلع رحیم یار خان جنوبی پنجاب کا سب سے بڑا ضلع ہے۔ 2023 کی مردم شماری کے مطابق ضلع رحیم یار خان کی کل آبادی، 55، 64، 703 نفوس پر مشتمل ہے اور افزائش آبادی کی سالانہ شرح +2.47% بتائی گئی ہے۔ مختلف زبانیں بولنے والوں کے اعداد و شمار فی الحال 2017 کے دستیاب ہیں جن کے مطابق 48،07،762 نفوس پر مشتمل آبادی میں سرائیکی، پنجابی، اردو، سندھی اور بلوچی بطور مادری زبانیں بولنے والوں کا تناسب بالترتیب 64.91 فیصد 24.89% 2.99% 1.85% اور 1.49 فیصد جب کہ دوسری زبانیں مثلاً باگڑی، چولستانی اور ہریانوی زبانوں کا تناسب 2.01 فیصد تھا۔ جہاں تک تعلیمی سہولتوں کا تعلق ہے تو سیاسی لیڈر جو بیک وقت جاگیردار اور سرمایہ دار بھی ہے، اس کی کوششوں اور سیاسی منشا سے ضلع رحیم یار خان کے تمام اہم شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں پرائمری سکول سے ہائر سیکنڈری سکولز تک کا ایک وسیع ترنیٹ ورک موجود ہے۔ ایک مدت تک ضلع بھر میں کل آٹھ گورنمنٹ کالج تھے جب کہ آج کالجوں کی تعداد 23 ہے۔ میاں والی قریشیاں میں بوائز کالج بھی منظور ہوا تھا جسے وہاں کی مقامی سیاسی منظوری نامل سکی اور اسے غالباً کوٹسمابہ منتقل کر دیا گیا۔ غیر معمولی تعلیمی سہولتوں کی فراہمی سے یہ پتا چلتا ہے سیاسی دانشمندی یا وزڈم نے یہ یقین کر لیا ہے کہ تیز تر اطلاعاتی انقلاب نے یہاں شعور کے عمل کو ایسی تحریک دی ہے کہ اگر وہ کام (ڈلیور) کریں گے تو عوامی رائے ان کے حق میں رہے گی۔ خواجہ فرید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے رحیم یار خان کیمپس کے علاوہ بڑے برانڈ کے پبلک و پرائیویٹ سکولز، کالج اور کیمپس اس پر مستزاد ہیں۔ ہر 8 پرائمری سکولوں پر ایک مڈل سکول، ہر 2 مڈل سکولوں پر ایک ہائی سکول اور 15 ہائی سکولوں پر ایک ہائیر سیکنڈری سکول کی نسبت سے کل 3225 (17116 بوائز اور 1509 گرلز) سکولوں کا وسیع تر نظام مصروف بہ عمل ہے جس نے یہاں کی خواندگی کی شرح میں کامیابی سے لامحدود اضافہ کیا ہے۔

پرانے جائزے میں یہ کہا گیا تھا کہ یہاں کا جاگیردار مقامی طور پر صنعت کار بننے کی طرف مائل ہو رہا ہے جو سچ ثابت ہوئی اور اب حقیقت یہ ہے کہ وہ مکمل صنعتکار بن چکا ہے جس کے باعث رحیم یار خان ضلع ایک مکمل صنعتی مرکز (Hub) کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ملک کے تمام بڑے صنعتی مراکز سے یہ ضلع ریل، ہائی ویز، موٹروے اور ہوائی سفر سے باہمی طور پر مربوط ہے۔ 6 شوگر ملوں، 2 کھاد کی فیکٹریوں، 3 ٹیکسٹائیل ملز اور دیگر چھوٹی بڑی صنعتوں کے قیام نے اس ضلعے کی کایا پلٹ دی ہے۔ اب یہ شہر نوشہرہ مائینر، بلجیم چوک اور اڈہ گلمرگ کی مثلث کے درمیان گھرا ہوا شہر نہیں رہا بل کہ چوک بہادر پور تا اقبال آباد، پیلس سے ترنڈہ سوائے خاں کے درمیان مکمل رہائشی سہولتوں سے مزین ہاؤسنگ کالونیوں اور قومی اور بین الاقوامی برانڈز میں گھرا ہوا شہر ایک نیا معاشرتی، تہذیبی اور شہری منظر نامہ مرتب کرتا نظر آتا ہے۔

چولستانی اپنی منفرد ثقافت کے خول میں ہمیشہ سے بند رہے اور انہوں نے اس خول سے باہر نکلنے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی البتہ چولستان ترقیاتی ادارہ چولستانیوں کی بہتری کی متعدد سکیموں پر عمل پیرا ہے۔ علاوہ ازیں چند غیر حکومتی تنظیموں (NGOs) نے بھی معاشرتی اور تعلیمی بہتری کے چند منصوبے شروع کر رکھے ہیں جس سے ان کی زندگیوں میں نا قابل محسوس تبدیلیوں کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔

1987 تک مجھے رحیم یار خان میں آٹھ سال ہو گئے تھے۔ اس وقت میں اس شہر کی معاشرتی، تہذیبی اور علمی و ادبی زندگی میں رچ بس گیا تھا اور سرائیکی زبان کو پختہ انداز میں بولنا شروع کر دیا کہ جیسے میں یہیں کا رہنے والا تھا اور اس شہر نے بھی مجھے اپنانے میں کسی ہچکچاہٹ کا اظہار نہیں کیا۔ متعدد دوستوں سے فیملی کی سطح کے تعلقات اور میل ملاپ تھا۔ ایک وقت غالباً 1982 کے دوران میرا، جی۔ این شاکر (انگلش)، محمد اظہر چودھری (بیالوجی) اور شوکت ضیا (اردو) کا گروپ بن گیا اور ہم نہر کنارے نئی متعارف شدہ گلیکسی مارکیٹ میں بیٹھ کر ہفتہ وار کھانا کھاتے۔ کڑاہی نئی نئی متعارف ہوئی تھی اور کڑاہی سے براہ راست کھانے کا اپنا لطف تھا۔ شوکت ضیا کچھ تاجرانہ ذہن رکھتے تھے۔ انہوں نے سیٹلائیٹ ٹاؤن۔2 (بعد میں گلشن اقبال) میں دس مرلے کا پہلا گھر تعمیر کیا تھا، اس سے پہلے ان کے گھر کے سامنے والی گلی میں ایک پانچ مرلے کا گھر تعمیر ہو چکا تھا۔ ہم اکثر اس سے وہاں ملنے جاتے اور ویرانہ ہی ویرانہ دیکھ کر سوچتے کہ اتنی دور کون آ کر یہاں بسے گا اور یہ کب آباد ہو گا مگر دیکھتے ہی دیکھتے گلشن اقبال کی بستی ایسی آباد ہوئی کہ وہ توسیعی سکیموں کے ذریعے پھیلتی چلی گئی۔ غلام سرور صدیقی نے خان پوراڈے کے عقبی کھیتوں کے ایک ویرانے میں 5 مرلے کا پلاٹ لے کر گھر بنایا تو اس تک پہنچنے کا راستہ ہی نہیں تھا، جس شخص نے تمام عمر کرایوں میں بسر کی ہو، اپنا گھر پا کر اس کی خوشی دیدنی تھی۔ 1990 میں شاید انہوں نے وہ گھر بیچ کر گلشن اقبال میں گھر بنایا جہاں میں ایک بار فیملی کے ساتھ مبارک باد دینے گیا تھا۔ خان پوراڈے کی عقبی زمین اب کمرشل ہو چکی ہے۔ ہر چیز بہت نارمل چل رہی تھی کہ 1986 کے ماہ جولائی میں میرے دوست اور بیالوجی کے استاد محمد اظہر چودھری عارضہ قلب کے باعث جواں مرگی کا شکار ہو گئے۔ ان کے جنازے میں گویا سارا شہر ہی امڈ آیا تھا۔ اپریل 1987 میں میرے اعلیٰ ظرف دوست اور مقبول ترین ڈاکٹر عبدالغفور بلوچ بھی کوچ کر گئے، ان دو لگاتار دھاکوں نے بہت دکھی کر دیا تھا۔ ان دو لوگوں کے جانے سے میرے لیے سارا شہر ہی ویران ہو گیا۔

جب میری رحیم یار خان کے خواجہ فرید گورنمنٹ کالج میں 1982 کے دوران دوبارہ تعیناتی ہوئی تو جناب شعیب عتیق خان اور جناب غلام سرور صدیقی کے ساتھ ''میزان'' کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی مگر وہ کالج تک محدود رہی اور زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ اس کے چھ سال کے بعد جب رحیم یار خان کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کا میں ایک ناگزیر حصہ بن چکا تھا اور یہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے ذاتی مراسم قائم ہو گئے تو یہاں کے ترقی پسند سوچ کے حامل دوستوں سے مل کر اس سوچ کو فروغ دیا کہ ایک ایسی ادبی، علمی اور ثقافتی تنظیم

قائم کی جائے جس کا موضوعاتی دائرہ کار ادبی کے ساتھ ساتھ علمی بھی ہو۔اس ضمن میں رحیم یار خان کے صحافی نذیر احمد گھلو کی مبارک ہوٹل میں تقریباً بیس دوست اکٹھے ہوئے۔ اس اجلاس میں وحید صدیقی، مولانا مقصود احمد، محمد طارق چودھری، محمد رمضان، اشرف پیرزادہ اور نسیم بلوچ پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اور اسے مندرجہ بالا مقصد کی روشنی میں دستور مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی اور اس دستور کو 13 اکتوبر 1988 کے اجلاس میں پیش کرنے کو کہا گیا۔ کنوینگ کمیٹی نے اپنے تین مسلسل اجلاسوں میں اس فورم کا نام "بزم فیض" تجویز کیا اور اس کا دستور مرتب کیا۔محمد طارق چودھری کے گھر ماڈل ٹاؤن میں منعقدہ 13 اکتوبر کے اجلاس میں شہر کے تقریباً پچاس ارباب فکر نے شرکت کی۔ اس میں ''بزم فیض'' کا نام منظور کر لیا گیا اور کنوینگ کمیٹی کے تیار کردہ دستور کی شق وار خواندگی کی گئی۔ اجلاس کے شرکا کی تجاویز کی روشنی میں ترامیم کر کے اسے زیادہ قابل عمل اور حقیقت پسندانہ بنایا گیا۔ اس اجلاس کو ''تاسیسی اجلاس'' اور اس میں شریک افراد کو بزم فیض کے ''تاسیسی ارکان'' کا نام دیا گیا۔ اس میں متفقہ طور پر مندرجہ ذیل عہدیداران کا انتخاب عمل میں لایا گیا:

صدر: شیخ عظیم اشرف۔ نائب صدر: مولانا مقصود احمد۔ جنرل سیکریٹری: نسیم بلوچ۔ جوائنٹ سیکریٹری: اشرف علی پیرزادہ، فنانس سیکریٹری: محمد طارق چودھری۔ اس اجلاس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ بزم فیض کا ماہانہ علمی اور ادبی اجلاس ہر ماہ کی پہلی جمعرات کو منعقد ہوا کرے گا۔ چوں کہ کسی بھی فورم کی کامیابی کے لیے کسی مستقل جگہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے لہٰذا اجلاس کا مقام مولانا مقصود احمد کا گارنش پبلک اسکول مقرر کیا گیا۔ اگرچہ تاسیسی اجلاس میں بزم فیض کے بنیادی خط وخال واضح کر دیے گئے تھے تاہم اس کی عملی صورت اس کے پہلے اجلاسوں کے بعد ہی سامنے آ سکتی تھی۔ بزم فیض کا پہلا علمی و ادبی اجلاس 27 اکتوبر 1988ء کو ہوا جس میں اراکین کی شرکت بڑی بھرپور تھی۔ اس میں خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان کے شعبہ بیالوجی کے استاد جناب طارق ندیم نے نظریہ ارتقاء پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس پر بحث میں حصہ لینے والے شرکاء نے اپنی اپنی فکر اور سوچ کے مطابق بڑی جاندار بحث کی اور اس طرح اس کے پہلے اجلاس ہی سے بحث کا ایک معیار قائم ہو گیا۔ اس بحث کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ تمام تر اختلاف رائے کے باوجود اس میں علمی رویّہ غالب رہا اور اسے غیر مناظرانہ انداز میں آگے بڑھایا گیا۔ اس نشست میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ بزم فیض کے آئندہ اجلاس ہر دوسری جمعرات کو ہوا کریں گے اور ہر دو اجلاسوں میں سے ایک اجلاس ادبی اور دوسرا اجلاس علمی ہوا کرے گا لہٰذا اس کے دوسرے اجلاس میں خالد محمود نے اپنی غزل تنقید کے لیے پیش کی۔ اس غزل پر گفتگو اراکین کے بہترین ادبی اور تنقیدی شعور کا مظہر تھی۔ اس کے بعد بزم فیض کے اجلاس باقاعدگی سے منعقد ہونے لگے۔ اس میں زیر بحث موضوعات کا دائرہ کار وسیع تھا اور ان پر گفتگو کا انداز متوازن، علمی اور غیر مناظرانہ تھا۔ اس میں شرکت کرنے والے افراد میں اضافہ ہوا۔ اس علمی اور ادبی فورم کی گونج دور دور تک سنی گئی۔ ایک اور اضافہ یہ کیا گیا کہ اگر مقالہ نگار یا ادیب کسی مجبوری کے باعث نہیں آ سکتا تو اجلاس ملتوی کرنے کی بجائے کسی قومی و بین

الاقوامی اہمیت کے موضوع پر گفتگو کی جائے۔اس کے لیے یہ طریقہ اپنایا گیا کہ کوئی ایک رکن متعلقہ موضوع پر بحث کا آغاز کرتا اور باقی شرکا باری باری اس موضوع پر بحث میں حصہ لیتے۔ یہ طریقہ بھی اختیار کیا گیا کہ اگر کبھی تفصیلی و تحقیقی مقالہ دستیاب نہ ہوتا تو کوئی رکن یا دلچسپی رکھنے والا شخص کسی ایک موضوع کو تحریری یا زبانی متعارف کراتا اور شرکا اس موضوع پر بحث میں حصہ لیتے۔موضوع گفتگو اور بحث کے یہ تمام انداز بزم فیض کی مستقل روایت بن چکے تھے۔ اراکین کی تجاویز کی روشنی میں مقام کی تبدیلی کا تجربہ بھی کیا گیا۔ 30 جولائی 1990 سے چند ماہ کے لیے بزم فیض کی نشستیں ضلع کچہری کے بار روم میں منعقد ہوئیں جہاں سے اسے پھر گارنش پبلک اسکول منتقل کر دیا گیا۔ چند اجلاسوں کے بعد اراکین نے مقام کی تبدیلی کی تجویز پیش کی تو بزم فیض کے صدر جناب عظیم اشرف شیخ کے گھر کا انتخاب ہوا۔ 1991 سے 1994 تک اس کے اجلاس یہیں پر منعقد ہوتے رہے۔22 اگست 1994ء تک بزم فیض اپنے 120 اجلاس پورے کر کے رحیم یار خان کی علمی و ادبی تاریخ میں نیا باب رقم کر چکی تھی۔

میں نے اکتوبر 1988ء سے لے کر ستمبر 1994ء تک تقریباً چھ سال ''بزم فیض'' میں بحیثیت سیکرٹری کام کیا اور جب میں نے بہاول پور منتقلی کا فیصلہ کیا تو بزم کے تحت ایک خاص نشست منعقد کی گئی جس میں دوستوں نے میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور رجسٹر کاروائی اور دیگر دستاویز نئے نامزد شدہ سیکرٹری کے حوالے کر دی گئیں۔ میرے جانے کے بعد جی اے طارق ایڈووکیٹ صدر اور پرویز الحسن صادق سیکریٹری مقرر ہوئے۔ان کے بعد محمد رمضان جتالہ ایڈووکیٹ صدر اور اشرف پیر جی سیکریٹری کے طور پر کام کرنے کے لیے آگے بڑھے، ان تمام کی کوششوں سے بزم فیض کچھ عرصہ 1997 تک کام کرتی رہی لیکن عظیم اشرف اور وحید صدیقی کی ناگہانی رحلت سے بزم فیض کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور ہوتے ہوتے یہ کل دس سال سے بھی کم عرصے کے بعد یعنی 2004 تک معدوم ہو گئی تاہم آج بھی رحیم یار خان کے ادبی حلقوں کے حافظے میں بزم فیض کا نام محفوظ ہے۔

وفاقی وزارت اطلاعات کے تحت مختلف ڈویژنل ہیڈ کوارٹرز اور منتخب اضلاع میں ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے لیے نیشنل سنٹرز قائم کیے گئے اور ہر سنٹر کے ساتھ ایک لائبریری بھی منسلک تھی۔ رحیم یار خان کے حصے میں بھی ایک نیشنل سنٹر آیا جس کے اسسٹنٹ ریذیڈنٹ ڈائریکٹر جناب صدیق طاہر تھے۔ وہ خود شاعر تھے اور سابق ریاست بہاول پور کی تاریخ و تہذیب کے محقق بھی۔ یہاں کے صحافتی حلقوں میں وہ بہت مقبول تھے کیوں کہ صحافیوں کی حسب ضرورت تربیت بھی کرتے تھے اور انہیں تحریری مواد از قسم پریس ریلیز اور خبروں کے ڈسپیچ بھی تیار کر کے فراہم کرتے۔ انھوں نے بھی اپنے سنٹر میں متعدد اجلاس منعقد کیے مگر موضوعات کی کوئی قید نہیں تھی۔ میں بھی ان کو ملنے اور لائبریری سے استفادہ کے لیے اکثر وہاں چلا جایا کرتا تھا۔ ایک دن میں نیشنل سنٹر میں دیگر چار یا پانچ دوستوں کے ساتھ موجود تھا کہ صدیق طاہر نے کہا'' آج اقوام متحدہ کے عالمی

کردار'' پر بحث مقصود ہے۔انہوں نے بات کا آغاز کیا تو تمام لوگوں نے اس ادارے کے بنیادی فرائض میں مختلف ممالک کے درمیان جنگوں کا باعث بننے والے معاملات کو اس کے فرائض قرار دیا مگر میں نے ایک مختلف زاویے سے بات کی۔ میں نے کہا کہ اقوام متحدہ کے اصل فرائض میں دنیا سے بھوک کے پھیلاؤ کا سد باب بھی ہے کیوں کہ آئندہ اسی بھوک کی وجہ سے بھی جنگیں ہوا کریں گی۔ میرے اس نقطۂ نظر کی تمام شرکا نے اتفاق کیا۔

مجلسی تنقید کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالخالق کے ''حلقہ دوستاں'' نے بھی مجموعی طور پر بہت اچھا کام کیا۔اس حلقے میں پہلے ہر سوموار کو فلسفہ اور تاریخ کا مطالعہ اور مباحثہ کیا جاتا اور ہر جمعہ مذہبی و اسلامی تاریخی مطالعات و مباحث کے لیے مخصوص تھا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے رحیم یار خان میں پہلا نجی ہسپتال بنایا تو وہ صرف جمعہ کو دستیاب ہونے لگے تو سوموار والے مطالعات و مباحث کو بھی جمعہ کے دن پر رکھ دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر پر یہ محفل 30 سال تک چلتی رہی مگر میں اس کا چھ سال حصہ رہا۔اس میں تمام شرکا جن کی تعداد محدود تھی، مکمل مختلف نظریات اور فکر کے حامل تھے مگر وہاں پر ہونے والی بحث ہمیشہ علمی دائرے میں رہ کر کی جاتی۔اس کے علاوہ رحیم یار خان میں آنے والے شاعروں اور ادیبوں میں سے بعض کے ساتھ اس حلقے میں بھی نشستوں کا اہتمام کیا جاتا رہا۔ میں جب بہاول پور منتقل ہوا تو 1995 میں پروفیسر غلام سرور صدیقی اور 1997 میں عظیم اشرف کی وفات سے اس حلقے کو بہت ضعف پہنچا تاہم حلقہ کسی نہ کسی طور جاری رہا تا آنکہ ڈاکٹر صاحب کی طویل علالت اور رحلت کے باعث یہ طویل روایت ختم ہوگئی۔

رحیم یار خان کی صحافتی تاریخ میں روزنامہ ''وفاق'' کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے کیوں کہ یہاں کا پہلا روزنامہ ہے۔1965ء میں ''وفاق'' کے مدیر مصطفیٰ صادق نے لاہور کے ساتھ ساتھ رحیم یار خان سے بھی شائع کرنا شروع کیا۔اس اخبار کے اندر کے دو صفحات لاہور سے تیار ہو کر آتے اور باہر کے صفحات رحیم یار خان میں شائع ہوا کرتے تھے۔روزنامہ ''وفاق'' روزنامہ کی حیثیت سے خاصی دیر تک مقامی صحافت پر راج کرتا رہا تا آنکہ 1982ء میں ضیاء اللہ نے روزنامہ ''شہادت'' کا اجرا کیا۔اس اخبار نے جب خبروں کو منفرد انداز اور نئے ذائقے کے ساتھ پیش کیا تو سرکولیشن کے اعتبار سے یہ بہاول پور ڈویژن کا سب سے بڑا اخبار بن گیا اور کچھ عرصہ تک یہ اخبار صادق آباد سے فورٹ عباس تک پڑھا گیا مگر بعد میں سرکولیشن کے مسائل اور دیگر وجوہات کے باعث یہ اخبار سرکولیشن کا معیار برقرار نہ رکھ سکا۔ دو باتوں کے باعث اس اخبار کو مقامی صحافت کے رجحان ساز اخبار کا مقام حاصل رہا۔ایک تو یہ کہ علاقائی اور مقامی صحافت میں اس میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی کو اختیار کیا گیا اور روزنامہ جنگ کی طرز کے شاہکار نستعلیق پروگرام کو خرید کر اخبار کی کمپوزنگ کا کام لیا گیا تھا اور پھر رحیم یار خان اور بہاول پور کے بیشتر اخبارات اور جرائد شہادت کے کمپیوٹر کی کمپوزنگ کے ذریعہ شائع ہونے لگے۔ دوسری اہم بات جو روزنامہ شہادت نے شروع کی وہ مقامی صحافت میں کالم نگاری کی روایت

تھی۔سجاد لاکھا کا ''نوک نشتر'' عقاب صحرائی کا ''ناشتہ'' اور میرا ''آئینہ''، ''براہ راست'' اور ''ادب نما'' اور راؤ تہذیب حسین خان کا ''حالِ دل'' اپنے موضوعات کے تنوع اور سنجیدہ گفتگو کے لیے بہت پسند کیے گئے۔اس کی روشنی میں دیگر مقامی اخبارات نے بھی کالم کی روایت کو اپنایا مگر کچھ عرصہ بعد یہ مشکل پسند روایت برقرار نہ رکھی جا سکی کیوں کہ مقامی صحافت کی محدود ریڈرشپ کے باعث کالم نگاری اتنی ناگزیر نہیں کہ اس کی عدم موجودگی سے سرکولیشن میں کوئی بڑا فرق پڑ سکے تاہم زیادہ تر اخبارات میں کوئی ادیب صحافی کبھی کبھار کوئی ''مشق کالم'' کر لیتا تھا مگر اس میں باقاعدگی نہیں تھی۔اب تو مقامی اخبارات کے ساتھ ساتھ دو قومی اخبارات کے رحیم یار خان ایڈیشن بھی شائع ہو رہے ہیں اور مقامی صحافی یہاں سے شائع ہونے والے تمام اخبارات میں کالم نگاری کر رہے ہیں جس میں مقامی کے ساتھ قومی موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی جاتی ہے۔

1990ء کے اواخر میں روزنامہ شہادت نے مقامی سطح پر کالم نگاری کی روایت کا آغاز کیا تو میں 1991 سے 1993 کے دوران ہفتے میں ایک یا دو کالم لکھتا رہا۔ان کالموں کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا اور صرف 35 کالم دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گئے۔ان دستیاب کالموں کے عنوانات کی زمانی ترتیب سے مرتب کردہ فہرست ذیل میں دی گئی ہے۔ان کالموں کی فہرست کے کل 35 کالموں میں 19 ادبی، ثقافتی اور تعلیمی، 2 سیاسی اور 14 سرکاری محکمہ جات کے موضوعات کے بارے میں ہیں۔ذیل میں موضوعاتی تقسیم کے تحت کالموں کی ترتیب دی گئی ہے۔

الف۔ادبی کالم: 1-نیشنل سنٹر (مرحوم) کی یاد میں 2-ڈی سی کا اعلان اور رحیم یار خان کے مشاعرے 3-انارکلی حقیقت یا افسانہ (1) 4-انارکلی حقیقت یا افسانہ (2) 5-انارکلی حقیقت یا افسانہ (آخری گفتگو) 6-شاباش! ینگ تھنکرز فورم 7-منظور محسن کی نظم ''مثالی لوٹے'' کے بارے میں 8-ضلع رحیم یار خان کا گزٹیئر 1984ء کہاں گیا؟ 9-گورنمنٹ کالج خان پور کے میگزین ''بانگ سحر'' رحیم یار خان نمبر کے لیے تعاون کی اپیل 10۔رحیم یار خان کا ادبی منظر نامہ (1) 11-رحیم یار خان کا ادبی منظر نامہ (2)

ب۔ثقافتی کالم: 1-رحیم یار خان کے آثار قدیمہ (1) 2-رحیم یار خان کا ثقافتی جمود اور مذہبی حلقے 3-رحیم یار خان کا ثقافتی جمود 4-رحیم یار خان کا آثار قدیمہ 5۔رحیم یار خان کا آثار قدیمہ اور ادارہ تاریخ و تذکرہ کے پرویز صادق سے گفتگو۔ج۔تعلیمی کالم 1:-ایم اے کے امتحانی سنٹر کی بحالی۔ایک چیلنج 2-رحیم یار خان میں سفارشی قافلوں کی آمد (1) 3-رحیم یار خان میں پرچوں کا تعاقب کرنے والے قافلوں کی آمد (2) د۔سیاسی کالم: 1-رحیم یار خان کی سیاسی نمائندگی کا پس منظر و پیش منظر 2-صوبائی اسمبلی میں ضلع رحیم یار خان کی نمائندگی۔۔۔گذشتہ تیس سال کا جائزہ۔باقی کالموں کا موضوع ضلع بھر کے شہری مسائل سے تھا جن کا یہاں ذکر کرنا ضروری نہیں۔

ذیل کی سطور میں ضلع رحیم یار خان کے ماضی و حال کی تہذیبی، معاشرتی، علمی و ادبی پہلوؤں کی

بازیافت کی کوشش کی گئی ہے جو میرے سولہ سالہ قیام کے دوران میرے مشاہدات اور تحقیقی کاوشوں کے نتیجے میں سامنے آئے۔

ضلع رحیم یار خان علمی اور ادبی لحاظ سے ماضی کی سیاسی اور معاشرتی زندگی سے پوری طرح مربوط ہے۔ ماضی میں یہ علاقہ سیاسی جغرافیائی اور معاشرتی لحاظ سے یکسر مختلف تھا۔ اڑھائی ہزار سال قبل کے دو بڑے شہروں ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی دریافت سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ ضلع رحیم یار خان کا علاقہ وادی سندھ کی تہذیب کا اہم مرکز رہا ہے۔ بعد کے انکشافات سے یہاں وادی ہاکڑا کی تہذیب کا سراغ ملا۔ سندھ کے ساتھ واقع ہونے کے باعث 512 قبل مسیح میں یہ علاقہ ایرانی سلطنت کا حصہ بنا۔ تیسری صدی قبل مسیح میں یہ علاقہ مہاتما بدھ کی تعلیمات کے زیر اثر رہا۔ "پتن مینارہ" اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ہندو برہمنوں کے اثرات بھی مرتب ہوئے۔ اس سرزمین نے اسی زمانے میں سکندر اعظم کے حملوں کا بھی اثر قبول کیا۔ پھر یہاں سندھ کے ساتھ موریہ، کشان اور رائے خاندانوں کا تسلط قائم ہوا۔ مؤخر الذکر خاندان نے تو یہاں 495 عیسوی کے بعد 137 سال حکومت کی، ان کا دارالخلافہ الور تھا جس کے بارے میں زیادہ گمان یہی ہے کہ ضلع رحیم یار خان میں واقع تھا۔ بہاول پور ڈویژن کے تینوں اضلاع کا علاقہ ان کے چار صوبوں میں سے ایک تھا۔ سرواہی، بھٹہ واہن اور مؤ مبارک کے شہر اس دور سے بہت قبل کی یادگاریں ہیں۔ اس کے بعد اور داؤد پوتراہ خاندان کی حکومت کے درمیانی عرصہ میں یہ علاقہ سندھ، پنجاب، راجستان پر حکومت کرنے والے مقتدر خاندانوں کے زیر تسلط آتا رہا حتیٰ کہ داؤد پوترا خاندان نے اپنے ہی خاندان کے کلہوڑوں کے ہاتھوں طویل کشمکش کے بعد شکار پور میں شکست کھا کر ادھر کا رخ کیا اور چودری (موجودہ لیاقت پور) کی جاگیر کے حصول کے بعد اس علاقے میں اپنی حکومت قائم کی۔ الہ آباد (تحصیل لیاقت پور) میں شہر بسا کر اسے اپنا پہلا گھر بنایا۔ اس وقت خان پور کا کوئی وجود نہیں تھا۔ رحیم یار خان پُھل وڈا کے نام کی ایک بستی ٹیلے پر آباد تھی۔ صادق آباد اور لیاقت پور تو ایک صدی سے بھی زیادہ بعد کی بات ہیں۔ گویا ریاست بہاول پور کا قیام بنیادی طور پر ضلع رحیم یار خان میں عمل میں آیا۔ ایک عرصے تک یہی سرزمین ریاست کا مرکز بنی رہی تا آنکہ 1748 میں بہاول پور کا نیا شہر بسا کر بہاول خان اول نے اسے اپنا دارالخلافہ بنایا۔ داؤد پوتروں نے جب ریاست کو وسعت دینے کے لیے علاقائی سرداروں کو تابع کرنے کی اپنی کوششوں کا آغاز کیا تو یہ علاقہ لڑائیوں کا مرکز بن گیا۔ کئی شہر اجڑے، کئی بسائے گئے، کئی قلعے مسمار ہوئے، کئی تعمیر ہوئے۔ تین چوتھائی صدی کے اس عرصہ کے دوران کی لڑائیوں نے یہاں کی معاشرتی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس دوران کے اہم انتظامی مراکز میں احمد پور شرقیہ، الہ آباد، گڑھی اختیار خان، احمد پور لمہ اور خان پور کے نام قابل ذکر ہیں۔

1833 کے 14 نکاتی معاہدے کے تحت جب ریاست میں انگریزوں کا عمل دخل شروع ہوا تو انتظامی سطح پر لائی جانے والی تبدیلیوں اور منصوبوں کے اثرات اس علاقے پر بھی مرتب ہوئے۔ یہاں کے

معاشرتی اورتہذیبی ڈھانچے میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ برصغیر کی تحریک آزادی اور دیگر واقعات سے یہ علاقہ بھی بالواسطہ اور بلاواسطہ متاثر ہوا۔ خان پور کا قصبہ دین گڑھ 1917 کی ریشمی رومال تحریک کا اہم مرکز رہا۔ اس کے ایک اہم کردار مولانا عبید اللہ سندھی دین گڑھ میں مدفون ہیں۔ تین اکتوبر 1947 کو ریاست بہاول پور کے الحاق پاکستان پر دستخط ہوئے تاہم اس کی علیحدہ شناخت بحال رہی۔ 1953 تک احمد پور شرقیہ ضلع رحیم یار خان کا حصہ رہا۔ 1955 میں ون یونٹ بنا تو ریاست کو مغربی پاکستان میں ضم کر دیا گیا۔ اگر چہ 1870 کے بعد برصغیر کے مختلف حصوں سے لوگ ریاست میں آباد ہونا شروع ہو گئے تھے مگر 1926 میں شروع ہونے والے ستلج ویلی پروجیکٹ کی 1933 کے آس پاس تکمیل ہوئی تو یہاں آبادکاری کے رجحان میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اب یہاں مقامی سرائیکی آبادی کے علاوہ مختلف لسانی ثقافتی اور تہذیبی گروہ پائے جاتے ہیں۔ ان تمام گروہوں کے مابین معاشی اور معاشرتی تعلقات سے نئی اور مخلوط معاشرتی اکائی وجود میں آئی ہے۔

ضلع رحیم یار خان سرائیکی پٹی کا اہم ترین حصہ ہے۔ آبادکاری سسٹم کے متعارف ہونے سے پہلے ضلع رحیم یار خان کی اہم اور بڑی زبان سرائیکی رہی ہے اور اس علاقے میں ذرا تر یہی زبان اظہار کا واحد وسیلہ تھی۔ آبادکاری کے بعد اس علاقے میں دیگر زبانوں کی بول چال کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اگر ہم اس علاقے کے سرائیکی زبان کے ادب کا جائزہ لیں تو اس میں ابتدائی طور پر تو کہاوتیں، ضرب الامثال، محاورات اور پند و نصائح ملتے ہیں۔ اس کے بعد ہر زبان کی طرح سرائیکی زبان میں بھی پہلے پہل شعری ادب ہی ملتا ہے جس میں قدیم صنف دوہڑا ہے۔ سرائیکی کے دوہڑے اور لوک گیت ہی سرائیکی ادب کے قدیم نمونے ہیں۔ جب سرائیکی زبان آہستہ آہستہ اظہار کا مؤثر ترین وسیلہ بنی تو اس کی بیشتر اصناف سخن مذہبی عقائد و جذبات کے زیر اثر وجود میں آئیں جن میں مندرجہ ذیل اہم ہیں۔ نور نامہ، معراج نامہ، درود نامہ، جنگ نامہ، حلیہ مبارک۔ اس کے ساتھ ساتھ نعت، قصیدہ، مرثیہ، مناقب اور کافیاں بھی لکھی جاتی رہیں۔ عشقیہ مثنویوں، رباعیوں اور دیگر اصناف کے شاندار نمونے بھی ملتے ہیں۔ آئیں سب سے پہلے دور اول کے اہم شعراء کا سرسری ذکر کر لیں۔ مخدوم حمید الدین حاکم کا نام سرائیکی زبان و ادب کے ارتقا میں ایک غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے سرائیکی دوہڑوں اور قطعات کو گیارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کی وسطی مدت کے دوران سرائیکی زبان کا اہم نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ دوسرے نمبر پر محمد اعظم خان چانڈیو اور محمد قبول خان چانڈیو ہیں۔ چانڈیو قبیلے کے ان دونوں عظیم شعرا کا تعلق بھونگ سے ہے جو میران تالپور کے عہد میں پرگنا تھا اور اسے بھونگ بھارا کہتے تھے۔ تیسرے نمبر پر پیارے شہید ہیں۔ تیرہویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں سرائیکی زبان میں بہت سے جنگ نامے، معراج نامے اور نور نامے لکھے گئے۔ بھونگ بھارا کے اس صوفی اور درویش شاعر پیارے شہید نے ان اصناف میں بہت نام پیدا کیا۔ چوتھے نمبر پر مولوی لطف علی سرائیکی زبان کے وہ عظیم شاعر ہیں جنہوں

نے تخلیق اور انداز بیان کے لحاظ سے سرائیکی زبان کو نیا انداز بخشا۔ خواجہ غلام فرید نے بھی اس عظیم شاعر کو اپنا امام تسلیم کرتے ہوئے خراج عقیدت پیش کیا۔ مولوی لطف علی کو سرائیکی زبان کا میر حسن بھی کہا جاتا ہے۔ وہ 1716 میں قصبہ بہادر پور میں پیدا ہوئے اور 1794 میں 78 سال کی عمر پا کر فوت ہوئے اور مؤ مبارک میں دفن ہوئے۔ انہوں نے سرائیکی زبان میں مثنوی سیف الملوک لکھ کر نام پیدا کیا۔ ان کی مثنوی کو ''سیفل نامہ بالتحقیق'' کے نام سے بعد از ترتیب وتدوین وترجمہ جناب مجاہد جتوئی نے لاہور کے ایک پبلشر کے ذریعے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ اگلی شاعرہ دائی پھاپھل حفظانی ہیں۔ 1800 عیسوی کے لگ بھگ پیدا ہوئیں اور 71 برس کی عمر پائی۔ ان کے والد حکیم محمد کبیر بلوچ معروف طبیب تھے۔ مولانا برخوردار خوش دل فارسی کے عظیم عالم تھے جنہیں سرائیکی شاعری کا سعدی بھی کہا جاتا ہے۔ انہیں عربی پر بھی عبور حاصل تھا، انہیں خواجہ فرید اور ان کے خاندان کا استاد اور اتالیق ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ جیون خاتون نکمی دائی پھاپھل حفظانی کی چھوٹی بہن تھی جو 1835 میں پیدا ہوئیں اور 1898 میں وفات پاگئیں،

عمر خان شاہد بلوچ 1825 میں شیدانی شریف کے قریب ایک قصبے دبلی کبیر میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اور شاعری میں مولانا کبیر خان صابر بلوچ کی شاگردی اختیار کی۔ خواجہ غلام فرید کی صحبت میں رہنے سے بھی ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو جلا ملی۔ ان کی وفات 1912 میں ہوئی۔ سید جلال الدین شاہ کلیم سرائیکی شاعری کے ایک تابندہ ستارے ہیں، بدلی شریف کے سید خاندان سے تعلق رکھنے والے یہ شاعر 1846 عیسوی کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔۔ خواجہ فرید سے انہیں بے حد عقیدت تھی۔ اگرچہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں مگر ضلع رحیم یار خان کے قصبے بھٹہ وان میں جنم لینے والی داستان سسی پنوں کے لوک قصے کو اپنے والد محترم کے مشورے سے منظوم کیا۔ یہ مثنوی 1885 میں مکمل ہوئی۔ جہاں شاہ مجروح کا تعلق اللہ آباد سے ہے۔ یہ وہ شہر ہے جہاں سے داد پوتروں نے آغاز کیا۔ ان کے سادات گیلانی خاندان کا تعلق بغداد سے تھا جو سندھ آیا۔ وہاں سے نواب بہاول پور نے اس سادات خاندان کو الہ اباد میں آنے کی دعوت دی جہاں یہ شاعر 1831 میں پیدا ہوئے اور 1891 میں 60 سال کی عمر میں انتقال کیا۔ سید نبا ہو شاہ افگار ٹبی جھلن خان پور کے عالم گھرانے میں 1838 کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ اپنی کافیوں اور دوہڑوں کے باعث سرائیکی ادب میں اہم مقام کے حامل ہیں۔ اگرچہ اپنے ماحول کے باعث وہ ذہنی طور پر قدامت پسند تھے مگر ان کی شاعری جدت پسندی کا شاہکار ہے، 1898 میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مولانا احمد یار فریدی 1840 میں گڑھی اختیار خاں میں پیدا ہوئے۔ ان کا سپل نامی خاندان اس علاقے میں پشتوں سے آباد تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے مروجہ علوم کی تعلیم حاصل کی پھر تونسہ شریف کے چشتیہ سلسلے سے بیعت ہوئے۔ خواجہ غلام فرید کے ہم عصر ہیں اور خواجہ صاحب ان کو بہت قدر ومنزلت سے دیکھتے تھے۔ آپ کا انتقال 1895 میں ہوا۔ ان کا "دیوان محمدی" موسوم بہ "انوار فریدی" 1948 میں شائع ہوا آج کل ان کی گدی کے سجادہ نشین خواجہ غلام قطب الدین فریدی نے

گڑھی اختیار خان میں ان کے مزار کے ارد گرد ایک وسیع کمپلیکس تعمیر کرایا ہے۔ وہ خود بھی قادرالکلام شاعر ہیں جن کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

خواجہ غلام فرید سرائیکی ادب میں ایک عہد کا نام ہے۔ یہ نابغہ روزگار اور رجحان ساز شاعر سرائیکی ادب کا ایک اہم اور بڑا استون ہے جس سے سرائیکی شاعری کی عمارت نا صرف مستحکم ہوئی بل کہ اس عمارت کی خوبصورتی میں بھی اضافہ ہوا۔ انہیں ملک الشعرا اور رئیس المتغز لین اور دیگر خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ وہ سرائیکی زبان میں ایک مستقل دبستان شعر و فکر کے بانی ہیں۔ 1845 میں چاچڑاں میں پیدا ہونے والے اس قادرالکلام شاعر نے سرائیکی کے ساتھ ساتھ سندھی۔ فارسی، مارواڑی اور اردو میں بھی شاعری کی۔ انہوں نے سرائیکی زبان کو اظہار کا ایک مؤثر وسیلہ بنا کر جدید زبانوں کے ساتھ لا کھڑا کیا۔ تصوف، مناظر قدرت اور حسن و محبت کے مضامین کو مختلف اصناف سخن میں بیان کر کے سرائیکی زبان ادب کو اوج کمال تک پہنچایا۔ فلسفیانہ اور دقیق مضامین بھی ان کے اظہار کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں۔ ان کی شاعری میں روہی، اس کی ثقافت اور اس کی تمام خوبصورتی محفوظ ہوگئی ہے۔ ان کے ہاں چولستانی زندگی اپنے تمام پہلوؤں اور کیفیات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ خواجہ فرید پہلے اور بعد کے ادب کے درمیان ایک حد فاصل ہیں۔ نواب صادق محمد خاں پنجم نے ایک بورڈ قائم کیا تھا جس نے ان کے کلام کو دیوان کی شکل میں شائع کیا۔ خواجہ فرید فاؤنڈیشن رحیم یار خان کے تحت صدیق طاہر کا مرتب کردہ دیوان فرید 1989 میں شائع ہوا۔ جھوک پبلی کیشنز خان پور نے بھی ان کا دیوان شائع کیا۔ شفیق پبلی کیشنز چاچڑاں شریف نے بھی مسعود اشعر صدیقی اور ارشاد احمد امین کا مرتب کردہ خواجہ فرید کا اردو دیوان 1979 میں شائع کیا۔ اردو اکیڈمی بہاول پور نے ان کے دیوان کو جدید اور خوبصورت انداز میں شائع کیا ہے۔ دیوان فرید بالتحقیق کے نام سے مجاہد جتوئی نے بہت محنت کے ساتھ ترجمے کے ساتھ شائع کیا جس کی سافٹ کاپی اور وٹس ایپ پر دیوان فرید کا سلسلہ وار ترجمہ اور تشریح بہت مقبول ہوئی۔ خواجہ فرید کے اشعار اس علاقے میں اور پنجاب کی باروں کے مقامی لوگوں میں زبان زد خاص و عام ہیں۔ صالح محمد صالح 1908 میں الہ آباد لیاقت پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میاں محمد بخش لکھویرا تھا۔ صالح محمد صالح پیشے سے سنار تھے، دنیاوی تعلیم ادھوری چھوڑ کر احمد پور شرقیہ کے مولوی رحیم بخش مسرور کی صحبت اختیار کی اور ان کی علمی و ادبی صحبت نے صالح محمد کو شاعر بنا دیا۔ اگر چہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے کافی اور دوہڑے میں بھی کامیاب طبع آزمائی کی اور ایسی شاعری تخلیق تھی جو تمام سرائیکی پٹی کے لوگوں کے دلوں پر راج کرتی ہے۔ فقیر بخت علی کا تعلق پنجاب کے نون خاندان سے ہے۔ ان کے آباؤ اجداد پنجاب سے ترک سکونت کر کے احمد پور لمہ میں آ بسے۔ ان کے والد کا نام رانا نبی بخش ہے۔ انہوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی مگر بخشن خاں کے خواجہ پیر صالح محمد سیرانی کی صحبت نے ان کو وہ شعور بخشا کہ شاعر ہو گئے اور شاعر بھی ایسے کہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کر کے اپنی قادرالکلامی کا ثبوت فراہم کیا۔ سلطان محمود 1868 میں پیدا

ہوئے، ریاست بہاول پور کی فوج میں خدمات سرانجام دیں اور اپنے پیشے کے برعکس شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ سلطان محمود نے قصائد، مناقب اور مرثیہ کہہ کر سرائیکی شاعری میں معتد بہ اضافے کیے۔ عبدالحکیم اُچوی، اکبر شاہ، خرم بہاول پوری، محمد یار بلبل فریدی، ظامی بہاول پوری جیسے بڑے شعرا کا شمار بھی متقدمین میں ہوتا ہے۔ اسے حسن اتفاق کہیں کہ ضلع رحیم یار خان کے ادب کے پہلے دور کا آغاز مؤ مبارک کے حمید الدین حاکم سے ہوا اور اس کا اختتام اسی خاندان کے شاعر مخدوم محمد بخش سے ہو رہا ہے۔ رحیم یار خان کے معروف معالج ڈاکٹر مخدوم محمد حسین کے دادا مخدوم محمد بخش دوسرے بڑے شاعر ہیں کہ جنھوں نے مثنوی سیف الملوک کو منظوم انداز میں لکھ کر سرائیکی ادب میں بے حد اضافہ کیا۔ ان کے پوتے ڈاکٹر مخدوم محمد حسین نے 1992 میں سیف الملوک شائع کی۔ اس کے آغاز پر ڈاکٹر صاحب نے ایک بسیط دیباچہ تحریر کیا ہے جو ان کے تنقیدی شعور کا مظہر ہے۔

اب تک اس علاقے میں ادب سرائیکی زبان ہی میں تخلیق کیا جاتا رہا اور اس میں زیادہ تر شاعری شامل ہے مگر آبادکاری کے عمل سے اس علاقے کی معاشرت میں غیر معمولی تبدیلی آئی اور 1870 کے بعد برصغیر کے مختلف علاقوں سے آبادکار یہاں آنا شروع ہوئے مگر یہ عمل 1933 سے پہلے تک زیادہ تیز نہیں تھا۔ باہر سے آنے والوں کی مغائرت کو ختم کرنے کے لیے ریاستی شہریوں کی درجہ بندی کی گئی اور ریاستی درجہ اول دوم اور سوم کی اصطلاح وضع کی گئی۔ 1937 میں بننے والے اس قانون کے مطابق ریاستی آبادی کو تین درجوں میں تقسیم کیا گیا۔ درجہ اول میں 1880 سے پہلے، درجہ دوم میں 1880 سے 1926 کے درمیان اور درجہ سوم میں اس کے بعد آباد ہونے والے شامل تھے۔ 1926 میں شروع ہونے والے ستلج ویلی پروجیکٹ کی 1933 میں تکمیل ہوئی تو پنجاب اور دیگر صوبوں سے آبادکاروں کی آمد کا سلسلہ تیز تر ہو گیا اور یوں دیگر زبانیں بھی یہاں متعارف ہوئیں اور ان میں بھی ادب کی تخلیق کا آغاز ہوا جن میں اردو زبان سرفہرست تھی۔ جب ریاست بہاول پور کا قیام عمل میں آیا تو فارسی زبان کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ ہندوستان کی طرح یہاں بھی دفتری امور فارسی زبان میں سرانجام دیے جاتے تھے۔ 1833 میں ریاست بہاول پور میں ایک معاہدے کے تحت انگریزوں کا عمل دخل شروع ہوا اور اس کے بعد برصغیر کی طرح فارسی زبان کے دورِ انحطاط کا آغاز ہوا۔ اس دور میں اردو زبان اظہار کا ایک مؤثر وسیلہ بن چکی تھی لہٰذا پہلے پہل انگریز سرکار کی طرف سے جو مراسلے آتے ان کا اردو ترجمہ کروا کے نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا جاتا پھر فارسی زبان میں جو تھوڑی بہت مراسلت ہوتی تھی وہ بھی ختم ہو گئی اور اردو زبان ہی میں سرکاری خط و کتابت شروع کر دی گئی تاہم اس میں فارسی کی آمیزش زیادہ تھی۔ اردو کے ضمن میں ایک غیر معمولی واقعہ یہ ہوا کہ نواب صادق محمد خان چہارم کو 28 نومبر 1879 کو حکمرانی کے اختیارات عطا ہوئے تو پنجاب کے انگریز گورنر نے اس موقع پر اردو میں تقریر کی۔ نوابوں نے بھی اردو کی ترقی اور ترویج بھی دلچسپی لینا شروع کر دی حتیٰ کہ اردو زبان یہاں کے علم و ادب کی

زبان بن گئی اور اردو میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ ریاست بہاول پور میں سب سے پہلی کتاب "تاریخ مراد" ملتی ہے جو 1867 سے 1879 کے درمیان سید مراد شاہ نے لکھی۔ تاریخ کی دوسری اہم کتاب صادق التواریخ بھی 1899 میں اردو میں لکھی گئی مگر اس سے پہلے 1866 میں سرکاری اخبار "صادق الاخبار" جاری ہوا تو اس کی زبان بھی اردو تھی یوں ریاست بہاول پور میں اردو زبان کو بہت زیادہ فروغ ملا۔ یہاں تک کہ اس علاقے میں اردو زبان رائج ہو گئی اور علاقائی زبانوں کی اہمیت اپنی جگہ رہی مگر اردو قومی زبان کی حیثیت اختیار کر گئی۔ خواجہ فرید نے بھی اردو میں غزلیں کہیں۔ 1926 میں سنجر پور کے مبارک شاہ جیلانی نے ''لالہ صحر'' کے نام سے سہ ماہی ادبی مجلّہ اردو زبان میں نکالا گویا ستلج ویلی پروجیکٹ سے اس علاقے میں سرائیکی ادب بھی تخلیق ہوتا رہا، پنجابی ادب بھی تھوڑا بہت مل جاتا ہے مگر اردو تو علم و ادب کی زبان بن گئی اور یہاں کے ہر شاعر ادیب نے زیادہ تر اردو زبان ہی میں لکھا۔ اس دور کے شعراء اردو کے ساتھ ساتھ علاقائی زبان میں بھی ادب تخلیق کر رہے ہیں اور اس وقت کئی شعرا بیک وقت اردو، سرائیکی اور پنجابی میں لکھ رہے ہیں۔

سب سے پہلے شیخ عبدالعزیز اختر کا نام آتا ہے جو رحیم یار خان کے بزرگ ترین وکیل بھی تھے۔ انہوں نے 1940 کی دہائی اور اس کے بعد تک کی ادبی سرگرمیوں کے ضمن میں کلیدی کردار ادا کیا۔ نظم، غزل اور قطعہ یکساں مہارت کے ساتھ کہتے تھے۔ "جنبش لب" اور "دامن احساس" ان کے شعری مجموعے ہیں۔ خلیق ملتانی کا تعلق مظفر گڑھ سے تھا مگر 1949 میں بہاول پور اور 1964 کے لگ بھگ رحیم یار خان آ گئے۔ انہوں نے غزل بھی کہی مگر وہ نظم میں منفرد اسلوب کے شاعر ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "دولت احساس" مکتبہ یاران خلیق بہاول پور نے 1981 میں شائع کیا۔ ارمان عثمانی قدیم طرز فکر کے پختہ کار شاعر تھے اور وہ طرحی مشاعروں کے زیادہ قائل تھے۔ 1979 میں بہاول پور میں رہائش اختیار کی، 1983 میں انجمن فروغ اردو کے پہلے صدر بن کر نوجوان شاعروں کی رہنمائی کی۔ حمید نقوی رحیم یار خان کے استاد شاعر ہیں جن کے بغیر یہاں کی کوئی شعری نشست مکمل نہیں ہوتی تھی۔ ان کی غزلیات کا شعری مجموعہ "مسافتیں کیا کیا'' شائع ہو چکا ہے "نوک نیزہ" کے نام سے ان کا دوسرا شعری مجموعہ واقعہ کربلا کے بارے میں ان کی قلبی واردات پر مشتمل ہے۔ ندیم نیازی ایک پرگو شاعر جنہوں نے خود کو شاعری تک محدود نہیں رکھا، نقاد اور ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ ارشد جاوید بھی رحیم یار خان کا ایک معروف نام ہے اور ان میں شہر کی ادبی فضا کو متحرک دیکھنے کی تڑپ موجود ہے بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں تاہم افسانہ اور انشائیہ بھی لکھتے ہیں۔ عاشق قریشی رحیم یار خان کے ایک اہم شاعر تھے جنہوں نے شہر کی ادبی فضا کو استوار کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا اور بزم یاران خلیق انہوں نے بنائی اور ایسی جاندار تقاریب منعقد کیں کہ لوگ اب بھی ان کو یاد کرتے ہیں۔ ان کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ موج پنجند کے نام سے رحیم یار خان کے شعرا کا انتخاب شائع کیا۔ نجم الحسن نجمی اپنی شگفتہ مزاجی اور سنجیدہ شاعری کے باعث یہاں کی سماجی اور ادبی محفلوں کی جان تھے۔ ان کو کراچی نے چھین کر اپنے شہر کے

لیے اجنبی بنا دیا۔منظور محسن کی طبعی عمر کے مقابلے میں ان کی شاعری خاصی جوان سال تھی۔ان کی غزل،نظم اور قطعات میں روایتی مضامین کے ساتھ ساتھ عصری شعور کا اظہار بھی ملتا ہے۔ڈاکٹر کبیر اطہر پیشے سے ڈاکٹر ہیں مگر کمال کی غزل کہتے ہیں۔ان کا شعری مجموعہ "منظر خواب کا سا" شائع ہو چکا ہے۔راؤ تہذیب حسین تہذیب کی پسندیدہ اصناف سخن غزل اور قطعہ ہیں مگر کچھ عرصہ سے ان کا قطعہ ان کی غزل پر غالب ہے۔حکیم خلیق الرحمان خلیق یہاں کی ادبی اور مجلسی زندگی کا ایک معروف نام ہے۔انہوں نے متعدد ادبی انجمنوں کے ذریعے شہر کی فضا کو ادبی طور پر متحرک کرنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ان کی غزل اگرچہ اسلوب کے لحاظ سے کلاسیکل انداز کی حامل ہے مگر موضوع کے لحاظ سے جدید معاشرتی اکائی کے فرد کا جذباتی کیتھارسس محسوس ہوتی ہے۔

ایوب ندیم (اب ڈاکٹر و پروفیسر) طالب علمی کے دور سے ہی کالج کے جرائد کی ادارت،شعری محافل برپا کرنے اور ادبی رپورٹیں شائع کرانے کی اچھی عادت میں گرفتار ہوئے۔اب لاہور میں ہیں اور پختہ کار شاعر ہیں۔رحیم یار خان،بہاول پور اور لاہور کے حلقوں میں خاصے متحرک اور جانے پہچانے ہیں۔ان کے دو سے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں،گورنمنٹ سائنس کالج وحدت روڈ سے بطور پروفیسر اردو ریٹائر ہوئے۔رفعت شیخ بھی ایک معروف شاعر اور ادیب ہیں جنہوں نے ادبی تنظیموں اور متعدد ادبی جرائد کے ذریعے رحیم یار خان اور صادق آباد میں علمی اور ادبی فضا استوار کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔بشیر عاجز واپڈا اسکارپ جیسے فنی شعبے میں بھی شعری ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔شین الف شاہد نے کچھ عرصہ قبل یہاں کی ادبی سرگرمیوں کے فروغ میں غیر معمولی دلچسپی لی مگر آج کل خاموش ہیں،خوبصورت شاعری کرتے ہیں۔مختار احمد عزمی بنیادی طور پر اردو کے استاد،شاعر،ادیب اور نقاد ہیں۔آج کل وہ منہاج یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔حسن المرتضیٰ خاور نعت گو شاعر ہیں۔زاہد اختر شاہین خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان سے بحیثیت استاد وابستہ ہیں۔ابھی کالج میں زیر تعلیم تھے تو کالج کے مجلّے کی ادارت اور دیگر تعلیمی اداروں کے ادبی مقابلوں میں بھرپور حصہ لیا۔شاعر اور نقاد ہیں۔ڈاکٹر مخدوم محمد حسین ایک اچھے شاعر اور نقاد ہیں جنہوں نے اپنا تخلیقی عمل نہایت خاموشی سے جاری رکھا ہوا ہے۔۔حکیم شیر محمد خیال کوٹ سماب کلاسیکل انداز کی غزل کہتے تھے۔عبدالقادر آزاد رحیم یار خان میں 1950 اور 1965 کے درمیان بہت متحرک رہے۔عبدالمالک شاکر غزل اور نظم یکساں مہارت سے کہتے رہے۔منیر عابد دشت دل اور تلاش گل کے نام سے ان کی غزلوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔حافظ اقبال علیم،ہدایت کاشف،خالد جاوید،جاوید حمید خلجی،امین بابر،عابد جعفری،ملک نذیر احمد گھلو،عبدالخالق مستانہ،خالد محمود اور دیگر اہم شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔یہاں کے سرائیکی اور پنجابی شعرا کے چند نام کچھ یوں ہیں۔صالح محمد سوز،سراج سانول،اختر حسین اختر،احمد علی گورایا،ناصر بھٹی،فقیر حسین فقیر،حمید صابری،حمید سفری،امداد اللہ امداد،غلام عباس ملنگی

اورمہر علی مہر۔

یہ تذکرہ صرف شعرا کا تھا تاہم ان شعرا میں ہمہ جہت ادیب بھی شامل تھے۔ڈاکٹر محمد سلیم ملک نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے شعبہ اردو سے آغاز کیا اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے منسلک رہے۔ ڈاکٹر امتیاز علی تاج شخصیت وفن کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ بنیادی طور پر محقق، نقاد اور انشائیہ نگار ہیں۔صدیق طاہر رحیم یار خان کے نیشنل سینٹر کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر رہے۔ان کا تعلق اگرچہ بہاول پور سے تھا مگر نیشنل سینٹر میں تعیناتی کے عرصہ کے دوران ان کا تحقیقی اور تخلیقی کام سامنے آیا۔وادی ہاکڑا اور اس کے آثار ان کی طویل تحقیقی کاوشوں کا ثمر ہے۔ان کا مرتب کردہ" کلام فرید" بہت مقبول ہوا۔ پرویز الحسن صادق محقق، افسانہ نگار اور آرکیالوجسٹ ہیں۔ بہاول پور اور بلوچستان کی تاریخ وثقافت اور آثار قدیمہ ان کا خاص میدان ہے۔شیخ عظیم اشرف ایک ایسے ادیب واور مفکر تھے جو رحیم یار خان میں روشن فکری کی علامت تھے۔سائنسی انداز فکر رکھنے کے باعث اپنی تحریروں میں موضوع کو دلیل کے ساتھ اور صحیح تناظر میں دیکھنے کے قائل تھے۔ غلام سرور صدیقی بھی ایک ماہر تعلیم، تجزیہ نگار اور افسانہ نگار تھے۔ سیاسی، معاشرتی اور معاشی ناہمواری کے موضوعات پر اپنی واضح رائے رکھتے تھے۔ان کی تحریروں اور افسانوں میں سماجی انصاف کی آرزو پائی جاتی ہے۔عبدالعزیز جاوید ماہر تعلیم، محقق اور ادیب تھے۔ان کی تحریروں میں بلا کی روانی، شگفتگی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔اواخر عمر تک تصنیف وتالیف میں مصروف رہے، راہ آورد کے نام سے اردو اور فارسی شعری مجموعہ شائع کیا، اس دنیا سے روانگی سے قبل کیمیائے سعادت کا ترجمہ بھی شائع کیا اور دوستوں کو بھیجا۔شنید ہے کہ کشف المحجوب کا ترجمہ بھی کر چکے تھے۔ڈاکٹر عبدالخالق پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے مگر ایک ادیب کے طور پر بھی جانے جاتے تھے۔اس کثیر المطالعہ مسیحا کی تحریروں میں معتدل علمی رویہ اور تنقیدی شعور بدرجہ اتم ملتے ہیں۔ثنا اللہ چیمہ خواجہ فرید کالج کے شعبہ انگریزی سے وابستہ تھے۔عرصہ ہوا ان کا ایک ناول نیا مالک شائع ہوا تھا۔عبدالجلیل للہ بھٹی بھی رحیم یار خان سے تعلق رکھتے تھے اور ادیب، مؤرخ، ریسرچ سکالر اور اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ سے وابستہ تھے۔سعید احمد سعید ادیب اور شاعر ہیں اور ان کی کتاب تاریخ وتعارف رحیم یار خان اس موضوع پر پہلی اور ابتدائی کاوش تھی۔صرف سرائیکی نثر لکھنے والے ادیبوں میں مقبول احمد تھریجہ، محمد اسلم بھٹی اور منظور احمد اعوان کے نام قابل ذکر ہیں۔

اب خان پور تحصیل کو لیتے ہیں۔محسن خان پوری معروف شاعر عبدالرحمٰن آزاد کے والد تھے۔انہوں نے ریختی میں رنگیلی بیگم تخلیق کر کے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا۔عبدالرحمان آزاد نے اپنے والد کی طرح شاعری میں نام پیدا کیا۔آسی خان پوری، خان پور کی ادبی تاریخ کا معتبر نام ہیں جنہوں نے اس چھوٹے سے شہر میں بھی شاعری کی کامیاب جوت جلائی اور شعری محافل کا کامیاب انعقاد کیا۔موسم یہ خزاں جیسا، انگیارے، شرار سنگ اور بچوں کی نظموں پر مشتمل" صلح کے بعد" پہلے ہی شائع ہو چکی ہیں۔حفیظ شاہد خان پور

کے خاموش طبع شاعر جو عظیم شاعر ہونے کے باوجود سراپا انکسار تھے۔اس منفرد لہجے کے شاعر کے تین شعری مجموعے سفرِ روشنی کا (1983) چراغ حرف (1989) اور مہتاب غزل 1994 میں شائع ہو کر دنیائے ادب سے تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ یہاں پر گلزار نادم صابری جیسا شاعر بھی تھا جس نے شاہ نامہ حسین لکھ کر اپنی قادرالکلامی کا لوہا منوایا۔عارف عزیزی 1982 میں رحلت پا جانے والا یہ شاعر اہل خان پور کو ابھی نہیں بھولا، چشم و دل کے نام سے ان کا ایک شعری مجموعہ زیر ترتیب تھا۔نردوش ترابی (صفدر نقوی) نے 20 سال کا عرصہ مقامی کالج میں تدریس میں گزارا اور لاہور چلے گئے۔ان کی بیشتر شعری کائنات خان پور میں تخلیق ہوئی۔صفدر صدیق رضی کو کراچی ایسا پسند آیا کہ خان پور پلٹ کر نہیں دیکھا۔اسد حسین ازل دشت انا جیسے شعری مجموعے کے خالق تھے،خان پور کو چھوڑ کر لاہور کی فلمی دنیا میں جا بسے۔قیس فریدی بنیادی طور پر حضرت حمیدالدین حاکم کے مؤمبارک سے تعلق رکھنے والا یہ شاعر خان پور کی ادبی دنیا کی آبرو ہے۔وہ شاعر،نقاد اور ماہر لسانیات کے طور سامنے آئے ہیں،ان کے سرائیکی کلام کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ان کا مرتب کردہ دیوان فرید 1992 میں شائع ہوا۔حیدر قریشی انشائیہ اور افسانہ کامیابی سے لکھتے تھے۔''بوجوہ'' خان پور چھوڑ کر بیرون ملک جا بسے۔رفیق راشد روایتی غزل کے کامیاب شاعر ہیں۔رفیق احمد صدیقی شعبہ اردو کے استاد اور گورنمنٹ کالج خان پور سے بحیثیت پرنسپل ریٹائر ہوئے ہیں۔وہ نظم میں بھی تغزل کی کیفیت پیدا کرتے ہیں، محقق اور نقاد بھی ہیں۔مجاہد جتوئی سرائیکی شاعر راز جتوئی جیسے بزرگ شاعر کے بیٹے ہیں۔انہوں نے شاعری میں ساون خاں تخلص کیا۔جیسا میں نے سوچا لکھ کر خوب کیتھارسس کیا اور اب کوٹ مٹھن میں خواجہ فرید کے میوزیم اور لائبریری سے وابستہ ہیں اور خواجہ فرید کا کلام مرتب کر کے خوب داد سمیٹ رہے ہیں۔محمد اجمل بھٹی ادیب،نقاد اور محقق ہیں جنھوں نے نثری ادب میں گرانقدر اضافہ کیا ہے اور گورنمنٹ کالج خان پور کے مجلّے بانگ سحر کے ضلع رحیم یار خان نمبر میں کامیاب مدیر کے طور پر سامنے آئے۔نذر خلیق جنہوں نے اردو ادب میں سرقہ بازی جیسے متنازعہ موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا اور اس کا ردعمل بھی وصول کیا۔انیس دین پوری کو خان پور کی تاریخ کا انسائیکلو پیڈیا کہا جاتا ہے۔ایک منفرد اسلوب کے افسانہ نگار خورشید ٹمی اپنے افسانوں میں اچھوتے موضوعات کا انتخاب کرتے تھے۔سید بیتاب بھی افسانہ نگاری کرتے ہیں جب کہ سرائیکی افسانہ کے لیے اختر شاکر، حبیب اللہ خیال، جواد تھہیم اہم نام ہیں۔خان پور میں ظفر اقبال جیسا محقق بھی ہے جس کی کتاب ''آئین سے انحراف'' شائع ہو چکی ہے۔ان کی ذاتی لائبریری میں چند اخبارات اور جرائد کی مکمل فائلیں موجود ہیں۔دیگر نثر نویسوں اور شاعروں میں شاغل صدیقی ظاہر پیر،محمد یار بے رنگ،عبدالجبار شاکر اور شکیل پتافی کے نام اہم ہیں پنجابی شاعری میں نیاز احمد نیاز ہیں۔سرائیکی گیتوں اور دوہڑوں کے لیے امان اللہ ارشد بہت معروف ہیں۔

اب صادق آباد کو دیکھیں تو یہاں غلام محمد 1904 میں پیدا ہوئے۔1980 میں فوت ہونے والا

بزرگ شاعر اس علاقے میں پنجابی کا ایک بڑا نام ہے۔میر حسان الحیدری ضلع رحیم یار خان بالخصوص اور بہاول پور ڈویژن سمیت تمام سرائیکی پٹی میں بالعموم تحقیق و ادب کا ایک بہت بڑا نام ہیں۔شاعر، محقق اور ماہر لسانیات اور صحافی، بھونگ بھارہ (موضع نور احمد آباد) سے تعلق رکھنے والے اس شاعر نے فارسی اردو، سرائیکی اور سندھی میں شاعری کر کے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا۔سرائیکی اکیڈمی ملتان کے بانی صدر ہیں اور سرائیکی لفظ کو متعارف کرانے کے بارے میں سرائیکی اکیڈمی کے منعقدہ پہلے اجلاس میں پیش کردہ قرارداد کے محرکین میں سے ہیں۔1975 کی سرائیکی کانفرنس میں قائم کردہ سرائیکی رسم الخط کمیٹی کے ممبر نامزد ہوئے۔شعبہ ادبی تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے شائع ہونے والی تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند میں علاقائی ادب کے سلسلہ میں سرائیکی زبان وادب کے بارے میں ان کا طویل اور تحقیقی مقالہ بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ان کے بیٹے جاوید حسان چانڈیو شاعر، نقاد اور محقق ہیں اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں زبانوں کی فیکلٹی کے ڈین اور سرائیکی شعبہ کے سربراہ رہے۔خواجہ فرید کی شاعری کا سماجی اور لسانی جائزہ اور سرائیکی لسانیات ان کے اہم میدان ہیں۔گوہر ملسیانی صادق آباد کے معروف اور منفرد ادیب اور شاعر، غزل اور نعت میں کمال پیدا کیا۔بشیر بیتاب کسی بھی قسم کی لابی سے بے نیاز صادق آباد کے ایک قصبے میں تخلیقی عمل میں مصروف ہیں۔توقیر حسین توقیر، گوہر ملسیانی کی رفاقت میں مجلس اقبال کی ادبی تنظیم قائم کی اور اپنی ذات کے اظہار کے لیے تنگ نائے غزل کا انتخاب کیا۔شاہد عباسی نوجوان شاعر جس نے بہت کم وقت میں تخلیق کے سفر کی منزلیں طے کیں۔حکیم احمد حسن صادق آباد کی محفل ساز ادبی شخصیت ہیں۔شہباز آفاقی صادق آباد کی ادبی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔اشرف طاہر صرف 35 سال کی عمر میں دار فانی سے کوچ کر جانے والے اس شاعر نے پنجابی زبان کی مروجہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ان کے علاوہ رحمت علی شیدا، اختر جعفر پوری، ہدایت رضوی، افضل درویش اور انور ہاشمی وہ اہم نام ہیں جن کے بغیر صادق آباد کی کوئی ادبی محفل مکمل نہیں ہوتی۔ انیس جیلانی صادق آباد کے قریب ایک قدیم قصبے سنجر پور کے نواح محمد آباد میں رہتے تھے، ضلع رحیم یار خان کی اہم اور معروف ادبی شخصیت تھے۔وہ سرائیکی اور اردو کے صاحب طرز ادیب ہیں۔ان کے سرائیکی زبان میں خاکوں کی کتاب مہاندرہ ڈیکھنس چند سال قبل شائع ہوئی، اس میں اختیار کردہ اسلوب میں خالص سرائیکی زبان کی بازیافت کی شعوری خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔اردو زبان میں ان کے خاکوں کا مجموعہ آدمی غنیمت ہے اور ان کا سفر نامہ مقبوضہ ہندوستان شائع ہو کر اپنی پہچان کرا چکے ہیں۔ممتاز حیدر ڈاہر سرائیکی کے ایک متحرک نوجوان شاعر و ادیب تھے انہوں نے سرائیکی زبان کے ایک ادبی مجلّے سوجھلا کا اجرا کیا جو سرائیکی تہذیب و ثقافت اور ادب کا احاطہ کرتا تھا۔اشرف شکیل ماضی میں لبرل طرز فکر کا حامل نوجوان تھا جس نے صادق آباد میں ترقی پسندی کو فروغ دیا۔دین محمد جوہر اپنے تنقیدی شعور اور علمی رویہ کے باعث علمی حلقوں میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔طارق منصور نے اپنا سارا تدریسی پیشے کا عہد صادق آباد میں گزارا اور یہاں ادبی سرگرمیوں کے

لیے سرگرم رہے۔ صادق آباد کے دیگر ادیبوں اور شاعروں میں سید ابوالبشر جیلانی (انشائیہ نگار) بشیر احمد دیوانہ راہی گبول (جگر دے پھٹ افسانہ اور مٹھڑے نیر طنز و مزاح) رفیق ساحل (بڑدا ساحل) اور محمد افضل جام جیسے لوگ اپنی اپنی سطح پر تخلیق میں مصروف رہے۔ اخلاق مزاری بھی ایک جانے پہچانے شاعر ہیں مگر میری موجودگی تک رحیم یار خان کی مجلسی زندگی میں انہوں نے کبھی بحیثیت شاعر متعارف نہیں کرایا، بلدیہ رحیم یار خان کی لائبریری میں لائبریرین تھے۔ ہمارے ایک سینئر شاگرد مرشد سعید ناصر اور ان کی رفیقہ حیات رضوانہ سعید ناصر تدریس کے ساتھ ساتھ بہت خود اعتمادی سے شاعری تخلیق کرنے میں مصروف ہیں۔

لیاقت پور کے محدود ماحول کے باوجود یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی استعداد کے مطابق یہاں کی علمی اور مجلسی زندگی کی شمع کو روشن کیا ہوا ہے۔ یہاں پر شاعروں میں شفیق حیدر آبادی جیسے قادرالکلام شاعر اور استاد موجود ہیں جب کہ ایک بزرگ شاعر عبداللطیف دانش رحلت فرما چکے ہیں۔ ان استاد شعرا کے بعد سید ضیاء الدین نعیم کا نام بہت اہم ہے جنھوں نے یہاں کی ادبی فضا کو فعال بنانے میں ہمیشہ اہم کردار ادا کیا۔ آج کل اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ حبیب الرحمٰن مصنف آئینہ لیاقت پور، نواز فانی اور جام نواز کا شمار بھی یہاں کے شاعروں کی متوسط نسل میں ہوتا ہے۔ بابا جگ کا پنجابی کلام بھی لوگوں میں قبول عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔ نوجوان شاعر اعجاز خاور ضیائی کا نام غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اخبار الادب کے شمارے اس نوجوان شاعر کی ادب سے کمٹمنٹ اور صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کے ساتھ نوجوان شاعروں کی جو کھیپ تیار ہوئی ان میں پرویز عامر، افضال انجم، منیر انور، رفیع صدیقی، حسین ریاض اور ضمیر جانپوری کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ اب آخر میں جناب واحد بخش سیال کا ذکر جنھوں نے اسلام، روحانیت اور تصوف پر متعدد کتب لکھی ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے کشف المحجوب کی شرح بھی تحریر کی جو شائع ہو چکی ہے۔ وہ اپنے تحقیقی میدان میں قومی اور بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں اور انہیں کیپٹن واحد بخش سیال بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ یہ بہاول پور ریاست کی فوج میں خدمت سرانجام دیتے رہے ہیں۔ جن ادبا اور شعرا نے سرائیکی زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ان میں نمایاں لکھاریوں کے نام کچھ اس طرح سے ہیں۔ اختر الہ آبادی، اختر شاکر، امیر بخش دانش امیر عباس امیر، ابو طاہر بشیر، پرسوز بخاری۔ حبیب اللہ اویسی۔ شباب ملک، عبدالرشید انجم۔ فانی الہ آبادی، غلام شبیر ارشد، محمد نواز فریدی اور نجیب اللہ نازش شامل ہیں۔

لیاقت پور کا ادبی تذکرہ نصر اللہ خان ناصر کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ معروف شاعر، محقق اور براڈ کاسٹر ہیں۔ ان کا تعلق ریاست بہاول پور کے پہلے صدر مقام الہ آباد سے ہے۔ انہوں نے ''سرائیکی شاعری داارتقا'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا اور سرائیکی زبان میں پہلے پی ایچ ڈی کا اعزاز حاصل کیا۔ ریڈیو کے ذریعے ملتان اور بہاول پور کی علاقائی ثقافت کی ترویج کی۔ آج کے متعدد معروف لوک فنکاروں کو گوشہ گمنامی سے نکالنے کا سہرا ان کے سر ہے۔ اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں تخلیق اور اپج کے قائل ہیں۔

1982 میں 65 ملکوں کے دستاویزی پروگراموں کے مقابلے میں ان کی ڈاکومنٹری ''جھوکاں تھیسن ول آباد'' کو انٹرنیشنل ایوارڈ ملا۔ وادی سندھ اور ہاکڑہ کی قدیم موسیقی کے بارے میں ان کا ایک اور پروگرام جاپان میں منعقدہ ایشین براڈ کاسٹنگ یونین کے مقابلے میں شرکت کے لیے بھیجا گیا۔ آسٹریلیا میں سپورٹس کوریج کے علاوہ 1988 کے سیلاب کی کوریج اس انداز سے کی کہ بی بی سی کے نمائندہ نے انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ ان کے سرائیکی شاعری کا مجموعہ اجرک سرائیکی ادبی اکیڈمی شائع کر چکی ہے جب کہ اردو نظموں کا مجموعہ تیری ذات سے تیرے ہجر تک شائع ہو چکا ہے۔ ان کی اردو نظموں میں تغزل کی کیفیت اور بے ساختہ پن پایا جاتا ہے جب کہ ان کی سرائیکی نظموں میں روہی اور اس کے سارے رنگ توانا استعاروں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

چاروں تحصیلوں کے دونوں ادوار یعنی قدیم و جدید کے جائزے کو مکمل نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ بہت سے ادیب اور شاعر ایسے ہیں جن کے صرف نام معلوم ہیں کام نہیں یا ایسے شاعر و ادیب جو معروف تو ہیں مگر ان سطور کے لکھنے کے دوران ان کا علم ہوا یا علم میں لائے گئے، ذیل میں ان کے نام دینے پہ اکتفا کیا جاتا ہے۔ بی بی جنت مائی (چاچڑاں شریف) اللہ بخش فاخر الہ آباد لیاقت پور (مولود شریف کافیاں تے ڈھولے) خواجہ نازک کریم فرزند خواجہ فرید، پیر منصور الدین عاصی۔ صادق آباد (کافیاں) منشی بارات علی فیروزہ (سسی پنوں) خوشتر جوئی جہ عباسیاں (یوسف زلیخا) فانی الہ ابادی الہ آباد، فیض محمد دلچسپ۔ اب تک کی گفتگو کے دوران جتنے بھی شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، تیس سال قبل تک جب میں رحیم یار خان تھا تو اس وقت تک کی معلومات، مطالعے، ملاقاتوں اور تعلقات یا بعد میں ملنے والی اکا دکا معلومات پر مبنی ہے۔

ادبی محافل کی روایت۔ ادب ہر جگہ ہر دور اور ہر زبان میں ہمیشہ تخلیق ہوتا رہا ہے۔ ضلع رحیم یار خان میں قدیم دور سے لے کر ستلج ویلی پروجیکٹ کے عہد سے قبل تک کا جائزہ لیا جائے تو علمی اور ادبی محافل کے بارے میں کسی قسم کی معلومات نہیں ملتیں تاہم قیاس کی بنیاد پر رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات میں شاعروں کا آپس میں تھوڑا بہت رابطہ ضرور ہوتا ہوگا۔ اطلاعاتی ذرائع اور اشاعتی سہولتیں اور وسائل مفقود تھے لہٰذا شاعری اور دیگر علمی اور ادبی تخلیقات کی تفصیل کے صرف دو ہی ذرائع تھے پہلا یہ کہ کسی شعری یا نثری کتاب کے کئی قلمی نسخے تیار کر کے مختلف علاقوں یا اس وقت کے نجی کتب خانوں یا افراد کو بھجوا دیے جاتے۔ دوسرا شاعر و ادیب ایک دوسرے کو ملاقات پر سناتے یا لوگ پڑھ کر زبانی یاد کر کے ترسیل کا ذریعہ بنتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قریب کے علاقوں کے شعراء جب کبھی کبھار آپس میں ملاقات کرتے تو وہ ملاقات علمی ادبی محافل کا روپ دھار لیتی۔ اس علاقے میں خواجہ فرید کے عہد کے شعراء کا آپس میں رابطہ قدرے مستحکم ہوا۔ اس عہد ساز شخصیت کے باعث چاچڑاں شریف کو ان کے قیام کے دوران علمی مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور ان کے ہم عصر ان سے ملاقات کرتے نظر آتے ہیں۔ اس دور کے ضلع رحیم یار خان کے کچھ شاعر تو ان سے یا ان کے خاندان سے بیعت تھے یا ان کے عقیدت مند تھے۔ خواجہ صاحب کے عہد میں

چاچڑاں شریف میں علمی اور ادبی محافل منعقد ہوتی رہی ہیں۔ 1933 کے بعد تو گویا انقلاب آ گیا۔ یہاں آبادی بڑھی، انتظامی ڈھانچے میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئیں جس سے ریاستی ملازمین کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ ملازمت کے ضمن میں لوگ آتے جاتے رہے۔ کئی کچھ عرصہ گزار کر واپس چلے گئے جب کہ کئی ایک نے اس شہر کو مستقل رہائش کے لیے منتخب کیا۔ آنے جانے اور یا بسنے والے لوگوں میں شامل شاعروں اور ادیبوں نے یہاں علم و ادب کی جوت جگائی۔ یہاں پر ادبی تنظیمیں قائم کرنے اور محافل بر پا کرنے والوں میں یہاں کے مستقل رہائش پذیر یا ملازمت کے ضمن میں قیام کرنے والوں کے علاوہ ایسے لوگ بھی شامل تھے جو شاعر تھے نہ ادیب مگر اعلی علمی اور ادبی ذوق کے حامل تھے۔

رحیم یار خان میں سب سے پہلی ادبی تنظیم بزم ادب 1936 میں محکمہ آبپاشی میں تبدیل ہو کر آنے والے بہاول پور کے شاعر عبدالحمید ارشد کی تحریک پر قائم کی گئی۔ بزم ادب کے دیگر اراکین میں سید محمد سلیم، حمید الحق کوثر، شیخ عبدالعزیز اختر، سردار چتر سنگھ، رانا رب نواز آزاد، چودھری نذیر احمد، محمد بخش مسلم ذیلدار، میاں محمد دین اور شیخ صلاح الدین کے نام شامل ہیں۔ اس بزم کی ہفت وار نشستیں کینال لائبریری اور نشاط سینما ہال میں منعقد ہوتی تھی۔ عبدالحمید ارشد 1937 میں بہاول پور تبدیل ہو گئے تو اس بزم کی سرگرمیاں بھی ماند پڑ گئیں۔ 1944 میں جب وہ واپس آئے تو یہاں انہوں نے شیخ عبدالعزیز اختر سے مل کر بزم ادب کو مزید فعال بنایا اور اس کے ہفتہ وار اجلاسوں میں باقاعدگی پیدا کی۔ اس کے 1936 والے ارکان کے علاوہ اب اس میں آذر نوشہروی، صالح محمد سوز، ماسٹر عبدالعزیز، سردار پریم سنگھ، پنڈت چندر بھان مفلوک، ماسٹر عبدالرحمٰن آزاد اور موج گوہری شامل تھے۔ جلد اس بزم کا نام تبدیل کر کے بزم اقبال رکھ دیا گیا۔ انھی دنوں شیخ عبدالعزیز اختر نے اردو مجلس کے نام سے ایک اور تنظیم بھی قائم کر رکھی تھی۔ بزم اقبال کے تحت 21 اپریل 1946 میں یوم اقبال منایا گیا جس کی صدارت ڈپٹی کمشنر شیخ محمد حسین نے کی۔ اس دوران لالہ ہنس راج ہیڈ ماسٹر نے اپنے سکول میں ایک ادبی مجلس بنائی اور اس کی سالانہ تقریب میں ایک کامیاب مشاعرہ بھی کرایا۔ 1954 میں خان پور میں محسن خان پوری کے فرزند ماسٹر عبدالرحمان آزاد کی زیر سرپرستی کاروان ادب قائم ہوئی تو یہاں کے ادبی ماحول میں تحریک پیدا ہوئی۔ اس تنظیم کے صدر راثر لکھنوی اور جنرل سیکرٹری مسعود احمد نقوی تھے۔ کاروان ادب سے خان پور میں ادبی سرگرمیوں کو خاصا فروغ حاصل ہوا۔ 1956 میں انجمن فروغ اردو اور 1957 میں انجمن ترقی تعلیم کے قیام سے خان پور میں علمی اور ادبی فضا استوار ہوئی اور ادبی محافل کی روایت بھی مستحکم ہوئی-1960 میں کوٹ سمابہ کی بزم عیش کا نام قابل ذکر ہے جو کوئٹہ کے شاعر علامہ عیش فیروز پوری کی عقیدت میں اس کے صدر حکیم شیر محمد خیال اور سیکرٹری راؤ مستجاب علی نے قائم کی۔ 1960 ہی میں گورنمنٹ کالج رحیم یار خان میں حلقہ ارباب ادب کی سرگرمیاں بھی قابل توجہ ہیں۔1960 کی دہائی عشرت مراد آبادی، گل صدیقی اور ضیاء الحق ضیا کی دہائی کہلاتی ہے۔ ان اصحاب نے اپنی سطح پر رحیم یار خان میں ادبی

سرگرمیوں کو فروغ دیا، 1967 میں بزم فکر ونظر نے رحیم یار خان میں متضاد نظریات کے حامل لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر کے یادگار مباحث کرائے۔ اسی دوران گوہر ملسیانی نے صادق آباد میں بزم اقبال قائم کی اور دیگر ادب دوست احباب سے مل کر یادگار تقاریب منعقد کیں۔ نیشنل سینٹر رحیم یار خان بھی مؤثر علمی اور ادبی فورم کا کام دیتا رہا ہے۔ 1970 میں خواجہ فرید کالج میں بزم فکروادب نے خاصا کام کیا۔ 1971 میں انجمن فروغ اردو لیاقت پور کی داغ بیل ڈالی گئی اور شوکت ہمایوں، سید ضیاالدین نعیم، عبداللطیف اور محمد ابراہیم رحمانی اور محمد جمیل رحمانی نے مل کر ادبی نشستوں کا آغاز کیا۔ 1975 تا 1990 کے دوران ضلع رحیم یار خان علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لحاظ سے بڑا منفرد نظر آتا ہے۔ سینئر لوگوں کے ساتھ ساتھ نوجوانوں نے ادبی ماحول کو متحرک کرنے میں نمایاں جوش وجذبہ سے کام لیا۔ بزم یاران خلیق، انجمن فروغ اردو اور بزم فیض نے ادبی سرگرمیوں میں باقاعدگی اور استقلال کی نئی طرح ڈالی۔ اول الذکر دونوں تنظیموں نے 1982 سے 1988 تک اتنا کام کیا جتنا گذشتہ مدت کے دوران نہیں ہوا تھا۔ عاشق قریشی، رفعت شیخ، اشعر جاوید، نذیر احمد گھلو، صدیق طاہر اور دیگر اصحاب نے ایک شیڈیول کے تحت مجلسی زندگی کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ پھر بزم فیض بنی جس نے اپنے 120 اجلاس مکمل کیے اور کامیابی سے جاری رہی۔ واپڈا اسکارپ اور ماچھی گوٹھ جیسے فنی ادارے بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ رحیم یار خان کے ساتھ ساتھ دیگر شہروں اور قصبوں میں بھی ادبی تنظیموں اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی انفرادی کاوشوں سے ادبی محفل کی مضبوط روایت موجود رہی ہے۔ تعلیمی اداروں میں بھی ادبی تنظیموں اور صاحبِ ذوق حضرات کی انفرادی کاوشوں سے ادبی محافل کی روایت قابل ذکر ہے۔ تعلیمی اداروں نے مختلف مقابلوں کے تحت جوہرِ قابل تلاش کرنے اور ان کی تربیت کا فرض سرانجام دیا ہے۔ اِس وقت تک ضلع رحیم یار خان میں 50 کے قریب ادبی انجمنوں کے قیام کے شواہد ملے ہیں، ان میں سے کچھ تو مرحوم ہو چکی ہیں جب کہ کچھ زندہ ہیں جو ایک سال میں ایک دو بار اپنی زندگی کا احساس دلانے کے لیے کسی نشست کا اہتمام کر لیتی ہیں۔ چند تنظیمیں ایسی بھی ہیں کہ جنہوں نے آغاز تو زوروشور سے کیا مگر دو تین اجلاسوں کے بعد ہی کاغذی حیثیت اختیار کر لی۔ یہاں کی ادبی سرگرمیوں کی پریس کوریج زیادہ تر مقامی اخبارات تک محدود رہی تاہم 1980 کے بعد قومی پریس میں بھی خبریں اور کارروائیاں چھپوائی جاتی رہیں۔ اس وقت دو چار تنظیموں کے سوا کسی کے پاس باقاعدہ ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ اب آئیں یہاں کی ادبی محافل کے انداز اور طریق کار کا جائزہ لیں۔ یہاں کی ادبی تنظیموں کے تحت شعری مجالس برپا کرنے کا رجحان زیادہ رہا ہے اور تنقیدی نشستوں کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ادیبوں کی نسبت شاعروں کی تعداد کہیں زیادہ رہی ہے۔ مزید تنقیدی نشست کے لیے غیر معمولی مطالعے اور تنقیدی شعور کی ضرورت ہوتی ہے جس کا رجحان کم رہا ہے۔ شعری نشست کا عام طریقِ کار یہ رہا ہے کہ جب کوئی شاعر باہر سے آیا تو کسی تنظیم کے تحت انفرادی سطح پر اس کے ساتھ شام یا تقریب کا اہتمام کر لیا گیا۔ اس سے قطع نظر کہ

مہمان ادیب ہے یا شاعر مقامی شعراء کو اطلاع دے کر محض شعری مجلس برپا کرنے پر اکتفا کیا گیا۔ جہاں تک ادیبوں اور شاعروں کے آپس میں ربط و تعلق کی بات ہے تو جس جگہ ایک وقت میں کئی تنظیمیں عملاً یا کاغذوں پر موجود ہوں گی وہاں پر گروہ بندی ایک لازمی عمل ہے۔ ان گروہ بندیوں میں فکری اور نظریاتی اختلافات کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں بل کہ ان میں چھوٹی چھوٹی رنجشوں، کام کرنے کے طریقِ کار، اپنی انفرادیت اور شناخت قائم کرنے کا احساس اور تھوڑے بہت لسانی اختلافات کا کردار زیادہ ہے۔ یہاں کے شاعروں اور ادیبوں میں سے اکثریت کے ہاں جدید شعور سے ہم آہنگ مطالعاتی رجحان بہت زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے شاید اس لیے یہاں کے ادیبوں میں تحقیقی رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان میں علم و ادب کی ترویج کی تڑپ تو موجود ہے مگر اپنی ادبی کمٹمنٹ کے بارے میں چند لوگ ہی واضح ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود گذشتہ 50 سالوں کا جو علمی ادبی منظر نامہ مرتب ہوتا ہے وہ خاصا قابل توجہ ہے۔ آج جب پرانا معاشرتی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر نئی اقدار کی تشکیل کر رہا ہے، انسانی ربط و تعلق میں کمرشلائیزیشن کا رجحان غالب ہے اور مادی نقطۂ نظر تقویت پکڑ رہا ہے ایسے میں علم و ادب کے معیارات بھی تبدیلی کے عمل سے دوچار ہیں۔ ادبی رجحان اور ذوق انحطاط پذیری کی طرف مائل ہے ایسے میں علم و ادب کی بات کرنا اور ادبی محافل کا انعقاد ایک غیر معمولی واقعہ محسوس ہوتا ہے اور ایسے غیر معمولی واقعات ضلع رحیم یار خان میں اکثر رونما ہوتے رہتے ہیں۔

رحیم یار خان میں مشاعرے کی روایت: رحیم یار خان میں مقامی ادبی تنظیموں و ادیبوں شاعروں اور باذوق افراد کی کاوشوں سے محض مقامی شعراء سے سجی شعری محافل ہی منعقد نہیں ہوتی رہیں بل کہ یہاں بڑے پیمانے پر مشاعروں کی روایت بھی موجود رہی ہے۔ اگر گذشتہ 70 سال کا جائزہ لیا جائے تو بڑے مشاعروں کی تعداد اتنی زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ ضلع رحیم یار خان میں منعقدہ مشاعرے کو چار درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے- 1- ایسے مشاعرے جن میں شہر یا ضلع کے شعرا شرکت کرتے ہیں۔ 2- ایسے مشاعرے جن میں ڈویژن بھر خصوصاً بہاول پور سے شعرا مدعو ہوتے ہیں۔ 3- لاہور، ملتان یا دیگر شہروں سے بلائے گئے شعرا جو تعداد میں ایک یا ایک سے زائد ہو سکتے ہیں، کے ساتھ شعری محافل کا انعقاد۔ 4- کل پاکستان مشاعرے۔ رحیم یار خان میں سب سے پہلے مشاعرے کا سراغ 1946 میں ملتا ہے جب مقامی اسکول کے ہیڈ ماسٹر لالہ ہنس راج ساحر نے سکول کی ادبی مجلس کے تحت ضلع رحیم یار خان اور بہاول پور کے شعراء کو اکٹھا کیا۔ مقامی شعرا میں عبدالعزیز اختر، ملک محمد بخش مسلم، عبدالحمید ارشد، سید محمد سلیم۔ خان پور سے ماسٹر عبدالرحمٰن آزاد، سردار پریم سنگھ پریم، پنڈت چندر بھان مفلوک کے علاوہ بہاول پور کے شعرا ظہور نظر، پرکاش آزاد، رفیق خاور جسکانی اور دیوی دیال آتش نے اس مشاعرے میں شرکت کی۔ اس کے بعد ایک طویل خاموشی نظر آتی ہے اور کوئی بڑا مشاعرہ نظر نہیں آتا۔ ماسٹر عبدالرحمان آزاد نے کاروان ادب کے نام سے 1954 میں جب ادبی تنظیم قائم کی تو انہوں نے اس طویل خاموشی کو توڑتے ہوئے اسی سال ایک مشاعرہ کرایا جس میں مقامی شعرا کے علاوہ زیادہ تر

بہاول پور کے شعراء نے شرکت کی۔اس مشاعرے کی صدارت محمد اسلم سکھیرا نے کی اور مہمان خصوصی شہاب دہلوی تھے۔مہمان شعرا میں حیات میرٹھی، علی احمد رفعت، ادیب واثقی، محی الدین شان، امجد قریشی، عبدالحق اور سید آلِ احمد کو مدعو کیا گیا تھا۔رحیم یار خان میں جب صنعتی نمائش کا آغاز ہوا تو مشاعرہ بھی اس کی اہم تقریب قرار پایا لہٰذا 1957 میں ہونے والا کل پاکستان مشاعرہ ضلع بھر کی تاریخ کا پہلا یادگار مشاعرہ تھا جس میں پاکستان کے تمام معروف اور مقبول شعراء نے شرکت کی۔اس مشاعرے کو ضلعی انتظامیہ نے گورنمنٹ کالج رحیم یار خان کے توسط سے منعقد کرایا۔اس زمانے میں بہاول پور ڈویژن کے کمشنر ہاشم رضا تھے جو یہاں ادبی سرگرمیوں کی سرپرستی کرتے رہے اس لیے جب تک صنعتی نمائش ہوتی رہی ہر سال یا ایک سال چھوڑ کر کل پاکستان مشاعرہ منعقد ہوتا رہا تا آنکہ صنعتی نمائش کی روایت ختم کر دی گئی۔اس دوران صادق آباد کی یونین آف جرنلسٹس نے کل پنجاب مشاعرہ کرایا جس کی صدارت خلیق ملتانی نے کی۔مزید برآں سیلاب زدگان کی امداد کے لیے کمشنر ہاشم رضا کی صدارت میں جناح ہال میں ایک مشاعرے کی اطلاع ملتی ہے مگر ان دونوں مشاعروں کا مستند ریکارڈ اور شعراء کے نام دستیاب نہیں۔پانچ چھ سال کی خاموشی کے بعد 1964 کا سال مشاعروں کے لحاظ سے یادگار تھا۔اسی سال دو کل پاکستان مشاعرے ہوئے جن میں پہلا مشاعرہ کاروان ادب نے خان پور میں کرایا جس میں حفیظ جالندھری، احمد ندیم قاسمی، شہاب دہلوی، تابش الوری، محی الدین شان، عارف عزیزی، نور سلطانہ اور دیگر شعرا نے شرکت کی۔اسی سال 23 نومبر کو ریڈ کراس سوسائٹی کے زیر اہتمام ای ٹی او ملک عبدالرب نسیم کی کاوشوں سے ڈپٹی کمشنر سردار غلام فرید کی صدارت میں ایک یادگار مشاعرہ ہوا جس میں مقامی شعرا کے علاوہ بہاول پور ڈویژن کے متعدد شعرا نے شرکت کی۔ان شعراء کے اسمائے گرامی اس طرح تھے۔ملک عبدالرب نسیم، ارمان عثمانی، اختر بزمی، علی احمد رفعت، مذاق العیشی، مس بلبل شاہجہاں، عارف عزیزی، انعام اسعدی، محی الدین شان، حیات میرٹھی، رشید روہتکی، عبدالحمید ارشد، تابش الوری، نظر جتوئی، خلیق ملتانی اور ظہور نظر۔

1964 اور 1994 کی 20 سالہ مدت کے دوران مختلف موقعوں پر منعقد ہونے والے مشاعروں کا خاکہ کچھ اس طرح ہے۔ان مشاعروں میں کئی ایک روایت کیے گئے ہیں اور کچھ کا ریکارڈ دستیاب ہے۔کچھ میں راقم نے 1979 کے بعد بطور سامع شرکت کی۔21 اپریل 1964 ڈی سی رحم شاہ کی صدارت میں مشاعرہ مہمان خصوصی خلیق ملتانی 1967۔ہائی کورٹ کے صد سالہ جشن کی تقریبات کے ضمن میں منعقدہ مشاعرے کے اہم شعراء احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی۔جانباز جتوئی اور خلیق ملتانی۔1968۔جشن ایران کے حوالے سے مشاعرے کا انعقاد۔1979 خواجہ فرید کالج میں شب مہتاب کی صورت میں شعری نشست۔ 1981 علامہ اقبال لائبریری میں منعقدہ اس مشاعرے کو ارشد جاوید اور رفعت شیخ نے ترتیب دیا۔شرکت کرنے والے مہمان شعرا میں اقبال ساجد، سلیم شہزاد، سید آل احمد، افتخار قیصر، نواز کاوش اور منور جمیل کے نام

اہم ہیں۔ 1983 میں جب جی اے طارق بار کے صدر بنے تو انہوں نے شب فرید کے نام سے پہلے مرحلے میں علمی اور دوسرے مرحلے میں شعری نشست کا اہتمام کیا جس کی صدارت سیشن جج محمد نسیم نے کی اور مہمان خصوصی جسٹس منیر خان (اس وقت ایڈووکیٹ) تھے، اس میں مقامی اور باہر سے آنے والے شعراء کے نام یہ ہیں۔ محسن نقوی، جانباز جتوئی، حسین بخش نادم، صدیق طاہر، عبدالعزیز اختر، نجم الحسن نجمی، شوکت مہدی ارشد جاوید، عاشق قریشی، سراج سانول، اسلم میتلا اور مختار عزمی۔ اکتوبر 1985 میں خواجہ فرید کالج ہال میں ایک اہم مشاعرہ منعقد ہوا جس میں شعرا اور سامعین کی تعداد قابل ذکر تھی۔ مقامی شعرا کے علاوہ امجد سلام امجد، عطاالحق قاسمی، جانباز جتوئی، عنایت علی خان، خادم رزمی، اسیر عابد، نواز کاوش، انور جمال، عابد صدیق اور شفیق احمد نے شرکت کی۔ 1989 میں ایف ایف سی ماچھی گوٹھ کی کلب میں مشاعرہ کا انعقاد۔ 1989 میں کاکل پاکستان مشاعرہ ڈپٹی کمشنر شوکت علی شاہ کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں تمام اہم شعراء نے شرکت کی۔ مقامی شعراء سے چند ہی کو پڑھنے کا موقع دیا گیا جس سے یہاں کے شاعروں میں گروہ بندی کو فروغ ملا۔ اس مشاعرہ کے اہم شعرا کے نام اس طرح تھے۔ قتیل شفائی، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، جمیل الدین عالی، محسن احسان، سلیم کوثر، امجد سلام امجد، جانباز جتوئی اور بہت سے دیگر شاعر۔ 1990 میں واپڈا اسکارپ میں بشیر عاجز کی کاوشوں سے ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں قتیل شفائی، افشاں عباس، عباس خان، نقوی احمد پوری اور رحیم یار خان اور صادق آباد کے شعرا نے شرکت کی۔ 1990 دسمبر میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی کی بزم شعور نے صادق آباد، رحیم یار خان اور کوٹ سماں کے شاعروں کو مدعو کر کے ایک اہم شعری نشست کا اہتمام کیا۔ 1994 کے بعد جن ایک دو بڑے مشاعروں کا سراغ ملتا ہے وہ ضلعی انتظامیہ کی خواہش اور کوشش سے منعقد ہوئے۔ خواجہ فرید گورنمنٹ کالج میں منعقد ہونے والی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا خصوصاً ڈاکٹر محمد اجمل بھٹی پرنسپل تھے تو وہ دور اس لحاظ سے یادگار تھا۔

ضلع رحیم یار خان میں خواتین شاعر و ادیب کی حوصلہ افزا تعداد موجود ہے مگر وہ مخصوص سماجی ڈھانچے کے باعث تشہیر یا ایکسپوژر سے احتراز کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں ان کا وجود اور عملی حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہاں کسی ایسی تنظیم یا ادبی فورم کا وجود بھی نہیں ملتا جسے خواتین نے تشکیل دیا ہو۔ گویا یہاں کسی بھی ادبی پلیٹ فارم سے کبھی کسی مقامی شاعرہ یا ادیبہ نے اپنی تخلیق پیش نہیں کی پھر بھی منظر عام پر آئے بغیر یہاں کی خواتین نے تخلیق کا عمل جاری رکھا ہے مگر ان کا تخلیقی کام بھی انہی کی طرح مستور ہے۔ بہت کم خواتین ایسی ہیں کہ جنہوں نے ادبی جرائد کے ذریعے منظر عام پر آنا پسند کیا۔ رحیم یار خان گرلز کالج کے شعبہ انگریزی کی استاد فرحت نواز نے رحیم یار خان سے باہر ملتان اور بہاول پور کے ادبی حلقوں میں شاعرہ, ادیبہ اور نقاد کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی۔ 1981 میں ان کا ایک شعری مجموعہ "منزلاں تے پینڈے'' شائع ہوا۔ ملتان میں انہیں فرید کلچرل ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ ثمینہ راجہ اور اسماء راجہ کا تعلق رحیم یار

خان سے ہے جوادبی جرائد کے ذریعے بطور شاعر سامنے آئیں جب کہ مقامی ادبی سرگرمیوں سے انہوں نے کبھی کوئی واسطہ نہیں رکھا۔ خان پور سے شمسہ اختر ضیا، خواتین کالج کی پروین عزیز، ان کی بہن شیما سیال کے نام یہاں کی ادبی تاریخ میں اہم ہیں۔ ضلع رحیم یار خان میں خواتین اگرچہ ادب تخلیق کر رہی ہیں مگر ان کا تخلیقی کام سامنے نہ آنے سے ان کے فن کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ عام تاثر یہ ہے کہ چند ناموں کے سوا باقی جو ادب تخلیق کر رہی ہیں وہ فکری اور فنی لحاظ سے ذرا معیاری نہیں ہے۔ جن خواتین کے نام دستیاب ہیں ان کے کام کے بارے میں بھی واضح نہیں۔ شاعر وادیب خواتین کے ملے جلے نام یہ ہیں۔ رفعت انور ہاشمی، طلعت سعید طلعت، رفیعہ عباسی، پروین شاکر، شگفتہ ضیا، ناہید رعنا، یاسمین گل، شہلا نیازی، نسیم اختر، درشہوار، شفقت نور، اطلا عاتی وفور کے اس دور میں بھی سامنے آنے والی خواتین کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے البتہ رضوانہ سعید روز نے فیس بک کے ذریعے اپنی معیاری شاعری کو منوایا ہے۔

ضلع رحیم یار خان کے کتب خانے: یہ دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا کہ ضلع رحیم یار خان میں کتب خانوں کا جال بچھا ہوا ہے تاہم یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ سرکاری اداروں کے روایتی کتب خانوں کے علاوہ چند نجی کتب خانوں کا ضلع بھر میں وجود مل جاتا ہے جب کہ دو نجی کتب خانے تو غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس علاقے میں ماضی میں مقامی زبان کے علاوہ فارسی اور عربی کا غالب رجحان رہا ہے۔ 19 ویں صدی کے اواخر میں اردو ذریعہ اظہار بنی۔ اشاعتی سہولتوں کے فقدان کے باعث مخطوطوں یا قلمی نسخوں کو ہی کتب کا درجہ حاصل تھا لہٰذا یہ قلمی نسخے ہر اس گھر میں پائے جاتے تھے جہاں پڑھنے لکھنے کا ذوق رہا ہے۔ کچھ خاندانوں میں ایک یا دو افراد پڑھے لکھے مل جائیں تو وہاں قدیم کتب اور قلمی نسخوں کا ہونا یقینی ہے۔ ایسے خاندان ایسی کتب اور مخطوطوں کو وراثتی سرمایہ تصور کر کے ہوا تک نہیں لگنے دیتے جس سے ان کی علمی و ادبی افادیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہاں پر پہلی صف میں تعلیمی اداروں کی لائبریریاں آتی ہیں جنہیں کتب کی خرید کے لیے سالانہ گرانٹ ملتی ہے، ایسی لائبریریوں سے متعلقہ ادارے کے اساتذہ اور طلباء کے استفادہ کرنے کا تصور راسخ ہے۔ دوسری قسم بلدیاتی اداروں کی پبلک لائبریریاں ہیں اور ان لائبریریوں کو بھی کتب خرید اور دیکھ بھال کے لیے سالانہ گرانٹ مل جاتی ہے مگر ان لائبریریوں کے استعمال کا رجحان زوال پذیر ہے اور محض چند افراد صرف اخبارات کے لیے ان لائبریریوں سے رجوع کرتے ہیں۔ کتب جاری کروانے کے لیے رکنیت سازی کا رواج بہت کم ہے۔ خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان میں واقع ابوظہبی کے حکمران کی طرف سے تعمیر کردہ لائبریری مکتبہ شیخ زاید کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ یہ لائبریری اپنے طرز تعمیر، بہترین فرنیچر اور دیگر سہولتوں کے باعث اہل رحیم یار خان کے لیے غیر معمولی تحفہ تھا مگر لائبریری کے استفادہ کے زوال پذیر رجحان کے باعث اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ اس سے ملحقہ خوبصورت آڈیٹوریم تو کبھی کبھار کالج کے استعمال میں آجاتا ہے مگر لائبریری منجمد صورت اختیار کر چکی ہے۔ ابتدائی کتب خریدنے کے بعد اس میں کوئی اضافہ ہوا نہ یہ لائبریری

پبلک لائبریری کی صورت ہی اختیار کر سکی۔ مارکیٹ کمیٹی کی لائبریری بھی منجمد لائبریریوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ ضلع بھر میں نجی اور خاندانی وراثتی کتب خانوں کا سراغ مل جاتا ہے مگر یہ کتب خانے بھی ناقابل رسائی ہیں اور استفادہ کے متمنی افراد کے لیے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کچھ کتب خانے تو ختم بھی ہو گئے جیسے مؤمبارک کا کتب خانہ جو مخدوم افتخار احمد مرحوم کی تحویل میں تھا۔ شیدانی شریف گڑھی اختیار خان، بندور عباسیاں اور میاں والی قریشیاں میں نجی کتب خانوں کی موجودگی بتائی جاتی ہے۔ میاں والی قریشیاں کا کتب خانہ مخدوم حمید الدین حاکم کی تحویل میں تھا۔ روایت ہے کہ اس کتب خانے میں ان کے جدامجد حمید الدین حاکم جو آٹھویں صدی ہجری میں سرائیکی زبان کے ابتدائی اور فارسی زبان کے نعت گو شاعر تھے اور (کہا جاتا ہے کہ) سعدی شیرازی کے ہم مکتب تھے، کے وہ خطوط موجود ہیں جو انہیں سعدی شیرازی نے لکھے مگر وہ کسی کو نہیں دکھاتے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مرکز تحقیقات ایران و پاکستان اسلام آباد نے جب پاکستان میں موجود فارسی مخطوطات کو جمع کرنے کی مہم کا آغاز کیا تو مخدوم حمید الدین حاکم کو ان خطوط کی منہ مانگی قیمت کی پیشکش کی گئی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ ان خطوط کی موجودگی میں کتنی حقیقت ہے اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ اگر ان خطوط کا کوئی وجود ہے تو یہ خاصا غیر معمولی واقعہ ہوتا اور ان کی افادیت ان کو منظر عام پر لانے میں ہی تھی۔ اس لیے اس بات کو افسانہ ہی کہنا چاہئے۔ بہر حال ان کی لائبریری میں اسلامی فلسفہ پر نادر کتب موجود ہے۔ دیگر ذاتی لائبریریوں میں ڈاکٹر عبدالخالق اور شیخ عظیم اشرف کی لائبریریاں اہم ہیں جن میں مختلف موضوعات پر کتب کی قابل ذکر تعداد موجود ہے۔ ڈاکٹر محمد حسین مخدوم کا ذاتی کتب خانہ بھی قابل ذکر ہے جس میں عمومی موضوعات کی بجائے چند نادر قلمی نسخوں اور تصوف کے موضوع پر اہم کتب دستیاب ہیں۔ اس لائبریری میں قران حکیم کے 10 زبانوں میں تراجم، قران حکیم کا 200 سال پرانا نسخہ، متفرق قدیم تفاسیر، کشف المحجوب کے ایک درجن سے زائد تراجم، فارسی ادب کی کلاسیکل کتب کے علاوہ حمید الدین حاکم کی گلزار حمیدیہ فارسی کلام کل صفحات 290 اور ملفوظات مخدوم حاکم کل صفات 188 کے علاوہ خواجہ فرید کے اس دیوان کا قلمی نسخہ بھی موجود ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ان پانچ مخطوطات میں سے ایک ہے جن کی خواجہ صاحب نے اپنے سامنے کتابت کروائی۔ اس نسخے کو ہاتھ لگائیں تو کاغذ ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر اسی کی ویڈیو یا مائیکرو فلمیں تیار کروائی جائیں تو انہیں محفوظ رکھا جا سکتا ہے بل کہ اب تو کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے ذریعے ایسی نادر اور اہمیت کی حامل کتب و قلمی نسخوں کی پی ڈی ایف کاپیاں بھی تیار کی جا سکتی ہیں۔ ضلع رحیم یار خان میں ادارہ تحقیق و تذکرہ پاکستان کی صادق لائبریری میں بہاول پور کی تاریخ پر نایاب کتب کا خزانہ موجود ہے جو اس کے جنرل سیکرٹری پرویز الحسن صادق کے گھر قائم ہے۔ اس لائبریری میں بلوچستان اور بہاول پور کی تاریخ پر متعدد اہم کتب اکٹھی مل جاتی ہیں۔ سید مبارک شاہ کی مبارک لائبریری محمد پور (سنجر پور) اپنی قدامت کے لحاظ سے معروف ہے۔ ان کے بیٹے سید انیس جیلانی نے اس لائبریری کو منجمد نہیں ہونے دیا، اس میں مختلف

نایاب کتب، مخطوطات اور مشاہیر کے خطوط کے نادر مجموعے موجود ہیں۔ یہ لائبریری تحقیق کرنے والے سکالرز کے لیے کھلی ہے۔صادق آباد میں میر زاہد حسین کے بیت الحکمت میں مختلف موضوعات پر نادر اور نایاب کتب کا ایسا ذخیرہ موجود ہے جو کتاب میں دلچسپی رکھنے والے اصحاب کو حیرت سے دوچار کرتا ہے۔ ہمارے ہاں سرکاری اور نجی دو طرح کے کتب خانے پائے جاتے ہیں۔ اول الذکر میں پبلک لائبریریاں، تعلیمی اداروں، تحقیقی اداروں، محکمہ آثار قدیمہ و عجائب خانوں سے وابستہ کتب خانے آتے ہیں جب کہ مؤخر الذکر میں مذہبی اداروں سے وابستہ کتب خانے اور نجی لائبریریاں آتی ہیں۔ میر زاہد کا بیت الحکمت ضلع رحیم یار خان میں نجی لائبریریوں میں سرفہرست ہے اور دیکھنے والے کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔صادق آباد میں میر زاہد کے مہمان خانے اور کتب خانے سے سبھی واقف ہیں۔ان کے مہمان خانے کی روایات خصوصاً دسترخوان بہت معروف تھا مگر کتب خانے کو انہوں نے اپنے خون سے سینچا۔ میر زاہد حسین کا بیت الحکمت دراصل ان کی خاندانی روایت کا تسلسل معلوم ہوتا ہے۔ان کے خاندان میں پہلے ہی ذاتی کتب خانے موجود تھے جن میں ان کے دادا کے بھائی سید سعید ہاشمی کا کتب خانہ۔ سید سعید ہاشمی کے چھوٹے بھائی سید جمیل الدین اختر کا کتب خانہ جو انہوں نے اپنے جدامجد سید محمد یامین سے ورثہ میں حاصل کیا اور ان کے پردادا میر محمد یاسین کا کتب خانہ اہم ہیں گویا ان کی کتاب اور کتاب اندوزی سے محبت میں ان کے خاندانی ماحول کا خاصا دخل ہے۔ وہ ابھی پرائمری کے ابتدائی سالوں میں تھے کہ رسالہ پھول پڑھنے لگے اور رسالے میں جن کتب کے اشتہار ہوتے ان کو بذریعہ وی پی منگوا لیتے۔اس کے بعد وہ دیگر دو جرائد نیرنگ خیال اور عالمگیر کے باقاعدہ خریدار بنے۔ان کے علاوہ گھر میں آنے والا اخبار زمیندار بھی ان کے زیر مطالعہ رہتا۔ پہلے والے رسائل نے ان میں مطالعہ کا شوق اور زمیندار نے ان میں سیاسی اور علمی ذوق کی آبیاری کی۔ 1940 میں جب وہ میرٹھ میں نوچندی کا میلہ دیکھنے گئے تو وہاں سے انہوں نے 60 روپے کی کتب خریدیں۔انہی کتب میں جوش ملیح آبادی کے ایک دو شعری مجموعے بھی شامل تھے گویا ان کی لائبریری کا باقاعدہ آغاز انہی کتب سے ہوا۔اس کے بعد جب وہ ایس ای کالج بہاول پور میں داخل ہوئے تو وہاں کے اساتذہ نے ان کے علمی ذوق کو مہمیز لگائی۔ان کے ایک بزرگ سید رفیق احمد نے خاص طور پر کالج کے دنوں میں ان کو کتب فراہم کر کے ان کی کتب کے شوق کو مزید جلا بخشی اور آج اسی ذوق کی بدولت ایک حیرت زدہ کرنے والی لائبریری وجود میں آ چکی ہے۔میر صاحب نے اپنی نئی رہائش گاہ کچھ اس انداز سے تعمیر کروائی ہے کہ اس کا ایک بڑا حصہ اپنے بیت الحکمت کے لیے مختص کیا ہے۔دو ہال نما کمروں میں کتب الماریوں میں سجی اور فرش پر بکھری نظر آتی ہیں۔اس طرح کے ایک اور ہال میں اخبار و جرائد کی فائلیں اور کچھ کتب منتشر حالت میں موجود ہیں۔اس لائبریری میں کتب کی درجہ بندی کسی مروجہ یا معروف فنی طریقے سے نہیں کی گئی ،ان کو محض موضوعاتی تقسیم کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ چند نمایاں موضوعات یہ ہیں۔اسلامیات، اقبالیات، جناحیات، غالبیات، حافظیات،، شعر و شاعری، تذکرہ، سوانح،

نامہ و پیام (مکتوبات)، سیاسیات، تاریخ، تاریخ اسلام، لغت، فلسفہ، تصوف، فقہ، ادیان، تقابل ادیان، اردو تنقید، آثارقدیمہ، لسانیات، جرائدواخبارات وغیرہ۔انہوں نے عمومی سطح کے ناول اورافسانے کولائبریری میں رکھنا پسند نہیں کیا کیوں کہ وہ انہیں اخلاقی انحطاط کا ذمہ دارتصور کرتے تھے تاہم اہم اور قابل ذکر ناول اور فکشن ان کی لائبریری میں نظر آ جاتا ہے۔بیس ہزار سے زائد کتب کے حامل بیت الحکمت کے اندر داخل ہوتے ہی کتاب کا ذوق اور شعور رکھنے والا شخص حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔جیسے ہی کتب خانے میں داخل ہوں دائیں جانے دوالماریاں نظر آتی ہیں جن میں فارسی ادب کی منفرد کلاسیک سجی ہوئی ہیں۔ان میں ڈاکٹر رکن الدین ہمایوں کا مرتب کردہ 8 جلدوں پر مشتمل حافظ خراباتی کے نام سے دیوان حافظ شیرازی، چار جلدوں پر مشتمل حافظ کی غزلیات کی شرح اور 1911 میں بمبئے سے شائع ہونے والا حافظ شیرازی کا خوبصورت دیوان قابل ذکر ہے۔ان دوالماریوں کے علاوہ گیلری میں بھی فارسی ادب کی کتب کا ذخیرہ نظرا تا ہے جوابھی الماریوں کا منتظر ہے۔ ہال نمبرایک اور دو میں مضمون وار سجی ہوئی کتابوں کی اس دنیا میں حیرت ہی حیرت ہے۔کبھی نظر تقابل ادیان کی الماری پر رامائن، مہا بھارت اور بائبل کے متعدد کمیاب نسخوں پر پڑتی ہے تو دوسری جانب ڈکشنری سیکشن میں فرہنگ آصفیہ، بہار عجم، فرہنگ آنند راج ہفت قلزم مکمل، فرہنگ نظام، لغت فیروزی اور متعدد دیگر لغات دیکھنے والے کا دامن دل کھینچتی نظر آتی ہیں۔ یاقوت مستعصمی کا خط نسخ میں لکھا ہوا قرآن کا قدیم ترین مخطوطہ، مشہور فارسی شاعر طالب آملی کے دیوان کا قلمی نسخہ اور متعدد ناپید قلمی نسخے، حیدرآباد دکن کی مطبوعات، کامریڈ، زمیندار، نگار، ابوالکلام آزاد کے الہلال اور دیگر رسائل و جرائد اور اخبارات کی مکمل فائلیں۔علاوہ ازیں علامہ اقبال کی کتب کے ابتدائی ایڈیشن، سیرت النبیؐ، فقہ اور کشمیر کے موضوع پر نادر کتب، بہادرشاہ ظفر کے چار جلدوں پر مشتمل دیوان کا پہلا ایڈیشن، سائل دہلوی کی ہاتھ سے لکھی ہوئی بیاض اور مختلف مشاہیر کے خطوط غرض ہر موضوع پر بیس ہزار سے زائد کتب کی اس دنیا میں ایسی ایسی کتابوں سے ملاقات ہوتی ہے کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

میرزاہد حسین صادق آباد سے باہر کم ہی گئے زیادہ تر کتب انہوں نے لاہور کے مولوی شمس الدین سے منگوائیں جوانمول کتب کے بہت بڑے تاجر تھے۔کراچی میں عباسی کتب خانہ کے ذریعے کتابیں خریدیں اور انڈیا سے شروع شروع میں نیاز فتح پوری کے ذریعے منگوائیں۔علاوہ ازیں چندنجی کتب خانے بھی خریدے جن میں بہاول پور کے مولوی فضل اللہ کا نجی کتب خانہ قابل ذکر ہے۔ بیت الحکمت میں کتب کے اندراج کے لیےایک رجسٹر بنایا گیا ہے جو ضائع ہوگیا۔ یہاں پرکسی کتاب کی تلاش یا حصول ایک مشکل کام ہے کیوں کہ کسی کیٹلاگ کا اہتمام ہے نہ کلاسیفکیشن کا۔کوئی کتاب اپنے موضوع کی جگہ سے اِدھر اُدھر ہو جائے تو اس کا تلاش کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔اگر کوئی اہم کتاب میر صاحب کی نظر سے اوجھل ہو جائے تو وہ اس کے دوبارہ حصول تک بہت پریشان رہتے ہیں۔لائبریری کے کمروں کا فرش ایسے مٹیر یل سے تیار کیا گیا ہے جس

سے کتابوں اور اخبارات اور رسائل کو دیمک نہیں لگ سکتی۔ کتابوں کو نمی اور دیگر موسمی اثرات سے پاک رکھنے کے لیے سال میں ایک دو مرتبہ دھوپ لگوا دی جاتی ہے۔ جہاں تک نادر کتب کے استعمال کا تعلق ہے تو یہ چند ان آسان نہیں کیوں کہ اس کے لیے میر صاحب کا اعتماد حاصل کرنا پڑتا ہے اور میر صاحب کے مخصوص مزاج کے باعث اس میں ایک مدت صرف ہو سکتی ہے۔ انہوں نے لائبریری کی کتب کے استعمال کے ضمن میں ایک عبارت لکھ کر ایسی جگہ رکھی ہوئی ہے جہاں لائبریری میں داخل ہونے والے کی نظر سب سے پہلے پڑتی ہے۔
"جس طرح چڑیا کا بچہ ایک بار گھونسلے سے نکل کر واپس نہیں لوٹتا اسی طرح کتاب ایک بار کتب خانے سے نکل کر کبھی واپس نہیں آتی۔ ناظم بیت الحکمت"

85-1984 کے سال اس لائبریری کے لٹنے کا دور ہے جب رحیم یار خان کے ذریعے انتظامیہ میں کچھ اعلیٰ افسران کے ادیب ہونے کا شہرہ تھا ان پر لائبریری کے در وا کر دیے گئے۔ میر صاحب اس دور کا ذکر بڑے دکھ کے ساتھ اور ان افسران کو اپنے مخصوص انداز میں خراج تحسین ادا کر کے کرتے ہیں کہ انہوں نے لائبریری میں متعدد انمول اور نایاب کتابوں کا انتخاب کیا اور پھر کئی طریقوں سے جن میں ڈپلیکیٹ چابیوں کا بنایا جانا بھی شامل تھا، لائبریری کو ان کتابوں سے محروم کر دیا، اس نقصان سے میر صاحب یوں رنجیدہ اور ملول نظر آتے ہیں کہ جیسے ان کی زندگی بھر کی کمائی چھین لی گئی ہو۔ یہ یقیناً ان کی قیمتی متاع ہے کہ جس کی حفاظت اور دیکھ بھال کا مستقل اور خاطر خواہ انتظام ہونا چاہیے کیوں کہ کتابوں کا یہ خزانہ متعدد موضوعات پر تحقیق کا نیا جہان آباد کر سکتا ہے۔ میر زاہد کی وفات کے بعد ان کی لائبریری کے نگہبان ان کے صاحب زادے سید فضلی ہیں مگر جب سے میر صاحب اگلے جہان سدھارے ہیں، ان کے بیت الحکمت کے بارے میں کم ہی سننے کو ملا ہے۔

میر زاہد کی لائبریری کے لٹنے سے مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ تقریباً اسی دور میں میرے ایک ایسے شاگرد جو پنجاب پولیس میں سب انسپکٹر تھے، ایک دن مجھے ملنے آئے اور دوران گفتگو دریافت کیا کہ ''بریٹانیکا انسائیکلو پیڈیا'' کا مکمل سیٹ کتنے کا آتا ہے۔ میں ایک پولیس والے سے اس استفسار کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے پوچھا، خیریت ہے؟ بتانے لگے کہ ضلعی پولیس کے سربراہ نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں انہیں اس انسائیکلو پیڈیا کی تمام جلدوں کا مکمل سیٹ خرید کر دوں۔ میں نے جواباً کہا کہ 82-1981 کے دوران رحیم یار خان کے ڈپٹی کمشنر محمد اکرم ملک گورنمنٹ کالج خان پور میں منعقدہ ایک تقریب میں مدعو تھے اور میری تحریک پر پرنسپل نے دیگر مطالبات کے ساتھ ان سے کالج کی لائبریری کے لیے اسی انسائیکلو پیڈیا کا سیٹ خریدنے کے لیے گرانٹ کا مطالبہ بھی شامل کر دیا اور انہوں نے کالج کو پانچ ہزار روپے کی گرانٹ جاری کی۔ میں تو وہاں سے آ گیا تھا، معلوم نہیں پرنسپل نے وہ خریدا یا نہیں اور اب میں آپ کو اندازہ لگا کر بتا سکتا ہوں کہ تقریباً پندرہ ہزار روپے کا تو ضرور آئے گا۔ اس کے بعد کا مجھے معلوم نہیں۔

امانت علی اینڈ سنز نیوز و جنرل بک سٹور ریلوے روڈ رحیم یار خان کی اگر تجسیم کی جائے تو یہ اخبارات اور رسائل اور جنرل کتب کی محض ایک دکان نہیں بل کہ سانس لیتا ہوا ایک ادارہ ہے جو اہل رحیم یار خان کو پارٹیشن سے بھی پہلے سے پاکستان اور دنیا بھر کے اخبارات رسائل و جرائد اور جنرل کتب پیش کرتا آیا ہے۔ کئی لوگوں کو تعجب بھی ہوسکتا ہے کہ کتابوں کی دکان پر یہ تحریر کیسی یا اس کا کیا جواز ہے؟ میں نے رحیم یار خان میں کم وبیش 16 برس گزارے اور ان برسوں میں اس دکان کی وجہ سے میرے ذاتی کتب خانے میں خاصا اضافہ ہوا۔ یہ محض ایک عام دکان نہیں ہے، اس میں اگر آپ داخل ہو جائیں اور اگر آپ پڑھنے کا ذوق وشوق بھی رکھتے ہوں تو میرا نہیں خیال کہ آپ اس دکان سے خالی ہاتھ باہر آئیں گے۔ میرا اس دکان سے تعارف مارچ 1979 میں ہوا تھا۔ خواجہ فرید گورنمنٹ کالج کی جس ہاسٹل میں میرا قیام تھا اس میں اردو اور انگریزی اخبارات آتے تھے۔ انگلش اخبار خاص طور پر ہاکر اگلے روز دیتا تھا جو ایک دن لیٹ ہوتا تھا۔ اخبار کی خبریں ویسے بھی ایک دن پرانی ہوتی ہیں۔ اس طرح گویا ہمیں دو دن پرانی خبریں پڑھنے کو ملتی تھیں۔ تصور یہ تھا کہ اخبار دفتر میں پڑھا جاتا ہے اس لیے آج سہ پہر کو پہنچنے والا اخبار ہاکر اگلے دن آفس ٹائم میں دینے کا عادی تھا جب کہ ہم شام کو ہاسٹل میں بھی اخبار پڑھ سکتے تھے۔ میں نے اخبار کی ایجنسی پر شکایت درج کرائی تو ہاکر کو سمجھا دیا گیا اور اخبار اسی دن اسی شام ملنا شروع ہوا۔ چند دنوں بعد اخبارات کی دکان سمجھ کر میں بھی وہاں گیا۔ دکان میں داخل ہوا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ لاہور سے ساڑھے پانچ سو کلومیٹر دور کسی ایسی دکان کا خواب ہی دیکھا جا سکتا تھا۔ ایک طرف کشادہ میز پر سماجی، سیاسی رسائل و ڈائجسٹ، ماہانہ و ہفت روزے ترتیب سے لگے پڑے تھے، ان میں ادبی رسائل بھی اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ فنون، اوراق، نقوش، افکار، سیپ، ادب لطیف، تخلیق، ادبیات، ماہ نو کے ساتھ ساتھ ریڈرز ڈائجسٹ، نیشنل جیوگرافک، ہفتہ وار ٹائمز، نیوز ویک اور دیگر بین الاقوامی رسائل بھی نمایاں تھے۔ ڈائجسٹوں اور پاکستان کے شہروں کراچی لاہور اور اسلام آباد سے چھپنے والے تمام رسائل و جرائد کے تازہ شمارے تمام تر کشش کے ساتھ موجود تھے۔ میں کیا دیکھیں اور کیا خریدیں کے مخمصے میں پڑ گیا۔ دوسری جانب الماریوں میں دنیا جہان کے موضوعات پر انگریزی اور اردو کتب کے قومی اور بین الاقوامی ایڈیشن بھرے پڑے تھے۔ تیسری جانب اخبارات کی آمد و رفت اور ہاکرز کے ذریعے ان کی ترسیل جاری تھی۔ چوتھی جانب بشیر امانت علی ایک کونے میں اپنی کرسی و میز پر بیٹھے سامنے بیٹھے دوستوں سے مخاطب تھے اور ساتھ ہی حنیف صاحب تمام اخبارات کو رحیم یار خان کی تازہ نیوز رپورٹس بھجوانے اور لکھنے میں مصروف تھے۔ کاؤنٹر پر باری باری صغیر امانت علی اور منیر امانت علی بیٹھتے تھے۔ یہ دونوں بھائی نسبتاً کم گو تھے جس سے ان پر مغرور ہونے کا احساس ہوتا تھا جب کہ بشیر صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ تبادلہ خیال کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ میں جو پہلا تاثر لے کر آیا وہ یہی تھا کہ دکان تو بہت شاندار اور رحیم یار خان میں غنیمت ہے مگر اس میں موجود لوگوں کے رویے آنے والوں کو خوش آمدید کہنے سے شاید قاصر ہیں۔ بہر حال دکان پر جانا شروع ہو گیا

اور مشینی انداز میں دکان کے اندر کی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ایک دو نہیں تین سال بعد منیر صاحب اور صغیر صاحب سے خاصی حد تک تعلق قائم ہو گیا۔صغیر صاحب سے ایک زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کوئی شگفتہ بات بھی سننے کو ملنے لگی۔بشیر صاحب چوں کہ بزرگ تھے اور اخبارات کے لیے رپورٹنگ کرانے کا شعبہ ان کے پاس تھا،حنیف صاحب ان کی معاونت کرتے تھے،دکان میں نظر آنے والی اجنبیت جاتی رہی اور جان پہچان کی فضا محسوس کی جانے لگی۔جب انہوں نے مستقل مزاج کتاب دوست دیکھا تو اب وہ کسی کتاب پر رعایت بھی دینے لگے تھے۔اخبار کا بل تو میں با قاعدگی سے ادا کر دیتا تھا،عبدالسلام میرے علاقے کا نیوز ہاکر تھا،اس سے مسلسل اخبارات دیر سے ملنے کی شکایت آخر تک جاری رہی۔تینوں بھائیوں اور حنیف صاحب سے بات چیت بھی ہونے لگی۔ہفتے میں ایک بار اس دکان پر جانا با قاعدہ روایت بن گیا۔نئی کتب اور رسائل کے انڈیکس یا عنوانات دیکھنے پر ایک گھنٹہ صرف ہوتا لیکن اب وہاں فضا بڑی مانوس ہو چکی تھی۔1985 میں ہمارے تعلقات نے ایک اور جست بھری۔اب مجھے جو کتاب یا رسالہ پسند ہوتا وہ میں لے جاتا اور اپنے کھاتے میں اس کا اندراج کرا دیتا،جب مہینے کا آغاز ہوتا تو ادھار کتابوں پر 20 فیصد رعایت ملنے لگی۔یہ ایک شاندار تجربہ تھا کہ کتابیں ادھار پر لے جائیں اور ادائیگی بعد میں اور رعایت کے ساتھ کریں۔ان میں رسائل و جرائد شامل نہیں ہوتے تھے۔یہ ضروری نہیں تھا کہ تمام بل ادا کر دیا جائے۔پھر ایسا ہونے لگا کہ میں جب بل ادا کرنے آتا تو رسائل و جرائد اخبارات اور پچھلا بقایا الگ دکھایا جاتا اور مہینے بھر کی نئی کتب کا رعایتی بل بن جاتا۔ہر مہینے کچھ نہ کچھ بقایا رہ جاتا مگر حرف شکایت کسی طرف سے نہ آیا۔ان لوگوں سے تعلق دوستی میں بدل چکا تھا، حنیف صاحب سے تو یارانہ تھا۔اب تو کسی نئی کتاب کا پہلا ایڈیشن آتا تو ہاکر کے ذریعے گھر بھیج دیا جاتا مثلاً شہاب نامہ اور فیض احمد فیض کے کلیات نسخہ ہائے وفا کے پہلے ایڈیشن کی کاپیاں مجھے اب تک یاد ہیں۔اس طرح جزوی یا کلی طور پر ادائیگی بھی کرتا رہا اور میری لائبریری میں اضافہ بھی ہوتا رہا۔میری موجودہ لائبریری کا نصف حصہ صرف اسی دکان سے خریدی گئی کتب پر مشتمل ہے۔1990 کے بعد کسی سال دکان کو پچھلی گلی کی جانب منتقل کر کے موجودہ جگہ پر دکان کی توسیع و تعمیر کے کام کا آغاز ہوا جو ایک سال سے زائد مدت میں مکمل ہونا تھا۔نئی اور عارضی جگہ اگرچہ تنگ تھی مگر میرے ہفتے میں ایک بار جانے کے معمول میں فرق نہ آیا۔آخر دکان تیار ہو گئی اور تمام سامان اور رسائل و کتب نئی دکان میں رکھ دیے گئے۔دکان کی نئی عمارت میں کشادگی کا احساس ہوتا تھا۔دیوار گیر الماریوں کی تعداد بھی بہت معقول تھی لیکن کتابیں الماریوں میں کسی موضوعاتی ترتیب کے بغیر پڑی تھیں جن سے کسی کتاب کی تلاش میں دقت ہوتی ہے۔میں نے دو تین گھنٹے روزانہ کی بنیاد پر دو دنوں میں ان کتابوں کو موضوعاتی ترتیب دے کر رکھ دیا مثلاً تاریخ و تہذیب، اردو ادب میں افسانہ، ناول، تنقید، شعری مجموعوں کو علیحدہ سے رکھ دیا۔تفاسیر و احادیث اور دیگر مذہبی کتب کو ان کے موضوعاتی اور ذیلی ترتیب سے الماریوں کی زینت بنا دیا۔پہلے دن تو وہاں پر موجود صغیر صاحب اور منیر صاحب دیکھتے رہے مگر دوسرے دن

انہوں نے کہا کہ آپ بلا وجہ تکلیف کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں یہ سب کچھ اپنے لیے کر رہا ہوں تا کہ کسی کتاب کو ڈھونڈنے میں دقت نہ ہو، آپ صرف یہ زحمت کریں گے کہ جب بھی نئی کتب آتی جائیں انہیں اسی ترتیب سے رکھتے جائیں تو یہ تکلیف ضائع نہیں جائے گی۔ اس واقعے کے بعد تو وہ مجھے اپنے حلقہ احباب میں بھی شامل سمجھنے لگے، امانت علی اینڈ سنز کا ایک بہت بڑا فعال کردار بشیر امانت علی تھے جو پریس کلب، اخبارات کی رپورٹنگ کی نگرانی اور اخبارات کی ایجنسی کے امور کی مانیٹرنگ کرتے تھے۔ 1990 کی دہائی کے اوائل میں پہلی بار ایک اہم اخبار کی ایجنسی کسی نے سفارش یا دیگر طریقے سے حاصل کر لی۔ بشیر صاحب نے صرف ایک چکر لاہور کا لگایا اور ایجنسی واپس آ گئی۔ اسی طرح کے امور میں انہیں دسترس حاصل تھی۔ میں نے جب 1993 میں خان پور کالج کے میگزین بانگ سحر کا ضلع رحیم یار خان نمبر نکالا تو اس میں رحیم یار خان کی صحافت کے عنوان سے ایک خاصا طویل مضمون تھا، اس کے پس منظر میں سب سے بڑا حوالہ بشیر صاحب تھے جنہوں نے ایک تین گھنٹے کی طویل نشست میں مجھے پارٹیشن سے 1993 تک کی معلومات دیں۔ جب رسالہ شائع ہوا تو میں ستمبر 1994 میں بہاول پور شفٹ ہو چکا تھا۔ رسالہ ملا تو انہوں نے مجھے خط لکھا کہ آپ نے کمال کر دیا، ضلع رحیم یار خان کو زندہ کر دیا، سلامت رہیں۔ میری حوصلہ افزائی کے لیے یہ بہت تھا۔ 1994 کے بعد جب رحیم یار خان جانا ہوتا تو میں امانت علی اینڈ سنز پر جانا بالکل نہ بھولتا بل کہ میں اپنی آمد اور واپسی کے درمیان ایک دفعہ اس دکان پر جانا لازمی خیال کرتا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ میں اپنے کالج کے لیے کتابوں کا انتخاب اور کالج کے مفاد میں ایک معقول رعایت لینے میں کامیاب ہو جاتا اور وہ کتابیں کالج اور ان کا بل کا چیک دکان پر پہنچ جاتے پھر ریٹائرمنٹ کے بعد میں 2014 میں لاہور شفٹ ہو گیا لیکن جب بھی رحیم یار خان جانا ہوتا ہے میں حسب معمول ایک آدھ گھنٹے کے لیے وہاں ضرور جاتا ہوں، کوئی کتاب یا رسالہ پسند نہ بھی آئے تو نشانی کے طور پر ملتان ایڈیشن کا کوئی اخبار ہی لے لیتا ہوں۔ میں جب بھی دکان پر جاتا ہوں اس کونے میں ضرور دیکھتا ہوں اور وہاں بیٹھتا ہوں جہاں بشیر صاحب اپنے مہمانوں سے ملا کرتے تھے۔ صغیر صاحب اچانک ایک جان لیوا بیماری کا شکار ہوئے اور چلے گئے، میں تب رحیم یار خان میں نہیں تھا۔ منیر صاحب امریکہ میں انتقال کر گئے اور وہیں پر ان کی تدفین ہوئی۔ حنیف صاحب سے ملاقات ہو جاتی ہے مگر سماعت کی وجہ سے وہ بھی مشکل میں ہیں۔ میں جب بھی اس دکان پر جاؤں تو میری ملاقات بشیر صاحب، منیر صاحب اور صغیر صاحب سے بھی ہوتی ہے مگر ان کی نئی نسل کی شکل میں جنہوں نے رپورٹنگ، ایجنسی اور بک شاپ کی ذمہ داریاں احسن انداز سے سنبھالی ہوئی ہیں۔

رحیم یار خان سے وابستہ ایک ناقابل فراموش واقعے کا ذکر کرنا دلچسپ رہے گا۔ جماعت اسلامی نے صادق آباد اور رحیم یار خان میں تعمیر ملت کے نام سے طلبا اور طالبات کے ہائی سکول کھول رکھے تھے جو

یکم اکتوبر 1972 سے ملک کے دیگر تعلیمی اداروں کی طرح گورنمنٹ کی تحویل میں چلے گئے۔ رحیم یار خان میں تعمیر ملت بوائز سکول کالونی المعروف بستی امانت علی کے اندر اپنی عمارت میں واقع تھا جب کہ اسی نام کا طالبات کا سکول ائیر پورٹ روڈ کی جانب اسی آبادی کے آغاز میں ایک انتہائی غیر موزوں اور خستہ حال کرائے کی عمارت میں کام کر رہا تھا۔ جنوری 1982 میں جنرل ضیاالحق نے الیکشن سے بچنے اور اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے وفاقی سطح پر فیڈرل کونسل یا مجلس شوریٰ تشکیل دی جس میں اس وقت کی فوجی حکومت کے ہمنوا افراد کو بطور رکن شامل کیا گیا جسے پارلیمنٹ کا جعلی ایڈیشن کہنا چاہیے۔ اسی طرح صوبائی سطح پر بھی صوبائی کونسلیں بنائی گئیں جس میں بلدیاتی سطح کے ارکان کو نامزد کیا گیا اور اسکے اجلاس صوبائی اسمبلی کی طرز پر ہونے لگے۔ اس کے ارکان کو ممبر صوبائی اسمبلی تصور کیا جانے لگا اور اس کے اجلاس میں ان ارکان کے مطالبہ نما سوالات کو بھی اہمیت دی جانے لگی۔ اسی دوران جماعت نے اسلامیہ گرلز سکول ائیر پورٹ روڈ پر بستی امانت علی کے آخر میں جناب ہارون باجوہ کے گھر کے تقریباً سامنے ایک عمارت میں متعارف کرا دیا جس کی ہیڈ مسٹریس تعمیر ملت گرلز ہائی سکول کی سابق معلّمہ محترمہ شمیم عالم تھیں۔ رحیم یار خان شہر سے متذکرہ بالا صوبائی کونسل کی رکن جناب محمد حسین باجوہ کی صاحبزادی محترمہ عقیلہ باجوہ تھیں۔ انہوں نے پنجاب کی صوبائی کونسل میں سوال اٹھادیا کہ: ''کیا حکومت کو یہ معلوم ہے کہ رحیم یار خان شہر میں گورنمنٹ تعمیر ملت گرلز ہائی سکول ایک خستہ اور خطرناک عمارت میں کام کر رہا ہے، اسے وہاں سے منتقل کیا جائے۔'' ان کے اس سوال کو منتخب اسمبلی کے سوال کی طرح اہم تصور کیا گیا اور ضلع کے تعلیمی حکام نے ہنگامی بنیادوں پر سکول کو وہاں سے تین دن کے اندر اندر منتقل کرنے کا حکم دے دیا۔ نیت چاہے جو بھی ہو اس اقدام سے بظاہر تاثر یہ لیا گیا کہ اس سکول کے منتقل ہونے سے جماعت کے سکول کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ تعمیر ملت گرلز ہائی سکول کا تمام فیڈنگ ایریا نجی سکول میں منتقل ہو جائے گا اور سرکاری سکول بتدریج ختم ہو جائے گا۔ میری رفیقہ حیات نجمہ نسیم اپنے پے اینڈ سکیل پر بطور انچارج ہیڈ مسٹرس تعمیر ملت گرلز سکول میں کام کر رہی تھیں لہٰذا سکول کو منتقل کرنا انہی کا کام تھا اور اس سکول کے فیڈنگ ایریا میں کوئی کرائے کی عمارت موجود نہیں تھی یوں سکول کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ انہوں نے سکول منتقل کرنے کا حکم نامہ مجھے دکھایا۔ یہاں پر ایک بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ تعمیر ملت بوائز ہائی سکول کے سامنے گورنمنٹ کی خاصی زمین پڑی تھی جس کو سکول کے کھیل کے میدان کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ کالونی امانت علی کے قبرستان کے سامنے اس کھیل کے میدان کے علاوہ بھی ایک وسیع قطعہ زمین پڑا تھا جس پر کئی محکموں کے

افسران اپنے دفاتر کے لیے آنکھیں گاڑھے ہوئے تھے۔ جب بھی کوئی حکومتی ٹیم اس جگہ کو دیکھنے آتی تو سکول کا سٹاف انہیں یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ یہ زمین تعمیر ملت گرلز سکول کے لیے مخصوص ہے جب کہ تعمیر ملت گرلز سکول کی اپنی عمارت کا منصوبہ ایک خیالِ خام کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی اپنی عمارت کا خواب دیکھنا بھی ناممکن تھا۔ میں نے اپنے دوست پروفیسر غلام سرور صدیقی سے مشورہ کر کے ایک سرکاری خط کا ڈرافٹ تیار کیا جس کا ترجمہ اور خلاصہ کچھ یوں تھا:۔

۔''جناب عالی! تین دن کے اندر سکول کو منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے جب کہ اس کے فیڈنگ ایریا میں کہیں بھی کرائے کی عمارت دستیاب نہیں ہے۔ یہ سکول اس علاقے میں واحد حکومتی سکول ہے جسے یہاں سے منتقل کیا گیا تو یہ اقدام اس کے مکمل خاتمے پر منتج ہوگا۔ اس حکومتی سکول کے وجود کو ختم ہونے سے بچانے کے لیے اسی علاقے میں کسی کرائے کی عمارت کی تلاش کے لیے ہم بھی کوشش کرتے ہیں اور محکمہ بھی ہماری مدد کرے اور متبادل عمارت کے حصول تک اسے یہاں سے منتقل کرنے کے احکام واپس لیے جائیں۔ گورنمنٹ تعمیر ملت بوائز سکول کے سامنے کھیل کے میدان سے ملحق ایک معقول قطعہ اراضی پڑا ہے جو گورنمنٹ تعمیر ملت گرلز سکول کی عمارت کے لیے مخصوص (Reserve) ہے۔ اگر حکومت تعمیر کے لیے گرانٹ منظور کر دے تو کامیابی سے کام کرنے والے اس علاقے کے واحد گورنمنٹ گرلز سکول کو معدوم ہونے سے بچایا جا سکتا ہے''۔

اس خط کی کاپیاں ڈپٹی کمشنر رحیم یار خان، کمشنر بہاول پور ڈویژن اور گورنر پنجاب کے نام بھی بھیجی گئیں۔ اس کے بعد ایک لمبی چپ، کسی نے سکول کو منتقل کرنے کی بات نہیں کی۔

ایک سال سے زیادہ عرصے بعد کی بات ہے، میں ایک دن امانت علی نیوز ایجنسی پر گیا تو جناب صغیر امانت علی نے اخبار کے اندر چھپا ہوا ایک اشتہار دکھایا جس میں 23 لاکھ کی گرانٹ سے گورنمنٹ تعمیر ملت گرلز ہائی سکول کی عمارت کی تعمیر کے لیے ٹینڈر نوٹس شائع ہوا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد سکول کی عمارت کی تعمیر کے آغاز پر چار دیواری کی تعمیر پہلے ہونے لگی۔ سکول کے منظور شدہ نقشے میں اکیڈیمک بلاک کے علاوہ 18 اور 16 گریڈ کی دو رہائش گاہیں بھی شامل تھیں۔ جب سکول کی عمارت مکمل ہوگئی تو ایک اور مسئلے نے سر اٹھایا۔ ایک تجویز کو خفیہ طریقے سے فلوٹ کیا گیا کہ نئی بلڈنگ چوں کہ آبادی سے باہر واقع ہے اور بچیوں کے لیے موزوں نہیں ہے اس لیے بوائز سکول کو نئی بلڈنگ اور گرلز سکول کو بوائز سکول کی پرانی طرز کی عمارت میں منتقل کیا جائے۔ ڈائریکٹر سکولز بہاول پور ڈویژن میاں سردار محمد نے اس کی منظوری دے دی۔ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر (زنانہ) مسز ارشد کو یہ تجویز پسند نہ آئی۔ انہوں نے نئے بننے والے سکول میں سٹاف اور چند معززین کی

میٹنگ بلائی اور کہا کہ کیا ہماری بچیوں کے نصیب میں نئی اور معیاری عمارت نہیں ہے۔ کالونی امانت علی اور سکول کے درمیان صرف ایک سڑک واقع ہے۔ اخلاقی طور پر فیصلہ بچیوں کے حق میں ہو گیا مگر ڈائریکٹر اجازت دے چکے تھے۔ انہیں دنوں جناب محمد رفیق لغاری پنجاب کابینہ میں وزیر تھے اور رحیم یار خان کے دورے پر ہائی وے ریسٹ ہاؤس میں قیام پذیر تھے۔ پنجاب کے گورنر جنرل غلام جیلانی خاں تھے اور ان کی ہدایت کے مطابق کسی بھی علاقے کے دورے پر گئے ہوئے وزیر کو دورے کے منٹس پیش کرنے پڑتے تھے۔
جناب بشیر امانت علی نے تجویز پیش کی کہ بلڈنگ کی تبدیلی کے ضمن میں تعمیر ملت گرلز ہائی سکول کی محترم اساتذہ کا ایک وفد وزیر صاحب سے مل کر منتقلی کا مسئلہ پیش کرے کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ جب تک کسی بڑی اتھارٹی کا حکم نہیں لے لیا جاتا، باہمی منتقلی کی تجویز والے باز نہیں آئیں گے۔ انہوں نے وزیر صاحب سے وقت لیا اور صغیر امانت علی نے وفد کی سربراہی کی اور سارا قصہ لغاری صاحب کے گوش گزار کیا جنہوں نے اپنے پرسنل سیکرٹری کو ہدایت کی کہ اس مسئلے کو دورے کے منٹس میں شامل کرے۔ ان کے دورے کے چند دنوں بعد ایک حکمنامہ موصول ہوا کہ ''گورنمنٹ تعمیر ملت گرلز ہائی سکول رحیم یار خان کی عمارت گورنر کی خصوصی گرانٹ سے تعمیر کی گئی ہے اور یہ گرانٹ ناقابل انتقال ہے اس لیے اس میں وہی سکول منتقل ہوگا جس کے لیے یہ تعمیر کی گئی ہے''۔ یوں مارچ 1985 کے دوران تعمیر ملت گرلز ہائی سکول کو اپنی نئی عمارت نصیب ہوئی۔ 5 اپریل 1985 کو ہم لوگ ہیڈ مسٹریس کی سرکاری رہائش گاہ میں منتقل ہو گئے اور یہیں سے 5 اکتوبر 1994 کو بہاول پور منتقل ہوئے۔ اس سکول کی حدود میں پہلے عام اور پھلدار درخت ہم نے لگوائے یا لگائے اور آج چالیس سال کے بعد بھی وہ وہاں اپنے پھلوں اور سائے سے سب کو مستفید کر رہے ہیں۔ یہاں پر مجھے سعدی کی ایک حکایت یاد آئی۔ انوشیروان بادشاہ کا گزر ایک ایسی جگہ سے ہوا جہاں ایک بوڑھا شخص کچھ پودے لگا رہا تھا، بادشاہ نے پوچھا، اے بزرگ کیا کر رہے ہو؟ جواب آیا اخروٹ کے پودے لگا رہا ہوں۔ انوشیرواں کہنے لگا: اچھا تو ان درختوں کا پھل کھانے کی امید بھی رکھتے ہو۔ بوڑھے نے جواب دیا نہیں جناب! ہم سے اگلوں نے لگائے ہم نے کھائے، ہم لگائیں گے تو آنے والے کھائیں گے۔
اب کچھ ذکر ضلع رحیم یار خان کے ان افراد کا جن سے دوستی اور خلوص کا تعلق رہا۔
پروفیسر محمد اظہر (مرحوم) نے اس وقت ایم فل کیا جب یہ ڈگری ابھی عام نہیں ہوئی تھی۔ 1952ء میں پیدا ہونے والے اور 1980ء میں خواجہ فرید گورنمنٹ جوائن کرنے والے اس قابل استاد نے صرف 34 سال کی جوان سالی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ جولائی 1986 میں پائلٹ سکول کے گراؤنڈ میں پڑھا جانے والا ان کا جنازہ رحیم یار خان کی تاریخ کے بڑے جنازوں میں سے تھا۔ وہ ایک اچھے استاد ہونے کے ساتھ ایک اچھے انسان اور دوست تھے۔ ان کی شخصیت کے اوصاف میں خلوص، محنت، نیک نیتی، مقبولیت اور متحرک معاشرتی اور تدریسی عناصر شامل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالغفور بلوچ اپنے پیشہ ورانہ رویوں کے لحاظ سے بہت مقبول ڈاکٹر تھے۔ انھوں نے بزم فرید کے صدر کی حیثیت سے رحیم یار خان کی ثقافتی زندگی میں تحرک پیدا کیا۔ وہ ایک بہترین اور زندہ دل دوست، ہمدرد اور دردمند ڈاکٹر تھے جنھوں نے اپنے پیشے سے مستحق لوگوں کو مستفید کیا اور پیشہ ورانہ دیانت کو ذاتی زندگی پر ترجیح دی۔ قدرت نے ان کی زبان میں بھی مسیحائی کی تاثیر رکھ دی تھی۔ زندہ دلی ان کی شخصیت کا ایسا وصف تھا جو انہیں ایک کامیاب مجلسی انسان کے درجے پر فائز کرتا تھا۔ اساتذہ اور پڑھے لکھے لوگوں کو بہت زیادہ عزت اور محبت دیتے تھے۔ کسی استاد سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ دوستوں کو جوڑ کر رکھنا ان کی طبیعت کا خاصا تھا۔ اپریل 1987ء میں اچانک اس فانی دنیا کو چھوڑنے میں بہت جلدی کی۔ یہ شاید واحد ڈاکٹر ہیں جو کرائے کے مکان میں رہتے تھے اور بوقت رحلت مقروض تھے۔

شیخ عظیم اشرف صرف ایک تجربہ کار اور طویل کیریئر کے حامل قانون دان ہی نہیں تھے، وہ ایک صاحب طرز ادیب، منطقی اور ریشلسٹ نقطۂ نظر کے مفکر، تاریخ دان اور ترقی پسند سوچ کے داعی تھے۔ وہ سائنسی طرز فکر کے حامل دانشور تھے جو دوستوں اور دیگر متجسس لوگوں کے لیے روشنی کی مشعل تھے۔ علمی بحث و مباحثہ میں علمی رویہ اور تحمل و برداشت کے قائل تھے۔ وہ بہت سے علم دوست لوگوں کی انسپائریشن تھے۔ وہ ایک ایسا معاشرہ دیکھنے کے متمنی تھے جہاں معاشرتی مساوات ہو اور علمی رویے کے ساتھ مباحث کی روایت ہو۔ ان کا مزاج اور بصیرت ہماری دنیا سے میل نہیں کھاتے تھے بل کہ بعض اوقات تو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ان کی روح بھٹک کر ہمارے معاشرے میں آ گئی تھی۔ دوستوں کے درمیان بہترین رابطہ اور ان کے درمیان اتصال کا ذریعہ تھے۔ اپنے اور دوستوں کی بہتری کے خواب ان کی پلکوں پر سجے رہتے۔ عدلیہ سے وابستہ لوگ بیک ڈور سے سول کیسز میں ان سے رہنمائی لیتے تھے۔ ان سے مل کر میں اس صداقت پر ایمان لے آیا کہ عظیم اشرف جیسی عظیم شخصیات نور کے ایسے ہالے کی مانند ہوتی ہیں کہ جو چیز بھی ان کے دائرہ اثر میں آتی ہے روشن اور منور ہو جاتی ہے۔ عظیم اشرف درحقیقت روشنی کا استعارہ تھے۔ انہوں نے کراچی کے ایک ہسپتال میں 1996ء کے دوران دل کی سرجری کے بعد کی پیچیدگیوں کا شکار ہو کر وفات پائی۔ ان کی موت رحیم یار خان کی علمی اور تہذیبی زندگی کی موت بھی تھی۔

ڈاکٹر عبدالخالق رحیم یار خان کی ایک کثیر الجہات شخصیت تھے۔ وہ یہاں کے سب سے قابل اور پیشہ ورانہ جدتوں سے آگاہ معالج تھے جنھوں نے نئی اور بہترین روایات متعارف کرائیں۔ وہ سماجی طور پر بھی انتہائی وقار اور توقیر کے حامل تھے۔ ان کے گھر حلقہ دوستاں کے 30 سال تک ہفتہ وار اجلاس منعقد ہوتے رہے اور شہر بھر کے منتخب دانشور وہاں تاریخ و فلسفہ اور الٰہیات کے مطالعے کے ساتھ علمی مباحث کے لیے اکٹھے ہوتے رہے۔ بحیثیت ڈاکٹر ان کا رویہ بہت نرم، دھیما اور ذمہ دارانہ ہوتا۔ ان کا رویہ بنیادی طور پر علمی تھا لہٰذا عمومی اور طبی لٹریچر کے مطالعے میں خود کو مصروف رکھتے تھے۔ اگر میں یہ کہوں کہ وہ سر سے پاؤں تک ڈاکٹر تھے تو

اس میں کوئی مبالغہ یا مغالطہ نہیں ہے۔ شہر کے لوگوں اور ان کی پیشہ ورانہ کمیونٹی میں انہیں بہت عزت و وقار اور تکریم دی جاتی۔ اگر چہ وہ کم گو تھے مگر ضروری بات کو ادھورا نہیں چھوڑتے تھے۔ ان کی باتوں میں ایک تسلسل اور ربط ہوتا، وہ شہر کی ایک متحرک سماجی شخصیت تھے۔ ان کی رائے اور مشورے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ ان کا نظریہ اسلام معتدل اور ایک باعمل مسلمان کا تھا جس میں فرقہ وارانہ تعصب نام کو نہیں تھا۔ شہر میں مذہبی رواداری کے وہ سب سے بڑے داعی تھے اور ضلعی امن کمیٹی میں وہ کسی نہ کسی حیثیت سے تاحیات اس کا حصہ رہے۔ بحیثیت دوست ان کا اخلاص کسی بھی غرض یا شک وشبہ سے بالاتر ہوتا۔ وہ اگر چہ کم آمیز تھے اور کسی حد تک شرمیلے بھی اس لیے کسی شگفتہ بات کے جواب میں مسکرانے تک اکتفا کرتے۔ میں نے ایک دو کوششوں میں ان سے قہقہے بھی لگوائے۔ رحیم یار خان کا یہ نرم خو اور نرم گفتار علمی و تہذیبی اثاثہ 2011 کے دوران رحلت کر گیا۔ رحیم یار خان میں ان کا متبادل ڈھونڈنا محض ایک خواب ہے۔

پروفیسر غلام سرور صدیقی دراصل ایک گمنام (unsung) ہیرو تھے۔ وہ یہاں کی علمی محفلوں کے لیے ناگزیر تصور کیے جاتے تھے۔ محنتی، خود کوش، مدلل گفتگو کے ماہر، پرخلوص دوست اور بہترین انسان تھے۔ غلام سرور صدیقی کی شخصیت کے میں کن کن پہلوؤں کو گنواؤں۔ وہ اہل اور اچھے استاد تھے۔ انہیں اپنے مضمون اور اس سے متعلقہ تمام موضوعات پر ایک گونہ عبور حاصل تھا۔ وہ بین الشخصی مکالمے کے فن سے خوب واقف تھے اور یہ بات انہیں دیگر اساتذہ سے ممتاز کرتی تھی۔ ان کی بصیرت اور تجزیات آفاقی سوچ کے مظہر تھے۔ تمام علمی اور ادبی حلقوں میں انہیں بہت محترم تصور کیا جاتا تھا۔ وہ ایک دردمند دل رکھنے والے انسان تھے جو دوستوں کے لیے اپنے خلوص کا اظہار بڑے شوق سے کرتے ہیں۔ میرے لیے وہ دوست سے بڑھ کر تھے۔ اپنی بہت سی علمی اور فکری الجھنوں کو میں نے ان کے ذریعے دور کیا۔ فلسفے کی گتھیاں جو میری سمجھ میں نہیں آتی تھی وہ پل بھر میں سلجھا لیتے۔ ان کے بات کرنے کا انداز مربوط اور مدلل ہوتا۔ وہ کم از کم الفاظ میں معنویت سے بھرپور بات کرتے۔ ان کی رفاقت زندگی آموز تھی، میں کئی معاملات میں ان سے رہنمائی لیتا رہا۔ آج سے تیس سال قبل بہاول پور کے ڈاکٹروں کی غلط اور تاخیری تشخیص نے اس نابغہ روزگار ہستی کو شہر خموشاں کے سفر پر روانہ کر دیا۔

محمد رمضان جتالہ پیشے سے وکیل اور نظریاتی طور پر کامریڈ ہیں۔ ان سے ملاقات سے پہلے ان کا بھرپور تعارف مجھ تک پہنچ چکا تھا۔ رحیم یار خان میں جہاں میری رہائش تھی ان کے قریب ہی ان کے بھائی مقبول احمد آفیسر نیشنل بنک کا گھر تھا جن کی بیٹیاں میری بیوی کی شاگرد تھیں اور وہ عموماً کہا کرتیں کہ ہمارے ایک چچا ہیں جو مجھ سے خاصی مشابہت رکھتے ہیں مگر وہ سیاسی قیدی کی حیثیت سے جیل میں ہیں۔ ان سے ایک عجیب صورت حال میں ملاقات ہوئی۔ اکبر روڈ پر محلّہ کانجواں کی مسجد کے عقب میں چند دکانیں تھیں۔ میں کوئی چیز لینے کے لیے رکا تو آٹھ دس افراد وہاں اس انداز میں جمع تھے کہ جیسے کسی ابھی ابھی رونما ہونے والے واقعے

پر گفتگو کر رہے ہوں۔ دراصل رمضان صاحب مسجد کا ٹوائلٹ استعمال کرنے لگے تو انہوں نے اپنا کوٹ مسجد کی ایک صف پر رکھ دیا۔ واپسی پر کوٹ اٹھایا تو کوٹ سے پرس غائب تھا۔ یہاں پر ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ دنوں میں ہم دوست بن گئے اور صبح کی سیر ہم مل کر کرنے لگے۔ آئندہ چار سال ان کی شادی ہونے تک ہم ائیر پورٹ روڈ سے ہوتے ہوئے ٹڈی دل پر چھڑکاؤ کے چھوٹے جہازوں کے لیے پختہ اینٹوں سے بنائے گئے ہوائی اڈے کے رن وے کے آخر تک جاتے۔ (اب یہ سولنگ والا ہوائی اڈا بوئنگ طیاروں کا ائیر پورٹ بن چکا ہے۔) وہ یوگا کے کچھ آسنوں سے واقف تھے جن کے ساتھ وہ کچھ مختصر ورزشیں بھی کرتے۔ بغیر کسی سہارے کے سر کے بل کھڑے ہونے کی تکنیک مجھے بھی سکھا دی تھی۔ بعد میں ہماری ہونے والی بھابی اور میری بیوی پہلے سے ایک دوسرے کو جانتی تھیں اور تدریس کے پیشے سے ہمکار تھیں لہٰذا جب رمضان صاحب کی شادی ہوئی تو ہم اس میں شریک تھے۔ ان کے ساتھ فیملی تعلقات اور زیادہ ہو گئے۔ بہاول پور منتقل ہونے کے بعد جب بھی رحیم یار خان جانا ہوتا تو ان کی فیملی سے ملنا ناگزیر ہوتا۔ اسی اثنا میں رحیم یار خان بار کے سیکرٹری بھی منتخب ہوئے اور اس حیثیت میں وہ فوائد سمیٹے جو ایسے عہدوں سے مخصوص ہوتے ہیں۔ بھابی کی اچانک وفات کے بعد ان کا گھریلو شیرازہ وہ نا رہا۔ بیٹے اسلام آباد چلے گئے اس لیے یہ بھی مہینوں وہیں چلے جاتے جہاں ان کی رفاقت زیادہ تر فلسفی اور مفکر ڈاکٹر اشفاق سلیم مرزا کے ساتھ رہتی۔ مسٹر جتالہ معروف کالم نگار اور بائیں بازو کے دانشور امتیاز عالم کے ساتھی تھے اور مزدور کسان پارٹی کی بات کرنے والے یہ لوگ جیل میں بھی اکٹھے رہے۔ وکالت کا شعبہ ترک کر کے کسی غیر حکومتی تنظیم سے وابستہ ہو گئے۔ یہ پہلے ارائیں دیکھے جو مجلسی زندگی میں پختہ سرائیکی بولتے۔ بچوں کے بیرون ملک جانے کے بعد ان کی مالی آسودگی انتہا کو پہنچ گئی اور انہوں نے پولیٹیکل اکانومی اور تاریخ کے معروضی موضوعات پر باہر کے لکھاریوں کی کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ جب بھی فون کرتا بتاتے فلاں کتاب پڑھ رہا ہوں۔ پھر گذشتہ دنوں بتانے لگے کہ رحیم یار خان کی ارائیں برادری نے انہیں برادری کے معاملات کے لیے اپنا سربراہ چن لیا ہے۔ نجانے کیوں مجھے ان کی نیشنلسٹ سوچ، وزڈم، غیر طبقاتی انداز فکر اور عظیم فکری کتب کا مطالعہ برادری ازم کی ادنی سوچ میں ہچکیاں لیتا ہوا محسوس ہوا۔

محمد حنیف نارو (پیپلز پارٹی کے سابق ایم پی اے اور ایڈووکیٹ) ان سے ان کے کلاس فیلو اور دوست شیخ عظیم اشرف کے ذریعے تعارف ہوا۔ مرنجان مرنج اور شگفتہ مزاج تھے، شیخ صاحب کے فیملی ممبر کی طرح تھے۔ ان سے مل کر بہت اچھا لگتا تھا۔ چند بار فیمیلیز کی سطح پر ملاقاتیں ہوئیں۔ 1977 میں لاہور کے شاہی قلعہ میں طویل عذاب سے گزرے۔ صحت متاثر ہوئی۔ 1990 کی دہائی کے نصف اول میں صحت خراب ہوئی، دل کے مریض قرار دیے گئے۔ ایک دن فیملی کے ساتھ گھر تشریف لائے، کہنے لگے دل کا مرض نجانے کب روانگی کا بگل بجادے لہٰذا جتنے دن ہیں ان کو بھرپور طریقے سے دوستوں کو مل کر گزارنا چاہتا ہوں۔ کچھ عرصے بعد پیپلز پارٹی کا اہم اجلاس ان کے کزن ڈاکٹر محمد اسلم نارو کے گھر ہونا تھا۔ سلمان تاثیر کا ہوائی

اڈے پر استقبال کیا، ساتھ لے کر جائے اجلاس پر پہنچے، اجلاس شروع ہوا۔ دوران اجلاس محض ایک ہچکی لی اور اس دنیا کو خیر باد کہا۔ دکھ سے نڈھال شیخ عظیم اشرف آخری سانس تک جنرل ضیاالحق کو ان کا قاتل قرار دیتے رہے کیوں کہ ان کو دل کا مرض شاہی قلعے کی اذیت کا نتیجہ تھا۔

رانا حافظ حبیب اللہ خان: انہوں نے ایک جنم میں ایک سے زائد اور بھرپور زندگیاں گزاریں۔ 45 سال کی عمر میں انہیں بیماری بھی ایسی ہوئی جسے نا کبھی دیکھا نا سنا۔ پولی مایوسائیٹس۔ اعصابی کمزوری کی ایسی بیماری جس کا شمار آٹوامیون بیماریوں میں ہوتا ہے جس کا کوئی مستند علاج نہیں ہے اور سٹیرائیڈ کھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ دس سال اس کا مقابلہ کیا۔ اس جنگ میں کبھی وہ اور کبھی بیماری حاوی ہوتے رہے لیکن جسم نے 2015 میں بیماری کے ہاتھوں ان کا مزید ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ مجھے 1979 کا وہ تابعدار، مئودب اور ہنس مکھ شاگرد یاد ہے جو موٗ مبارک رحیم یار خان کی طرف ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ایک زمیندار گھرانے کا سادہ، سچا اور کھرا۔ حافظ قرآن تھا، گاؤں میں تراویح بھی پڑھا لیتا، گھنی سیاہ اور چھوٹے سائیز کی داڑھی اور ہونٹوں پر مستقل مسکراہٹ اس کی شخصیت کو پرکشش بناتے تھے۔ ایم اے اسلامیات کرنے پنجاب یونیورسٹی گیا تو سر پر سندھی ٹوپی کا اضافہ کر لیا۔ بہت سے دوست بنائے۔ زراعت شماری کے وفاقی محکمے کے کمشنر علاؤالدین سے ملاقات دوستی میں بدلی تو اسے اپنے محکمے میں جاب دے کر وفاقی کالونی میں اس کو مکان الاٹ کرا کے ہوسٹل کے بعد اس کے رہنے کا ٹھکانہ کر دیا۔ اس نے مقابلے کے امتحان کے لیے دوستوں کا ایک گروپ بنایا اور اپنے مکان میں جگہ دی۔ یہ نوٹس تیار کرتا اور تمام دوست ان سے استفادہ کرتے۔ امتحان ہوا تو تمام دوست کامیاب ہو گئے جب کہ اس نے تمام مضامین میں سب سے اچھے نمبر لیے مگر مضمون (Essay) کے لازمی پرچے میں کامیابی کے لیے درکار 17 کی بجائے 16 نمبر آئے۔ آخری چانس تھا، اس کی شخصیت کا شیرازہ بکھر گیا۔ میں نے اور کچھ مخلص دوستوں نے سنبھالا۔ 1987 میں ٹیکنیکل سائیڈ پر اسلامیات کی پوسٹیں آئیں، 17 ویں گریڈ کی انسٹرکٹر/لیکچرر کی پوسٹ کا تقرر نامہ لے کر اپنے شہر آیا، شیو کرائی، اندر سے ایک خوبصورت نوجوان برآمد ہوا۔ مجھے ساتھ لیا اور گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی میں جوائن کر لیا۔ پرنسپل جوہر شناس تھا، پہچان گیا اور اس کی بہت قدر کی۔ شہری زندگی کے زیر اثر زندگی کی معنویت اور نئی جہتوں سے آشنا ہوا۔ دوسری شادی کی اور پہلی بیوی سے بڑے ہوتے بچوں کو ساتھ رکھا، سکولوں میں داخل کرایا۔ دوسری شادی کے خاندانی ردعمل اور پیچیدگیوں کا خندہ پیشانی سے سامنا کیا۔ بیوروکریٹ دوستوں نے ہمیشہ اس کی پذیرائی کی۔ اپنے دیہاتی اور زمیندارانہ خاندانی اور تھانے کچہری کے معاملات کو کامیابی سے سنبھالتا رہا۔ اپنے تدریسی پیشہ ورانہ امور پر بھی فوکس رکھا۔ شہری زندگی میں بھی فعال رہا۔ وہ بیک وقت شہری بھی تھا اور دیہاتی بھی بل کہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کی شخصیت کے سکے کے دو رخ تھے، ایک رخ دیہات کی زندگی اور دوسرا رخ شہری زندگی، دونوں میں توازن رکھا مگر ان دو پاٹوں کے بیچ شاید جسم کہیں پیچھے رہ گیا اور 55 سال کی عمر میں

اسے اگلے جہان جانا پڑ گیا۔ اللہ بڑا کارساز ہے، اس نے بیماری سے پہلے ہی دوسری بیوی کا بہترین تیماردار کے طور پر انتظام کر دیا ورنہ گاؤں والے اللہ کا حکم مان کر وفات سے دس سال قبل ہی اسے آخری سفر پر روانہ کر دیتے۔ وہ دوست نواز، مہمان نواز، بااخلاق، بامروت، باہمت، حوصلہ مند، کامیاب استاد اور بہت کچھ تھا۔

خلیق الرحمٰن خلیق: اپنی خاندانی روایت کی پیروی میں طبیہ کالج لاہور کے فارغ التحصیل مستند حکیم ہیں جنہوں نے اپنی خاندانی وراثت اور والد محترم کے طب میں دست راست بننے کو ترجیح دی۔ اس کے علاوہ شاعر، ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ "الخلیق" کی ادارت میں مصروف رہے۔ 1985 کے دوران ان سے باقاعدہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور بہت سے باہمی مشترک اوصاف نے اس تعلق کو دوستی میں بدل دیا۔ وہ میری زندگی میں آسودگی کی علامت بن گئے۔ موسیقی کا شاندار ذوق رکھتے ہیں۔ انہوں نے جگجیت اور چترا سنگھ سے مجھے متعارف کرایا اور پھر بوجوہ جگجیت سنگھ کو سننا ہماری جذباتی ضرورت بن گیا۔ اس کی گائی ہوئی غزلیں ہمارے لیے کیتھارسس کا ایسا ذریعہ بنیں کہ میں نے ایک دن ان سے کہا: " جگجیت نہ ہوتا تو ہمارا کیا بنتا"۔ ہم جگجیت کی غزلوں کی نئی البم کا انتظار کرتے۔ مزید برآں اچھی اور پسندیدہ موسیقی کی مشترکہ تلاش ہمارے تعلق کا نصب العین بن گیا۔ ہم رحیم یار خان کے قرب وجوار میں طویل ڈرائیو پر چلے جاتے اور بہترین موسیقی اور اس کی کیفیات سے لطف اندوز ہوتے۔ یہ وہی دوست ہیں جن سے میں نے 1990 کے دوران بہاول پور شفٹ ہونے کی خواہش کا اظہار کیا اور انہوں نے اس تجویز کو سختی سے رد کر دیا بلکہ ناممکن قرار دیا۔ 1986 اور 1987 کے دوران میرے دو قریب ترین دوست رحلت کر گئے تو خلیق کی ڈھارس بہت کام آئی۔ طبی پیشے کی وجہ سے ان کی زبان میں مرہم کی سی تاثیر ہے۔ میری بہاول پور اور پھر لاہور منتقلی ہمارے تعلق پر بھی اثر انداز ہوئی جن میں ان کی پیشہ ورانہ اور والدین کی علالت کے دوران ان کی خدمت کی مصروفیات شامل تھیں۔ اب یہی طبیب جو نجانے کتنے مریضوں کی بیماریاں دور یا کم کرنے کے لیے کوشاں رہا، اب سنجیدہ قسم کے طبی مسائل کا بڑی حوصلہ مندی اور صبر سے مقابلہ کر رہا ہے۔ ان کے منجھلے بھائی لئیق الرحمان ایک کامیاب ای این ٹی ڈاکٹر ہیں اور میری ہر کال پر جواب دیتے ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی نوید الرحمان خواجہ فرید کالج میں میرے شاگرد تھے پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادب میں ماسٹرز کیا اور نجی شعبے میں تدریسی، انتظامی اور ترقیاتی امور کے ماہر تصور کیے جاتے ہیں۔

عبدالوحید صدیقی وہ پہلے کامریڈ ہیں جن سے میری ملاقات 1980 کے دوران رحیم یار خان میں ہوئی۔ بائیں بازو کے دانشور کے طور پر معروف تھے۔ ان کا مطالعہ کثیر الجہات تھا۔ ان کی گفتگو مربوط اور مدلل ہوتی۔ ان کی تنقیدی بصیرت اور منطقی انداز گفتگو نے بزم فیض کے اجلاسوں کو بامعنی اور مفید بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ میں نے ان سے بہت سیکھا۔ یہ جوہر قابل اور شاندار انسان وسکالر ایک خطرناک اور اچانک ظاہر ہونے والی مرض کا شکار ہوا جس نے علاج کی مہلت بھی نہ دی اور انہیں اس فانی دنیا کو چھوڑنا پڑا۔

پرویز الحسن صادق:۔ان سے میری دوستی بہاول پور کے پہلے چیف انجنیئر پبلک ورکس سید نور علی ضامن حسینی نے کرائی۔ درحقیقت میں نے اپنے کسی مضمون میں حسینی صاحب کا ذکر کیا۔ چوں کہ حسینی صاحب ان کے مربی اور رہنما تھے اور ان کی تربیت ایک ایسے ماحول میں ہوئی جہاں حسینی صاحب کی مستقل موجودگی تھی لہٰذا انہوں نے ان کو بہاولپو کی تاریخ اور اپنی لائبریری کی طرف راغب کیا اسطرح بہاول پور کی تاریخ میں دلچسپی کے باعث اسی موضوع پر ایک لائبریری قائم کی۔انہوں نے ایک ادارہ بنایا جس کا نام تحقیق و تذکرہ تاریخ پاکستان رکھا۔ان سے تعارف رحیم یار خان اور بہاول پور کے تحقیقی اہداف کی وجہ سے ہوا جو معاشرتی تعلق میں بدل گیا۔1993 کے دوران جب میں نے گورنمنٹ کالج خان پور کے ادبی مجلّے "بانگ سحر" کا ضلع رحیم یار خان نمبر نکالنے کا ارادہ کیا تو "رحیم یار خان کا نظام آبپاشی" کے موضوع پر 30 صفحات کا پہلا مضمون ان کی طرف سے موصول ہوا جو باقی مضامین کا نقیب ثابت ہوا۔ان کا مضمون تحقیقی ہونے کو ساتھ ساتھ کہیں کہیں ماورائے تحقیق بھی تھا یعنی دلچسپ واقعات کا حامل تاہم انہوں نے پہلی بار اس مضمون میں بنیادی معلومات یکجا کردی تھیں۔ پھر ہم دونوں نے معروف مفکر ایڈووکیٹ عظیم اشرف کی رہنمائی میں پرانے شہر کا چکر لگایا اور پرانے شہر کے بارے میں ان کے تقریباً ساٹھ سالہ پرانے مشاہدات پر مبنی نوٹس تیار کیے جن کو پرویز صاحب نے رحیم یار خان پر اپنے تحقیقی مضمون میں شامل کیا۔ میں نے بانگ سحر کے "ضلع رحیم یار خان نمبر" کے پیش لفظ میں ان کے تحقیقی تعاون کا شکریہ بھی ادا کیا۔ وہ بہاول پور کی معروف تاریخ کا علم اور حکمران نوابوں سے خاصی جذباتی وابستگی رکھتے ہیں۔ بوجوہ ان سے گذشتہ بیس سال سے ملاقات نہیں ہوسکی۔

محمد حنیف صادق آباد شیخ عظیم اشرف کے بہترین دوست تھے اور انہی کے توسط سے ان سے ملاقات ہوئی۔ شیخ صاحب کا قریبی دوست عمومی سطح کا تو نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ واقعی بہت پیارے انسان تھے۔ فلاحی کاموں میں غیر معمولی دلچسپی لیتے رہے۔ اقرا سکول صادق آباد انہی کا بچہ تھا۔اس کی پرورش کچھ اس طرح سے کی کہ بہت جلد وہ صادق آباد میں تعلیمی معیار کی علامت بن گیا۔ایک دن میں نے انہیں بہت خوش دیکھا، پوچھنے پر بتایا کہ میں نے اقرا سکول وکالج کے لیے جو زمین وقف کی تھی اس کے بالکل سامنے سے جی ٹی روڈ کی صادق آباد بائی پاس منظور ہوچکی ہے۔ایک روز میں صادق آباد ان سے ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اقرا سکول وکالج کی زیر تعمیر عمارت کی جگہ پر ہیں۔ میں وہاں ملنے چلا گیا تو بچوں کی طرح فرط مسرت سے مجھے اپنے تعلیمی ادارے کی تفصیل بتاتے رہے۔ پرویز صادق میرے ہمراہ تھے،ہمیں کالج میگزین کے سلسلے میں سید انیس جیلانی کی مبارک لائبریری جانا تھا جس کے لیے انہوں نے ڈرائیور اور ٹرانسپورٹ مہیا کی۔ بہت پیارے انسان تھے۔ان سے شیخ صاحب کے ہاں متعدد بار ملاقاتیں ہوئیں۔ پہلی بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی ایک ایسی خاتون سے کی جو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کی تعلیم یافتہ تھیں جنہوں نے اقرا سکول کے گرلز سیکشن کی ذمہ داری کو سنبھال لی۔ان کی بے لوث خدمات اور ان سے تعلق کی وجہ سے ان کے کالج کی

رجسٹریشن کے لیے میں نے بھی مقدور بھر کوشش کی تھی۔ یہ شیخ صاحب کے وہی دوست ہیں جن کا مقدمہ ہائی کورٹ بہاول پور میں زیر سماعت تھا۔ وہ اپنے دوست کے مقدمے سے جذباتی طور پر وابستہ تھے۔ وہ جن قانونی نکات پر بحث کر رہے تھے، جج کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے جس سے شیخ صاحب پر نا امیدی غالب ہونے لگی مگر اچانک جج ان کے نکات کو سمجھ گیا اور ان کے دوست حنیف صاحب کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس غیر متوقع صورت حال سے وہ فرط مسرت میں جو جذباتی ہوئے کہ کورٹ سے باہر آئے تو ان کی طبیعت خراب ہوگئی۔ ابتدائی طبی امداد سے کچھ سنبھل گئے مگر ان کی صحت متاثر ہو چکی تھی جس کی روشنی میں انہوں نے کراچی کے کسی ہسپتال سے دل کا بائی پاس آپریشن کرایا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد حنیف صاحب بھی کسی نا سمجھ آنے والی بیماری کا شکار ہو کر چل بسے۔

کسووال سے بنگلہ اوکانوالہ جانے والی سڑک پر ایک گاؤں کے رہائشی اللہ بخش بلوچ گورنمنٹ کالج ساہیوال میں میرے کلاس فیلو اور دوست تھے۔ وہ اکثر بتایا کرتے کہ ان کے چچازاد بھائی شیر خان بلوچ محکمہ عمارات میں سب انجینئر ہیں اور رحیم یار خان میں رہتے ہیں جہاں صادق آباد کے کرنل اللہ یار مزاری کی بڑی صاحب زادی سے ان کی شادی ہوئی تھی اور ان کے بچے وہیں سکولوں میں پڑھتے ہیں۔ بات سنی ان سنی ہوگئی۔ کیا خبر تھی کہ میری پوسٹنگ بھی رحیم یار خان میں ہوگی لہٰذا ان کے دفتر رحیم یار خان میں ملاقات ہوگئی۔ بہت خوش ہوئے۔ ان سے دوستانہ مراسم قائم ہوئے جو جلد گھریلو مراسم میں بدل گئے۔ ان کے بچے بہت مؤدب تھے اور اپنے ننھیال کے بہت قریب تھے۔ مہینے میں ایک دو بار ہماری فیملیز ملنے لگیں۔ شیر خان بہت مجلس ساز اور محبت کرنے والے دوست تھے۔ اپنے محکمے کے بارے میں بہت سے حقائق بتاتے تھے۔ ایس ڈی او ہوئے تو معقول سرکاری رہائشگاہ ملی۔ بھابی کی ایک بھتیجی چھ سال کی تھی اور وہ تمام خاندان کی آنکھوں کا تارا تھی۔ اس نے اپنی پیاری باتوں سے ہر ایک کا دل موہ رکھا تھا۔ گھر کے باہر کھیل رہی تھی کہ ان کے ٹریکٹر ڈرائیو نے ایک دن ٹریکٹر ریورس کیا، وہ پیچھے تھی، ٹریکٹر کی زد میں آ کر جان سے چلی گئی۔ اس پھول کی سی بچی کی اس اچانک موت نے گھر کے ہر فرد کو متاثر کیا۔ خان صاحب کو بھی میں نے بہت دکھی محسوس کیا۔ بہت جلد دل کے مریض بنے تو ڈاکٹر نے آرام کا مشورہ دیا۔ ایسے متحرک انسان کے بس میں آرام کہاں تھا۔ ایک دن درد ہوا تو کسی کو جگائے بغیر خود ہی جیپ چلا کر ہسپتال پہنچ گئے۔ پھر چند دن ہسپتال رہے۔ مجھے کہنے لگے کہ جناب جانا تو ہے ہی، ڈر کا ہے کا اور ایک دن وہ واقعی چلے گئے۔ مجھے ذاتی طور پر بہت دکھ ہوا۔ اس ایس ڈی او بلڈنگز کا اپنا گھر تک نہیں تھا۔

محمد اجمل بھٹی۔ شمار تو ان کا بھی میرے کامیاب شاگردوں میں ہوتا ہے تاہم خان پور اور بہاول پور کے کالجوں میں رفیق کار بھی رہے۔ دوران طالب علمی یونیورسٹی کی سیاست میں متحرک کردار ادا کیا۔ 1989 میں لیکچرر ہو گئے۔ 1994 میں ہم دونوں نے مل کر خان پور کالج کے مجلّے "بانگ سحر کا" ضلع رحیم یار خان" نمبر

شائع کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ بھی کر لی۔اپنی مادرعلمی خواجہ فرید گورنمنٹ کالج میں پرنسپل مقرر ہوئے تو ادارے کی تعمیر وترقی میں دن رات ایک کر دیے۔انفراسٹرکچر،طلباوطالبات کی تعداد،تدریسی سہولتوں اور معیار کے لحاظ سے خواجہ فرید گورنمنٹ کالج کو مقابلے کی فضا میں ایک تعلیمی "برانڈ" بنادیا۔شاندار کارکردگی کی بنیاد پر سٹوڈنٹس اوران کے والدین اور شہریوں میں خاصے مقبول ہوئے۔طویل عرصے سے کالج کے لیاقت ہوسٹل اوراقبال ہال اسلامیہ یونیورسٹی کے رحیم یارخان کیمپس کے طور پر زیر تسلط تھے۔جب یونیورسٹی کا اپنا کیمپس بن گیا تو ہوسٹلوں کی بازیابی کا مطالبہ کر دیا۔اس وقت کا ڈپٹی کمشنر یونیورسٹی کا طرفدار تھا۔اس کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایک زبردست مہم چلا کر کالج ہوسٹلوں پر یونیورسٹی کا قبضہ چھڑایا۔اس متکبر بیوروکریٹ نے موقع ملتے ہی ان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا مگران کی مقبولیت کو دلوں سے محو نہ کر پایا۔ایوب ندیم،خان پور کالج میں طالب علم تھے۔ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات کے مصداق انٹر سال اول سے غزل لکھنے لگے۔ کالج کی تاریخ کا پہلا کالج میگزین "بانگ سحر" میری نگرانی میں پہلی بار 1982 میں شائع ہوتو یہ سال دوم میں اس کے طالب علم مدیر تھے۔رحیم یارخان کالج میں ڈگری کے طالب علم تھے تو میں وہاں لیکچرر تھا۔وہاں بھی ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔اردو میں ایم اے کا ارادہ کیا تو دیگر اساتذہ کے ساتھ ساتھ میں نے بھی مشورہ دیا کہ لاہور اورینٹل کالج چلے جائیں۔ یہاں سے ایم اے کیا،اس دوران مختلف اخبارات اور جرائد میں بھی کام کیا۔استاد بنے تو لاہور نہیں چھوڑا۔ماڈل ٹاؤن فلیٹس نئے بنے تھے تو ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ایک دفعہ میں بھی ان کا مہمان بنا۔تمام عرصہ ملازمت لاہور میں گزارا اور یہیں سے ریٹائر ہوئے،ڈاکٹریٹ کی۔لاہور کے علمی ادبی حلقوں میں نقاد اور پختہ کار شاعر کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔

نجم الحسن نجمی شاعر تھے مگر اس سے زیادہ جگت باز تھے۔ان کی جگتوں سے کوئی خوش قسمت ہی بچ کر نکل پاتا۔خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یارخان میں 1979 کے موسم گرما میں منعقدہ شب مہتاب کی شعری نشست میں ملاقات ہوئی۔1980 سے 82 تک وہ الائیڈ بنک اور میں خان پور کالج میں تھا۔رحیم یارخان سے اکٹھے جاتے آتے رہے۔ان کی رنگارنگ طبیعت نے روزانہ سفر کی کوفت سے بچائے رکھا۔پہلی دفعہ رنگین ٹی وی خریدا تو کہا کرتے اب تو اشتہار بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔جسم اور زبان کے بہت پھرتیلے تھے۔مستقل طور پر کراچی جا بسے،حال ہی میں ان کی رحلت کی خبر سنی۔زاہداختر شاہین 1987 میں خواجہ فرید کالج میں ڈگری کے طالب علم اور کالج میگزین کے طالب علم مدیر تھے۔شاعر ہیں،اسلامیہ یونیورسٹی میں ایم اے اردو کے طالب علم تھے تو ریڈیو سے یونیورسٹی میگزین قسم کے پروگرام سے وابستہ رہے۔اپنی مادرعلمی خواجہ فرید کالج میں شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔خواجہ فرید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی رحیم یارخان کی انسانی علوم کی فیکلٹی کے شعبہ اردو میں ڈیپوٹیشن پر چلے گئے۔اپنے علاقے کے شاعروں اور ادیبوں پر ایم فل کے تحقیقی مقالات لکھوا کر گویا رحیم یارخان کی ادبی تاریخ کو تاریخ کا حصہ بنا رہے ہیں۔آج کل وہ اس

یونیورسٹی میں وزٹنگ فیکلٹی کے طور پر وابستہ ہیں۔ مجھ پر "نسیم بلوچ کی ادبی و علمی خدمات کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے ایم فل کا تحقیقی مقالہ لکھوا کر حق شاگردی ادا کر چکے ہیں۔

رستم الرحمان۔ انگریزی کے استاد ملتان سے شفٹ ہو کر رحیم یار خان کو گھر بنایا اور انگریزی کے ٹیوشنز کے طور پر خاصی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ طلبا ان کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔ میرے وہ بزرگ اور سینئر تھے مگر میری ان سے بے تکلفی کی حد تک دوستی تھی۔ کالج والوں کی طرف سے کچھ باتیں دل میں لیے ریٹائر ہوئے تو سنا ہے پھر کالج کبھی قدم نہیں رکھا بل کہ گھر پر ملنے سے بھی گریز پا رہے۔ 2006 کے دوران میں ان کو ملنے گیا تو خوب آؤ بھگت کی اور لمبی نشست پر مشتمل گپ شپ لگائی۔ میں لاہور شفٹ ہو چکا تھا تو لاہور اپنے بیٹے کے پاس آئے ہوئے تھے، مجھے معلوم ہوا تو انہیں ملا، بہت خوش ہوئے۔ ایک طویل علالت کے بعد بحال ہوئے تھے۔ یادداشت متاثر ہونے کا آغاز ہو رہا تھا مگر تمام وقت پوری توانائی سے گپ شپ کرتے رہے۔ ان سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ نبی بخش ملک: خان پور کالج میں 81-1980 کے دوران ریاضی کے استاد تھے اور ان سے وہاں متواتر ملاقاتیں رہیں،۔ لیاقت پور کے قریب قصبہ ملکانی سے ان کا تعلق تھا، بچپن کے دوران چیچک کا شکار ہوئے اور ایک آنکھ کی بینائی سے بھی مرحوم ہونا پڑا مگر انہیں داد دینی چاہیے کہ انہوں نے اس چیز کو اپنی کمزوری بننے دیا نا اپنے اوپر حاوی کیا۔ انتہائی زندہ دل اور قہقہوں کی بہار لگانے والے اور زندگی میں بڑے اہداف رکھنے والے اس انسان سے سیکھنے کو بہت کچھ ملا۔ 82-1981 کے دوران خواجہ فرید گورنمنٹ کالج تبدیل ہوئے اور صوبائی سول سروس کے امتحان میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر/مجسٹریٹ تعینات ہوئے۔ دوستوں کو ہمیشہ یاد رکھا اور ان کی بہت توقیر کی۔ اپنا ایمان بھی سلامت رکھا اور اپنے اندر کے استاد کو بھی مرنے نہیں دیا۔ پنجاب میں متعدد تعیناتیوں کے دوران عاجزی اور انکسار کو اپنائے رکھا۔ ان کے قہقہے بھی آباد رہے۔ 2004 میں جب میں ای ڈی او ایجوکیشن بہاول پور تعینات ہوا تو یہ ڈسٹرکٹ آفیسر ہیومین ریسورس (HR) تھے تو ان سے روزانہ کی بنیاد پر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ڈپٹی کمشنر کے رینک سے ریٹائر ہوئے۔ لاہور آئیں تو ملتے ہیں، وہی پرانی باتیں اور ہنسی مذاق کہ جیسے پرانا وقت لوٹ آیا ہو۔ شعیب عتیق خواجہ فرید کالج میں اردو کے استاد اور دوست تھے۔ جب ان کی بڑی بیٹی پیدا ہوئی تو انہوں نے اس کا نام "ماورا" رکھا۔ میں نے بھی اسی دوران پیدا ہونے والی سب سے چھوٹی بیٹی کا نام ماورا رکھا۔ نون میم راشد کے شعری مجموعے کا ٹائیٹل بھی یہی تھا۔ جب میرے ایک دوست کو اس نام کا پتا چلا تو اس نے مذاق سے کہا کہ اب آپ اپنے بیٹے کا نام لا=انسان رکھ لیں۔ (یہ نام بھی اسی شاعر کے شعری مجموعے کا تھا) یہاں سے تبادلے کے بعد ڈاکٹریٹ کی اور ملتان اور مظفر گڑھ کے کالجوں میں پرنسپل بھی رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے شہر مظفر گڑھ کو اپنا مستقل مسکن بنایا۔ ہم شروع ہی سے رابطے میں رہے ہیں۔ محمد اکرم حجازی ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہسپتال کے کسی غیر طبی شعبے سے وابستہ تھے۔ قد بت، شخصیت اور رویے سے استاد نظر

آتے تھے۔ آگے بڑھنے کی امنگ کے باعث پرائیویٹ ایم اے اردو کیا اور لیکچرر سیلیکٹ ہو گئے۔ تمام سروس خواجہ فرید کالج میں ہی گزار دی۔ ان کی طبیعت میں بیبا کی تھی۔ بعض اوقات رائے قائم کرنے میں عجلت کرتے۔ ریٹائرمنٹ کے کچھ عرصہ بعد صاحبِ فراش ہوئے اور اگلے جہان چل دیے۔

محمد امجد چودھری: سوشیالوجی کے اس استاد کو اگر شاگردوں میں شمار کروں تو غلط نہیں ہوگا۔ اپنے تجارت پیشہ خاندان میں ان کا استاد بن جانا واحد مثال ہے۔ باذوق اور اچھے جمالیاتی رویے کے مالک ہیں۔ اکثر ان سے فون پر طویل گپ شپ ہوتی رہتی ہے۔ میاں عارف مسلم کمرشل بنک کی خان پور برانچ میں تھے جب کہ میں وہاں کے کالج میں، اکٹھے جاتے آتے رہے۔ ان کے اچھے اخلاق اور ایک ہی کالونی میں رہائش پذیر ہونے کے باعث دوستی ہوئی۔ مارچ 1982 میں میری بڑی اور جڑواں بیٹیوں کی پہلی سالگرہ میں بھابی نے اپنے کیمرے سے فوٹوگرافی کی۔ رحیم یار خان میں مرکزی برانچ میں تھے جہاں میرے بیٹے اور بیٹی کی فیس جمع ہوتی تھی لہٰذا ملاقات ہوتی رہی۔ ان کا خاندان بہت مہذب تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی جو شاید کالج میں میرے شاگرد بھی رہے، رحیم یار خان میں ٹی سی ایس کے پہلے منیجر تھے جنہوں نے ڈاک خانے کے بعد سب سے پہلی کوریئر سروس کا تصور مقبول بنانے میں بہت محنت کی۔ میاں صاحب آج کل اسلام آباد میں ہوتے ہیں، ان سے اکثر رابطہ ہوتا رہتا ہے۔

حاجی ولی محمد ایک منفرد مزاج اور کردار کے مالک ہیں۔ میرے سینئر شاگردوں میں سے تھے۔ بہت زیادہ تکلفات کے قائل نہیں تھے۔ ان کے پاس کوئی ایسی" گدڑسنگی" تھی کہ ناممکن کو ممکن بنا لیتے۔ اپنی ٹوپی اور داڑھی سے سنجیدہ صورت والے کسی بزرگ کا شائبہ ہوتا مگر اس کے لیے ان کا خاموش رہنا ضروری تھا۔ لیکچرر تھے تو اپنے حلقے کے ایم پی اے کو کہا۔ بورڈ میں کنٹرولر لگوا دو، وہ سیکرٹری سے ملے، سفارش کی، جواب ملا آپ کا امیدوار 17 ویں گریڈ میں ہے جب کہ سیٹ 18 ویں گریڈ کی ہے۔ ایم پی اے نے گلہ کیا کہ حاجی صاحب آپ نے میری بے عزتی کرا دی، سیٹ تو 18 ویں گریڈ کی ہے، ترنت جواب دیا کہ آخر میں نے کبھی کبھار تو 18 ویں گریڈ میں جانا ہی ہے۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ تیار ہونے کے بعد دفاع کے لیے ایکسٹرنل نے کہا کنٹرولر کو کراچی لاؤ تو دفاع ممکن ہے۔ دوستوں نے چندہ جمع کر کے ان کا اور مجاز ڈپٹی کنٹرولر کے ہوائی سفر کے کرائے کا بندوبست کیا۔ ڈائریکٹ اسسٹنٹ پروفیسر سیلیکٹ نہ ہو سکے، نام کے ساتھ حاجی لکھتے تھے سلیکشن بورڈ کے سربراہ نے کہا ماشاءاللہ آپ نے حج کیا ہوا ہے سچ بتا دیا کہ میں حج کے دن پیدا ہوا تھا اس لیے حاجی میرے نام کا حصہ ہے مگر ایسوسی ایٹ پروفیسر سیلیکٹ ہو گئے۔ ان کا ایک ہمدرد پرنسپل ریٹائر ہوا تو خواجہ فرید کالج کے پرنسپل کا چارج انہیں دے گیا، پرنسپل کے پینل میں اپنا نام ڈلوایا۔ کیس لٹک گیا، یونیورسٹی نے رحیم یار خان کیمپس کے لیے لیاقت ہوسٹل مانگا، فوراً دے دیا۔ کیمپس کے افتتاح کے لیے گورنر خالد مقبول خود آئے، حاجی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور خدمت پوچھی، کہا میرے پرنسپل بننے کی فائل محکمہ میں لٹکی ہوئی ہے، گورنر نے دو دن کا وعدہ کیا،

تیسرے دن ریگولر پرنسپل کے آرڈرآ گئے، لوگ دیکھتے رہ گئے۔ جلنے والے جلتے رہ گئے۔ لوگوں نے انہیں ہلانے کی بہت کوششیں کیں، کسی کی دال نہ گلی۔ ٹھسے سے برسوں پرنسپل شپ انجوائے کی۔ 20 ویں گریڈ میں ترقی لی، اِدھر اُدھر سے پھر کر بہاول پور میں 125 سالہ تاریخی صادق ایجرٹن کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ دسمبر 2024 کے آخری دنوں کے دوران طویل علالت کے بعد ان کے انتقال کی خبر سنی تو بہت دکھ ہوا۔ رفیق احمد صدیقی۔ تقریباً تمام کیریئر گورنمنٹ کالج خان پور میں گزرا۔ لیاقت پور پڑھتے رہے لیکن میرے شاگردوں کے ہم عمر، استاد کی طرح عزت کرتے۔ صلح جو اور شاعر و محقق اور شگفتہ مزاج، خاصا عرصہ پرنسپل رہے۔ خان پور ہی سے 2023 میں ریٹائر ہوئے۔ رانا فاروق مصطفیٰ طبعاً کم گو، جب بھی ملے بہت خلوص اور باہمی احترام کیساتھ، ان کے چچا محمد حنیف نارو سابق ایم پی اے سے دوستانہ تھا۔ کچھ عرصہ قبل ان کی رخصتی کی افسوس ناک خبر سنی۔ ابرار فاروق ایک کم گو اور نرم خو استاد، مخلص، خود کو بنیاد پرست کہتے تھے مگر اینٹی جماعت گروپ کا فعال حصہ تھے۔ 1994 تک ڈاکٹر عبدالخالق کے "حلقہ دوستاں" کی ہفتہ وار علمی نشستوں میں ہر ہفتے ملاقات ہوتی رہی۔ خواجہ فرید گورنمنٹ کالج سے ریٹائر ہونے والے یہ استاد کرونا کا شکار ہوئے اور اس موذی مرض نے سنبھلنے ہی نہیں دیا، دو تین دنوں ہی میں اپنا کاری وار کیا اور انہیں چھین لیا۔

عبدالستار جاوید ابرار فاروق کے بڑے بھائی، نئے نادرا اور پرانے ادارے ڈسٹرکٹ رجسٹریشن اتھارٹی رحیم یار خان کے ضلعی سربراہ ریٹائر ہوئے۔ میرا قومی شناختی کارڈ گم ہوا تو ان کے پاس نیا بنوانے گیا، کہا بیٹھو، چائے پیو اور کارڈ لے کر جاؤ، سو ایسا ہی ہوا۔ میرا ترکِ رحیم یار خان کے بعد فون پر فعال رابطہ رہا۔ اپنے چھوٹے بھائی کی طرح ڈاکٹر عبدالخالق کے "حلقہ دوستاں" کی ہفتہ وار علمی نشستوں میں شرکت کرتے رہے۔ اپنے بھائی کے ساتھ یہ بھی کرونا کا شکار ہوئے۔ کم بخت کرونا دنوں ہی دنوں میں کیسے پیارے دوست کھا گیا۔

یہ تھا رحیم یار خان میں گزرے تقریباً سولہ برسوں کے تجربات و مشاہدات اور تعلقات کا احوال۔ اب آپ سے 1994-2014 کے بیس برسوں کے لیے بہاول پور میں ملاقات ہوگی۔

بہاولپور۔ ہر صفحہ کھولو، کوئی قصہ سانس لینے لگتا ہے
(قیام بیس سال)

1976 کے موسم گرما میں ستمبر کا کوئی دن تھا جب گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس کی ملتان سے آنے والی بس جب ساہیوال شہر کے اندر اپنے وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے ٹرمینل پر رکی۔ میں طالب علم ہونے کے باعث نصف رعائتی ٹکٹ لے کر لاہور جانے کے لیے سوار ہوا تو مجھے ایک ایسی سیٹ ملی جس پر پہلے سے ایک بزرگ بیٹھے تھے جو ملتان سے آرہے تھے۔ بس روانہ ہوئی تو کچھ دیر بعد ان بزرگ سے تعارف ہوا۔ ان کا نام خواجہ ممتاز حسین تھا۔ وہ پولیس کے ریٹائر سب انسپکٹر تھے اور بہاول پور سے ان کا تعلق تھا۔ غالباً ان دنوں جی ٹی ایس کا روٹ لاہور سے ملتان اور ڈیرہ غازیخان تک تھا۔ بہاول پور بذریعہ سڑک اس روٹ سے ہٹ کر تھا۔ وہاں سے لوگ پہلے ڈیرہ اڈا ملتان آتے اور وہاں سے لاہور کے لیے گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بس پکڑتے۔ چوں کہ بس کی لاہور آمد رات نو بجے کے بعد متوقع تھی اور اطلاعاتی ذرائع ابھی پرانی ڈگر کے تھے لہٰذا میری پیشکش پر انہوں نے میری ایک رات کی میزبانی قبول کی۔ اگلے دن میں ان کو ہوسٹل چھوڑ کر ایک دوست کے ساتھ کسی کام سے تھوڑی دیر کے لیے شیخوپورہ جا رہا تھا تو ان بزرگ مہمان نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ سیالکوٹ سے شیخوپورہ کے ارد گرد کا علاقہ اپنے بہترین باسمتی چاول کے لیے بہت معروف ہے، انہوں نے مجھے کچھ رقم دی کہ جس سے میں ان کے لیے باسمتی چاول لیتا آؤں۔ اصلی باسمتی چاولوں کی سوغات کو حاصل کر کے وہ بہت خوش ہوئے۔ اسی روز عصر کے وقت پولیس میں اینٹی نارکاٹکس کنٹرول کے ایک ایس پی ان کو لینے آئے اور وہ چلے گئے۔ بعد میں ان سے دو چار خطوط کے ذریعے رابطہ رہا۔ بہاول پور کی درست لوکیشن کے ضمن میں میرے ذہن میں ابہام برقرار رہا۔ ملتان سے آگے صرف ایک بار نومبر 1973ء کے وسط میں مظفر گڑھ و ڈیرہ غازیخاں کے راستے شاہ صدر دین، تونسہ شریف اور تونسہ بیراج جا چکا تھا اور بس۔ ان دنوں غازی گھاٹ پر ابھی کشتیوں کا پل تھا۔ دو رویہ پختہ پل کی تعمیر کا منصوبہ ابھی حکومت کے زیر غور تھا۔ خواجہ صاحب بہاول پور کے وہ پہلے شخص تھے جن سے ایک ملاقات ہوئی اور بعد میں بذریعہ ڈاک ان سے رابطہ رہا۔ میں ان دنوں ایم اے کے ساتویں پرچے کے ایک آپشن کے لیے ''اقبال اور

ایران'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے میں مصروف تھا۔ 21 فروری 1979ء کو جب میں نے خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان جوائن کیا تو 20 فروری کو مجھے ریلوے کے ذریعے سفر کے دوران بہاول پور کی اصل لوکیشن کا علم ہوا۔ گزیٹڈ گریڈ کی ملازمت (وہ ملازمت جس کو سرکاری گزٹ میں نوٹی فائی کیا جائے) کو جوائن کرنے کے فوری بعد چند بنیادی دستاویز کی تکمیل ضروری ہوتی ہے۔ پولیس کی سپیشل برانچ لاہور کی جاری کردہ پولیس رپورٹ اور ڈویژنل ہیڈ کوارٹر ہسپتال کی طبی موزونیت رپورٹ، ان کے اجرا کے بغیر تنخواہ ملتی ہے نہ گزٹ نوٹیفیکیشن جاری کیا جاتا ہے لہٰذا بہاول وکٹوریہ ہسپتال بہاول پور سے طبی معائنے کا سرٹیفکیٹ لازمی تھا۔ گزٹ نوٹیفیکیشن سے پہلے میڈیکل فٹنس کی بنیاد پر البتہ ضلعی دفتر خزانہ عارضی بنیاد پر تنخواہ جاری کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔ اپنے دو رفقائے کار کے ساتھ میں نے پہلی بار 5 مئی 1979ء کو بہاول پور شہر کی زمین پر قدم رکھا۔ ڈویژنل ہیڈ کوارٹر ہسپتال المعروف بہاول وکٹوریہ ہسپتال (بی وی ایچ) سے میڈیکل فٹنس سرٹیفکیٹ درکار تھا۔ پہلے دن سہ پہر تک بنیادی کلینکل ٹیسٹ ہوئے اور ان کے نتائج کی روشنی میں میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش ہوئے۔ اس ضروری کارروائی کے بعد اگلے دن سرٹیفکیٹ کا اجرا ہونا تھا۔ اچانک مجھے خواجہ ممتاز حسین جو ایس ای کالج کے سامنے صادق کالونی یا محلّہ بگھی خانہ میں رہائش پذیر تھے، یاد آ گئے۔ ان سے ستمبر 1976 کے بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ محبت اور تپاک سے ملے اور رات کے کھانے کی دعوت دی جو تھوڑے بہت ردوکد کے بعد قبول کر لی گئی۔ رات کو ایس ای کالج میں اُردو کے استاد اور ایک ہی سیلیکشن بیچ اور پنجاب یونیورسٹی کے دوست ہمایوں کبیر چودھری کے ہاں قیام کیا جو سیٹلائیٹ ٹاؤن کے نام سے ماضی قریب میں شروع ہونے والی سیٹلائیٹ ٹاؤن ہاؤسنگ کالونی کے ایک نامکمل گھر میں چند دوستوں کے ساتھ رہتے تھے۔ اس وقت ون یونٹ چوک کے بعد ہر طرف مکمل ویرانہ تھا اور ان کا گھر ایس ای کالج سے بہت دور واقع محسوس ہوا۔ اگلے دن ان کے ساتھ ایس ای کالج آئے جہاں یونیورسٹی میں سینئر اور ہوسٹل فیلو دوست جیون سلطان سے ملاقات ہوئی۔ وہ چوں کہ اداکاری کی طرف مائل تھے اس لیے میں نے ان کے ساتھ دورِ طالب علمی میں متعدد بار پی ٹی وی لاہور میں ڈراموں کی صورت بندی دیکھ رکھی تھی۔ وہ فرید گیٹ کے اندر کہیں رہائش پذیر تھے۔ پروفیسر منور علی خاں پرنسپل سے ملاقات ہوئی۔ اچھے اور نستعلیق انسان محسوس ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اپنے ایک سینئر اللہ یار خاں بلوچ بھی ملے جو اس وقت سگریٹ نوشی میں مصروف تھے کہ دور سے پرنسپل کو آتے دیکھا تو احترام کے باعث فوراً سگریٹ پھینک دی۔ سہ پہر کو میڈیکل فٹنس سرٹیفکیٹ دستی وصول کیا۔ باقی دوست تو چلے گئے مگر ہمایوں کبیر نے مجھے روک لیا۔ کھانا جیون سلطان کے ہاں کھایا۔ اگلی صبح چھ بجے تیز رو نامی ٹرین دستیاب تھی جو بہاول پور سے کراچی کی جانب آخری ٹرین تھی۔ اس کے بعد چار بجے اور پانچ بجے سہ پہر اباسین اور خیبر میل کی آمد تھی لہٰذا تیز رو کے ذریعے یہ سفر تین گھنٹے کا تھا۔ صبح دس بجے میں کالج میں کلاس پڑھا رہا تھا۔ اس پہلے دورے کے دوران شہر کے بارے میں جو تاثر قائم ہوا وہ ایک انتہائی گرم

اور گرد آلود ریتلے شہر کا تھا جہاں گرم ہوا کے جھکڑ چلتے ہیں اور جس کی فضا میں خاک معلق رہتی ہے اور بس۔

جاتی سردیاں اپنا آخری زور دکھا رہی تھیں۔ 5 فروری 1980ء کو بذریعہ تار (ٹیلیگرام) ایک افسوسناک اطلاع موصول ہوئی کی راولپنڈی میں مقیم میری خوش دامن اسی روز انتقال کر گئی تھیں اور مجھے اپنی نصف بہتر کے ساتھ فوراً روانہ ہونا چاہیے تھا مگر دقت یہ تھی کہ وہ ایم اے کے باقی ماندہ دو پرچے دینے کے لیے دو دن قبل بہاول پور چلی گئی تھیں۔ ایک پرچہ ہو چکا تھا اور دوسرا اور آخری اگلے دن تھا۔ طے پایا کہ میں انہیں بہاول پور سے ساتھ لے کر راولپنڈی کے لیے روانہ ہو جاؤں۔ بہاول پور میں وہ اپنی ایک رفیقہ کار کی بہن کے گھر مقیم تھیں۔ ان صاحبہ سے بہاول پور میں ان کی بہن کا پتہ لیا۔ بتایا گیا کہ شاہی بازار میں ڈان ہوٹل کے سامنے والی گلی میں ان کی ٹیلرز شاپ ہے اور ساتھ ہی ان کا گھر ہے۔ فیصلہ ہوا کہ ساڑھے نو بجے تیز رو پر سوار ہو کر بہاول پور پہنچوں اور انہیں ساتھ لے کر اگلی ٹرین کراچی ایکسپریس پکڑیں گے جو لاہور تک جائے گی، جہاں سے بس پر سوار ہوں گے۔ رات کے تقریباً ایک بجے بہاول پور اترا تو شہر اس طوفانی رات میں سائیں سائیں کر رہا تھا اور میں یہاں زندگی میں دوسری بار آیا تھا۔ موٹر سائیکل رکشا پکڑا جس نے مجھے شاہی بازار کے آغاز میں چھوڑ دیا۔ تمام بازار بند تھا۔ میری خوش قسمتی کہ رات گئے ایک فوٹو سٹوڈیو کھلا ہوا ملا تو مجھے حوصلہ ہوا۔ اندر داخل ہوا تو تمام ماجرا کہہ سنایا۔ کہنے لگے ڈان ہوٹل تو کب کا ختم ہو چکا البتہ وہاں ایک گلی ضرور ہے۔ ان کی رہنمائی میں گلی پہنچا تو ایک صاحب دکان بند کر کے تالے لگا رہے تھے۔ ان سے بات کی تو کہنے لگے وہ یہی دکان ہے اور ساتھ ہی میرا گھر ہے۔ فوٹو گرافر کا شکریہ ادا کیا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔ سوتوں کو جگایا گیا۔ میں نے اپنی بیوی کو آدھا سچ بتایا کہ ان کی والدہ کی طبیعت سخت خراب ہے اور ہمیں فوراً ملنے کے لیے بلایا ہے۔ اگر میں پورا سچ بتا دیتا تو سفر خاصا دشوار ہو جاتا۔ بہر حال انہیں ساتھ لیا اور پیدل نکل پڑے، راستے میں رکشا مل گیا، ریلوے اسٹیشن پر پہنچے ہی تھے کہ کراچی ایکسپریس نے روانگی کا بگل بجا دیا۔ مجبوراً اگلی ٹرین تیز گام کا انتظار کیا جو صبح پانچ بجے کے قریب آئی۔ یوں ایک بجے سے پانچ بجے صبح تک یعنی چار گھنٹے بہاول پور ریلوے اسٹیشن کی انتظار گاہ میں گزارے۔ میں اب بھی سوچتا ہوں کہ اگر فوٹو گرافر کی دکان نہ کھلی ہوتی یا دکان بند کرنے کے آخری ایک دو منٹ کے دوران میزبان نہ ملتا تو اس تاریک اور طوفانی رات میں اس وقت تک ''اجنبی شہر'' میں کتنی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔

خواجہ فرید گورنمنٹ کالج میں تدریس کو ایک سال ہی ہوا تھا کہ اچانک ایک مسئلہ پیش آیا۔ وجوہات میں جائے بغیر یہ بتانا کافی ہے کہ تعلیمی سیشن عروج پر ہونے کے باوجود پرنسپل سید رحمت اللہ شاہ نے خصوصی پروانہ لکھ کر مجھ سمیت پانچ اساتذہ کے مختلف شہروں مثلاً ڈیرہ غازیخاں، جہلم، فورٹ عباس، نیوڑہ کنجور ضلع اٹک کے کالجوں میں تبادلے کرا دیے گئے۔ میرے حصے میں بہاول نگر آیا جو بڑے دھارے یا مین سٹریم سے ہٹ کر تھا لہٰذا میں نے ویڈ لاک کی بنیاد پر منسوخی تبادلہ کی درخواست لکھی جس پر پرنسپل نے اپنی سفارش بھی کر

دی۔اپریل کی کسی تاریخ کو میں دستی درخواست لے کر خیبر میل پر صبح سات بجے روانہ ہو کر ساڑھے دس بجے بہاول پور ریلوے اسٹیشن پر اترا اور دستی سائیکل رکشا پر سوار ہو کر ایس ای کالج پہنچا جہاں سے زوالوجی کے پروفیسر فروغ جلیل قریشی کو لے کر ایلیمنٹری کالج میں واقع نظامت تعلیم میں پروفیسر منور علی خان ڈائریکٹر بہاول پور ڈویژن سے ملا۔رات حسب معمول ہمایوں کبیر کے پاس اور حسب سابق دوسرے دن صبح تیز رو سے واپس رحیم یار خان۔ یہ میرا بہاول پور کا تیسرا دورہ تھا جو پہلے سے زیادہ محدود تھا۔اس بار بھی میں ناک کی سیدھ میں گیا اور واپس آیا۔

چوتھی بار بہاول پور گیا تو یہ ایک مختلف تجربہ تھا۔مئی 1980ء کے دوران خواجہ فرید گورنمنٹ کالج کے سابق پرنسپل سید محمد اشرف کی والدہ کے انتقال پر جنازے میں شرکت کے لیے کالج کا تدریسی سٹاف کالج بس کے ذریعے بہاول پور جا رہا تھا کہ ظاہر پیر سے پہلے بس کو حادثہ پیش آ گیا۔میرا خیال تھا کہ جنازے میں شرکت کے بعد میں تنسیخ تبادلہ کی درخواست کے بارے میں معلومات لے لوں گا۔حادثے کے بعد جب جانا مؤخر ہو گیا تو پروفیسر محمد اظہر چودھری نے مجھے زبردستی دس بجے کے قریب ایک بس پر سوار کرا دیا کہ کم از کم میں اپنے کام کے بارے میں تو معلوم کر لوں۔بس کے ذریعے یہ میرا بہاول پور کے لیے پہلا سفر تھا۔کراچی موڑ سے بائی پاس بن چکا تھا لہٰذا بسوں کو اسی راستے سے شہر میں داخل ہونا پڑتا تھا۔چار گھنٹے کے بعد بس نے بہاول پور اڈے پر پہنچایا جہاں سے میں ایس ای کالج پہنچا اور بیالوجی کے پروفیسر محمد طیب سے مل کر تمام ماجرا کہہ سنایا تو انہوں نے اسسٹنٹ ڈائریکٹر آصف سلطان کو فون پر خوب سنائیں اور مجھے ان سے ملنے کو کہا۔ ملنے پر انہوں نے کہا کہ آپ کے تبادلے کی تنسیخ جلد ہو جائے گی۔ میں نے رکشا لیا اور سخت گرمی میں سٹیشن پر آیا جہاں سے اباسین کے ذریعے رحیم یار خان کے لیے روانہ ہو گیا۔اس بار بھی میں بہاول پور کو آنکھ بھر کر نا دیکھ سکا۔اوپر میں بیان کر آیا ہوں کی جب میری خوش دامن کی وفات ہوئی تو نجمہ نسیم ایم اے کے چھوڑے ہوئے دو پرچے دینے کے لیے بہاول پور گئی ہوئی تھیں۔ابھی ایک ہی پرچہ دیا تھا کہ اپنی والدہ کی وفات کی وجہ سے ایک پرچہ چھوڑنا پڑ گیا اور اب کے تو چانس بھی آخری تھا- جون 1980 کے گرم ترین دنوں میں امتحان شروع ہو چکا تھا۔ پرچے سے ایک دن قبل انہیں بہاول پور پہنچنا تھا اور میزبان اس بار بھی ان کی کولیگ کی بڑی بہن تھی۔ میں صبح خیبر میل پر انہیں سوار کرانے آیا۔ ریل کی آمد سے بیس منٹ پہلے انہیں بائیں گردے میں شدید درد اٹھا۔ساتھ ہی ریلوے روڈ سے میں عجلت میں درد کُش دوا لے آیا مگر آرام نہیں آ رہا تھا۔اسی اثنا میں خیبر میل آ گئی۔اب جانا بھی مشکل تھا اور نہ جانا بھی۔ آخری چانس کا ایک پرچہ تھا۔انہوں نے پہلی مشکل کا انتخاب کیا اور روانہ ہو گئیں۔ دس بجے کے قریب مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اس شدید تکلیف میں انہیں اکیلے نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔ان دنوں رحیم یار خان کے لیے پرانی طرز کی فورڈ ویگن کا آغاز ہو چکا تھا۔رحیم یار خان پوسٹ آفس کے سامنے احسن ایجنسیز پر اس کا اڈا تھا۔دونوں شہروں کے درمیان کل دو ویگنیں ہی دستیاب تھیں۔ گیارہ بجے کے وقت

میں روانہ ہوا اور براستہ خان پور، لیاقت پور اور چنی گوٹھ شام تین بجے منزل مقصود پہ پہنچ گیا۔ معلوام ہوا کہ درد ابھی تھما نہیں تھا۔ جہاں ان کا قیام تھا وہ حکیموں کا خاندان تھا لہٰذا متعلقہ جوارش یا معجون دیے جانے کے بعد بھی درد کم نہیں ہوا تھا۔ میں نے ایک تکا لگایا، اسپرین کی دو گولیاں انہیں کھانے کو دیں۔ اگلے تیس منٹ میں درد غائب ہو گیا۔ میں انہیں پڑھنے کا موقع دینے کی خاطر بازار میں گھومنے نکل گیا۔ شاہی بازار کو میں نے پہلی بار دیکھا۔ گویا میں پہلی بار بہاول پور کو کھلی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ سینما چوک (اب سرائیکی چوک) میں واقع رین بو سینما میں فلم دیکھی۔ رات دس بجے واپس پہنچا۔ اگلی صبح گورنمنٹ کالج برائے خواتین کے امتحانی سنٹر میں انہیں چھوڑ کر سامنے کے چند گھروں پر مشتمل ریاض کالونی میں ہمایوں کبیر چودھری کے گھر گیا۔ ہمایوں خود موجود نہیں تھے۔ تین گھنٹے ان کے والد محترم سے خوب باتیں کیں۔ پرچہ ختم ہوا تو نجمہ نسیم کو لے کر میز بانوں کے گھر آئے اور ان کا شکریہ ادا کر کے خدا حافظ کہا اور ریلوے سٹیشن آئے۔ اتفاق سے اس دن خیبر میل کی ڈائننگ کار کے منیجر محمد عمر بلوچ کی باری تھی سو انہوں نے ڈائننگ کار میں خوش آمدید کہا اور رحیم یار خان پہنچ گئے۔ اس بار دن کے اجالے میں بہاول پور کو غور سے دیکھا مگر ابھی بہاول پور کی تاریخی اور ادبی قدو قامت سے آگاہ نہیں ہوا تھا۔ یہ میرا بہاول پور کا پانچواں دورہ تھا اور ذہن میں شہر کے بارے میں پہلے دن کا تاثر ہی موجود تھا۔

اگلے دو برس ستمبر 1980 تا جون 1982 کا ایک پورا سیشن رحیم یار خان سے ترقی تعلیم کالج خان پور جانے آنے میں بیت گیا۔ اس دوران لاہور، ملتان اور ساہیوال جاتے وقت صرف بہاول پور سٹیشن کو آنکھ بھر کر دیکھ لیتے۔ اس شہر سے تقریباً آشنائی تو ہو ہی چکی تھی۔ اس دوران سیاسیات کے استاد جناب منظور شاد صادق آباد سے خان پور آ چکے تھے، اردو کے استاد جناب صفدر نقوی (نردوش ترابی) پہلے سے موجود تھے۔ 82-1981 کے تعلیمی سال کے دوران انجمن طلبا (سٹوڈنٹس یونین) کے زیر اہتمام بڑے پیمانے پر بین الکلیاتی تقریبات منعقد کی گئیں۔ آخری دن مشاعرہ تھا۔ ان تقریب میں بہاول پور سے بھی شاعر تشریف لائے۔ مارچ 1982 کے دوران بہاول پور کے کمشنر چودھری محمد شریف تھے اور بہاول پور آرٹس کونسل کے بلحاظ عہدہ سرپرست بھی تھے۔ بہاول پور آرٹس کونسل اور بزم اہل قلم کے اشتراک سے دو روزہ اہل قلم کانفرنس منعقد کی گئی جس کے مدارالمہام ڈاکٹر فرحت عباس تھے۔ نردوش ترابی، خواجہ فرید کالج میں انگریزی کے استاد جی۔ این شاکر، خان پور کے شاعر صفدر صدیق رضی اور میں اکٹھے اس ادبی کانفرنس میں شرکت کے لیے بہاول پور گئے۔ کانفرنس کے تمام سیشن ضلع کونسل ہال میں منعقد ہو رہے تھے۔ رات کو سرکٹ ہاؤس میں کھانے کے بعد مشاعرہ شروع ہوا جو صبح دو بجے تک جاری رہا۔ اس کانفرنس میں بہاول پور اور باہر سے آئے ہوئے ادیبوں اور شاعروں سے بھرپور تعارفی ملاقاتیں ہوئیں۔ اس کانفرنس نے بہاول پور کے ادبی مقام و مرتبے کے حوالے سے میرا بہترین تعارف کرایا۔ سنٹرل لائبریری اور محلات کو سرسری طور پر دیکھ کر اس کی تاریخی جہتوں سے بھی آگاہ ہوا۔ جوائننگ سے لے کر اب تک ان دو سالوں کے دوران بہاول پور کے ان چھ مختصر دوروں نے

میرے اندر بہاول پور کی تمام جہتوں کے ساتھ پرانے اور تاریخی شہر کے تصور کو راسخ کیا۔

اگلے تین سال کے دوران یعنی 1985 تک پانچ یا چھ بار بہاول پور آنا ہوا جو کچھ اس طرح ہے۔ ایک بار لاہور سے واپسی پر دو دن بہاول پور قیام، کالج کی بیڈ منٹن ٹیم کے نگران کے طور پر ایس ای کالج میں آمد، اسلامیہ یونیورسٹی میں فارسی کے پہلے بورڈ آف سٹڈیز میں شرکت، طلبا کیساتھ تفریحی دورے پر بہاول پور آمد اور ملتان جاتے وقت ایک رات کا قیام۔ ان دوروں نے بہاول پور کو تہہ در تہہ مجھ سے متعارف کرایا۔ یہاں کے تعلیمی اداروں کی تاریخی عمارات، سنٹرل لائبریری، اسلامیہ یونیورسٹی کے تینوں کیمپس، محلات، تعلیمی بورڈ، بازار اور محلّوں کے پرانے نام، ستلج ویلی پروجیکٹ، تاریخی شہر اور قصبے اور آثار قدیمہ سے مجھ پر میں اس شہر اور ریاست کی تاریخی قد وقامت اور اہمیت منکشف ہوئی اور بہاول پور مستقل آنے سے نو سال قبل اس شہر نے میرے اندر ایسا گھر کیا کہ میرے تحت الشعور میں یہاں تبادلہ کرانے کی خواہش گھر کر گئی۔

میں نے فروری 1979 کے دوران جب رحیم یار خان میں رہائش اختیار کی تو اس شہر کا اپنے ڈویژنل ہیڈ کوارٹر سے مؤثر رابطے کا ذریعہ صرف ریل گاڑی تھا اور وہ بھی بہت محدود سطح پر۔ رحیم یار خان دراصل لاہور اور کراچی کے تقریباً وسط میں ہے اس لیے تمام گاڑیاں رات کے اوقات میں ہی دستیاب تھیں۔ لاہور اور بہاول پور کے لیے دن کے اوقات میں صبح سات اور آٹھ بجے دو آخری گاڑیاں خیبر میل اور اباسین تھیں۔ اسی طرح کراچی کی جانب شام کو سات اور آٹھ بجے یہی دو گاڑیاں جاتی تھیں۔ بیچ میں صرف ایک پسنجر ٹرین خانیوال اور سکھر کے درمیان چلتی تھی جو بہاول پور سے رحیم یار خان تک چھ گھنٹے لیتی تھی۔ صبح آٹھ بجے کے بعد رات کو لاہور کے لیے پہلی ٹرین 14 گھنٹے کے بعد دستیاب ہوتی تھی۔ صرف ایک بس سروس الفرید ٹرانسپورٹ تھی مگر وہ بھی 5 سے 6 گھنٹے میں بہاول پور پہنچتی تھی۔ 1980 میں ڈاکخانے کے سامنے احسن ایجنسیز سے پرانی طرز کی فورڈ ویگن کا آغاز ہوا تھا جو ہائیکورٹ بہاول پور بنچ کے وکلا اور ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کے دفاتر جانے والے سرکاری عمال کے لیے بہت کارآمد تھی لیکن 1981 کی ایک شدید دھند آلود صبح کو سمہ سٹہ کے قریب ویگن خراب ہوئی اور ایک بس نے کھڑی ہوئی ویگن کو پیچھے سے روند دیا۔ ہلاک شدگان کی خاصی تعداد سرکاری امور کی انجام دہی دینے والوں پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد یہ سروس ہی ختم کر دی گئی۔ 84-1983 کے لگ بھگ صادق آباد سے فیصل آباد براستہ تر نڈہ محمد پناہ و بہاول پور اور صادق آباد سے لاہور براستہ رحیم یار خان، لیاقت پور و بہاول پور دو روٹ منظور ہوئے اور پہلی بار بہاول پور سے صادق آباد اور رحیم یار خان سے بہاول پور تک بہتر ٹرانسپورٹ میسر آئی۔ 1984 میں ہی رحیم یار خان سے صادق آباد، خان پور اور بہاول پور کے لیے ہائی ایس ویگن کا آغاز ہوا۔ پھر بہاول پور کے لیے کوسٹر چلی۔ 1988 میں صادق آباد سے رحیم یار خان اور لاہور کے لیے چار اے سی بسوں کی سروس شروع ہوئی۔ بس صادق آباد سے آتی جس میں ایک مکمل سائیڈ صادق آباد کے لیے جب کہ دوسری سائیڈ کی سیٹیں رحیم یار خان کے لیے مختص ہوتیں۔ یہ بس اپنے روٹ

خان پور، لیاقت پور سے بہاول پور براستہ کراچی موڑ، احمد پور شرقیہ روڈ سے سرکلر روڈ، فرید گیٹ، حاصلپور روڈ سے حاصلپور، وہاڑی، بوریوالہ، عارف والہ اور ساہیوال کے راستے لاہور پہنچتی۔ یہ تمام بسیں اسی روٹ سے رات کے ایک بجے کے بعد بہاول پور سے گزرتیں تو بہاول پور میں سناٹا ہوتا۔ کافی مدت کے بعد اے سی بسوں نے بتدریج رواج پکڑا اور رحیم یار خان سے کراچی اور لاہور براستہ لودھراں، خانیوال کے روٹ بھی شروع ہوئے۔ 1990 میں پہلی بار چار اے سی کوسٹرز رحیم یار خان سے بہاول پور کے درمیان چلنا شروع ہوئیں۔
اس تمام تفصیل کا مقصد یہ بتانا مقصود ہے کہ جیسے جیسے ان دو شہروں کے درمیان چلنے والی ٹرانسپورٹ کی سہولتیں بہتر ہوتی گئیں اسی قدر بہاول پور جانے میں آسانیاں پیدا ہوتی گئیں۔ پہلے چھ سال میں جتنی بار بہاول پور جانا ہوا اب اس سے زیادہ بار ایک سال میں جانا ہوتا۔ جیسے جیسے سینئر ہوتے گئے اسلامیہ یونیورسٹی اور تعلیمی بورڈ بہاول پور کے اجلاسوں میں جانا زیادہ ہو گیا۔ اس دوران بہت سے دوستوں سے ملاقات بھی ہوتی اور متعدد نئے دوست بھی بنتے گئے۔ اگرچہ میں رحیم یار خان میں معاشرتی اور علمی ادبی سطح پر ایک متحرک زندگی گزار رہا تھا مگر معمولات کی یکسانیت سے اکتاہٹ ہونے لگی۔ اس دوران بہاول پور کی ہمہ جہت تاریخ کا مطالعہ بھی جاری رہا حتیٰ کہ بہاول پور تبادلہ کرانے کی خواہش ایک مستقل خواہش بن گئی۔ 1990 کے دوران ایک دوست، شاعر اور ادیب حکیم خلیق الرحمان خلیق کے ساتھ گفتگو کے دوران میں نے بہاول پور جانے کی خواہش کا اظہار کیا جس کی ویڈیو ریکارڈنگ میرے پاس موجود ہے۔ اس گفتگو سے ایک اقتباس پیش ہے۔

"رحیم یار خان میں 12 سال کے بعد میں خود کو یکسانیت کا شکار محسوس کرتا ہوں۔ اب میں اس شہر سے کوچ کرنا چاہتا ہوں۔ میں بہاول پور شفٹ ہونا چاہتا ہوں مگر اس کی کوئی صورت دور دور تک نظر نہیں آتی۔" یہ سن کر اس دوست کو ایک جھٹکا سا لگتا ہے۔ اور کہتا ہے'' یہ فیصلہ آپ نے کب کیا؟ بڑا حیرت انگیز فیصلہ ہے، میں آپ کو آپ کی خواہش کے باوجود مستقبل قریب میں بہاول پور جاتا نہیں دیکھ رہا۔ سب اچھا چل رہا ہے۔ آپ کا یہ فیصلہ مجھے اچھا نہیں لگا، یہ محض ایک خواب تو ہو سکتا ہے!"۔ جواباً میں صرف یہی کہہ پاتا ہوں کہ خواب دیکھیں گے تو ان کی عملی تعبیر کے لیئے کوشاں ہوں گے۔''

اس سے ایک سال پہلے میں براہ راست اسسٹنٹ پروفیسر منتخب ہوا تو ایک بار پھر میری پوسٹنگ خان پور کے کالج میں ہو گئی تھی اور میں رحیم یار خان سے ہی روزانہ جاتا آتا رہا۔ روزانہ سفر کی اپنی ایک اکتاہٹ تھی مگر اس کا کوئی حل نہیں تھا۔ اگلے چار سال کے دوران میں سرکاری اور نجی امور کے ضمن میں بہاول پور جاتا رہا اور یہ شہر میرے خوابوں میں بستا جا رہا تھا بلکہ میری خواہش بن چکا تھا مگر کوئی ترکیب نظر نہیں آ رہی تھی۔ بہاول پور سے محبت کو میں نے ایک نئی صورت دی۔ رحیم یار خان، بہاول پور کی تاریخ کا ایک خوبصورت اور ناگزیر باب ہے۔ اس کی تاریخ کے مطالعے کے لیے بہاول پور کی تاریخ کے صدر دروازے سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے لہٰذا بہاول پور کی تاریخ کے مطالعے سے رحیم یار خان کے تمام پہلو مجھ پر منکشف ہوئے جس کا نتیجہ

گورنمنٹ کالج خان پور کے مجلّے "بانگ سحر" کے "رحیم یار خان نمبر" کی اشاعت کی صورت میں سامنے آیا۔ کالج میگزین کے اس شمارے کوضلع رحیم یار خان کی تاریخی، علمی و ادبی، معاشرتی، جغرافیائی اور ثقافتی دستاویز قرار دیا جاتا ہے۔ ایسی غیر معمولی دستاویز کسی شہر سے محبت کے بغیر مرتب نہیں ہوسکتی تھی۔ اوپر میں نے ایک ویڈیو کلپ کے اقتباس کا ذکر کیا ہے، اسکے چار سال بعد جب بہاول پور نے مجھے اپنی محبت میں راسخ دیکھا تو اس نے چار سال سے مسلسل دیکھے گئے ایک خواب کی تعبیر کے لیے ایسے سازگار حالات پیدا کیے کہ میں نے ہمراہ فیملی و مال واسباب 5 اکتوبر 1994 کو اس شہر نگاراں میں قدم رکھا اور آئندہ بیس سال تک اس شہر کی تہذیبی، معاشرتی اور علمی ادبی زندگی کا حصہ بن گیا۔

بہاول پور شفٹ ہوتے وقت اس شہر کے بارے میں جو میرے ذہن میں خاکہ تھا وہ گذشتہ سولہ سال کے دوران متعدد بار بہاول پور جانے آنے، ریاست بہاول پور کی تہذیبی، معاشرتی، علمی ادبی اور سیاسی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے اور یہاں پر شفٹ ہونے کی شدید خواہش کے تحت مرتب ہو چکا تھا وہ مختصر طور پر کچھا س طرح تھا۔

"بہاول پور ایک ایسا تاریخی شہر ہے جس کی جڑیں گذشتہ کئی صدیوں کی تاریخ میں پیوست ہیں۔ آخری طاقتور مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات 1707 کے بیس برس بعد کا واقعہ ہے شکار پور میں ایک ہی برادری کے دو طاقتور گروہوں میں طویل جنگی مہمات اور خاندانی مخاصمت کے نتیجے میں صادق محمد خان اول پہلے دریائے ستلج کی دوسری طرف گئے۔ اوچ کے مخادیم کی دعوت اور ملتان کے گورنر کی طرف سے چودری کی بڑی جاگیر ملنے پر یہاں آئے۔ انہوں نے موجودہ لیاقت پور سے چھ میل دور اللہ آباد کے قصبے کی بنیاد رکھی۔ صادق محمد خاں اول کو اس قبیلے کا بانی نواب کہا جاتا ہے جو شکار پور پر قبضے کی لڑائی کے دوران مارا گیا اور وہیں دفن ہوا۔ تمام نوابوں میں بہاول خاں اول کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے 1748 میں بہاول پور شہر کو ریاست کے مرکزی شہر کے طور پر آباد کیا۔ بہاول خاں دوم کا دور نوابوں کی بقا کی جنگوں کا دور تھا۔" ریاست کے قیام کے تقریباً ایک صدی بعد ریاست کو انگریزوں نے اپنی سرپرستی میں لینا شروع کیا۔ اگر ریاست انگریزوں کے سایہ عاطفت میں نہ آتی تو شاید منظر نامہ مختلف ہوتا۔ نواب بہاول خاں چہارم نے جب 1866 میں انتقال کیا تو اس کے بیٹے صادق محمد خاں چہارم کی عمر صرف ساڑھے چار سال تھی۔ محلاتی سازشوں اور خاندانی رقابتوں کے بیچ گھرے ہوئے ننھے نواب کو ان کی والدہ کی درخواست پر انگریزوں نے اپنی سرپرستی میں لے لیا اور 18 سال کی عمر تک پہنچنے تک ریاست کا انتظام وانصرام برٹش ایجنسی نے سنبھال لیا۔ کم عمر نواب کی تربیت ماہر اساتذہ کے سپرد کی گئی۔ 28 نومبر 1879 کو "تعلیم یافتہ اور ترقی پسند نواب" کی نور محل میں تاج پوشی کی گئی۔ انگریزوں کی رہنمائی میں اس دور میں ریاست کی ترقی کا ایک نیا منظر نامہ سامنے آنا شروع ہوا۔"

’’14 فروری1899 میں نواب صادق محمد خان چہارم نے جب انتقال کیا تو نواب بہاول خاں پنجم کی عمر صرف 12 سال تھی اور وہ ابھی زیر تعلیم تھے۔ ماضی کی طرح ریاست کا کنٹرول ایک کونسل کے ذریعے انگریزوں نے سنبھال لیا۔18 سال کی عمر میں 12 نومبر 1903ءکو وائسرائے اور ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ کرزن نے بہاول پور آ کر نواب کو ریاست کی اتھارٹی سپرد کی۔اس نواب کا عرصہ حکمرانی صرف چار سال ہے لیکن ان چار سالوں میں اس ’’تعلیم یافتہ اور ترقی پسند‘‘ نواب نے ریاست کو جدید خطوط پر استوار کیا۔اِس دوران ریاستی عوام کی بھلائی کے متعدد کام کیے گئے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ 15 فروری1907 کو حج سے واپسی پر دوران سفر ان کا انتقال ہوا تو کم عمر نواب کی عمر تین سال سے بھی کم تھی لہٰذا ایک بار پھر کونسل آف ریجنسی کے قیام کے بعد نواب کو ایچی سن کالج لاہور، ملٹری کالج کوئٹہ اور انگلینڈ میں انتظامی وفوجی امور کی تربیت دی گئی۔ نواب برٹش کور میں کیپٹن کے عہدے تک پہنچے جب انہیں ریاست کی حکمرانی کا اختیار دیا گیا۔(1946 میں ان کا عہدہ میجر جنرل کا تھا)۔15 اکتوبر 1947 کو آخری مقتدر نواب اور گورنر جنرل پاکستان کے درمیان ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی دستاویز پر دستخط ہوئے۔ریاست بہاول پور کا پاکستان میں انضمام عمل میں آیا۔ون یونٹ کے قیام پر ریاست کا علیحدہ وجود اختتام کو پہنچا اور اسے کمشنری کا درجہ ملا۔ون یونٹ ختم ہوا تو بہاول پور کو رحیم یار خان اور بہاولنگر کے اضلاع کے ساتھ ڈویژن بنا دیا گیا۔انضمام کے بعد نواب کا وظیفہ لگا دیا گیا۔ دو فہرستیں تیار کی گئیں جن مین ایک فہرست پبلک کے وہ اثاثے جو حکومت پاکستان کی ملکیت تھے اور دوسری فہرست میں نواب کے ذاتی اثاثوں کی تفصیل مرتب کی گئی تھی۔دونوں کو نوٹی فائی کر دیا گیا۔ بہاول پور شہر کے آباد ہونے میں کافی عرصہ لگ گیا۔1869 میں اصلاح آبپاشی کے منصوبوں کے بعد آسان شرائط پر آبادکاری کی سکیموں کا اعلان کیا گیا۔ستلج ویلی پروجیکٹ نے ریاست بہاول پور کی آبادکاری کو مہمیز لگائی۔تقسیم ہند کے بعد مہاجرین کو خوش آمدید کہا گیا۔اس تاریخی شہر کو محلات کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ایک صدی سے زائد کے تعلیمی اداررو ں میں بہترین علمی و ادبی اقدار، معیار اور سرگرمیوں کی ارتقا یافتہ روایات بہت پختہ تھیں۔ 1869 سے اشاعت کا آغاز کرنے والے ’’صادق الاخبار‘‘ سے لے کر اب تک یہاں پر صحافت اور ادبی انجمنوں کی تاریخی قدامت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔کور ہیڈ کوارٹر، لاہور ہائی کورٹ کا بہاول پور بنچ، پنجاب کے تمام محکموں کے ضلعی اور ڈویژنل ہیڈ کوارٹر، ائرپورٹ، تقریباً تمام گاڑیوں کے سٹاپ والا ریلوے سٹیشن، یونیورسٹی، تعلیمی بورڈ اور میڈیکل کالج بھی موجود تھے۔"پنجاب کے سو سال" کے مصنف اور ہندوستان لیور کے پہلے دیسی سربراہ پرکاش ٹنڈن نے جو 2004 میں فوت ہوئے، بہاول پور سے میٹرک کیا۔آخری نواب کی تخت نشینی کے وقت وہ بہاول پور میں موجود تھے۔انہوں نے بہاول پور کی نوابی اور معاشرتی زندگی پر دس صفحات تحریر کیے جس کے مطالعے نے اس وقت کے بہاول پور کے ماضی کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ گویا بہاول پور ایک بڑے اور تاریخی شہر کے اوصاف کا حامل شہر تھا۔"

یہ تھے وہ ابتدائی تاثرات جن کے ساتھ میں اس شہر میں منتقل ہوا۔عملی زندگی کا آغاز کرنے سے پہلے میری زندگی کے دو بہترین شہر تھے۔ پہلا ساہیوال جو میرا ہوم ٹاؤن تھا جہاں میں نے بچپن سے جوانی تک کا سفر طے کیا تھا یعنی زندگی کے پہلے اکیس برس۔ دوسرا شہر لاہور تھا جہاں مستقبل سازی کے مقصد سے چار سال ہوسٹلوں میں رہائش اختیار کی۔عملی زندگی کا آغاز رحیم یار خان سے کیا۔اس شہر نے اگلے تقریباً سولہ سال مجھے اپنی محبت میں گرفتار کیے رکھا۔ بہاول پور چوتھا اور آخری شہر ہے جہاں میں نے اپنے آبائی شہر کے برابر کا عرصہ گزارا۔گھر یہاں بنایا اور اسے ہوم ٹاؤن کے طور پر اپنایا۔آدھے سے زیادہ بچوں کی شادی کی تقریبات اس شہر میں منعقد ہوئیں۔ 2013 میں ریٹائر ہوا اور نومبر 2014 میں بیس سال کے بعد ایک خاندانی فیصلے کے تحت لاہور شفٹ ہونا پڑا جہاں اب دس سال سے زیادہ کا عرصہ ہونے کو ہے۔ بہاول پور میں گزری پہلی رات 5 اکتوبر 1994 سے لے کر آخری رات 13 نومبر 2014 تک کے درمیان کا ایک ایک لمحہ میرے ذہن کی مقناطیسی قرص (ہارڈ ڈسک) میں ایک ناقابلِ تنسیخ فائل کی طرح محفوظ ہے۔ گذشتہ سولہ سال کے دوران رحیم یار خان اور بہاول پور کے درمیان مواصلاتی سہولتوں میں اضافے کے باعث میں بیسیوں بار بہاول پور آ چکا تھا اور پھر چار سال کی تگ ودو کے بعد میں بہاول پور شفٹ ہوا تو یہ شہر میرے لیے نیا نہیں تھا بل کہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ میں بہاول پور میں جذباتی سطح پر اسی وقت سے موجود تھا جب اس شہر میں منتقل ہونے کی میرے اندر خواہش بیدار ہوئی۔

میں نے بغداد روڈ پر واقع گورنمنٹ انٹر کالج میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر جوائن کیا اور دو چار دنوں میں ہی تمام تدریسی اور غیر تدریسی عملے سے آشنا ہو چکا تھا۔ جناب خضر اقبال پرنسپل تھے۔ پرنسپل آفس ہی کو سٹاف روم کا درجہ حاصل تھا جب کہ اصل سٹاف روم میں کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ چائے کلب کے انچارج خود پرنسپل تھے۔ان کے دوستانہ رویے نے تمام سٹاف کو ایک لڑی میں پرو رکھا تھا۔ میرے لیے یہ ماحول غیر معمولی تھا اور ایسی فضا میں، میں بہت خوش اور مطمئن تھا۔ ماڈل ٹاؤن سی کے بلاک وی میں کرائے پر گھر لے لیا۔ جڑواں اور ان سے چھوٹی بچی یعنی تینوں بہنیں ایک ہی کلاس میں تھیں، انہیں ماڈل ٹاؤن اے کے گرلز ہائی سکول میں داخل کرا دیا تھا جب کہ بیٹا اور اس سے چھوٹی بچی ایک پرائیویٹ سکول میں داخل ہو گئے۔ میری شریک حیات نے ماڈل ٹاؤن اے میں واقع گورنمنٹ کالج برائے ایلیمنٹری ٹیچرز میں جوائن کیا جہاں کالج جیسی فضا تھی۔ تمام بچوں کے لیے ٹرانسپورٹ کا انتظام کر دیا۔ بہاول پور آنے پر میرے والد سب سے زیادہ خوش تھے کیوں کہ یہاں سے ساہیوال قریب پڑتا تھا۔فرید گیٹ کے قریب سٹی تھانے کے سامنے نیو خان کی چار بسیں مختلف اوقات میں لاہور کے لیے روانہ ہوتی تھیں۔ لودھراں سے خانیوال کے درمیان براستہ چوک میتلا ایکسپریس وے بن چکا تھا۔اس طرح ساہیوال کا سفر چار گھنٹے سے بھی کم کا ہو گیا تھا۔ بہت جلد بہاول پور میں زندگی کچھ اس طرح معمول پر آ گئی کہ جیسے میں یہاں برسوں سے رہائش پذیر تھا۔

گذشتہ سولہ سال کے دوران بہاول پور متعدد بار آنے جانے کی نسبت یہاں مستقل منتقل ہونا ایک منفرد تجربہ تھا۔ بہاول پور کے شب و روز کا حصہ بننے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ یہ شہر کسی پرانے اور دروازوں والے شہر کی ہو بہو شبیہ یعنی replica ہے۔ 1748 میں دریائے ستلج سے تین چار کلومیٹر جنوب کی جانب ایک معمولی سی بستی سے آغاز کرنے والا شہر 246 سال کے بعد 1994 تک اپنے ارتقا کی ان گنت منازل طے کر کے موجودہ صورت میں یہاں پہنچا تھا۔ اس شہر کی مشابہت کے لیے لاہور اور ملتان کے نام لیے جا سکتے ہیں مگر ان دونوں پرانے شہروں کی نسبت بہاول پور ہی ایک ایسا تاریخی شہر ہے جس کی بنیاد کے حوالے سے 1748 کا سال واضح ہے اور اس کے نام کے حوالے سے بھی کوئی دو آرا نہیں ہیں مگر جس جگہ کا نام بہاول پور پڑا اس سے پہلے اس کا کیا نام تھا، اس بات پر تین مصنفین نے مختلف آرا پیش کی ہیں۔ سٹیٹ گزٹیر 1904 میں مذکور ہے کہ نواب بہاول خان نے محمد پناہ گھمرانی کی قیام گاہ کے گرد ایک (طویل) دیوار تعمیر کروائی اور اس کے اندر ایک قصبہ بسایا۔ عزیز الرحمٰن عزیز صبح صادق میں لکھتے ہیں کہ امیر محمد بہاول خاں کو اپنے مقبوضات کی نگرانی رکھنے اور صوبہ داری ملتان کے قریب قیام رکھنے اور مخالفوں کے حملوں سے بچاؤ کی تدابیر کے لیے ایک مرکزی جگہ کی تلاش تھی۔ آخر اس نے غور و خوض کے بعد اپنا دارالخلافہ دریائے ستلج کے تین میل کے قریب جانب جنوب بنانے کی تجویز کی۔ یہاں پہلے "جھوک سوڈھا" اور وڈیرہ محمد پناہ خاں گھمرانی کی ایک پختہ کوشک یعنی حویلی موجود تھی۔ اسی جگہ ایک شہر کی بنیاد ڈالی۔ شہر پناہ تعمیر کرائی اور شہر کا نام اپنے نام پر تجویز کیا۔ ڈاکٹر محمد طاہر بتاتے ہیں کہ سوڈھا ہندوؤں کی ذات تھی اور پختہ حویلی اوچ کے مخدوم راجن قتال کی تھی۔ معلوم نہیں اس جگہ کا نام جھوک رانجھا کہاں سے آ گیا۔ ڈاکٹر محمد طاہر کے مطابق مخدوم راجن کو عقیدت اور پیار سے رانجھن کہتے تھے۔ شہامت علی 1848 میں لندن سے انگریزی میں شائع ہونے والی "ہسٹری آف بہاول پور" میں کوئی اور کہانی بتاتے ہیں جس سے مقام اور نام کے بارے میں ابہام بڑھ جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں "محمد پناہ کے ساتھ عنایات و مہربانی کا سلوک کیا گیا۔ اس کی بستی (ککھ یا KAKH) کی آبادی کافی بڑھ گئی اور اب اسے بہاول پور کہا جاتا ہے۔ یہ بہاول پور کے بارے میں کوئی تحقیقی مضمون نہیں ہے مگر میں جس تاریخی شہر میں شفٹ ہوا تھا اس کے ماضی کے باطن میں اتر کر سرسری طور پر دیکھنا بھی تو ضروری ہے۔ بہر حال یہ طے ہے کہ کوٹ سبزل سے چشتیاں تک دریائے سندھ اور ستلج کے بائیں کناروں اور چولستان کے درمیان داؤد پوتروں المعروف داد پوتروں کی بیسیوں گوتیں شہر بسا کر آباد ہوئیں۔ سب سے زیادہ مشکل وقت چوتھے نواب بہاول خان دوم نے گزارا۔ اس نے گویا اپنی جاگیر یا مقبوضات کی بقا کی بہت مشکل جنگ لڑی اور 1802 میں اپنے زیر تصرف علاقے کا نام "ریاست بہاول پور" رکھا اور ٹکسال بھی قائم کی۔ 1748 کے بعد چند سال تک لوگوں نے یہاں آباد ہونے میں دلچسپی نہیں لی اس لیے یہ شہر بہت جلدی آباد نا ہو سکا۔ اگلے پچاس سال کے بعد انگریز سیاحوں کے سفر ناموں یا رپورٹس (1808) میں یہ ایک بسا ہوا شہر نظر آتا ہے جس

کے گرد دیوار ہے اور یہ باغات سے گھرا ہوا ہے مگر 1827 کے دوران ایک انگریز مسافر کو اس کی دیوار جگہ جگہ سے گری ہوئی نظر آتی ہے جس کو اس کے باسیوں نے گزرگاہ بنا رکھا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ فروری 1833 اور بعد کے ترمیمی معاہدات کی وجہ سے ریاست بہاول پور کو نوابی ریاست (Princely State) تسلیم کر لیا گیا جس سے اسے خاصا استحکام ملا مگر آئندہ نصف صدی کے قریب خاندانی آویزشوں، محلاتی سازشوں کے ساتھ ساتھ روائتی انداز میں کاروبار ریاست چلتا رہا۔ یہ جو ہم آج بہاول پور شہر اور ڈویژن کے شہروں کا موجودہ انفرا سٹرکچر دیکھ رہے ہیں یہ تین مرحلوں میں حاصل ہوا ہے۔ پہلا دور 1866 سے 1924 تک، دوسرا دور 1955 تک اور تیسرا دور ون یونٹ سے اب تک کا ہے۔ 1866 میں ریجنسیوں کا دور شروع ہوا جو 1924 تک جاری رہا۔ ریجنسی کونسل میں گو اکثریت مقامی زعما کی ہوتی مگر دماغ اور منصوبہ بندی نواب کے نام پر انگریزوں کی چلتی۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اگر انگریز نہ ہوتے یا ان کی حمایت اور نگرانی نہ ہوتی تو بہاول پور کی یہ ترقی یافتہ صورت ہرگز نہ ہوتی۔ 16 اگست 1866 کو ریاست کے انتظام کے لیے برٹش کونسل آف ریجنسی قائم کی گئی۔ مسٹر ڈبلیو فورڈ کے بعد کرنل منچن کو ریاست کا سپرینڈنٹ مقرر کیا گیا۔ ریجنسی کے دور یعنی 1866 تا 1879 کے درمیان ریاست میں برطانوی طرز کے ادارے بنائے گئے جن میں عدلیہ، فوج، تعلیم، مال، پولیس، تعمیرات، انہار، جنگلات، صحت، بلدیات، اطلاعات، سروے اور خزانہ کے محکموں کی بنیاد ڈالی گئی۔ 1866 میں "صادق الانوار" کے نام سے پریس قائم ہوا۔ سرکاری گزٹ "صادق الاخبار" کا 1869 میں اجرا ہوا۔ 10 اگست 1872 میں نور محل اور صادق گڑھ محلات تعمیر ہو رہے تھے، 1877 میں کونسل آف ریجینسی کی تشکیل نو کی گئی۔

28 نومبر 1879 کو صادق محمد خان رابع نے باقاعدہ اقتدار سنبھالا تو ریجنسی کا اختتام ہوا۔ انگریزوں نے ان کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی تھی جس کے باعث ان میں آرٹ اور علم کو فروغ دینے کا شوق پیدا ہوا۔ اس کے عہد میں کاریگر اور اہل علم دور دراز علاقوں سے آئے۔ مشائخ، ادبا اور شعرا سے انہیں لگاؤ تھا۔ 1880 میں خواجہ غلام فرید سے بیعت کی۔ 1882 میں صادق اپر سکول اور 1886 میں ایس ای کالج قائم ہوئے۔ 14 فروری 1899 میں 37 سال کی عمر میں رحلت کی اور دراوڑ کے شاہی قبرستان میں دفن ہوئے۔ اس وقت ان کے بڑے صاحبزادے محمد مبارک خان کی عمر ساڑھے بارہ سال تھی اس لیے ایک بار پھر ریاست بہاول پور کی دیکھ بھال کے لیے کونسل آف ریجنسی قائم کی گئی جو 14 فروری 1899 سے 1903 تک قائم رہی۔ کم عمر نواب نے 1897 میں ایچیسن کالج لاہور میں داخلہ لیا اور 1901 میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد انہیں امور حکومت کی تربیت دی گئی۔ 12 نومبر 1903 میں لارڈ کرزن وائسرائے ہند بہاول پور آئے اور ایک دربار میں اختیارات ان کے سپرد کیے۔ بہاول خاں پنجم کے مختصر ترین دور میں ریاست نے بہت ترقی کی۔ گلزار محل، فرخ محل، مبارک محل اور نشاط محل۔ یتیم خانہ، پولیس ٹریننگ سینٹر، بہاول کلب اور پیپلز

بینک تعمیر کروائے۔ 1906 میں بی وی ہسپتال کا سنگ بنیاد رکھا۔ اسی سال حج پر گئے تو واپسی پر 15 فروری 1907 کو عدن میں انتقال کر گئے۔ 23 فروری 1907 کو شاہی قبرستان دراوڑ میں دفن ہوئے تو ان کے جانشین صادق محمد خاں کی عمر صرف اڑھائی برس تھی لہٰذا ریاست کے انتظام کے لیے پھر کونسل آف ریجنسی قائم کی گئی۔ اس میں انگریزی اور مقامی امرا شامل تھے۔ کم سن نواب کی ولادت 30 ستمبر 1904 کو ہوئی تھی۔ 13 دسمبر 1910 میں تعلیم کا آغاز کیا۔ 1912 سے 1915 تک انگلستان میں رہے۔ اسی سال ایچیسن کالج میں داخل ہوئے۔ 1921 میں تعلیم مکمل کی۔ گورنر جنرل برطانوی حکومت ہند نے 8 مارچ 1924 کو ریاست بہاول پور کے مکمل اختیارات نواب صادق محمد خان خامس کے سپرد کیے جنہوں نے ریاست بہاول پور کی تعمیر وترقی میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ ستلج ویلی پروجیکٹ نے ریاست کی تقدیر بدل دی۔ مواصلات کے نظام کو ترقی دی۔ آبادکاری میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ نئے منڈی شہر بسائے گئے۔ سینٹرل لائبریری کا قیام عمل میں آیا۔ جامعہ الاظہر کی طرز پر جامعہ عباسیہ، سمہ سٹہ تا بہاول نگر اور قتل العمارہ تا بہاول نگر براستہ یزمان، فورٹ عباس تا ڈونگا بونگا ریلوے لائن، پختہ سڑکوں کی تعمیر، چڑیا گھر، ریاست کا نیم جمہوری سیاسی ڈھانچہ، جامع مسجد الصادق، ڈرنگ اسٹیڈیم، ایمپرس برج ستلج اور ریاست کے اہم شہروں کی ٹاؤن پلاننگ ان کے دور کی اہم خصوصیات ہیں۔ اس حوالے سے انہیں جدید بہاول پور کا بانی کہا جاتا ہے۔ مملکت پاکستان کے قیام کے بعد ریاست بہاول پور کا پاکستان سے الحاق کیا اور 13 اکتوبر 1947 کو ریاست پاکستان سے الحاق کا معاہدہ ہو گیا۔ ریاست کا علیحدہ وجود برقرار تھا۔ الحاق کے بعد اور پچاس کی دہائی میں جدید بہاول پور کی تعمیر کا آغاز ہو گیا۔ 1955 میں بہاول پور کو کمشنری کا درجہ دے کر مغربی پاکستان میں ضم کر دیا گیا۔ پہلے کمشنر ہاشم رضا مقرر ہوئے۔ 28 مارچ 1970 کو ڈویژن بہاول پور کو صوبہ پنجاب کا حصہ قرار دے دیا گیا۔ اس ڈویژن میں بہاول پور، رحیم یار خان اور بہاولنگر کے اضلاع شامل تھے۔۔ اس وقت بہاول پور جدید دور کی تمام سہولتوں اور وسائل کا حامل شہر ہے جہاں یونیورسٹی، میڈیکل کالج، ہائی کورٹ بہاول پور بنچ، چڑیا گھر، میوزیم، سینٹرل جیل، سینٹرل لائبریری اور تمام سطحوں کے تعلیمی ادارے، جدید بزنس سینٹر، جدید مواصلاتی نیٹ ورک، ہوائی اڈا، کور ہیڈکوارٹر، ریڈیو سٹیشن، قومی ٹی وی کی نشریات کی دستیابی اور جدید طرز کی رہائشی کالونیاں موجود ہیں۔ بہاول پور سے ملحقہ چولستان اس کی جغرافیائی تشکیل کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ چولستان ڈیویلپمنٹ اتھارٹی کے ذریعے یہاں پانی کی فراہمی اور زمینوں کی الاٹمنٹ کی متعدد سکیمیں مکمل کی گئی ہیں۔

1994 میں جب میں یہاں منتقل ہوا تو 1748 میں "جھوک سوڈھا" بہاول پور کا چولا بدل کر تقریباً اڑھائی صدیوں کے طویل ارتقائی عمل کے بعد ایک جدید شہر کی صورت اختیار کر چکا تھا کہ جس کی جڑیں تاریخ میں بہت گہری تھیں۔ میں جب یہاں آیا تھا تو خود کو بہت تازہ دم محسوس کر رہا تھا کیوں کہ رحیم یار خان کے (اصول اضافیت کی بنیاد پر) منجمد ماحول اور مسلسل یکسانیت کے باعث در آنے والی اکتاہٹ سے نجات ملی

تھی اور سب سے بڑھ کر بہاول پور میں مستقل آنے کا خواب پورا ہو چکا تھا۔ جیسا کہ میں نے اوپر گفتگو کے دوران کہا ہے کہ بہاول پور تاریخ میں پیوست ایک قدیم شہر کا ماڈل دکھائی دیتا ہے اور بہت سی مشترک خصوصیات کے باعث لاہور اور ملتان کے بعد پنجاب کا تیسرا بڑا تاریخی شہر ہے کہ جو قدیم دروازوں کے اندر موجود ہے۔ 1994 میں بیکانیری (موجودہ فرید) گیٹ اور احمد پوری گیٹ دروازوں کی صورت میں موجود تھے۔ فتح خاں، گری گنج اور مچھلی بازاروں کا جہاں آغاز ہوتا ہے وہاں دروازے تو موجود نہیں تھے مگر بالترتیب دراوڑی، شکار پوری اور ملتانی دروازوں کے نام سے معروف تھے۔ سیاستدان بلیغ الرحمان کے گھر کے ساتھ بائیں جانب مختلف محلّوں کی طرف جانے والی سڑک کے آغاز میں کبھی بوہڑ دروازہ تھا جب کہ میونسپل کارپوریشن کے سامنے محلّہ نواباں کو جانے والی سڑک کے آغاز پر "موری دروازہ" موجود تھا مگر ان کے نام صرف تاریخ میں رہ گئے تھے۔ اسی طرح پرانے شہروں کی طرح ان دروازوں کے اندر محلّوں کے نام بھی قدیم تھے مثلاً محلّہ بھا کھڑیاں، مبارک پورہ، کجل پورہ، میانی، کھتیکاں، ٹونکی، محلّہ عام خاص، ملانوالا، محلّہ نواباں، محلّہ قریشیاں، محلّہ ٹاہلی والا، کوچہ خزانچی، دال والی گلی، محلّہ میر سراج الدین، محلّہ حکیم بخش، شیر باغ، محلّہ ونگڑی گراں، مچھلی ہٹا، محلّہ گنج شریف، محلّہ باغ ماہی، محلّہ چڑی مار، محلّہ کرنل مقبول قریشی، محلّہ بگھی خانہ۔ محلّہ سادات، محلّہ مخدوم پورہ۔ کوچہ گل حسن، سعدی محلّہ وغیرہ۔ فرید گیٹ سے شروع ہونے والا شاہی بازار (ماضی کا بھابڑہ بازار)، دراوڑی دروازے اور ملتانی دروازے سے شروع ہونیوالے فتح خاں اور مچھلی بازار کا نکتہ اتصال چوک بازار تھا جو چوک بھی تھا اور بازار بھی۔ چوک بازار جامعہ مسجد کو چھوتا ہوا شہزادی چوک میں شکار پور گیٹ سے آنے والے گری گنج بازار اور احمد پوری گیٹ سے آنے والے بازار کو ملاتا تھا۔ انہی بازاروں اور دروازوں کے اندر محلّوں کی صورت میں پرانا شہر آباد تھا۔ موجودہ سرکلر روڈ تو اس کی توسیعی صورت ہے۔ سرکلر روڈ کی دکانوں کے پیچھے تمام پرانے شہر کے گرد ایک سڑک ایک دائرہ مکمل کرتی تھی جسے بند روڈ کا نام دیا جاتا تھا اور اب بھی موجود ہے۔

منتقلی کے بعد پہلا مرحلہ شہر کی مختلف آبادیوں، سڑکوں، بازاروں، گلیوں اور آنے جانے والے راستوں اور مارکیٹوں کی سمتوں سے آگاہ ہونے کے لیے ان کا جائزہ لینا تھا تاکہ آنے جانے اور روزمرہ کی اشیا کی دستیابی میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ آسانی کے لیے ہم ریلوے سٹیشن کو نکتہ آغاز کے طور پر لے لیتے ہیں۔ پہلے میں یہ بات واضح کر دوں کہ سارے شہر میں فی الحال کوئی سڑک دورویہ نہیں تھی۔ سٹیشن کی طرف سے ریلوے روڈ سے آغاز کریں تو فوری بعد ایک سڑک بائیں طرف شاہدرہ کو جاتی ہے اور ماڈل ٹاؤن سی موڑ پر اور ماڈل ٹاؤن بی کی طرف سے آنے والی سڑک سے مل کر جنرل بس سٹینڈ کی طرف چلی جاتی ہے۔ تھوڑا آگے بڑھیں تو بائیں جانب سے ماڈل ٹاؤن بی اور انڈسٹریل ایریا کی طرف سے آنے والی سڑک ریلوے روڈ پر ختم اور اس کے برابر دائیں جانب گلبرگ روڈ ماڈل ٹاؤن اے اور چیمہ ٹاؤن و محکمہ زراعت کے کے وسیع تر علاقے

کے درمیان ہوتی ہوئی احمد پور روڈ میں ضم ہو جاتی ہے۔ ریلوے روڈ پر اگلا اہم پوائنٹ ویلکم چوک ہے جہاں دائیں جانب ماڈل ٹاؤن اے کو سڑک جاتی ہے جب کہ بائیں جانب ایک سڑک ماڈل ٹاؤن بی کا سینہ چیرتے ہوئے ملتان روڈ سے جا ملتی ہے۔ تھوڑا آگے دائیں جانب عباسیہ سکول اور اس سے آگے دائیں جانب ہی اسلامیہ یونیورسٹی کا ریلوے کیمپس اور اس کے پہلو میں سکولز ڈائریکٹوریٹ کی عمارتیں تھیں۔ اس سے پہلے ریلوے روڈ پر صرف دائیں طرف ایک ریستوران ہے یا گاڑیوں کے چند شوروم یا پھر ویلکم چوک پر چند دکانوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی مارکیٹ ہے۔ سینما چوک البتہ بارونق علاقہ ہے جہاں دائیں جانب کنٹونمنٹ مارکیٹ کی چند دکانیں ہیں۔ عباسیہ اور رینبو کے نام سے دو سینما گھر ہیں یا سیدھے ہاتھ کے کونے میں ایک پیٹرول پمپ ہے۔ ایک سڑک ماڈل ٹاون اے کے بنک چوک کو جاتی ہے جب کہ بائیں جانب کی سڑک جہاں مکینکوں کی دکانیں ہیں شکار پوری گیٹ اور گری گنج بازار چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد ریلوے روڈ کی بائیں جانب مرکزی عیدگاہ اور دائیں جانب بہاول پور آرٹس کونسل کا دفتر ہے اور بس۔ آگے ایک چھوٹے سے چوک میں ملتان روڈ دائیں سے بائیں جوانب قطع کرتی ہے۔ سرکٹ ہاؤس کے قریب سے شروع ہونے والی ملتان روڈ اس چوک سے ہوتی ہوئی ملتانی گیٹ کے قریب سے گزر کر سیدھی جنرل بس سٹینڈ چلی جاتی ہے۔ اس چوک کے بعد ریلوے روڈ ختم ہو کر سرکلر روڈ کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس پر آگے فوارہ چوک آتا ہے جسے بہاول پور شہر کی مرکزی جگہ یا سنٹر پوائنٹ کہنا چاہیے۔ اس چوک کے کے دائیں جانب احمد پور روڈ کا آغاز ہوتا ہے۔ دائیں طرف کی نکڑ پر مرکزی جنازہ گاہ ہے اور وہاں پر موجود کونے کے دونوں اطراف میں اوقاف کی چھوٹی سی مارکیٹ ہے۔ بائیں جانب احمد پوری گیٹ ہے جس کا بازار چوک شہزادی پر گری گنج اور چوک بازاروں سے جا ملتا ہے۔ دوسری سائیڈ کے دائیں کونے پر سڑک چھاؤنی، نور محل اور محمدی کالونی کو جاتی ہے۔ اس کے آغاز پر ہی لاہور ہائی کورٹ کا بہاول پور بنچ واقع ہے۔ دائیں جانب میڈیکل کالج کے پہلے گیٹ تک جب کہ بائیں جانب فرید گیٹ تک کا علاقہ سست رفتاری سے ایک ٹریڈ سنٹر میں منتقل ہوتا جا رہا ہے۔ فرید گیٹ میں پرانا شہر بستا ہے۔ سیدھی طرف پریس کلب، ڈرنگ سٹیڈیم، چڑیا گھر اور ریڈیو سٹیشن سے ہوتی ہوئی جنرل بس سٹینڈ سے جا ملتی ہے جب کہ دائیں جانب ضلع کچہری، ڈی آئی جی چوک، صدر پلی، ون یونٹ چوک، یونیورسٹی کے بغداد کیمپس سے ہوتی ہوئی سیدھی حاصل پور چلی جاتی ہے۔ احمد پور روڈ پر ذخیرے کے آغاز کو کراچی موڑ کہا جاتا ہے۔ اس سڑک پر بھٹہ نمبر ایک اور دو کی آبادیاں ہیں۔ دائیں جانب ماڈل ٹاؤن اے اور بائیں جانب سرکٹ ہاؤس اور دو بئی محل جب کہ چند کار مکینکوں کی ورکشاپس اور یا پھر صادق پبلک سکول اور این ایل سی کا اڈا تھے۔ یہ سارا منظر تیس سال پہلے کا ہے۔

بہاول پور کی پہلی رہائشی کالونی ماڈل ٹاون اے ریاست کی ایلیٹ کلاس کے لیے تھی جس میں ہر گھر ایکڑوں پر مشتمل تھا۔ 1980 کے بعد یہاں کے مکینوں نے گھروں کی پچھلی جانب کا ایریا بیچنا شروع کر دیا۔

1994 میں ان گھروں کے پیچھے مکانوں کی تعمیر سے گلیاں وجود میں آ چکی تھیں اور یہ کام جاری تھا۔ یہ جان کر بہت تعجب ہوا کہ ایلیٹ کلاس کی اس کالونی میں سیوریج کی سہولت مہیا نہیں تھی۔ سینما چوک سے ریلوے روڈ اور شکار پوری گیٹ کی جانب جانے والی سڑک کے درمیان ماڈل ٹاؤن بی کی سڑک شروع ہوتی ہے جس کے دونوں اطراف میں یہ رہائشی کالونی واقع ہے جو سرکاری ملازمین کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کالونی کے مکینوں نے خاصا عرصہ قبل اپنے گھروں کے سامنے پکی اینٹوں یا الیرکی باڑوں سے درمیانی سڑک تک تجاوزات قائم کر لیے تھے۔ اب ان کا خاتمہ ہو چکا تھا اور گھروں کی درمیانی سڑکیں اتنی کشادہ ہو چکی تھیں کہ کالونی پہچانی نہیں جاتی تھی۔ غلہ منڈی بھی اس کالونی کی ایک سائیڈ پر واقع تھی۔ جہاں ماڈل ٹاون بی کی آبادی ختم ہوتی تھی وہیں سے 1985 میں وجود میں آنے والی نئی رہائشی کالونی ماڈل ٹاون سی ستر فیصد تک آباد ہو چکی تھی۔ اس کالونی کے آخری بلاک کے فوری بعد شہر بھر کے گندے پانی کا ڈسپوزل سسٹم تھا۔ دوسری جانب ون یونٹ کالونی چوک سے شروع ہونے والی رفیع قمر روڈ کے بائیں جانب خالی جگہ پر مسلم ٹاؤن نے مکانوں کی صورت اگنا شروع کر دیا تھا جب کہ اس کے دائیں جانب سیٹلائٹ ٹاؤن نا صرف مکمل ہو چکا تھا بل کہ یہ توسیعی سکیموں کی حد تک پھیل چکا تھا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں 1979 کے دوران ابھی چند گھر ہی بنے تھے اور ایک نامکمل گھر میں مہمان کی حیثیت سے قیام کیا تھا۔ 1980 کی بات ہے جب میں خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان میں تھا تو معلوم ہوا کہ بہاول پور میں حاصل پور روڈ پر پنجاب ایمپلائیز کواپریٹو ہاوسنگ سوسائٹی کا آغاز ہوا تھا اور میں نے چند سینئر اساتذہ کو بڑی گرم جوشی سے اس کی رکنیت کے فارم پر کرتے دیکھا۔ 1994 میں یعنی پندرہ سال بعد بھی وہاں سوائے ترقیاتی کاموں کے ایک مکان بھی نہیں بن سکا تھا جب کہ اس کے بالکل سامنے ریلوے لائن کے کے پار ٹیلوں پر اسلامیہ یونیورسٹی کے بغداد الجدید کیمپس میں تین فیکلٹیز کی عمارتیں، اساتذہ کے لیے رہائشی کالونی اور تین طلبا و طالبات کے ہوسٹل اس سوسائٹی کی ویرانی پر قہقہے لگا رہے تھے۔ ریلوے روڈ، سرکلر روڈ اور فرید گیٹ کے بعد حاصل پور روڈ بغداد کیمپس تک ابھی دو رویہ نہیں تھی بل کہ دونوں اطراف سے درختوں سے گھری ہوئی سڑک تھی۔ سرکلر روڈ کے حصے میں درخت قدرے کم تھے۔ ابھی بہاول پور آئے ایک ماہ کا عرصہ ہوا تھا کہ ایک رات دو گھنٹے کی شدید بارش ہوئی اور بجلی بند ہو گئی۔ میں موٹر سائیکل پر فوارہ چوک میں واقع ایک پیٹرول پمپ سے جنریٹر کے لیے پیٹرول لینے آیا تو دیکھا کہ فوارہ چوک پانی کی جھیل میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میں نے پانی کی گہرائی کا غلط اندازہ لگایا اور موٹر سائیکل پانی میں ڈال دیا۔ عین وسط میں موٹر سائیکل بند ہو گیا اور پنکچر بھی۔ میں نے پانی سے پیدل موٹر سائیکل نکالا اور پیٹرول پمپ تک آیا جہاں سے پنکچر بھی لگوایا اور ٹینکی بھی فل کرائی اور کسی دوسرے راستے سے واپس گھر آیا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ یاد ہے کہ شہر میں بارش بہت ہو چکی تھی اور ایک مہمان کو رحیم یار خان کی کوسٹر پر سوار کرانا تھا۔ پچھلے تجربے کی روشنی میں ملتان روڈ کے آغاز پر موٹر سائیکل کھڑا کیا اور مہمان کو انتظار کرنے کو کہا۔ ایک موٹر رکشا لیا اور فوارہ چوک کا سمندر عبور کرنے

کے بعد رحیم یار خان جانے والی کوسٹر کی ایک سیٹ ریز رو کرا کے اسی رکشے پر واپس آیا اور خاصی دیر کے بعد آنے والی کوسٹر پر مہمان کو رخصت کیا۔ رحیم یار خان کی طرح بہاول پور کا زیر زمین پانی پینے کے قابل نہیں تھا حالانکہ یہ دریا سے تین چار کلو میٹر ہی دور ہے لیکن دریائے ستلج تو طویل عرصے سے خود پیاسا ہے۔ بہر حال سارا شہر پینے کے لیے ہیلتھ انجینئر نگ کا مہیا کردہ پانی ہی استعمال کرتا تھا۔

یہاں آنے کے دو تین ماہ بعد میں جان گیا کہ کونسے بازار سے کونسی چیز ملتی ہے۔ کالج جانے کے لیے معمول کا روٹ ماڈل ٹاؤن بی، سینما چوک، فوارہ چوک، فرید گیٹ، صدر پلی سے ون یونٹ چوک جہاں کالج واقع تھا۔ کئی دفعہ لائبریری چوک سے دائیں مڑ کر کالی پلی سے صدر پلی کا راستہ بھی اختیار کرتا۔ واپسی پر بھی یہی روٹ ہوتا البتہ کبھی کبھار فرید گیٹ سے شاہی بازار داخل ہوتا اور شیخ ریاض کی اخبارات و رسائل اور جنرل کتب کی دکان کیپیٹل نیوز ایجنسی پر توقف کرتا اور نئے رسائل و کتب پر سرسری نظر ڈالتا اور پسند آنے والے جریدے یا کتاب کو رعایت پر خرید لیتا۔ پھر چوک بازار براستہ گری گنج بازار و سینما چوک اور ماڈل ٹاؤن بی کے راستے واپس گھر آ جاتا۔ یہ روٹین اس وقت ختم ہوئی جب دکان وہاں سے شفٹ ہوئی۔ سینما چوک کی کنٹونمنٹ مارکیٹ میں واقع کارواں بک سنٹر بھی دلچسپی کا مرکز ہوتا۔ اسی دکان پر 1994 کے اواخر میں میری ملاقات جناب منور جمیل سے ہوئی تھی جو بعد میں دوستی کی بنیاد بنی۔ اسی طرح اسلامیہ یونیورسٹی کے ریلوے روڈ کیمپس بھی چلا جاتا جہاں اوپر شعبہ فارسی تھا اور اس کے ساتھ شعبہ سرائیکی۔ انہی دنوں کی بات ہے جب سرائیکی ادبی مجلس کا دفتر سینما چوک کے ساتھ واقع تھا اور سینما چوک کو سرائیکی چوک کا نام دیا گیا جو بہت جلد زبان زد خاص و عام ہو گیا۔ شعبہ سرائیکی میں ریاض حسین سندھڑ، سید صفدر حسین اور جاوید حسان چانڈیو سے ملاقات ہو جاتی۔ نیچے شعبہ لائبریری سائنس میں صدر شعبہ ڈاکٹر فاضل خان سے بھی مل لیتا۔ ان کے پی اے مسٹر چشتی بہت زندہ دل اور ہنس مکھ تھے ان سے ملاقات رہی۔ شعبہ فارسی میں ہو کا عالم طاری رہتا، وہاں بھی کبھی کبھار مختصر سا ایک آدھ چکر لگا لیتا۔ اب آتے ہیں شعبہ ایجوکیشن اور آرٹس فیکلٹی کے ایک بڑے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جو اپنی علمی، تحقیقی اور ثقافتی سرگرمیوں اور طلبا و طالبات کی بھرپور تعداد کے لحاظ سے یونیورسٹی بھر میں معروف تھا۔ اس شعبہ نے کسی موضوع پر تین روزہ ورکشاپ کا انعقاد کیا۔ پہلے دن کے اختتام پر شرکا کے سٹڈی گروپ بنائے گئے اور ہر گروپ کا ایک لیڈر تھا۔ گروپس کو موضوع اور کمرے الاٹ ہو گئے جہاں بحث و مباحثہ کے بعد نتائج اخذ کیے گئے۔ اور اگلے دن گروپ لیڈرز نے وہ نتائج اور سفارشات اختتامی اجلاس میں پیش کرنے تھے۔ ہمارے گروپ کے لیڈر اس وقت کے ڈائریکٹر ایجوکیشن (کالجز) ڈاکٹر محمد اشرف تھے (بعد میں گورنمنٹ کالج ساہیوال کے پرنسپل بنے)۔ اسی ورکشاپ میں صدر شعبہ ڈاکٹر اسلم ادیب سے متواتر ملاقاتیں رہیں۔ پنجاب یونیورسٹی میں جو میرا سیشن تھا، ان کا زکریا یونیورسٹی میں وہی سیشن تھا۔ شعبہ اردو کے سربراہ ڈاکٹر شفیق احمد بھی پنجاب یونیورسٹی میں سیشن فیلو تھے تو ایک بار یہ دونوں حضرات گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بس

میں ملتان آ رہے تھے جب کہ میں اسی بس میں ساہیوال کے لیے سوار ہوا تو ہم تینوں ہم نشست تھے۔ خوب گپ شپ رہی۔ ان سے ایک ملاقات سیٹلائیٹ ٹاؤن والے گھر میں ہمایوں کبیر کے ساتھ ہو چکی تھی۔ معلوم نہیں وہ کونسے عوامل تھے کہ ڈاکٹر اسلم ادیب کے ساتھ ورک شاپ کے دوران دو تین ملاقاتیں دوستی کے تعلق میں بدل گئیں لہٰذا میں کبھی کبھار خود یا کسی مشترکہ دوست کے ساتھ ان سے شعبہ ایجوکیشن بھی جانے لگ گیا۔ اولڈ کیمپس میں شعبہ قانون کے سربراہ نعیم بٹ سے ملاقات تھی جب کہ کنٹرولر امتحانات جناب محمد شفیق سے پرانی واقفیت تھی۔ یونیورسٹی کے انتظامی سٹاف میں بھی چند جاننے والے تھے۔ نیو کیمپس میں پرانے دوست ڈاکٹر شاہد رضوی اور سیاسیات کے خواجہ محمد علقمہ، شعبہ اردو میں محمد سلیم ملک اور میاں محمد مشتاق سے ملاقات ہونے لگی۔ شعبہ اردو کے سربراہ ڈاکٹر شفیق احمد سیشن فیلو تھے جب میں فائنل میں تھا تو عربی کے جناب سلیم طارق ایم اے عربی کے سال اول کے طالب علم تھے۔ ان دونوں اصحاب سے اگرچہ اخلاقی سطح پر بہت بہتر تعلق تھا مگر ڈاکٹر اسلم ادیب سے تعلق کی وجہ سے انہوں نے مجھے ان کے ساتھ بریکٹ کر دیا۔ یونیورسٹی کی سیاست کے اپنے اسرورموز ہوتے ہیں جو مجھ پر آہستہ آہستہ وا ہوئے۔

جہاں تک کالجز کا تعلق ہے تو دونوں کالجز میں بہاول پور میں منتقلی سے پہلے ہی سے متعدد دوست موجود تھے۔ پرنسپل پروفیسر خضر اقبال سے بہت اچھا تعلق بن گیا۔ سید لئیق انور زیدی (اردو)، راؤ انعام الحق (انگلش)، جام منیر احمد (کیمسٹری)، امتیاز سلیم لودھی (اردو)، محمد ارشد چودھری (انگلش)، محمد بخش آسی (اسلامیات)، قاضی رؤف احمد (ریاضی)، خالد اقبال رضا (اسلامیات)، منظور احمد شاد (سوکس) اور سب سے بڑھ کر ہمایوں کبیر چودھری ان دوستوں میں شامل تھے۔ ایس ای کالج میں محمد معید خاں (نفسیات)، علامہ محمد طاہر (تاریخ)، اصغر علی روحیل (سوشیالوجی)، رانا محمد صدیق (کیمسٹری)، سعید احمد بھٹی (انگلش)، نذیر احمد بھٹی (ریاضی)، اسحاق رضوی (بیالوجی)، نواز کاوش، سید زوار حسین شاہ اور عبدالباسط نظامی (اردو)۔ ان میں کچھ تو رحیم یار خان اور خان پور کے کالجوں میں رفیق کار بھی رہ چکے تھے یا پھر پہلے سے ذاتی مراسم تھے۔ ہمایوں کبیر نے میرے ایک فون پر بہت دلچسپی سے یہاں میرے تبادلے کے آرڈر کرائے تھے۔ جب میں بہاول پور کی معاشرتی زندگی کا حصہ بنا تو یونیورسٹی، کالجز کے علاوہ دیگر شعبوں کے لوگوں سے خوب آشنائی ہوئی۔ 1994 بیچ کے ڈائریکٹ سلیکشن میں ہمایوں کبیر ایسوسی ایٹ پروفیسر ہوئے تو ان کی تقرری 1995 کے اواخر میں بطور پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج لیاقت پور ہوئی۔ جس دن انہوں نے وہاں جوائن کرنا تھا خضر اقبال ملک، لئیق انور زیدی، امتیاز سلیم لودھی اور میں ان کے ہمراہ گئے۔ اس نئی تقرری کے بعد ان سے ملاقات کبھی کبھار ہی ہونے لگی۔ ایک دن اچانک وہ کالج آئے تو ان کے ہاتھ میں گورنمنٹ انٹر کالج کی اپگریڈیشن بطور ڈگری کالج اور پرنسپل کی اپ گریڈڈ سیٹ پر ان کی تقرری کے آرڈر تھے گویا وہ بحیثیت پرنسپل جوائن کرنے آئے تھے۔ تمام لوگ دنگ رہ گئے کیوں کہ یہ سب کے لیے حیران کن تھا۔ بہرحال انہیں

مبارک باد دی گئی۔سب سے زیادہ گرمجوشی پہلے سے موجود پرنسپل ملک خضر اقبال نے دکھائی۔فوراً کرسی سے اٹھے اور نئے پرنسپل کو بٹھا دیا۔فوری طور پر ایک استقبالیہ ترتیب دیا جس میں موجود تمام سٹاف ممبران نے شرکت کی۔ضروری دستاویز پر دستخط کر کے چارج منتقل ہوا۔یہ شاید 29 ستمبر 1996 کا دن تھا۔اسے "حسن اتفاق" ہی کہنا چاہیے کہ اسلامیہ یونیورسٹی میں میرے ڈیپوٹیشن کے احکام موصول ہو چکے تھے اور اگلے روز ہی مجھے کالج سے فراغت نامہ درکار تھا۔ نئے پرنسپل نے مجھے فراغت نامے کے خالی پروفارمے پر دستخط کر کے دے دیے اور کہا کہ جب ضرورت ہو ڈسپیچ نمبر فون پر آفس سے لے لینا۔دراصل ہمایوں کبیر سے میرا تعلق اتنا پرانا، قریبی اور اس قدر بے جھجک (Frank) تھا کہ ہم ایک دوسرے کو "آپ" نہیں کہہ سکتے تھے۔ان دنوں ان کے گھر میں ان کی ''اس وقت تک'' کی چھوٹی بیٹی کی پیدائش کے فوری بعد علالت کی پریشانی چل رہی تھی۔ میں اسی شام مع فیملی ان کی بیٹی کی عیادت کے لیے ان کے گھر گیا۔میں نے باتوں ہی باتوں میں انہیں بحیثیت ایک دوست چند مشورے دیے کہ بطور پرنسپل اپنا رویہ دوستانہ اور مہربانی کا رکھنا۔انہوں نے میری بات کاٹی اور کہا کہ چھوڑو یار کوئی اور بات کرو۔ان کے یہ تیور دیکھ کر میرے لیے مستقبل میں ان کے انتظامی اسلوب اور اس کے اثرات ونتائج کا اندازہ لگانا مشکل نہ رہا۔

میں ڈیپوٹیشن پر یونیورسٹی آ گیا اور کالج سے رابطہ بھی کمزور پڑ گیا تاہم وقتاً فوقتاً دوستوں سے ملاقات ہوتی رہی۔اس دوران ہمایوں کبیر سے دو چار ملاقاتیں ہی ہوسکیں۔دو ایک بار بورڈ جاتے آتے وہ مجھے یونیورسٹی ملنے آئے۔ایک روز میں زنانہ ہسپتال روڈ پر جا رہا تھا کہ ملک خضر اقبال سے ملاقات ہوگئی۔سلام دعا کے بعد انہوں نے ہمایوں کبیر کے حوالے سے شکوؤں کو ایک سانس میں بیان کر دیا۔تب مجھے معلوم ہوا کہ شاید سب اچھا نہیں ہے۔اس سے اگلے سال جولائی کے آخری ہفتے کی ایک گرم رات تھی۔اسی روز میں اسلام آباد سے مرکز تحقیقات ایران و پاکستان کے زیر اہتمام منعقدہ تین ہفتے کے ایک ریفریشر کورس سے لوٹا تھا اور جلد ہی سو گیا تھا۔رات گیارہ بجے کے قریب ہمایوں کبیر اور لئیق انور زیدی میرے ہاں تشریف لائے۔احوال پرسی کے بعد ہمایوں کبیر گویا ہوئے۔"تم تو یونیورسٹی جا کر بھول ہی گئے۔تمہاری اسسٹنٹ پروفیسر کی پوسٹ کو کسی دیگر مضمون میں تبدیل کرانے کے بہت سے حملے ہوئے جن کو میں نے ناکام بنا دیا مگر اتنی دیر کوئی سیٹ خالی بھی تو نہیں رکھی جا سکتی۔اب بات میرے بس سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔اُدھر سیکرٹیریٹ والوں نے آپ کی کالج سے فراغت رپورٹ بھی منگوالی ہے۔شاید وہ جاننا چاہتے ہیں کہ سیٹ خالی پڑی ہوئی ہے۔مجھے لگتا ہے کوئی اس سیٹ کے پیچھے لگا ہوا ہے۔تم کل ہی یونیورسٹی سے فراغت نامہ لے کر آؤ اور پرسوں لاہور چلتے ہیں اور تمہاری واپس پوسٹنگ کراتے ہیں۔تم نے واپس تو آنا ہی ہے اور اگر سیٹ ہی نہ رہی تو کہاں جاؤ گے۔ تمہاری ترقی کا کیس بھی جانے والا ہے اور جب تک ڈیپوٹیشن والا واپس نہیں آتا اس کی ترقی بھی نہیں ہوسکتی" ان کی باتوں نے مجھے قائل کر دیا اور ضروری کاروائی کے بعد میں نے کالج میں اپنی پوسٹ پر جوائن کر لیا۔ بعد

میں معلوم ہوا کہ میرا فراغت نامہ ڈیپوٹیشن کی شرائط کونوٹیفائی کرنے کیے لیے منگوایا گیا تھااور آڈٹ کی ہدایت کی وجہ سے کالج میگزین کا ایک شمارہ فوری طور پر شائع کرنا ضروری تھا اور ان کی رائے میں یہ فوری ذمہ داری میں ہی ادا کرسکتا تھا، باقی تمام کہانی کی بنت اسی مقصد کے لیے کی گئی تھی۔(یونیورسٹی میں ڈیپوٹیشن کے تفصیلی احوال پر مشتمل میری ایک تفصیلی تحریر الزبیر کے شمارہ 2 برائے سال 2023 میں شائع ہو چکی ہے اور شامل کتاب بھی ہے)

اب کی بار میں کالج آیا تو جناب قاضی رؤف ایس ای کالج جا چکے تھے اور میں پرنسپل کے بعد سینئر استاد تھا لہٰذا میں وائس پرنسپل قرار پایا اور ایک کمرے میں میرا آفس قائم ہوا۔ یہ آفس انگریزی حرف ایچ کے مماثل بنی ہوئی بلڈنگ کے درمیان دونوں بلاکس کو ملانے والے کوریڈور کے درمیان واقع تھا۔ کالج میں یہاں اب سٹاف کے حوالے سے مختلف منظر نامہ تھا۔ کچھ چہرے جا چکے تھے اور کچھ ان کی جگہ لے چکے تھے۔ ایک پرانے دوست سید اسرار حسین شاہ تعلیمی بورڈ بہاول پور میں ڈیپوٹیشن کی دو مدتوں سے کچھ زیادہ دن گزار کر اسی کالج میں جوائن کر چکے تھے۔ انگلش کے محمد طارق خان بھی جو محکمہ تعلیم میں ڈیپوٹیشن پر سیکشن آفیسر تھے، یہاں آ چکے تھے۔ میرا آفس ہر گزرنے والے کا گویا ایک پڑاؤ تھا۔ سٹاف روم میں کوئی نہیں بیٹھتا تھا۔ کمرہ نمبر 8 میں عرصے سے سیاسیات کے احمد حسن خان اور منظور احمد شاد نے چائے کی محفل سجائی ہوئی تھی۔ اب دوسری محفل میرے آفس میں سجنے لگی۔ خالی پیریڈ میں اکثر دوست آ جاتے۔ کالج کا اکیڈیمک شعبہ اور طلبا کے مسائل میرے پاس تھے۔ اس آفس میں چائے کے لیے عطیہ صرف ہم تین چار دوست ہی دیتے مگر چائے ہر ایک کو ملتی۔ پرنسپل نے ایک اٹینڈنٹ بھی دے دیا تھا۔ دنیا جہاں کے مسائل یہاں زیر بحث آتے تھے۔ خوب رونق رہتی۔ قہقہے اور لطائف کے علاوہ سنجیدہ مباحث بھی چلتے رہتے مگر علمی رویے اور باہمی عزت و احترام کے ساتھ۔ بہت سے دوستوں کے مسائل کا حل نکالا جاتا اور کئی ایک کو حسب ضرورت انگریزی ڈرافٹنگ کی سہولت بھی دی جاتی تھی۔ سید اسرار حسین کو انگریزی ڈرافٹنگ پر ملکہ حاصل تھا اور میں نے یہ ہنر انہی سے سیکھا۔ ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ یزمان روڈ پر واقع ایک گاؤں کے رہائشی اور لمبردار کالج میں فزکس کے استاد حاجی محمد ناصر کی بطور اسسٹنٹ پروفیسر ترقی ہوئی تو مدد کے طالب ہوئے۔ انہوں نے یہ بات کر کے حیران کر دیا کہ وہ کبھی لاہور نہیں گئے۔ ان دنوں ان کی زوجہ محترمہ شدید علیل تھیں اور ان کا مرض ناقابل علاج ہو چکا تھا۔ راشدہ ملک پنجاب کی سیکریٹری ایجوکیشن تھیں۔ میں نے ان کے لیے اسی کالج میں بعد از ترقی کے تقرری مع پوسٹ اپ گریڈیشن کی ایک درخواست تیار کی۔ لاہور کے لیے یہ بھی بتایا کہ وہ بس سے کہاں پر اتریں گے۔ رکشے پر سوار ہو کر سیکریٹریٹ جائیں گے۔ سیکریٹری کو براہ راست مل کر ان کو درخواست پیش کریں گے۔ مجھے تعجب ہوا جب وہ ایک دن کی رخصت کے بعد کالج آ گئے اور ان کے ہاتھ میں تقرری اور اپ گریڈیشن کے آرڈر تھے۔ میری حیرت کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ: "درخواست پڑھ کر وہ رونے ایسی

ہوگئیں اور اگلے ایک گھنٹے میں مطلوبہ آرڈرانہیں دیتے ہوئے کہنے لگیں۔ جناب میں آپ کی یہی خدمت کرسکتی تھی۔اللہ تعالی آپ کی بیوی پر اپنا کرم کرے" کسی نے یہ تک نہیں دیکھا کہ درخواست براہ راست تھی اور کسی چینل کے ذریعے بھی نہیں تھی۔اس کے بعد میں نے رکشا لیا اور بادامی باغ والے بس اڈے پر آیا، ایک نان اے سی بس تیار تھی لہٰذا رات گئے گھر پہنچ گیا۔" میرے دفتر میں تیار کردہ کسی درخواست یا کسی اور ذریعے سے کسی دوست کا کام ہوجاتا تو ون یونٹ چوک میں واقع آئیڈیل سویٹس کی برفی منگوائی جاتی۔انہی دنوں ہم نے انگریزی کے استاد راؤ انعام کی ایک چھیڑ بنالی کہ راؤ صاحب برفی کے تین چار ٹکڑے کھانے کے بعد کہتے ہیں، "میری چائے میں چینی نہیں ڈالنی کیوں کہ ڈاکٹر نے میٹھا کھانے سے منع کیا ہوا ہے۔"

ایک دن میں پرنسپل آفس داخل ہوا تو پرنسپل کی کرسی پر اس وقت کے ناظم تعلیمات (کالجز) بہاول پور ڈویژن ڈاکٹر عبدالمجید براجمان تھے۔سامنے پرنسپل اور دیگر اساتذہ ہمہ تن گوش تھے۔ وہ جس کالج میں بھی جاتے پرنسپل کی کرسی پر ہی بیٹھتے تھے۔ میں نے ایک جملہ کسا: " کیا پرنسپل کی سیٹ اپ گریڈ ہوگئی ہے"اس بات کا انہوں نے بہت برا منایا۔بس اسی طرح کالج میں تدریسی اور جزوی طور پر انتظامی سرگرمیاں جاری رہیں۔ جب نئے ڈاریکٹر ایجوکیشن (کالجز) بہاول پور ڈویژن پروفیسر ارشاد حسین نقوی نے جوائن کیا تو میں اور ہمایوں کبیرانہیں ملنے گئے۔تعارف کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئے: آپ وہی ہیں نا جو پہلے گورنمنٹ کالج خان پور میں تھے۔میری ان سے پہلی ملاقات تھی اس لیے مجھے بہت تعجب ہوا۔ بعد میں بتانے لگے کہ جس دن میں چارج لینے آیا تو مجھے اپنے پیشرو کے انتظار میں ڈائریکٹر آفس میں کچھ دیر تنہا بیٹھنا پڑا۔ کتابوں کے ریک میں آپ کی ادارت میں چھپنے والے کالج میگزین کا شمارہ پڑا تھا جس کی میں نے ورق گردانی کی اور میں نے محسوس کیا کہ یہ عام روش سے ہٹ کر تحقیقی نوعیت کا میگزین تھا غالباً رحیم یار خان نمبر تھا تب سے ہی مجھے اس شمارے کے مدیر سے ملنے کا تجسس پیدا ہوا اور آج ملاقات ہوگئی۔ ان دنوں کالج کی فضا میں ایک دباؤ (stress) کی کیفیت بھی چل رہی تھی۔کالج کے پرنسپل ہمایوں کبیر اور ان کے پرانے قریبی دوست ملک خضر اقبال جواب ایس ای کالج میں تھے، کے درمیان خاصی دیر سے مناقشہ چل رہا تھا جس کی وجہ سے کسی نہ کسی درخواست کی روشنی میں باہر سے مختلف اتھارٹیز کی نمائندگی کرنے والے لوگ آئے رہتے تھے جن سے پرنسپل خود ہی نپٹ رہے تھے تاہم جہاں وہ ضروری سمجھتے تھے،مشورہ کر لیتے تھے۔ ہماری محفلیں وائس پرنسپل آفس میں جاری تھیں۔ پرنسپل آفس میں یک پرانا کمپیوٹر پڑا تھا جس پر میں اپنا ہاتھ صاف کرتا رہتا تھا،اس میں ابھی ڈاس سسٹم تھا،کبھی سٹاف لسٹ تیار کر لی یا کوئی لیٹر تیار کرلیا۔ کالج میں انگریزی کے دس استاد تھے جب کہ ورک لوڈ اتنا نہیں تھا۔میرے ذہن میں ایک تجویز آئی کہ کیوں نا بلاسیٹ و بلا اخراجات ایم اے انگریزی متعارف کرا دیا جائے۔ پرنسپل نے تجویز سے اتفاق کیا اور میں نے مطلوبہ فارمیٹ کے تحت بنیادی معلومات کے ساتھ فزیبلٹی رپورٹ تیار کر کے پرنسپل کے سپرد کردی۔ایک ہفتے کے بعد جب وہ لاہور سے لوٹے تو ان کے ہاتھ میں ایک

ڈیڑھ سطری اجازت نامہ تھا جس کا اردو ترجمہ یہ تھا۔" محکمہ تعلیم ،حکومت پنجاب کو گورنمنٹ ڈگری کالج بہاول پور میں بلا اخراجات ایم اے انگریزی کی کلاس شروع کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے" اطلاعی نقول رجسٹرار اسلامیہ یونیورسٹی اور ڈائریکٹر کالجز کے نام بھیجی گئی تھیں۔اب داخلوں کا موسم بھی آ پہنچا تھا۔کالج میں ایم اے کی فیس یونیورسٹی سے کئی گنا کم تھی اور داخلے کا طریق کار بھی مختلف تھا۔ پہلے داخلہ ٹیسٹ لینا تھا، پھر انٹرویو اور ڈگریوں کے کل نمبروں سے میرٹ کا تعین کرنا تھا۔انٹر دیو کے پراسس نے بہت مایوس کیا۔ پرنسپل چند دنوں کی رخصت پر تھے لہٰذا ساری کارروائی کی نگرانی میں نے کرنی تھی۔انٹرویو کے وقت کئی امیدوار نثر اور نظم میں فرق کا جواب بھی نا دے سکے۔ بہر حال بعد کے برسوں میں ایم اے انگریزی کی روایت اتنی مستحکم ہوئی کہ کالج کے طلبا و طالبات نے یونیورسٹی میں پوزیشنیں بھی لیں۔ میں نے پہلے کالج کی فضا میں خاص قسم کے دباؤ کا ذکر کیا تھا۔ پرنسپل کے کسی حریف نے ڈائریکٹر کے اس حد تک کان بھرے کہ وہ کالج کی ٹیکنیکل انسپکشن کے لیے ٹیم کے ہمراہ کالج پہنچ گئے۔ یہاں میں عرض کر دوں کہ ہر ڈائریکٹر کے پاس یہ اختیار ہوتا ہے بل کہ اس کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ اپنی حدود میں واقع کالجوں کی ٹیکنیکل انسپیکشن کرتا رہے۔اس کا بڑا جز تو انٹرنل آڈٹ ہوتا ہے تاہم نتائج ،طلبا کی تعداد اور دیگر امور کو بھی اس کی رپورٹ میں شامل کیا جاتا ہے۔اس کی کوئی سزا یا جزا نہیں ہوتی بل کہ ایسی انسپکشن رپورٹ کا درجہ ایڈوائزری یا ہدایات اور رہنمائی کا ہوتا ہے۔ ماضی میں ایسی انسپکشن کی اچھی رپورٹ کے لیے ”کھانے پینے" کی مثالیں زبان زدِ عام و خاص تھیں جس میں ڈائریکٹوریٹ کے کئی لوگوں کے نام لیے جاتے تھے۔موجودہ ڈائریکٹر سابقین سے بہت مختلف تھے۔ جب ٹیکنیکل انسپکشن یا فنی معائنے کی رپورٹ آئی تو میں نے تمام پیروں کا بہترین جواب تیار کیا اور آخر میں اس ایڈوئزری پر عمل درآمد کی بات کی۔ بعد میں ڈائریکٹر اس بندے کی تلاش میں رہے کہ جس نے وہ ترتیب وار جواب تیار کیا تھا۔ان کی نظر انگریزی کے اساتذہ سید اسرار حسین شاہ اور محمد طارق خان سے آگے نہ جا سکی۔ مجھ تک نظر اس لیے نہیں گئی کہ میں فارسی کا استاد تھا۔ پرنسپل نے بھی اسے راز رکھا اور میں نے تو رکھنا ہی تھا، آج پہلی بار میں یہ انکشاف کر رہا ہوں۔

بہاول پور ڈویژن کے کالجز ڈائریکٹوریٹ میں سید ارشاد حسین نقوی کا دور ایک نئے، دوستانہ اور مہربان رویے کا نقیب تھا۔ان کے پیشرو ڈاکٹر عبدالمجید کا دور کئی طرح سے مختلف تھا۔ وہ ایک سے زائد بار اس سیٹ پر آ چکے تھے لیکن تین سال کی مدت ایک بار بھی مکمل نہ کر سکے۔ایک مثال کافی ہوگی۔ان کے دور میں ایک ڈپٹی ڈائریکٹر تھے، نام بھول گیا ہوں غالباً ساہیوال کے تھے۔ایک صاحب نے تبادلے کے لیے ان کے ساتھ کچھ لین دین مقرر کیا۔ جب وہ آرڈر لینے پہنچے تو ڈپٹی ڈائریکٹر دوستوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ ان صاحب نے سوچا کہ طے شدہ رقم میں سے کچھ نکال لیتا ہوں انہیں کیسے پتا چلے گا۔ایک لفافہ دوں گا اور ان سے لفافے میں بند آرڈر وصول کر لوں گا، انہوں نے دوستوں کے سامنے کون سا گننا ہے۔سائل کا لفافہ وصول

کرنے کے بعد انہوں نے پیسے نکال کر گنے تو طے شدہ سے کم تھے تو سب کے سامنے ان سے بقایا پیسے وصول کیے اور آرڈر ان کے حوالے کیا۔ سوال یہ ہے کہ طے شدہ رقم کیا صرف انہی کی تھی، اوپر نیچے کسی اور کا حصہ نہیں تھا کیا؟ اگرچہ پروفیسر نقوی لوگوں کے کہنے سننے سے کسی کے بارے میں یک طرفہ رائے بھی قائم کرتے تھے مگر مجموعی طور پر ان کا دور ہوا کا تازہ جھونکا تھا۔ وہ اپنے آفس میں آنے والے پرنسپلز اور کالج اساتذہ کو اچھی اخلاقی اور معاشرتی اقدار کے ساتھ اٹینڈ کرتے، مناسب پروٹوکول دیتے۔ ان کے دور میں ڈائریکٹوریٹ کا آرتھوڈوکس ماحول بدل چکا تھا۔ کلرکوں سے ترقی یافتہ "افسران" جو برسوں سے یہاں چمٹے بیٹھے تھے اور ان کا طوطی بولتا تھا، ریٹائر ہو چکے تھے البتہ ان کی نرسری ضرور موجود تھی مگر آئندہ دنوں میں ان کا ڈنک بھی ماند پڑ گیا۔ اگر کسی نئے گرلز کالج کی ڈگری کلاسز کے الحاق کے لیے یونیورسٹی کی ٹیم نے آنا ہوتا تو نقوی صاحب اس اجلاس میں پرنسپل کے مددگار کی حیثیت میں موجود ہوتے بل کہ گھر سے چائے کا سامان بھی ساتھ لے جاتے۔ اسی دوران میرا ایسوسی ایٹ پروفیسر کے لیے ترقی کا کیس بھی جا چکا تھا۔ 1999 مئی و جون کی بات ہے جب پرنسپل کو ایک ماہ کی رخصت پر جانا پڑ گیا۔ نقوی صاحب نے وائس پرنسپل ہونے کی وجہ سے میرے نام ڈی ڈی او پاورز جاری کر دیں۔ میں نے اپنا عارضی دفتر پرنسپل آفس کے ساتھ والے کمرے میں قائم کیا اور پرنسپل کا آفس اور ان کی کرسی استعمال نہیں کی کیوں کہ ایک دوسرے سے فری ہونے کی وجہ سے مجھے یہ جملہ سننا پڑ سکتا تھا کہ جناب کو پرنسپل بننے کا بڑا شوق ہے!!! بجٹ خاصا پڑا تھا سو میں نے قواعد وضوابط کے مطابق پرچیز شروع کر دی تاکہ مالی سال کے اختتام پر ضائع نہ ہو جائے۔۔ پرنسپل آفس کا کچھ سامان تبدیل کیا۔ وائس پرنسپل کے لیے فرنیچر بنوایا۔ پرنسپل جب واپس آئے تو اپنے آفس کی تبدیلی دیکھ کر خوش ہوئے اور جب وائس پرنسپل کا دفتر دیکھا تو ماتھے پر تیوریاں ڈال کر کہا: "اس کی کیا ضرورت تھی"۔ پرنسپل کی کرسی پر نہ بیٹھنے کا فیصلہ میں نے ایسے نہیں کیا تھا! کتب کے لیے بجٹ ختم کیا جا چکا تھا اور میں کالج کی لائبریری کے لیے اردو لغت بورڈ کراچی کی اس وقت تک شائع ہونے والی 18 جلدوں کا سیٹ خریدنا چاہتا تھا، میں نے نقوی صاحب سے ذکر کیا تو انہوں نے اس کی قیمت کے مساوی بجٹ جاری کر کے بھجوا دیا۔ میں نے کارواں بک سنٹر کے ذریعے وہ سیٹ خرید کر لائبریری میں رکھوا دیا۔ ایک بار پرنسپل کی عدم موجودگی میں نقوی صاحب کلاسز چیک کرنے آ گئے۔ میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ چوں کہ وہ خود پروفیسر اور پرنسپل کا تجربہ رکھتے تھے لہٰذا ایک کلاس میں گئے تو ان کے اندر کا پروفیسر جاگ اٹھا اور طلبا سے ان کا خطاب شروع ہو گیا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور ساتھ والے کمروں کو چیک کیا تو کلاس موجود ہے مگر استاد سے خالی، میں نے ان دو کلاسوں میں فوری طور پر دو اساتذہ بھیج دیئے۔ ان کلاسوں کو چیک کیا گیا تو استاد موجود تھے۔ وہ وائس پرنسپل آفس میں کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ ایک دن میں اور کچھ دوست ان کے آفس میں کسی کام سے گئے تو معمول کی باتیں ہونے لگیں۔ بیچ میں کہیں موقع ملا تو انہوں نے طعنہ دیا کہ یہاں تو کلاسز کا معائنہ کرنے جاؤ تو غیر حاضر اساتذہ کی جگہ فوری طور پر دیگر اساتذہ کو کلاسز میں

بھیجنے کا انتظام کر دیا جاتا ہے اور میں حیرت سے ان کا منہ تکتا رہ گیا۔

2000 کے اوائل کی بات ہے کالج کے ایک ملازم نے مجھے ایک لفافہ دیا جو ڈائریکٹر پروفیسر ارشاد حسین نقوی نے میرے لیے بھیجا تھا۔ کھولا تو اس میں ایک جملہ تھا کہ "بلوچ صاحب، مبارک ہو، آپ کی ترقی کا نوٹیفیکیشن ہو گیا ہے"۔ تکنیکی طور پر انیسویں اور اوپر کے گریڈز کی ترقی کے لیے صوبائی سلیکشن بورڈ کا اجلاس ہوتا ہے جس کے بعد ایس اینڈ جی اے ڈی اس اجلاس کے منٹس کا ایک نوٹیفیکیشن جاری کرتا ہے جس میں ترقی کے لیے کلیئر ہونے والے ناموں کے ساتھ ساتھ مسترد یا مشروط نام بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد متعلقہ محکمہ اس کی روشنی میں خالی پوسٹوں پر تقرری کا کیس تیار کرتا ہے۔ ابھی پہلے والا نوٹیفیکیشن ہی ہوا تھا۔ اس خبر کے ساتھ ہاتھ سے نہایت خوشخطی کے حامل دو سفارشی خطوط بھی تھے جو ڈی پی آئی اور سیکریٹری کے نام لکھے گئے تھے جنہیں فنی زبان میں ڈی او لیٹر کہا جاتا ہے۔ ان خطوط میں سفارش کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ انہیں بہاول پور ڈویژن خصوصاً ضلع بہاول پور کے کسی ڈگری کالج میں پرنسپل تعینات کرنا بہت مناسب اور مفید ہوگا جب کہ میں نے انہیں ابھی تک ان خطوط کے لیے نہیں کہا تھا۔ ان خطوط کے ساتھ میں نے اپنی تقرری بطور پرنسپل حاصل پور کالج کی درخواست بھی بھیج دی۔ یکم مئی 2000 کو حسب خواہش گورنمنٹ ڈگری کالج حاصل پور میں بطور پرنسپل تقرری کے آرڈر ہو گئے جنہیں محمد طارق خان نے بذریعہ فیکس اسی دن لاہور سے منگوا لیا۔

2 مئی 2000 کو میں جب گورنمنٹ کالج حاصلپور بطور پرنسپل جوائن کرنے گیا تو سید اسرار حسین شاہ، سید لئیق انور زیدی اور محمد طارق خاں میرے ہمراہ تھے۔ میں نے نقوی صاحب کو فون پر بتایا کہ میں نے حاصل پور کالج میں جوائننگ دے دی ہے تو بہت خوش ہوئے اور مجھے مشورہ دیا کہ جوائننگ رپورٹ کی کاپیاں بھیجنے سے پہلے کل یہاں آ کر میرے توثیقی دستخط کرا لیں سو اگلے دن ملاقات ہوئی اور انہوں نے میری پروموشن اور جوائننگ کی خوشی میں چائے کے ساتھ یک دو کھانے کی اشیا بھی منگوا لیں۔ بغداد روڈ کالج بہاول پور میں پرنسپل اور سابق پرنسپل ملک خضر اقبال کے درمیان تلخیوں اور انکوئریوں سے تناؤ کی کیفیت اپنی آخری حدود کو چھو رہی تھی، جب میں نے بہاول پور سے 100 کلومیٹر دور جانے آنے کی بنیاد پر حاصل پور کالج جوائن کیا تو مجھے اس تناؤ سے نجات مل چکی تھی۔ میرے لیے منعقد کی جانے والی الوداعی تقریب میں سٹاف کی خاصی تعداد نے میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا بل کہ شعبہ اردو کے جناب فدائے اطہر نے فارسی میں اور ملک محمد اکبر نے اردو میں منظوم محبت کا اظہار کیا۔ کالج کی باتیں بعد میں، پہلے نقوی صاحب کا باب مکمل کر لیں۔ میرے جوائن کرنے کے بعد وہ جتنا عرصہ یہاں رہے حاصل پور نہیں آ سکے۔ جون کے آغاز پر موسم گرما کی تعطیلات ہو گئیں تو میں نے ہفتے کے متبادل دنوں میں کالج جانا شروع کر دیا اور کبھی کبھار ڈائریکٹوریٹ بھی چلا جاتا تھا۔ ایک دن ان کے آفس میں بیٹھا تھا کہ ایک صاحب نے شرارتاً کہا، " آپ آج کل کالج نہیں جا رہے۔ " میرے بولنے سے پہلے نقوی صاحب خود میرے دفاع میں بولنے لگے کہ تعطیلات چل رہی ہیں اور تعلیمی

سرگرمیاں بند ہیں۔ کیا پرنسپل کا اتنا بھی حق نہیں کہ وہ ان دنوں کالج سے چند دن دور رہ لے اور یہ تو پھر بھی متبادل دنوں میں سوکلومیٹر کا سفر طے کر کے چلے جاتے ہیں یا پھر یہاں آ جاتے ہیں۔ یہ تھے پروفیسر ارشاد حسین نقوی۔ انہی دنوں حکومت پنجاب کے محکمہ تعلیم نے ڈویژن کی سطح پر انتظامی ڈھانچے میں چند تبدیلیوں کی سکیم منظور کی اور اس کا اشتہار اخبارات میں دے دیا کہ ہر ڈویژن میں " کوارڈینیٹر " مقرر کیے جائیں گے۔ اس عہدے کی تنخواہ اس وقت ایک سے دولاکھ تک بتائی گئی اور اس کے انتخاب کا معیار اور طریق کار بہت پیچیدہ تھا جس پر پورا اترنا ہر ایک کے بس میں نہیں تھا۔ نقوی صاحب منتخب ہو گئے اور ان کی تقرری کے آرڈر بھی آ گئے۔ جس دن انہوں نے ریلیو ہونا تھا تو اتفاق سے میں بھی موجود تھا۔ میں نے انہیں بے چین پایا۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے بڑے بھائی کو استخارہ کرنے کو کہا تھا اور اس کے مطابق عمل کرنا تھا۔ کچھ دیر بعد فون پر نئے عہدے کے مفید ہونے کی اطلاع ملی تو انہوں نے یہاں سے فارغ ہو کر سکول ڈائریکٹوریٹ کے کسی دفتر میں بیٹھنا تھا لہٰذا وہ یہاں سے فارغ ہو گئے۔ ایس ای کالج کے پرنسپل ڈاکٹر دولت علی زیدی کو اضافی چارج دیا گیا۔ یوں ہی حسب معمول میں کالج ڈائریکٹوریٹ گیا تو زیدی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہمیشہ محبت سے پیش آتے۔ کہنے لگے کہ آپ جانے سے پہلے مجھ سے مل لیں۔ ملا تو کہنے لگے چوں کہ آپ کالج کی بجائے یہاں پر موجود ہیں اس لیے آج کی اتفاقیہ چھٹی مع ترک مستقر کی منظوری لیتے جائیے گا۔ اس وقت مجھے نقوی صاحب بہت یاد آئے۔ نقوی صاحب کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آیا۔ کوئی انسان کامل نہیں ہوتا، ہم ہر ملنے والے کی شخصیت کا ایک مجموعی تاثر لیتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں۔ اگر اس شخصیت کا کوئی مختلف اور غیر متوقع پہلو سامنے آ جائے تو شاید ہم اس کو پہلے والے مقام سے پھسلتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ نقوی صاحب نے ڈائریکٹر کے عہدے سے فراغت والے دن مختلف باتیں کیں اور وہ بے چین بھی تھے مگر اس دن انہوں نے ایک " شخصیت " کو چاہے وہ جیسی بھی تھی، بد دعا دی جو ان کے بظاہر دکھائی دینے والے ظرف سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ میرے ذہن میں وہ جہاں تھے، چند سیڑھیاں نیچے آ گئے۔ میری ان سے آخری ملاقات ستمبر 2004 میں ہوئی جب وہ پنجاب ٹیچرز فاؤنڈیشن لاہور کے سربراہ تھے۔ ڈاکٹر دولت علی زیدی کے پاس چارج ایک ماہ سے بھی کم عرصے تک رہا کہ سول لائینز کالج ملتان میں شعبہ انگریزی کے سربراہ پروفیسر فضل الٰہی رائے نے ڈائریکٹر تعلیمات (کالجز) بہاول پور ڈویژن کا چارج سنبھال لیا۔

یہاں میں ایک بنیادی بات کہنا چاہتا ہوں کہ میری سروس کو تقریباً 25 سال ہونے کو تھے اور اس میں اکیس سال کا تدریسی تجربہ اور چار سال کا انتظامی و نیم انتظامی تجربہ شامل تھا۔ ان برسوں پر مشتمل تدریسی زندگی کے دوران میں نے مختلف پرنسپلز کے تحت کام کیا۔ (97-1996 کا عرصہ اسلامیہ یونیورسٹی میں ڈیپوٹیشن پر بطور چیئر مین شعبہ فارسی کا تجربہ جو تدریس و انتظامی فرائض کا امتزاج تھا، بھی شامل ہے) میں نے مختلف اداروں میں جتنے بھی پرنسپلز کے ساتھ کام کیا وہ اپنے مزاج اور منتظم کی حیثیت سے مختلف طبائع کے لوگ

تھے لہٰذا جہاں ان کی کچھ خوبیاں متاثر کرتی تھیں وہاں ان کے انتظامی اسلوب کے کچھ پہلو مایوس بھی کرتے تھے۔ کئی دفعہ ذہن میں یہ بات آتی کہ جب بھی مجھے کوئی ایسا موقع ملا تو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق بہتر انتظامی رویے کو ترجیح دونگا اس لیے میرے انتظامی رویے میں اس دوران ایک ارتقائی عمل کے ذریعے راسخ ہونے والے تصورات کا بنیادی دخل تھا۔ ہماری مخصوص اجتماعی اور معاشرتی نفسیات میں اتھارٹی کا ایک موضوعی (Subjective) تصور غالب آجاتا ہے اور کسی بھی قسم کی اتھارٹی ملنے پر فرد کے اپنے Complexes، خواہشات اور لاشعور میں جاگزین ہونے والی ناآسودگیوں کے اظہار کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اگر ادارے کا انتظامی عہدہ ملنے سے پہلے طویل تدریسی تجربے کی روشنی میں ایک علمی رویے کی تشکیل ہو چکی ہو اور اگر یہی رویہ انتظامی رویے کو کنٹرول کرے تو بہتر نتائج سامنے آتے ہیں مگر ہمارے طبقاتی اور کولونیل اثرات کے حامل معاشرے میں شعبہ تعلیم کسی باقاعدہ کمٹ منٹ اور مشن کے بغیر اختیار کرنے کی وجہ سے تدریس اور ایڈمنسٹریشن دو مختلف شعبے محسوس ہوتے ہیں مگر میرے ساتھ شاید یہ صورت حال نہیں تھی۔ میں چوں کہ خود کو بنیادی طور پر استاد اور سٹاف روم کا نمائندہ تصور کرتا رہا ہوں لہٰذا میری شعوری اور لاشعوری کوشش یہی رہی کہ علمی رویے (Academic behaviour) کو ہی اپنے انتظامی اسلوب کے لیئے بنیاد بناؤں اور یہی وجہ ہے جس سے میں کالج میں ایک پسندیدہ فضا قائم کرنے میں خاصی حد تک کامیاب ہوا۔ آگے بڑھنے سے پہلے حاصل پور شہر کے بارے میں کچھ بتاتا چلوں۔

ساہیوال سے بہاولنگر جانے کے لیے براستہ عارف والہ، قبولہ کا روٹ ہی آسان تھا مگر اس راستے دریائے ستلج کے بھوکاں پتن پر کشتیوں کے پل سے گزرنا پڑتا تھا۔ گرمیوں کے دوران دریا میں پانی آجانے کے بعد یہ راستہ بند ہو جاتا تھا۔ میرے والد کے ایک دوست فقیر والی کے ساتھ کسی 7/R کے گاؤں میں رہتے تھے اور میں پہلے بھی ایک دو بار اسی راستے سے آچکا تھا۔ یہاں دریا پر پل کی تعمیر کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔ 1969 کی گرمیوں میں جب میٹرک کا امتحان دے چکا تو میں اپنے والدین کے ساتھ یہاں آیا مگر دریا میں پانی کی وجہ سے یہ راستہ بند ہونے کی وجہ سے روٹ تبدیل کرنا پڑا۔ پہلے ساہیوال سے براستہ عارف والہ، بورے والہ، وہاڑی پہنچے، وہاں سے نئی بس لے کر اسلام ہیڈ کے راستے حاصل پور جہاں سے ہارون آباد کی بس لی جو براستہ چشتیاں سیدھا ہارون آباد پہنچی پھر فقیر والی قصبہ آیا اور اس کے بائیں جانب کی طرف پیدل سفر۔ جس گاؤں میں میرا جانا ہوا اس نے خاصی دیر مجھے حیرت زدہ کیے رکھا۔ میں نے یہ پہلا گاؤں دیکھا تھا جہاں مرکز میں ایک تالاب تھا جس میں نہر کا پانی میسر تھا اور تمام اہل دیہہ پینے اور نہانے کے لیے وہی پانی استعمال کرتے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میں کسی قدیم عہد میں پہنچ گیا تھا۔ یہ حیرت اس لیے بھی تھی کہ میرا گاؤں ساہیوال سے سات کلومیٹر دور تھا اور زمین کا پانی بہت میٹھا تھا اور پہلے پانچ سالہ منصوبے کے تحت 1961 سے بجلی کی سہولت مہیا تھی بہر حال حاصل پور سے میرا یہ پہلا تعارف اس سفر کے دوران ہوا۔ بہاول پور آنے کے

بعد ایک دوست کے ساتھ پرانے حاصلپور آنے کا اتفاق ہوا مگر کالج کی طرف دھیان نہیں گیا۔ اس بار یہاں آیا تو یہاں کے کالج میں بطور پرنسپل جوائن کرنے کے لیے۔

بہاول پور سے مشرق میں 100 کلومیٹر اور اسلام ہیڈ ورکس کے جنوب میں 15 کلومیٹر کے فاصلے پر وہاڑی، بہاولنگر، فورٹ عباس، ہارون آباد اور بہاول پور کی طرف جانے والی سڑکوں کا ایک اہم ترین سنگم واقع ہے۔ یہی آج کا حاصل پور ہے۔ یہ سنگم حاصل پور کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے، ایک طرف حاصل پور منڈی یا نیا حاصل پور جو ستلج ویلی پروجیکٹ کے بعد کی آبادکاری کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ اسی مرکز سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر اولڈ حاصل پور ہے جو اس شہر کی تاریخی قدو قامت کی نشان دہی کرتا ہے مگر اس تاریخ کا تذکرہ محض کتابوں میں ملتا ہے یا پھر پرانا حاصل پور کی کچھ اثری باقیات حاصل پور کا تاریخ سے رابطہ قائم کرتی نظر آتی ہیں ورنہ اب نیا شہر ہو یا پرانا دونوں کے درمیان دو کلومیٹر کا فاصلہ نکال دیں تو تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی سطح پر اصل میں دونوں ایک ہیں۔

حاصل پور کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لیے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱)۔ آبادکاری سے قبل (۲) آبادکاری کے بعد۔ لہٰذا اس گفتگو میں اسی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

حاصل پور تقریباً اتنا ہی پرانا ہے جتنا بہاول پور یا شاید اس سے بھی قدرے پرانا، تاریخی حوالہ جات بتاتے ہیں کہ دریائے ستلج سے سات کلومیٹر دور ایک پرانے دریائی نشیب ''پاکھالا'' کے کنارے جوگی خان گھمرانی نامی داؤد پوترہ سردار کے بیٹے حاصل خان نے اپنے نام سے یہ شہر اٹھارہویں صدی کے ربع اول میں آباد کیا۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے دوران جب سمہ سٹہ سے منڈی صادق جنگ، امروکا اور بٹھنڈا کے راستے ہندوستان تک ریلوے لائن بچھائی گئی تو حاصل پور سے جنوب کی جانب ایک میل کے فاصلے سے گزری اور وہاں حاصل پور ریلوے سٹیشن قائم ہوا۔ حاصل خان داؤد پوترا کو بہاول پور کے نواب کے مساوی رتبہ حاصل تھا اور یہ مرتبہ اس کے پانچ جانشینوں تک قائم رہا۔ چوں کہ نواب کی طرح حاصل خان کا خاندان بھی داؤد پوتروں کی پرجانی شاخ سے تھا لہٰذا نواب یا اس کا نمائندہ (جو اعلیٰ سردار یا نواب کا بیٹا ہوتا) شادی یا غمی کے موقع پر حاصل پور آتے۔ نواب صادق محمد خان دوم (1825-1809) کے عرصہ میں حاصل پور کے گھمرانیوں کو زوال آیا۔ گھمرانی جب باہمی رقابتوں کا شکار ہوئے تو انہوں نے اپنی ملکیتیں اور جاگیریں نواب صادق محمد خان دوم کو منتقل کر دیں اور نتیجتاً نواب نے اپنے ایک غلام سہراب خان چاچڑ کو ان پر حاکم بنا کر بھیجا جس پر گھمرانی اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے سہراب خان چاچڑ کو قتل کر دیا کیوں کہ وہ ایک کنیز زادے کو داؤد پوتروں پر حاکم نہ دیکھ سکتے تھے۔ اس کشمکش میں سہراب خان چاچڑ کے ملازمین نے گھمرانیوں کے سربراہ لقمان خان کو قتل کر دیا۔ آخر کار نواب نے حاصل پور پر لشکر کشی کی اور اس کو ریاست بہاول پور میں ضم کر دیا اور گھمرانیوں کے لیے وظائف اور جاگیریں مقرر کر دیں جو ہوتے ہوتے بہاول خان پنجم کے دور میں

1902 تک برائے نام رہ گئیں۔ گھمرانیوں کا سربراہ عثمان خان صرف 96 روپے سالانہ کا مشاہرہ پاتا تھا اور باقی خاندان کا گزارہ محنت مزدوری پر ہوتا تھا۔ حاصل پور کا قصبہ کچے پکے ملے جلے مکانوں پر مشتمل تھا۔ 1902 کے لگ بھگ یہاں 350 گھروں پر مشتمل ایک قصبہ تھا جس کا تنگ بازار شمال سے جنوب کی جانب واقع تھا اور اسے سات گلیاں مختلف مقامات پر قطع کرتی تھیں۔ یہاں پانی کھدے ہوئے کنوؤں سے حاصل کیا جاتا تھا۔ بارش ہوتی تو قریبی نشیب ''پاکھالا'' بہنے لگتا۔ یہاں حاصل خان اور اکرم خان کی بنوائی ہوئی مسجدیں تھیں۔ حاصل خان نے مسجد 1768 میں بنوائی جس کی تعمیر میں چھ سال صرف ہوئے۔ اس کے بیرونی دروازے پر قرآنی آیات تحریر تھیں۔ بڑے دروازے پر دائرے میں ابھرے ہوئے حروف میں آیت الکرسی لکھی گئی تھی۔ یہ مسجد اس خطاطی کی وجہ سے معروف تھی۔ بعد میں یہ مسجد امتداد زمانہ کا شکار ہوئی۔ نواب صادق خان چہارم (1899-1879) نے 1890 میں اس کی مرمت کے لیے خصوصی رقم دی جس سے اس مسجد کی شان وشوکت قدرے بحال ہوئی۔

تاریخ کے جھروکے میں جھانک کر دیکھیں تو حاصل پور کے گھمرانیوں کے مقبوضات میں ضلع میلسی کے علاقے، ستلج پار لڈن، سلول اور ڈرہ تک تھے۔ لکھویروں کے ساتھ فاصل بستی دُلا بھڈیرہ تھی جس کی آمدنی مشترکہ طور پر مساوی حاصل کرتے تھے۔ مشرق میں مشہور رائی کاٹبہ اور جنوب میں قلعہ پھلڑہ اور ولہار اس کی حدود میں آتے تھے۔ مقبرہ محمد پناہ ٹوانہ اور محمد شاہ قابل دید جگہیں تھیں۔ محمد پناہ ٹوانہ ایک فقیر تھا۔ اس کا مقبرہ گر گیا تو غلام محمد دولتانہ (لڈن کے جاگیردار) نے 1899-1859 کے درمیان یہ مقبرہ دوبارہ تعمیر کرایا اور اس پر 24 ہزار روپے کی خطیر رقم صرف ہوئی۔ اس مقبرے کے ساتھ ایک عمدہ سرائے اور مجلس خانہ بھی بنوائے۔ ان کے عقیدت مند مقامی لوگوں کی بجائے ملتان کے ضلع سے (جو دریا پار تھا) آتے۔ محمد شاہ کا مقبرہ شہر کے جنوب مغرب میں ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ امید علی شاہ نے موجودہ مقبرہ 1899-1890 کے درمیان بنوایا۔ ہندو مذہب کی دھرم سالہ، پیپل والی، ٹھاکراں دا بیلہ رام، سنگھ والی دھرم سالہ اور دو مڑھیاں بھی یہاں ہوتی تھی۔ 1904ء میں یہاں سکول، ڈاکخانہ، سرائے، میونسپل ڈاک بنگلہ، پولیس سٹیشن اور نواب صاحب کی رہائش کے لیئے دولت خانہ یا ریسٹ ہاؤس بھی موجود تھا۔ نواب صاحب مشرقی علاقوں (اُبھا) کے دورے پر جاتے تو اس ریسٹ ہاؤس میں قیام کرتے۔ پرانے دنوں میں یہ خاصا سرسبز وشاداب علاقہ تھا۔ یہاں فصلیں بہت اچھی ہوتی تھیں۔ Indigo (نیل) گندم، تل اور دالیں یہاں سے باہر بھیجی جاتی ہیں۔ حاصل پور کی میتھی یہاں کی ایک سوغات تھی اور ریاست میں اس سے بہترین میتھی دستیاب نہ تھی۔

بہاول پور اور بہاولنگر کے اضلاع کی آبپاشی اور آبادکاری کے لیئے ستلج ویلی پروجیکٹ کے تحت دو ہیڈ ورکس تعمیر کیے گئے۔ سلیمانکی ہیڈ ورکس کی تعمیر کا آغاز 1922 میں ہوا اور 12 اپریل 1926 کو پنجاب کے گورنر نے اسکا افتتاح کیا۔ ایسٹرن صادقیہ کینال سے نکلنے والی ہاکڑہ برانچ 30-1929 تک مکمل نہ ہوسکی

تو ملک واہ برانچ کو 27-1926 خریف سے پانی دے دیا گیا۔ اسی نہر سے چائنا بنگلہ پر واقع ایک مائنر ہیڈ کے ذریعے فتح اور مراد نہریں نکالی گئیں اور ان کے ذریعے حاصل پور کے آباد کاری کے علاقے کو سیراب کیا گیا۔ ان دونوں نہروں کی ٹیلز تحصیل حاصل پور میں ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ فورڈ واہ کینال 29-1928 میں مکمل ہوئی لیکن اس سے پہلے پرانی سیلابی نہر فورڈ واہ کو ہیڈ سلیمانکی سے پانی 27-1926 خریف سے دیا جانے لگا۔ اس نہر سے بھی حاصل پور کو پانی فراہم کیا گیا۔ اسلام ہیڈ ورکس کو سلیمانکی ہیڈ ورکس سے 115 میل نیچے بنایا گیا۔ نومبر 1923 کو اس کی تعمیر شروع ہوئی اور 28 اکتوبر 1927 کو وائسرائے ہند نے اس کا افتتاح کیا۔ اس ہیڈ ورکس سے بہاول کینال اور قائم کینال کو باقاعدہ سپلائی شروع ہوئی۔ پاکستان بننے کے بعد سندھ طاس معاہدہ کے تحت ستلج اور بیاس کا پانی رک جانے سے بہاول پور کے ستلج ویلی پروجیکٹ کے تینوں ہیڈ ورکس، سلیمانکی ہیڈ ورکس، اسلام اور پنجند بری طرح متاثر ہوئے۔ ان ہیڈ ورکس کو پانی دینے کے لیئے تربیلہ اور منگلا سے لنک نہریں نکالی گئیں۔ سلیمانکی ہیڈ ورکس کو پانی کی فراہمی کے لیئے رسول قادر آباد لنک، بلوکی لنک اور بلوکی سلیمانکی نہریں تعمیر ہوئیں۔ اسلام ہیڈ ورکس کی نہروں کے لیئے تریموں سندھائی۔ سندھنائی میلسی اور میلسی بہاول لنک نکالی گئیں۔ کینال اور ہیڈ ورکس کے اس تمام نظام میں حاصل پور کو پانی دینے والی نہروں میں عظیم، مراد، فتح، قائم اور فورڈ کے نام اہم ہیں۔

مندرجہ بالا آبپاشی کے نیٹ ورک سے یہاں آباد کاری میں بہت پیش رفت ہوئی۔ ہندوستان اور خصوصاً پاکستان کے مختلف علاقوں سے لوگ زمینوں کی مختلف ترغیبات کے تحت الاٹمنٹ کے لیئے کھنچے چلے آئے اور اسی نہری نظام آبپاشی کی برکت ہے کہ حاصل پور کے جنوب مشرق اور جنوب مغرب میں واقع چولستان کا صحرا سرسبز و شاداب اور سونا اگلتی ہوئی زمینوں اور کھیتوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ ان علاقوں میں نہری نظام کے تابع منصوبہ بندی کے تحت چک بندی کی گئی اور ان چکوک کو فتح، مراد اور فورڈ کی ذیلی تقسیم کے تحت کیا گیا۔ حاصل پور اور دریائے ستلج کے درمیان کے علاقے کو کچے کا علاقہ کہا جاتا تھا۔ حاصل پور کی شمال مغرب کی جانب اس سے منسلک علاقے کو فورڈ واہ کے تحت چک بندی نظام سے منسلک کر دیا گیا مگر اس سے آگے اور ستلج کے درمیان موضعات جیسے تلہڑ، جمال پور، لڈن، ابلانی، قطب پور، محمد پور، نور پور اور خیر و دیہہ اپنے اصل ناموں سے قائم رہے۔ یہاں شروع شروع میں تو دریائے ستلج کی کریکس سے پرانی وضع کا آبپاشی کا نظام رہا بعد میں سلیمانکی ہیڈ ورکس سے نکلنے والی نہروں قائم اور بہاول کینالز سے یہاں کا نظام آبپاشی جدید خطوط پر استوار کیا گیا اور اب یہاں کی زمینیں بھی سونا اگلتی ہیں اور اب یہ دعویٰ کیا جا سکتا کہ جدید خطوط پر استوار اس نہری نظام نے یہاں کے علاقے کی تقدیر بدل کر رکھ دی ہے۔ ہارون آباد اور فورٹ عباس شہروں کا وجود میں آنا بھی اسی نہری نظام کا مرہون منت ہے۔

زرعی معیشت کی ترقی کے لیے 1930 کی دہائی میں ریاست بہاول پور کے کچھ شہروں کو منڈی کا

درجہ دیا گیا۔ اس میں حاصل پور بھی شامل تھا لہٰذا بیسویں صدی کے آغاز میں بچھائی جانے والی ریلوے لائن کی وجہ سے قائم کردہ سٹیشن کے قریب غلہ منڈی قائم کی گئی جس سے حاصل پور منڈی یا حاصل پور کے نئے شہر کا آغاز ہوا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہاں پر ریلوے اسٹیشن کے قیام کے بعد اکا دکا دکانوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ منڈی بننے تک حاصل پور اولڈ ہی کے بازار پر مشتمل شہر کو مرکزیت حاصل تھی۔ منڈی کے قیام اور اس کے نتیجے کے طور پر غلہ منڈی کے آغاز اور آبادکاری کی مختلف سکیموں کی تکمیل نے نئے شہر کو جنم دیا۔ 1947 کے بعد اس شہر نے پھیلنا شروع کر دیا اور بازاروں کے ساتھ ارد گرد رہائشی آبادیاں بھی قائم ہونے لگیں۔ ریاست بہاول پور کے زمانے میں حاصل پور، خیر پور ٹامیوالی کی پیشکاری میں شامل تھا۔ ریاست کے پاکستان میں ادغام کے بعد حاصل پور کو سب تحصیل کا درجہ حاصل رہا اور اس کے دفاتر قائم کیے گئے۔ 1970 میں حاصل پور کو جب تحصیل بنایا گیا تو اس میں خیر پور ٹامیوالی بھی شامل کیا گیا۔ اور اس طرح اس کی ریونیو حدود لال سہانرہ سے شروع ہوتی تھیں۔ بعد میں 1990 میں جب خیر پور ٹامیوالی کو تحصیل کا درجہ ملا تو حاصل پور تحصیل کی ریونیو حدود مزید سکڑ گئیں۔ اب اسکی حدود قائم پور سے ہیڈ پلہ، ٹیل مراد، بخش خان کے درمیان ہے۔ 1970 میں جب حاصل پور کو تحصیل کا درجہ ملا تو یہاں پر اسسٹنٹ کمشنر کا انتظامی سیٹ اپ قائم کیا گیا اور تحصیل کی سطح کے تمام دفاتر قائم ہوئے۔

11 نومبر 1897 کو سمہ سٹہ تا امروکا ریلوے لائن کا آغاز ہوا تو یہاں پر ریلوے اسٹیشن قائم کیا گیا تھا۔ یہ ریلوے لائن Strategic نکتہ نظر سے بہت اہم ہے۔ 1947 کے بعد ریاست بہاول پور میں ہونے والے مہاجرین کی اکثریت اسی ریلوے روٹ سے یہاں آئی۔ یہ ریلوے لائن کراچی سے امروکا اور دہلی براستہ بٹھنڈہ بہترین اور فعال روٹ تھا۔ روایت ہے کہ مہاتما گاندھی نے بھی اسی راستے انڈیا سے کراچی تک کا سفر کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پاکستان کا سارا ریکارڈ مع خزانہ اسی راستے کراچی پہنچایا گیا اور بہاول پور کے معزز شہریوں پر مشتمل ایک وفد نے سمہ سٹہ اس ٹرین کا استقبال کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ریلوے کا یہ سیکشن غیر فعال اور ریلوے لائن کا ڈھانچہ بہت کمزور ہو گیا۔ چند سال قبل تک سمہ سٹہ سے امروکا تک صرف ایک پسنجر ٹرین اپ اور ڈاؤن چلتی رہی جس کی رفتار ریلوے لائن کے کمزور ہونے کے باعث بہت کم رکھی جاتی بعد میں یہ سہولت بھی جاتی رہی۔ بہاول پور سے بہاولنگر براستہ حاصل پور تقریباً 170 کلومیٹر کی سڑک ابتدائی طور پر اس وقت بنائی گئی جب وائسرائے انڈیا نے بہاول پور کا دورہ کیا۔ اس وقت اس سڑک پر صرف گاڑی کے پہیوں کے لیے تین چار فٹ کی اینٹوں کی لائنوں پر مشتمل سولنگ بچھائی گئی۔ اس راستے کو ریاست بہاول پور کے حکمران استعمال کرتے رہے۔ پاکستان بننے کے کئی سال بعد یہاں سنگل پختہ سڑک تعمیر کی گئی۔ چند سال قبل اس کی چوڑائی میں اضافہ کیا گیا۔ حاصل پور سے بہاول پور اب اسفالٹ سے بنی دورویہ سڑک دستیاب ہے۔ چشتیاں اور بہاولنگر جانے والی سڑک کی چوڑائی میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

حاصل پور میں بنیادی سطح پر اوسط درجے کا صنعتی انفراسٹرکچر اور زرعی صنعت کے فروغ کا رجحان پایا جاتا ہے۔تقریباً تمام قومی بنکوں کی شاخیں شہر کی صنعتی ترقی میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔زرعی انڈسٹری کا یہ شہر زرعی اجناس کی بہترین منڈی ہے۔ یہاں کی اہم اجناس میں کپاس، گندم، چاول، مکئی، جوار، باجرہ، سرسوں، سورج مکھی کے علاوہ اسبغول کی کاشت کے لیے بہت موزوں ہے۔شہر کے بازاروں میں ضروریات زندگی کی ہر چیز دستیاب ہے۔ ہر شہر کی طرح غیر ہنر مند کاروبار اور لیبر بھی عام ہے۔ یہاں کا کاروبار شہر اور دیہات پر مشتمل کاروباری حضرات کے کنٹرول میں ہے۔ یہاں بازار صبح جلدی شروع اور سر شام بند کرنے کا رواج ہے۔حاصل پور میں زیر زمین پانی کی کثافت Density بہت زیادہ ہے اور سیوریج سسٹم جدید خطوط پر استوار نہیں ہے۔ جہاں تک تعلیمی اداروں کا تعلق ہے، گورنمنٹ کے مرد اور خواتین کے ڈگری کالجز اور سکولوں کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ کالجز اور اداروں کا نیٹ ورک بھی موجود ہے جس سے اس شہر کی خواندگی کا تناسب بہت بہتر ہو چکا ہے اور اس میں اضافے کا رجحان موجود ہے۔اب یہ شہر ملک کے تمام شہروں سے ٹرانسپورٹ کے جدید ترین ذرائع کے ساتھ مربوط ہے۔ یہاں پر 24 گھنٹے کے دوران چشتیاں، بہاولنگر، ہارون آباد، فورٹ عباس، وہاڑی، بورے والا، لاہور، ملتان، بہاول پور اور کراچی کے لیے ہر طرح کی ٹرانسپورٹ مل جاتی ہے اور شہر کے مرکزی چوک میں تمام وقت ٹرانسپورٹ کی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔میونسپل ایڈمنسٹریشن نے دو سال پہلے یہاں سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر جنرل بس اسٹینڈ تعمیر کیا تھا مگر اپنی لوکیشن کے باعث اسے کامیاب نہ کیا جا سکا۔مرکزی چوک جس کا نام میزائیل چوک ہے، ہی میں تمام روڈ ٹرانسپورٹ دستیاب ہوتی ہے۔

بہاول پور کو ہم مرکز قرار دیں اور اس کے شمال مغربی جانب چلتے جائیں تو سرائیکی تہذیب وثقافت نمایاں ہوتی جاتی ہے۔اگر اس کے مشرق کی جانب خیر پور سے حاصل پور تک پہنچتے ہیں تو سرائیکی تہذیب و ثقافت کے نقوش کم ہوتے جاتے ہیں۔1922 تا 1930 تک ہیڈ ورکس کی تعمیر کے دوران ہونے والی آباد کاری سے قبل یہاں کی آبادی زیادہ تر نیلی بار کے مقامی کلچر پر مشتمل تھی جو دریائے ستلج کی جانب آباد تھی۔ یہاں پر سرائیکی اور نیلی بار کا مقامی کلچر مخلوط انداز میں موجود تھا اور اس علاقے کی زبان پر خالص سرائیکی اثرات کمزور پڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں پر سرائیکی اور نیلی بار کی مقامی زبان جسے پنجابی کا ٹھیٹھ لہجہ یا لہندے کی زبان بھی کہتے ہیں باہم ملتے اور جدا ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔آبادکاری کے بعد جو چک بندی کی گئی وہ زیادہ تر حاصل پور کے جنوب مغرب میں تھی لہٰذا ان چکوک کی آبادی پنجابی آبادکاروں پر مشتمل تھی۔اس طرح سے 1922 اور 1947 کے بعد یہاں ایک مخلوط سماجی اکائی وجود میں آئی جو آپس میں رواداری اور باہمی تعاون اور احترام کی فضاء میں زندگی گزار رہی ہیں۔ بہاول پور کے دوسری جانب یعنی ضلع رحیم یار خان میں جاگیرداری نظام کی گرفت ایسی ہے جو اب کمزور پڑ رہی ہے مگر حاصل پور میں جاگیرداری

نظام کسی پختہ اور روائتی شکل میں نہیں رہا۔شاید یہی وجہ ہے کہ یہاں ان علاقوں کی نسبت اوسط درجے کی صنعت کے فروغ کا رجحان زیادہ بہتر صورت میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں کی مقامی آبادی اپنی تہذیبی اور ثقافتی شناخت کے ساتھ موجود ہے۔ معاشرتی روابط میں چھوٹے شہروں والی مروت موجود ہے۔ آبادکاروں اور مقامی آبادی کے درمیان ادنیٰ سطح پر مقابلے کی لاشعوری کشمش موجود ہے مگر اس کا اظہار نہ ہونے کے برابر ہے۔تمام لسانی گروپوں کے ثقافتی بُعد نے کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں کیا۔ مذہبی طور پر بھی یہاں رواداری کی فضاء قائم ہے۔ 1947 سے بہت پہلے اولڈ حاصل پور کو مرکزیت حاصل تھی تو یہاں کے کاروبار پر ہندو زیادہ نمایاں تھے اور آج کی نسبت ان کی آبادی کا تناسب خاصا زیادہ تھا۔ مجموعی طور پر شہر کا مزاج دھیما اور پرسکون ہے۔ یہاں قدیم اور جدید دونوں طرز تعمیر کے مکان ہیں جو یہاں کے لوگوں کی مالی اور سماجی حیثیت کا تعین کرتے ہیں۔مجلسی زندگی بہت زیادہ متحرک نہیں ہے۔ معاشرتی سطح پر ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا زیادہ فعال ریکارڈ نہیں ملتا۔ شہر کی مجموعی فضاء پر زرعی سماج کی چھاپ گہری ہے۔ اختیارات کی نچلی سطح پر مرکزیت کے نئے بلدیاتی نظام کے نفاذ کے نتیجے کے طور پر یہاں کی نوجوان نسل سیاسی منظر پر نمایاں ہے۔ یہاں کے لوگوں کی رائے ہے کہ ماضی میں خصوصاً قومی سطح کی سیاسی قیادت کا تعلق حاصل پور سے براہ راست کم رہا ہے۔طویل تاریخ اور روشن تہذیبی روایات کے امین اس شہر نے ماضی کی طرح جدید دور میں بھی اپنی شناخت برقرار رکھی ہے۔ یہاں کے لوگ محنتی، جفاکش، صابر اور قناعت پسند ہیں۔شہر کے خمیر میں بھائی چارے اور آشتی کے عناصر کارفرما ہیں اس لیے انفراسٹرکچر اور بعض بنیادی سہولتوں کی غیر حوصلہ افزا صورت حال کے باوجود اس درویش صفت شہر نے کبھی احتجاج کا غیر مہذب انداز اختیار نہیں کیا۔ بہاول پور ڈویژن بالخصوص اور دیگر شہروں کے بارے میں بالعموم یہ کہا جاسکتا ہے کہ ملازمت کے سلسلے میں آنے والے ادیبوں، شاعروں اور ادب نواز لوگوں نے بھی مختلف شہروں میں اپنے قیام کے دوران وہاں پر علمی و ادبی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ حاصل پور میں ادبی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی اور چند تقریبات کے انعقاد میں یہاں کے اسسٹنٹ کمشنر فیاض تحسین اور حمید الدین بھٹی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ یہاں کی بلدیہ نے بھی ٹاؤن ہال کی فراہمی یا دیگر سطحوں پر یہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے ہمیشہ تعاون کیا۔''

اب آتے ہیں کالج کی طرف جہاں میں پرنسپل کے طور پر اپنے فرائض سنبھال چکا تھا۔ دراصل پرنسپل کی اسائنمنٹ ہمہ وقتی اور ہمہ جہت ہے۔ کسی تعلیمی ادارے کا سربراہ بننا تدریسی پیشے میں اعزاز کی بات ہے مگر اس اعزاز کو ایمان یا ایقان کی حد تک نبھانا پڑتا ہے۔ ہر فرد کے کچھ خواب اور آدرش ہوتے ہیں جو اس کے انتظامی رویے کو کنٹرول کرتے ہیں۔ میرے بھی انتظامی حوالے سے شعوری اور لاشعوری سطح پر کچھ نظریات اور آدرش تھے جنہوں نے میرے انتظامی رویے کی تشکیل میں اہم کردار کیا۔ان کی طرف پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ ہمارے معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حالات میں ایسے آدرشوں اور انتظامی نظریات کو عملی شکل دینے کے

لیے بہت زیادہ مشکلات اور کئی قسم کے دباؤ کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ اگر یہ باتیں شعوری سطح پر کنوکشن کی ایک ٹھوس صورت اختیار کر لیں تو کامیابی کی طرف جانے کے امکانات زیادہ ہو سکتے ہیں۔ ہماری صورت حال میں انتظامی عہدہ بہت آسان نہیں ہے۔ آپ کو مختلف پریشرز میں سے ایک راہ نکالنی پڑتی ہے اور میں خود اعتمادی سے کہہ سکتا ہوں کہ میں وہ راہ نکالنے میں خاصی حد تک کامیاب رہا۔

چلیے آپ کو مئی 2000 کی ایک جھلسا دینے والی گرم دوپہر کی طرف لے چلتا ہوں کہ جب میں نے حاصل پور ڈگری کالج میں بطور پرنسپل جوائن کرنے کے لیے زندگی کا پہلا قدم رکھا۔ کالج داخل ہوتے ہی لو کے تھپیڑوں نے استقبال کیا اور ریت کے ٹیلوں سے اڑ کر آنے والی ریت نے سانس اور منہ میں داخل ہو کر اپنے طاقت ور اور مستقل بالذات ہونے کا احساس دلایا۔ ریت کے ذائقے سے ایک منفی خیال ذہن میں آیا کہ کہیں میں نے گورنمنٹ ڈگری کالج حاصل پور کا انتخاب کر کے ریت پر گرفت تو نہیں ڈال دی مگر میں نے ذہن سے یہ بات ایک عام سے خیال کے طور پر جھٹک دی۔ سٹاف روم میں تمام سٹاف ممبرز منتظر تھے لہٰذا ایک محدود فارمل سی تقریب ہوئی۔ تمام دوستوں سے تعارف کے بعد مجھے تاثرات کا موقع دیا گیا تو میں نے اپنی انتظامی پالیسی یا ترجیحات کے خط وخال کا خاکہ پیش کیا جو یہ تھا۔

☆ میں بنیادی طور پر اخلاقی اور انسانی اقدار کا قائل ہوں لہٰذا میری تمام انتظامی پالیسی میں اس بات کو اہم ستون کی حیثیت حاصل رہے گی۔ ☆ میں بنیادی طور پر استاد ہوں اور استاد کے طور پر ہی اپنی شناخت کو جاری رکھنا پسند کروں گا۔ ☆ میں مزاجاً کمٹ منٹ کے ساتھ کام کرنے کا واضح رجحان رکھتا ہوں لہٰذا کالج سے وابستہ تمام افراد کو بھی پیشہ وارانہ کمٹ منٹ کے رجحان کو بنیاد بنا کر کام کرنے کے رجحان کا حامل دیکھنا پسند کروں گا۔ ☆ میں ادب کا طالب علم ہوں اس لیے جمالیاتی و اخلاقی بنیاد پر استوار ہونے والی تعلیمی اقدار کے فروغ کو ترجیح دونگا۔ ☆ کالج کیمپس شہری زندگی کے بڑے دھارے سے منقطع ہے۔ اس کا رابطہ شہری کمیونٹی سے مستحکم کرنے کی کوشش کروں گا۔ ☆ طالب علم کسی بھی تعلیمی ادارے کے وجود کا جواز ہے اس لیے ان کے کردار کو کالج کی تعمیر و ترقی میں فعال بنانا بہت ضروری ہے۔ طالب علم کالج میں ایک نصب العین لے کر آتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کا حصول ممکن بنائیں اور اس کی شخصیت سازی اس انداز میں کریں کہ ایک مفید اور کامیاب فرد کے طور پر اسے معاشرے کے سپرد کریں اور کوئی بھی طالب علم مجھ سے کسی بھی وقت مل سکتا ہے۔ ☆ کالج کا انفرا سٹرکچر بہت کمزور ہے جسے مضبوط و معیاری بنانا از حد ضروری ہے۔ ☆ استاد کے احترام اور تمام سٹاف کی عزتِ نفس پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوگا۔ ☆ میں محبت سے معاملات کو سلجھانے کا مزاج رکھتا ہوں اور اس کو ایک طاقتور قوت تصور کرتا ہوں۔ ☆ ہر سٹاف ممبر سے میرا ذاتی رابطہ و تعلق ہوگا جسے کالج کے مفاد میں استعمال کرنے کی کوشش کروں گا۔ ☆ تمام سٹاف کے ذاتی مسائل کے حل میں ہر ممکن سعی کروں گا۔

خود سے پہلے کا احوال جاننا بہت ضروری تھا۔ اگلے چند دنوں کے دوران میں نے سابقہ پرنسپل،

وائس پرنسپل سے تبادلہ خیال کیا اور ہر استاد سے ذاتی ملاقات کر کے ان کی صلاحیتوں اور رجحانات کے ذریعے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کونسا استاد ادارے کے مفاد میں کیا کام کرنے کی غالب صلاحتیوں کا حامل ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ ادارہ بہت سے امور میں غیر معمولی محنت کا طالب ہے اور یہاں بڑے پیمانے پر کام کرنے کا سکوپ ہے۔ میں نے انہی ترجیحات کے مطابق ممکنہ اہداف کے حصول کی ہمیشہ کوشش کی اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اطمینان کی حد تک اس میں کامیاب رہا۔

اب میں ان امور کی طرف آتا ہوں کہ جن پر انسانی بس میں ممکنہ حد تک میں نے عمل کرنے کی کوشش کی یا ان کو پیش نظر رکھا، اس تصور اور جذبے کے ساتھ کہ کسی بھی تعلیمی ادارے کی ہمہ جہت ترقی کے لیے کسی بھی سربراہ ادارہ کو ان باتوں کو ضرور اہمیت دینی چاہیے۔ میں اس بات کا بھی قائل ہوں کہ ہمارے سماجی و معاشی ڈھانچے یا حالات میں کبھی کوئی مثالی صورت حال پیدا نہیں کی جا سکتی۔ اگر مستقل مزاجی سے ان کے لیے کوشش کی جائے تو کم از کم سطح پر اس کا حصول ہی مثالی قرار دیا جا سکتا ہے۔

میری اولین ترجیح رہی کہ میں بہترین تعلقات کار کی فضاء قائم کروں اور اس طریق کار کے ذریعے دوستی کی فضا قائم کر کے کالج کے مفادات کے لیے کام کروں اور دوستوں کا تعاون حاصل کروں۔ یہ اسی جذبے کا اعجاز تھا کہ تمام سٹاف سے میرے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔ میری تدریسی زندگی کا یہ مشاہدہ ہے کہ پرنسپل کی عدم موجودگی میں کالج سے وابستہ سٹاف آسودہ محسوس کرتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک منفی رویہ ہے اور یہ پرنسپل کے انفرادی انتظامی رویے کا ردعمل بھی ہو سکتا ہے۔ اخلاقی سطح پر بھی یہ بات عجیب محسوس ہوتی ہے کہ لوگ آپ کی عدم موجودگی کو ترجیح دیں لہٰذا میں نے اپنے انتظامی رویے کو اس انداز سے تشکیل کیا کہ میں اگر نہیں ہوں تو بھی لوگ آسودگی سے کام کرتے رہیں اور اگر میں موجود ہوں تو بھی اسی آسودگی کی صورت حال برقرار رہے۔ میں نے سٹاف کے ساتھ ایک ایسے رویے کو ترجیح دی کہ جس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ ادارے کو پہنچے۔ آپ جب کسی ادارے میں کام کرتے ہیں تو وہاں مختلف مزاج کے لوگ ہوتے ہیں، کچھ لوگ فطری طور پر اپنے فرائض کی ادائیگی احسن طریقے سے کرتے ہیں۔ کچھ لوگ آپ کے محبت کے رویے کو کمزوری بھی تصور کر سکتے ہیں۔ میں نے وسعت قلبی کے ساتھ مؤخر الذکر لوگوں کو بھی محبت کی زنجیر سے باندھنے کی کوشش کی اور خاصی حد تک کامیاب ہوا۔ کبھی کسی کی عزت نفس کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ میں سٹاف سے تعلقات کو اس سطح پر لے آیا کہ میں جب یہاں نہیں بھی ہوں گا تو بھی ان تمام احباب سے ذاتی تعلق و ربط کی ایک صورت برقرار رہے گی۔ میں نے اپنی بات کو ٹھونسنے کی بجائے دلیل کا راستہ اختیار کیا اور اگر کسی نے دلیل کے ساتھ اپنی رائے کو سچ ثابت کیا تو اسے تسلیم کرنے میں کسی تامّل سے کام نہیں لیا۔ میں نے یہاں دلیل کے حوالے سے جو بات کی ہے اس نے میری بہت معاونت کی۔ اگر آپ کے پاس ٹھوس دلیل ہے تو آپ خود اعتمادی کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ کئی مواقع پر میں نے دلیل کو استعمال میں لا کر خود کو مشکل صورت حال سے نکالا، مثلاً متعدد بار

مختلف مسالک کے فعال لوگ آئے اور انہوں نے کالج کے طلباء سے خطاب کرنے کا موقع فراہم کرنے کی بات کی۔ میں نے ان کے سامنے بڑے معتدل اور نارمل انداز میں ٹھوس دلائل سے ثابت کیا کہ اس قسم کے خطاب سے مجموعی طور پر کالج کو فائدہ کی بجائے نقصان پہنچے گا۔ان لوگوں نے میری باتوں کو تسلیم کیا اور کالج کی تعمیر وترقی میں معاونت اور کالج کی غیر جانبدارانہ فضا میں عدم مداخلت کا وعدہ کر کے گئے۔اسی طرح کھاتے پیتے گھرانوں کے کچھ طلبا نے اپنی چودھراہٹ کے شوق میں ایک گروپ بنا کر ڈسپلن کے مسائل پیدا کرنے کی کوشش کی۔ پہلے تو ان کو چند چانس دے کر وارننگ دی جاتی رہی اور پیار سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ باز نہ آئے تو ایک واقعہ کے نتیجے میں ڈسپلن کمیٹی کی سفارش پر انہیں خارج کر دیا گیا۔اس معاملے میں ان کے والدین کو دلیل سے سمجھایا کہ یہ بچے پڑھنا نہیں چاہتے۔تمام تر چانسز کے باوجود یہ باز نہیں آئے لہٰذا کالج کی تعلیمی فضا کو نقصان سے بچانے کی خاطر یہ انتہائی اقدم اٹھانا پڑا۔اس کے بعد حسب دستور سیاسی سفارشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا مگر ہر سفارشی کو دلیل کے ساتھ حقیقت حال بتائی اور ان سب کو قائل ہونا پڑا۔

میں ذاتی طور پر ادب کا طالب علم ہوں لہٰذا جمالیاتی اقدار کو ترجیح دیتا ہوں۔ جمالیات ایک بلیغ اصطلاح ہے جو انسان کے داخلی اور معروضی رویوں کا احاطہ کرتی ہے۔اگر آپ میں یہ چیز راسخ ہے تو ادارے کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔سچائی، ایمانداری، مہربان رویہ، پسندیدہ اخلاق اور فرض شناسی بھی جمالیاتی اقدار ہیں۔ خوبصورت تعلقات کار، بہتر تعلیمی اقدار، طلباء کی اچھی اخلاقی تربیت، اچھا تعلیمی ماحول، خوبصورت ادارہ، ترتیب وتنظیم، نظم وضبط، اچھے نتائج، غرضیکہ یہ احساس ہمہ جہت ہے۔ میں نے اس احساس کو انسانی حد تک ہر ممکن ترجیح دی جس کا نتیجہ لوگوں نے کالج کی بہتر تعلیمی فضاء، مضبوط انفراسٹرکچر، بہتر تعلقات کار اور کالج کے تمام شعبوں میں خوشگوار تبدیلیوں کی صورت میں دیکھا۔کالج کے مجموعی تعلیمی امیج کے بہتر ہونے کا یہ فائدہ پہنچا کہ طلباء کی تعداد تقریباً دوگنی ہوگئی۔

کسی بھی ادارے میں اگر اعتماد کی فضا نہیں تو اس سے ادارے کو قطعی طور پر فائدہ نہیں پہنچتا۔اگر ادارے سے وابستہ افراد اور ان کی صلاحیتوں پر بھروسہ کیا جائے تو اس کے اچھے نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ میں خود بھی اعتماد کی فضاء کے بغیر کام نہیں کر سکتا اس لیے سٹاف کے تمام ارکان کی صلاحیتوں پر اعتماد کیا اور اعتماد کی بہتر اور پسندیدہ فضاء قائم کی۔مزید برآں محبت ایک خیر کی قدر ہے اور بہت طاقتور بھی، اس کو استعمال میں لا کر چاہے نتائج تاخیر سے حاصل ہوں، حاصل ضرور ہوتے ہیں۔ایسی فضاء میں کام کر کے مجھے ذاتی طور پر آسودگی ملتی ہے۔اس کی کسی قدر تفصیل میں سٹاف کے ساتھ تعلقات میں بیان کر چکا ہوں۔

طالب علم کسی بھی ادارے کا بنیادی جواز فراہم کرتا ہے۔اس طرح طالب علم کو تعلیمی ادارے میں مرکزی حیثیت حاصل ہے بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ طالب علم کا وجود ہی کسی تعلیمی ادارے کو معنویت اور جواز عطا کرتا ہے لہٰذا کسی بھی تعلیمی ادارے کے سربراہ کی سوچ اور عمل مکمل طور پر طالب علم کی سمت Student)

(Oriented) ہونا چاہیے۔ میں نے اپنی سوچ اور رویوں کو اسی طرح بنانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ میری تمام تگ و دو کا محور طالب علم رہا ہے۔ میں نے طلبا سے بلا واسطہ رابطہ رکھنے کو ترجیح دی۔ میں نے اپنی جوائننگ کے ایک ہفتہ بعد ہی پرنسپل آفس پر یہ تختی آویزاں کی ''طلبا پرنسپل سے ہر وقت مل سکتے ہیں'' اور اس پر ہر ممکن عمل بھی کیا۔ کالج کی تعمیر و ترقی میں طلبا کے کردار کو متحرک کرنے کے لیے پرنسپل آفس کے باہر ایک ''تجاویز و شکایات'' بکس رکھوایا اور یہ موقع فراہم کیا کہ طلبا کالج کو کیسا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ نفسیاتی طور پر طلباء کے جذبات و احساسات کو جاننے کا ذریعہ بھی ثابت ہوا۔ اس بکس کے ذریعے موصول ہونے والے تجاویز اور شکایات کا باقاعدہ رجسٹر میں اندراج کے ساتھ ریکارڈ رکھا جاتا۔ اچھی تجاویز پر فوراً عمل کیا اور شکایات کو ان کے جواز کے مطابق حل کیا۔ اس اقدام سے طلباء کے ذہنوں کو پڑھنے کا موقع ملا۔ اگر کسی استاد کے اتفاقی رخصت پر ہونے کے باعث کلاس خالی دیکھی تو کلاس میں خود چلا گیا اور طلبا سے علمی اور درسی یا عمومی سطح کی گفتگو کی۔ اس سے جہاں طلباء سے براہ راست رابطے کو تقویت ملی وہاں بحیثیت استاد بھی ان سے ربط مستحکم ہوا اور تدریس کی خواہش کی تسکین بھی ہوتی رہی۔ طلبا کو یہ باور کرایا کہ یہ ادارہ آپ کا اور آپ کے لیے ہے۔ کالج کے فیڈنگ ایریا کے معاشی اور سماجی حالات کے پیش نظر مائیگریشن کو اوپن کیا اور کالج کے محدود وسائل کے باوجود'' کالج میں داخلہ حاصل پور کے لوگوں کا بنیادی حق ہے'' کی بنیاد پر سیٹوں کی تعداد بڑھائی۔ 2001 میں سال بھر کی تدریسی اور غیر تدریسی سرگرمیوں پر مشتمل تعلیمی کیلنڈر متعارف کرایا اور اسے ہر سال کے کالج پراسپیکٹس کا حصہ بنایا۔ ہم نصابی سرگرمیوں کے رجحان کے فروغ کے لیے اقدامات کیے۔ داخلی امتحان کی روایت کو مستحکم کیا، ہر امتحان کے رزلٹ کارڈز کی سکیم متعارف کرائی۔ اوپن ڈے کے ذریعے والدین کو ان کے بچوں کے نتائج اور امتحانی کارکردگی سے آگاہ کیا، اساتذہ، طلبا اور والدین تین اہم فریق ہیں۔ اوپن ڈے کے ذریعے تیسرے اہم ترین فریق کے کردار کو دریافت کیا۔ اس تحریر میں جہاں کہیں بھی کامیابی کے دعوے کیے گئے ہیں وہاں اس بات کو بنیادی تصور کیا جائے کہ اشارہ کسی ایک فریق کی طرف نہیں ہے بل کہ تمام کامیابیوں اور اہداف کے حصول میں کالج سے وابستہ ایک استاد سے لے کر بیلدار تک تمام لوگوں کی اجتماعی کوششوں کا دخل رہا۔ کالج میں کمپیوٹر کلاسز کا آغاز میرا جنون تھا۔ میں نے فوری طور پر پنجاب حکومت کی کمپیوٹر پالیسی کی روشنی میں انٹر کی سطح کی کلاسز کا کیس بھیجا جسے منظور کر لیا گیا اور ڈگری سیکشن میں موجود ایک بڑے کمرے میں حکومت کی منظور شدہ فرم کے ذریعے کمپیوٹر لیب قائم کی اور کمپیوٹر کلاسز کا آغاز کیا۔ بعد میں کلاسز کا دائرہ کار ڈگری کلاسز تک بڑھا دیا گیا۔

انسان کی نجی اور اجتماعی زندگی ترتیب و تنظیم سے عبارت ہے جہاں ایسا نہیں ہوگا وہاں انتشار اور فرسٹریشن کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ انسان کی اجتماعی زندگی کو منضبط کرنے کے لیے سٹیٹ قوانین کا نفاذ کرتی ہے۔ اجتماعی اور قومی اداروں کو چلانے کے لیے بھی قواعد و ضوابط مرتب کر کے نافذ کیے جاتے ہیں لہٰذا کسی ادارے

کے منتظم کے لیے ان تمام قواعد وضوابط اور قوانین کا جاننا ضروری ہے جن کے تحت ادارے کے ہر فرد کے اختیارات اور فرائض کا تعین کیا جاتا ہے۔ گورنمنٹ ملازمین کے لیے مختلف سول سرونٹ ایکٹ دیگر قوانین ہیں۔ تعلیمی ادارے کو چلانے کے لیے پنجاب ایجوکیشن کوڈ رہنما اصول فراہم کرتا ہے۔ اس طرح ادارے کے فنانسز اور گرانٹس کے لیے بھی اصول وضوابط اور طریق کار تجویز کیے گئے ہیں۔ ایسے قوانین کو ان کی صحیح تشریح کے ساتھ جان کر ادارے کو چلانے میں بہت آسانی رہتی ہے۔ اس سے پہلے عمومی سطح پر تھوڑے بہت انتظامی تجربے کے باعث مجھے ان قواعد کا تھوڑا بہت علم تھا مگر منتظم کی حیثیت سے میں نے ان کا مطالعہ کرنے اور انہیں جاننے کو ترجیح دی۔ میں جتنی بھی دیانتداری کا دعویٰ کروں مگر میرے فنانسز میں ڈسپلن نہ ہو تو ایمانداری کے دعوے کو باطل ثابت کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ ہر سال آڈٹ کرایا، آڈٹ رپورٹس کی تکمیل کر کے آئندہ آڈٹ پر پیش کرنے پر تکمیل شدہ اعتراضات دور کرائے۔ خود کو فنانشل رولز میں محدود رکھا۔ کالج میں سروسز کو بہتر بنانے کے لیے غیر معمولی اقدامات بھی کیے اور ان کا جواز فراہم کیا۔ کالج میں کچھ کام ایسے بھی کیے کہ جن میں ''یہ کمپلیکس'' بنیاد بنا کہ بعض پرائیویٹ ادارے اپنی Outlook اور سروسز سے اچھا تاثر چھوڑتے ہیں ہم اپنی سروسز کی کوالٹی کیوں بہتر نہ بنائیں۔ شاید سپلٹ اے سی، جنریٹر، انٹرکام، کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ، کمپیوٹرائزڈ خط وکتابت، تمام شعبوں میں کارپٹ، پردے اور اچھے فرنیچر اور اچھے ساز وسامان کی فراہمی اسی ''کمپلیکس'' یا شوق کا نتیجہ ہیں۔

گورنمنٹ کے تمام دفاتر اور اداروں کے کنٹرولر آفس ہیں جو ادارے سے مربوط ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے ڈی ای او یا ڈپٹی ڈائریکٹر (کالجز)، ڈویژنل ڈائریکٹر کالجز یا ای ڈی او (ایجوکیشن)، ڈی پی آئی (کالجز) یا اس سے اوپر کنٹرولنگ اتھارٹیز تھیں۔ اسی طرح کچھ محکمے ایسے ہیں جن سے حکومتی سطح پر رابطہ رہتا تھا جیسے محکمہ بلڈنگز، ورکس اور دیگر متعلقہ محکمے۔ ان اتھارٹیز کے ساتھ اچھے تعلقات سے ادارے کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ ان اتھارٹیز سے باقاعدہ اور اچھا ربط وتعلق رکھنا، ان کی طرف سے آمدہ ہدایات پر عمل کرنا، ان کے ساتھ خط وکتابت میں باقاعدگی رکھنا ہر ادارے کے سربراہ کا فرض ہے اور میں نے ان امور پر پوری توجہ اور وابستگی کے ساتھ عمل پیرا ہونے کی کوشش کی۔ آمدہ ہدایات پر فوری عمل درآمد کو ممکن بنایا، متعلقہ اتھارٹیز سے بہتر تعلقات کار رکھے اور ان کو کالج کے مسائل اور پیش رفت سے پوری طرح آگاہ رکھا۔ ہر تعلیمی سال کے اختتام پر یعنی 30 اپریل کے بعد کالج کی سالانہ رپورٹ مرتب کی جو تمام سال کے دوران کالج میں ہونے والی سرگرمیوں اور مختلف اوقات میں کیے جانے والے اقدامات اور ان کے نتائج اور مستقبل کے پروگرام پر مشتمل ہوتی تھی۔ اس رپورٹ کو کالج گزٹ میں شائع کرنے کے علاوہ متعلقہ اتھارٹیز کو باقاعدگی سے بھجوانے کی روایت کا آغاز کیا اور اسے برقرار رکھا۔ کسی بھی انتظامی سربراہ کے لیے تخلیقی ہونا ادارے کے مفاد میں بے حد اہم ہے۔ سربراہ کو سٹاف کے ساتھ مشاورت سے ہر زاویے سے غور وفکر کرنا چاہیے کہ ادارے کی ترقی اور طلبا

کے مفادات کے لیے کیا کیا اقدامات ہو سکتے ہیں؟ میں نے ادارے اور طالب علم اور سٹاف کے مفادات کے لیے اپنے تخیل کو ہر ممکن متحرک رکھنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں پہلے بھی خاصی باتیں کر چکا ہوں۔ کچھ حوالے اب پیش کر رہا ہوں مثلاً ایک دن مجھے خیال آیا کہ طلبا کے ٹائیلٹس میں صابن اور آئینہ ہونا چاہیے، دو تین دن میں اس پر عمل درآمد ہو گیا۔ اس طرح خیال آیا کہ کالج کے تعلیمی بلاک میں اہم جگہوں پر قد آور آئینے لگانے چاہئیں تاکہ طلبا اپنے آپ کو چیک کر سکیں۔ سٹاف روم میں بھی ایک قد آور آئینہ ہونا چاہیے۔ کلاس رومز اور دفاتر کی نشاندہی کے لیے خوبصورت پلیٹس ہونی چاہئیں۔ دفاتر اور دیگر شعبوں کو اپنے ساز و سامان اور خوبصورتی کے ذریعے اچھا تاثر دینا چاہیے۔ ریڈنگ روم میں زیادہ گنجائش پیدا کرنے اور نجی مطالعے کے لیے دیواروں کے ساتھ ریڈنگ کیبن ہونے چاہئیں۔ کالج کا اپنا کلر اور فلیگ ہونا چاہیے۔ کالج اوقات میں قومی پرچم اور کالج فلیگ کو لہرانا چاہیے، رات کے اندھیرے میں روشنی کا انتظام ہونا چاہیے۔ مندرجہ بالا و دیگر اقدامات کے بارے میں سوچا جاتا رہا اور ان پر عمل درآمد کیا جاتا رہا۔

ادارے کے سربراہ کے لیے پبلک اور والدین سے رابطہ از حد ضروری ہے۔ اچھی پی آر سے ادارے کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ اگر پبلک کو ادارے کی تعمیر و ترقی سے وابستہ (Involve) کر دیا جائے تو اس سے کئی پروجیکٹ مکمل کیے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر بزنس کمیونٹی سے ربط قابل ذکر ہے۔ میں نے کالج کے لیے نقد رقم کبھی قبول نہیں کی البتہ قائل کر کے پروجیکٹس ضرور لیے ہیں۔ میں نے ذاتی تعلقات کو کالج کے مفاد میں استعمال کیا۔ طلبا کے بیٹھنے کے لیے سیمنٹ کے بنچوں کی تنصیب، انڈر گراؤنڈ وائرنگ کے ساتھ رات کو روشنی اور خوبصورتی کے لیے گلوبز کی تنصیب، نیا کالج گیٹ اور اس پر کالج کے نام کا منفرد بورڈ، طلبا کے پینے کے لیے پانی کی ٹینکی کی تعمیر، KV3 کا جنریٹر، پرنسپل آفس کے دروازے اور کھڑکی کی تبدیلی، سٹاف کے لیے سائیکل سٹینڈ کی تعمیر، گراؤنڈز کی لیولنگ بذریعہ بلڈوزر، 2001 میں ضلعی حکومت کے ناظم سے 12 لاکھ کے پروجیکٹس کا حصول بہتر پی۔ آر، مؤثر ترجمانی اور ذاتی تعلقات کا نتیجہ تھے۔

محکمہ کی طرف سے ہر سال سیلری اور نان سیلری بجٹ ملتا ہے جس سے کالج کا نظام چلانے کے علاوہ سروسز کو بہتر بنایا جاتا ہے۔ طلبا سے مجوزہ فنڈز لیے جاتے ہیں۔ اگر بجٹ کو متعلقہ مقاصد کے لیے متعینہ طریقِ کار کے ساتھ خرچ نہ کیا جائے تو وہ ہر سال 30 جون کو سوخت (Lapse) ہو جاتا ہے۔ فنڈز کے بارے میں تصور یہ ہے کہ جس سال جو طلبا فنڈز دیتے ہیں اسی سال ان کے مفاد میں انہیں خرچ کیا جانا چاہیے۔ سربراہ ادارہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ مہیا کردہ رقوم کو طریق کار کے تحت متعینہ مدت میں کالج پر صرف کر دے۔ اس سے تعلیمی ادارے کے اثاثوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ بہتر خدمات اور وسائل مہیا ہوتے ہیں۔ فنڈز کو جمع در جمع (Pile up) کرنے کی بجائے ان کی متعین شدہ حدود میں رہ کر ادارے کے وسائل اور سروسز میں اضافہ کرتے رہنا چاہیے۔

یہ کالج چوں کہ انفراسٹرکچر کے حوالے سے حوصلہ شکن حالات سے دوچار تھا اور ریت کے ایک ٹیلے پر واقع تھا۔ دو اطراف میں ریت کے ٹیلے اور تیسری جانب دیوار نما ریل کی پٹڑی تھی اور شہر یہاں سے پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا لہٰذا میں نے کوشش کی کہ بجٹ کی ایک پائی بھی ضائع نہ ہو اور وہ تمام پروجیکٹس مکمل کیے جائیں جن سے اس کے وسائل بہتر ہوں اور جس کی بنیاد پر بہتر تدریسی خدمات مہیا کی جاسکیں۔ اسی طرح کالج کے تعمیراتی پروجیکٹس متعلقہ سرکاری محکموں کے ذریعے مکمل کیے جاتے ہیں۔ ان سے جہاں بہتر تعلقات سودمند رہے وہاں اگر محکمہ نے کسی پروجیکٹ مثلاً سالانہ مرمت اور دیکھ بھال کے لیے تخمینے طلب کیے تو انہیں متعلقہ محکمے کی معاونت سے فوراً مہیا کیا گیا۔ ایک دن حاصل پور کے اسسٹنٹ کمشنر جناب عبدالغفور بھٹی (حال مقیم لاہور) کا فون آیا کہ میں نے اپنے بیٹے کا امتحانی داخلہ فارم تصدیق کروانا ہے، کیا میں کسی کے ہاتھ بھیج دوں یا خود آؤں، میں نے جواباً کہا کہ خود آئیں تو زیادہ بہتر ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ خود آ گئے۔ بڑے تپاک سے ملے، فارم میں نے کلرک کو دیا کہ وہ ضروری کارروائی کے بعد تصدیق کے لیے لائے اور ہم دونوں باتوں میں مشغول ہو گئے۔ دو ایک دوست ہمارے مشترک نکلے۔ میں نے انہیں کالج کی لوکیشن کے حوالے سے بہت سے مسائل سے آگاہ کیا اور اس ضمن کردار ادا کرنے کو کہا۔ میں نے ایک تجویز پیش کی کہ حاصل پور کی کمیونٹی کو متحرک کرنا چاہیے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنے دفتر میں حاصل پور کی تجارتی تنظیموں کے کرتا دھرتا افراد کو بلا کر ایک اجلاس کرا دیں۔ انہوں نے وعدہ کر لیا اور بعد میں ہم نے ایک دن بھی مقرر کر دیا۔ جیسے ہی لوگ ان کے دفتر میں اکٹھے ہو گئے تو مجھے فون کیا کہ اب پہنچ جائیں۔ میں، وائس پرنسپل اور ایک اور رفیق کار پہنچ گئے۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے اجلاس کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ آج میں نے نہیں بل کہ پرنسپل صاحب نے آپ کو بلایا ہے اور وہ آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنی گفتگو کے پہلے حصے میں ان کو کالج میں ان کے عدم کردار کے حوالے سے اتنا جذباتی کر دیا کہ انہوں نے متفقہ طور پر مجھ سے میرا پلان پوچھا۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ کالج کے بہتر انفراسٹرکچر اور دیگر امور کے لیے ایک مشترکہ اکاؤنٹ کھولیں اور مطلوبہ رقوم اس میں جمع کرائیں۔ اس اکاؤنٹ کے آپریشن میں ہمارا کوئی کردار نہیں ہوگا۔ میں آپ کو پروجیکٹ بتاؤں گا اور آپ اپنی نگرانی میں اس کو مکمل کرائیں گے۔ فی الحال طلبا کے لیے پینے کے پانی کی ٹینکی اور کالج کے ساتھ واقع ریت کے ٹیلوں کی لیولنگ کرا دیں۔ پانی کی ٹینکی بھی بن گئی، ریت کا ٹیلہ مکمل برابر تو نہ ہو سکا تاہم اس کی اونچائی کا غرور کسی قدر کم ہو گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد حاصل پور کے سٹیڈیم میں تحصیل کی سطح کی کھیلوں کی تقریب تھی جس میں بہاول پور کے ڈپٹی کمشنر محمد طاہر مہمان خصوصی تھے۔ میں بھی اس تقریب میں مدعو تھا۔ میں نے محنت کر کے کالج کے ایسے مسائل کی سمری تیار کی جس میں ڈپٹی کمشنر مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ یہ بات میں نے اے سی صاحب کو بتائی تو انہوں نے میری نشست ڈپٹی کمشنر کے ساتھ رکھی اور ان سے تعارف بھی کرایا۔ دوران تقریب جہاں موقع ملتا ان سے کالج کے حوالے سے گفتگو کر لیتا۔ تقریب کے اختتام پر میں نے انہیں

تیار کردہ سمری دی تو مجھے بہاول پور کے کیمپ آفس میں ملنے کو کہا۔ دو تین دنوں بعد میں ان سے ملا تو کہنے لگے کہ کالج کے ساتھ پڑی ہوئی پانچ ایکڑ کی سرکاری زمین کالج کو دینے کی تجویز تو میں نے کارروائی کے لیے متعلقہ دفتر بھجوا دی ہے، دوسری تجاویز کو بھی آہستہ آہستہ دیکھتے رہیں گے۔ بہاول پور سے حاصل پور روزانہ جانے آنے والوں میں ایک بزرگ گرداور ملک بشیر احمد بھی ہمارے ہم سفر ہوتے۔ میں نے چند دنوں بعد ان سے ذکر کیا تو انہوں نے بتایا کہ آپ کا کیس ریونیو بورڈ پنجاب برائے منظوری بھیجا جا چکا ہے، جیسے ہی منظوری آئی آپ کو مطلع کر دوں گا۔ ایک ماہ کے بعد وہ ایک بڑے سائز کے رجسٹر اور پٹواری کے ساتھ کالج آئے اور کہنے لگے " آج میں آپ کو ان پانچ ایکڑوں کی نشان دہی کرنے آیا ہوں جو آپ نے مانگے تھے''۔ اس کے بعد انہوں نے کالج کے کل رقبے کی معلومات اور اس کا ریکارڈ بھی مہیا کیا۔ (2016 کے بعد پروفیسر محمد طارق گل جب پرنسپل تھے تو انہوں نے چند ایکڑ مزید زمین کالج کے لیے حاصل کر کے اس کے رقبے میں خاصا اضافہ کیا۔)

یکم جولائی 2001 کے بعد کسی دن عبدالغفور بھٹی صاحب کا فون آیا کہ نئے انتظامی سسٹم کے متعارف ہونے سے اسسٹنٹ کمشنر کے بہت سے اختیار ختم کر دیے گئے ہیں۔ اب یہ عہدہ ڈپٹی ڈسٹرکٹ آفیسر (ریونیو) میں بدل چکا تھا۔ ڈسٹرکٹ ناظم کو اس میں کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ پہلے ضلعی ناظم محمد طارق بشیر چیمہ تھے۔ میں نے تحصیل ناظم سید سجاد حسین بخاری کے ذریعے ضلعی ناظم کو کالج کی سالانہ کھیلوں کے آخری دن بطور مہمان خصوصی بلا لیا ور کالج کی سامنے والی چار دیواری اور دو اطراف میں ریز روائر والی فینسنگ کا مطالبہ کیا جو انہوں نے تسلیم کر لیا۔ یوں یہ وہ پہلا ادارہ بن گیا جس میں نئے نظام کے تحت کوئی منصوبہ مکمل کیا گیا۔ کوئی بھی شخصیت منصوبے کی قبولیت کا اعلان کر کے چلی جاتی ہے، اب یہ ادارے کے سربراہ کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس کیس کو تیار کر کے برائے منظوری و بجٹ متعلقہ اتھارٹی تک بھجوائے۔ میں نے محکمہ کمیونیکیشن اور ورکس کے تحصیل سب انجینئر کو چائے پر دعوت دی اور انہیں اعلان کردہ منصوبے کا پی سی ون تیار کرنے کو کہا۔ اسے اس بات پر بھی قائل کیا کہ اعلان شدہ منصوبے میں جو ریز روائر دو طرفہ تھی اسے سامنے والی دیوار کے بعد تین طرفہ ہی کر دے یوں تمام کالج محفوظ ہو جائے گا۔ مزید متوقع منصوبوں میں کالج ہال اور لائبریری کی عمارتوں کو بھی ذہن میں رکھیں۔ ڈویژنل ورکنگ پارٹی کے آئندہ اجلاس میں پی سی ون منظور کر لیا گیا اور ضلع کونسل کے اجلاس میں بجٹ بھی، جلد ہی کام شروع ہو گیا۔ اس مرحلے پر میں حاصل پور کے سابق اے سی عبد الغفور بھٹی اور انجمن تاجران کے بھرپور تعاون کو ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں۔ انجمن تاجران کے نمائندگان شیخ محمد عالم اور چودھری رحمت علی، حاصل پور کی ایک یونین کونسل کے ناظم اور دوست چودھری عبدالشکور اور نیشنل بنک کے منیجر اور دوست ضیاء الحق نے کالج کی تعمیر و ترقی میں بہت دلچسپی لی اور اپنی جیب سے چند منصوبوں کی تعمیر و تکمیل میں بہت معاونت کی۔

کالج کی تعمیر وترقی اور تعلیمی بہتری کے اقدامات اور نتائج کو ریکارڈ پر لانا بہت ضروری ہے ورنہ ہر چیز رزقِ ہوا ہو جاتی ہے۔ جب وہ ریکارڈ طلبا اور پبلک میں پہنچتا ہے تو ادارے کا امیج بہتر ہوتا ہے اور بہتر رائے قائم ہوتی ہے، ساتھ ساتھ تاریخ اور ریکارڈ بھی مرتب ہو جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے تعلیمی سال کے اختتام پر سالانہ رپورٹ کے اجرا کیساتھ ساتھ کالج گزٹ کے نام سے کالج کا اخبار سال میں دو دفعہ شائع کرنے کی روایت کا اجراء کیا اور تمام باتوں کو ریکارڈ کا حصّہ بنایا۔ یہ کام میں نے خود کیا اور پرنسپل کے ''سرپرست'' ہونے کے تصور کو ختم کیا۔ کالج میگزین ''پیش منظر'' کے بہاول پور نمبر کے لیے بھی میں نے خود پروف ریڈنگ سے لے کر تمام کام میں مجلس ادارت کی بڑھ کر معاونت کی اور خود کو مختلف امور میں کالج کا کارکن تصور کیا اور سرپرست کے ''مقدس تصور'' کو کبھی پسند نہیں کیا۔

اس گفتگو کے دوران اگر چہ میں نے بہت احتیاط سے کام لیا ہے تاکہ خود ستائی کا تاثر پیدا نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ میں جنون ((passion) اور رفقائے کار اور کالج سے وابستہ ہر فرد کو ساتھ ملا کر کام کرنے کا قائل رہا ہوں۔ لوگوں نے کہا کہ کالج بہت ترقی کر رہا ہے، میں نے ان لوگوں سے کبھی اتفاق نہیں کیا اور ہمیشہ کہا کہ یہ چیزیں ضروری اور بنیادی ہیں۔ یہاں غیر معمولی اس لیے محسوس ہو رہی ہیں کیوں کہ پہلے ان کا وجود نہیں تھا۔ مثلاً اب وہ طلباء جو اس سال داخل ہوئے ہیں انہیں ان چیزوں کی موجودگی پر کوئی تعجب نہیں ہوا اس لیے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں پہلے سے موجود ہیں یہی وجہ ہے کہ 2002 کی سالانہ کھیلوں کے آخری روز میں نے اپنی تقریر میں یہ باتیں بطور خاص کہی تھیں کہ: ''ان تمام باتوں کو دیکھ اور سن کر لوگ کہتے ہیں کہ کالج بہت ترقی کر رہا ہے مگر معذرت کے ساتھ میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا۔ کسی ادارے کی ترقی کا عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب وہاں تمام مطلوبہ معیار کی سہولتیں فراہم کر دی جائیں مگر جہاں پینے کا پانی نہ ہو، جہاں بہت سخت موسمی حالات (Hard Climatic Conditions) میں تعلیمی عمل جاری رکھنا انتہائی دشوار ہو جائے، جہاں بجلی گھنٹوں بند رہتی ہو، جہاں شہری کالج سے خاصی حد تک لاتعلق رہیں وہاں ترقی کا صرف خواب ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ ہم ابھی ترقی کی معیاری تعریف کے قریب ہی نہیں پہنچے۔ ہم تو ابھی کالج کو اس سطح پر لانے کی جدوجہد کر کرنے میں مصروف ہیں جہاں سے ترقی کا عمل شروع ہوتا ہے۔''

کالج میگزین ''پیش منظر'' کے لیے میں نے گورنمنٹ کالج حاصل پور کی تدریسی اور غیر تدریسی سٹاف کے بارے میں نہایت اختصار کے ساتھ دو سے تین سطری خاکے لکھے جو اس طرح ہیں '': آئیں پہلے اسلامیات سے شروع کرتے ہیں۔ اس مضمون میں دو استاد ہیں۔ پہلے سید ذوالفقار علی شاہ۔ بظاہر سنجیدہ مگر اچھے بذلہ سنج ہیں۔ ان کی بذلہ سنجی اگر چہ بہت محتاط نوعیت کی ہوتی ہے مگر جان بوجھ کر یا معصومیت میں کوئی ایک جملہ ایسا بھی کہہ جاتے ہیں جس سے سٹاف روم میں سنسنی پیدا ہو جاتی ہے یا پھر وہ بات موضوع گفتگو بن جاتی ہے۔ ان کے کام کرنے کے انداز سے تو تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے مگر ان کے کام کی کوالٹی بہت اچھی ہوتی

ہے۔ ذاتی طور پر اپنے قواعد کے مطابق نظم وضبط کے پابند ہیں۔ ان کا جلالی لہجہ بھی بڑا دوستانہ محسوس ہوتا ہے۔ مفتی عبدالحمید احمد۔ ان میں جمالی اور جلالی دونوں کیفیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ کالج کے حسابات کی بہت مہارت کے ساتھ مانیٹرنگ کرتے ہیں اور مالی قواعد وضوابط کے اسلحہ سے پوری طرح لیس ہیں۔ ان کی اس خصوصیت کو آڈٹ افسران بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ہر مشورہ خلوص نیت سے دیں گے۔ شعبہ اردو میں ایک عبد الغفار بھٹی ہیں جن کو میں پیار سے ''بابا'' کہتا ہوں۔ بابا جی استاد تو اردو ادب کے ہیں مگر ان پر غالب اثرات اسلامیات کے پائے جاتے ہیں جو ماضی میں ان کی تدریس پر بھی غالب تھے مگر اب ان اثرات کی شدت میں خاصی کمی واقع ہو چکی ہے۔ بابا جی کی تلاوت میں بڑی تاثیر ہے اور کالج کی سٹاف میٹنگز میں تلاوت اکثر انہی کے حصے میں آتی ہے۔ دوسرے دوست عرفان نسیم ہیں جو بڑے وضع دار مزاج کے حامل ہیں اور اپنی اسی عادت کی وجہ سے اکثر ان کا استحصال بھی ہوتا رہتا ہے۔ کرسی پر بیٹھے ہوں تو صرف وہی نظر آتے ہیں کرسی نظر نہیں آتی۔ شعبہ انگریزی سے بھی دو احباب وابستہ ہیں ایک تو طارق گل ہیں جو اپنے مزاج کے تنوع کے باعث بڑی ''قد وقامت'' (چھ فٹ سے زائد) کے حامل ہیں۔ ان کے چہرے پر مستقل مسکراہٹ منجمد رہتی ہے۔ وہ حسب ضرورت ابریشم کی طرح نرم اور فولاد کی طرح سخت دیکھے گئے ہیں۔ دوسرے حیدر نواز خان ہیں ان کا اپنا خاص سٹائل ہے۔ وہ اگر چہ مقابلے کے امتحان کے ذریعے کالج چھوڑنا چاہتے ہیں مگر کالج فی الحال ان کے لیے ایک ایسا کمبل ہے جو انہیں چھوڑنے کو تیار نہیں۔ بیالوجی کے طاہر محمود غوری بظاہر مزاج کے بہت دھیمے اور مگر مستعد ہیں۔ آج کل کالج کے ویرانے میں شجر کاری کے جذبے سے معمور نظر آتے ہیں۔ اس شعبے سے وابستہ ظفر اسلام بظاہر خاموش رہنے والے ہیں مگر ان کی خاموشی میں بھی ایک طرح کی گفتگو پائی جاتی ہے۔ جب وہ بولتے ہیں تو اچھا بولتے ہیں مگر اس دوران ان کے کسی جملے سے مخاطب کے فائر ہونے کا امکان بھی موجود ہوتا ہے۔ سیاسیات کے شعبے سے تین لوگ وابستہ ہیں اور تینوں اپنے اپنے مزاج اور رنگ کے۔ ان تینوں کے مزاج میں مشترک بات تلاش کرنے کے لیے خاصی جدوجہد کرنا پڑتی ہے مگر پھر بھی ہاتھ میں کچھ نہیں آتا۔ مثلاً طارق چودھری جتنے موضوعیت پسند ہیں، جاوید امجد واہلہ اتنے ہی معروضیت کے قائل ہیں۔ طارق چودھری اپنے دل کی بات کو چہرے کے مصنوعی تاثر سے چھپا نہیں سکتے اس طرح سے وہ منافقت کے خلاف جہاد کر رہے ہیں، جاوید امجد واہلہ کے جس دن ہونٹ (پان خوری سے) سرخ نہ ہوں تو تشویش لاحق ہو جاتی ہے۔ سٹاف روم سے اگر قہقہوں کی آواز آ رہی ہو تو وہ اس بات کی نشانی ہے کہ وہ یہاں موجود ہیں۔ وہ بے ساختگی سے کوئی ایسی بات کر جاتے ہیں جس پر مخاطب اپنا قہقہہ روکنے میں ناکام رہتا ہے اور اگر مخاطب نہ ہنسے تو وہ خود اسے دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں۔ مشتاق احمد تھہیم کی شخصیت اور مزاج باقی دونوں ہم شعبہ استادوں سے مختلف اور منفرد سٹائل کا ہے۔ انہوں نے یہاں پانچ سال کا عرصہ بطور پرنسپل بھی گزارا ہے لہٰذا جہاں وہ کسی کی بے ساختہ جگت پر قہقہہ لگانے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے قائل ہیں وہاں پر کسی جگت کا برا منانے

کے امکانات بھی ان کے ہاں اتنے ہی پائے جاتے ہیں۔ان کے مزاج میں دیہات اور شہر کی زندگی کا امتزاج پایا جاتا ہے جو ان کی شخصیت کو خاص اسلوب اور رنگ کا حامل بناتا ہے۔ ریاضی کے ارشاد علی انجم کی معتدل طبیعت اور دھیمے مزاج کا میں پوری طرح قائل ہوں وہ باہمی احترام کی وجہ سے اختلاف کرنے کی عادت کو پسند نہیں کرتے۔ فزکس کے شمس الدین تمام موسموں میں ایک ہی انداز اور وضع قطع کے حامل ہیں۔ پان کھانا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے اور اگر ان کے منہ میں پان ہو تو کسی کو پتہ نہیں چلنے دیتے۔ کیمسٹری کے استاد خالد نجم خاصی پہلو دار شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ بہت کوشش کرتے ہیں کہ ان سے کوئی آزردہ نہ ہو مگر اس کوشش میں کبھی کبھار ناکام بھی ہو جاتے ہیں۔ گرم دم جستجو، نرم دم گفتگو قسم کے انسان ہیں۔ اس شعبہ کے حق نواز خان خاموش طبع انسان ہیں جو اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ جسطرح اوپر میں نے اپنے بابا جی کا ذکر کیا اسی طرح فزیکل ایجوکیشن کے ایک استاد منور حسین ،گل میرے اور سب کے ''چاچا جی'' ہیں۔ اگر چہ اب ان میں وہ دم خم نہیں رہا مگر ایک دور میں وہ بہت متحرک مجلسی زندگی کے حامل تھے۔ وہ جہاں موجود ہوں وہاں خود بخود معلوم ہو جاتا تھا کہ یہاں چاچا جی ہیں۔ وہ عنقریب ریٹائر ہو کر بے وفائی کرنے کا سوچ رہے ہیں مگر فی الحال 'ارادے باندھتا ہوں توڑ دیتا ہوں' کی کیفیت سے دو چار ہیں۔ میں ان کے ارادوں کی ناکامی کی دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ فزیکل ایجوکیشن کے ایک اور استاد مسعود اقبال ہیں، اچھی لبرل شخصیت اور عادات کے مالک ہیں۔ کالج بند ہو تو گھر بیٹھے بور ہو جاتے ہیں اور ادھر اُدھر نکل جاتے ہیں۔ گرمی کی تعطیلات میں بھی ان کی یہاں آمد باقاعدہ رہتی ہے۔ مشکل موسمی حالات میں بھی کلب جانا انہیں اس طرح یاد رہتا ہے جس طرح خوراک اور لباس۔ شہزاد رموز لائبریرین ہیں مگر لائبریری سائنس کے استاد بھی ہیں۔ ان کا ایک پاؤں کلاس میں تو دوسرا لائبریری میں ہوتا ہے۔ مزاجاً بھلے مانس آدمی ہیں۔ انہوں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ لائبریری پر زیادہ توجہ دیں مگر لائبریری سائنس کی کلاسز نے انہیں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ آجکل ہر اس امکان پر غور وفکر کرتے پائے جاتے ہیں جو انہیں بہاول پور سے قریب کر دے۔ ارے ہاں میں ایک شخصیت کا ذکر تو بھول ہی گیا۔ حاجی عبدالغفار وائس پرنسپل، سیکرٹری پرچیز کمیٹی۔ چیف ٹیوٹر اور بہت کچھ۔ اس کالج میں ان کو بائیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔ کالج سے طویل دوستی کے باعث میں نے انہیں اکثر و بیشتر مخلص پایا۔ وہ جب تک حاصل پور میں تھے تو ہماری گاڑھی چھنتی تھی اب بہاول پور جا کر مصروف ہو گئے ہیں۔ روزانہ کی بنیاد پر بہاول پور سے کالج آتے ہیں۔

یہ تو تھے وہ دوست جو تدریس پر مامور ہیں۔ اب کچھ ذکر غیر تدریسی احباب کا بھی۔ مثلاً ارشد چودھری سینئر کلرک ہیں۔ میں انہیں پیار سے ہیڈ کلرک کہتا ہوں۔ محنتی اور شریف شخص ہیں۔ ان میں کوئی بھی خو روائتی کلرک کی نہیں پائی جاتی۔ محمد اکبر ہاشمی بظاہر جونیئر کلرک ہیں مگر ان کا کام تھری اِن ون ہے۔ محنتی ہیں۔ لائبریری میں چلیں جہاں نصر اللہ مل جائیں گے۔ جو ہیں تو بہت بے ضرر اور اپنی طرف سے خاصے خلوص سے

کام کرتے ہیں مگر کام تھوڑا بہت ادھر ادھر ہو جاتا ہے۔ اس میں قصور ان کا نہیں ان کے مرض نسیاں کا ہے۔ ایک ایس ایل اے عبدالخالق ہیں، کالج کو چھوڑنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ان کو ملنے والے بہت آتے ہیں۔ میں انہیں بہت سوشل سمجھتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ لوگ ان کے مریدین میں شامل ہیں۔ ایک ایس ایل اے نواز شاہد ہیں۔ ان کی قسم کی شخصیت صرف اس کالج ہی میں آپ کو ملے گی۔ رات کو لاہور میں تو دن کو کالج اور کالج میں نہ بھی ہوں تو بھی کالج ہی میں ہوتے ہیں اور یہ گُر صرف وہی جانتے ہیں۔ اپنی عادت واطوار کے لحاظ سے خاصے "ملنسار" واقع ہوئے ہیں۔ ایک مرزا الطاف حسین صیاد قسم کی چیز بھی اس کالج میں موجود ہے جو صرف یہیں پائی جاتی ہے۔ اسکا کوئی ثانی کہیں پر موجود نہیں۔ چاچا نور محمد سے کالج کی دوستی بہت پرانی ہے۔ غلام رسول اینڈ کو ہر وقت کسی نہ کسی کونے کھدرے میں کسی کدال کے کام میں مصروف نظر آتے ہیں۔ میں ان سب سے اور یہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔

2000 کی موسم گرما کی تعطیلات کے وسط میں نئے ڈائریکٹر کالجز پروفیسر فضل الٰہی رائے آ چکے تھے۔ وہ بنیادی طور پر بائیں بازو کی فکر کے حامل اور زمین پر پاؤں رکھ کر چلنے والے انگریزی کے استاد تھے۔ میری ان سے دو سال پہلے بغداد روڈ کالج میں ایک سرسری سی ملاقات ہوئی تھی مگر میں ان کا ناک نقشہ بھول چکا تھا۔ پروفیسر ارشاد حسین نقوی نے جو موزوں دفتری کلچر متعارف کرایا وہ انہیں ورثے میں ملا۔ میں انہیں ایک ہفتے کے بعد ملنے گیا تو ایک مصنوعی سی خفگی کا اظہار کیا کہ بلوچ صاحب کو اب وقت ملا ہے؟ میں نے جوابی مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔ انہیں خوش آمدید کہا۔ موسم گرما کی تعطیلات ختم ہوئیں تو کالج باقاعدگی سے جانا آنا ہو گیا۔ میں ہفتے کے درمیان ایک چھٹی ضرور کرتا اس طرح روزانہ دوطرفہ 200 کلومیٹر کی مسافت سے در آنے والی بیزاری سے بچ جاتا۔ کبھی اتفاقی چھٹی لے لیتا کبھی ڈائریکٹوریٹ کالج کا کوئی کام کروانے چلا جاتا۔ اسی اثنا میں پروفیسر رائے کو سٹاف کی طرف سے "چائے کی دعوت" دی گئی۔ پروفیسر نقوی کی طرح انہیں بھی پرنسپل کی کرسی پر بیٹھنے کی عادت نہیں تھی لہٰذا میں اپنی کرسی چھوڑ کر ان کے ساتھ دوستانہ انداز میں بیٹھ جاتا۔ ان کی آمد پر انہیں سٹاف روم لے گیا، تمام سٹاف کا تعارف کرایا اور انہیں کمیونٹی کے ذریعے زیر تکمیل اور کالج کے آئندہ منصوبوں پر بریفنگ دی۔ یہ انداز شاید انہیں بھا گیا۔ خوش آمدید کی تقریب لائبریری سے ملحقہ ریڈنگ روم میں ہوئی۔ سٹاف کے نمائندوں کے بعد میں نے اپنے "خوش آمدید" کے تاثرات میں کہا کہ جناب کالج کا ہر فرد اپنے اپنے فرائض کے مطابق کالج کی تعمیر و ترقی کے لیے کام کر رہا ہے۔ ہم سب کا نصب العین بہترین تدریسی سرگرمیاں اور طلبا کی شخصیت سازی ہے۔ اس میں ہمیں آپ کا تعاون درکار ہوگا۔ اگر آپ افسر بن کر یہاں آئے ہیں تو ہماری کارکردگی اوسط درجے کی ہوگی اور اگر دوست بن کر آئے ہیں تو پھر ہم آپ کو بہترین صلاحیتوں کے ذریعے اس درسگاہ کو مثالی بنا کے دکھائیں گے۔" انہوں نے اپنے جواب میں کہا کہ آپ لوگوں کے جذبات کی میں قدر کرتا ہوں اور آپ لوگ مجھے بھی اپنا حصہ تصور کریں۔ میں جب تک ہوں آپ مجھے

ادارے کے حوالے سے ہمیشہ اپنا دوست اور مددگار پائیں گے۔ آپ کے پرنسپل سے میں نے بہترین تاثرات (vibes) محسوس کیے ہیں۔ مجھے آج آپ کے ہاں آ کر بہت اچھا لگا۔" پھر واقعی انہوں نے اپنا کیا ہوا وعدہ ایفا کیا جس سے کالج کو بہت فائدہ ہوا۔ کمیونٹی کی طرف سے پینے کے پانی کی تعمیر کردہ ٹینکی کا افتتاح ڈائریکٹر پروفیسر فضل الٰہی رائے اور اسسٹنٹ کمشنر عبدالغفور بھٹی نے مل کر کیا۔ اس موقع پر ڈپٹی ڈائریکٹر کالجز شیخ محمد اکبر اور شہریوں کی خاصی تعداد کالج تشریف لائی۔ شام کو مہمانوں کے لیے کالج ہی میں عشائیے کا اہتمام کیا گیا۔ اس دن پہلی بار کالج میں جشن کا منظر تھا۔ انجمن تاجراں کے نمائندگان خصوصاً چودھری محمد عالم اور چودھری رحمت علی پیش پیش تھے۔ بطور ڈائریکٹر کالجز پروفیسر فضل الٰہی رائے کا یہ آخری دورہ تھا کیوں کہ نظام کی تبدیلی کے بعد انہیں ضلعی گورنمنٹ بہاول پور میں ضلعی ایگزیکٹو آفیسر ایجوکیشن بنا دیا گیا جس میں ضلع بھر کے کالجز اور سکولز کو اکٹھا کر دیا گیا تھا۔ سکول و کالج کے ڈویژنل ڈائریکٹوریٹس کو ختم یا برخاست (Dissolve) کر دیا گیا اور ایک وقت وہ تھا کہ پرنسپلز میٹنگ میں ڈویژن بھر کے کالجز کے پینتیس پرنسپل ہوتے تھے مگر اب ضلع بہاول پور کے پندرہ کالجز کے پرنسپل موجود ہوتے۔ پروفیسر رائے سے اچھی دوستی ہو گئی۔ دوستوں کے درمیان جیسے مذاق چلتا ہے، کبھی وہ کوئی جملہ کس دیتے کبھی میں۔ کئی دفعہ وہ ضلع بہاولنگر کے دورے سے واپسی پر آ جاتے اور بہاول پور کے لیے مجھے ساتھ لے لیتے۔ وہ رکھ رکھاؤ کے بھی قائل تھے، اس خیال سے کہ مجھے پیچھے بیٹھنا پڑے گا، وہ ڈرائیور کو پیچھے بٹھا کر گاڑی خود چلاتے۔ ایسے ہی ایک دن وہ گاڑی پرانی لینڈ کروزر چلا رہے تھے کہ ڈیرہ بکھا کے پاس وہ سڑک سے اتر گئی تو میں نے کہا: جناب گاڑی کہاں جا رہی ہے، تو انہوں نے گاڑی روک کر کہا: یار مجھے نیند آ گئی تھی۔ پھر میں نے پیچھے ہی بیٹھنا شروع کر دیا۔ ایک بار بہاول پور واپسی پر دورانِ سفر تھوڑی دیر بعد کہتے، " آج گرمی بہت ہے۔" ان کو گھر چھوڑ کر ڈرائیور حسبِ معمول مجھے ماڈل ٹاؤن سی گھر چھوڑنے گیا تو میں آگے آ کر بیٹھ گیا تو مجھے بھی بہت زیادہ گرمی محسوس ہوئی۔ میں نے چیک کیا تو پتا چلا کہ سامنے ایک سوراخ تھا جس سے انجن کی گرمی لیک ہو رہی تھی۔ میری نشان دہی پر وہ سوراخ بند کرا دیا گیا۔ تمام کالجوں کو ڈویژنل ڈائریکٹوریٹ بجٹ تقسیم کر کے بھجواتا تھا مگر ان کا اپنا بجٹ ڈی۔ پی۔ آئی کالجز پنجاب لاہور سے آتا تھا۔ سٹیشنری کی مد میں ان کا بجٹ جلد خرچ ہو جاتا تھا تو وہ کالجوں سے سٹیشنری یا اس کی قیمت منگوا لیتے تھے جسے پرنسپل کہیں نا کہیں ایڈجسٹ کر لیتے تھے۔ مجھ سے ایک دن خود ڈائریکٹر نے یہی مطالبہ کیا تو میں نے جواب میں کہا، "جناب میرے لیے یہ بات بہت مضحکہ خیز ہو گی کہ میں کیشئر سے اتنی رقم ڈائریکٹوریٹ کو دینے کے لیے کہوں، البتہ میں اپنی ذاتی گرہ سے کچھ نا کچھ دے سکتا ہوں۔" جواب آیا، نہیں رہنے دیں۔ میری اس بات کا انہوں نے شاید برا نہیں منایا تھا اور اگر کوئی ایسی صورت حال تھی بھی تو انہوں نے کبھی اظہار نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے دور کی جو میری سالانہ خفیہ رپورٹس لکھیں ان میں ہر وہ بات لکھی جو بہت خوب کے زمرے میں آتی تھی تو میں نے شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے: ''میرے حساب میں تم ہی ایک ایسے پرنسپل ہو جو اس

کے مستحق تھے۔ بہت خوب سے اوپر کوئی خانہ ہوتا تو میں تمہارے لیے اسی خانے میں لکھتا''۔ ان کے تمام ریمارکس کو میں اپنا بہترین اثاثہ تصور کرتا ہوں۔

3 ستمبر 2001 سے وہ ای۔ڈی۔او (ایجوکیشن) ضلعی گورنمنٹ بہاول پور کام کر رہے تھے اور ان کے ہوتے ہوئے کالج کے متعدد پروجیکٹ مکمل ہوئے۔ 6 جون 2002 سے وہ ساٹھ سال کی عمر میں ریٹائر ہونے جا رہے تھے۔ ڈی سی او نے ان سے نئے ای۔ڈی۔او کے لیے سفارشات مانگیں تو انہوں نے میرا نام لیا۔ ڈی سی او کے دفتر سے کالج فون آیا کہ آج دو بجے آپ کی ان سے میٹنگ ہے۔ ڈی سی او نے میرا مختصر انٹرویو کیا۔ پروفیسر رائے نے مجھے بتایا کہ وہ آپ کے نام پر قائل ہو چکے ہیں۔ آپ کے بارے میں پوچھنے پر میں نے انہیں بتایا کہ ہم سٹیشنری کے لیے کالجوں سے کچھ قرض یا ڈونیشن لے لیتے تھے، اس نے وہ بھی ہمیں نہیں دیا۔ بعد میں انہوں نے ای ڈی او کے لیے پینل تیار کیا۔ پہلے نمبر پر میرا نام تھا اور پرزور سفارش تھی۔ دوسرے نمبر پر ڈاکٹر عبدالمجید جودو، تین دفعہ مختصر وقفوں سے ڈائریکٹر کالجز رہ چکے تھے اور تیسرے نمبر پر ایس ای کالج میں بیالوجی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر محمد حفیظ کے نام تھے۔ تین نمبر والے کے خانے میں انتظامی تجربے کا خانہ خالی تھا۔ ڈی سی او نے وہ پینل ابھی اوپر نہیں بھجوایا تھا۔ عربی کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر عائشہ سلیم بہاول پور کی رہائشی تھیں اور شاید چشتیاں کے گرلز کالج میں پرنسپل تھیں۔ انہوں نے اپنا تبادلہ بحیثیت ای ڈی او (لٹریسی) بہاول پور کرالیا۔ پروفیسر رائے کے بعد ضلعی انتظامیہ نے ای ڈی او (ایجوکیشن) کا اضافی چارج ان کے حوالے کر دیا۔ ڈاکٹر سلیم طارق یونیورسٹی میں شعبہ عربی کے سربراہ تھے اور پنجاب یونیورسٹی میں میں فائنل میں تھا تو یہ سال اول (سمسٹر سسٹم 1975) میں تھے۔ یونیورسٹی اور کالجز میں گروپ بندی بہت چلتی ہے جو بظاہر فکری ہوتی ہے مگر درحقیقت پنجاب پروفیسرز اور لیکچررز ایسوسی ایشن (PPLA) کے انتخاب کے لیے ہی استعمال ہوتی ہے۔ یونیورسٹی میں بھی ایسی ہی صورت حال ہوتی ہے مگر وہاں زیادہ گروپ بندی اوپری درجے کی پروموشن یا سیلیکشن کے لیے ہوتی ہے۔ انہی فرضی قسم کے اختلافات کے باعث بیچ میٹ ڈاکٹر محمد شفیق اور ڈاکٹر سلیم طارق سے بہت قربت کا تعلق پیدا نہ ہو سکا۔ اب ای ڈی او ایجوکیشن مسز عائشہ سلیم تھیں۔ ایک دفعہ کالج میں تشریف لائیں تو انہوں نے بہت خوبصورت بات کی، "بلوچ صاحب! گروپ بندی ماضی کی بچگانہ باتیں ہیں، میں انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتی، ہمیں پیشہ ورانہ انداز میں اپنے اداروں کے لیے بارے میں سوچنا چاہیے۔" اس بات کے بعد ان سے بہت اچھی ورکنگ ریلیشن شپ قائم ہو گئی۔ ان کے دوبئی روڈ گرلز کالج میں بطور پرنسپل جوائن کرنے کے بعد چند انکوائریز اور کالج رجسٹریشن کمیٹیوں میں کئی دفعہ ہم اکٹھے ہوئے۔ پروفیسر رائے نے جو پینل بھیجا تھا اس کے تین نمبر پر موجود امیدوار پروفیسر محمد حفیظ کے آرڈر ہو گئے جنہوں نے 11 مئی 2004 کو ریگولر ای ڈی او (ایجوکیشن) کے جوائن کر لیا۔ پینل میں ان کے انتظامی تجربے کا خانہ خالی تھا۔

دوستوں نے کہا کہ نمبر ایک پر میرا نام گیا ہوا تھا تو نمبر تین کے آرڈر کیوں ہوئے؟ کسی نے گرہ لگائی کہ نئے ای ڈی او نے زبردست اثر ورسوخ استعمال کیا ہے مگر میں کبھی رنجیدہ نہیں ہوا۔ محمد حفیظ میرے دوست تھے، ان کی تقرری سے میں بہرحال خوش ہوا کیوں کہ میرا ایمان تھا کہ اگر اللہ نے چاہا تو وہ ایسی سبیل پیدا کرے گا اور روزانہ سفر سے نجات ملے گی۔ کئی دوستوں نے کہا کہ اب مجھے یزمان کالج کے لیے کوشش کرنی چاہیے جہاں پرنسپل کی سیٹ خالی تھی۔ میں نے ان کی باتوں کو کوئی اہمیت نہ دی۔ درحقیقت میں چاہتا تھا کہ گورنمنٹ کالج حاصلپور میں شروع کیے ہوئے منصوبے مکمل ہو جائیں۔ ڈاکٹر عبدالمجید ایس ای کالج میں انچارج پرنسپل تھے۔ ان کی "بوالعجبیاں" بہت معروف تھیں۔ انہوں نے ایک عجیب وغریب حرکت کی۔ ایک دن وہ راؤنڈ پر تھے تو اتفاق سے اس کلاس میں چلے گئے جس میں میرا بیٹا وجاہت نسیم موجود تھا۔ انہوں نے کلاس کے بچوں سے پوچھنا شروع کر دیا کہ کس کا باپ کیا کرتا ہے۔ جب میرے بیٹے نے باری آنے پر میرا نام لیا تو فوراً بولے، "تیرے باپ کا بیڑا میں نے غرق کیا تھا، میرا کام نہیں بن رہا تھا تو میں نے ان کو بھی نہیں بننے دیا"۔ ایک استاد کی طلبا سے ایسی گفتگو کو کیا نام دیا جا سکتا ہے!! بہرحال میں اپنے دوست کو مبارکباد دینے گیا۔ وہاں پر مبارک دینے والے دیگر لوگ بھی موجود تھے۔ اب میں ایک انکشاف کرنے جا رہا ہوں۔ اسی روز عشا کے بعد پروفیسر محمد حفیظ مجھے گھر ملنے آئے۔ میرا گھر ان کے گھر سے دو گھروں کے فاصلے پر تھا۔ کہنے لگے کہ آج کی ڈاک میں گھر لے آیا ہوں مگر مجھے کوئی سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا کرنا ہے۔ میں نے تو آج تک اپنی پرسنل فائل تک نہیں پڑھی۔ مجھے یاد آیا کہ پینل میں ان کے نام کے سامنے انتظامی تجربے کا خانہ خالی تھا۔ وہ ایک اچھے استاد تھے۔ ان کی اب تک کی تمام سروس پہلے ٹائم کالج اور دوسرے ٹائم ایک سے زائد گروپس کو ٹیوشن پڑھانے میں گزری تھی۔ کالج ٹیچرز سیاست میں بہت متحرک رہے۔ نصابی کتب کے علاوہ عمومی مطالعے کا بھی کوئی کا زیادہ رجحان نہیں تھا۔ میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ ان کے کمرے میں چار پائیوں پر فائلوں کا انبار بکھرا پڑا تھا۔ میں نے تمام ریکارڈ کی دو کیٹیگریز بنائیں۔ پہلی آج تک موصول ہونے والی ڈاک اور دوسری وہ فائلیں جو دفتر نے برائے مزید کارروائی ان کو پیش کی تھیں۔ پہلے ڈاک میں موجود ہر لیٹر پڑھ کر انہیں بتاتا کہ اس پر کیا لکھنا ہے۔ عموماً پروفیسر نقوی اور پروفیسر رائے کے سوا تمام گذشتہ (سکول ڈائریکٹرز یا ای ڈی او) افسران نئی ڈاک پر صرف اپنے دستخط کر دیتے تھے اور باقی کام عملہ کرتا تھا مگر میں ان سے ہر ڈاک پر پہلے ضروری ریمارکس لکھواتا اور پھر ان سے دستخط کراتا۔ پھر ہر فائل کو بغور پڑھ کر ضروری اختلافی یا اتفاقی نوٹ لکھوا کر متعلقہ سیکشن کو مارک کراتا۔ مثلاً ایک فائل میں ایک انکوائری کی روشنی میں تجویز کیا گیا تھا کہ متعلقہ فرد کو بری کیا جائے، میں نے فائل بغور دیکھی تو کارروائی میں سقم تھا جس کی روشنی میں چند اہم سوال اٹھائے اور تجویز کو رد کر دیا۔ میں اس رات دو بجے گھر لوٹا اور دوسری صبح حاصل پور کالج موجود تھا۔ ایک ہفتے تک تو یہی روٹین رہی، میں دو سے تین بجے صبح گھر لوٹتا رہا۔ ذہین آدمی تھے آہستہ آہستہ سیکھتے بھی گئے۔ اب اس فائل ورک سے آفس

میں بھونچال آ گیا۔ دفتری عملے نے کہا کہ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ان کا کوئی انتظامی تجربہ نہیں ہے تو ڈاک اور فائلیں اتنی مہارت سے کیسے نکل رہی ہیں، لوگوں نے ان کے بارے میں مبالغہ کیا ہوگا! سیکھ میں خود بھی رہا تھا لیکن سر دست میں اپنے دوست کی مدد کر رہا تھا۔ گھر لوٹنے کا وقت بتدریج کم ہونے لگا۔ مجھے اس کام سے چھٹی تب ملتی جب وہ شہر میں موجود نہیں ہوتے تھے۔ تین ہفتے تک میں نے ایک دو بجے سے پہلے سو کر نہیں دیکھا تھا۔ میں نہایت خلوص اور نیک نیتی سے ان کی مدد کر رہا تھا۔ تمام فائل ورک کا 25 فیصد وہ سیکھ چکے تھے۔ ان کے چارج لینے سے پہلے ضلع بھر کے سکولوں میں ضلعی گورنمنٹ کے تحت کچھ تبادلے کیے گئے تھے جن پر عمل درآمد بھی ہو چکا تھا جب کہ حکومت کی طرف سے تبادلوں پر پابندی تھی۔ یکم یا دو جون کو وہ ایک میٹنگ کے سلسلے میں لاہور گئے تو محکمہ سکولز کے سیکریٹری نے دیگر امور کے ساتھ تمام ای ڈی اوز کو خبردار کیا کہ جہاں جہاں جو بھی تبادلے ہوئے وہ غیر قانونی تھے لہٰذا انہیں کینسل کر دیا جائے ورنہ نتائج کے لیے تیار رہیں۔ پروفیسر محمد حفیظ نے اگلے دن شاید تین جون کو واپس آتے ہی تمام تبادلے بیک جنبش قلم منسوخ کر دیے۔ یہ ایک بم تھا جس کی گونج ڈی سی او اور ضلع ناظم کے دفتر میں پریشانی سے سنی گئی۔ میں حسب معمول کالج میں موجود تھا کہ ای ڈی او ایجوکیشن کا فون آیا: ''یار یہاں پر تو خاصی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ میں نے سیکریٹری سکولز کی ہدایت پر میرے آنے سے پہلے ہونے والے تبادلے منسوخ کر دیے ہیں۔ جب ناظم کو پتا چلا تو اس نے غصے میں فون کیا کہ تم کون ہو اور تمہیں میرے کیے ہوئے تبادلوں کو منسوخ کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ تمہارا میرے ساتھ چلنا مشکل ہے، میں آج ہی تمہارا بندوبست کرتا ہوں"۔ پروفیسر صاحب نے جواباً کہا کہ مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے یہاں کام کرنے کا۔" مجھے دھچکا سا لگا۔ میں نے کہا کہ یہ اچھا نہیں ہوا، کم از کم پہلے کی طرح تھوڑا بہت مشورہ تو کر لیتے۔ دو دن کے بعد میرے دوست پروفیسر طارق خاں کا مجھے فون آیا کہ سیکرٹیریٹ میں ایڈیشنل چیف سیکریٹری کے آفس میں وزیر اعلیٰ کے دفتر سے فون پر ہی ایک پوزیٹو ڈائریکٹو موصول ہوا ہے کہ گورنمنٹ کالج حاصل پور کے پرنسپل جن کا نام پینل کے نمبر ایک پر تھا، اس کا ای ڈی او ایجوکیشن بہاول پور کے طور پر تبادلہ کر دیا جائے اور پہلے سے موجود کو ڈی سی او کے آفس میں رپورٹ کرنے کا کہا جائے۔ میں نے ای ڈی او آفس جا کر نئی سنی سنائی بات بتا دی۔ انہوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو بہت اچھی خبر ہے، اگر آپ یہاں آ جائیں تو مجھے اطمینان ہوگا ویسے میرا مزاج ہی نہیں اور ناظم سے لڑائی کے بعد تو یہاں میں قطعاً نہیں رہ سکتا۔ میں نے کہا کہ میں کون سا ناظم کو جانتا ہوں۔ تین سال قبل کالج کی سالانہ سپورٹس کے وقت کچھ پروجیکٹ لینے کے لیے کالج بلایا تھا۔ اگلے دن آرڈر کی فیکس آ گئی۔ میں نے فوراً جوائن نہیں کیا بل کہ ان سے کہا کہ جب آپ کہیں گے میں جوائن کروں گا حتیٰ کہ اگلے دن یعنی 9 جون کو ڈی سی او نے فون پر جوائن کرنے کا پیغام دیا۔ ہم متعلقہ پروفارما مکمل کر کے ڈی سی او سے ملے اور انہوں نے میری جوائننگ اور ان کے فراغت نامے پر دستخط کیے اور ان کے لیے الوداعی کلمات بھی کہے کہ یہ ایک سرائے ہے جہاں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، یہ ملازمت کا ناگزیر حصہ

ہے۔افسوس کہ ہم آپ کی صلاحیتوں سے فائدہ نا اٹھا سکے۔میری سب سے پہلی کوشش یہ تھی کہ انہیں ان کی اپنی سیٹ پر ایڈجسٹ کراؤں کیوں کہ میں نے محسوس کیا تھا کہ ناظم ان کے بارے میں خاصے متعصب تھے۔میں ان کی سمری لے کر ڈی سی او کے پاس لے گیا اور ذاتی طور پر ان سے منظوری لی اور ان کے آرڈر کرائے۔میں نے پہلے اساتذہ کی گروپ بندی کا ذکر کیا تھا۔متحارب گروپ کے دو تین پروفیسروں نے انہیں اس بات کا قائل کر لیا کہ جس طرح آپ کو ای ڈی او کے عہدے سے ہٹایا گیا ہے تو نسیم بلوچ کو جوائن کرنے سے انکار کر دینا چاہیے تھا۔ایک صاحب نے تو حد کر دی کہ یہ سارا کیا کرایا ہی میرا ہے،اب میں کیا کر سکتا تھا۔ابھی تک تو ان کے لیے کیے گئے جگراتے میری پلکوں پر پڑے تھے مگر "لوگوں سے سنا تم نے" کے مصداق ان کی طرف سے کوئی مثبت جواب نہ پا کر میں بھی خاموش ہو گیا۔

یکم جولائی 2001 سے پنجاب کے تعلیمی شعبے میں ضلعی گورنمنٹ کے نئے نظام کے باعث بہت زیادہ سٹرکچرل تبدیلیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔مختصر طور پر چند سطور میں گذشتہ نظام کا ایک ارتقائی جائزہ مناسب رہے گا۔جنگ آزادی سے ایک سال پہلے یعنی 1856 کے دوران انگریزوں نے اپنے مقبوضہ علاقوں میں نظامت تعلیم عامہ (ڈائریکٹوریٹ آف پبلک انسٹرکشنز) کا شعبہ قائم کیا۔ایک سو سال بعد 1956 میں اسے نظامت تعلیم عامہ (مغربی پاکستان) کا نام دیا گیا اور پشاور،کوئٹہ،لاہور اور حیدرآباد میں ریجنل ڈائریکٹوریٹس قائم کیے گئے۔1962 میں لاہور کو تقسیم کر کے راولپنڈی ریجن کا اضافہ کیا گیا۔1973 کی تنظیم نو کے بعد ڈویژنل ڈائریکٹوریٹس کا قیام عمل میں لایا گیا جہاں سکولوں اور کالجوں کا ایک ہی ڈائریکٹر ہوتا تھا۔میاں محمد شریف ایک بہت متحرک اور کالجوں سے تعصب رکھنے والے ڈی پی آئی پنجاب تھے لہٰذا کالجوں کو زک پہنچانے کے لیے انہوں نے ہائر سیکنڈری سکولوں کی سکیم منظور کرائی۔1982 میں سکولوں اور کالجوں کے علیحدہ ڈی پی آئی مقرر کیے گئے اور اسی طرح کالجوں کا ڈویژنل ڈائریکٹوریٹ بھی الگ کر دیا گیا۔سکولوں میں تین صوبائی ڈائریکٹوریٹس منظور ہوئے۔ڈی پی آئی سکولز (سیکنڈری ایجوکیشن)،ڈی پی آئی سکولز (ایلیمنٹری ایجوکیشن) اور ڈائریکٹوریٹ آف سٹاف ڈیویلپمنٹ (ٹریننگ ونگ)۔ڈویژن کی سطح پر ڈائریکٹر سکولز (سیکنڈری ایجوکیشن) اور ڈائریکٹر سکولز (ایلیمنٹری ایجوکیشن)۔سکولوں کے لیے یہی سکیم ضلع اور تحصیل پر بھی برقرار رکھی گئی۔اب 2001 سے ضلعی گورنمنٹ کے قیام پر ڈائریکٹرز کو ختم کر کے کالجوں اور سکولوں کا ضلع کے لیے ڈسٹرکٹ ایگزیکٹو آفیسر ایجوکیشن کا عہدہ تخلیق کیا گیا جب کہ کالجوں میں ہر ضلع میں ڈسٹرکٹ آفیسر (کالجز) کا عہدہ متعارف کرایا گیا۔سکولوں کے ضلعی اور تحصیل پر بالترتیب ڈی ای او سیکنڈری و ایلیمنٹری کے عہدے برقرار رکھے گئے۔ضلعی گورنمنٹ کے نظام کو کچھ اس طرح سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔بلدیاتی انتخابات کے ذریعے ضلعی اسمبلی کا قیام،اس کے ذریعے ناظم (وزیر اعلیٰ) کا انتخاب۔ضلع کا ضلعی رابطہ آفیسر یا ڈی سی او (چیف سیکرٹری)،ہر صوبائی محکمے کا ایک ضلعی انتظامی آفیسر یا ای ڈی او (سیکرٹری)۔پاکستان ایڈمنسٹریٹو سروس کے

عمران احمد ڈی سی او بہاول پور تھے۔ کام کرنے کا ان کا اپنا اسلوب تھا۔ اکثر فائلوں پر " پلیز سپیک "ہی لکھا آتا۔ مجھے جوائن کیے ابھی دو دن ہوئے تھے کہ اس وقت کے وزیر اعلی چودھری پرویز الٰہی کا 11 جون کا دورہ آ گیا اور تمام ای ڈی اوز کو سرکٹ ہاؤس میں مع اپنے محکمے کے ضروری معلومات پہنچنے کی ہدایت کی گئی تھی جہاں منتخب نمائندے بھی موجود تھے۔ مختلف محکموں کے بیوروکریٹس کو ایک جگہ ملنے کا پہلا موقع تھا۔ مجھے ڈی سی او کا فون آیا کہ میں چوں کہ ابھی نیا ہوں لہٰذا مجھے نمایاں جگہ نہیں بیٹھنا چاہیے، سائیڈ ہال زیادہ موزوں رہے گا۔ میں جب سائیڈ ہال پہنچا تو چند دیگر نئے ای ڈی اوز بھی ملے جنہیں میرے والی ہدایات دی گئی تھیں۔ صحافیوں کی اکثریت واقف تھی وہ مل کر بہت خوش ہوئے بل کہ انہیں میرے جوائن کرنے کی خبر بھی مل گئی۔، چند ای ڈی اوز جن سے ملاقات ہوئی بہت خوش ہوئے اور خوب گپ شپ رہی۔ ایس ای کالج بہاول پور کے سابق پرنسپل محمد کامل صدیقی کے صاحب زادے راحیل صدیقی جو پاکستان ایڈمنسٹریٹو سروس سے تھے، ای ڈی او فنانس اینڈ پلاننگ تھے، ان سے ملاقات خوب رہی۔ بہرحال وہ ایک مصروف اور تجربے و مشاہدے کے لحاظ سے ایک بھرپور دن تھا۔ ایک دن ڈی سی او عمران احمد نے وزیر اعلی کے دورے کے حوالے سے بتایا کہ جب اس درجے کی کوئی اتھارٹی آتی ہے تو ایک انتظام کے تحت منظور شدہ مقامی ہوٹل میں خصوصی طور پر کھانا تیار کرایا جاتا ہے جسے پیش کرنے سے پہلے ڈاکٹروں کی ٹیم کھا کر اسے پاس کرتی ہے۔ وزیر اعلی نے تو کھانا نہیں کھایا لیکن ہوٹل نے تمام کھانے کا بل بھیج دیا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ جب وزیر اعلی چلے گئے تو وہ کھانا چیک کرنے والے ڈاکٹروں نے ہی تمام کر دیا تھا۔ ڈی سی او بل کی ادائیگی کے لیے مضطرب نظر آئے۔

ای ڈی او (ایجوکیشن) کا دفتر سکول ڈائریکٹوریٹ میں قائم ہوا جب کہ تمام سیکشن اور عملہ سکول ڈائریکٹوریٹ والا تھا۔ کلرک اپنا" کارٹل" بنا کر چلتے ہیں جسے کلرک مافیا بھی کہا جا سکتا ہے۔ 1982 میں جب سکول اور کالج انتظامی طور پر الگ ہوئے تو کلرک کیڈر کو انتخاب (Opt) کرنے کو کہا گیا۔ یوں بہاول پور ڈویژن کا کارٹل بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ حافظ خورشید احمد نام کا ایک نامی گرامی کلرک بطور کالج کے حصے میں آیا اور بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر ریٹائرمنٹ تک اصلی (virtual) ڈائریکٹر وہی رہا اور اس نے اپنے شاگردوں کی کھیپ بھی پیدا کی۔ سکول سائیڈ پر منظور ملک تھے، حافظ خورشید بھی ان کے شاگرد تھے۔ منظور ملک ریگولیشنز کے ماہر تھے اور طویل عرصے تک اسسٹنٹ ڈائریکٹر (ریگولیشنز) ڈی پی آئی سکولز لاہور میں کام کرتے رہے حتٰی کہ ان کا متبادل نا ہونے کی وجہ سے متعدد بار توسیع دی گئی۔ مزاج اور افتادِ طبع کے لحاظ سے سو فیصد کلرک تھے۔ سکول اور کالج کے انتظامی کلچر میں بہت زیادہ فرق تھا۔ ابتدائی تین چار ای ڈی او کالج کیڈر سے تھے جس سے قدرے بہتر اقدار قائم ہو چکی تھیں مگر آرتھوڈوکس رویہ اور کلچر ایک دم ختم نہیں ہوتے۔ یہ وہی آفس ہے جہاں سائلین کو ڈائریکٹر سے ملنا منع تھا۔ ہر سائل اس کلچر کی شرائط کے ساتھ متعلقہ کلرک سے ملتا تھا اور وہی فائل نکلتی جس کے لیے مطلوبہ تقاضا پورا کیا گیا ہوتا۔ دفتر بند ہونے سے پہلے ڈائریکٹر اپنا حصہ وصول

کرتے اور چلے جاتے۔سکولز ڈائریکٹوریٹ میں عملے کا بہت زور تھا۔1980 کی دہائی کے وسط میں جب یہ دفتر جنرل بس سٹینڈ اور سبزی منڈی کی درمیان بہاول پور کی سب سے پرانی اور آسیب زدہ پرانی کوٹھی میں تھا تو میں وہاں ایک کام سے بہاول پور گیا۔اس دفتر کے تقاضوں سے ناواقف تھا۔ ہمارے دوست کے جاننے والے اقبال احمد خان رحیم یار خان کے کمپری ہینسو سکول میں پرنسپل رہ چکے تھے، ان دنوں ڈسٹرکٹ آفیسر سیکنڈری سکولز بہاول پور تھے، ان کو ساتھ لیا مگر ان کی بھی کسی نے ایک نا سنی۔ میں لاہور گیا اور سیکریٹری جیون خان سے ملا جنہوں نے ڈپٹی سیکرٹری کو ہدایت کی کہ یہ کیس فیصلے کے ساتھ فلاں تاریخ تک میری میز پر ہونا چاہیے، محکمہ تعلیم کے متعلقہ سیکشن آفیسر نے ڈائریکٹر سردار محمد کو براہ راست فون کر کے کیس بذریعہ خصوصی ہرکارہ اگلی صبح دس بجے تک بھیجنے کو کہا۔ چودھری سردار محمد نے کیس کے التوا پر عملے کو خوب سنائیں، جس کیس کے لیے بہاول پور کے چکر لگائے وہ اگلی صبح دس بجے سیکرٹریٹ کے متعلقہ سیکشن میں پہنچ چکا تھا۔(سکول سائیڈ کے ڈی پی آئی میاں محمد شریف اور بہاول پور کے ڈائریکٹر چودھری سردار محمد عملے اور افسران کو گالم گلوچ کے لیے بہت معروف تھے۔) وہ کیس کومنٹس کے لیے ڈی پی آئی سکولز کو بھیجا گیا تو وہاں پھنس گیا جس پر رحیم یار خان کی ایک ایسی مقتدر شخصیت کے ذریعے نکلوایا گیا جس کے گھر المعروف "وائیٹ ہاؤس" میں ڈی پی آئی میاں شریف رحیم یار خان کے دورے پر قیام کرتے تھے۔ وہاں سے کیس نکلوایا تو پھر سیکرٹریٹ کے ایک سیکشن میں پھنس گیا۔ لاہور ہائی کورٹ کے بہاول پور بنچ میں آئین کے سیکشن 199 کے تحت رٹ پٹیشن کی تو محکمے نے 3 ماہ کی ٹائم لائن دی اور تب مسئلہ میرٹ پر حل ہوا۔ اس پر چار سال لگ گئے۔ یہ تجربہ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ یہاں کے انتظامی کلچر میں مطلوبہ تقاضا پورا نہ کرنے والوں کے ساتھ کیا ہوتا رہا تھا اور اب میں اسی دفتر میں بیٹھا تھا اور جسے بلاتا وہ ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑا ہوتا۔ جو بھی فائل یا کیس کہتا وہ چند ثانیوں میں میری میز پر ہوتا۔ ضروری ہدایات لیتا۔ دو ماہ سے پینڈنگ پڑا ہوا میری وائف کی پروموشن بطور SSS سکیل 19 کا کیس دو دن میں تیار کر کے ڈی پی آئی آفس میں دستی جمع کرایا گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اے سی آر ڈوزئیر کب بنا، باقی دستاویز کہاں سے آئیں۔ مجھ تک تو وہ فائنل صورت میں پہنچا۔ وہ کیس جس پر چار سال لگے تھے وہ بھی میری شریک حیات کا تھا۔ میں سکول ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کو اوپر سے تحصیل لیول تک جانتا تھا۔ اللہ تعالی نے مجھے یہ نعمت عطا کی ہے کہ میں معاشرتی ناہمواریوں سے قطع نظر انسان کی توقیر اور تکریم کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہوں، مقدم سمجھتا ہوں اور میری نہاد یا فطرت میں یہ بات بھی اللہ تعالی کی دین ہے کہ اگر مجھے کسی انسان کا خدمت کا موقع ملے تو میں اسے اپنی خوش نصیبی تصور کرتا ہوں۔ کالج ڈائریکٹوریٹ میں ایک پرانے ماڈل کی لینڈ کروزر تھی جس میں ڈاکٹر عبدالمجید نے کہیں سے وسائل اکٹھے کر کے اے سی لگوا دیا تھا۔ پروفیسر ارشاد حسین نقوی کی آمد پر وہ اے سی نکال کر لے گئے۔ نقوی صاحب کے زیر استعمال یہ گاڑی کبھی کی اپنی طبعی عمر پوری کر چکی تھی۔ جب پروفیسر رائے آئے تو انہیں صرف ایک ڈھانچہ نما گاڑی ملی جس کو انہوں نے بلال گنج لاہور کے ذریعے بحال کرا

لیا۔ نئے نظام میں یہ گاڑی ای ڈی او ایجوکیشن کو ملی جو 60 کلومیٹر سے اوپر نہیں جاتی تھی۔ اتفاق سے ڈرائیور کالج سائیڈ سے تھا۔ میں نے سب سے پہلی ہدایت ڈرائیور کو دی کہ وہ میری طرف کا دروازہ کھولے گا نہ بند کرے گا بلکہ سوار ہونے کے بعد میں خود بند کروں گا اور اترتے وقت خود کھولوں گا۔ یہ ایک اینٹی کلونیل رویہ تھا۔ اسی دن دفتر کے باہر دوسری ہدایت اردو کے بڑے فاؤنٹ میں کمپیوٹر سے نکلوا کر لگائی کہ "محترم اساتذہ کرام اور دیگر سائلین مجھے براہ راست مل سکتے ہیں۔ اجازت لینے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کی خدمت پر یہاں موجود ہوں"۔ گویا میں نے خود تک ہر آنے والے کی رسائی کو آسان بنا دیا۔ پی اے اور اٹینڈنٹ کو میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی کو نہ روکیں۔ ای ڈی او آفس کے بہت سے مسائل تو اسی سے حل ہو گئے۔ دوست احباب پہلے دنوں میں خوب ملنے آئے۔ جب بھی کوئی سائل تشریف لاتا اور اس کی بات کو پوری توجہ سے سنتا اور اگر اس کے مسئلے کا حل فوری طور پر ممکن ہوتا تو کر دیا جاتا۔ جس میں کچھ وقت درکار ہوتا تو اسے واضح طور پر بتا دیا جاتا۔ شروع شروع میں تو آفس والے حیرت میں رہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ نئے کلچر کے عادی ہونے لگے۔ پچھلے چند دنوں سے فائل ورک رکا ہوا تھا گویا ایک انبار (back log) لگ گیا تھا۔ مجھے پھونک پھونک کر قدم رکھنا تھا۔ سابقہ ڈی پی آئی سکولز پنجاب میاں محمد شریف کی یہ بات بہت مشہور ہوئی کہ "میں اپنے آپ کو بہت مستعد اور چالاک سمجھتا ہوں لیکن کلرک مجھے بھی دھوکا دے کر خالی کاغذ پر دستخط کرا لیتے ہیں۔" میاں شریف اپنے کئی کارناموں کے لیے معروف ہیں۔ انہوں نے ہائر سیکنڈری کی سکیم یہ کہہ کر منظور کرائی کہ اب کوئی نیا کالج نہیں بنے گا۔ جہاں کالج کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا وہاں ہم اپنے ہائی سکولوں کو اپ گریڈ کریں گے۔ ہمارا انفراسٹرکچر پہلے سے موجود ہے صرف ایس ایس کی آسامیاں منظور کرائیں گے۔ پھر سکول سائیڈ پر سبجیکٹ سپیشلسٹ (SS) کی آسامیوں پر بھرتی کے لیے پنجاب پبلک سروس کمیشن کا اشتہار پہلی دفعہ 1985 میں اخبارات میں شائع ہوا۔ جب کالج کیڈر کی ترقی کا فارمولہ سکول کیڈر کے اساتذہ کے لیے بھی منظور کر لیا گیا تو شارٹ ٹرم ترقیوں کی لائن لگ گئی۔ فوری قسم کی ڈاک کا کام تو دفتر میں ہو جاتا تھا جب کہ باقی ڈاک اور فائلیں میں گھر لے آتا اور دو گھنٹے کے لیے کام کرتا۔ ڈاک پر میں ریمارکس لکھنے کے ساتھ ٹائم لائن بھی لکھ دیتا۔ باقی فائلوں کو میں غور سے قواعد وضوابط کے مطابق دیکھتا۔ میں نے محسوس کیا کہ اہل کاروں کی نوٹنگ، ڈرافٹنگ اور ٹیگنگ شرمناک حد تک خراب تھی۔ ڈی سی او جب کیمپ آفس میں بیٹھ کر کام کرتا تو جس جس محکمے کی فائل آتی جاتی، کسی وضاحت یا مزید معلومات کے لیے ہر متعلقہ ای ڈی او کو وہ فون ضرور کرتا لہٰذا میں آفس ہی میں ایسی متوقع فائل کہ جس کے بارے میں پوچھا جا سکتا تھا، نوٹ کر لیتا اور یوں فون آنے پر فوری طور پر مطلوبہ معلومات شیئر کر لیتا۔ ایک دن ان کا فون نہیں آیا تو اگلے دن فون آنے پر میں نے فرینک ہوتے ہوئے کہا کہ کل پہلی دفعہ آپ کا فون نہیں آیا، وہ بیوروکریٹ تھا مگر چپ رہا اور معلومات شیئر کر کے فون بند ہو گیا۔

آئندہ ایک دو ہفتوں بعد مجھ پر واضح ہوا کہ کون کیا ہے اور اس کا فائل ورک کیسا ہے۔ ہر سیکشن کا ہیڈ عموماً اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا۔ سکول سائیڈ کے اساتذہ بھی سٹاپ گیپ کے طور پر ایک خاموش یا غیر رسمی ڈیپوٹیشن پر تھے۔ یہاں میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر (ایڈمن) زاہد ملک کا ذکر کروں گا جو منظور ملک کے صاحبزادے تھے۔ صاف ظاہر ہے اپنے والد کے ذریعے ہی سکولز ڈائریکٹوریٹ میں آئے تھے۔ پرانی کوٹھی میں جب دفتر تھا تو اس نے مجھے بہت چکر لگوائے تھے مگر اب وہ انکسار و عاجزی کا پتلا لگ رہے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے کسی سمری کا ڈرافٹ تیار کرنے کو کہا، جواباً کہنے لگے کہ کل صبح تک مل جائے گا۔ میں نے ذرا زور دیا تو ایک اغلاط نامہ لکھ کر لے آئے جسے میں نے مسترد کر کے خود ڈرافٹ تیار کروایا۔ وہ جو کل کا کہہ رہے تھے تو مجھ پر منکشف ہوا کہ یہ اب تک اپنے باپ منظور ملک کی انگلی پکڑ کر چل رہے ہیں اور اپنا سارا کام انہی سے کراتے ہیں۔

میں فائل ورک سے مطمئن نہیں تھا۔ میں نے اس کا حل بڑی ہوشیاری سے نکالا۔ ایک دن میں نے تمام کلرکوں کو اپنے آفس میں اکٹھا کیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہمارا فائل ورک معیاری نہیں ہوتا۔ سمریوں کے ڈرافٹ اچھے اور مؤثر نہیں بنتے،، فائلوں کی نوٹنگ بھی بہت عامیانہ ہوتی ہے، ہماری فائل جہاں بھی جاتی ہے وہ مذاق اڑاتے ہیں کہ محکمہ تعلیم جو تعلیم اور شعور دینے والا ہے اسی کا فائل ورک بہت ناقص ہوتا ہے۔ اس کے بعد میں نے پہلے سے تیار کردہ لیکچر وائیٹ بورڈ پر ان کو فائل انڈیکسیشن، سمری کے بنیادی اصولوں، مؤثر ڈرافٹنگ اور نوٹنگ اور بہتر طور پر فائل ورک کا طریقِ کار بتایا۔ یہ میرا ایک نفسیاتی حربہ بھی تھا۔ اس لیکچر سے تمام تر رویے اور انداز بدلنے میں بہت مدد ملی اور کلرک میری بات اس طرح ماننے لگے جس طرح شاگرد استاد کی بات مانتے ہیں۔ ہر دفتر کی طرح یہاں بھی مختلف طبائع کے لوگ جمع تھے۔ مکر و فریب میں گندھے ہوئے تھے تو نیک نیت، شائستہ اور مؤثر اندازِ گفتگو کے حامل بھی تھے۔ ایسے بھی تھے کہ جن پر نگاہ رکھنی پڑتی تھی اور ایسے بھی تھے کہ جن پر مکمل بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ تبادلوں پر چوں کہ پابندی تھی اس لیے راوی نے خاصی حد تک چین ہی چین لکھ دیا تھا مگر باقی فائل ورک بھی بہت تھا۔ کئی مہینوں سے پیچیدہ قسم کی فائلز کا انبار لگا ہوا تھا جن میں کئی فائلز پر مختلف سوالات (queries) اٹھائے گئے تھے مگر ان کے جوابات تکنیکی طور پر نہیں دیئے جا رہے تھے۔ کئی ریفرنسز کی دس گیارہ یاد دہانیاں بھی آ چکی تھیں اس لیے میں ایسے کیسز پر ٹائم لائن دے دیتا یا یہ لکھ دیتا" اس ضمن میں نئی یاد دہانی نہیں آنی چاہیے۔" فنانس اینڈ اکاؤنٹ اور پلاننگ برانچوں کا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا البتہ نجی سکولوں کی رجسٹریشن برانچ کے بارے میں مجھے تحفظات یا شک و شبہات تھے۔ ہمارے سیٹ اپ میں کرپٹ فرد کے لیے آسانیاں ہی آسانیاں ہیں جب کہ ایمانداری برقرار رکھنے کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح نجی سکولوں کے مالک رجسٹریشن کے حصول کے لیے مبینہ طور پر خفیہ طریقے سے ان کو دے دلا دیتے ہوں گے۔ میں نے سکول رجسٹریشن برانچ میں کچھ تبدیلیاں متعارف کرائیں۔ مجھے نجی کالجوں کی رجسٹریشن کے طریقِ کار کا علم تھا کیوں کہ میں متعدد دفعہ نئے نجی کالجوں کی ڈویژنل اور بعد میں ضلعی رجسٹریشن

کمیٹیوں کا چیئر مین یا ممبر رہا تھا۔ میں نے چاروں تحصیلوں میں اپنی حد تک ایماندار ہیڈ ماسٹر یا ڈی ڈی او تلاش کیے اور انہیں متعلقہ تحصیل کا رجسٹریشن ہیڈ بنا دیا اور ان سے میٹنگ کر کے سکولز رجسٹریشن ایکٹ اور ایجوکیشن کوڈ کی روشنی میں ایس او پی تیار کیے اور صرف انہی کی سفارش کردہ کیس منظور کیے جاتے مگر کیا لوگ اپنے مقصد کے لیے انہیں سفارشیں نہیں کراتے ہوں گے! مگر میں دستیاب حالات میں یہی کر سکتا تھا۔ ایک ماہ ہو چکا تھا اور جو سمت متعین کی تھی اسکی طرف کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اب میں نے تھوڑا بہت فیلڈ میں نکلنے کا ارادہ کیا۔ شاید کلانچ والا بوائز ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کے تین خطوط موصول ہو چکے تھے کہ سکول کی بلڈنگ بہت خستہ حالت میں ہے اور اگر گر گئی تو وہ ذمہ دار نہیں ہوگا۔ موسم گرما کی تعطیلات چل رہی تھیں اس لیے تدریسی سرگرمیاں تو بند تھیں۔

5 جولائی کو پہلا دورہ بہاول پور سے چنی گوٹھ کا رکھا۔ راستے میں پہلا پڑاؤ خانقاہ کے ہائی سکول کا تھا جہاں ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انتہائی دوستانہ ماحول میں پانچ دس منٹ تک عام سی باتیں ہوئیں پھر میں نے ان کے مسائل دریافت کیے۔ زیادہ تر کا تعلق بلڈنگ کی خستگی اور چاردیواری کے بارش میں گرنے اور شاید نہری پانی سے تھا۔ ان کے میں نے نوٹس لے لیے۔ یہاں کچھ وقت لگ گیا۔ پھر کلانچ والا پہنچے جہاں بلڈنگ دیکھی اور اس کی مرمت کے تخمینے بھجوانے کے لیے کہا۔ چنی گوٹھ ہائی سکول پہنچے۔ ادارے کے سربراہ سراپا انتظار تھے۔ وہاں کی بلڈنگ کا ایک پورشن نیا بنا ہوا تھا جب کہ پرانا پورشن بھی استعمال میں تھا اور اس کی حالت ایسی تھی جیسے یہاں جنوں اور بھوتوں کا بسیرا ہو۔ ان کو بھی محکمہ عمارات کے توسط سے مرمت کے تخمینہ جات بھیجنے کو کہا۔ واپسی پر احمد پور شرقیہ کے ڈپٹی ڈسٹرکٹ آفیسر (زنانہ) گئے جہاں کوئی ریفریشر کورس چل رہا تھا۔ وہاں اساتذہ نے کئی مہینوں سے تنخواہ نہ ملنے اور مستقل نہ کیے جانے جیسے مسائل کا انبار لگا دیا۔ ڈی ڈی او کو میں نے انسپکشن کے سیمپل (نمونے) کے طور پر گورنمنٹ کیش بک منگوانے کو کہا تو جواب آیا کہ حسابدار (اکاؤنٹنٹ) آج بہاول پور خزانہ آفس گیا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ سٹیشن چھوڑنے کی درخواست تو ہوگی، بولیں وہ کیا ہوتی ہے۔؟ عصر کے وقت احمد پور شرقیہ کی نجی سکولز ایسوسی ایشن نے میونسپل کمیٹی کے جناح ہال میں نو منتخب عہدیداران کی حلف برداری کی تقریب کا اہتمام کر رکھا تھا۔ تحصیل ناظم مخدوم سمیع الحسن گیلانی اور میں مہمانان خصوصی تھے۔ میں نے اپنے مختصر خطاب میں کہا کہ اگر آپ لوگ اپنے مسائل کے حل میں سنجیدہ ہیں تو جو مجھے تحریری یادداشت دی گئی ہے اس میں آپ کے مسائل و مطالبات موجود ہیں۔ میں اپنی ٹیم کے ساتھ ان کا ممکنہ حل تیار کر لوں گا۔ آپ بھی اپنی طرف سے مجوزہ حل تیار کریں اور کسی متفقہ تاریخ کو مل کر دونوں اطراف کی تجاویز کا جائزہ لیں گے اور کسی مناسب حل کی طرف پیشرفت کریں گے۔ میں انتظار کرتا رہ گیا مگر ان کا کوئی نمائندہ اپنا مجوزہ حل لے کر نا آیا۔ اساتذہ کا کوئی بھی لیڈر یا ان کا کوئی وفد آیا تو میں نے ان کے سامنے وہی قابل عمل فارمولہ رکھا مگر اس ملاقات کے بعد کوئی بھی ملنے نہ آتا۔ ایک دن ایک دوست کا فون آیا کہ ایک لیڈر

استاد آپ سے ملنے آئیں گے آپ بس ان کو ایک کپ چائے کا پلا دیں۔ اگلے دن اس لیڈر کی مجھ سے ملاقات کی خبر ایک دو مقامی اخبارات میں شائع ہوئی جس کے تراشے مجھے بھیجے گئے تھے۔ مسائل کے حل کے میرے تجویز کردہ طریقِ کار کو کبھی پذیرائی نہ مل سکی کیوں کہ سب سیاست سیاست کھیل رہے تھے، مسائل کے حل میں کوئی سنجیدہ کوئی نہیں تھا۔

7 جولائی کو ایک ایسا ہی دورہ حاصلپور تک کا تھا۔ پہلے گورنمنٹ ہائیر سیکنڈری سکول خیر پور پہنچے۔ اسکے ہائر سیکنڈری بلاک کے تمام (تین چار) کمروں میں گورنمنٹ ڈگری کالج قائم تھا۔ انٹر کلاسز کے داخلوں کے دوران دونوں ادارے ایک دوسرے پر متجاوز (overlap) تھے۔ میری تجویز یہ تھی کہ اس ہائر سیکنڈری حصے کو لال سہانرا کے ہائی سکول میں شفٹ کر دیا جائے تو دونوں اداروں کے حق میں بہتر ہوگا۔ وہاں کے ایک اور ہائی سکول میں گئے، دوران گفتگو میں نے آڈٹ کے بارے میں دریافت کیا تو مجھے جان کر تعجب ہوا کہ پندرہ سال سے اس ادارے میں ایسی کوئی سرگرمی وقوع پذیر نہیں ہوئی۔ راستے میں زنانہ و مردانہ ڈی ڈی او کے دفتر گئے تو کوئی بھی نہیں تھا صرف چوکیدار ملے۔ حاصل پور کی ایک تنظیم سائبان ڈویلپمنٹ آرگنائزیشن (رجسٹرڈ) نے گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 کے ہال میں ایجوکیشنل ایوارڈ 2004 کی تقریب میں مدعو کر رکھا تھا جس میں میرے علاوہ تحصیل ناظم سید سجاد حسین بخاری مہمانان خصوصی تھے۔ بخاری صاحب بہت نرم گفتار اور اساتذہ کا احترام کرنے والے انسان ہیں۔ ایک دفعہ کالج کے کسی کام کے ضمن میں ان کے دفتر جانا ہوا تو انہیں اس دوران کچھ فون آئے مگر انہوں نے سب کو خوشی سے بتایا کہ کالج کے پرنسپل صاحب تشریف لائے ہیں اس لیے وہ مصروف ہیں۔ میں نے اپنے خطاب میں کہا کہ میں نے مکمل انتظامی ذمہ داری کا آغاز حاصل پور سے کیا تھا اس لیے یہاں کے لوگ اور ان کی محبت میرے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہیں۔ یہاں کے تعلیمی مسائل کا حل میری لسٹ میں سب سے اوپر ہے۔ میں نے واپس آ کر ان دونوں دوروں کے تفصیلی منٹس تیار کیے اور ان میں وہاں کے مسائل کو اجاگر کر کے ان کے حل بھی تجویز کیے۔ ڈی سی او آفس کے کلرک ملتے تو میرے ان تفصیلی منٹس کا تحسین کے انداز میں ذکر کرتے۔

ان دونوں دوروں سے میں نے جو عمومی نتائج اخذ کیے ان میں سب سے پہلا یہ کہ زنانہ دفاتر اور سکولوں (حتیٰ کہ کالجز) میں کلرک ہی مدارالمہام ہوتے ہیں۔ سکول کے ہیڈ ماسٹرز کے ہاں کالجز کے لیے ایک طرح کا تعصب موجود ہے۔ نئے نظام میں ای ڈی او سکول یا کالج دونوں اطراف سے ہوسکتا تھا۔ اگرچہ سکول سائیڈ پر یہ نظام 2014 تک رہا مگر کالج ونگ 2006 میں ضلعی نظام سے نکال کر صوبائی چھپٹر میں چلا گیا۔ اس دوران پہلے پانچ ای ڈی او اتفاقاً کالج سائیڈ سے تھے۔ کالج اور سکول کیڈرز سے آنے والے ای ڈی اوز میں وہی فرق تھا جو کالج اور سکول کلچر میں پایا جاتا ہے۔ کالج کیڈر سے آنے والے ای ڈی او سکول اساتذہ اور سکولوں کے سربراہوں کو سکول کیڈر سے آنے والے افسران کی نسبت زیادہ عزت و تکریم دیتے تھے۔ کالجز میں

بھی ایسا پایا جاتا ہے مگر سکولوں کے سربراہوں میں چودھراہٹ کے آثار زیادہ پائے گئے تاہم بعض ہیڈ ماسٹر اپنے کردار کی وجہ سے بہت مکرم ومعتبر تھے۔اس ضمن میں مجھے گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ایک حاصلپور کے سینئر ہیڈ ماسٹر چودھری محمد سرور کی مثال ہی مل سکی۔سکولوں اور ان کے انتظامی دفاتر میں رعب و دبدبے کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ریگولر اور انٹرنل آڈٹ کی روایت بھی بہت بے قاعدہ نظر آئی۔درجہ چہارم کے ملازمین سے گھروں میں کام لینے اور مادی رجحانات بہت عام نظر آئے۔

ہماری بیوروکریسی "فائل بازی" پر مکمل ایمان رکھتی ہے۔معروف طریقہ تو یہ ہے جس سیکشن سے فائل کا آغاز کیا جاتا ہے اسے ہر لحاظ سے چھان پھٹک کر دیکھ لینا چاہیے اور اس کے تمام تقاضے پورے ہونے چاہئیں۔پنجاب سیکرٹریٹ میں یہ بات معروف ہے کہ سفارش یا پہیے لگی فائل کے علاوہ باقی فائلوں کو "یتیم" کا درجہ دیا جاتا ہے۔زیادہ سے زیادہ ڈپٹی سیکرٹری تک کوئی اعتراض باقی نہیں رہنا چاہیے مگر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فائل جتنی بار آئے جائے گی اسی قدر وہ میچور ہوگی اور آخر کار فائنل اتھارٹی اس کی منظوری دے دیتی ہے۔ ایڈیشنل سیکریٹری سے فائل کا پروٹوکول تبدیل ہو جاتا ہے اور ڈپٹی سیکرٹری اور بعد کی اتھارٹیز کے لیے نوٹنگ ہاتھ سے نہیں لکھی جاسکتی بل کہ ٹائپ کی جاتی ہے۔اب کمپیوٹر نے کام بہت آسان کر دیا ہے۔ڈی سی او عمران احمد جب دیکھتے کہ فائل "میچور" ہوگئی ہے تو وہ منظوری دینے سے پہلے "پلیز سپیک" لکھ دیتے۔ان کا جب یہاں سے ٹرانسفر ہوا تو ان کی الوداعی تقریب کے آخر میں ضلعی ناظم چودھری طارق بشیر چیمہ نے جگت لگائی۔" عمران صاحب فائلوں پر تو آپ نے ہمیشہ "پلیز سپیک" ہی لکھا ہے، آئیں چائے کے لیے چلتے ہیں۔"میں نے اپنی محدود مدت پر مشتمل تعیناتی کے دوران اہم اور غیر اہم اجلاسوں کا بھرپور کلچر دیکھا۔اگر چہ مثبت اور منطقی نتائج تک پہنچنے اور کچھ امور کو فیصلہ کن بنانے کے لیے بعض اجلاس بہت اہم ثابت ہوئے مگر ان کا تناسب 25 فیصد تھا۔75 فیصد اجلاس محض کارروائی، بے سود اور وقت کا ضیاع دیکھے گئے۔صبح لاہور سے فون آتا کہ کل دس بجے محکمہ سکول ایجوکیشن میں فلاں موضوع کے حوالے سے ایک اہم اجلاس ہے، ای ڈی او بروقت پہنچیں، پہنچنے پر معلوم ہوتا کہ اجلاس دو گھنٹے کی تاخیر سے شروع ہوگا، دو گھنٹے کے بعد بتایا جاتا سیکرٹری کو وزیر اعلی نے بلا لیا ہے اس لیے اجلاس منسوخ کر دیا گیا ہے۔سیکرٹریٹ میں کہیں بیٹھنے کی جگہ مل جائے تو غنیمت ہے۔سکول کے ایس او جنرل کو بہاول پور میں کوئی کام تھا تو ملاقات ہوئی جو واقفیت کی صورت اختیار کر گئی اس طرح ایک پناہ گاہ مل گئی جہاں کسی میٹنگ یا فائل کی تاخیر میں بیٹھ جاتا۔ایس ای کالج بہاول پور میں تاریخ کے استاد جناب خالد نذیر تھے جو ڈپٹی ڈائریکٹر کالجز بہاول پور رہے۔ان کی بیٹی (نام یاد نہیں رہا) سکول سائیڈ میں سیکشن آفیسر تھی جو اپنے والد (مرحوم) کے دوستوں اور بہاول پور سے تعلق رکھنے والوں کیساتھ بہت عزت واحترام سے پیش آتی۔کئی دفعہ ان کا آفس بھی پناہ گاہ ثابت ہوا۔عباسیہ سکول کے شریف النفس اور بزرگ ہیڈ ماسٹر جناب عبدالحمید ملک چند ماہ بعد ریٹائر ہونے والے تھے کہ ایک اور صاحب نے ان کی جگہ پر

تبادلہ یا پوسٹنگ کرالی۔ جب وہ وہاں جوائن نا کر سکے تو محکمہ سکول ایجوکیشن میں درخواست دائر کر دی۔ سیکرٹری نے مجھے اور پارٹیوں کو مع ریکارڈ طلب کر لیا۔ میں نے سیکرٹری سے درخواست کی کہ پارٹیوں کو سننے سے پہلے میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ دراصل میں ملک صاحب کی بزرگی کے باعث ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ 2001 میں ہم نے لاہور میں ایک ٹریننگ میں شرکت بھی کی تھی لہٰذا ریٹائرمنٹ کے قریب ہونے کے حوالے سے میں سیکرٹری کا ذہن بنانا چاہتا تھا۔ جب میں نے تحریری دلائل تھماتے ہوئے زبانی چند باتیں کیں تو انہیں تسلیم کر لیا گیا اور جب کیس کی سماعت کی تو ملک صاحب کے حق میں فیصلہ دیا۔ جہاں ملک صاحب کو پریشانی سے نجات ملی وہاں مجھے اطمینان جیسی دولت نصیب ہوئی۔

اسی طرح ضلع میں ڈی سی او اور ناظم کے دفتر کو ضلعی سیکرٹریٹ کہنا چاہیے۔ یہاں بھی ضروری اور غیر ضروری بل کہ رسمی و غیر رسمی اجلاسوں کا سلسلہ تواتر سے جاری رہتا۔ اجلاسوں میں وقفے بھی آتے۔ ڈسٹرکٹ آفیسر (کوارڈینیشن) شارق مسعود انصاری بتا دیتے کہ کون سی میٹنگ کب تک متوقع ہے تو وہاں میری پرسکون پناہ گاہ اس وقت کے ڈسٹرکٹ آفیسر (ایچ آر) اور پرانے رفیق کار اور دوست نبی بخش ملک کا دفتر ہوتا۔ ملک صاحب کا تعلق لیاقت پور کے قریب ایک قصبے ملکانی سے ہے۔ وہ ریاضی کے شاندار استاد تھے اور ہم نے خان پور اور رحیم یار خان کے کالجوں میں اکٹھے کام کیا تھا۔ 1983 کے بیچ میں وہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر/مجسٹریٹ کے صوبائی مقابلے کے امتحان میں دوسری پوزیشن سے کامیاب ہوئے اور مختلف شہروں میں مجسٹریٹ اور اسسٹنٹ کمشنر رہے۔ ضلعی نظام میں بہاول پور آ گئے۔ میں ذاتی طور پر ان سے بہت متاثر تھا۔ بچپن میں چیچک کا حملہ ہوا اور ایک آنکھ جاتی رہی۔ اس کمی کو انہوں نے اپنی طاقت بنایا اور ایم ایس سی ریاضی کر کے کالج کے استاد بنے۔ ان کی صحبت بہت قہقہہ آور ہوتی۔ زندہ دلی اتنی کہ ایک لمحے کے لیے بھی سامع اکتاہٹ کا شکار نہ ہوتا۔ بیوروکریسی میں اتنی مدت گزارنے پر بھی ان کا ایمان ڈگمگایا اور نہ قہقہے کی اور یجنلٹی متاثر ہوئی۔ ان کی جگت کی کاٹ بھی ویسی ہی رہی۔ چوں کہ میرا تعلق بھی دیہات سے تھا اس لیے ہمیشہ ان سے تحریک ملتی رہی۔ ان کے آفس میں بیٹھ کر دو میٹنگز کا درمیانی وقفہ محسوس ہی نہ ہوتا۔ ایک دن کچھ بے فائدہ سی میٹنگز کے بعد میں اپنے آفس پہنچا تو میرے داخل ہونے کے فوری بعد ایک مضافاتی سکول کے پرائمری بزرگ استاد داخل ہوئے اور مجھ سے وضاحت طلب کر لی کہ میں اتنی دیر سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں نے مسکرا کر انہیں بتایا کہ میں کچھ بے معنی میٹنگز سے دیر سے فارغ ہوا، آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی جس کے لیے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ آپ تشریف رکھیں۔ میں نے انہیں ٹھنڈا پانی پیش کیا اور پوچھا کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ انہوں نے کوئی کام بتایا جس کا اس وقت ہونا ناممکن تھا تاہم میں نے نہایت احترام سے ان پر حقیقت واضح کی جس سے وہ مطمئن ہو گئے۔ جب وہ جانے لگے تو میں انہیں دروازے تک چھوڑنے آیا۔ میرے لیے پرائمری استاد زیادہ قابل قدر تھا جو سخت حالات میں بچوں کی ابتدائی

تربیت کر کے اگلے مرحلے کی جانب روانہ کرتا ہے۔

تبادلوں پر پابندی نے بہت پرسکون رکھا کیوں کہ یہ وہ باب ہے جس سے توقعات رکھنے والے دوستوں کے ناراض یا آزردہ ہونے کے امکانات زیادہ تھے۔ دن میں متعدد فون صرف تبادلوں کے حوالے سے آتے اور میرا جواب ہوتا، "تبادلوں پر پابندی ہے۔" سابق ڈائریکٹر ایجوکیشن کالجز بہاول پور پروفیسر ارشاد حسین نقوی ٹیچرز ویلفیئر فاونڈیشن کے مینیجنگ ڈائریکٹر تھے۔ جولائی کے آخری دنوں کی بات ہے کہ میں لاہور میں محکمہ سکولز ایجوکیشن سے منسلک پی اینڈ ڈی بلڈنگ میں واقع ان کے دفتر میں ملنے گیا تو انہوں نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ ان سے خوب باتیں ہوئیں۔ اسی دوران تبادلوں کے سلسلے میں میرے موبائل پر ایک ایم پی اے کا فون آیا تو میں نے کہا کہ تبادلوں پر پابندی ہے۔ کہنے لگے کہ میں نے معلوم کیا ہے کہ یہ پابندی اب اٹھا لی گئی ہے۔ میں نے جواباً کہا کہ محترم، جہاں سے پابندی اٹھائی جاتی ہے میں لاہور میں اسی جگہ بیٹھا ہوں، وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

14 اگست 2004 کے یوم آزادی کو بھرپور انداز سے منانے کا فیصلہ ہوا اور چراغاں وغیرہ کے ساتھ ساتھ 14 اگست کو ڈرنگ اسٹیڈیم میں ایک بڑی تقریب کا انعقاد طے پایا اور ای ڈی او ایجوکیشن کو کہا گیا کہ اس میں مرکزی کردار سکولوں کے بچوں کا ڈرل کا مظاہرہ ہوگا۔ پرانے سکولز ڈائریکٹوریٹ اور اب ای ڈی او ایجوکیشن کے آفس میں میٹنگ روم نہیں تھا جب کہ پرانے کالج ڈائریکٹوریٹ اور اب ڈسٹرکٹ آفس کالجز میں ایک بہترین میٹنگ ہال تھا، میں نے پروفیسر محمد اکبر شیخ کو اعتماد میں لیا اور بہاول پور شہر کے ہائی سکولوں کے سربراہوں کا اجلاس طلب کیا۔ سکول و کالجز کی روایتی باہمی نفسیاتی کشمکش کے پیش نظر تقریب کے آغاز میں وضاحت کرنا پڑی کہ میرے لیے بحیثیت ای ڈی او کالج اور سکولوں کے سربراہ برابری کی سطح پر اہم ہیں لہٰذا اس ہال میں میری موجودگی میں خود کو کوئی صاحب بھی غیر اہم ہونے کا خیال دل میں نہ لائے۔ 14 اگست کے دن کی تقریب میں شاندار کارکردگی سے دراصل محکمہ تعلیم کا نام اجاگر ہوگا۔ میری اس گفتگو نے سب حاضرین میں ایک جذبہ روشن کر دیا۔ تقریب کے دوران سکولوں کی طرف سے پی ٹی شو کا شاندار مظاہرہ دیکھ کر میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ڈسٹرکٹ آفیسر (کوارڈینیشن) شارق مسعود انصاری کو کہتے سنا۔ ''بھئی نسیم بلوچ صاحب! اس سال تو سکولوں کی کارکردگی گذشتہ سالوں کے مقابلے میں کہیں بڑھ کر ہے، فرق صاف ظاہر ہے''۔ میں شکریہ کے طور پر مسکرا دیا۔

ایک دن مجھے پنجاب سروسز ٹربیونل کا توہین عدالت کا نوٹس ملا۔ میں نے اس اسسٹنٹ کو بلایا جو کورٹ کیسز کو دیکھتا تھا۔ اس نے کہا کہ 14 جولائی کو کیس لگنا تھا مگر فائل پر اگلی پیشی کی تاریخ غلطی سے اس نے 15 لکھ دی ہے جو آج ہے۔ مجھے معلوم ہوا پی ایس ٹی کا سنگل بنچ مہینے میں دو بار بیٹھتا ہے اور آج دوسرا دن ہے۔ سرکٹ ہاؤس میں اس اسسٹنٹ کو لے کر میں پہنچ گیا، ابھی ممبر نہیں پہنچے تھے۔ وہاں خاصا رش تھا۔

رحیم یار خان کے ای ڈی او ایجوکیشن رانا حضور بخش بھی موجود تھے۔ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ میں نے جج کے معاون کلرک کو اپنے کلرک کی غلطی بتائی تو اس نے وعدہ کیا کہ وہ جج کے آتے ہی ہمیں پہلے نمبر پر بلا لے گا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ میں نے کہا: "جناب میرے آفس کی ایک کلیریکل غلطی سے میں یا متعلقہ اسسٹنٹ کل حاضر نہیں ہو سکے۔ میں یقین کی حد تک عدالت کا احترام کرتا ہوں لہٰذا درخواست ہے کہ توہین عدالت کا نوٹس واپس لیا جائے"۔ میں نے یہ بات انگریزی میں کہی۔ میری درخواست کو قبول کر لیا گیا اور جج نے فائل پر منسوخی کا حکم لکھ کر دستخط کر دیے۔ سکول کیڈر کے ایک سینئر کلرک نے سروس بک اور میٹرک کی سند میں ردوبدل کر کے چند سال اوپر گزار لیے۔ وہ کسی سٹیج پر منکشف ہو گیا۔ اب اس کی پینشن کا کیس منظور ہو چکا تھا مگر خزانہ اس کو ادائیگی نہیں کر رہا تھا۔ اس نے مل ملا کر جی پی فنڈ کی منظوری لے لی جسے خزانہ قبول نہیں کر رہا تھا۔ ضلعی افسر خزانہ نے مجھے جی پی فنڈ کی منظوری کو کینسل کرنے کے لیے لکھا جس پر اگلے دن عملدرآمد کر دیا۔ پینشن کی چلت کے لیے اس نے لاہور ہائیکورٹ کے بہاول پور بنچ میں رٹ دائر کر رکھی تھی۔ میرا موقف یہ تھا کہ اس نے جعل سازی کے ذریعے جو مفادات حاصل کیے ان کو منہا کر کے باقی کے واجبات کی ادئیگی کر دی جائے۔ بعد میں شائد اسی طرح کا فیصلہ آیا تھا۔ ایک دن ڈی سی او آفس سے واپسی پر میں ٹیکنیکل سکول چلا گیا۔ جناب قمر الدین خاں پرنسپل نے ایک مسئلہ میرے سامنے رکھا کہ ایک سینئر کلرک ہے جس کے پاس پنجاب کے محکمہ سکولز ایجوکیشن کی طرف سے جاری کردہ ایک اتھارٹی لیٹر تھا جس میں یہ مذکور تھا کہ ان صاحب کو بہاول پور کے لیے محکمہ تعلیم کا کوارڈینیٹر مقرر کیا گیا ہے اس لیے اسے ٹیکنکل سکول میں دفتر اور ضروری سہولتیں مہیا کی جائیں۔ اب وہ دفتر میں بیٹھ کر سکول کے درجہ چہارم کے ملازمین پر رعب جماتا ہے اور دوستوں سے گھرا رہتا ہے اور چائے چلتی رہتی ہے۔ میں نے ان سے اس لیٹر کی کاپی لے لی۔ اتفاق سے مجھے ایک نوجوان دفتر ملنے آیا اور اس نے کہا کہ میں مقتدر جماعت کا کارکن ہوں اور کل میری وزیر تعلیم سے ملاقات طے ہے۔ میں نے اسے پرنسپل کے خط کی کاپی دی کہ یہ وہاں سے تصدیق کرا دے۔ دوسرے دن ڈی سی او اور ای ڈی او آفس میں فیکس آئی کہ یہ لیٹر جعلی ہے اور اس سے سکول میں حاصل کردہ دفتر فوری طور پر واپس لیا جائے اور ساتھ ہی پیڈا ایکٹ کے تحت کارروائی کا حکم دیا گیا تھا۔ اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ اب لاہور جانا ہوتا تو ڈی۔ پی۔ آئی کالجز اور سکولز دونوں کو ملنا پڑتا۔ ایک دفعہ جب میں ڈائریکٹوریٹ آف پبلک انسٹرکشنز گیا تو اتفاق سے کالجز کے نئے ڈی پی آئی ڈاکٹر محمد شوکت نے اسی روز اپنے عہدے کا چارج لیا تھا سو مبارک باد دی اور جواباً مٹھائی بھی کھائی۔ اس کے بعد ڈی پی آئی (سیکنڈری ایجوکیشن) راؤ شمیم خان سے ملنے گیا تو وہ اپنے قریبی ساتھیوں میں گھرے بیٹھے تھے اور بریانی چل رہی تھی۔ میں نے تعارف کرایا تو بہت خوش دلی سے ملے اور لذیذ بریانی بھی زبردستی کھلائی۔ میں اوپر کہیں تاریخ کے پروفیسر اور ایس ای کالج بہاول پور کے سابق پرنسپل محمد کامل صدیقی کے بیٹے راحیل صدیقی کا ذکر کر چکا ہوں۔ ان کا تعلق ڈی ایم جی گروپ سے تھا اور بہاول پور میں ای ڈی او (فنانس اور

پلاننگ) تھے۔ سابق سکول ڈائریکٹوریٹ کی عمارت میں ای ڈی او ایجوکیشن کے علاوہ ڈسٹرکٹ آفیسر (انٹر پرائیز) کا دفتر بھی تھا اور راحیل صدیقی کے پاس اس کا اضافی چارج تھا لہٰذا وہ جب اس دفتر میں آئے تو دو بار مجھے بھی ملنے آئے۔ ایک بار تو ڈسٹرکٹ آفیسر (کالجز) اور تاریخ کے استاد شیخ محمد اکبر بھی موجود تھے، صدیقی صاحب خاصے باتونی تھے کیوں کہ اس دن وہی بولتے رہے اور اپنے قصے سناتے رہے۔ یہ وہی ہیں جو نون لیگ کے دور میں ڈی سی رحیم یار خان رہے۔ سیلاب زدہ علاقوں کے دورے پر شارٹس پہن کر گئے جس پر حزب اختلاف نے بہت تنقید کی۔ بعد میں صوبائی سیکرٹری اور پنجاب ریونیو اتھارٹی کے سربراہ بھی رہے۔ ستمبر 2004 کے شروع میں ان کے دفتر میں ایک میٹنگ میں شرکت کا موقع ملا جس میں چولستان ڈیزرٹ جیپ ریلی کے انعقاد پر بحث کی گئی۔ اس وقت یہ محض ایک تصور تھا جس کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی تھی۔ ایک بار ڈی سی او نے مجھے ایک فائل دی کہ کسی این جی او نے چولستانی طلبا کے لیے چند وظائف دینے کی پیش کش کی اور میں ان وظائف کی شفاف تقسیم کے لیے قابل عمل ایس او پی تیار کر کے دوں۔ میں نے بڑی محنت کے ساتھ اس سکیم پر کام کیا اور ایک ہفتے کے بعد وہ فائل ان کے حوالے کی جسے دیکھ کر انہوں نے خاصی تحسین کی۔ ایک بار مجھے سابق ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر (سیکنڈری ایجوکیشن) نے ایک درخواست بھیجی کہ اسلامیہ یونیورسٹی کا ریلوے روڈ کیمپس دراصل عباسیہ ہائی سکول کا ہوسٹل ہوا کرتا تھا جسے یونیورسٹی نے بطور ٹوکن ایک روپے ماہانہ کرائے پر حاصل کر رکھا تھا۔ درخواست کے ساتھ کرائے نامے کی ایک کاپی بھی منسلک کی گئی تھی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کے علم میں لاؤں اور میڈیا کو بھی استعمال کروں مگر وہ بھی کشمیر کی طرح ایک مقبوضہ علاقہ تھا اور کسی بھی قسم کی کوشش اور جدوجہد بے سود تھی پھر اگر میں اس بات کو آگے بڑھاتا تو اسے محض ایک شرارت تصور کیا جاتا مگر ایک خیال میرے ذہن میں ضرور پیدا ہوا کہ یہ کیس تو بہت پرانا تھا تو اسے پہلے ڈائریکٹوریٹ کے وقت کیوں نہ اٹھایا گیا جب کہ درخواست دہندہ خود بھی خاصی دیر تک اچھی پوزیشن پر رہے۔ سکول ڈائریکٹوریٹ 1987 تک پرانی کوٹھی میں رہا، بعد میں اسے موجودہ بلڈنگ میں منتقل کیا گیا۔ اب صرف ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر (ایلیمنٹری) کا دفتر اس میں موجود تھا۔ ایک دن ڈی ای او محمد اقبال بہت پریشانی کے عالم میں میرے پاس دفتر آئے اور روہانسے انداز میں بتانے لگے۔ " ہمیں ایک مقتدر ادارہ بلڈنگ خالی کرنے پر زور دے رہا ہے۔ کئی دفعہ تو دھمکیاں بھی دی جاتی ہیں۔ ایک دفعہ تو بہت ہتک آمیز رویہ بھی اختیار کیا گیا جس سے مجھے بہت تکلیف ہوئی۔" میں نے انہیں چائے پیش کی اور کہا کہ ہم آج ہی اس مسئلے کا حل نکالتے ہیں جس سے وہ پریشان نہیں کریں گے۔ میں نے ان کی طرف سے ایک خط بعنوان " درخواست برائے رہنمائی وہدایت" تیار کیا اور اس کا متن کچھ اس طرح تھا۔" جناب یہ دفتر اس جگہ پر کئی سال سے قائم ہے اور پرانی کوٹھی جسے بہاول پور کے نواب کی بہاول پور میں پہلی رہائش گاہ کا اعزاز حاصل ہے۔ کئی سال سے محکمہ سکول بہاول پور کے زیر استعمال ہے۔ اب یہاں صرف ایک ضلعی آفس موجود ہے۔ ایک مقتدر

ادارہ اسے اپنی ملکیت جتا کر ہمیں یہ جگہ خالی کرنے پر اصرار کر رہا ہے اور آہستہ آہستہ ان کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔اس ضمن میں آپ کی رہنمائی اور ہدایت درکار ہے۔" انگریزی ڈرافٹ کے خط پر ان کے دفتر سے سابقہ تاریخ میں روانگی نمبر دستیاب ہو گیا۔اس خط کی روشنی میں اب میں نے انہیں ایک محتاط ہدایت جاری کی گئی جس کے متن کا ترجمہ یہ تھا۔''عنوان بالا کے تحت آپ کی طرف سے آمدہ خط کے ضمن میں تحریر ہے کہ اس بلڈنگ کے دعوے دار دونوں ادارے اپنے اپنے دائرہ کار میں مؤقر و محترم ہیں لہٰذا اسکا کوئی مناسب و موزوں حل نکالا جانا چاہیے۔آپ ملکیت کے دعوے دار ادارے سے درخواست کریں کہ اس جگہ کی ملکیت کے حوالے سے کوئی دستاویز مہیا کریں تاکہ ہم اپنے محکمے کو مزید کارروائی کے لیے لکھ سکیں" اس پر اپنے دفتر کا روانگی نمبر اور تاریخ ڈال دی۔اب ایک تیسرا خط تحریر کیا گیا جس میں ای ڈی او آفس کی ایڈوائس کے مندرجہ بالا نکات کو ہی لکھا گیا تھا۔تینوں خطوط بزبان انگریزی تھے۔آخری دونوں خطوط کی ایک ایک کاپی ملکیت ظاہر کرنے والے ادارے کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو بھی بھیجی گئی۔بعد میں جب کبھی اقبال صاحب ملے تو بتانے لگے کہ اس خط کی وجہ سے فی الحال تو خاموشی ہے۔

کچھ دنوں بعد حاصل پور کے سابق اسسٹنٹ کمشنر، ضلع بہاول پور کے سابق ڈی او (ریونیو) جناب عبدالغفور بھٹی پنجاب میں کین کمشنر تھے یا شاید بورڈ آف ریونیو کے سیکرٹری کالونیز تھے، کا ایک دھماکے دار فون آیا کہ " آج میں پنجاب کے وزیر تعلیم عثمان ابراہیم کے دفتر گیا تو وہ بڑے فخریہ انداز میں بتانے لگے کہ آج وہ ایک دھماکا کر کے آئے ہیں۔میرے پوچھنے پر بتانے لگے کہ ورلڈ بنک نے بہت دباؤ ڈال رکھا تھا کہ پنجاب کے تمام ای ڈی اوز کو بلا امتیاز تبدیل کر دیا جائے اور آج وہ سمری میں نے دستی وزیر اعلیٰ سے منظور کرالی ہے۔" بھٹی صاحب نے بتایا کہ ان کی بات سن کر میرے منہ سے نکلا، میرا ایک دوست بھی ای ڈی او ایجوکیشن بہاول پور تھا، وزیر تعلیم نے کہا کہ بلا تخصیص سب گئے اور ان سب کی جگہ نئی تقرریوں کا کل تک نوٹیفیکیشن بھی جاری ہو جائے گا کیوں کہ ہوم ورک پہلے ہی مکمل ہو چکا ہے۔میں ایک دن پہلے ہی لاہور سے لوٹا تھا اور یہ تمام کام اتنی راز داری سے ہو رہا تھا کہ کسی کو کوئی خبر ہی نہیں تھی۔اگلے دن نوٹیفیکیشن آ گیا جس میں تمام 36 اضلاع کے ای ڈی اوز کی جگہ 36 نئی تقرریاں کی گئی تھیں۔میں نے تو پھر بھی چند ماہ گزار لیے ورنہ کچھ کی تقرریوں کو تو دو سے چار ہفتے ہی ہوئے تھے۔

میری جگہ پر گوجرانوالہ کے کسی کالج میں اسلامیات کے استاد ڈاکٹر بابر بیگ مطالی کی پوسٹنگ ہوئی تھی۔دفتر کی طرف سے رابطہ کرنے پر انہوں نے ایک ہفتے کے بعد جوائن کرنے کا کہا۔ڈسٹرکٹ ناظم وزیر اعلیٰ کے بہت قریب تھے انہوں نے وزیر اعلیٰ سے بات کرنے کا عندیہ دیا اور چارج چھوڑنے سے منع کیا۔دو دن کے بعد ان کا فون آیا کہ میں نے بات کی تھی مگر وہ کہنے لگے کہ یہ سب کچھ ورلڈ بنک کا پرانا مطالبہ تھا اور انہوں نے اپنے شہر اور ضلع گجرات کا ای ڈی او بھی نہیں چھوڑا۔اگر میں ایک کا تبادلہ منسوخ کرتا ہوں تو ایک

قطار لگ جائے گی۔ اب میرا جانا ٹھہر گیا تھا مگر میں نے اس دن تک فائل ورک کیا جب تک کہ نئے ای ڈی او نہیں آ گئے۔ جس دن انہوں نے آنا تھا اس دن میں اپنی گاڑی پر دفتر آیا۔ سرکاری گاڑی ان کو لینے بھیج دی اور ان کی آمد پر انہیں خوش آمدید کہا۔ انہوں نے بتایا کہ میرا اس سے پہلے کوئی انتظامی تجربہ نہیں ہے۔ ان کے سامنے میں نے سٹاف سے پوچھا کہ میرے ذمے کوئی کام رہتا تو نہیں، بتایا گیا کہ آج تک کی کوئی فائل باقی نہیں ہے۔ میں نے ریلیونگ جوائننگ پروفارما پر کر کے لانے کو کہا۔ اس پر میں نے اور نئے آنے والے افسر نے دستخط کیے۔ سٹاف کو دفتر میں اکٹھا کیا، ان کا تعارف کرایا اور ہر ممکن تعاون کرنے کی نصیحت کی۔ میں اپنی کرسی سے اٹھا اور انہیں اس کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی، پہلے انہوں نے تکلف کیا، میرے اصرار پر وہ بیٹھ گئے۔ میں نے ان کے سامنے والی کرسی سنبھال لی، چند منٹ عمومی باتیں کیں، سب حاضرین سے اجازت لی، گاڑی سٹارٹ کی اور گھر کی راہ لی۔ میرے دل میں کوئی ملال تھا نہ کوئی پچھتاوا۔ میں نے آلودگی کے ماحول میں اپنے دامن پر کوئی چھینٹا نہیں پڑنے دیا۔ میں نے ہر ممکن اور ہر لمحے اپنی تمام تر توانائی اور کمٹ منٹ سے اچھائی کی جوت جلانے کی کوشش کی۔ جب میری کوئی مادی تحریص نہیں تھی تو ہر ایک نے پھونک پھونک کر قدم رکھا۔ میں نے ان کی خامیوں کی نشان دہی بھی کی اور ان کی اچھائیوں کو سراہا بھی۔ میں نے اخلاقی اور باہمی احترام کی بنیادوں پر بہتر تعلقات کار قائم کرنے کی کوشش کی۔ اساتذہ اور تمام سائلین پر بلا امتیاز اپنے دفتر کے دروازے وا کیے اور ان کی عزت و تکریم کو ملحوظ خاطر رکھا۔ میں نے استاد کی حیثیت سے آرتھوڈوکس ماحول کے بتوں کو توڑ کر ان کی مثبت خطوط پر تربیت کی کوشش بھی کی۔ میں نے افسر بننے کی بجائے خادم اور دوست بننے کو ترجیح دی۔

میری رخصتی پر اگر کچھ لوگ شاداں تھے تو چند ملول بھی ہوئے ہوں گے، مثالی صورتحال تو کہیں نہیں مل سکتی۔ اب مجھے آگے کا سوچنا تھا۔ ایک ہفتے بعد میں نے محکمہ ہائر ایجوکیشن میں تحریری طور پر رپورٹ کیا اور اپنی نئی تقرری کی درخواست بھی جمع کرا دی اور لوٹ آیا۔ حاصل پور کے دوستوں نے جو میرے جانے پر ناراض تھے، واپس آنے کو کہا تو میں نے کہا اب کوئی نئی بستی بسائیں گے۔ کل تک میں جو گورنمنٹ ڈگری کالج یزمان آنے کے خلاف دلائل دیتا تھا اب میں وہاں جانے پر مائل ہو گیا مگر خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان میں شعبہ بیالوجی کے جاوید اختر واہلہ ترقی پا کر بطور پرنسپل یزمان کالج جوائن کر چکے تھے۔ میں بہر حال بے یقینی کا شکار تھا اور یہ کیفیت بہت پریشان کن ہوتی ہے۔ میں کہ متحرک اور مصروف رہنے کا عادی تھا، فراغت اور مستقبل کے ابہام نے نفسیاتی طور پر بہت متاثر کیا۔ میں اور جاوید اختر واہلہ خان پور کالج میں اکٹھے بھی رہ چکے تھے اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ رحیم یار خان کے بغیر کہیں نہیں ٹک سکتے تھے اور یہ بھی جانتا تھا کہ ان کو کام کرانے کے سوہنر آتے تھے مگر اس بات کا کیا ثبوت تھا کہ ان کے جانے کے بعد میں ہی یزمان کالج میں پرنسپل کی پوسٹ پر جاؤں گا۔ واہلہ صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا کہ ان کی جگہ میں ہی لوں گا اور اس طرح ان کی رحیم یار خان کی سیٹ اپ گریڈ ہو گئی اور میرے پرنسپل کے کے طور پر آرڈر بھی اسی آرڈر کا حصہ تھے۔ واہلہ صاحب ماڈل ٹاؤن سی

بہاول پوروالے گھر میں آئے اور میری جوائننگ اور ان کے فراغت نامے پر دستخط کیے گئے اور میری زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

میں یزمان کے نام سے ساٹھ کی دہائی کے آخر میں کسی وقت واقف ہوا۔ دراصل نیاز بس سروس کی ایک بریڈفورڈ بس جس کا انجن فرنٹ پر عام ٹرکوں کی مانند آگے نکلا ہوا تھا، اس پر منزل کا نام "یزمان منڈی" لکھا ہوا تھا، کو میں نے کمالیہ چیچہ وطنی روڈ پر کہیں دیکھا تھا۔ اس وقت یزمان کے کے محل وقوع کا علم تھا نہ بس کے روٹ کا۔ 1979 میں خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان میں ایجوکیشن کے استاد چودھری غلام نبی تھے جنہوں نے اپنا تبادلہ ایس ای کالج بہاول پور کرا لیا۔ چوں کہ وہ تنظیم اساتذہ کے کارکن اور شاید عہدیدار بھی تھے اس لیے اس تنظیم سے تعلق رکھنے والے یہاں کے اساتذہ ان کا کبھی کبھار تذکرہ کر لیتے تھے۔ 1992 میں ان کے بارے میں سنا کہ انہوں نے بہاول پور کے قریب واقع اپنے شہر "یزمان" کے انٹر کالج میں اپنا تبادلہ کرا لیا۔ یزمان کی درست لوکیشن سے پھر بھی لاعلم رہا۔ بہاول پور شفٹ ہونے کے بعد مارچ 1995 میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر خواجہ صابر حسین اور ان کے دوستوں کے ساتھ میلہ چنن پیر جانا ہوا۔ جاتے وقت یزمان شہر سے گزرے تو ایک نظر دیکھا، مین سٹریم سے کٹا ہوا ایک چھوٹا اور عام سا شہر نظر آیا یوں پہلی بار اس شہر کی لوکیشن کا علم ہوا۔ 1997 میں بغداد روڈ کالج میں بیالوجی کے استاد محمد طارق جتالہ (مرحوم) کے گھر یزمان جانا ہوا مگر مین روڈ شروع ہونے کے فوری بعد دائیں طرف مڑ کر ان کا گھر تھا اور وہیں سے واپس ہوئے، شہر نہ دیکھ سکے۔ گورنمنٹ صادق عباس کالج ڈیرہ نواب (احمد پور شرقیہ) میں فارسی کے استاد محمد ادریس کے گھر براستہ نور پور نورنگا، ہیڈ راجکاں اور ان کے گاؤں جانے کا اتفاق ہوا تو انہوں نے نشان دہی کی کہ یہ سڑک ٹیل والہ اور یزمان جاتی ہے۔ پروفیسر محمد حفیظ کی ای ڈی او تقرری ہوئی تو پروفیسر سید اسرار حسین نے ان کے لیے اپنے گھر میں ایک کھانا دیا۔ وہاں پر ایک تجویز سامنے آئی کہ نسیم بلوچ نے حاصل پور کا بہت سفر کر لیا ہے، اب انہیں یزمان لانا چاہیے جب کہ میں نے اس سے اختلاف کیا کیوں کہ میں حاصل پور کالج میں اپنے شروع کیے ہوئے کالج پروجیکٹس کو مکمل کرنا چاہتا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ میرے یزمان آنے کے حالات خود بخود بنتے چلے جائیں گے۔ وزیر اعلی پنجاب پرویز الٰہی کا ہیڈ راجکاں میں ڈاکٹر محمد افضل کی حمایت میں ایک جلسہ عام تھا اور تمام ای ڈی اوز کے لیے اس جلسہ میں شرکت کرنا لازمی تھا تاکہ وہ اپنے محکمے کے بارے میں کسی امکانی سوال کا جواب دے سکیں۔ سب لوگ سرکٹ ہاؤس میں اکٹھے تھے اور تمام افسران کے لیے ایک کوسٹر کا انتظام کیا گیا تھا۔ اسی دوران میں نبی بخش ملک اور شارق انصاری کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا۔ باہر نکلا تو کوسٹر جا چکی تھی۔ میں نے گھر آ کر اپنی گاڑی لی اور براستہ یزمان راستہ پوچھتے ہوئے عصر تک پہنچ گیا، جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ سارے ای ڈی اوز پہلی قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے ڈی ای او اور ڈی ڈی ای او ایلیمنٹری مل گئے۔ ہم اکٹھے وہاں بیٹھ گئے جہاں مقررین کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

وزیراعلی نے جن تعلیمی منصوبوں کا اعلان کیا وہ ہم نے نوٹ کرلیا اور جلسے کو بیچ میں چھوڑا اور بہاول پور پہنچ گئے۔ اگلے دن ڈی سی او نے پوچھا کہ آپ باقی ای ڈی اوز کے ساتھ نظر نہیں آئے۔ میں نے کوسٹر نکل جانے اور اپنی گاڑی پہ جانے اور اعلان کیے گئے منصوبوں کے بارے میں بتایا تو مطمئن ہو کر کہنے لگے، اچھا ہوا آپ کوسٹر میں نہیں گئے، سنا ہے کہ دو تین جگہ پر کوسٹر بند ہو گئی تو تمام افسران سے ہر بار دھکا لگوا کر سٹارٹ کی گئی۔

14 اگست کے بعد ایک دن ڈی سی او آفس کے کمیٹی روم میں میٹنگ ہو رہی تھی۔ انہیں کسی اہلکار نے کوئی پیغام دیا۔ ڈی سی او نے مجھے کہا کہ لاہور سے ضلع ناظم کا آپ کے لیے فون ہے، میرے آفس جا کر سن لیں۔ ناظم گویا ہوئے۔ "بلوچ صاحب! میرے پلے کچھ بھی نہیں ہے۔ یزمان میں گرلز کالج کا وعدہ کیا تھا۔ اب تو لوگ گالیوں بھرے خطوط لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کالج قائم نہیں کرنا تھا تو جھوٹا وعدہ کیوں کیا تھا۔ مجھے اگلے تین دنوں میں گرلز کالج قائم کرنے کی فزیبلٹی رپورٹ اور عمارت کی نشان دہی درکار ہے"۔ میں نے اپنے دوست ڈسٹرکٹ آفیسر کالجز شیخ محمد اکبر سے مشورہ کیا اور انہوں نے بتایا کہ تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتال کی بلڈنگ بننے کے بعد ٹاؤن کمیٹی سطح کے پرانے ہسپتال کی بلڈنگ خالی ہے۔ کل اسے دیکھ لیتے ہیں۔ پھر میں پہلی دفعہ یزمان شہر گیا۔ بلڈنگ مناسب تھی بس صفائی اور جراثیم کش ادویات کے چھڑکاؤ کی ضرورت تھی۔ آخر میں ہم نے گورنمنٹ ڈگری کالج یزمان کا پہلی دفعہ چکر لگایا۔ اس کے لان میں بیٹھ کر کالج کے رہائشی بلاک میں مقیم تاریخ کے استاد محمد اظہر رامے کی میز بانی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کیا معلوم تھا کہ چند ماہ بعد میری یہیں پر پوسٹنگ ہو گی اور آئندہ 8 سے زائد سال بعد 30 اپریل 2013 کو یہیں سے ریٹائر ہو کر میری تقریباً پینتیس سالہ سروس کا اختتام ہو گا!!

حاصل پور کی طرح میں نے یزمان بھی بہاول پور سے روزانہ کی بنیاد پر جانے آنے کا فیصلہ کیا۔ وہ شہر تو بہاول پور سے 100 کلومیٹر دور تھا جب کہ یہ شہر صرف اکتیس کلومیٹر کی دوری پر تھا اور گھر سے کالج تک پینتیس منٹ لگتے تھے۔ حاصل پور میں مئی 2000 کے دوران جب میں نے بطور پرنسپل جوائن کیا تو وہ کالج لوکیشن کے اعتبار سے ایک غیر موزوں جگہ پر شہر سے پانچ کلومیٹر دور چولستانی پٹی کے غیر آباد ٹیلوں کے درمیان گھری ہوئی ایک معقول عمارت پر مشتمل تھا۔ اگر اس کی پیشانی سے کالج کا نام مٹا دیا جاتا تو کسی کو پتہ بھی نہ چل سکتا کہ یہاں کالج واقع ہے۔ ذرا سی ہوا چلنے سے وہاں کے کمرے اور دفتر ریت سے اٹ جاتے۔ جب میں نے اس کالج کو خدا حافظ کہا تو اس کا ناک نقشہ نکل آیا تھا اور بہت سے بنیادی منصوبے مکمل ہو چکے تھے اور چند پائپ لائن میں تھے۔ اس کے برعکس گورنمنٹ کالج یزمان کی لوکیشن حاصل پور سے قطعی مختلف تھی اور یہاں میں نے گورنمنٹ کالج حاصل پور کے چار سال کے تجربات کو بنیاد بنا کر آغاز کیا۔ حاصل پور کے چار سال کو میری بحیثیت پرنسپل تربیت کا عرصہ شمار کیا جا سکتا ہے جہاں میں نے بہت سے تجربات کیے جن کے نتائج بہت حوصلہ افزا رہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے کل کی روہت والی اور آج کے یزمان کے بارے میں جاننا موزوں ہوگا۔

''یزمان ماضی کا روہت والا نام کا دو چار گھروں پر مشتمل ایک ٹوبہ تھا جو چولستان میں بہاول پور سے 18 میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ 1922 کے بعد دو ایسے واقعات رونما ہوئے جنھوں نے اس چولستانی ٹوبے کی قسمت کچھ یوں بدل کر رکھ دی کہ نا صرف اس نے یزمان کا روپ دھارا بل کہ اس کے اردگرد میلوں تک پھیلے ہوئے چولستان نے ایک کروٹ لی اور سبزے کا لباس پہن لیا اور یہاں کے موسموں کو انسانی حیات کے لیے سازگار بنا دیا۔ پہلا واقعہ 1922 میں شروع ہونے والے ستلج ویلی پروجیکٹ (SVP) کے تحت وجود میں آنے والا نہری نظام ہے جس کے تحت اسلام ہیڈ ورکس سے نکالی جانے والی نہر بہاول کینال سے لال سہانرا کے مقام پر جنم لینے اور اپنے سفر کا آغاز کرنے والی ڈیزرٹ برانچ ہے۔ اس برانچ میں گو پانی 1932 میں آیا مگر نہر اور اسکے مائنرز کی کھدائی اور اس کے تحت ہونے والی مجوزہ آبادکاری کا آغاز 23-1922 میں ہو گیا تھا۔ اسی حیات افروز نہر پر روہت والا کے نام سے ایک بستی تھی جس کا نام روہت والی پڑ گیا اور یہ بستی ایک قصبے کا روپ دھارنے لگی۔ 1932 میں ڈیزرٹ برانچ میں آنے والا پانی، پانی نہیں خون کی بوندیں تھیں جو چولستان کی رگوں میں اتریں تو چولستان لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل ہو گیا اور روہت والی تجارتی، زرعی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔

روہت والی کو یزمان بنانے کا واقعہ دوسرا ہے۔ 1926 میں چولستان کے کالونی ایریا میں بہاولنگر، ہارون آباد، فورٹ عباس اور بہاول پورر کو ملانے اور اس علاقے میں ترقی کے عمل کو تیز کرنے کے لیے 150 میل (240 کلومیٹر) ریلوے لائن کے منصوبے کا آغاز ہوا۔ پہلے مرحلے میں بہاولنگر اور ڈونگہ بونگہ تک 40 میل (64 کلومیٹر) ریلوے لائن کی پٹری بچھائی گئی جس کا افتتاح 1928 میں کیا گیا۔ آئندہ پانچ برسوں میں ڈونگہ بونگہ براستہ فورٹ عباس و یزمان تا قطع العمارہ بہاول پور تک ریلوے لائن بچھائی گئی۔ فورٹ عباس تک کے تیس میل کے ٹکڑے کے بعد اگلے حصے کے لیے سٹیشنوں کے نام رکھے جانے تھے۔ کچھ نام تو مقامی ہی تھے مگر چند ایک سٹیشنوں کے نام کا مسئلہ درپیش تھا۔ ریاست بہاول پور کے نواب تازہ تازہ شام کے دورے سے واپس آئے تھے لہٰذا کچھ نام انہوں نے ذاتی دلچسپی سے رکھے۔ ان میں ایک نام یزمان کا ہے۔ اس نام کا ایک شہر آج بھی شام کے صوبے اور شہر حلب (Aleppo) میں واقع ہے۔ فورٹ عباس سے قطع العمارہ کے درمیان واقع اہم ریلوے سٹیشنوں کے نام یہ رکھے گئے۔ مروٹ، قریش، منصورہ، یزمان۔ یہاں پر سب سے پہلی سرکاری عمارت یزمان ریلوے سٹیشن تھا جب کہ دیگر سرکاری عمارتوں میں محکمہ انہار کے مقامی اہلکاروں کی رہائشگاہیں اور افسروں کے لیے محکمہ انہار کے ریسٹ ہاؤسز شامل تھے۔ اس کے بعد آنے والے

عرصے کے دوران تمام برصغیر سے لوگوں نے یہاں کا رخ کیا اور ریاست بہاول پور کی جانب سے پیش کی گئی آباد کاری کی سکیموں کے تحت زمینیں الاٹ کرا کر زمینوں کی بحالی میں خون پسینہ ایک کر دیا۔ جیسے جیسے لوگ آتے گئے اور یہاں بستے گئے ویسے ویسے یہاں زرعی پیداوار میں اضافہ ہوتا گیا اور روہت والی جواب یزمان کا روپ دھار چکا تھا اس کے ریونیو میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ محکمہ انہار اور مال کے ابتدائی دفاتر کا قیام بھی عمل میں آنے لگا۔ بہاولنگر سے یزمان تک مواصلات کا بہترین اور مؤثر ذریعہ کالونی ریلوے لائن تھی۔ ابھی سڑکوں کی سہولت میسر نہیں تھی اور اگر تھی تو کچے اور ریتلے ٹریک موجود تھے جن پر صرف پیدل یا جانوروں کے ذریعے سفر کیا جا سکتا تھا۔ ددوسری جنگ عظیم کے دوران انگریزوں کو مشرق وسطی میں مواصلاتی مسائل کے حل کے لیے ریلوے لائن کی ضرورت پڑی تو انہوں نے ریاست سے قطع العمارہ براستہ یزمان سے فورٹ عباس یا خان پور سے چاچڑاں کی ریلوے لائن مستعار مانگ لی۔ مؤخرالذکر ریلوے لائن چوں کہ نواب کے مرشد گھرانے کے شہر کو جاتی تھی لہٰذا 12 دسمبر 1940 کو اول الذکر ریلوے لائن اکھاڑنے کے حکم نامے پر دستخط کرتے ہوئے نواب نے یہ نوٹ لکھا۔ ''کالونی ایریا کے لیے مواصلات اور رابطے کا یہ واحد ذریعہ ہے جس کے جانے سے یہاں ترقی اور آباد کاری کے عمل کو دھچکا لگے گا مگر یہ امید کی جاتی ہے کہ جیسے ہی عالمی جنگ ختم ہوگی یہ ریلوے لائن دوبارہ یہاں بچھا دی جائے گی'' مگر یہ امید پوری نہ ہو سکی۔ ریاست کا ایک وفد جنگ کے خاتمے کے بعد ریلوے سٹرکچر کی واپسی کے لیے پنجاب کی انگریز حکومت سے بات چیت کی غرض سے لاہور گیا مگر کامیابی نہ ہو سکی اور یوں یہ ریلوے لائن ماضی کا قصہ بن گئی تاہم سٹیشنوں اور نہروں پر موجود ریلوے پلوں کے آہنی گارڈ کی باقیات اب بھی اس ریلوے لائن کے گم ہو جانے پر نوحہ کناں نظر آتی ہیں۔ ریلوے کی سہولت ختم ہونے پر سٹیٹ نے بہاول پور اور فورٹ عباس کے درمیان سڑکوں کی بحالی اور دیکھ بھال پر توجہ مرکوز کی اور کسی موزوں وقت میں اس راستے پر سرکاری سطح پر لاری کا انتظام کیا گیا جس میں سٹیٹ کو خسارہ ہوا اور لاری سروس کو ٹھیکے پر دے دیا گیا۔

1942-43 میں یزمان کے قصبے کو اس وقت شناخت ملی جب اسے اس کے ہم عصر شہروں حاصلپور، فورٹ عباس، بہاولنگر، ہارون آباد، چشتیاں اور صادق آباد کے ہم پلہ انتظامی یونٹ کا ابتدائی درجہ دیا گیا یعنی یزمان کو نوٹیفائیڈ ایریا کمیٹی (NAC یا سب تحصیل) قرار دیا گیا۔ اسی سال اسے ریونیو کی بہتر صورت حال کے پیش نظر غیر مستقل منڈی بنا دیا گیا جس میں توسیع کی جاتی رہی حتی کہ 1949 کو اسے مستقل منڈی کا درجہ مل گیا۔ اس دوران یہاں پر نائب تحصیلدار کا دفتر قائم کیا گیا جو کمیٹی کا چیئرمین بھی تھا۔ 1943 کا سال

یزمان کی تاریخ کا اس لحاظ سے بھی یادگار سال ہے جب یہاں ڈسپنسری قائم ہوئی اور اس علاقے کا گویا یہ پہلا سرکاری ہسپتال تھا۔ اسی سال یزمان تھانہ قائم کیا گیا جس میں ابتدائی طور پر یہاں ایک سب انسپکٹر، ایک حوالدار اور اٹھارہ کانسٹیبلوں پر مشتمل عملہ تعینات کیا گیا۔ اسی دوران یہاں پر پختہ اینٹوں کا ایک بھٹہ منظور کیا گیا جس سے شہر میں تعمیراتی سرگرمیوں کو فروغ حاصل ہوا۔ قیام پاکستان اور ریاست کے پاکستان سے الحاق کے اعلان سے ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ آبپاشی کا نیٹ ورک بتدریج وسیع ہوتا گیا۔ صحرائی علاقہ ہونے کی وجہ سے مواصلاتی سہولتوں کی صورت حال ناگفتہ بہ رہی۔ ریلوے انگریز لے گئے۔ جولاری سروس کچی سروس روڈ پر شروع کی گئی تھی 1955 یعنی تا دم انضمام ریاست چلائی جاتی رہی۔ بہاول پور سے یزمان سڑک کے پختہ بنائے جانے کے بعد دونوں شہروں کے درمیان سفر نسبتاً بہتر ہو گیا۔ 1984 تک مختلف شعبوں میں ترقی کا عمل کسی نا کسی طور پر جاری رہا۔ 1982 میں بوائز کالج کا قیام عمل میں آیا۔ گرلز اور بوائز ہائی سکول پہلے سے موجود تھے۔ رینجرز کے دفاتر بھی پرانے ریلوے سٹیشن کی عمارت اور اس کے اردگرد قائم ہو چکے تھے۔ آبادی میں بھی معتد بہ اضافہ ہو چکا تھا۔ نیشنل بنک کے ساتھ ساتھ چند دیگر بنکوں کی شاخیں بھی قائم ہو چکی تھیں۔ غلہ منڈی کے ذریعے زرعی اجناس کی تجارت بھی پنپ رہی تھی کہ یکم جولائی 1984 کو یزمان کو تحصیل کا درجہ دے دیا گیا۔

یہ سال یزمان کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ 1943 میں سب تحصیل یا نوٹیفائیڈ ایریا کمیٹی (NAC) کا درجہ ملنے کے بعد شروع ہونے والے سفر کی انتہا 1984 کا سال تھا جب یزمان کو تحصیل کا درجہ ملا۔ یہ منزل حاصل کرنے میں 40 سال کا عرصہ لگ گیا۔ یکم جولائی 1984 کے بعد یہاں مختلف جہتوں میں ترقی کا سفر تیز تر ہوا۔ صوبائی اور وفاقی حکومت کے تمام محکموں کے تحصیل کی سطح کے دفاتر بتدریج قائم ہوئے۔ عمرانی بنیادوں پر روہت والی سے یزمان بننے کے 80 سالہ ارتقائی عمل کا جائزہ لیا جائے تو پرانی سے جدید اقدار کا یہ سفر زیادہ تر سست روی کا شکار رہا ہے۔ یزمان کے عمومی معاشرتی مزاج پر زرعی معاشرے کی اقدار کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ بہاول پور کے بہت قریب واقع ہونا جہاں کچھ امور میں مفید رہا ہے وہاں یزمان میں خود کفالت پر مبنی آزادانہ ترقی کا عمل متاثر اور سست روی کا شکار بھی رہا ہے۔ مثلاً تعلیم کے شعبے کو ہی لے لیں، یہاں 1982 میں بوائز انٹر کالج قائم ہوا جب کہ گرلز کالج اس کے بائیس سال بعد 2004 میں قائم کیا گیا البتہ گذشتہ دہائی سے یزمان میں معاشرتی سطح پر فعالیت پائی جاتی ہے۔ اپنے فیڈنگ ایریا میں بہتر معاشی سرگرمیوں کا مرکز بننے کا عمل بتدریج تیز تر ہو رہا ہے۔ اپنے محل وقوع کی وجہ سے یہ شہر ایک عرصہ تنہائی کا شکار رہا ہے تاہم بہتر مواصلاتی سہولتوں کی وجہ سے دیگر شہروں کے ساتھ اس کے معاشرتی اور معاشی روابط میں اضافہ ہو رہا ہے اور وہ دن دور نہیں جب یہ شہر اپنی منفرد شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔''

میں نے گورنمنٹ کالج یزمان میں اپنے فرائض کو چار شعبوں میں تقسیم کیا اور درحقیقت کالج یا کسی بھی

تعلیمی ادارے کے سربراہ کوانہی کے درمیان رہ کر کام کرنا ہوتا ہے۔اہمیت کے لحاظ سے ان کی ترتیب یوں ہو گی :اول۔انتظامی امور، دوم۔بنیادی اثاثوں اور سہولتوں کی دیکھ بھال اور اضافہ،سوم۔تعلیمی نظم و ضبط، چہارم۔مالی نظم وضبط۔اگر چہ انتظامی امور کی اصطلاح عمومی طور پرادارے سے متعلق تمام امور کی ترجمانی کرتی ہے مگر میں اسے با قاعدہ شعبہ تصور کرتا ہوں بل کہ یہ ایک رویے کا نام ہے جس کے اثرات کالج کے ہر شعبے پر پڑتے ہیں۔1982 میں قائم ہونے والے اس کالج کو15 سال بعد 2003 کے دوران ڈگری کالج کا درجہ ملا اور میں تقریباً ڈگری کالج کا پہلا ریگولر پرنسپل تھا۔اسی طرح1976 میں انٹر کالج کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج حاصل پور کوڈگری بننے میں 23 سال کا عرصہ لگا اور وہاں بھی میں ہی ڈگری کالج کا پہلا ریگولر پرنسپل قرار پایا۔ ہمارے تعلیمی ڈھانچے میں اداروں کی اپگر یڈیشن میں سیاسی عنصر اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جوائن کرنے کے فوری بعد میں نے اساتذہ کو باور کرایا کہ ادارے کی ہمہ جہت ترقی میں ان کا بنیادی کردار ہے۔ پرنسپل اکیلا کچھ نہیں کرسکتا۔کسی بھی ادارے میں پرنسپل کا انتظامی اسلوب بہت اہم ہوتا ہے۔ چوں کہ میں باہمی تعلقات کو بہت اہم تصور کرتا ہوں اس لیے تدریسی اور غیر تدریسی سٹاف کے ساتھ باہمی احترام واعتماد کی بنیاد پر کالج کے مفادات سے ہم آہنگ تعلقات کار بہت کم وقت میں مستحکم ہوگئے۔کالج سٹاف کے ساتھ سرگوشی میں بات کرنے کی بجائے کھلے مکالمے اور مشاورت کی روایت سے بھی مفید اقدار پر مشتمل ماحول کے قیام میں مدد ملی۔ استاد کے احترام کو بہت اہمیت دی اور اس پر کبھی کمپرومائز نہیں کیا۔تمام سٹاف اور میرے درمیان اعتبار کا رشتہ کبھی کمزور نہیں ہوا۔تدریسی اور غیر تدریسی سٹاف کے ہر رکن کو اس کی دلچسپی اور صلاحیتوں کے مطابق کام تفویض کیے گئے جس سے ان کی کارکردگی اور کام کی کوالٹی بہت اچھی رہی۔اردو کے استاد جناب فردوس احمد کو ٹائم ٹیبل انچارج بنایا۔تین چوتھائی تدریسی سٹاف بہاول پور سے روزانہ کی بنیاد پر آتا جاتا تھا لہٰذا نظام الاوقات میں لازمی مضامین کے پہلے دو پیریڈ ان کو دیے گئے جو باقاعدگی سے آسکتے تھے۔اس لیے پہلے دو پیریڈ میں کالج میں مکمل خاموشی ہوتی اور کوئی طالب علم باہر نظر نہیں آتا تھا۔کالج کے دیگر غیر تدریسی امور کے لیے موزوں سٹاف کا انتخاب کیا گیا۔سٹاف ٹی کلب کا میں خود ممبر بنا اور اپنے حصے کا ماہانہ چندہ ادا کرتا بل کہ اگر کوئی دوست آجاتے تو وہاں آنے والی چائے نوٹ کرلی جاتی اور مہینے کے اختتام پر ادائیگی کردی جاتی۔باہمی تعلقات میں محبت اور انسانی تعظیم وتکریم کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔کالج میں سٹاف کے درمیان ہونے والی گفتگو میں علمی رویے کو فوقیت دی جاتی۔مجھ سمیت تمام تدریسی سٹاف ایک دوسرے کے نظریات اور فکری رویوں سے پوری طرح آگاہ تھا۔اس لحاظ سے پرنسپل کو ایک نیوٹرل ایمپائر کا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔اس کردار کا اظہار زیادہ تر چار پانچ سال کے بعد ہونے والے پنجاب پروفیسر اور لیکچرر ایسوسی ایشن کے انتخابات کے دوران اہم ہوتا ہے۔اس دوران پرنسپل کا غیر جانبدار رویہ تمام سٹاف کو جوڑ کر رکھتا ہے جس سے کالج کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔میں نے سٹاف کے وقار پر کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ایک دن طلبا کے امور سے وابستہ ایک سٹاف

ممبر نے ایک آؤٹ سائیڈر کو کالج چھوڑنے کے لیے کہا تو اس نے متعلقہ استاد سے تھوڑی بہت بدتمیزی کی۔ باہمی مشاورت سے ایک شکایت پولیس کو بھیجی گئی مگر اس پر عمل درآمد نا ہوا۔ ایک سٹاف ممبر کے مقامی عدالت کے ایک جج سے دوستانہ تعلقات تھے تو ان کے ذریعے پولیس کو متحرک کیا۔ کچھ شہری اس لڑکے کو معاف کرنے کی درخواست لے کر آئے۔ میں نے شرط رکھی کہ وہ آؤٹ سائیڈر کالج کے تمام طلبا کے سامنے اس استاد سے معافی مانگے اور آئندہ کبھی کالج میں نہ آئے۔ استاد چاہے تو اسے معاف کر دے۔ اس طریق کار کو اختیار کیا گیا۔ یہ مثال قائم ہونے کے بعد کبھی کوئی نظم وضبط کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ درجہ چہارم کے ملازمین سے ایک متحرک اور اچھے اخلاق اور مزاج کا حامل تلاش کیا اور اسے پرنسپل آفس کا اٹینڈنٹ مقرر کیا۔ میرے نزدیک ایمان داری سے ادارے کے وسائل کا درست استعمال، رواداری اور شائستگی، صبر و برداشت، کالج سے وابستہ تمام افراد کی عزت نفس کی حفاظت اور ان سے مشاورت، کالج کی ترقی کے جنون ((passion میں مبتلا، تخلیقی و جمالیاتی ذہن اور جدید رجحانات سے ہم آہنگی کسی بھی ادارے کے سربراہ کے لیے لازمی صفات ہیں اور یہ بطور منتظم میرے پندرہ سالوں کے تجربے کا نچوڑ ہیں۔ یہ باتیں تجریدی ہرگز نہیں۔ میں نے ان باتوں پر حتی المقدور عمل کرنے کی کوشش کی اور اچھے نتائج حاصل کرنے میں خاصی حد تک کامیاب رہا۔

دوسرا اہم جز وتر قیاتی منصوبوں کے ذریعے انفراسٹرکچر یا اثاثہ جات کی کوالٹی کو بہتر بنانا، اس میں توسیع کرنا اور کالج میں ان کا درست استعمال ہے۔ اگر کالج میں مہیا سہولتیں مطلوبہ تعداد و معیار کے مطابق ہو نگی تو تدریسی اور زائد از نصاب خدمات کے ذریعے تعلیم و تربیت کے مفید نتائج کا حصول ممکن ہو سکتا ہے۔ کالج کی عمارت کا موزوں ترین استعمال اس کی افادیت میں اضافہ کرتا ہے۔ دور دراز اور پسماندہ علاقوں اور شہروں کے کالجوں کا یہ المیہ رہا ہے کہ برسوں تک ان کی عمارت اور سہولتوں میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اداروں کی سہولتوں کے لیے بھی سیاسی منشا (Political will) کی ضرورت ہوتی ہے۔ یزمان کالج کے قیام سے اپنی عمارت کے حصول تک کی کہانی میں حزنیہ عنصر زیادہ ہے۔ 1982 میں تحصیل کی مستعار عمارت میں اس کا آغاز ہوا۔ ایک سال کے بعد ہی محکمہ تعلیم نے گرلز ہائی سکول کا جنوبی حصہ کالج کو، شمالی حصہ بوائز سکول کو دے کر گرلز ہائی سکول کو بوائز ہائی سکول کی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ کالج یہاں 9 سال تک چلتا رہا۔ لڑکوں کے سکول کی مشرقی جانب ساڑھے بارہ ایکڑ سرکاری زمین مختص کی گئی اور انٹر کالج کی بلڈنگ کی تعمیر کا آغاز ہوا اور دو سال کے بعد بغیر پانی اور بجلی کی سہولت کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں نے 28 مئی 1992 کو لالٹین کی روشنی میں اس کا افتتاح کیا مگر پانی و بجلی کی سہولتوں کے حصول میں دو سال کا مزید عرصہ لگ گیا اور یوں مزید دو سال کے بعد ان بنیادی سہولتوں کی دستیابی کے بعد کالج کو اپنی بلڈنگ میں شفٹ کر دیا گیا۔ جب میں نے یہاں جوائن کیا تو 2001 سے کالج ڈگری ڈگری ہونے کے بعد 2003 میں موجودہ عمارت کے شمالی جانب ڈگری حصہ مکمل ہو چکا تھا۔ جن کالجوں کو ڈگری تک اپ گریڈ کیا گیا تو حکومت نے یہ شرط عائد کر دی کہ متعلقہ

کالج کے ڈگری حصے کی عمارت کی تکمیل کے بعد ہی سیٹوں اور بجٹ (SNE) کا نوٹیفکیشن جاری کیا جائے گا۔ اس طرح 2003 میں ڈگری کی پہلی کلاس کا آغاز ہوا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پنجاب بھر میں یکم ستمبر 1982 سے متعدد انٹر کالجوں نے آغاز کیا۔ محکمہ عمارات نے اس دور میں انٹر کالجوں کے لیے عمارت کا یکساں ماڈل منظور کیا جو خاصے عرصے تک مروج رہا۔ اس عرصے میں بننے والے تمام انٹر کالجوں کی عمارات ایک ہی طرز کی تھیں۔ گورنمنٹ کالج صادق آباد اور یزمان کی عمارتیں ایک دوسرے کی ہو بہو نقل (Replica) تھیں۔ ایک جانب تعلیمی بلاک جس کی چار پانچ فٹ کی گیلری میں چار چار کمرے آمنے سامنے اور آخر میں لیوٹری بلاک، ان کمروں کے اوپر تین تجربہ گاہیں اور دوسری جانب کرش ہال اور اس سے آگے اتنی ہی گیلری میں ایڈمن بلاک جہاں آمنے سامنے چھوٹے باکس نما دس کمرے، پرنسپل آفس اور سٹاف روم واقع تھے۔ یکم ستمبر 2003 سے کالج کو ڈگری کا درجہ ملا اور پہلے بلاک سے تیس چالیس فٹ دور اس کے برابر اتنے ہی سائز کی گیلری کے آمنے سامنے ڈگری بلاک کا اضافہ کر دیا گیا اور دونوں بلاکس کو ایک نسبتاً بڑی گیلری یا برآمدے سے منسلک کر دیا گیا اس طرح کالج کی عمارت ہاتھ سے لکھے ہوئے انگریزی ہندسے چار کے مشابہہ تھی۔ ہم نصابی سرگرمیوں اور امتحانات کے لیے بھی کلاس رومز ہی استعمال ہوتے۔ میں نے سٹاف سے مشاورت کے بعد انٹر بلاک میں واقع لیبارٹریوں کو ڈگری بلاک کی خالی لیبارٹریوں میں شفٹ کیا اور دو لیبارٹریوں کی درمیانی دیوار کو ہٹایا گیا تو ایک معقول سائز کا منی ہال بن گیا جس میں 200 تک کرسیوں کی جگہ بن گئی۔ اب بورڈ، اسلامیہ اور اوپن یونیورسٹیوں اور کالج کے امتحانات اور ہم نصابی سرگرمیوں کا انعقاد ممکن ہو گیا۔ سٹاف روم ایک وسیع کلاس روم میں تھا جب کہ انتظامی بلاک میں پہلے سے موجود سٹاف روم کو پرنسپل آفس میں تبدیل کیا۔ دو کمرے کلرکوں کے پاس اور پرانا پرنسپل آفس، وائس پرنسپل کے لیے مخصوص کر دیا۔ تین باکس نما کمرے کنٹرولر امتحانات، چیف پراکٹر اور ڈائریکٹر فزیکل ایجوکیشن کو دے دیے۔ اس طرح کالج کی عمارت کو بہتر انداز میں استعمال کرنے کا آغاز کیا۔ میں نے چوں کہ انٹر اور بی اے گورنمنٹ کالج ساہیوال سے کیا تھا جہاں کی تعلیمی سہولتیں، انفراسٹرکچر اور تعلیمی روایات ہمیشہ میرے پیش نظر رہیں لہٰذا میں جہاں کہیں بھی جاتا اس کالج کے کلچر کی کچھ باتیں میں متعارف ضرور کراتا رہا مثلاً میں نے ریڈنگ روم کے لیے حاصل پور کالج کی طرح ایک بڑا کمرہ مختص کیا اور طلبہ کے لیے میگزین اور اخبارات کا اجراء کیا۔ ایک اور کلاس روم کو لائبریری کے لیے مختص کر کے کتب کے اجرا کو ممکن بنایا۔ انہی دنوں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر (کالجز) بہاول پور محمد اکبر شیخ نے میری درخواست پر ایک گرانٹ جاری کی جس سے دو سو کرسیوں کا اضافہ ہوا۔ گورنمنٹ کالج خیر پور ٹامیوالی کے پروفیسر مفتی حمید احمد نے مجھ سے ناراضگی کا اظہار بھی کیا کہ ہمارے کالج کی خصوصی گرانٹ کا ایک معقول حصہ آپ نے تعلقات استعمال کر کے لے لیا۔ اسی سال طلبا کے ٹائلٹس بلاکس میں ٹائلز لگوا کر آئینوں اور صابن کا بندوبست کیا اور تمام دفاتر اور سٹاف روم کی کھڑکیوں اور دروازوں کو پردوں سے مزین کیا جس سے مجموعی طور

پر بہتر جمالیاتی تاثر قائم ہوا۔ کالج کی ویب سائٹ بنوا کر ویب ایڈریس رجسٹر کرایا اور ایک ویب سروسز مہیا کرنے والی کمپنی سے ویب ہوسٹنگ حاصل کی اور میں خود ہی اسے اپڈیٹ کرتا رہا۔ کالج کے تمام ڈیٹا بشمول لائبریری کتب کو کمپیوٹر پر منتقل کیا۔ کالج گزٹ کے نام سے کالج کا خبر نامہ جاری کیا جس کی تکمیل یعنی لکھنے اور چھپنے تک سے پہلے کا کام میں خود کرتا۔ کالج گزٹ کے حصے " کالج گزٹ میگزین" میں یزمان اور بہاول پور کی تاریخ کے بارے میں تحقیقی مضامین بھی شامل کی جاتے۔

اب میں نے آئندہ تین سال کا ترقیاتی منصوبہ تیار کیا جس میں سالانہ مرمت و دیکھ بھال اور سپیشل مرمت کے لیے گرانٹس کا حصول، کثیر المقاصد ہال کی تعمیر۔ لائبریری و ریڈنگ روم کمپلیکس کی تعمیر مع فرنیچر، کالج ہال کے لیے پانچ سو کرسیوں اور کالج کے سٹاف روم، پرنسپل آفس اور دیگر دفاتر کے لیے نئے فرنیچر کا حصول اور ضروری ساز و سامان سے آراستہ کمپیوٹر لیب کی تعمیر شامل تھے۔ ضلع بہاول پور کے ناظم طارق بشیر چیمہ تھے اور یزمان ان کی تحصیل تھی۔ جب میں ای ڈی او (تعلیم) تھا تو تب سے ان سے آشنائی تھی۔ میں نے کالج کی سالانہ کھیلوں کی تقریب تقسیم انعامات میں انہیں بطور مہمان خصوصی بلا لیا۔ میں نے اپنی باری آنے پر جو سپاس نامہ پیش کیا اس کا ایک اقتباس اس طرح کا تھا: "جناب ہمارے پاس بہترین بلڈنگ ہے اور وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے۔ صرف دو منصوبے مل جائیں تو ہمارا انفراسٹرکچر آسمان کو چھو لے گا۔ اس سال ملٹی پرپز ہال اور اگلے سال لائبریری کمپلیکس اور بس، انہوں نے اگلے دو سال میں دونوں منصوبوں کا اعلان کر دیا۔ اس طرح کے اعلان کے بعد پرنسپل کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے بہاول پور ڈویژن کے ڈپٹی آرکیٹیکٹ کو کالج میں دعوت دی اور ان سے ہال کی جگہ کی مارکنگ کرا کے اگلے کچھ دنوں میں نقشہ تیار کروا لیا اگرچہ مجھے اس دفتر کے کئی چکر لگانے پڑے۔ اس کے بعد ضلعی محکمہ تعمیرات سے اس کا پی سی ون تیار کروایا جس میں ہال کا تخمینہ اور دیگر تفصیلات تھیں۔ غلطی یہ ہوئی کہ اس میں ریونیو گرانٹ برائے فرنیچر شامل نہ کیا جا سکا۔ تمام کیس مکمل کرا کے ڈسٹرکٹ آفیسر فنانس اینڈ پلاننگ کے حوالے کیا جہاں ڈویژنل ورکنگ پارٹی کے آئندہ اجلاس میں منظور ہو گیا اور جلد ہی اس کے لیے گرانٹ کی تخصیص، اجرا اور ٹینڈر کے مراحل طے ہو گئے اور اس کی تعمیر کا آغاز ہو گیا۔ وائس پرنسپل اور میرے ساتھ کالج کی ترقی کے خواب دیکھنے والے جناب فردوس احمد کو کالج کی طرف سے پروجیکٹ انچارج مقرر کیا تاکہ وہ اس کے تعمیری معیار پر کڑی نظر رکھیں۔ یکم جولائی سے کالجوں کو ضلعی گورنمنٹ سے نکال کر واپس صوبائی چیپٹر میں ڈال دیا گیا یعنی ڈویژنل ڈائریکٹوریٹ (کالجز) بحال ہو گئے اور تمام اضلاع بشمول ڈویژنل ہیڈ کوارٹر ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر (کالجز) کی پوسٹوں کو ڈپٹی ڈائریکٹر (کالجز) کا نام دے دیا گیا۔ لائبریری کے منصوبے کا خواب تعبیر ہونے سے رہ گیا تھا۔ اسی اثنا میں ضلعی افسر فنانس اینڈ پلاننگ منیر احمد کلیار کا فون آیا کہ لائبریری بلاک کی تعمیر کے لیے کتنی گرانٹ چاہیے۔ میں تو مایوس ہو چکا تھا کہ اب ضلعی گورنمنٹ کو کالج میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اس فون نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے کہا کہ ہم تو

اب ضلعی گورنمنٹ میں نہیں رہے؟ کہنے لگے، جناب آپ مجھے صرف کل رقم بتائیں، ضلعی ناظم کو اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں نے شاید کہہ دیا" پچاس لاکھ "اور فون بند ہو گیا۔ چند دنوں کے بعد مجھے سب انجینئر محمد رحمت ملنے آئے کہ ضلعی ناظم نے پنجاب گورنمنٹ سے آپ کے لیے گرانٹ حاصل کر لی ہے اور ڈسٹرکٹ آفیسر بلڈنگز کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو چکی ہے جسے ضلعی گورنمنٹ ہی مکمل کرے گی۔ آپ جتنا جلدی بہاول پور ڈویژن کے چیف آرکیٹیکٹ سے کالج کیمپس میں جگہ کی نشان دہی کرا کر نقشہ تیار کرائیں گے اتنا جلدی پی سی 1 بنا کر اس پر کام شروع ہو جائے گا۔ میں نے کم از کم وقت میں اس کا نقشہ بنوالیا جس میں ریڈنگ ہال، لائبریری ہال، لائبریرین آفس، کلرک آفس، کیٹیلاگنگ روم، کانفرنس ہال اور ٹائلٹ بلاک شامل تھے۔ پی سی ون میں فرنیچر کے لیے ریونیو گرانٹ بھی شامل کرائی۔ کالج ہال کے لیے ایسا کرنا بھول گئے تھے۔ کالج ہال اب 75 فیصد مکمل ہو چکا تھا تو اس کے برابر بائیں جانب لائبریری کمپلیکس کی تعمیر بھی شروع کر دی گئی۔ بعد میں گرانٹ کم پڑنے سے نقشے میں موجود ہال کی جانب والا برآمدہ ترک کرنا پڑا۔ جب کثیر المقاصد ہال مکمل ہوا تو بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانات اور کالج کی مختلف تقاریب کے لیے اس کا استعمال شروع ہو گیا۔ چوں کہ کالج میں 200 طلبا کا ایک چھوٹا ہال بھی موجود تھا تو کالج میں ایک وقت میں دو دو امتحانات بھی منعقد ہونے لگے۔ بڑے ہال میں بورڈ کا امتحان ہے تو چھوٹے ہال میں اوپن یونیورسٹی کا اور اسی طرح سال میں کالج کے دو داخلی امتحانات بھی اسی میں منعقد ہونے لگے۔ 400 طلبا کی گنجائش والے اس ہال میں کالج کے داخلی امتحانات کے لیے ایک دن دو کلاسز کے پرچے لیے جاتے، اس سے امتحان کی ڈیٹ شیٹ سمٹ کر چھ سات دنوں تک آ گئی۔ اب لائبریری بھی مکمل ہونے لگی اور تمام فرنیچر کا آرڈر محکمہ تعمیرات کے توسط سے ایک مقامی فرم کو دیا جا چکا تھا جس کے معیار کو چیک کرنے کا کام مقامی اساتذہ کے سپرد کیا گیا۔ ہال تو کوئی بھی بنوا سکتا تھا مگر لائبریری کمپلیکس تو صرف میرا خواب تھا اور اس میں ریڈنگ روم اور کانفرنس ہال کی موجودگی میرے لیے خوشی اور اطمینان کا باعث تھی۔ میرے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کالج ساہیوال کا شاندار انفراسٹرکچر بطور انسپائریشن موجود رہا۔ ریڈنگ روم اور اس کا فرنیچر تو اس کالج کے ریڈنگ روم کی ہو بہو نقل تھی۔ انفرادی مطالعے کے لیے دیوار کے ساتھ رکھے گئے نیم کیبن نما ریکس کی تصویر اور پیمائشیں گورنمنٹ کالج ساہیوال سے ہی حاصل کی تھیں۔ ریڈنگ روم میں چند گول میز اور ان کے ساتھ کرسیاں رکھوا دی گئیں۔ کانفرنس ہال میں کمرے کے سائیز سے کچھ کم طویل بیضوی میز اور پچاس کرسیوں کا انتظام بھی کیا گیا۔ اب سٹاف میٹنگز یہیں پر منعقد ہونے لگیں۔ ریڈنگ روم میں حسب معمول اخبارات و جرائد مہیا کیے گئے۔ پہلی بار کیٹیلاگ باکس کی فراہمی کے بعد اس میں لائبریری کتب کا ریکارڈ مکمل کیا گیا۔ طلبا کو ریڈنگ روم میں مطالعے کی طرف راغب کیا گیا۔

کالج ہال میں فرنیچر کی کمی کو بری طرح محسوس کیا گیا تھا۔ اب میں نے کثیر المقاصد ہال کے فرنیچر کے حصول کا منصوبہ وضع کیا اور کالج کی سالانہ کھیلوں کی تقریب تقسیم انعامات منعقدہ 29 نومبر 2008 کو میں

محمد مشتاق احمد کمشنر بہاول پور ڈویژن کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا۔ ان کو جب میں دعوت دینے گیا تو دعوتی خط کے ساتھ میں نے کالج گزٹ کی تین کاپیاں بھی منسلک کر دیں اور فائل ان کے سامنے رکھی۔ دو تین منٹ تک وہ دیکھتے رہے اور کہنے لگے کہ یہ تو کمال کیا آپ نے، میں آپ کی تقریب میں ضرور آؤں گا۔ بس دو دن پہلے یاد دلا دیجئے گا۔ کسی اچانک در آنے والی سرکاری مصروفیت کے باعث معینہ تاریخ کو ان کے آنے کے امکانات معدوم ہونے لگے تو میں نے ایک ایسے دوست سے کہا کہ جو ان کے ساتھ لان ٹینس کھیلتے تھے۔ اس دوست نے مجھے بتایا کہ میں نے انہیں قائل کر لیا ہے، وہ آپ کے ہاں ضرور آئیں گے ہاں البتہ ایک بات کا خیال رکھیئے گا کہ وہ آپ کے آفس کا واش روم کسی بہانے سے دیکھیں گے تو آپ کے ذوق کے بارے میں کوئی رائے قائم کریں گے۔ حسن اتفاق سے سپیشل مرمت کی گرانٹ سے پرنسپل آفس کا واش روم جون 2008 میں کشادہ کر کے سفید ٹائل لگوا دی گئی تھی اور نئے کموڈ کی تنصیب بھی کی گئی تھی۔ ان کی کالج آمد کے بعد انہیں میں اپنے آفس لے گیا۔ دو منٹ کے بعد انگریزی میں کہنے لگے۔ "پرنسپل صاحب! کیا میں آپ کا واش روم استعمال کر سکتا ہوں" میں نے کہا یقیناً جناب۔ دو تین منٹ بعد کموڈ کی ٹینکی کے پانی کی آواز آئی اور وہ باہر آ گئے۔ انہوں نے غالباً اچھی رائے قائم کی ہو گی۔ پھر کالج کا راؤنڈ لگایا اور میں نے انہیں کالج ہال اور لائبریری کی عمارتیں قصداً دکھائیں۔ اس کے بعد پنڈال میں آئے اور تقریب کا آغاز ہوا۔ میں نے اپنے سپاسنامے میں جو کہا اس کا ایک اقتباس پیش ہے، "جناب ہمارا کالج سہولتوں کے لحاظ سے خاصی حد تک خود کفیل ہے۔ ہمیں صرف کالج ہال اور کلاس رومز کے لیے فرنیچر کی کمی کا سامنا ہے۔" انہوں نے اپنے جوابی خطاب میں جو کہا اس میں ہمارے لیے کارآمد یہ الفاظ تھے۔ "یہ واحد ادارہ ہے جہاں مجھے مطالبات کی طویل فہرست پیش کرنے کی بجائے صرف اپنی بنیادی ضرورت کا ذکر کیا گیا ہے جسے اسی سال پورا کیا جائے گا۔" میں نے فرنیچر کا پی سی ون بنایا اور اس میں تمام قسم کے فرنیچر کی تفصیل دی گئی تھی جس کی لاگت دس لاکھ روپے بنتی تھی، کمشنر کو براہ راست بھیج دیا۔ ضروری کارروائی کے بعد تھوڑی مدت میں 9-2008 کے مالی سال کے لیے دس لاکھ کی گرانٹ کا لیٹر موصول ہو گیا۔ یہ گرانٹ پرنسپل نے کالج پرچیز کمیٹی کے ذریعے پیپرا رولز کے تحت خرچ کرنا تھی۔ پی سی 1 میں فرنیچر کی تفصیل اس طرح تھی۔ ☆ 500 سٹوڈنٹس کرسیاں۔ ☆ سٹاف روم کے لیے 25 صوفہ نما کرسیاں۔ ☆ سٹاف روم کے لیے لکڑی کے فریم اور شیشے سے بنی ہوئی میزیں ☆ کلاس روم اور ہال کے لیے 10 روسٹرم۔ ☆ پرنسپل آفس میں رکھی گئی کرسیوں کے سامنے شیشے کا ایک بڑا میز۔ ☆ کالج ہال میں سٹیج کے لیے ایک بڑا میز اور سٹیج کے لیے تین خصوصی کرسیاں۔ یہ اشیا مجھے یاد رہ گئیں۔ پرچیز سیکرٹری کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے مقامی فرم سے کم از کم نرخوں اور بہترین کوالٹی کے لیے بات چیت شروع کی۔ اس سے پہلے تمام فرنیچر کے بہترین نمونے انٹرنیٹ کی مدد سے حاصل کیے گئے اور منتخب ڈیزائین کی تصویریں اور پیمائشیں فائنل کر کے کمیٹی کے حوالے کیں۔ جن قیمتوں اور کوالٹی کا تعین کیا گیا اس کے تحت حتمی سپلائی آرڈر

جاری کر دیا گیا اور کام شروع ہو گیا۔ جناب فردوس احمد اور دیگر اساتذہ کام کی کوالٹی چیک کرتے رہے حتیٰ کہ تمام فرنیچر کالج کو سپلائی کر دیا گیا۔ ہر چیز کی کارروائی بھی مکمل ہو چکی تھی۔ بل بنا کر ضلعی آفس خزانہ میں جمع کرا دیا گیا۔ میں اپنا ایک نقطۂ نظر بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ مملکت خداداد پاکستان اس لحاظ سے شائد دنیا کا منفرد ملک ہے کہ جہاں کسی آفس میں کام ہو تو وہاں کوئی واقفیت تلاش کی جاتی ہے۔ عموماً کچہریوں کے بارے میں معروف ہے کہ وہاں شدید قسم کی مادی تحریص کی فضا پائی جاتی ہے مگر میرا مشاہدہ یہ ہے کہ خزانہ کے صوبائی اور ضلعی دفاتر میں یہ رجحان شدید تر ہے جہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ وہاں بھی قدرت دو چار لوگ ضرور مامور کر دیتی ہے کہ جن پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ بہاول پور کے آفس میں دو ایسے انسان تھے جن کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا تھا کہ ان کی مالی سالمیت شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ ان میں سید وحید رضوی اور اقبال انجم تھے۔ چوں کہ ہمارا کیس ہر لحاظ سے مکمل تھا لہٰذا کوئی اعتراض نہیں لگ سکتا تھا تاہم "سسٹم ڈاؤن" کے بہانے تاخیر کی جاتی رہی۔ میاں غلام رسول سینئر افسر خزانہ تھے اور میں انہیں رحیم یار خان سے جانتا تھا، بہت بھلے مانس اور دھیمے مزاج کے مالک تھے۔ میں ان سے ملا تو انہوں نے کہا کہ میں چوں کہ آپ سے پوری طرح آگاہ ہوں اس لیے میں نے تو بل فوراً پاس کر دیا تھا اب جہاں چیک بنائے جاتے ہیں وہاں شائد میں کچھ نہ کر سکوں۔ میں ایک اور سیکشن میں گیا جہاں چیک بن کر آتے اور تقسیم ہوتے تھے، دیکھا تو اقبال انجم اس سیکشن کے انچارج تھے، گرم جوشی سے ملے، میں نے مدعا بیان کیا تو کہنے لگے، اس طرح تو آپ کو یہ لوگ چیک نہیں دیں گے، آپ تشریف رکھیں، میں آپ کے چیک کا پتہ کرتا ہوں اور پھر چند منٹس کے بعد وہ متعلقہ سیکشن سے چیک لے کر آئے اور میرے حوالے کر دیا۔ اس دن میں نے محسوس کیا کہ ایمانداری میں بہت رعب اور دبدبہ ہے، مادی رجحان رکھنے والے ایسے لوگوں سے دب کے رہتے ہیں۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ ہمارا معاشرتی کلچر کتنا عجیب ہے کہ جس میں نیک نیتی اور ایمانداری سے کام کرنے والوں کے لیے بہت سی مشکلات اور رکاوٹیں ہیں جب کہ مادی تحریص کے حامل لوگوں کے لیے آسانیاں ہی آسانیاں ہیں۔ بہرحال اس طرح ہم بروقت ادائیگی کر کے سرخرو ہوئے۔

ایک اور آزمائش کا تذکرہ دلچسپ ہو گا کہ 2011 کے دوران مجھے ڈی پی آئی کالجز پنجاب کی طرف سے ایک نئے یا اپ گریڈڈ تعلیمی ادارے گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج اوچ شریف کا ڈرائنگ اینڈ ڈسبرسنگ آفیسر (DDO) بنا دیا گیا۔ مجھے پانچ لاکھ کی لائبریری کتب، خریدے گئے سائنسی ساز وسامان اور وقوع پذیر (Recurring) بجٹ کا کچھ نا کچھ حصہ ضائع ہونے سے بچانا تھا۔ یہ میرے لیے ایک چیلنج تھا کہ اوچ شریف، احمد پور شرقیہ اور بہاول پور کے چھ کالجوں کو چھوڑ کر صحرا کے دروازے پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کا انتخاب کیا گیا تھا۔ سائنسی سامان تو انچارج پرنسپل نے خرید کر لازمی کارروائی کے بعد کیس مجھے بھجوا دیا، باقی بجٹ کا کچھ نا کچھ حصہ بھی منظور کروا کر کالج بھجوا دیا مگر مسئلہ پانچ لاکھ کی کتب کا تھا، میں نے چند شرائط کے ساتھ

وہ کتب بیکن بکس ملتان سے خریدنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے لائبریرین سے رابطہ کیا اور کہا کہ فلاں تاریخ کو اپنی چند اساتذہ کے ساتھ اس دکان پر پہنچ جائیں۔ ہم سب ایک متعینہ تاریخ کو بیکن بکس کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ میں نے گفتگو کا آغاز کیا کہ ہم نے پانچ لاکھ روپے کی کتب لینی ہیں مگر ان کتب کا انتخاب اس کالج کے اساتذہ کریں گے جو وہاں موجود تھے۔ ان کتب کو رکھنے کے لیے معیاری اور پائیدار گیج کی آٹھ المارياں آپ کالج کو بطور عطیہ دیں گے۔ گورنمنٹ کا منظور کردہ ڈسکاؤنٹ لیں گے، تمام کتب کا اندراج لائبریری رجسٹر میں آپ لوگ کر کے دیں گے کیوں کہ لائبریرین اتنی کتب کے اندراج پر مہینوں لگا دیں گی اور ہم نے سٹاک کے اندراج کے ثبوت کے ساتھ بل بھی منظور کرانے ہیں۔ چیک آپ کو اس وقت ملے گا جب کتابوں کو لائبریری میں ان الماریوں میں ترتیب کے ساتھ رکھ دیا جائے گا۔ بغیر کسی رد و کد کے ہماری تمام باتیں مان لی گئیں اور بر وقت ادائیگی نے ان کے سامنے ہم سب کو سرخرو کیا۔ لائبریری رجسٹر میں مختصر ترین مدت سے کتب کا اندراج اتنا آسان نہیں تھا شاید اسی لیے جناب عبدالجبار کے پارٹنر فیض شاہ صاحب نے کہا کہ جبار صاحب کی دل کی تکلیف میں آپ کی کتابوں کے اندراج کے ضمن میں کی جانیوالی مشقت کا بھی کردار تھا۔

کالج میں آئی ٹی لیب بھی میرا ایک خواب تھا۔ میں نے ڈپٹی ڈائریکٹر آرکیٹکچر بہاول پور کو سائیٹ دکھانے اور کیمپس میں اس کی جگہ کی نشان دہی کے لیے دعوت دی۔ اس نے کالج ایڈمنسٹریشن بلاک کے برآمدے کو آگے توسیع دے کر خالی پڑے ہوئے پلاٹ کو ترجیح دی تا کہ وہ کالج کے مین اکیڈیمک اور ایڈمن بلاک کا ایک حصہ تصور ہو اور سیکیورٹی کا مسئلہ بھی نہیں بنے گا۔ اسطرح مجوزہ لیب کالج ہال اور لائبریری کے برابر بھی ہو جائے گی مگر اس میں مسئلہ یہ تھا کہ وہاں پانی کا زمین دوز ٹینک تھا جہاں سے پانی تمام کالج کی طرف لفٹ کر کے لے جایا جاتا تھا۔ اس کا حل یہ ڈھونڈا گیا کہ پرنسپل آفس اور کالج ہال کے درمیان کی خالی جگہ پر میں نے پانی کی متبادل سٹوریج بنوادی تا کہ آئی ٹی لیب منظور ہو جائے تو پہلے ٹینک کو ترک کر کے نئے زمین دوز ٹینک کو پائپ سے ملا دیا جائے گا اور میں اگر نہیں بھی ہوں گا تو بھی کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔ بہترین نقشہ بنایا گیا اور تکنیکی مشاورت سے آئی ٹی لیب کے لیے ساز و سامان کی لسٹ کو ریونیو کمپوننٹ کے طور پر پی سی ون کا حصہ بنایا گیا۔ ہر طرح سے مکمل کیس کی پندرہ کا پیاں بذریعہ ڈویژنل ڈائریکٹوریٹ اتھارٹیز کو بھجوا دیا گیا مگر کچھ عرصہ بعد اسے واپس کر دیا گیا۔ میری ریٹائرمنٹ میں اب ایک دو ماہ رہ گئے تھے اور طارق بشیر چیمہ جیسا کوئی مددگار بھی میسر تھا نہ پروفیسر رائے فضل الٰہی جیسا دلچسپی لینے والا دوست اور ناظم کلیات لہٰذا میں وہ کیس کالج اس امید سے چھوڑ آیا کہ شاید کوئی جنون رکھنے والا پرنسپل آجائے اور اسے آئی ٹی لیب کے کیس میں صرف تاریخ اور کچھ رقوم کے ہندسے ہی بدلنا پڑے۔

میری دانست میں اس کے بعد تیسرا بنیادی اور اہم شعبہ "اکیڈیمک ڈسپلن" یا تعلیمی نظم وضبط کا ہے۔ ہم سب نے مل کر ایک نظریہ قائم کیا کہ طالب علم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور وہی اسٹاف اور کالج کا

جواز فراہم کرتا ہے۔ طالب علم کی تعلیم و تربیت ہی ہم سب کی صلاحیتوں اور کالج کے وسائل کا محور ہے۔ ہماری اولین ترجیح یہ قرار پائی کہ طالب علم کو اس کے نصب العین کے حصول میں ہر ممکن سہولت فراہم کی جائے جس کے لیے اس نے کالج میں داخلہ لیا ہے۔ باقی کا تمام عرصہ اس نظریے پر عمل درآمد میں بیت گیا۔

یزمان کی تاریخ اور معاشرتی و تہذیبی مزاج کے مطالعے اور مشاہدے سے میں نے جو نتائج اخذ کیے ان میں بنیادی بات یہ تھی کہ یزمان بڑے دھارے یا مین اسٹریم سے ہٹ کر واقع تھا اور بہت سے امور میں بہاول پور کے انتہائی قربت کے سایے نے اس شہر کو فطری انداز میں پنپنے نہیں دیا۔ اس کے مقابلے میں حاصل پور دور ہونے کی وجہ سے خود کفالت کے درجے پر آتا ہے۔ یہاں یہ دیکھنے میں آیا کہ یزمان شہر کے اکثر طلبا بہاول پور کے تعلیمی اداروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہر روز درجنوں ویگنیں طلبا اور طالبات کو بہاول پور لے جانے اور سہ پہر کو واپس لانے کے کام میں مصروف عمل رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ بہاول پور کے بہت سے پرائیویٹ کالجز نے بھی یزمان کے طلبہ اور طالبات کے لیے لانے اور لے جانے کے لیے ٹرانسپورٹ کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ ایسی صورتحال میں یہ ضروری تھا کہ طلبا اور ان کے والدین کے ساتھ براہ راست رابطہ کیا جائے اور والدین اور شہریوں کے ساتھ مکالمے کی روایت کا آغاز کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے گذشتہ کالج کی طرح یہاں بھی "طلبا پرنسپل سے ہر وقت مل سکتے ہیں" اور طلبہ سے مہینہ وار خطاب کو زیادہ مؤثر انداز سے شروع کیا۔ تمام تعلیمی سال کے دوران اس انٹریکشن کو جاری رکھا۔ اس طرح نوٹس بورڈ کی بجائے طلبہ تک پیغام براہ راست پہنچنے لگا۔ شہریوں اور والدین کی آمد پر ان کو کالج کے مجوزہ منصوبوں پر بریف کیا جانے لگا۔ کالج کے طلبا کی اکثریت دیہی پس منظر رکھتی ہے اور یزمان شہر کا عمومی مزاج بھی زرعی اور دیہی ہے۔ میں خود بھی دیہی پس منظر کا حامل ہوں لہٰذا میں یہاں کے طلباء کے مسائل اور نفسیات سے پوری طرح آگاہ تھا۔ میرے ہر خطاب کا مرکزی نقطۂ نظر ان کو اپنے نصب العین کے حصول کے لیے تحریک دینا ہوتا اور ہر خطاب میں اس بات پر بھی زور دیا جاتا کہ تعلیم کا فائدہ تبھی ہے جب اس کا اطلاق اپنی ذات اور شخصیت پر کیا جائے۔ ہماری گفتگو، کردار، سوچ اور معاشرتی رویوں سے اس تعلیم کی عکاسی ہونی چاہیے ورنہ تعلیم کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایماندار طالب علم وہ ہے جو کالج کے وسائل سے خوب استفادہ کرے اور نصب العین سے مخلص ہو۔ ان اقدامات کے بہت اچھے نتائج حاصل ہوئے۔ ڈسپلن کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوا، داخلی امتحانات میں طلبا کی شرکت کی شرح مثالی رہی، دسمبر ٹیسٹ اور داخلہ کنفرمیشن ٹیسٹ کے رزلٹ کارڈ اور حاضری کی شرح سے والدین کو کالج بلا کر آگاہ کرنے کی روایت سے طالب علموں کی کارکردگی پر مثبت اثرات مرتب ہوئے۔

اس سلسلے کی اہم بات یہ تھی کہ تعلیمی سال کے آغاز پر سال بھر کے تعلیمی کیلنڈر کا اعلان کر دیا جاتا جس میں نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کے انعقاد کے دن مخصوص ہوتے۔ کب کلاسیں ہونی ہیں، کب داخلی امتحانات اور ان کے نتائج کا اعلان ہوگا۔ کب کیا تقریب یا سالانہ کھیلیں ہونی ہیں۔ کالج میں ہر طرح سے

بورڈ اور یونیورسٹی کے معیار کے مطابق دو امتحانات لیے جاتے جس پر کنٹرولر امتحانات اور اس کا عملہ بہت محنت کرتا تھا۔ پہلا امتحان دسمبر کی تعطیلات سے قبل لیا جاتا جسے سینٹ اپ یا امتحانی داخلہ بھیجنے کا ٹیسٹ کہا جاتا تھا۔ کسی طالب علم کو کوئی استثنا حاصل نہیں تھا۔ صرف تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتال کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کے توثیقی دستخط کے ساتھ آنے والے میڈیکل سرٹیفکیٹ کو ہی قبول کیا جاتا مگر اس کی تصدیق کالج براہ راست میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سے کرالیتا اس طرح کچھ طالب علم پکڑے بھی گئے اور انہیں معاف نہیں کیا گیا۔ دسمبر کی تعطیلات کے بعد کمپیوٹر پر تیار کردہ رزلٹ نوٹس بورڈ پر آویزاں کر دیا جاتا جس میں تمام مضامین کے نمبر، کل نمبر، فیصد شرح حاصل کردہ نمبرات، کل حاضریاں، طالب علم کی شرح حاضری، آخر سے پہلے خانے میں مجموعی کارکردگی کے ریمارکس مثلاً شاندار، بہت خوب، خوب، اوسط، اوسط سے نیچے اور بہت بری، دکھائے جاتے۔ آخری خانے میں داخلہ جانے، مشروط جانے یا نہ جانے کے بارے میں لکھا جاتا۔ اس امتحان کے رزلٹ کارڈ تیار کیے جاتے اور والدین، اساتذہ اور طلبا (پی ٹی ایم) میٹنگ میں والدین کو رزلٹ کارڈ براہ راست دیے جاتے اور والدین کو ان کے بچے کی کارکردگی سے آگاہ کیا جاتا۔ اس عمل کے بہت مثبت اثرات سامنے آئے۔ بورڈ یا یونیورسٹی کے امتحان کے لیے فری کرنے سے پہلے ایک فل کورس امتحان لیا جاتا جس سے غیر حاضر ہونے یا پست ترین کارکردگی دکھانے والے طلبا کی چھانٹی ہو جاتی اور یونیورسٹی اور بورڈ کے کیلنڈرز میں دیے گئے قواعد کے مطابق عمل کیا جاتا۔ ایک دفعہ ایک طالب علم نے سال سوم میں داخلہ لیا اور غیر حاضر ہو گیا۔ سال سوم کے ریگولر امتحان کے لیے بھی رجوع نہیں کیا۔ اس طرح اس کا داخلہ کالج نے بطور ریگولر طالب علم نہیں بھیجا۔ اس نے آئین پاکستان کے آرٹیکل نمبر 199 کے تحت لاہور ہائیکورٹ بہاول پور بنچ میں رٹ دائر کر دی۔ عدالت نے پیرا وائیز کومنٹس مانگے جو میں نے مطلوبہ عدالتی فارمیٹ میں خود تیار کیے اور اس میں حاضریوں کے قواعد کا حوالہ دیا اور رجسٹر حاضری کے ریکارڈ کے ساتھ دو اساتذہ کو بھی ساتھ لے لیا۔ جج ہائیکورٹ نے میرا جواب پڑھ کر وہ رٹ خارج کر دی۔ نئے سال کے داخلہ جات کے لیے اگرچہ اخبار میں بھی اشتہار آتا لیکن ہم نے ایک جامع اشتہار چھپوایا ہوا تھا جس میں کالج کی سہولتوں اور ایک ماہ کی اوسط فیس جو انٹر میں شاید ایک سو سے کم اور ڈگری میں 125 روپے سے کم کو نمایاں کیا گیا تھا، علاقے کے ہائی سکولوں میں بھجوا دیتے بل کہ انگلش کے استاد زاہد فاروق جو سکول کی ہیڈ ماسٹر شپ ترک کر کے کالج کی تدریسی زندگی کا حصہ بنے، ہائی سکولوں میں جا کر طلبا کو یزمان کالج میں داخلہ لینے کے لیے لیکچر بھی دینے جاتے۔ شہر میں مختلف جگہوں پر کپڑے کے بینر بھی لگائے جاتے جس میں یہ جملہ ذرا نمایاں ہوتا کہ "صرف---- روپے ماہانہ کی اوسط فیس پر گورنمنٹ ڈگری کالج یزمان میں داخلہ لیں''۔ نجی کالجوں کے لوگ ہمارے بینر اتار دیتے۔ ہم ان کی جگہ نئے لگا دیتے۔ بینر اتارنے اور نئے بینر لگانے کا سلسلہ داخلوں کی تکمیل تک جاری رہتا۔

میں نے جن چار شعبوں کی مکمل ہم آہنگی (Synchronization) کا ذکر کیا تھا ان میں چوتھا

اور آخری فنانشل ڈسپلن یا مالی نظم وضبط ہے۔ اسکی میں وضاحت کردوں کہ کسی بھی ادارے یا محکمے کا تحصیل، ضلع، ڈویژن یا اوپر کی سطح کے سربراہ جس کو قواعد کے مطابق مالی اختیارات بھی حاصل ہوں تو اس کو انگریزی میں ڈرائنگ اینڈ ڈسبرسنگ آفیسر کہتے ہیں جس کا اردو میں مفہوم ہے رقم نکالنا، وصول کرنا اور اسے تقسیم کرنا اور تصرف میں لانا۔ اس عمل کے لیے مختلف گریڈز کے لحاظ سے مالی اختیارات کا تعین کر کے مالی قوانین وقواعد کی منظوری دی جاتی ہے۔ اگر کوئی آفیسر کتنا بھی ایماندار ہو اور اس پر کسی قسم کی حرف گیری نہیں کی جاسکتی ہو مگر اس نے مطلوبہ قوانین اور مجوزہ پروسیجر یا طریقِ کار کی پابندی نہیں کی تو وہ محکمے کی نظر میں ایک ایماندار آفیسر نہیں کہلائے گا کیوں کہ جب آڈٹ یا حسابات کی جانچ پڑتال ہوگی تو بے قاعدگیاں سامنے آئیں گی۔ ہمارے اس سسٹم میں ایک بہت بڑا تضاد یہ بھی ہے کہ ایک ایسے آفیسر نے بہت سے مادی فوائد حاصل کیے ہوں مگر اس نے قواعد وضوابط کا پیپر ورک مکمل کیا ہوا ہے تو وہ بددیانت آفیسر محکمے کی نظر میں نہایت دیانتدار ہوگا تاہم ''خلق خدا'' اسے جانتی ہوگی۔ بہرحال مالی امانتوں کو دیانت کے ساتھ صرف کرنے والے آفیسر کے لیے قوعد وضوابط کی پابندی از بس ضروری ہوتی ہے۔ اس وضاحت کے بعد عرض ہے کہ جب میں نے جوائن کیا تو اگلے چند دنوں میں مالی ریکارڈ اور دستاویز کو دیکھتے ہوئے میں نے اندازہ لگایا کہ قواعد وضوابط کی بے ضابطگیوں کے ساتھ بہت سے غیر متعلقہ اخراجات بھی کیے گئے تھے۔ میں نے حد فاصل قائم کرنے کے لیے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر (کالجز) آفس کے ذریعے کالج کے حسابات کا انٹرنل آڈٹ کرالیا۔ چوں کہ میرے پیشرو پہلے ڈگری کالج کے انچارج پرنسپل تھے اور میرے آنے سے وہ اپنی اسسٹنٹ پروفیسر کی پوسٹ تک محدود ہو گئے۔ میں نے ان کو انٹرنل آڈٹ رپورٹ کی ایک کاپی دی اور کہا کہ آپ کو اپنے دور کے تمام ریکارڈ تک رسائی حاصل ہوگی۔ جہاں جہاں تصحیح درکار ہے وہ کرلیں، جہاں ریکوری بنتی ہے وہ مکمل کرلیں۔ مجھے آپ اپنا دوست تصور کریں اور اپنا ریکارڈ درست کرلیں کیوں کہ یہ آپ ہی کی ذمہ داری ہے۔ ابھی تو انٹرنل آڈٹ یا ایڈوئزری رپورٹ کی روشنی میں یہ کام کیا جاسکتا ہے، کل کو آڈٹ ہوگیا تو پھر تمام بے قاعدگیاں ریکارڈ کا حصہ بن جائیں گی۔ ریکارڈ کی اس خراب صورتحال کے پیش نظر میں نے اگلے سینئر سٹاف ممبر جناب فردوس احمد کو وائس پرنسپل نامزد کردیا۔ مجھے کالج کے معاملات کو آگے بڑھانے کے لیے ایک متحرک اور میری طرح کالج کی ترقی کے خواب دیکھنے والے معاون کی ضرورت تھی۔ ویسے بھی وائس پرنسپل بلحاظ عہدہ کالج پرچیز کمیٹی اور دیگر امور میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام میں کسی بھی سرکاری تعلیمی ادارے میں تین طرح کے مالی وسائل ہوتے ہیں۔ پہلا اور بڑا وسیلہ ادارے کی سالانہ مرمت و دیکھ بھال، سپیشل مرمت اور متفرق منصوبوں کے لیے رقوم مختص کی جاتی ہیں جنہیں ایک ضابطے کے تحت تھرڈ پارٹی یعنی محکمہ ورکس وکمیونیکیشن یا محکمہ تعمیرات و عمارات کے توسط سے معروف ٹھیکیداری سسٹم کے ذریعے خرچ کر کے ان منصوبوں کی تکمیل کی جاتی ہے۔ محکمہ تعلیم کی طرف سے ان رقوم کو براہ راست ان محکموں کے اکاونٹس میں منتقل کردیا جاتا ہے۔ ہم کسٹمر ڈیپارٹمنٹ

کی حیثیت سے اپنے منصوبے کی تعمیر و تکمیل کے دوران مطلوبہ معیار چیک کر سکتے ہیں۔ دوسرا وسیلہ کالج کو گورنمنٹ کی طرف سے تنخواہوں، الاؤنسز اور مختلف خدمات کے لیے کانٹی جینٹ بجٹ جاری کیا جاتا ہے۔ جواب میں کالج طلبا سے مختلف مدات مثلاً داخلہ فیس اور ماہانہ ٹیوشن فیس وصول کر کے ایک مخصوص ہیڈ کے تحت گورنمنٹ کے خزانے میں جمع کرا دیا جاتا ہے اور اس کا اندراج گورنمنٹ کیش بک میں کیا جاتا ہے۔ تیسرا ذریعہ طلبا کی طرف سے گورنمنٹ کے مقررہ نرخوں کے مطابق فنڈز کی وصولی ہے۔ ہر فنڈ کے اخراجات کی حدود یا تصریحات (specifications) کا تعین بھی کیا گیا ہے۔ یہ فنڈز دراصل طلبا کی وہ امانتیں ہیں جنہیں فنڈز کے نوٹیفکیشن میں بیان کی گئی تصریحات کے مطابق ضروری خدمات کی فراہمی پر اصولی طور پر اسی سال خرچ کر دینا چاہئے۔ گورنمنٹ گرانٹس کے اخراجات کے اختیارات کی حدود مقرر ہیں مگر فنڈز کے ضمن میں پرنسپل کے پاس مکمل اختیارات (full powers) ہوتے ہیں۔ کالج میں تمام قسم کی رقوم کی وصولی اور خرچ کی آڈٹ کے ذریعے مالی نظم وضبط کے قوانین کی روشنی میں پڑتال کی جاتی ہے۔ تمام وسائل سے آنے والی رقوم سے خدمات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ کالج کے اثاثوں میں توسیع اور تدریسی سہولتوں میں اضافہ ہوتا رہنا چاہیے۔ میں ایک ایسے پرنسپل کو جانتا ہوں جنہیں آڈٹ کا اتنا خوف لاحق تھا کہ انہوں نے چار سال سے زیادہ اپنی مدت کے دوران ایک پائی بھی خرچ نہ کی۔ کسی نے اعتراض کیا تو بتایا کہ بھائی میں نے ریٹائر بھی ہونا ہے، مجھے اگر "عدم آڈٹ پیرا" کا سرٹیفکیٹ نہ ملا تو میں کیا کروں گا حالانکہ اس وقت ان کی ریٹائرمنٹ کو ابھی بارہ برس پڑے تھے۔ میں نے یہ اصول اپنایا کہ پرنسپل کو تمام قسم کے بجٹ اور رقوم کو قانونی طریقہ سے خرچ کرنے سے پوری طرح آگاہ ہونا چاہیے۔ اس کے دو پہلو ہیں: 1- گورنمنٹ سے ملنے والا بجٹ مالی سال کے اختتام کے بعد سوخت (lapse) ہو جاتا ہے۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ کانٹی جنٹ بجٹ کو مناسب وقت میں کالج کے بہترین مفاد میں خرچ کر دینا چاہیے۔ 2- تمام طلبا سے جو ہر سال مختلف خدمات فراہم کرنے کے لیے فنڈز وصول کیے جاتے ہیں انہیں مطلوبہ مقاصد پر خرچ کرنے سے کترانا نہیں چاہیے۔ اگر فنڈز کو جمع (Pile up) کریں گے تو یہ طلبا کی امانتوں میں خیانت کرنے کے برابر ہوگا۔ طلبا کو جن سہولتوں کی فراہمی پر یہ فنڈز وصول کیے جاتے ہیں ان پر خرچ ہونے چاہئیں۔ مثلاً سپورٹس کی سرگرمیوں کا انعقاد اور انعامات، ریڈنگ روم میں اخبارات و جرائد کی فراہمی، غریب بچوں کی مالی امداد بصورت ادائیگی فیس و فری کتب، تفریحی و مطالعاتی دورے، دیگر کالجز میں ہم نصابی مقابلوں میں بھیجنا، تجربہ گاہوں کے سامان و کلاس روم فرنیچر کی مرمت، داخلی امتحانات کا انعقاد وغیرہ۔ میں نے کالج کو ملنے والے بجٹ کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیا، میرا ایک اپنا طریقِ کار تھا۔ میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بل پاس کروا کر پرچیز کمیٹی کے ذریعے ضرورت کی چیزیں خریدتا جاتا۔ ایسے میں جو بچت ہوتی وہ اکاؤنٹینٹ یا پرچیز سیکرٹری کے پاس جمع ہوتی جاتی اور اس کا باقاعدہ تحریری حساب کتاب رکھا جاتا۔ اس بچت سے ہم وہ چیزیں خرید لیتے جن کی بجٹ سے خریدنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

مثلاً جنریٹراور اس کا پیٹرول، ٹی وی، انٹرکام کی تنصیب، فیکس مشین، ٹرپلٹ سسٹم کا فریزر، سپلٹ اے سی اور بہت کچھ۔ ایسی اشیا کا سٹاک میں اندراج بطور ڈونیشن کر دیا جاتا۔ یوں جہاں سہولت میسر ہوتی وہاں کالج کے اثاثوں میں بھی اضافہ ہو جاتا۔ بات صرف اتنی ہے کہ ان امانتوں کی ایک پائی بھی کسی ذاتی منفعت پر خرچ نہیں ہونی چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں پبلک ایکس چیکر یا سرکاری رقوم کا کوئی پیسہ آپ کی جیب میں نہیں جانا چاہیے۔ ایمان داری کی صفت انسان کو پچھتاووں سے بچاتی ہے، اس سے سکون، اعتماد اور طمانیت کی دولت ملتی ہے بل کہ میں اس کو ایک جمالیاتی قدر اور احساس کے طور پر دیکھتا ہوں۔

اب آڈٹ کا مرحلہ آجاتا ہے۔ کچھ دوست آڈٹ کو ایک بلا کے طور پر لیتے اور خوف کھاتے ہیں۔ یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ آڈٹ بھی محکمہ خزانہ ہی کا حصہ (component) ہے اور ایماندار آڈٹ آفیسر کو میں فرشتہ صفت قرار دیتا ہوں۔ آڈٹ کا طریق کار اور معیار یکساں یا مستقل قسم کا نہیں ہوتا۔ سب کچھ آڈٹ آفیسر کے مزاج، کردار اور ترجیحات پر منحصر ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ کچھ آڈٹ آفیسر مصلح اور محتسب کی بجائے "تھانیدار" کا کردار ادا کرتے ہیں۔ کچھ نارمل، نرم خو اور نرم گفتار ہوتے ہیں اور تمام کام میرٹ پر کرتے ہیں مگر ایسے ہوتے کتنے ہیں؟ میں کسی بھی مالی ایکٹیوٹی کو متعلقہ قواعد وضوابط میں رہ کر سرانجام دیتا اور دستاویزی طور پر اسی وقت کیس مکمل کر کے فائل کا حصہ بناتا۔ کالج میں ریاضی یا شماریات کے ایک استاد کو برسرِ مقرر کیا جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً کالج کے آمدنی اور خرچ کے معاملات کی جانچ پڑتال کرتا رہتا ہے۔ ایسا انٹرنل آڈٹ کے سسٹم کے تحت کیا جاتا ہے۔ گورنمنٹ کالج حاصل پور میں اسلامیات کے استاد جناب عبدالحمید احمد کو آڈٹ کے امور پر پورا عبور تھا۔ دراصل وہ وفاق المدارس کے سسٹم میں آڈٹ کے معاملات دیکھتے تھے اور حسابات کی جانچ پڑتال اور خریداری کے عمل سے مکمل طور پر آگاہ تھے لہٰذا ان کو برسراور آڈٹ کے معاملات کا انچارج بنایا۔ کالج کا سات سال کا آڈٹ نہیں ہوا تھا اور یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ آڈٹ کرانے، ورکنگ پیپر تیار کرنے اور پرانے اور نئے پیروں کو طے یا ختم کرانے کی بنیادی ذمہ داری موجود پرنسپل پر عائد ہوتی ہے۔ گورنمنٹ کالج حاصل پور میں ہمارا سب سے پہلا آڈٹ قاضی عبدالحمید نے کیا تھا جن کا تعلق رحیم یار خان سے تھا اور انہیں اکثر ضلعی افسر خزانہ کے دفتر میں دیکھا کرتا تھا جب وہ آڈٹ کے معاون ہوتے تھے۔ پہلے انہوں نے مقامی گرلز کالج کا آڈٹ کیا پھر ہماری باری آئی۔ وائس پرنسپل کے آفس میں ریکارڈ کا ڈھیر لگا دیا گیا اور کالج کی نمائندگی جناب عبدالحمید احمد کر رہے تھے۔ جب آڈٹ مکمل ہو جائے تو لگائے گئے پیروں کے رف ڈرافٹ کی ایک کاپی پرنسپل کو دے دی جاتی ہے جس کے بعد ایک میٹنگ ہوتی ہے جس میں پرانے جنرل پیرے جن کی تعمیل ہو چکی ہوتی ہو وہ طے کرنے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں اور جس سے آڈٹ آفیسر مطمئن ہوا سے ختم کر دیا جاتا ہے جب کہ تمام نئے پیروں پر پرنسپل اپنا مؤقف پیش کرتا ہے اور جہاں آڈٹ آفیسر کی تسلی ہو جائے اس کو بھی طے (settle) کر دیا جاتا ہے اور نئی آڈٹ رپورٹ میں ان طے شدہ پیروں کو شمار نہیں کیا جاتا۔ البتہ

پرانی رپورٹ کے پیروں کو طے کرنے کا ذکر ہوتا ہے تا کہ ریکارڈ کا حصہ بن جائے۔ ایسی ہی ایک میٹنگ میں سابق پرنسپل مشتاق احمد تھہیم بھی موجود تھے کیوں کہ وہ اب تدریسی سٹاف کا حصہ تھے۔ ان کے دو پیروں کے حوالے سے میں نے قاضی صاحب کو کہا کہ یہ پیرے تو آپ کو چھوڑنے پڑیں گے کیوں کہ ان کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ انہوں نے مروت میں آ کر اتفاق کر لیا تو تھہیم صاحب اس صورت حال سے بہت محظوظ ہوئے اور بعد میں کبھی کبھار میرا یہ جملہ ازراہ تفنن یاد کراتے "قاضی صاحب یہ پیرا تو آپ کو طے کرنا پڑے گا۔" قاضی صاحب نے جناب مفتی حمید احمد کے آڈٹ کا بہترین ادراک رکھنے پر یہ جملہ کہا۔ "مفتی صاحب ہم سے زیادہ تو نہیں جانتے مگر ہمارے برابر ضرور جانتے ہیں۔" میں آڈٹ کے سلسلے کو سیکھنے کا عمل سمجھتا تھا اور ہر آڈٹ پر سیکھنے کو بہت ہوتا تھا۔ اس کے بعد اگلے چار برسوں میں میں نے تین آڈٹ کرائے اور حسن اتفاق سے آڈٹ آفیسرز کا اخلاقی معیار و کردار بہت قابل تعریف رہا۔ دوسرا آڈٹ رانا محمد گلزار نے کیا۔ تیسرے آڈٹ سے پہلے انہی کا فون آیا کی گرلز کالج کا آڈٹ مجوزہ مدت سے پہلے ختم ہو چکا ہے، آپ چاہیں تو آپ کے کالج کا آڈٹ کر لوں۔ اس صورت حال میں کوئی ڈی ڈی او آڈٹ نہیں کرا سکتا کیوں کہ آڈٹ متعلقہ ادارے کو دو ہفتے قبل مطلع کرتا ہے تا کہ ریکارڈ پر آخری نظر ڈال لی جائے۔ جب میں نے تذبذب کا اظہار کیا تو کہنے لگے، "آپ کو کیا فکر، آپ کا ریکارڈ تو ہر وقت مکمل ہوتا ہے، یہ میرا مشاہدہ ہے۔" سو مجھے راضی ہونا پڑا۔ یہاں کا چوتھا اور آخری آڈٹ ضلعی آڈٹ کے تحت ہوا اور وہ آڈٹ آفیسر محمد سعید طاہر نے کیا۔ ان کا رویہ بہت سکھانے والا اور تدریسی انداز کا تھا، انہوں نے قواعد و ضوابط میں بہت رہنمائی کی جو بعد میں بہت کام آئی۔ بعض آڈٹ آفیسر پیروں کی تعداد بڑھانے کے لیے معمولی پیرے بھی لگا دیتے تھے۔ مثلاً ایک پیرا لگا کہ دو طلبا نے لائبریری کتب واپس نہیں کیں۔ میں ے کہا کہ ریکارڈ کے مطابق انہوں نے کتابیں واپس کر دی تھیں تو ایک آڈٹ آفیسر کہنے لگے کہ آپ جواب میں یہی لکھ دیں گے کہ کتب واپس ہو چکی ہیں تو پیرا طے ہو جائے گا۔

اسی طرح میں گورنمنٹ کالج یزمان میں تدریسی سٹاف یا غیر تدریسی سٹاف میں سے کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھا جو اکاؤنٹس اور آڈٹ کی شد بد رکھتا ہو۔ ہیڈ کلرک اور اکاؤنٹینٹ لکیر کے فقیر تھے اور ان میں خود اعتمادی کی کمی تھی اور آڈٹ کا نفسیاتی طور پر سامنا نہیں کر سکتے تھے اور ان میں دستیاب ریکارڈ پیش (present) کرنے کا ہنر اور کرافٹ بالکل نہیں تھا۔ ایک سال سے زائد مدت میں مجھے سینئر لیکچرا سسٹنٹ (ایس ایل اے) غلام مصطفیٰ جیسا بااعتماد شخص مل گیا تھا۔ وہ کسی کالج میں شاید یہ کام کر چکا تھا۔ گورنمنٹ کالج یزمان میں آڈٹ و اکاؤنٹس کی صورت حال قابل رحم تھی۔ ہر کالج میں گورنمنٹ کی طرف سے مجوزہ فنڈز اور ان کے سالانہ یا ماہانہ نرخ مقرر ہوتے ہیں اور ہر فنڈ کا ایک بنک اکاؤنٹ ہوتا ہے۔ ہر اکاؤنٹ کی الگ الگ کیش بک میں آمدنی اور اخراجات کا حساب رکھا جاتا ہے۔ مجھ سے پہلے فنڈز کے تمام اکاؤنٹس سے ایک ناپختہ بچے کی طرح کھیلا گیا تھا۔ میں نے فوراً انٹرنل آڈٹ کرا لیا اور اس رپورٹ میں واضح کر دیا کہ کونسے فنڈ میں کیا گڑ بڑ

ہے۔ میں نے اس کی ایک کاپی سابق پرنسپل کو جو کہ اب تدریسی سٹاف میں شامل تھے دے کر ان کے تمام عہد کا سارا ریکارڈ ان کی رسائی میں دے کر اسے درست کرنے کے لیے کہا اور انہوں نے اس رپورٹ کی روشنی میں بہت سی رقوم کی ریکوری از خود کرادی اور میں نے ان کو اگلے آڈٹ تک کا وقت دیا جو دو سال سے زائد کا تھا۔ رحیم یار خان سے تعلق رکھنے والے ایک واقف کار آڈٹ آفیسر محمد افضل قاسم بہاول پور میں تعینات تھے۔ رحیم یار خان میں یہ اسسٹنٹ اکاؤنٹس آفیسر تھے اور بڑی تگ ودو اور شوق کے بعد وہ آڈٹ میں آئے تھے۔ انہیں مادی لالچ نہیں تھا البتہ اکاؤنٹس آفس کی بجائے یہاں کہیں زیادہ اہمیت ملتی تھی۔ میں نے ان سے ذکر کیا تو کہنے لگے جب آپ کہیں گے 2005 تک کا آڈٹ کر لیں گے لیکن روزانہ مجھے اور میرے معاون کو گاڑی میں ساتھ لے جانا پڑے گا۔ میں تو پہلے ہی روزانہ کی بنیاد پر جاتا تھا۔ اس آڈٹ آفیسر کی عمومی شہرت اس لحاظ سے اچھی تھی کہ یہ کسی آشنائی اور تعلق کو اپنے کام کے درمیان نہیں آنے دیتے تھے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ پہلے اور میرے اس وقت تک کے دور کا آڈٹ میرٹ پر ہونا چاہیے۔ اگست کا مہینہ تھا اور موسم گرما کی تعطیلات کا آخری ہفتہ تھا بارشوں کا موسم تھا۔ پرنسپل آفس میں سپلٹ اے سی لگا ہوا تھا لہٰذا وہیں ایک میز لگا دیا گیا۔ وہ آڈٹ کرتے اور میں اپنے کام نپٹاتا۔ وہ خاصے تجربہ کار تھے، سٹوڈنٹ کلرک کو مل کے کچھ بھانپ گئے اور گورنمنٹ کی کیش بک منگوالی جس میں فیسوں کی وصولی اور خزانے میں جمع کرانے کی تفصیل درج ہوتی ہے۔ اپنے معاون کو انہوں نے کیش بک میں درج رقوم کا ٹوٹل چیک کر کے خزانے میں جمع شدہ چالان سے موازنے کے کام میں لگا دیا۔ دو دن کی محنت کے بعد وہ مجھ سے پہلے کی مدت کا ریکارڈ سامنے لے آیا جس میں ستر ہزار کا گھپلا تھا۔ اس کالج میں پہلے پڑتال کا رواج ہی نہیں تھا لہٰذا کلرک اصل اور صحیح جمع شدہ رقم سے کچھ کم رقم دکھاتا اور بنک میں جمع کروا دیتا۔ اس کی اس کارروائی سے اصل جمع شدہ رقم اور بنک یا خزانے میں جمع کرائی گئی رقم میں فرق تھا۔ اس طرح ستر ہزار روپے سے زیادہ کا فرق نکلا۔ میں نے کلرک کو بلایا، سمجھایا کہ یہ غبن شدہ رقم متعلقہ ہیڈز میں جمع کرا دو تو میں آڈٹ آفیسر سے پیرا نہ لگانے کی سفارش کر دوں گا اور اگر یہ پیسے جمع نہ ہوئے تو پھر ایڈوانس پیرا لگے گا جو ریکوری نہ ہونے کی صورت میں ڈرافٹ بن جائے گا تو معاملہ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی میں جائے گا۔ مسئلہ معطلی، انکوائری اور کریمینل کی طرف بھی جا سکتا ہے۔ اس نے پیسے جمع کرا دیے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ افضل قاسم بعض معاملات میں رف اور ٹف انسان تھا۔ آڈٹ مکمل ہونے کے بعد آڈٹ کا یہ اصولی مرحلہ ہے کہ آڈٹ آفیسر گذشتہ رپورٹوں کے جنرل پیروں کی تعمیل کا ریکارڈ چیک کرے اور اگر آڈٹ کی ہدایت کی روشنی میں پیرے کی تعمیل کر دی گئی ہو تو اسے ختم کر کے اس کا نئی آڈٹ رپورٹ کے پہلے حصے میں اندراج کرے اور نئی رپورٹ کو سامنے رکھ کر پرنسپل اور اس کی ٹیم سے تمام پیروں پر ان کا مؤقف سنے اور جہاں جہاں ان کے مؤقف سے اتفاق کرے وہ پیرے ختم کرتا جائے۔ اگرچہ یہ میرے دور کا آڈٹ نہیں تھا مگر کچھ پیروں کی ہم نے تکمیل کر لی تھی انہوں نے مجھے اصولی طور پر میٹنگ کا موقع نہ دے

کر خود آڈٹ کے قانون یا روایت سے انحراف کیا۔ 6-2005 کا آڈٹ جو ضلعی گورنمنٹ کا آخری سال تھا، کنٹریکٹ پر رکھے گئے مسٹر عمر گل نے کیا۔ اس کا انداز بہت خشک اور کھردرا تھا کیوں کہ ان کے لیے ماضی کی قائم کردہ روایت کی روشنی میں ان کی مطلوبہ خدمت نہیں کی جا سکتی تھی۔ انہوں نے گذشتہ پیرے جن کی تعمیل ہو چکی تھی کے بارے میں آدھا کام کیا کہ ریکارڈ چیک کر لیا ہے۔ اس کے بعد پیرا ختم کیا جاتا ہے نہ لکھ سکے، شاید یہ ان کا پہلا آڈٹ تھا۔ میرے ریٹائر ہونے میں صرف 20 سے کم دن رہتے تھے کہ میری درخواست پر اس کالج کا نام آڈٹ شیڈیول میں ڈال دیا گیا اور اس طرح ڈائریکٹر جنرل آڈٹ لاہور سے آئے آڈٹ آفیسر محمد افضل نے آڈٹ کیا، یہ آڈٹ ضلعی گورنمنٹ سے صوبائی کنٹرول میں جانے کے بعد کے عرصے پر محیط تھا۔ میں نے کالج کی تمام آڈٹ رپورٹس کے ورکنگ پیپر مع توضیحی (Annotated) جوابات مکمل کر کے آفس میں رکھوا دیے تھے۔ تمام رپورٹس کے متعدد پیرہ جات کی تکمیل بھی کر دی گئی تھی۔ بات تو پیش کرنے کی ہے، اگر ان جوابات کو مہارت سے پیش کیا جائے تو متعدد پیرے ختم ہو جائیں گے۔ یہ ورکنگ پیپر آڈٹ ریڈی ریکنر کے فولڈر میں کالج کے آفس کمپیوٹر میں اب بھی موجود ہوگا۔

گورنمنٹ کالج یزمان میں گزارے ساڑھے آٹھ سالوں کا جب میں جائزہ لیتا ہوں تو ایک گونہ اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ دستیاب حالات میں انسانی اختیار کی حد تک میں نے اپنے فرض کی ادائیگی میں دانستہ کوتاہی نہیں۔ آج جب 2024 کے آخر میں اپنی چند یادداشتوں کو تحریر کرنے کا موقع ملا ہے تو خوف لاحق ہے کہ کہیں ایسی لغزش کا ارتکاب نہ کر بیٹھوں کہ یہ تحریر نرگسیت کا شکار ہو جائے کیوں کہ اس قسم کی تحریروں میں خودستائی کا جن بار بار اپنی جھلک دکھاتا ہے اور اس سے پہلو بچانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اگرچہ کالج کو جب میں نے ہمیشہ کے لیے الوداع کہا تھا اب یہ وہ کالج نہیں رہا تھا کہ جب میں نے یہاں جوائن کیا تھا۔ وہ تبدیلیاں جنہیں لوگ ترقی کا نام دیتے ہیں، رونما ہوئیں تو یہ امر کوئی ایسا غیر معمولی نہیں تھا بل کہ یہ تو معمول کے فرائض کی ادائیگی کا حصہ تھا اور میں خود کو کسی قسم کے زُعم میں مبتلا بھی نہیں پاتا بل کہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس کی ذات بابرکات نے مجھے رہنمائی عطا کی اور انسانی سطح پر سوچنے اور ثابت قدم رہنے کی صلاحیت سے نوازنے کے ساتھ ساتھ عاجزی اور انکساری جیسی نعمت بھی دی جس کی بدولت میں ایک ادنیٰ درجے کے حاصل اختیار کے بعد بھی بہت سی انسانی کمزوریوں اور خطاؤں کا شکار ہونے سے محفوظ رہا۔

30 اپریل 2013 کو 35 سال کی سروس کے بعد میرا آخری دن تھا جو حسب معمول میں نے مصروف ترین گزارا۔ دو دن پہلے تمام غیر تدریسی سٹاف کی طرف سے ایک الوداعی دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں ان کی طرف سے خلوص، محبت اور احترام کا اظہار کیا گیا۔ ایک دن قبل ضلع بہاول پور کے پرنسپلز کی طرف سے فورسیزنز بہاول پور میں الوداعیہ دیا گیا تھا۔ ان کے خیالات کے اظہار نے مجھے مسرت اور سرشاری سے مالا مال کیا۔ 30 اپریل کو ایک الوداعی عشائیے کا اہتمام کالج کی تدریسی سٹاف کی جانب سے پانڈا

ریسٹورنٹ میں ہوا جس میں جن دوستوں نے جو کچھ بھی کہا اس نے مجھے خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ عاجزی اور انکساری سے سرفراز کیا۔ 30 اپریل کو میں نے ایک اختتامی دن کے طور پر گزارا اور وائس پرنسپل جناب منظور احمد ناصر کو مختصر سی بریفنگ دی۔ اسی دوران میری بہو مسز عافیہ وجاہت، بیٹا وجاہت نسیم اور ایک سال کا پوتا محمد ارسلان وجاہت ریٹائرمنٹ کے بعد مکمل طور پر خانگی زندگی کی طرف لوٹنے کی خوشی کے علامتی اظہار کے طور پر مجھے بہاول پور لے جانے کے لیے آ گئے۔ سب سے آخری کام میں نے فراغت نامے پر دستخط کیے، وائس پرنسپل کو پرنسپل کی کرسی پر بٹھایا جو پرنسپل کا چارج منتقل کرنے کی علامت تھا، موقع پر موجود تمام افراد کو خدا حافظ کہا اور سب کی دعاؤں کے ساتھ ساڑھے آٹھ سال کی بہترین یادوں کا خزانہ سمیٹے میں بہاول پور کے لیے روانہ ہو گیا۔

گورنمنٹ ڈگری کالج یزمان میں پرنسپل کے طور پر کام کرنے کے دوران مضمون وار تدریسی سٹاف کے یہ نام یاد رہ گئے ہیں، اکنامکس: منیر احمد چودھری، حافظ سلطان محمود، سید عمران۔ تاریخ: خواجہ نور اللہ، محمد اظہر رامے، محمد طاہر عباسی، مظہر حسین۔ اردو: فردوس احمد، خالد نذیر، امتیاز سلیم لودھی، نعیم نبی۔ ایجوکیشن: محمد اسلم گورایہ۔ اسلامیات: محمد یونس خان۔ (مرحوم) انگریزی: مجیب الرحمان شیرانی، محمد اصغر کلیار، جاوید عثمان شامی، سعید اختر، عبدالناصر، زاہد فاروق۔ سوشیالوجی: راؤ اقبال محسن، مشتاق جاوید (مرحوم)، محمد رفیق۔ شماریات: محمد اسلم۔ سیاسیات: اشفاق احمد، منظور احمد شاد، خالد بشیر، فرحان نیازی، محمد شاہد: فزکس: میاں غلام مصطفیٰ، ظفر جاوید، محمد ارشد۔ ریاضی: مجاہد اقبال، عبدالغنی، محمد صادق ہاشمی، منظور ناصر (مرحوم)۔ بیالوجی: محمد یاسین۔ زوالوجی: شاہد قیوم۔ کیمسٹری: محمد عمران انجم، زاہد نواز۔ ہیلتھ اینڈ فزیکل ایجوکیشن: ممتاز احمد وٹو (مرحوم)۔ لائبریری سائنس: محمد ارشاد۔

ذیل میں چند چھوٹے چھوٹے واقعات یا مختصر باتیں ہیں جو میرے نزدیک دلچسپی کی حامل ہیں، ان کے اظہار سے اس طویل تحریر کا یہ حصہ مکمل ہو جائے گا۔

☆ گورنمنٹ کالج یزمان کے ٹائم ٹیبل میں یہ گنجائش رکھی گئی تھی کہ جو دوست پہلے تین پیریڈ میں ریگولر آتے ہیں، اگر کوئی کالج کی اسائینمنٹ ان کے ذمے نہیں تو وہ اپنا کام مکمل کر کے جا سکتے ہیں۔ انگریزی کے استاد جناب جاوید عثمان شامی اپنے پہلے پیریڈ پڑھا کر واپس بہاول پور چلے جاتے تھے۔ ایک دن میں نے انہیں کہا کہ چوں کہ آپ سب سے پہلے آتے ہیں اور اپنا کام مکمل کر کے کالج چھوڑ سکتے ہیں، اس طرح آپ جلدی بوریت اور اکتاہٹ کا شکار ہو جائیں گے۔ جب آپ کا تدریسی کام ختم ہو جائے تو سٹاف روم میں بیٹھ کر ایک کپ چائے پر اپنے رفقائے کار کے ساتھ باتیں کیجیے۔ کچھ خود ہنسیں، کچھ دوسروں کو ہنسائیں۔ اس کے بعد آپ ریلیکس ہو جائیں گے۔ پھر چاہے چلے جایا کریں۔

☆ میں نے کالج جوائن کرنے کے کچھ عرصے بعد محسوس کیا کہ وائس پرنسپل/ اکنامکس کے استاد

جناب منیر احمد چودھری بڑے آسودہ رہتے ہیں اور میں نے ان کو کبھی کلاس پڑھاتے نہیں دیکھا تھا۔ 82-1981 کے دوران ہم نے گورنمنٹ کالج خان پور میں کچھ عرصہ اکٹھے کام کیا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کسی کلاس میں نظر نہیں آتے۔ کہنے لگے میں تو ریٹائر ہونے والا ہوں لہٰذا میری کلاسیں اکنامکس کے استاد حافظ سلطان محمود پڑھاتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کب ریٹائرمنٹ ہے تو بولے ایک سال بعد، میں نے بے اختیار قہقہہ لگایا اور کہا، " آپ بادشاہ پروفیسر ہیں، استاد تو کبھی بھی ریٹائر نہیں ہوتا لہٰذا آپ اپنی دو کلاسز لیا کریں یوں وہ دو کلاسز پڑھانے لگے۔

☆ پروفیسر مشتاق احمد جاوید (مرحوم) غالباً سرگودھا ڈویژن کے ڈائریکٹر کالجز رہے تھے۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا زیادہ تر عرصہ گورنمنٹ کالج لودھراں میں بحیثیت پرنسپل گزارا۔ اتفاق سے یزمان کالج میں سوشیالوجی کی ایسوسی ایٹ پروفیسر کی سیٹ خالی تھی۔ جب سرگودھا سے شفٹ ہوئے تو اس سیٹ پر اپنی ایڈجسٹمنٹ کرالی۔ میں نے خوش دلی سے انہیں جوائن کرایا۔ میں نے انہیں ایک دن کہا کہ اتنی ہائر پوسٹوں پر آپ رہے ہیں، آپ کو کسی بڑے کالج میں جانا چاہیے تھا، انہوں نے دل ہی دل میں اس بات کا بہت برا منایا۔ اس کے بعد ان کی پوسٹنگ بہاول پور ڈویژن کے ڈائریکٹر کالجز کے طور پر ہوگئی تو ایک دن مجھے کہنے لگے کہ میں نے اس بات کا واقعی برا منایا تھا لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ آپ نے بہت اچھی بات کی تھی۔ پھر ایک دن کالج آ گئے اور رجسٹر حاضری چیک کیا اور دستخط کیے تو رجسٹر کے اس صفحے پر ان کا نام سٹاف ممبر کے طور بھی ابھی لکھا ہوا تھا کیوں کہ مہینہ مکمل ہونے کے بعد جب نام نئے مہینے کے لکھے جاتے تو ان کا نام رجسٹر حاضری سے ہٹایا جانا تھا۔ بعد میں ان کی بیسویں گریڈ میں ترقی ہوئی تو انہوں نے بغداد روڈ بہاول پور کے پوسٹ گریجوایٹ کالج میں بطور پرنسپل تقرری کرالی۔

☆ جب پروفیسر مشتاق احمد جاوید بغداد روڈ کالج کے پرنسپل ہوئے تو ایس ای کالج بہاول پور میں کیمسٹری کے استاد ڈاکٹر محمود احمد بہاول پور ڈویژن کے ڈائریکٹر کالجز مقرر کیے گئے۔ میرا ان سے تعلق بس واجبی تھا۔ بس اتنا معلوم تھا کہ وہ کوئی اکیڈمی بھی چلاتے ہیں لیکن انہوں نے ڈائریکٹر کے طور پر اپنی الگ اور اچھی پہچان بنالی۔ مشتاق جاوید نے ان سے جب یہ کہا کہ آپ کو رہنمائی کی ضرورت پڑے تو میں حاضر ہوں۔ جواب میں کہنے لگے کہ امید ہے ضرورت نہیں پڑے گی۔ مشتاق جاوید اپنا سا منہ لے کے رہ گئے۔ وہ کالجوں میں بلاضرورت نہیں جاتے تھے۔ میرے ہوتے ہوئے مجھے نہیں یاد کہ وہ کبھی کالج آئے ہوں۔ ایک دن میں نے ان کو تجویز پیش کی کہ نئے ریگولر اور ڈی ڈی او پاورز والے پرنسپلز کی ایک روزہ ٹریننگ رکھتے ہیں جن میں ان کو انتظامی اور مالی امور کے قواعد وضوابط کے ضمن میں رہنمائی فراہم کریں گے اس طرح مجموعی طور پر آڈٹ پیرے کم لگیں گے۔ یہ بات ان کے دل کو لگی اور یوں ایک روزہ پرنسپل ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا جس کے دوران میں، مشتاق جاوید اور خود ڈاکٹر محمود صاحب نے مختلف مالی و انتظامی امور کے بارے میں تفصیل سے

گفتگو کی۔شرکت کرنے والے پرنسپلز نے اس اقدام کو بہت پسند کیا۔

☆ ڈاکٹر محمد شوکت ڈی پی آئی (کالجز) پنجاب بہاول پور دورے پر تشریف لائے۔اگلے دن ان کی میٹنگ ڈویژن بھر کے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسرز کالجز کے ساتھ تھی جس کے بعد ڈسٹرکٹ بہاول پور کے کالجز کے پرنسپلز کے ساتھ میٹنگ رکھی گئی۔ پرنسپلز کی طرف سے ان کے اعزاز میں دوپہر کے کھانے کا سارا انتظام میرے ذمے تھا اس لیے میں نے کالج سے چھٹی کی۔اس دوران ڈائریکٹوریٹ کے ایک اہل کار کا فون آیا کہ کل ڈی پی آئی نے ضلع کا کوئی اچھا کالج دکھانے کی فرمائش کی تھی، ڈی ای او نے آپ کے کالج کا نام لے لیا لہٰذا وہ آپ کے کالج کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔ میں اس اچانک افتاد پر سٹپٹا گیا۔ میں نے ڈی ای او غلام اکبر شیخ کو جو ان کے ہمراہ تھے فون کیا کہ پہلے انہیں گرلز کالج لے جائیں، اس دوران میں بھی پہنچ جاؤں گا۔ میں کالج پہنچا ہی تھا کہ ڈی پی آئی بھی آ گئے۔ پانچ منٹ ہم پرنسپل آفس میں بیٹھے تھے کہ میں نے کہا، ڈاکٹر صاحب، آئیں سٹاف روم میں آپ کو اپنی کمیونٹی سے ملاتے ہیں اور وہیں پر چائے پیتے ہیں۔اب وہ اس بات سے انکار تو کر نہیں سکتے تھے۔سٹاف روم میں دس منٹ بیٹھے، چائے پی اور تھوڑی سی گفتگو کے بعد میٹنگ کی وجہ سے چل دیے۔

☆2009 کے دوران جاتی سردیوں میں بہاول پور میں پنجاب کی تمام بیوروکریسی جمع تھی۔ چیف سیکریٹری نے تمام صوبائی سیکرٹریوں کی میٹنگ کی صدارت کمشنر آفس کے کمیٹی روم میں کی۔ ہر سیکرٹری کو ڈویژن بھر کی ایک ایک تحصیل کا انچارج مقرر کیا اور تمام سکولوں، کالجوں اور دیگر محکموں خصوصاً زراعت، خوراک، بلڈنگز اور آبپاشی و دیگر کے اچانک معائنے کرنے کی ہدایت کی گئی۔تمام بہاول پور ڈویژن میں تھرتھلی مچی ہوئی تھی۔ایک دن میں دس منٹ پہلے پہنچا ہی تھا کہ اٹینڈنٹ نے بتایا کہ تین چار گاڑیاں کالج میں داخل ہوئی ہیں۔ میں نے اپنے آفس میں ان کو خوش آمدید کہا۔ ہمارے حصے میں پنجاب بورڈ آف ریونیو کے ممبر سید محمد حامد آئے۔وہ بیٹھے ہی تھے کہ میں نے پہلے سے تیارشدہ ایک فائل اٹھائی اور بریفنگ کی اجازت چاہی۔انہیں شاید یہ اچھا لگا۔ کہنے لگے کہ یہ فائل میرے پرسنل سیکرٹری کو دے دیں۔ میں نے اپنے فارمولے کے مطابق انہیں سٹاف روم میں اساتذہ سے ملنے اور چائے کی دعوت دے دی جو انہوں نے فوراً قبول کر لی اور ہم سب اٹھ کر سٹاف روم میں آ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں روزانہ بہاول پور سے آتا جاتا ہوں۔اس کے بعد وہ چلے گئے۔ جاتے جاتے کہہ گئے کہ میں نہر کے ساتھ واقع کینال ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ دو گھنٹے بعد فون آیا کہ آپ سہ پہر کی چائے میرے ساتھ پئیں۔ میں اور وائس پرنسپل فردوس احمد دونوں پہنچ گئے۔سید حامد نے انگلش اور عربی میں ایم اے کر رکھے تھے، فارسی ادب کا بھی مطالعہ کر رکھا تھا۔ چائے کے دوران ہماری گفتگو کا محور فارسی کا پہلا ناول حاجی بابا اصفہانی جو ایران کے معاشرتی و سیاسی حالات کو موضوع بنا کر انگریزی زبان میں لکھا گیا اور فارسی میں ترجمہ ہوا، زیر بحث رہا۔ان کا قیام بہاول پور میں کسی ریسٹ ہاؤس میں تھا لہٰذا

وہ میری گاڑی میں بیٹھ گئے۔ تمام سفر کے دوران خوب باتیں کیں۔ ایک ملاقات تو ان سے ان کے بہاول پور ریسٹ ہاؤس میں بھی ہوئی۔

☆ وائس پرنسپل جناب فردوس احمد اور میرے درمیان ایک طرح کا فکری بُعد تھا۔ وہ ایک خاص فکر کو ماننے والے اور میں لبرل سوچ کا حامل تھا مگر کالج کی ترقی کے بارے میں ہماری کیمسٹری حیران کن حد تک ملتی تھی۔ زبان و ادبیات کے استاد ہونے کے سات ساتھ ہم دونوں کا محبوب ایک تھا اور وہ تھا کالج اس لیے ذاتی سطح پر بھی ہماری دوستی ہو گئی۔ ان کے مزاج میں ایک طرح کی تلخی یا غصیلہ پن تھا مگر رواداری بل کہ وضع داری بھی ان کی شخصیت کا ایک لازمی جز وتھی۔ میں نے ابھی نیا نیا جوائن کیا تھا کہ گورنمنٹ کالج حاصلپور کے لائبریرین جناب شہزاد رموز نے انہیں بتایا کہ آپ کے ہاں ایک محنتی پرنسپل گیا ہے جو کالج کو سیٹ کر دے گا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ابھی تک تو ہم نے ان کی کوئی ایسی بات نہیں دیکھی۔ شہزاد رموز نے وضاحت کی کہ شاید وہ ابھی مشاہدے کے مرحلے سے گزر رہے ہوں گے۔ میں نے انہیں چیف پراکٹر بنایا اور ڈسپلن سے بے نیاز ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد "ولی نے ولی کو پہچان لیا۔" کے مصداق ہم ادبی مباحث پر خوب بولتے اور ہم دونوں کالج کی ترقی کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ 2009 میں ہماری کاوشوں کا ثمر سامنے آ چکا تھا اور کالج بہت اچھی روایت اور بہترین انفراسٹرکچر کا مالک بن گیا۔ اب ہمیں ایک پریشانی نے آن لیا۔ گرلز کالج کی اپنی بلڈنگ مکمل ہوئی تو اسے وہاں شفٹ کر دیا گیا۔ دو تین لوگ طالبات کے والدین کی صورت میں جلوہ گر ہوئے اور نعرہ مستانہ بلند کیا کہ گرلز کالج کی بلڈنگ آبادی کے بالکل باہر واقع ہے لہٰذا اسے بوائز کالج کی بلڈنگ میں شفٹ کر دیا جائے اور بوائز کالج کو وہاں۔ ہمارے لیے یہ خبر بہت پریشان کن تھی۔ سیاسی قوتیں اگر سیاست کی خاطر کود پڑتیں تو ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے جب کہ ہم نے کالج کے انفراسٹرکچر پر انتہائی محنت کے ساتھ ایک مدت صرف کی تھی۔ میں نے یہ معاملہ ممبر بورڈ آف ریونیو پنجاب سید حامد کے سامنے بھی رکھا تو انہوں نے کہا کہ چھوٹے شہروں میں یہ قدرتی بات ہوتی ہے، کچھ وقت درکار ہو گا، معاملہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ انہی دنوں سیکرٹری ہائر ایجوکیشن جب بہاول پور آئے تو ان کے سامنے بھی اس مطالبے کو دہرایا گیا۔ جناب محمد عارف وٹو ڈائریکٹر ایجوکیشن (کالجز) بہاول پور ڈویژن تھے۔ سیکرٹری نے ان سے کہا کہ دونوں پرنسپلز کو بلا کر ایک میٹنگ کریں اور اس کی سمری مجھے بھجوا دیں۔ گرلز کالج کی انچارج پرنسپل ہیلتھ اینڈ فزیکل کی لیکچرر تھیں۔ ایک دن پہلے انہوں نے ڈائریکٹر کو کہا کہ ہم نے شفٹ نہیں ہونا۔ دوسرے دن میٹنگ تھی جس میں وہ بدلی بدلی نظر آ رہی تھیں۔ ڈائریکٹر محمد عارف وٹو نے مجھے کہا کہ ہونا وہی ہے جو آپ چاہیں گے۔ آپ جو سمری بنا کر دیں گے میں وہ اوپر بھجوا دوں گا۔ میں نے ایک مؤثر قسم کی سمری تیار کی اور دلائل سے ثابت کیا کہ مجوزہ اقدام کسی طور بھی فائدہ مند نہیں ہے اور دونوں پرنسپل اس تجویز کو رد کرتے ہیں۔ دفتر کے ایک اہلکار سید افتخار بخاری نے مشورہ دیا کہ اس سمری پر دونوں پرنسپل دستخط کر کے مہر ثبت کر دیں۔ اس خاتون کو کہا گیا تو وہ دستخط کرنے پر مائل نہیں

تھیں۔ میں نے پانچ منٹ کی ایک تقریر کی جس کے بعد انہوں نے آرام سے اور بغیر کسی تردد کے دستخط کر دیے اور سمری سیکریٹری کو بھجوا دی گئی اور ہم نے سکھ کا سانس لیا۔ اس شک کی بنیاد پر کہ وہ لوگ پھر معاملے کو نہ اٹھائیں، فردوس صاحب نے ان میں سے ایک جو صحافی بن کر باقیوں کو بھی اکسا رہا تھا اسے دلائل کے ساتھ قائل کر لیا کہ وہ اس معاملے کو کبھی نہیں اٹھائے گا یوں ہم ایک ذہنی دباؤ سے نکل آئے۔ جناب فردوس صاحب سے قربت میرے اس مزاج سے ہم آہنگ تھی کہ میں محنت اور کام کرنے والے کی محبت اور تکریم میں حد سے آگے جاتا ہوں۔

☆ میں ذاتی طور پر اس بات پر ایمان کی حد تک یقین رکھتا ہوں کہ کوئی بھی مجھے اس قابل سمجھے کہ میں کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کر سکتا ہوں یا بہتر مشورہ دے سکتا ہوں تو یہ میری خوش نصیبی ہے۔ آگہی اور علم بانٹنے سے بڑھتے ہیں۔ جب بھی کسی کالج کے پرنسپل یا سٹاف ممبر یا دوست نے مجھ سے رابطہ کر کے کوئی مشورہ مانگا میں نے خلوص دل سے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق جواب دینے میں کسی بخیلی سے کام نہیں لیا۔ ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کے دور میں ایک بار تعلیمی بورڈ بہاول پور میں "پرنسپل کو زیادہ با اختیار بنایا جائے" کے موضوع پر ایک سیمینار ہوا جس میں تمام ڈویژن کے پرنسپل، ڈپٹی ڈائریکٹر شرکت کر رہے تھے۔ ڈی پی آئی (کالجز) اور سپیشل سیکریٹری ہائر ایجوکیشن بطور خاص آ رہے تھے۔ چند موضوعات مختلف پرنسپلز میں تقسیم کر دیئے گئے۔ میرے حصے میں " کالجوں میں پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کے تحت کمپیوٹر ایجوکیشن کا جائزہ" اور "ایجوکیشن کوڈ کو اپ ڈیٹ کرنا" کے موضوعات آئے۔ بہاول پور کے ایک گرلز کالج کی پرنسپل کا فون آیا۔ انہوں نے بڑے آزردہ لہجے میں پوچھا کہ فلاں پرنسپل کیسے آدمی ہیں، میں نے ان سے مشاورت کے لیے اپنے موضوع پر ان کے خیالات جاننا چاہے تو انہوں نے یہ کہہ کر بتانے سے انکار کر دیا کہ میں آپ کو اپنے خیالات کیوں بتاؤں۔ میں نے کہا کہ یہ ان کا ذاتی مسئلہ ہے۔ پھر میں نے اس موضوع پر انہیں اپنے نقطۂ نظر سے تفصیلاً آگاہ کیا۔ بہر حال سیمینار میں دیگر پرنسپلز کے ساتھ میں نے بھی اپنے دونوں موضوعات پر اپنا نقطۂ نظر پیش کیا تو سپیشل سیکرٹری نے میرے نکات اور تجاویز سن کر فوراً یہ ریمارکس دیے۔ ''یہ وہ باتیں ہیں جو ہم چاہتے ہیں کہ ان کا اظہار کیا جائے اور اس سیمینار کا مقصد بھی یہی ہے کہ آج کے موضوع کے حوالے سے ہمیں مفید اور کارآمد تجاویز ملیں''۔

☆ دوست مکرم اور اردو کے استاد امتیاز سلیم لودھی بیرون ملک سے واپس آئے تو ان کی تقرری اسی کالج میں ہوئی۔ جس دن وہ جوائن کرنے آئے تو میں نے ان کو ایک پرخلوص مشورہ دیا کہ ہر روز کا سفر کم بھی ہو تو سفر ہی ہوتا ہے۔ ابھی آپ جوائن کریں گے تو پھر تبادلے کی صورت ہی میں آپ بہاول پور جا سکیں گے۔ ابھی آپ نے جوائن نہیں کیا اس لیے نئے آرڈر ہی درکار ہوں گے۔ آپ لاہور جا کر بہاول پور میں کسی کالج کے لیے اپنے نئے آرڈر کرا لیں تو آسانی رہے گی۔ اگر اپنی تمام تر مساعی کے باوجود کامیاب نہیں ہوں گے تو

میں آپ کو آج ہی کی تاریخ میں جوائن کرالوں گا،انہیں کامیابی نہ ملی تو میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔

☆ میں نے ہمیشہ ادارے اور سٹاف کے مفادات کو مقدم رکھنے کی کوشش کی۔ گورنمنٹ کالج یزمان کے تین مقامی اساتذہ کے سوا تمام بہاول پور سے آنا جانا کرتے تھے۔شاید 2011 کے دوران چار اساتذہ کا ایس ای کالج ٹرانسفر ہو گیا۔ میں نے انہیں جب انہوں نے چاہا،فراغت نامے جاری کر دیئے۔میری سوچ یہ تھی کہ ان میں سے ہر ایک استاد خاصی دیر یہاں وقت گزار چکا تھا اور تب جا کر ان کو اپنے مطلوبہ کالج میں ٹرانسفر کا چانس ملا ہے اور ایسا چانس مستقبل میں انہیں کب مل سکے گا بل کہ ملے گا بھی یا نہیں لہٰذا ان کو اس موقع سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں ان مضامین کے استاد جلد یا بدیر آ جائیں گے۔ جب وہ ایس ای کالج جوائن کرنے گئے تو پرنسپل نے کہا:''کمال ہے،نسیم بلوچ نے سارا کالج ہی خالی کر دیا ہے''۔ میرا دعویٰ سچ ثابت ہوا اور ایک دو ماہ کے دوران ہی ان مضامین کے اساتذہ نے جوائن کر لیا۔

☆ ایک جونیئر کلرک حافظ محمد عثمان کا تبادلہ میرے لیے تکلیف دہ تھا۔ اس بچے نے پہلی مرتبہ میرے پاس ہی جوائن کیا تھا۔اسے کمپیوٹر کے مختلف پروگرامز میں مہارت حاصل تھی۔ جو بات بھی اسے سمجھائی جائے وہ اچھی طرح سمجھ لیتا تھا۔ میں اس کی موجودگی میں کمپیوٹر پر کیے جانے والے کام کے حوالے سے بہت آسودہ تھا۔اس کا فائل ورک اور دستاویز کو ترتیب سے فائل کرنا ریکارڈ کی تنظیم کے اصولوں کے مطابق تھا۔اس نے ایک دن تبادلے کی درخواست میرے سامنے رکھی اور سفارش بھی کرائی، اس کی درخواست پر میں نے بھاری دل کے ساتھ دستخط کیے۔اس کی جگہ پر جو کلرک آیا ایک دن میں نے پہلے ہی سے ایک لیٹر میں ترمیم کرتے ہوئے ہاتھ سے چند جملوں کے بیچ سے لائن لگا کر کچھ لفظ اوپر، کچھ نیچے اور کچھ سائیڈز پر افقی اور عمودی جملے لکھے جو چند جملوں کے بیچ میں شامل کر کے جملے مکمل کرنے تھے۔ جو وہ ٹائپ کر کے لایا وہ جملے مکمل کرنے کی بجائے اوپر والے الفاظ اوپر، نیچے والے الفاظ نیچے اور اسی طرح افقی و عمودی الفاظ اسی طرح ٹائپ کر کے لایا جن سمتوں میں، میں نے خالی جگہ دیکھ کر لکھے تھے۔ یہ ایک ایسا لطیفہ نما واقعہ تھا جو تصور کی کسی گرفت میں نہیں آتا۔اس دن مجھے حافظ عثمان بہت یاد آیا اور اس کی ٹرانسفر کرانے والوں پر کسی قدر غصہ بھی۔

☆ 2009 کے درمیان ایک المیہ وقوع پذیر ہوا جس نے کئی روز تک کالج کی فضا کو افسردہ کیے رکھا۔ کالج میں صحت و جسمانی تعلیم کے استاد ممتاز احمد وٹو اس سال حج کی سعادت حاصل کرنے گئے۔ چوں کہ جوان اور قد بت سے بہت توانا تھے لہٰذا انہیں وہاں کوئی کمزور، بوڑھا یا معذور نظر آ جاتا تو وہ فوراً اس کی مدد کے لیے تیار ہوتے۔ صفا اور مروا کی سعی کے وقت انہوں نے ایسے بہت سے افراد کی مدد کی۔ پھر معلوم ہوا کہ انہیں کوئی متعدی اور موذی مرض لاحق ہو گیا تھا اور وہ وہیں پر کسی ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ایک دن پتا چلا کہ وہاں کے ڈاکٹرز نے انہیں فوری طور پر پاکستان لے جانے کی ہدایت کر دی۔ لاہور میں انہیں شیخ زاید ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا مگر وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ہم تمام اساتذہ ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔ ان کا تعلق

حویلی لکھا اور پاک پتن کے درمیان کسی گاؤں سے تھا۔ جنازے میں شریک ہونے کے لیے بہاول پور سے بھی بہت سے لوگ گئے۔ان کی وفات سے شاید دو تین سال پہلے کالج اساتذہ ان کی شادی میں شرکت کے لیے یہاں آئے تھے۔ اس علاقے میں نہ پہلے کبھی گئے اور نہ ان کی وفات کے بعد۔ اگلے دن کالج میں تعلیمی سرگرمیاں معطل کر کے طلبا واساتذہ کی طرف سے ان کے لیے تعزیتی ریفرنس اور قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا۔ میں نے فوری طور پر بعد از مرگ ان کی فیملی کی مالی امداد کے لیے کیس حکومت پنجاب کو بھجوایا جو منظور بھی ہو گیا۔ ان کا بھائی یا کزن مجھ سے رابطے میں رہا۔ان کی زوجہ محترمہ نے تاریخ کے مضمون میں ایم اے کیا ہوا تھا۔ میں نے ان کی فیملی کو گائیڈ کیا کہ ان کی زوجہ محترمہ کو کنٹریکٹ یا ایڈہاک پر ملازمت مل سکتی ہے۔ وہ لوگ سیاسی طور پر اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ انہیں گورنمنٹ کی طرف سے تعلیم کے مطابق کہیں کنٹریکٹ پر لیکچرر شپ مل گئی تھی۔

☆یزمان دراصل چولستان کا دروازہ ہے۔اگر چہ لال سہانرا سے آغاز کرنے والی ڈیزرٹ برانچ نے تحصیل یزمان کے زیادہ تر علاقے کولہلہاتے کھیتوں میں تبدیل کیا ہے لیکن اس کے ارد گرد اور آگے کی طرف چولستان کا صحرا مختلف شکلوں یعنی ڈاہروں (ہموار)، چھوٹے سے لے کر بہت بڑے ریت کے ٹیلوں کی صورت یہاں وہاں بکھرا پڑا ہے۔ یزمان مین رینجرز کا بہت بڑا اور اہم مرکز ہے۔ 2000 کے بعد پاکستان کے چولستان اور انڈیا کے صحرائے تھر پر واقع سرحد پر جنگی صورت حال پیدا ہو گئی تھی، بعد میں حالات نارمل ہو گئے۔ 2001 میں کالج کا کچھ حصہ فوج نے مستعار لے لیا۔ کالج میں دراصل خوراک کا سپلائی ڈپو قائم کیا گیا تھا۔ 2004 تک یہی صورت حال تھی۔فوڈ سپلائی کے ڈپو اور اس پر مامور چار پانچ سپاہی ایک کلاس روم میں براجمان تھے۔ ان کی سپلائی کے جانور کالج میں چرتے پھرتے نظر آتے تھے۔مشرقی دیوار کے ساتھ تین درختوں کے جھنڈ کے نیچے سپاہی کھانا پکا رہے ہیں، گپیں لگا رہے ہیں۔ان کے ٹرکوں کی آمدورفت کے باعث رات کو مین گیٹ کھلا رکھنا پڑتا تھا۔ ماضی میں ''بوجوہ'' ان سے کالج کی جگہ کو خالی کرانے کے بارے میں سوچا تک نہیں گیا تھا۔ میں نے کہا کہ فوج ہماری ہے، اگر ہم انہیں بتائیں گے نہیں تو وہ ایسے رہتے رہیں گے اور کالج کا تعلیمی ماحول ڈسٹرب ہوتا رہے گا۔ میں نے کمانڈر 31 کور کو خط لکھ کر تمام مسائل و حالات سے آگاہ کیا۔ اگلے دن ایک میجر پرنسپل آفس تشریف لائے اور کہنے لگے، آپ کو کیا مسائل درپیش ہیں، میں نے کہا کوئی ایک ہو تو بتائیں پھر میں نے کئی مسائل گنوا دیے جو لیٹر میں تفصیل کے ساتھ درج تھے۔ دوسرے دن شام کو وائس پرنسپل سے کالج میں ملے اور وہی سوال کیا۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ کوئی ایک مسئلہ ہو تو بتائیں۔ جواباً کہنے لگے۔اگلے دو دن میں ہمارا سپلائی ڈپو اور عملہ کالج خالی کر دے گا اور ایسا ہی ہو۔

☆گورنمنٹ کالج حاصل پور میں میرے جانے سے پہلے درجہ چہارم کا ایک ملازم فوت ہو گیا۔ گورنمنٹ آف پنجاب کے ایک نوٹیفیکیشن کے مطابق اگر کوئی کوئی ملازم دوران ملازمت فوت ہو جائے یا طبی

بنیاد پر ریٹائر ہو جائے تو اس کے ایک بچے کو بمطابق مطلوبہ تعلیم سیکشن 17 اے کے تحت (Rule 17.A Govt of the Punjab Civil Servants Act (Appointment Conditions) 1974) متعلقہ ادارے میں اس کی تعلیم کے مطابق ملازمت دی جاسکتی ہے اور اس پر کسی پابندی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ایسے ہی ایک مرحوم ملازم کا بیٹا درجہ چہارم کی ملازمت کے لیے شرط پر پورا اترتا تھا لیکن بوجوہ اس استحقاق سے محروم تھا۔ کیس میرے سامنے لایا گیا تو میں نے اسے بلایا اور اس سے اور ادھر ادھر سے پوری تحقیق کی کہ اس نے کسی کلرک وغیرہ کو کوئی رشوت یا اس کا لالچ تو نہیں دیا اور اسے وارننگ دی کہ سروس کے دوران کسی وقت بھی کسی ایسی بات کا انکشاف ہو گیا تو اگر میں ملازمت پر رکھ سکتا ہوں تو نکال بھی سکتا ہوں، اس کے بعد اسے تقرر نامہ جاری کر دیا۔ مجھے اطمینان ہوا کہ میں نے کسی ایک گھر کا چولہا تو جلایا۔ اسی طرح گورنمنٹ کالج یزمان میں درجہ چہارم کا ملازم طبی بنیادوں پر ریٹائر ہوا تو اس نے درخواست دی۔ میں نے اس کے استحقاق کے مطابق بلا تاخیر اس کے نامزد کردہ بیٹے کو ملازمت کا تقرر نامہ جاری کر دیا۔ (2024 کے آخر میں حکومت پنجاب نے یہ رول ہی ختم کر دیا)

☆ دونوں کالجوں میں جہاں مجھے بطور پرنسپل کام کرنے کا موقع ملا، تعلیمی سال کے اختتام پر سالانہ رپورٹ ضرور مرتب کرتا تھا۔ اس رپورٹ میں چاروں شعبوں یعنی انتظامی ڈسپلن، منصوبہ بندی اور ترقی، اکیڈیمک ڈسپلن اور فنانشل ڈسپلن کے حوالے سے سال بھر کی تمام سرگرمیوں کا ذکر کیا جاتا۔ آخری حصے میں آئندہ کی ہمہ جہت منصوبہ بندی کے اہداف کی فہرست دی ہوتی۔ سالانہ رپورٹ میں ڈائریکٹر اور ڈی پی ائی کے دفاتر میں ضرور بھیجتا جہاں اسے ڈسٹ بن یا فائلوں کا رزق بننا ہوتا تھا کیوں کہ محکمہ آپ سے کسی ایسی رپورٹ کا مطالبہ نہیں کرتا۔ کالج گزٹ میں البتہ اسے شائع ضرور کرتا اس طرح کم از کم وہ ریکارڈ کا مستقل حصہ بن جاتی۔ یہ ایک خود احتسابی کا عمل تھا جس سے جہاں مستقبل کے لیے رہنمائی ملتی وہاں میرے لیے اطمینان کا باعث بھی ہوتا۔

☆ 2001-2 کے دوران گورنمنٹ صادق عباس کالج ڈیرہ نواب صاحب (احمد پور شرقیہ) کے ہر دلعزیز پرنسپل پروفیسر عبدالمجید بھٹی ریٹائر ہوئے تو کالج سٹاف نے ان کے اعزاز میں الوداعی دعوت کا اہتمام قلعہ دراوڑ میں کیا۔ بھٹی صاحب کی خواہش پر ڈائریکٹر پروفیسر فضل الٰہی رائے، اور ڈپٹی ڈائریکٹر کالجز پروفیسر محمد اکبر شیخ، پروفیسر اسرار حسین شاہ اور پروفیسر محمد طارق خاں کے علاوہ مجھے بھی دعوت دی گئی۔ ہم پہلے کالج پہنچے جہاں سے کالج بس میں قلعہ دراوڑ پہنچے۔ میں اس سے قبل جب یونیورسٹی میں ڈیپوٹیشن پر تھا تو طلبا و طالبات و اساتذہ کے ساتھ ایک تفریحی و مطالعاتی دورے کے دوران قلعہ دراوڑ اور اس کے قریب مسجد دیکھ چکا تھا۔ مجھے وہ لمحہ یاد ہے جب پہلی بار میری نظر قلعے پر پڑی تھی تو مجھے لگا جیسے مراقبے میں ڈوبے ہوئے ایسے دیوتا کو دیکھ رہا تھا جو چولستان کے مرکز میں یہاں کی تاریخی قدامت کا ایک با اعتبار اور مستند گواہ ہو۔ اس کے ساتھ

واقع عباسی یا شاہی مسجد 1650 میں تعمیر ہونے والی جامع مسجد دہلی کی ہو بہو شبیہ ہے جسے نواب بہاول خاں سوم نے 1835 اور 1849 کے درمیان تعمیر کرایا۔ آج کل کے اس ویرانے میں پونے دوسو سال قبل کی اس مسجد کا شاندار فن تعمیر اور شان و شوکت دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ اس بار آمد پر ہم کل پچاس کے قریب مہمان تھے جنہیں پہلے ریزہ ریزہ ہوتے قلعے کے قریب ایک وسیع ڈیرے پر لے جا کر کھانا پیش کیا گیا۔ اس کے بعد قلعے میں کچھ وقت گزارنے کے بعد ایک کلومیٹر دور شاہی قبرستان لے جایا گیا جہاں ایک وسیع ہال میں بہاول خاں دوم اور اس کے بعد کے نوابوں کی قبریں تھیں۔ صادق محمد خاں اول کو پہلا نواب قرار دیا جائے تو اس کی قبر شکار پور میں ہے۔ اگلے دو نوابوں بہاول خان اول اور امیر مبارک خاں ملوک شاہ قبرستان بہاول پور میں نواب خاندان کے لیے مخصوص گوشے میں دفن ہیں۔ ترتیب کے لحاظ سے چوتھے اور ان کے بعد کے نوابین قلعہ دراوڑ کے شاہی قبرستان میں دفن ہیں۔ اس متذکرہ وسیع ہال میں قیمتی قالین، خوبصورت گلوب اور دیگر نوادرات تھے جنہیں چند سال قبل چوری کر لیا گیا تھا بالکل اس طرح جیسے ڈیرہ نواب صاحب میں نوابوں کے مسکن بہاول گڑھ پیلس کو قیمتی نوادرات سے محروم کیا گیا تھا۔ شام تک کالج پہنچے جہاں سے بہاول پور واپسی ہوئی۔

☆ سروس کے آخری تیرہ سالوں میں مجھے محکمے کی طرف سے متعدد بار انکوائری آفیسر مقرر کیا گیا۔ نئے پرائیویٹ کالجوں کی رجسٹریشن اور توسیع کی کمیٹیوں میں بھی متعدد بار شریک کیا گیا۔ صرف ایک دلچسپ انکوائری کا احوال بیان کرتا چلوں۔ میں کراچی سے بذریعہ ریل واپس آ رہا تھا اور ٹرین روہڑی پہنچی تو ڈی ای او کالجز بہاول پور کا فون موصول ہوا اور انہوں نے ایک گرلز کالج میں انکوائری کرنے کو کہا اور یہ بھی کہ رپورٹ دو دن میں چاہیے۔ مسئلہ یہ تھا کہ گورنمنٹ صادق گرلز کالج بہاول پور میں پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کے تحت گورنمنٹ کی کمپیوٹر پالیسی کی روشنی میں ایک پرائیویٹ کمپنی کمپیوٹر سنٹر چلا رہی تھی لیکن فیسوں کے لیے کالج اور پارٹی کے مشترکہ منظور شدہ بنک اکاؤنٹ (Ascrow) کی بجائے اپنے کسی ذاتی اکاؤنٹ کو استعمال کیا جا رہا تھا۔ میں نے خیر پور ٹامیوالی کالج کے پرنسپل مفتی عبدالحمید کو بھی بحیثیت ممبر انکوائری کمیٹی بلا لیا۔ ہم نے دو دن میں چھان بین کی تو لاکھوں کا فراڈ منکشف ہوا۔ بس اتنا بتانا کافی ہے کہ اس کمپنی پر پابندی لگانے اور لاکھوں کی رقم ریکور کرنے کی سفارش کی۔ اس دوران میرا یہ مشاہدہ رہا ہے کہ گرلز کالجوں میں پرنسپل ہو یا سٹاف، شاید نسائی یا معاشرتی مجبوری کے تحت کالج کے کلرکوں پر مالی امور میں بہت انحصار کیا جاتا ہے جس سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ پرنسپل کو کلرکوں پر انحصار کرنے کی بجائے قواعد و ضوابط کے ضمن میں ان کے رہنما اور استاد کا کردار ادا کرنا چاہیے اس سے بہت سی قباحتوں سے بچا جا سکتا ہے۔

☆ میں جتنا عرصہ یزمان رہا اپنی گاڑی پر ہی جاتا آتا رہا اور یزمان سے واپسی پر کوئی نا کوئی دوست میرے ساتھ ہوتا۔ زیادہ تر جو دوست میرے ساتھ واپس آیا کرتے وہ انگریزی کے عبدالناصر اور سعید اختر

بلوچ تھے۔ راستے میں خوب باتیں ہوتیں او بہترین موسیقی بھی سنتے۔ عبدالناصر کا موسیقی کا ذوق خلاف توقع بہت اچھا تھا جو شاید انگریزی ادب کی جمالیات کا اثر تھا۔ ان سے اس دوران انگریزی کے متعدد الفاظ کے صحیح تلفظ بھی سننے کو ملے۔ سعید اختر بلوچ البتہ انگریزی فلموں اور موسیقی کا دانشورانہ سطح پر ادراک رکھتے تھے۔ ایک بار انہوں نے 1965 کے دوران اپنے دور کی کامیاب ترین اور کلاسیک کے درجے کی انگریزی فلم ''ڈاکٹر ژواگو'' کی موسیقی کا ذکر کیا جس کا ٹائٹل ''لاراز تھیم'' تھا جو پس منظر کی موسیقی کے طور پر تمام فلم میں خاص طرح کی فضا بناتا ہے۔ اس تھیم میوزک سمیت اس فلم کو دس آسکر ایوارڈز ملے۔ مجھے محسوس ہوا شاید یہ تھیم موسیقی میں کہیں سن چکا ہوں۔ یہ بات بعد میں مجھ پر منکشف ہوئی کہ 1970 کے دوران ایران کی عظیم اور مقبول ترین مغنیہ گوگوش کے گائے ہوئے گیتوں میں اس تھیم کا کثرت سے استعمال کیا گیا تھا۔ اسی طرح کئی بار فردوس احمد صاحب سے جن متعدد موضوعات پر گفتگو ہوتی ان میں موسیقی بھی تھی۔ وہ نور جہاں کی گائیکی کے معترف تھے خاص کر ایسے اردو اور پنجابی گانے جن میں وہ غم زدگی کے عالم میں فطری انداز کی ہچکی لیتی ہے تو المیہ گانے کی فضا زیادہ غم زدہ ہو جاتی ہے۔ جب کبھی ایسا گانا سنتے تو ان کی طرف سے ایک جملہ آتا، ''بلوچ صاحب یہ ہے کمال نور جہاں کا''۔

☆ ایک بار میں نے فردوس صاحب سے کہا کہ میری خواہش ہے کہ یزمان کی طرف کے کسی گاؤں میں بیلوں سے چلنے والی گندم پیسنے والی چکی کی فوٹوگرافی کروں جسے ''خراص'' کہا جاتا ہے یا دیسی گڑ یا شکر بنانے والے بیلنے کا پورا پراسس فلم بند کروں۔ میرا خیال یہ تھا کہ مشینی طریق کار آنے کے بعد اب یہ چیزیں ماضی کا حصہ بن چکی تھیں۔ آخر ایک دن انہوں نے دونوں جگہیں تلاش کر کے بتایا اور دن کا تعین بھی کر دیا۔ پہلے ہم ایک گاؤں میں گئے جہاں خراص چلانے کا خصوصی بندوبست کیا گیا تھا۔ پھر ایک اور گاؤں میں ایک فعال بیلنہ دیکھا۔ اضافی طور پر کھیتوں میں بیلوں والا ہل بھی چلایا گیا اور بیلوں سے چارہ کاٹنے والی مشین کو بھی۔ ان سب کی میں نے فوٹوگرافی کی اور ویڈیوز بھی بنائیں۔ آخر میں ایک افسانوی روحانی شخصیت چنن پیر کا مزار بھی دیکھا جہاں فروری اور مارچ کے ڈیڑھ ماہ کے دوران آنے والی جمعراتوں کے دوران میلہ یا عرس جاری رہتا ہے۔ یہ دن میرے لیے اس حوالے سے یادگار تھا کہ اس دن کی تمام سرگرمیاں اپنے بچپن اور اپنے گاؤں کی زندگی کی بازیافت کی ایک کوشش تھی اور معلوماتی اس لحاظ سے کہ چولستان کس طرح اور کہاں تک آباد ہو چکا ہے۔ یوں سمجھ لیں کی ہم ان دیہاتوں میں گئے جن کی آخری حدود کے بعد چولستان کا آغاز ہوتا تھا۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہم وہاں تک گئے جہاں تک انسان چولستان کو لہلہاتے کھیتوں میں بدل کر اسے شکست سے دوچار کر چکا تھا۔

''بہاول پور میں بیس سال'' کے اس آخری حصے میں ماضی سے حال تک صدیوں پر پھیلی ہوئی یہاں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کا ارتقائی جائزہ لینا مناسب ہوگا۔

بہاول پور کی موجودہ معاشرتی ساخت علاقائی، قبائلی مخلوط سماجی، لسانی، معاشی، زرعی اور جاگیر دارانہ نوابی ریاست اور سیاسی عوامل کے زیر اثر ایک طویل ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔ بہاول پور 1947 میں ہندوستان کی کل آزاد یا خودمختار 562 نوابی ریاستوں میں سے ایک نمایاں ریاست تھی جسے برٹش انڈیا میں 17 گن سیلوٹ کا پروٹوکول اور اس کے نواب کو وائسرائے ہند تک خصوصی رسائی حاصل تھی۔ ریاست کے کل "عرصہ حیات" میں نصف مدت ایسی تھی جس میں انگریزوں کا کردار ایک نگران یا محافظ (Protectorate) کا رہا۔ پہلی ایک صدی تک نوابوں نے قدیم اور تہذیبی قدوقدامت کے حامل اوچ کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ایک تو اوچ کے مذہبی اور صوفیانہ رشتے ملتان سے تھے اور دوسرے یہ کہ وہاں بخاریوں اور گیلانیوں کے روحانی سلسلے چل رہے تھے اور وہ کسی سیاسی مہم کا حصہ نہیں تھے بل کہ کہا جاتا ہے کہ اوچ کے گیلانیوں نے انہیں شکار پور کے بحرانی ماحول سے نکل جانے کا مشورہ دیا اور ان کی سفارش پر چودری کی جاگیر نوابوں کو ملی لہٰذا کچھ احساس ممنونیت بھی تھا۔ توازن قائم رکھنے کے لیے چوں کہ مادی طاقت کے ساتھ روحانی سکون وطمانیت کی بھی ضرورت پڑتی ہے اس لیے شدید مشکلات میں گھرے ہوئے اپنی اور ریاست کی بقا کی جنگ کا سامنا کرنے والے بہاول خاں ثانی نے روحانی سلسلے کے لیے شہر فرید اور چشتیاں کے قریب مہار شریف کے بزرگ نور محمد مہاروی کو اپنا روحانی پیشوا بنایا۔ ان کی روحانی دستگیری اور رہنمائی نے نواب کی قوت اور صلاحیت میں اضافہ کیا۔ آنے والے نوابوں نے قبلہ عالم کے دو قریب ترین خلفا خواجہ سلیمان تونسوی اور خواجہ محمد عاقل کے سلسلوں میں بیعت ہونے کو ترجیح دی۔ بل کہ یہ یاددلاتا چلوں کہ بہاول پور کے نواب بہاول خاں ثانی کا دور بہت پر فتن تھا۔ اوچ شریف میں سلسلہ قادریہ کے مخدوم حامد گنج بخش بہاول پور کے خلاف بننے والے الائنس کے ایک متحرک رکن تھے۔ دیگر میں والی بیکانیر وجیسلمیر اور ڈیرہ غازی خاں (جہاں مخدوم کا ننھیال تھا) اور سندھ کے نواب اور بہاول پور کے نوابوں کے مخالف قریبی عزیز بھی شامل تھے۔ ایک لڑائی میں بہاول پور کے نواب نے اوچ شریف کے قلعے کو گرا دیا۔ مخدوم صاحب کو جان بچا کر سندھ کی طرف بھاگنا پڑا اور وہ کبھی واپس نہ آسکے۔ بعد میں سلسلہ قادریہ کے گدی نشین کا تعین نواب کی منظوری سے ہونے لگا اور اوچ کو بہاولپور ریاست کا حصہ بنا دیا گیا۔ مذہبی اور روحانی اثرات کے تحت اوچ شریف میں ایک متمدن معاشرے کی ایک صورت نظر آتی ہے مگر اٹھارویں صدی کے اوائل میں بہاول پور میں شامل کیے جانے سے پہلے تک یہ علاقہ ملتان اور سندھ کے زیر نگین رہا۔

جب چودری (موجودہ لیاقت پور) کی جاگیر نوابوں کو ملی تو اس علاقے کی جغرافیائی آبادیاتی (ڈیموگرافک) صورت حال کیا تھی۔ ریاست بہاول پور کے آغاز کے حوالے سے بہت ابہام پایا جاتا ہے مگر فی الحال یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ اس وقت یہاں تہذیب وادب کا سرچشمہ اوچ شریف تھا مگر اوچ ملتان سے وابستہ تھا۔ اس سے آگے کچے کے علاقے میں دریا کے ساتھ کہیں کہیں اور بکھری ہوئی متحرک قبائل کی

خاندانی بستیاں (جھوکیں) تھیں اور وہاں کی زندگی کا سارا دارومدار دریا پر تھا۔ کبھی یہ اجاڑ دیتا اور کبھی آباد کر دیتا۔ یہاں کی کوئی معاشرتی زندگی بھی ہوگی، زبان کا اشتراک، شادی اور موت کی مقامی رسوم اور مالی اعتبار سے اشیا کے بدلے اشیا کی معاشی سرگرمیاں بھی ہوں گی۔ یہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک مخلوط معاشرتی ڈھانچہ تھا۔ صادق محمد خاں کی سربراہی میں جب نواب یہاں آ کر بسے اور جہاں انہوں نے اپنے گھر بنائے اس بستی کو اللہ آباد کا نام دیا تو یہاں کی معاشرتی اور معاشی زندگی انقلابی تبدیلیوں سے دوچار ہوئی۔ اب یہ علاقہ مختلف جنگی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا اور یہاں پر جو معاشرتی ڈھانچہ ارتقا پذیر ہوا اس کی بنیادی خصوصیات یہ تھیں۔ 1- نوابوں کا جاگیردار اور مقتدر خاندان، 2- انہی کی مختلف گوتوں کے لوگ، 3- ان کے مستقل خدمت گزار اور بھرتی کیے گئے فوجی، 4- جاگیر کے مختلف ٹکڑوں کو منتخب جنگ جوؤں کو الاٹ کر کے ان کی مناسبت سے انہیں مختلف تعداد میں فوجی رکھنے کی اجازت، 5- صرف کرائے کے جنگجو جو معاوضے سے حاصل کیے جاتے تھے 6- جھوکوں میں بسنے والی قدیم مقامی آبادی، 7- زراعت اور دیسی جنگی آلات کے کاریگر اور دیگر ضروری خدمات کی فراہمی والے پیشہ ور لوگ۔ ان گروہوں کے خاندان کے افراد اور کنبے بھی ہوں گے۔ ان سب کے درمیان باہمی تال میل (interaction) سے ایک نئے متحرک معاشرے کی تشکیل ہو رہی تھی۔ اپنے قائم کردہ شہر شکار پور سے نکالے گئے تو شکار پور سے چشتیاں کے قریب شہر فرید تک کے درمیان کا علاقہ جنگی کارروائیوں کا مرکز بن گیا اور دریائے سندھ اور ستلج کا 200 میل کا کچے کا علاقہ ان کے زیر نگین آ گیا۔ 1748 میں انہوں نے بہاول پور شہر کی بنیاد رکھ کر چار مربع میل پر مشتمل گارے اور مٹی کی کچی دیوار بنوائی اور اس کی آبادکاری کا کام شروع دیا۔ شہر کے بانی کی وفات 1749 سے بہاول خاں دوم 1808 تک کے ساٹھ سال اور صادق محمد خاں اول کے 30 سال ملا کر کل 90 سال بنتے ہیں۔ اس 90 سال کی مدت کے مکمل ہونے تک بہاول پور ریاست کے متعدد شہر داؤد پوتروں نے آباد کیے۔ پہلے پہل نوابوں نے قلعہ دراوڑ پھر بہاول پور کو اپنا مسکن بنایا جس کے بعد احمد پور شرقیہ سے تھوڑے فاصلے پر ڈیرہ نواب میں ایک نیا محل تعمیر کیا گیا۔ سیلابی نہروں سے آبپاشی کا انتظام کیا اور زرعی اجناس کی پیداوار میں اضافے کے ساتھ مقامی صنعتوں اور دستکاریوں نے ترقی کی۔ صحرا کو نکال کر ریاست میں دریائے سندھ اور ستلج کے ساتھ کی زمین سیلابوں کی لائی ہوئی زرخیز مٹی (Alluvial) سے بنی تھی۔ یہاں کی اپنی فصلیں، نباتات اور جنگلی حیات (Flora Fauna) and تھی جس میں مختلف قسم کی دالیں، اناج، پھل پھول، پودے اور جڑی بوٹیاں تھیں۔ صحرا کی اپنی جنگلی حیات تھی۔ تمام ریاست میں کچے راستے شہروں اور دیہاتوں کو آپس میں ملاتے تھے۔ زبان، معاشرتی اقدار، رسم و رواج، تجارتی سرگرمیوں، ریاست کی طرف سے محصولات کی وصولی، شہروں اور قصبات میں آبادکاری اور آبادی میں اضافے اور ان کے باہمی روابط سے وہاں پر معاشرتی ارتقا کو مہمیز اور وسعت ملی اور ایک ٹھوس اور مربوط معاشرہ وجود میں آ کر پھلنے پھولنے لگا اور اس کی واضح صورت گری ہونے لگی۔ اب اوچ شریف بھی

بہاول پور ریاست میں تھا۔ ایک اہم تبدیلی یہ آئی بہاول پور کی ریاست کو نوابی خودمختار ریاست کے طور پر فروری 1833 میں انگریزوں نے دوستانہ معاہدے کے بعد تسلیم کر لیا جس سے اس کے وجود کو لاحق خطرات میں کمی آئی مگر یہ جدید خطوط پر قائم ریاست نہیں تھی۔ ہندوستان میں قائم دیگر ریاستوں کی طرح ریاست بہاول پور بھی قبائلی طرز کی ایک نوابی اور مطلق العنان ریاست تھی جسے اسی انداز میں چلایا جاتا رہا۔ ریاست کے عناصر کی بات کریں تو صرف پہلے دو عناصر یعنی آبادی اور علاقہ موجود تھے۔ حکومت کا کاروبار چلانے کے لیے حکومت کے تین شعبے یعنی قانون سازی، انتظامیہ اور عدلیہ کا ٹھوس نظام موجود نہیں تھا بل کہ تمام اختیارات کا مرکز نواب یا ان کے مشیر ہی ہوتے تھے۔ آئندہ تینتیس سال تک صورت حال یہی رہی۔ اگر چہ انگریزوں نے اپنے زیر انتظام علاقے میں ہندوستان میں مردم شماری کا آغاز 1855 سے کر لیا تھا مگر یہاں مردم شماری کا کوئی وجود نہیں تھا اس لیے 1881 سے پہلے آبادی کے کوئی اعداد و شمار نہیں ملتے۔ علاقے کو کارداریوں میں تقسیم کر کے مال کے عملے کے ذریعے مختلف محصولات جمع کیے جاتے تھے۔ 1866 کا سال ایک سنگ میل ہے جب ریاست کے کاروبار میں انگریزوں کا عمل دخل ہوا۔ زراعت اور آبپاشی کی اصلاح کے بعد یہاں کے کسان اور زراعت پیشہ آبادی کی مالی حالت بہتر ہوئی جس کے ساتھ متعلقہ صنعت و حرفت ترقی کی طرف گامزن ہوئے۔ حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہوا۔ قوانین کا نفاذ ہوا۔ مقامی عدالتی نظام کو متعارف کرایا گیا۔ آبادکاری کی حوصلہ افزائی کی گئی، تعلیم کی طرف توجہ دی گئی اور 1900 تک یہ ایک مکمل ریاست کی صورت اختیار کر گئی جہاں زندگی اپنی تمام جہتوں کے ساتھ موجود تھی۔ تقریباً بیس ہزار صفحات اور پچیس جلدوں کے امپیریل گزٹیئر آف انڈیا کی چھٹی جلد ایڈیشن 1906 میں بہاول پور کی آبادی کے اعداد و شمار ملتے ہیں۔ 1881 اور 1891 میں بالترتیب یہاں کی آبادی 573494 اور 650042 تھی۔ 1901 میں یہ ریاست کل دس شہروں اور 1008 دیہات پر مشتمل تھی جس کی کل آبادی 720877 نفوس پر مشتمل تھی جہاں 20309 لوگ پڑھ لکھ سکتے تھے۔ محلات مکمل ہو چکے تھے۔ بہاول پور اور ڈیرہ نواب کے ریلوے سٹیشنوں پر نوابوں کے لیے علیحدہ ریلوے سیلون اور خصوصی پلیٹ فارم اور تمام سہولتوں سے مزین نجی انتظار گاہیں قائم ہو چکی تھیں جن کی باقیات اب بھی موجود ہیں۔ انگریزوں نے تمام ریاست میں ترقی و تعمیر اور نظام ریاست پر اپنے ویژن کا اطلاق کیا۔ تمام ریاست میں مختلف درجوں کے سکول، بہاول پور میں کالج، شہروں اور ان کے درمیان مواصلات میں ترقی کا عمل جاری تھا۔ عدلیہ بھی قائم تھی اور آخری اپیل کے سننے کا حق شہنشاہ یا صدر کی طرح نواب کو حاصل تھا۔ طبقاتی معاشرہ اور اس کی اقدار و رسم و رواج عمودی انداز میں پھل پھول کر اپنی شناخت قائم کر چکے تھے۔ بہاول پور بحیثیت دارالخلافہ وسعت پذیر تھا۔ چوں کہ ریاست کی ڈیموگرافی کی بنیادی خصوصیات کے تحت معاشرتی تشکیل اور آبادی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر ہو رہا ہے اس لیے ہم ایک جست لگاتے ہیں-1947 کے پاکستان سے الحاق کے بعد ریاست کا وجود برقرار رہا اور پاکستان کی پہلی مردم

شماری 1951 میں ہوئی جس کی پانچویں جلد کا عنوان ہے:"پنجاب اور ریاست بہاولپو کی مردم شماری کے اعداد وشمار" دلچسپ بات یہ ہے کہ پنجاب کے حدود اربعہ میں جنوب کی جانب ریاست بہاول پور اور انڈیا کے نام درج ہیں۔ اس میں ریاست کا کل رقبہ 17471 مربعہ میل (28117 کلومیٹر) بتایا گیا ہے۔ اس میں چولستان کا صحرا بھی شامل ہے۔ پنجاب کے ساتھ بہاول پور ریاست کی آبادی کے باب میں بتایا گیا ہے کہ یہ پنجاب کے تین ڈویژن اور ان کے سولہ اضلاع اور بہاول پور ریاست کے کل دو اضلاع رحیم یار خان اور بہاول پور کے اعداد وشمار ہیں۔ (بہاولنگر ابھی ضلع نہیں بنا تھا) ریاست کی کل آبادی 1823125 پر مشتمل ہے اور آبادی کی گنجانی 104 افراد فی میل بشمول چولستان ہے۔ قابل کاشت رقبہ 13745000 ایکڑ ہے جب کہ زیر کاشت رقبہ 2805000 یعنی 75 فی صد ہے۔ اس میں ریاست کے گذشتہ پچاس سال کی آبادی کے اعداد وشمار بھی شامل ہیں۔ 1951 کی مردم شماری کی جلد 5 میں 1901 کے بعد اور 1951 کے درمیانی ہر دس سالہ عرصے کے بعد ریاست کی آبادی کے اعداد وشمار دیے گئے ہیں۔ 1911 اور 1921 کے دوران ریاست کی آبادی 780000 اور 781000 تھی۔ اس کے بعد ستلج ویلی پروجیکٹ کے تحت آبادکاری کی وجہ سے آئندہ بیس سال کے دوران یہاں کی آبادی میں بہت اضافہ ہوا۔ 1931 اور 1941 کی دہائیوں میں آبادی 985000 اور 13411000 رہی کیوں کہ پاکستان کے قیام کے بعد مہاجرین کو بہاول پور ریاست میں بسانے کے بعد 1951 میں آبادی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

1950 کی دہائی کے پہلے نصف میں ریاست بہاول پور کی "نظامت اطلاعات" کے تحت ریاست کے انگریزی ترجمان ماہنامہ "بہاول پور ریویو" کی کچھ کاپیاں ملتی ہیں جن میں قوس قزح کی طرح بہاول پور کی تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، ترقیاتی اور محکمانہ کارکردگی پر مضامین اور خبریں ملتی ہیں۔ مجھے پروفیسر علامہ طاہر سے اگست 1953 سے اگست 1954 تک کے نو شمارے ملے جن کی میں نے فوٹو کاپیاں بنوالیں۔ اس میگزین کے ان شماروں کے مواد سے ایک جدید اور ترقی یافتہ بہاول پور ابھرتا دکھائی دیتا ہے جس کے شہروں کی ٹاؤن پلاننگ جدید خطوط پر استوار کی جارہی ہے۔ ان شماروں میں تصاویر کے حصے میں ماڈل ٹاؤن اے کی پہلی مکمل تعمیر شدہ کوٹھی، صادق پبلک سکول اور ایس ای کالج کی نئی عمارات کی تعمیر اور رحیم یار خان کے ڈی سی آفس اور ٹاؤن ہال کی زیر تعمیر عمارتیں قابل ذکر ہیں۔ آخری اور اگست 1954 کا خصوصی شمارہ" آزادی نمبر" ہے جس میں 1947 کے بعد کے سات سال تک کی سندھ، پنجاب بشمول بہاول پور اور سرحد کی ترقی کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

میں نے گورنمنٹ ڈگری کالج حاصلپور کا پہلا مجلّہ "پیش منظر" شائع کیا جس کے 250 صفحات بہاول پور کی مختلف جہتوں پر مختلف سکالرز کی تحقیقی تحریروں پر مشتمل تھے اس لیے یہ شمارہ بہاول پور نمبر کہلایا۔ شمارے میں موجود ان عنونات کو ذیل میں درج کیا گیا ہے۔

بہاول پور تہذیب و تاریخ کے 250 سال: ☆ بہاول پور کا سیاسی و سماجی پس منظر ☆ ریاست بہاول پور کی علمی خدمات کا جائزہ ☆ ضلع بہاول پور میں ادبی انجمنوں کا آغاز وارتقا ☆ ضلع بہاول پور کے رسائل و جرائد ☆ بہاول پور میں اردو ادب کا اجمالی جائزہ ☆ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے شعبہ اردو میں تحقیق کی روایت ☆ بہاول پور کے نظام عدل کا جائزہ ☆ خطہ بہاول پور کی تہذیبی اور ثقافتی روایات ☆ ریڈیو پاکستان بہاول پور ☆ بہاول پور میوزیم ☆ اردو اکیڈمی بہاول پور ☆ سنٹرل لائبریری بہاول پور ☆ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور 1925 تا 2003 ☆ چولستان فورم 1995 سے 2003 ایک کامیاب سفر ☆ سائبان انٹرنیشنل بہاول پور کا علمی اور ادبی استعارہ ☆ بہاول پور میں ادبی ارتقا، خصوصی مذاکرہ ☆ بہاول پور پر حوالہ جاتی کتب، خصوصی تراجم: ☆ آل پاکستان اردو کانفرنس کا بہاول پور میں انعقاد، ☆ بہاول پور کی صحافت کا ماضی حال اور مستقبل ☆ بہاول پور کی ٹاؤن پلاننگ ☆ ریاستی لائبریریاں ☆ حاصل پور روشن تہذیبی روایات کا امین ☆ حاصل پور تاریخی مدارج سے ابھرتا ہوا شہر ☆ حاصل پور کا ادبی منظر نامہ۔

بہاول پور شہر چوں کہ ماضی میں ریاست کا دارالخلافہ رہا ہے اور ریاست کے تمام علاقوں سے بغرض ملازمت لوگ یہاں آ کر آباد ہوئے لہٰذا اس مرکزیت کے باعث یہاں برداشت اور رواداری کے تحت معاشرتی فضا وجود میں آئی۔ یہاں کے سرائیکی زبان کے لہجے کو ٹکسالی قرار دیا جا سکتا ہے اور مختلف معاشرتی گروہوں کے درمیان تعلقات کی اقدار کو ریاست کا بنیادی معیار کہا جا سکتا ہے اس لیے یہاں سکون اور اطمینان نظر آئے گا۔ شاید اس لیے اسے خاموش، پرسکون اور قابل رہائش شہر کہا جاتا ہے۔ اگرچہ آبادکاری کے تحت تمام ریاست میں ہندو پاک کے تمام علاقوں سے لوگ یہاں آباد ہوئے لیکن 1960 کے بعد بہاول پور شہر میں بسنے کے لیے جن شہروں سے ترجیحاً زیادہ خاندان آئے ان میں فورٹ عباس، ہارون آباد، چشتیاں، میلسی، کہروڑ پکا، شجاع آباد اور ان سے ملحقہ علاقے شامل ہیں۔ ریاست میں آبادی کے دو بڑے گروہوں یعنی مقامی ریاستی اور آبادکاروں کے درمیان بے ضرر سطح کا نفسیاتی تضاد نظر آتا ہے۔ تیسرے نسلی گروہ چولستانیوں نے اپنے گرد ایک حصار قائم کر رکھا ہے اور وہ بہاول پور کی سول سوسائٹی سے الگ اور کٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ریاست کے پرانے خاندان نوابوں کی عزت و احترام میں بہت جذباتی ہیں اور اس ضمن میں وہ کسی دلیل یا تاریخی منطق کو نہیں مانتے۔

اگر بلا منطق و دلیل اور صحیح حوالہ جات کے برعکس 1727 کو ریاست کے قیام کا سال مان لیا جائے تو 1955 کو تادم انضمام ریاست کی کل مدت 228 سال بنتی ہے تو کل 12 نوابین نے یہاں حکومت کی۔ ان میں سے دو نے اصل یا عرفی نام جب کہ پانچ پانچ نے صادق محمد خاں عباسی اور بہاول خاں عباسی کے ٹائٹل یا اسما کو اختیار کیا۔ ریاست بہاول پور کی تاریخ میں نوابوں کے عباسی خانوادے سے تعلق یا ان کے مقامی ہونے کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں مختلف حوالہ جاتی اور تحقیقی مواد ملتا ہے۔ ایک

چھوٹا گروہ انہیں سندھ کے مقامی قرار دیتا ہے جب کہ اکثریت بشمول درباری اور عقیدت مند تاریخ نویس اپنی تحریروں کا آغاز ہی ان کے عباسی ہونے سے کرتے ہیں۔ اس ضمن میں انگریزوں کے سفارتکار اور ایجنٹ موہن لال (کاشمیری) کا ایک مضمون 1838 کے جرنل آف رائل ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال میں شائع ہو جس کا عنوان تھا۔ "داؤد پوتروں کے خاندان او دریائے سندھ اور ستلج کے کناروں پر بہاول خاں کے بطور سردار ظہور کی اصل کہانی"۔ چھ صفحات کے اس مضمون میں وہ داؤد پوتروں کو قطعی طور پر سندھ کے مقامی باشندے قرار دیتا ہے۔ اس کے دہلی کے پہلے انگریزی کالج میں کلاس فیلو اور انگریزوں کے ایجنٹ اور سفارتکار شہامت علی کی انگریزی زبان میں لکھی گئی " تاریخ بہاول پور "1848 میں لندن سے شائع ہوئی۔ یہ تاریخ اس کی اپنی تحقیق نہیں ہے۔ اپنی کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔ "یہ تصنیف نواب بہاول خاں کے خاندان کے متعلق تحریری یادداشتوں کا اختصار ہے۔ یہ تلخیص بہاول پور میں میر ابراہیم خاں نے پایہ تکمیل تک پہنچائی ہے۔ میر ابراہیم ایک مقامی باشندے ہیں جو ریاست بہاول پور میں برطانوی نمائندے ہیں۔ یہ تلخیص انہوں نے کیپٹن جے ڈی کننگم کی درخواست پر تحریر کی۔ کیپٹن صاحب آج کل بھوپال میں ہمارے ایجنٹ ہیں۔ 1846 میں اس آفیسر کی مذکورہ ایجنسی پر مجھے علم ہوا کہ ان کے پاس مشرق (ہندوستان) سے متعلق کچھ تحریری دستاویز ہیں۔ میں نے اپنے فارغ وقت میں مطالعہ اور عوام کی آگاہی کے لیے ان مسودات میں سے کچھ عنایت کرنے کی درخواست کی۔ کپتان صاحب نے بڑی فراخ دلی سے یہ مسودات مجھے عنائت کر دیے۔" شہامت علی نے دو اور انگریز افسران سے بھی معلومات حاصل کیں۔ یوں اس کی مرتب کردہ تاریخ میں بہاول پور کی 1835 تک کی تاریخ ملتی ہے۔ جس میں انہیں عباسی خاندان ہی بتایا ہے تاہم صفحہ 82 پر اضافی معلومات کے طور پر ایک باب کا اضافہ کر کے اس نے داؤد پوتروں کے مقامی ہونے کی طرف صرف اشارے کیے ہیں۔ "بہاول پور کی سیاست" میں ڈاکٹر عنبرین جاوید لکھتی ہیں: 1848 میں شہامت علی نے بہاول پور کی تاریخ پر کتاب لکھی جو لندن سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب دو حوالوں سے قابل قدر ہے، اول ایک مسلمان مصنف نے اس زمانے میں انگلش زبان میں کتاب لکھی جب انگلش جاننے والے مسلمان بہت کم تھے۔ وہ واحد مصنف ہے جس نے بہاول پور کے حکمرانوں کے ماخذ کے حوالے سے ایک مختلف اور خود مختار نقطۂ نظر پیش کیا۔ شہامت علی لکھتا ہے: داؤد رسول اکرمؐ کے چچا حضرت عباسؓ کی نسل سے ہونے کا دعویدار ہے۔ ان کا اصل ماخذ ایک نہایت مختلف نوعیت کا ہے۔ ان کا جد امجد داؤد شکار پور کے جولاہوں سے تعلق رکھتا تھا۔ تعداد زیادہ ہو جانے پر انہوں نے آہستہ آہستہ اپنا پیشہ ترک کیا اور اسلحہ استعمال کرنے کا فن سیکھنے لگے۔ بہت سوں نے ملتان، ٹھٹھہ کے ناظموں اور شہنشاہان دہلی کے پاس ملازمت اختیار کی لیکن ان میں سے زیادہ تر لوگ شکار پور اور ملتان کے درمیان شاہراہوں پر قافلوں کو لوٹتے اور ہر طرف لوٹ مار مچاتے رہے"۔ ڈیزل ابسٹن اپنی کتاب پنجاب کی ذاتیں کے صفحہ 17 پر لکھتا ہے کہ "داؤد پوترے بہاول پور کا برسر اقتدار خاندان ہے اور عموماً قریشی عرب ہونے کا

دعوی کرتے ہیں۔ اگر چہ کبھی کبھار انہیں راجپوت بتایا جاتا ہے لیکن ان کے حسب ونسب کے متعلق صرف یہی یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ان کا جدامجد داؤدخان اگر ذات نہیں تو پیشے کے اعتبار سے ضرور جولاہا تھا۔ بانی داؤد خان کو شکار پور کے جام جنجر کا بیٹا اور سندھ کی کلہوڑا سلطنت کے جدامجد محمد کا بھائی بتایا جاتا ہے جب کہ ایک اور کہانی اسے وٹو راجپوت قرار دیتی ہے۔" جے ڈی کننگم نے ہسٹری آف سکھ میں عباسی نوابوں کے بارے میں خوب دلیل دی ہے کہ جب نادرشاہ نے سندھ پر اپنی حاکمیت قائم کی تو جانا کہ خاندان کا جدامجد اپنے آبائی ضلع شکار پور کا نامور شخص تھا۔ نادرشاہ نے اسے صوبے کے بالائی ایک تہائی حصے پر اپنا نائب مقرر کردیا لیکن سارے قبیلے کے بارے میں مشکوک ہونے پر اسے غزنی کی طرف نکال دینے کا عزم کیا تب قبیلہ بالائی ستلج کی جانب ہجرت کرگیا اور طاقت کے ذریعے سے زمینوں پر قبضہ کرلیا۔ وہ اپنے حسب ونسب خلیفہ عباس سے ملاتے ہیں لیکن انہیں ایسے بلوچیوں کے طور پر لیا جاسکتا ہے کہ جو سندھ میں طویل عرصہ گزارنے کے بعد باعث تبدیل ہو گئے۔ یہ وہی جے ڈی کننگم ہیں جنہوں نے شہامت علی کو بہاول پور کی تاریخ کے بارے میں کچھ نوٹس دیے تھے۔ اس سے یہ رائے بھی قائم ہوتی ہے کہ اسی نے شہامت علی کو تاریخ کے آخری باب میں عباسی نوابوں کے بارے میں مقامی ہونے کو تفصیل سے لکھنے پر قائل کیا ہو۔

اس کے بعد مرۃ دولت عباسیہ از لالہ دولت رائے اور جواہر عباسیہ از مولوی محمد اعظم (مخطوطات) فارسی میں لکھی گئیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ ان میں عباسی خاندان کی سندھ اور بہاول پور کی حکومتوں کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ تاریخ مراد از سید مراد شاہ گردیزی کا مخطوطہ پہلی بار اردو میں لکھا گیا۔ اشرف گرگانوی اور مولوی محمد دین کی صادق التواریخ اور مولوی عزیزالرحمان کی صبح صادق اور دیگر تاریخ نویسوں کی کتابیں اہم ہیں۔ 1904 کا سٹیٹ گزٹیئر بہاول پور کی تمام جہتوں پر سند کا درجہ رکھتا ہے اور 1904 تک کی بہاول پور کے بارے میں ایسی دستاویز ہے جسے مرکزیت حاصل ہے۔ جدید دور میں مختلف تعلیمی اداروں بالخصوص اسلامیہ یونیورسٹی کے مختلف شعبوں نے ایم اے، ایم۔فل اور ڈاکٹریٹ کی سطح پر بہاول پور کی تاریخ وثقافت اور ادب کے تقریباً تمام پہلوؤں اور موضوعات پر تحقیقی مقالات تیار کروا کر غیر معمولی خدمت سرانجام دی ہے۔ بہاول پور کی سیاسی تاریخ کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا پہلا مقالہ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کی شعبہ سیاسیات کی چیئرپرسن ڈاکٹر عنبرین جاوید نے تحریر کیا۔ ڈاکٹر علامہ محمد طاہر نے ملتان یونیورسٹی سے ریاست بہاول پور کا نظام مملکت کے موضوع پر کام کیا۔ بہاول پور کی تاریخ ہی سے متعلق ڈاکٹر شاہد حسن رضوی، ڈاکٹر آفتاب گیلانی اور ڈاکٹر محمد اکبر ملک نے ڈاکٹریٹ کے مقالات لکھے۔ بہاول پور کی ادبی جہتوں پر بھی اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے شعبہ اردو نے بے مثال کام کرایا ہے جس کی توصیف کی جانی چاہیے۔

میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر نوابوں نے اپنا شجرہ نسب عباسیوں سے ملایا ہے تو یہ بطور حکمران ان کی

مجبوری اورضرورت تھی۔نواب عباسی سلطنت سے تعلق ہونے کا دعویٰ کرتے تھے تاکہ اشراف اورعوام کے ہاں قبولیت پاسکیں جن کی نظر میں غیر ملکی ماخذ والے مسلمان دیسی مسلمانوں کی نسبت زیادہ محترم تھے۔اس قبولیت کی کسوٹی میرٹ کے بجائے خاندان تھی۔اگرچہ عباسی سلطنت عملاً موقوف ہوچکی تھی لیکن اس کے شاندار عہد حکومت کی یاد لوگوں کے ذہنوں میں زندہ تھی۔برصغیر کے مسلمان بالخصوص اس سلطنت سے لگاؤ رکھتے تھے اور ان کی عظمت کی کہانیاں لوگوں میں عام تھیں- بات صرف اتنی ہے کہ مصر کے حکمران عباسیوں کی پانچویں پشت سے امیر سلطان احمد ثانی عباسی 1366 میں اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے بلوچستان کے راستے ہندوستان وارد ہوگئے۔ابتدائی زمانے میں مذہبی رہنما،صوفی بزرگ اور پیر رہے۔بعد کی نسلیں زمیندار اور جاگیردار بن گئیں۔مغلیہ شہنشاہ شاہ جہاں کے دور میں امیر چنی خاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے سندھ میں عباسی راج کی بنیاد رکھی۔اس نے سندھی راجہ کی بیٹی سے شادی کی اوران کے دو بیٹے پیدا ہوئے جن کے نام داؤد خان اور امیر مہدی تھے۔ان کی اولاد بعد میں دو دشمن گروہوں کلہوڑا اور داؤد پوترا میں بٹ گئی جنہوں نے ایک صدی تک آپس میں جنگیں کیں۔چنی خان کے پوتوں میں سے ایک کلہوڑہ خاں نے اقتدار پر قبضہ کر کے اپنے چچا داؤد خاں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔چنی خاں سے نویں پشت میں امیر بہادر خاں نے 1617 میں شکار پور کی بنیاد رکھی۔ایک ہی ذات کے دونوں رشتہ دار یعنی کلہوڑے عباسیوں اور داؤد پوترے عباسیوں کے گروہ سرداری کے لیے برسرِ پیکار رہے حتیٰ کی داؤد پوتروں نے وہ علاقہ چھوڑ دیا۔برصغیر میں مرکزی ایشیا اور ایران وافغانستان سے متعدد خاندان مختلف ادوار میں آباد ہوتے رہے۔ایسی ذاتوں کے لوگ جو اصل میں برصغیر ہی کے باسی ہیں،اپنا شجرہ نسب عربوں سے ملاتے ہیں جیسے بلوچ حضرت حمزہ کی اولاد تصور کرتے ہیں۔اسی طرح اعوان اپنی نسبت حضرت علی سے ٹھہراتے ہیں اور ارائیں بھی اپنے شجرے عرب سے ہی ملاتے ہیں حالانکہ بیشتر حسب ونسب سے برصغیر سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔فعال میڈیا کے اس دور میں جھوٹ بھی بولا جائے تو جلد وہ سچ کے طور پر پھیل جاتا ہے۔اب تحقیق کیسے کوئی کرے۔گذشتہ دنوں ایک پاڈ کاسٹ سن رہا تھا جس کے مہمان لبرل انداز فکر کے ایک دانشور سلمان رشید محو گفتگو تھے ان کے ان نکات نے مجھے متوجہ کیا کہ ہم جنوبی ایشیا کے باسی ہیں اور ڈی این اے کرا کے دیکھ لیں، ہمارا ڈی این اے جنوبی ایشیا کا آئے گا۔مرکزی ایشیا یا عرب ممالک کا نہیں آئے گا!!!

اگرچہ بہاول پور کی تہذیبی،ثقافتی،سماجی اور علمی وادبی جہتوں پر مختلف کتب میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے لیکن یہاں کے چند اہم اداروں کے ذکر کے بغیر بات مکمل نہیں ہوسکتی۔بہاول پور آرٹس کونسل کا کردار عمومی طور پر مجہولی رہا لیکن جب اقبال خالد اس کے ڈائریکٹر بنائے گئے تو انہوں نے بہاول پور سے تعلق کی وجہ سے بہت سے پروگرام کیے۔بہاول پور میں ان کے دوستوں کی اکثریت تھی اس لیے ان کے بلانے پر تمام دوست اکٹھے ہوجاتے۔انہوں نے مقامی ادبی تنظیموں کی شراکت سے بہت اچھی ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ

دیا۔ ریلوے روڈ پر عید گاہ کے دوسری جانب آرٹس کونسل کا دفتر تھا جہاں اکثر جانا ہوتا تھا۔ ساتھ ہی ایک چار دیواری کے اندر ایک اوپن ایئر تھیٹر قسم کی جگہ موجود تھی جہاں کوئی ڈرامہ بھی کرا لیا جاتا۔ چولستان فورم نے بھی ایک دفعہ بہاول پور کے ایک شوقین فنکار ڈاکٹر جمشید شوکت کے ساتھ ایک محفل موسیقی سجائی تھی۔ سرکٹ ہاؤس تو آرٹس کونسل اور چولستان فورم کی خصوصی تقاریب کا مرکز تھا۔ مجھے ایک بات بہت حیران کرتی کہ آرٹس کونسل کے تصرف میں خاصا بڑا رقبہ پڑا تھا جہاں آرٹس کونسل کی سرگرمیوں کے لیے ایک اچھا کمپلیکس بن سکتا تھا اور اقبال خالد اپنے دوستوں اور ان کے سیاسی اثر و رسوخ سے یہ کام کرا سکتے تھے۔ آخر معروف لکھاری اور سترہ نثری کتب کی مصنفہ اور 1985 سے 1913 تک پنجاب اسمبلی اور قومی اسمبلی کی خواتین کوٹے کی سیٹوں پر نامزد ہونے والی بشریٰ رحمان نے ماڈل ٹاؤن اے کی محمد بن قاسم روڈ پر واقع قبرستان کے ساتھ ایک خالی پلاٹ پر خصوصی گرانٹ سے اپنے والد کے نام پر ایک معقول ہال" رشیدیہ آڈیٹوریم" تعمیر کرایا جہاں آرٹس کونسل کو شفٹ کیا گیا تاہم پہلے والی جگہ بھی آرٹس کونسل کے تصرف میں رہی۔ اب سٹیج ڈراموں اور آرٹس کونسل اور چند دیگر تنظیموں کی ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز یہی ہال قرار پایا حتیٰ کہ 2001 میں ضلعی حکومتوں کے نظام کے نفاذ کے بعد ضلعی اسمبلی کے عام اجلاس بھی یہیں پر منعقد ہونے لگے۔ چوں کہ یہ ہال قبرستان کے ساتھ براہ راست ملحق ہے اس لیے کئی لوگ اسے ناچنے گانے کی سرگرمیوں کے لیے زیادہ مناسب خیال نہیں کرتے۔ میں تو اب بھی کہتا ہوں کہ آرٹس کونسل کے پاس معقول جگہ ہے جہاں پر ایک بہترین کمپلیکس تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ اب تو ڈویژن کی بجائے مختلف ضلعوں میں بھی آرٹس کونسلیں قائم ہیں اور حکومت کی طرف سے ثقافتی سرگرمیوں کے انعقاد پر زور دیا جا رہا ہے۔ آرٹس کونسلوں کے نظام کو متحرک کر دیا گیا ہے اور اس کی اپنی بلڈنگ کے لیے اب بھی کچھ کیا جا سکتا ہے۔ گزشتہ سطور تحریر کی جا چکیں تو مجھے کسی نے بتایا کہ بہاول پور آرٹس کونسل کی عمارت زیر تعمیر ہے تو تصدیق کرنے پر اس بات کی خوشی ہوئی کہ تین سال قبل اپنی اصل اور پرانی جگہ پر آرٹس کونسل کی ایک کمپلیکس نما عمارت کی تعمیر شروع ہوئی جو تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ یہ ایک عمارت دراصل ایک بڑے کمپلیکس کی صورت میں بہاول پور کی ثقافتی سرگرمیوں کی اشاعت میں غیر معمولی کردار ادا کرے گی۔

بہاول پور شہر کا سرائیکی چوک اس سے پہلے سینما چوک تھا۔ داتا سویٹس کی پچھلی جانب سرائیکی ادبی مجلس بہاول پور کا دفتر موجود ہے۔ یہ مجلس حکومت پنجاب کی تسلیم شدہ تھی اور اس کا اپنا آئین بھی تھا۔ اس دفتر کی عمارت کو" جھوک سرائیکی" کا نام دیا گیا اور اسی مناسبت سے سینما چوک کو سرائیکی چوک کا نام ملا جو جلد ہی زبان زد خاص و عام ہو گیا۔ پروفیسر دلشاد کلانچوی نے سرائیکی ادبی مجلس کے تحت متعدد سرائیکی کتب تحریر کیں۔ اس ضمن میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ جب ڈاکٹر نواز کاوش اس کے سیکریٹری تھے تو وہاں اکثر جانا رہتا تھا۔ اس مجلس کے تحت خاصے پروگرام، سٹیج ڈرامے اور سالانہ تقریبات دیکھنے کو ملیں۔ سرائیکی ثقافتی سرگرمیوں کے انعقاد کے ساتھ ساتھ اس ادارے نے سرائیکی ادب کی متعدد کتب بھی شائع کیں۔ پھر یہ مختلف سرائیکی

گروہوں کے باہمی اختلافات کی نظر ہوگئی اور خاصے غیر معروف اور غیر متعلق لوگوں کی آماجگاہ بن گئی۔اس ادارے کے پاس بھی اس مرکزی جگہ پر بہت وسیع ایریا ہے جس پر بہترین دفاتر اور ہال تعمیر ہو سکتے ہیں۔ سرائیکی لیڈر شپ نے بہت دعوے اور وعدے کیے مگر وہ حقیقت کا روپ نہ دھار سکے۔

اب کچھ ذکر اردو اکیڈمی بہاول پور کا ہو جائے۔اردو اکیڈمی بہاول پور نے جن علمی وادبی خدمات کی روایت قائم کی ہے وہ بہاول پور کی علمی، ادبی اور تحقیقی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب ہے۔اس کے تحت شائع ہونے والی کتب اور اس کے سہ ماہی مجلّے ''الزبیر'' کے عام شماروں کے ساتھ ساتھ خاص نمبروں کی اشاعت نے جو منفرد ریکارڈ قائم کیا ہے وہ صرف اسی کا حصہ ہے۔اردو اکیڈمی نے بہاول پور اور اسکی تاریخ وتہذیب کے ساتھ ساتھ کلاسیکی ادب کی اشاعت میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔اردو اکیڈمی کے اشاعتی منصوبوں اور دیگر امور کی انجام دہی کے لیے کمشنر کی سرپرستی میں نامزد ممبران کی ایک باڈی کام کرتی ہے اور ان کے ذریعے ہونے والے فیصلوں پر عمل درآمد کے لیے اکیڈمی کے سیکرٹری ذمہ دار ہیں۔حکومت پہلے ایک حقیر گرانٹ اکیڈمی کو دیتی تھی مگر عرصہ ہوا وہ بند ہو چکی۔اب کتب سے معمولی آمدنی ہو جاتی ہے جب کہ ڈاکٹر شاہد رضوی اپنی جمع پونجی سے الزبیر شائع کرتے ہیں۔ہر شمارے کی قیمت مبلغ 300 روپے ہے جس کے خریدار نا ہونے کے برابر ہیں۔زیادہ تر لوگ اعزازی پرچے کے حصول کو ترجیح دیتے ہیں۔اگر اکیڈمی کے سیکریٹری سالانہ چندہ مقرر کر کے اکیڈمی کا بنک اکاؤنٹ نمبر درج کر دیا کریں تو سالانہ خریدار پیدا کیے جا سکتے ہیں۔انہیں پرچے کی کچھ کاپیاں پنجاب بھر کے اہم شہروں کے بک سٹال پر فراہم کرنی چاہیئں۔اس طرح اس پرچے کا کچھ نہ کچھ مالی بوجھ بانٹا جا سکتا ہے۔

1979 میں جب میں نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز رحیم یار خان سے کیا تو شاہی روڈ پر واقع الحمرا جنرل سٹور سے میں نے ریڈیو سیٹ خریدا۔اس دور میں یہاں ٹی وی شجاع آباد کے بوسٹر سے بادلوں کے موسم میں تھوڑا بہت اور کبھی کبھار دکھائی دے جاتا ورنہ ریڈیو ہی اطلاعات اور تفریح کا واحد وسیلہ تھا اور بہاول پور میں واقع ریڈیو سٹیشن ہی واضح طور پر سنا جا سکتا تھا۔ملتان ریڈیو کی نشریات کے سگنل بھی رحیم یار خان میں اتار چڑھاؤ کا شکار رہتے تھے۔بہاول پور ریڈیو کا سامعین کے لحاظ سے وہ سنہری دور تھا۔بہاول پور آمد پر نا صرف بہاول پور ریڈیو سے ادبی پروگراموں میں حصہ لینے کا موقع ملا بل کہ یہاں کئی براڈ کاسٹرز سے میل جول بھی رہا۔18 اگست 1975 کو بہاول پور شہر اور اس کے دوسو کلومیٹر کے اردگرد کے علاقے میں تاریخ میں پہلی بار ہوا کے دوش پر یہ آواز آئی ''یہ ریڈیو پاکستان بہاول پور ہے'' یہ آواز انجم گیلانی کی تھی۔انجم گیلانی اور شعیب احمد کا شمار پہلے اناؤنسرز میں ہوتا ہے۔نشریات کا افتتاح اس وقت کے وفاقی وزیر تجارت ''میر افضل خاں'' نے کیا۔ریڈیو پاکستان بہاول پور کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں کی پہلی نشریات براہ راست اور ایک مشاعرے پر مشتمل تھیں جس میں تمام مقامی شعراء کو شرکت کا موقع دیا گیا۔اس مشاعرے کی نظامت منور جمیل قریشی نے

کی۔ اس موقع پر پاکستان کے نامور ادیبوں کے پیغامات بھی موصول ہوئے جنہیں افتتاحی نشریات کے دوران نشر کیا گیا۔ اس کے بعد ریڈیو پاکستان نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اسکی ترقی کا سفر ایک شاندار جدوجہد کی کہانی ہے۔ کم وسائل کے باوجود اس نے بہاول پور کی نہ صرف ثقافت کی ترویج کی بل کہ اسے علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بنا دیا گیا۔ یہاں پر بہاول پور کے تینوں اضلاع کے جوہر قابل کی تلاش اور اسکی تربیت وتہذیب کی جاتی رہی ہے۔ اس ضمن میں ایک بات قابل ذکر ہے کہ اس سے پہلے ملتان ریڈیو زیادہ وسائل اور زیادہ فضائی ایریا کے ساتھ موجود تھا۔ اسکی موجودگی میں بہاول پور ریڈیو نے اپنی علیحدہ شناخت قائم کی۔ ثقافتی سطح پر موسیقی کے شعبے میں بہاول پور ریڈیو نے رقیہ بانو، خادم حسین، سلطانہ سحر، اجمل ساجد، نجمہ خانم، اجمل خاں، امیر حسین، سخاوت حسین اور گل بہار بانو اور پروانہ مستانہ کو دریافت کیا اور ان تمام فنکاروں کے متعدد آئیٹم بہت معروف اور مقبول ہوئے۔ خواجہ فرید یہاں کا بہت بڑا شعری اور تہذیبی استعارہ ہے۔ بہاول پور ریڈیو نے اس استعارے کو مشعل راہ بنا کر عوامی مقبولیت حاصل کی۔ جہاں تک علمی وادبی پروگراموں کا تعلق ہے تو اس کی روایت بھی بہت حوصلہ افزا ہے اور بہت سے شاعر اور ادیب ایسے بھی سامنے آئے کہ جنہوں نے صرف ریڈیو کے لیے لکھنا شروع کیا۔ یہاں پر پڑھے لکھے اور شاندار تعلیمی کیریئر کے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اسلامیہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر اسلم ادیب، ڈاکٹر فیض الحسن نسیم، ڈاکٹر سلیم ملک کے علاوہ ڈاکٹر اعجاز طارق، انیس الرحمان، گلریز شاہ، بتول رحمانی، مسرت کلانچوی، ڈاکٹر زبیر، منور رحمانی، راؤ طارق، ڈاکٹر نواز کاوش اور منور جمیل یہ سب کسی نہ کسی صورت میں اس سے وابستہ رہے ہیں۔ اس سٹیشن کی سوشل سروسز کا ریکارڈ بھی بہت شاندار ہے۔ اس نے اپنے مقصد سے ہم آہنگ ہو کر اجتماعی سطح پر لوگوں کی تہذیب کی ہے۔ ان کو تعلیم دی ہے، ان کی تربیت کی ہے ان کے شعور میں اضافہ کیا ہے، ان کے مسائل پر ان کی رہنمائی کی ہے اور ذرائع ابلاغ کی مقصدیت میں اضافہ کا باعث بنا ہے۔

بہاول پور ریڈیو کا بڑا فوکس ''چولستان کی ثقافت اور وہاں کے مسائل'' رہے ہیں۔ دستاویزی پروگرامز، موسیقی، سٹیج شوز، اسکی تاریخ، اصل واقعات، لوک ورثہ اور فنکاروں کی دریافت۔ ان تمام ذرائع سے ریڈیو بہاول پور نے نہ صرف چولستان کو نئی جہت سے دریافت کیا بل کہ اس کو مؤثر انداز سے قومی اور بین الاقوامی سطح پر explain کیا۔ ریڈیو پاکستان بہاول پور کے کریڈٹ میں بہت سے قومی اور بین الاقوامی ایوارڈز ہیں جن میں نصر اللہ خان ناصر کے دو پروگراموں The River Song اور Sky of East کو بالترتیب کوالمپور اور فرانس میں ایوارڈز مل چکے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف برسوں میں اس سے وابستہ متعدد افراد کو مختلف شعبوں میں حسن کارکردگی کے متعدد ایوارڈ مل چکے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر نصر اللہ خان ناصر (سابق سینئر پروڈیوسر، پروگرام منیجر اور سٹیشن ڈائریکٹر)، جمیل اختر (سینئر پروڈیوسر)، ارشد مراد (پروڈیوسر)، ساجد حسن درانی (سینئر پروڈیوسر)، سید نعیم شاہ (سینئر پروڈیوسر)، محمد اجمل ملک اور عبدالرحمان اخضر (سٹاف

آرٹسٹ)، شعیب احمد (ڈرامہ آرٹسٹ) محمد شفیق مغل اور ایس ایم شاہین (کمپیئر) حسینہ خانم، کرشن لال بھیل، مائی دادلی، فقیرا بھگت اور سکھا جی بھیل (فوک موسیقی) کے نام قابل ذکر ہیں۔"جدید اطلاعاتی دور میں انٹرنیٹ نے تبدیلی کا جو طوفان برپا کیا اور دیکھنے والے بصری مواد (visual conten) میں جو بے حد اضافہ کیا ہے اس نے سمعی ذرائع اور وسائل کو بری طرح سے پٹخ دیا ہے۔اب ایسے ادارے سنبھل رہے ہیں اور ایف ایم اور پاڈ کاسٹ (Podcast) کی صورت اختیار کر کے اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

بہاول پور اپنے اثری باقیات اور آثار قدیمہ کی شاندار تاریخ رکھتا ہے۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ کسی قوم کی تہذیبی قدوقامت کے تعین میں وہاں کے عجائب گھروں اور ان میں موجود نوادرات بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ 1976 میں قائم بہاول پور کا عجائب گھر اس شہر کا ماضی کی تہذیبی اور ثقافتی میراث سے گہرا رشتہ قائم کرتا نظر آتا ہے۔ 1974ء سے پہلے سنٹرل لائبریری میں تاریخی نوادرات پر مشتمل ایک سیکشن تھا۔ اسی سال بہاول پور میں عجائب گھر تعمیر کرنے کا فیصلہ ہوا اور سنٹرل لائبریری سے ملحقہ 18 کنال زمین اس کے لیے مختص کی گئی۔ ڈاکٹر سیف الرحمان ڈار (ڈائریکٹر لاہور میوزیم) کو بہاول پور کے لیے پروجیکٹ ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ ان کی معاونت بہاول پور میوزیم کے انچارج محمد افضل اور لاہور میوزیم کے ریسرچ افسران شہباز خاں، نصرت علی اور مس حمیرا عالم پر مشتمل ماہرین کے پینل نے کی۔ اس پینل میں وسیم احمد کیمسٹ اور صلاح الدین ماڈلر بھی شامل تھے۔ انہوں نے بہاول پور میوزیم کی تعمیر اور اس کے قیام کی نگرانی کی۔ یہ میوزیم دو مرحلوں میں تعمیر ہو کر 1982 کو مکمل ہوا اور اس نے باقاعدہ کام شروع کر دیا۔ یہاں سنٹرل لائبریری میں موجود ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے نوادرات کو منتقل کیا گیا۔ اس کے علاوہ مختلف چیزیں بذریعہ خریداری اور کچھ مستعار لے کر اس میں شامل کی گئیں۔ لاہور میوزیم سے گندھارا آرٹ کی مجسمہ سازی کے نمونے، مختصر نقاشی کے فن پارے اور چند دیگر فن پارے اس میوزیم کو مستعار دیئے گئے۔ کمشنر آفس بہاول پور کے ریکارڈ آفس سے تاریخی دستاویزات بھی میوزیم کو منتقل کی گئیں، اس کے علاوہ خلقیاتی اور حنوط شدہ اشیاء بھی اس میوزیم کی زینت بنائی گئیں، محکمہ آثار قدیمہ نے روہڑی، امری اور کوٹ ڈی جی عہد کی اشیا بھی مہیا کیں۔ سابق ریاست بہاول پور کے نواب محمد عباس خان عباسی نے ڈاک کی ٹکٹیں اور میڈلز بطور عطیہ دیئے۔ 1974ء میں شروع ہو کر 1982ء میں مکمل ہونے والے بہاول پور میوزیم کو حکومت پنجاب کے ماہر فن تعمیر عبدالواحد نے ڈیزائن کیا۔ اس کا مکمل covered ایریا 8358 مربع فٹ ہے اور اس میں مستقبل کی توسیع کی پوری گنجائش رکھی گئی ہے۔ تعمیر شدہ عمارت میں چار گیلریوں کے علاوہ قلمی نسخوں کا کمرہ بھی تعمیر کیا گیا۔ 1983 میں اس میں قبل از اسلام یا آثار قدیمہ کی گیلری، اسلامی گیلری، تحریک پاکستان گیلری، خلقیاتی گیلری کے علاوہ مخطوطات کا ہال اور متفرق سیکشن موجود تھے اور محمد افضل اس کے قیام سے 20 سال تک اس کے ڈائریکٹر رہے۔ ان کے دور میں 1997 کے دوران میں بھی اس کی ایگزیکٹو کمیٹی کا رکن نام زد کیا گیا تھا لیکن اس کا کوئی

اجلاس ہی نہ ہو سکا، ان کی ناگہانی وفات کے بعد یہ عہدہ خالی چلا آ رہا تھا تا آنکہ محکمہ اطلاعات کے حسین احمد مدنی کو 2 مئی 2002ء کو اس کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ وہ بہاول پور میوزیم کی اہمیت سے آگاہ تھے اس لیے انہوں نے اس کی عمارت میں توسیع کا منصوبہ تکمیل کو پہنچایا اور اس کے نوادرات میں بھی اضافہ کیا۔

بہاول پور کی معروف زمانہ سنٹرل لائبریری کا میں لائف ممبر اور کاغذوں کی حد تک کتابوں کی انتخاب کمیٹی کا چیئر مین بھی رہا۔ ایک صدی پرانی یہ لائبریری دراصل بہاول پور کے آخری نواب صادق محمد خان عباسی کی 1924 میں نواب کے طور پر تاسیس کی یادگار کے طور پر قائم کی گئی۔ سر رفس ڈینیل اسحاق وائسرائے ہند نے مورخہ 8 مارچ 1924ء کو اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کا پہلا نام صادق ریڈنگ لائبریری تھا، باقی کی کہانی یہ ہے کہ اس کی تعمیر کا کام 1927 کو شروع ہو کر 1937 تک جاری رہ سکا۔ رقم کی فراہمی کا کام سرکاری طور پر سرانجام پایا جس میں سابق ریاست بہاول پور کے اہلکاران و ملازمین نے اپنی ایک ایک ماہ کی تنخواہ متعدد اقساط میں دی۔ عمارت کے لیے زمین اٹھاسی کنال دس مرلے امیر آف بہاول پور نے بطور عطیہ دی لیکن بدقسمتی سے جمع شدہ رقم عمارت کی تکمیل کے لیے کافی نہ تھی۔ اس عمارت کی تعمیر کے لیے سابق ریاست بہاول پور کے عوام نے کم و بیش ایک لاکھ روپیہ بطور اعانت دیا۔ قیام پاکستان سے چند ماہ قبل نواب مشتاق احمد گورمانی نے جو اس وقت سابق ریاست بہاول پور کے (وزیر اعظم) تھے، سابق ریاست بہاول پور کے صدر مقام میں ایک اعلیٰ قسم کی لائبریری کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ بلدیہ بہاول پور کی لائبریری بمع فرنیچر کتب و دیگر لوازمات کے سرکاری تحویل میں لے لی جائے اور اس لائبریری کا نام صادق ریڈنگ لائبریری کی بجائے سنٹرل لائبریری رکھ دیا جائے نیز یہ کہ سنٹرل لائبریری کی حیثیت مرکزی ہوگی اور اس کے تحت سابق ریاست بہاول پور کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں ذیلی لائبریریاں قائم ہوں گی چناں چہ حکومت بہاول پور نے وزیر اعظم کے مجوزہ فیصلے کے تحت 1947ء تک لائبریری عمارت کی بالائی منزل پر سنٹرل لائبریری قائم کر دی اور اس کے اخراجات سرکاری خزانے نے باقاعدہ بجٹ کے تحت برداشت کرنے شروع کر دیے۔ 1947ء سے 1958ء تک لائبریری عمارت کی بالائی منزل پر کام کرتی رہی۔ لائبریری کا ذخیرہ کتب اس حد تک بڑھ گیا کہ بالائی منزل ناکافی ثابت ہوئی۔ اس ضمن میں حکام سے رجوع کیا گیا اور ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی۔ چوں کہ تمام عمارت لائبریری کے لیے تعمیر ہوئی تھی لہٰذا اسکو صرف لائبریری کے مقاصد کے لیے وقف کیا جائے۔ میونسپل کمیٹی اس عمارت کو چھوڑنے کے لیے قطعی تیار نہ تھی۔ بالآخر چھ سال کی مسلسل انتھک کوششوں کے بعد 1958 میں جناب سید ہاشم رضا کمشنر بہاول پور کی توجہ اور تعاون سے میونسپل کمیٹی نے تمام عمارت اور ملحقہ احاطہ کو لائبریری کے حوالے کر دیا۔ سابق ریاست بہاول پور کے مغربی پاکستان میں انضمام کے بعد 1955ء سے لائبریری صوبائی حکومت کی تحویل میں بتدریج ترقی کی منزل کی طرف گامزن ہے۔ سنٹرل لائبریری بہاول پور اس وقت تین خوبصورت اور جاذب نظر عمارتوں پر

مشتمل ہے۔ان عمارتوں میں لائبریری کے تین بڑے سیکشن موجود ہیں جن میں ایک مین ہال دوسرا لیڈیز اینڈ چلڈرن سیکشن اور تیسرا اخبارات اور رسائل سیکشن ہے۔اس کے علاوہ غیر کتابی مواد کے لیے سمعی و بصری (AV) سیکشن موجود ہے۔اس لائبریری میں کتب کی کل تعداد تقریباً ایک لاکھ سے زائد ہے اور اخبارات و رسائل کا قیام پاکستان سے قبل اور بعد کا مکمل ریکارڈ موجود ہے۔اس لائبریری سے تقریباً بارہ ہزار سے زائد ممبران استفادہ کر رہے ہیں۔

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے بارے میں ابتدائی باتیں ''اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی میں ڈیپوٹیشن'' میں بتا چکا ہوں۔ 2025 میں یونیورسٹی کے قیام کو ایک صدی مکمل ہو جائے گی۔اس کی تاریخ میں اترنا بہت ضروری ہے جس کے بغیر بہاول پور کا ذکر مکمل نہیں ہوسکتا۔اس یونیورسٹی نے اس علاقے میں بالخصوص اور پاکستان میں بالعموم شاندار اور گرانقدر تدریسی خدمات کے ذریعے ملک بھر کو بہترین اور تربیت یافتہ جوہر قابل فراہم کیا ہے۔کتنا اچھا ہو کہ انتظامیہ یونیورسٹی کے سو سال مکمل ہونے پر صد سالہ تقریبات کا انعقاد کرے اور اس ضمن میں ایک کمیٹی ابھی سے قائم کر کے 2025 کے پورے سال کے دوران کا پروگرام وضع کرے۔آیئے آپ کو اس کے جدید دور کی کہانی سناتے ہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے دور حکومت (1971-1977) کے دوران تعلیمی اصلاحات اور تعلیمی سہولیات کی فراہمی کے لیے گئے اقدامات میں ایک اہم یہ تھا کہ پنجاب اسملی نے پہلے ملتان اور اس کے بعد بہاول پور میں یونیورسٹی کے قیام کی منظوری دی لہٰذا 4 مارچ 1975ء کے اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور ایکٹ کے تحت جامعہ اسلامیہ بہاول پور کو محکمہ تعلیم کے سپرد کر دیا گیا اور یوں اس یونیوسٹی میں جدید علوم کی تعلیم کا ایک نیا دور شروع ہوا۔اسلامیہ یونیورسٹی کے قیام سے قبل گریجوایشن اور پوسٹ گرایجوایشن کے لیے تمام پنجاب میں صرف پنجاب یونیوسٹی لاہور پر انحصار کیا جاتا تھا۔اب ملتان اور پھر بہاول پور میں یونیورسٹیوں کے قیام کے بعد پنجاب یونیورسٹی کی مرکزیت ختم ہوگئی اور بہاول پور جیسے نسبتاً پسماندہ ڈویژن میں یونیورسٹی کے قیام کے نتیجے میں ایک تعلیمی انقلاب کا دور شروع ہوا اور گذشتہ ایک صدی سے کچھ زائد عرصہ کے دوران اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور نے نہ صرف تمام ملک کو اعلیٰ تعلیم یافتہ ٹیلنٹ فراہم کیا بل کہ اپنی حدود میں واقع تعلیمی اداوں کو تدریسی سٹاف میں خود کفیل کر دیا۔ 80-1972 کی تعلیمی پالیسی کے نتیجے میں پہلے ملتان میں یونیورسٹی قائم ہوئی اور اس کے بعد ڈیرہ اسماعیل خان کی گومل یونیورسٹی اور بہاول پور کی اسلامیہ یونیوسٹی قائم ہوئیں۔صوبائی حکومت پنجاب میں جب حفیظ کاردار وزیر تعلیم تھے تو 1975 سے جامعہ اسلامیہ اپنے تمام اثاثوں اور سٹاف کے ساتھ محکمہ اوقاف سے محکمہ تعلیم کو منتقل کر دی گئی اور اوپر سے ڈائریکٹیو آیا کہ چوں کہ جامعہ اسلامیہ کو جدید یونیوسٹی بنایا جا رہا ہے لہٰذا اس کے لیے ایکٹ بنا کر بھیجیں اور یہاں ایسے مضامین متعارف کرائے جائیں جن کا ملک کی معاشی اور سماجی ترقی میں اہم کردار ہو۔اس سے پہلے ملتان میں یونیورسٹی کے

قیام کا ایکٹ منظور ہو چکا تھا جس میں اس کی حدود بہاول پور اور ملتان کے سول ڈویژن پر مشتمل تھیں لہٰذا اس کی حدود کے تعین میں مشکل درپیش تھی۔ ملتان یونیورسٹی کے ایکٹ میں بہاول پور کا نام اسمبلی کے ذریعے ہی ختم ہوسکتا تھا جو ایک مشکل کام تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طور ایک ماڈل ایکٹ بنا کر بھیج دیا گیا جس میں یہ ہنر اختیار کیا گیا کہ ڈویژن کا نام لکھنے کی بجائے اس کے دائرہ کار میں یہ لفظ لکھے گئے کہ اس کا دائرہ کار یا Jurisdiction ریگولیشن کے مطابق ہوگی۔ یہ ایکٹ 4 مارچ 1975 کو پاس ہوا اور ابوبکر غزنوی کو جو انجینئرنگ یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے تھے، وائس چانسلر مقرر کیا گیا اور رجسٹرار کے طور پر انجینئرنگ یونیوسٹی ہی سے چودھری حسن محمد کو OSD کے طور پر بلایا گیا اور یونیورسٹی کو چلانے کے لیے چانسلرز کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہاں پر یہ بتانا ضروری ہے کہ اس یونیورسٹی کو پہلے ایک مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا۔ ایکٹ نافذ ہونے کے بعد محکمہ تعلیم لاہور کی جانب سے یہ تاثر دیا گیا کہ اسلامیہ یونیورسٹی کے ذریعے صرف پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات لیے جائیں گے لہٰذا یہ تدریسی سطح پر تعلیمی اداروں کا الحاق نہیں کرسکتی۔ جب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو بہاول پور آئے تو ڈاکٹر ابوبکر غزنوی نے ان سے خصوصی ملاقات کی اور شکوہ کیا کہ اسلامیہ یونیوسٹی کو محض ثانوی امتحانی باڈی کے طور پر لیا جارہا ہے جب کہ ہمیں الحاق اور تدریسی امور بھی دیئے جائیں۔ وزیراعظم نے موقع پر موجود وزیراعلیٰ نواب صادق علی قریشی کو فوراً ایکشن لینے کی ہدایت کی اور وزیرتعلیم عبدالخالق نے اسلامیہ یونیورسٹی کو مکمل یونیورسٹی بنانے کا اعلان کیا لہٰذا اسلامیہ یونیورسٹی نے 1976 میں بی اے کا پہلا امتحان لیا اور پنجاب یونیورسٹی میں موجود امیدواروں کا ریکارڈ یہاں منتقل کیا گیا۔

ڈاکٹر ابوبکر غزنوی اور ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کے ادوار میں یونیورسٹی کے نئے کیمپس کے لیے زمین کے حصول کا معاملہ شروع ہوا۔ اس مقصد کے لیے بہت سی جگہیں دیکھی گئیں۔ لاہور سے ٹاؤن پلاننگ کے ماہرین بلائے گئے مگر معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔ نصیر احمد ناصر کے بعد پروفیسر عبدالقیوم قریشی 20 نومبر 1978ء کو بطور وائس چانسلر آئے۔ اس وقت تک یونیورسٹی کے خدوخال واضح ہو چکے تھے یا یوں کہہ لیں کہ یونیورسٹی نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کر دیا تھا مگر ابھی ایک طویل اور مسلسل جدوجہد اور محنت کی طالب تھی۔ قوموں اور اداروں کی زندگی میں کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جو اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ان کی تعمیر و ترقی کچھ اس انداز سے حرز جان بنا لیتے ہیں کہ کم از کم عرصے میں وہ ادارے اس حوالے سے طویل سفر طے کر لیتے ہیں۔ غیر جانبداری سے تجزیہ کیا جائے تو اسلامیہ یونیورسٹی کے ضمن میں پروفیسر عبدالقیوم قریشی کا نام بڑے وثوق سے لیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے چند ایسے بنیادی کام کیے کہ جن کی بنیاد پر یونیورسٹی کی ترقی کا ارتقائی عمل تیز تر ہوگیا۔ انہوں نے حکومت سے بغداد الجدید کیمپس کے لیے مفت زمین کا کیس منظور کرایا۔ یہ کیمپس 11250 ایکڑ پر مشتمل ہے۔ یہ تمام زمین ریت کے ٹیلوں پر مشتمل تھی اور صحرا میں بستی بسانا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس کی ہمواری اور ڈویلپمنٹ میں اتنا بجٹ درکار ہوتا ہے کہ اس سے ایک بہتر زمین پر ایک بہت بڑی یونیورسٹی تعمیر کی

جا سکتی ہے۔ ابتدائی طور پر ان کی اس تجویز کو پسند نہیں کیا گیا اور اس وقت کوئی شخص سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ آئندہ کچھ سالوں تک یہاں واقعی ایک نیا منظر ہوگا۔ اس منصوبے پر عمل درآمد اتنا آسان نہیں تھا۔ اس کے لیے ماسٹر پلان تیار کیا گیا اور یونیورسٹی میں ترقیاتی امور سے متعلق شعبوں کا اجراء عمل میں لایا گیا۔ یہ ایک منصوبہ ہی یونیورسٹی میں ان کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ قریشی صاحب کا اپنا ایک انتظامی اسلوب تھا جسے وہ اختیار کرنے پر مصر تھے۔ کئی معاملات میں ان کا رویہ یونیورسٹی کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور جمہوری نہیں تھا ، یہاں سے یونیورسٹی میں اختلافات کا دور شروع ہوتا ہے جو ایک نونہال یونیورسٹی کی لیے بعد میں بہت نقصان دہ ثابت ہوا اور حالات ایسے ہوئے کہ عبدالقیوم قریشی کو اپریل 1981 میں جانا پڑ گیا۔

ان کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ معاشیات کے سربراہ ڈاکٹر رفیق احمد کو وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ سنڈیکیٹ ابھی قائم نہیں ہوئی تھی اور وائس چانسلر کمیٹی ہی سنڈیکیٹ اور سینٹ دونوں کا کام کر رہی تھی جو نامزد ارکان پر مشتمل تھی۔ ترقیاتی حوالے سے نئے وائس چانسلر کا دور عبدالقیوم قریشی کے دور کا تسلسل تھا۔ یونیورسٹی کی عمومی فضا پرسکون تھی اور یہ ادارہ اپنی تدریسی شناخت بنانے کی جدو جہد کر رہا تھا۔ یونیورسٹی ابھی تک ریلوے روڈ کیمپس اور عباسیہ کیمپس تک محدود تھی۔ جدید یونیورسٹی کے قیام کو اب تک دس سال ہو چکے تھے۔ بغداد الجدید کیمپس کا ایک مشکل خواب شرمندہ تعبیر ہو رہا تھا۔ تمام اہم مضامین کے شعبے تدریس میں مشغول تھے۔ اس یونیورسٹی کی تیار کردہ کھیپ بہاول پور ڈویژن کے کالجوں میں آ چکی تھی۔ ان میں اکثر یونیورسٹی ہی میں تدریسی زندگی کا آغاز کر چکے تھے۔ بیرون ملک وظائف پر ڈاکٹریٹ کے لیے جانے والوں کی معقول تعداد بھی واپس آ چکی تھی۔ علمی ادبی روایت بہتر انداز میں ارتقا پذیر تھی۔ سٹاف میں سینئر و جونیئر ہونے کی نفسیاتی کشمکش بھی لاشعور میں جاگزین ہو چکی تھی جو اساتذہ کے رویوں کی تشکیل میں ایک اہم عامل کے طور کارفرما تھی۔ گویا ان دس سالوں کے درمیان اسلامیہ یونیورسٹی نے ایک طویل سفر طے کر لیا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اداروں کی مستحکم روایات کے قیام میں وقت کا بہت بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ کوئی ادارہ جتنا پرانا ہوگا اتنا ہی اس کی روایات پختہ ہوں گی اور اس کا کلچر بہت مضبوط بنیادوں پر قائم ہوگا۔ ان دس سالوں کے دوران کے تیز تر عمل میں یہ یونیورسٹی بظاہر ایک معقول تعلیمی کلچر پیدا کر چکی تھی لیکن اس کی تشکیل میں درکار وقت صرف نہ ہونے کی وجہ سے کئی سطحوں پر کمزور (grey) ایریا بھی تھے مگر ان کا اظہار ابھی نہیں ہوا تھا۔

ڈاکٹر رفیق احمد پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے تو وہاں کے ڈین اورینٹل لرننگ اور عربی کے پروفیسر ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک نے یہاں وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالا۔ ان کے دور میں عبدالقیوم قریشی کے دور سے شروع ہونے والے منصوبے پایہ تکمیل کو پہنچے اور یونیورسٹی میں ایک نئے دور کا آغاز اس حوالے سے ہوا کہ آرٹس، سائنس اور اسلامک تینوں فیکلٹیز کی عمارتوں کی تکمیل کے بعد بہت سے شعبہ جات کو وہاں منتقل کیا گیا اور گویا ایک بڑے کیمپس کے اضافے کے ساتھ اب یونیورسٹی تین کیمپس پر مشتمل تھی اور تینوں کیمپس کے

درمیان ٹرانسپورٹ کا خاطر خواہ انتظام کر دیا گیا۔ ان کے دور میں شجر کاری کے کام کو اور آگے بڑھایا گیا۔ اکتوبر 1988ء میں ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک رخصت پر چلے گئے تو یونیورسٹی کے اپنے تدریسی عملے میں سے سب سے سینئر استاد شعبہ کیمیا کے چیئرمین ڈاکٹر مصباح العین نے چارج سنبھالا جنہیں بعد میں 26 اپریل 1989 سے باقاعدہ وائس چانسلر بنا دیا گیا۔ گویا اب یونیورسٹی کی باگ ڈور اسلامیہ یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے فرد کے ہاتھ میں تھی۔ اس سے جہاں فائدے ہوئے وہاں پر سٹاف میں مختلف سطحوں پر کشمکش کا امکان بھی ظاہر ہوا۔ ہر یونیورسٹی کی اپنے علاقے اور کلچر کے امتیاز سے اقدار تشکیل پاتی ہیں۔ سٹاف کی باہمی کشمکش ہر یونیورسٹی میں پائی جاتی ہے مگر یہ چیز نقصان دہ اس وقت ہوتی ہے جب یونیورسٹی کی تشکیل پذیر تعلیمی اقدار متاثر ہونے لگتی ہیں اور اس میں بنیادی کردار سربراہ جامعہ کا انتظامی رویہ اور اسلوب ہوتا ہے۔ پہلے وائس چانسلر تقریباً باہر سے آتے رہے، یہ پہلے وائس چانسلر تھے جن کا تعلق اس یونیورسٹی سے تھا لہٰذا وہ یونیورسٹی اور علاقے کی ضروریات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ ڈاکٹر مصباح العین سائنس کے استاد ہونے کے باوجود ایک بہتر علمی بصیرت اور ادبی ذوق کے حامل تھے اور ان کا رویہ اور طرز گفتگو اور اس کا معیار خاصی حد تک وائس چانسلر کے عہدہ سے ہم آہنگ تھے۔

15 جون 1993ء کو ڈاکٹر مصباح العین کی تقرری کسی اور محکمے میں کر دی گئی اور ڈاکٹر محمد بلال سکھیرا چیئرمین شعبہ فزکس نے وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالا تو ان کے پیشرو کے دور میں در آنے والی گروہی سیاست اپنے عروج پر تھی۔ ان کا انتظامی اسلوب اور رویہ ان کے مزاج سے ہم آہنگ تھا۔ وہ حمایت یا مخالفت دونوں انتہاؤں پر جانے کا غالب رجحان رکھتے تھے لہٰذا عدالتی لڑائیاں اور اساتذہ کی گروہی کشمکش اسی طرح جاری رہی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اداروں کو کام کرتے رہنا چاہیے۔ ان کی ترقی کا عمل متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ اب تک یونیورسٹی میں تمام بنیادی کام ہو چکے تھے اور یونیورسٹی اپنا تشخص و مقام بنا چکی تھی اور آگے کا سفر جاری تھا۔ ان کی ٹرم ختم ہونے کے بعد 15 اگست 1997ء کو شعبہ کیمسٹری کے سابق اور شعبہ فارمیسی کے اس وقت کے سربراہ ڈاکٹر شفیق احمد وائس چانسلر مقرر کیے گئے۔ ان کا تعلق بھی اسی یونیورسٹی سے تھا۔ وہ جس ماحول میں آئے اس وقت سٹاف کی گروہ بندی جاری تھی۔ انہوں نے اپنی پالیسی اور طرز عمل میں گروہی اور ذاتی انداز اختیار کیا اور یونیورسٹی کی اہم باڈیز خصوصاً سنڈیکیٹ اور ایڈوانس سٹڈیز بورڈز اور سب کمیٹیوں کو اسی انداز میں چلایا۔ ان کے دور میں عدالتی لڑائیوں کو بھی فروغ ملا اور مبینہ طور پر مخالف گروپ کے ارکان کو کارنر کرنے کی ہر کوشش کی گئی۔ اس سے یونیورسٹی کی مجموعی فضا بھی متاثر ہوئی تاہم تعمیر و ترقی کا عمل بھی جاری رہا۔ ان کی ٹرم ختم ہونے کے بعد سینئر اساتذہ میں وائس چانسلر کا عہدہ حاصل کرنے کی جنگ شروع ہوگئی۔ آخر کار 2001ء میں شعبہ شماریات کے پروفیسر اور چیئرمین ڈاکٹر منیر اختر نے بطور وائس چانسلر جوائن کیا۔ وہ اس یونیورسٹی کے پہلے استاد ہیں جو اس یونیورسٹی میں بطور لیکچرار شماریات آئے اور اس عہدہ تک پہنچے۔ انہوں نے

اپنی افتادِ طبع کے مطابق امن و آشتی کی فضا قائم کرنے کے مشکل کام کا آغاز کیا۔ چوں کہ وہ اس یونیورسٹی سے بطور لیکچرار وابستہ ہوئے اس لیے تہذیبی اور معاشرتی سطح پر وہ سٹاف سے ذاتی تعلقات رکھتے تھے اور ہر سٹاف ممبر کی صلاحیتوں کے بارے میں اپنے بہتر ربط کی وجہ سے ایک رائے رکھتے تھے لہٰذا یہ بات ان کے کریڈٹ میں جاتی ہے کہ انہوں نے عدالتی لڑائیوں اور سٹاف کی گروہی کشمکش کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اعتماد کی فضا قائم کرنے کا آغاز کیا۔ اس یونیورسٹی کی ایک بدقسمتی رہی ہے کہ جب ایک دور کے گروہ کا نمائندہ وائس چانسلر بنا تو سبکدوش ہونے والے وائس چانسلر کا گروہ حزب مخالف بن گیا اور ڈاکٹر مصباح العین سے ڈاکٹر شفیق احمد کے دور تک یہ انتہائی ناپسندیدہ صورت حال موجود رہی۔ ڈاکٹر منیر اختر کے دور میں دونوں گروپ خاصی حد تک خاموش اور پرسکون نظر آئے۔ اگرچہ اس دور میں بھی کہیں کہیں شخصی یا گروہی فیصلوں کا رنگ نظر آتا رہا مگر مجموعی طور پر مصالحت کی پالیسی اپنانے سے یونیورسٹی کی تعلیمی، معاشرتی اور انتظامی فضا پہلے کے مقابلے میں کہیں بہتر محسوس کی گئی۔ ہر سٹاف ممبر کے ساتھ ان کا بہتر رابطہ دیکھنے کو ملا۔

2005 میں ڈاکٹر بلال اے خاں وائس چانسلر مقرر ہوئے تو اساتذہ کی گروپ بندی بظاہر ختم ہو گئی البتہ باہمی تعصبات برقرار رہے۔ چوں کہ یہ ایک نیوٹرل سربراہ تھے اور انہوں نے اپنے تجربات، ترجیحات ,تصورات اور بصیرت (Vision) کے مطابق یونیورسٹی کے امور کو نپٹانا شروع کیا۔ وہ پرانے اور گھاگ قسم کے بیوروکریٹ تھے اس لیے انہوں نے اپنے اور یونیورسٹی کے تدریسی اور غیر تدریسی عملے کے درمیان فاصلہ رکھا۔ گذشتہ روایت کے برعکس ان سے صرف وقت لے کر ہی ملا جا سکتا تھا۔ کسی کو سخت بات کرنا ہوتی تو اس ضمن میں ادھار اور انتظار کے قائل نہیں تھے۔ انسانی وسائل کی تنظیم (HRM) کا ان کا اپنا تصور تھا لہٰذا سب سے پہلے انہوں نے انتظامی سطح پر شعبہ امتحانات، رجسٹرار، اکاؤنٹس اور ان سے وابستہ دفاتر کی تنظیم نو کی۔ وہ غیر تدریسی پوسٹوں کے لیے سلیکشن بورڈ کے قائل نہیں تھے۔ ان کا ایک اپنا ہی طریقِ کار تھا۔ جہاں کوئی ان کو کسی کا ٹیلنٹ پسند آ گیا، اسے تقررنامہ تھما دیا۔ تدریسی سٹاف کے ساتھ تعلقات میں شخصیت، صلاحیت اور اپنی پسند کو مقدم رکھتے۔ ان کے دور میں بغداد کیمپس میں آڈیٹوریم کمپلیکس کو درآمدہ بہترین فرنیچر مہیا کیا۔ عباسیہ اور بغداد کیمپس میں داخلی دروازے تعمیر کرائے جو خوبصورت فنِ تعمیر کے نمونے ہیں۔ بغداد کیمپس کے تمام رقبے کے گرد اگرد ریز روائر کی تنصیب کرائی اور ٹھیکری پہرے کا بندوبست کیا۔ انجینئرنگ کالج ان کے دور میں مکمل ہوا، فیکلٹیز کی تنظیم نو کی۔ فیکلٹی ڈینز اور شعبوں کے سربراہوں سے اجلاسوں کی صورت اجتماعی رابطہ رکھا۔ مضبوط اعصاب کے باعث دوسروں کے اعصاب سے کھیلنا ان کا وطیرہ رہا۔ اپنے بیوروکریٹک ہنر سے اپنی مقررہ مدت سے دس ماہ تک کا عرصہ مزید گزار گئے۔

سہ ماہی جریدہ "الزبیر" میں "اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی میں ڈیپوٹیشن" کے عنوان سے شائع شدہ مضمون میں شعبہ فارسی کی حد تک تفصیلاً لکھ چکا ہوں۔ اسی تحریر میں اسلامیہ یونیورسٹی پر طویل گفتگو بھی کر چکا

ہوں لیکن یہاں یونیورسٹی کے حوالے سے چند مشاہدات کا ذکر کر رہا ہیں۔ میں نے یونیورسٹی کا حصہ بن کر یونیورسٹی کے اندر کے ماحول کو ظاہری تصور سے ہٹ کر پایا۔ یونیورسٹی میں باہمی تعلق اور دوستیاں بھی ہوتی ہیں۔فکری اختلافات بھی پائے جاتے ہیں مگر زیادہ تر گروہی تعلقات کی بنیاد یونیورسٹی کی سیاست اور اگلے گریڈ میں پروموشنز اور سیلیکشن پر ہوتی ہے۔اختیارات کی رو سے وائس چانسلر کو" گھنٹہ گھر" کہا جا سکتا ہے۔ ابتدا کے چند سال سے قطع نظر جب پہلی تین فیکلٹیز تدریسی سٹاف کے لحاظ سے مکمل ہو گئیں اور اساتذہ کے اگلے گریڈز میں سلیکشن کا وقت آیا تو وائس چانسلرز نے اس معاملے میں اپنی پسند کے اساتذہ کو ترجیح دینے کا آغاز کیا جس سے وائس چانسلر کے حمائتی اور مخالف اساتذہ کے دو گروہ وجود میں آ گئے ۔ یہ بات اساتذہ کے باہمی تعلقات پر بھی اثر انداز ہوئی۔ یوں یونیورسٹی ایسی ریاست کی صورت اختیار کر گئی کہ جہاں وائس چانسلر کے حمائتیوں کا گروہ حزب اقتدار اور مخالفین کا گروہ حزب اختلاف کہلایا جانے لگا حتیٰ کہ یونیورسٹی کی اکیڈیمک سٹاف ایسوسی ایشن میں وہی امیدوار جیتنے لگے جن کا تعلق "حزب اقتدار" سے ہوتا۔اگلے چار سال کے بعد نیا وائس چانسلر مخالف گروہ سے آ جاتا اور حزب اقتدار حزب مخالف میں بدل جاتی۔اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات میں نے یہ دیکھی کہ جب مقتدر وائس چانسلر کے بارے میں یقین ہو جاتا کہ انہیں توسیع نہیں ملے گی اور مخالف گروپ کا وائس چانسلر ہی آئے گا تو چار سال کی مدت کے آخری چھ ماہ کے دوران چند اساتذہ مخالف گروپ میں شامل ہو جاتے اور موجود وائس چانسلر کے خلاف باتیں کرنا شروع کر دیتے، اگرچہ مخالف گروہ کو اخلاقی مدد کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی مگر اپنا گروہ چھوڑ کر آنے والوں کی آمد اس بات سے مشروط ہوتی کہ انہیں اگلے گریڈ میں سلیکشن دی جائے گی۔ میں ایسے اساتذہ کو جانتا ہوں کہ وہ اسی فارمولے کے تحت لیکچرار سے پروفیسر کے درجے تک پہنچے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹر رفیق احمد کو وائس چانسلر کے طور پر لایا گیا۔اس وقت تک سنڈیکیٹ وجود میں نہیں آئی تھی اور چانسلرز کمیٹی ہی کم کرتی رہی۔ان کے بعد لاہور ہی سے ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک آئے۔ان کے دور میں گروہ بندی نے جڑیں پکڑیں بل کہ مسلک کا تڑکا بھی لگا۔ان کو چند ماہ قبل رخصت پر جانا پڑ گیا۔آئندہ برسوں کے دوران اسلامیہ یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے چار وائس چانسلر آئے۔ پہلے تین کے دور میں سٹاف کی گروہ بندی اور پسند ناپسند عروج پر رہی۔ چوتھے وائس چانسلر ڈاکٹر منیر اختر جو یونیورسٹی میں بطور لیکچرر آئے تھے، اس عہدے پر پہنچے۔ان کے دور میں البتہ فضا اتنی جارحانہ نہ رہی۔ پہلے چار سربراہ مسلسل سنڈیکیٹ سے بلیک میل ہوتے رہے۔اس ضمن میں ایک ذاتی تجربہ پیش کرتا ہوں۔ڈاکٹر بلال سکھیرا جب مجھے صدر شعبہ فارسی کے طور پر ڈیپوٹیشن پر لائے تو پہلے سے موجود مولانا منیر احمد اور ان کے سرپرست اور معاون گروپ کو یہ بات پسند نہ آئی اور پہلے دن ہی سے انہوں نے ان پر کم از کم صدر شعبہ کا اختیار واپس کرنے کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔کافی دیر تک وہ ٹالتے رہے۔مولانا منیر احمد کے ہم مسلک، سرپرست اور مربی ڈاکٹر رؤوف ظفر نے ڈاکٹر سکھیرا کا ناطقہ بند کیا ہوا تھا مگر وہ ہاتھ میں نہیں آ رہے

تھے۔فیکلٹی آف اسلامک لرننگ کے ڈین ڈاکٹر یوسف فاروقی کی بات بھی سکھیرا صاحب نے نہیں مانی، آخر کار یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (اب ہائرایجوکیشن کمیشن) میں اہم عہدے پر فائز ڈاکٹر یوسف فاروقی کے قریبی عزیز اور اسلامیہ یونیورسٹی سنڈ یکیٹ کے ممبر ڈاکٹر محمود احمد غازی سے سنڈ یکیٹ کے اجلاس میں دباؤ ڈلوایا گیا۔اس موضوع پر اجلاس میں کافی بحث ہوئی اور شعبے کی ترقی کی دلیل بھی دی گئی جسے کسی نے اہمیت نہ دی۔آخر سنڈ یکیٹ کے اس ممبر نے ذاتی سطح پر درخوست کر دی تو وائس چانسلر کو گھٹنے ٹیکنے پڑے۔سکھیرا صاحب نے غصے میں آ کر شعبہ فارسی کو اسلامک لرننگ فیکلٹی سے نکال کر آرٹس فیکلٹی میں شامل کرنے کے آرڈر کر دیے مگر ان کی مدت ختم ہونے کے بعد یہ مسئلہ لائق توجہ نہ رہا۔ڈاکٹر بلال اے خاں کے پانچ سال کے دوران فضا یکسر بدل گئی۔انہیں ملنے کے لیے نیچے سے ڈین تک کو ٹائم لینا پڑتا تھا اور بعض اوقات انتظار کی قطار میں بھی لگنا پڑتا تھا۔وہ بہت بولڈ انسان تھے اور اپنی مرضی کے فیصلے کرنے پر قادر تھے۔مگر انہوں نے اپنا آفیشل کلچر پیدا کرنے کی کوشش کی۔یونیورسٹی کے بہت سے معززین ان کی سفاکی کے شکار ہوتے نظر آئے۔انہوں نے یونیورسٹی کے نامکمل انفراسٹرکچر کو مکمل کیا۔بیس کے قریب ڈپٹی رجسٹرار اور ڈپٹی کنٹرولرز کو قابل توسیع کنٹریکٹ پر بھرتی کرلیا جس سے یونیورسٹی ملازمین ان کے خلاف ہوگئے مگر کچھ کر نہ سکے۔2008 کے دوران میں ایک خالی سیٹ پر تین سال کے لیے سنڈ یکیٹ کا ممبر مقرر ہوا تو میں نے بہت سے مناظر دیکھے۔اس فرعون صفت وائس چانسلر کو سنڈ یکیٹ کے اجلاسوں میں روہانسا ہوتے بھی دیکھا۔ایک اجلاس میں لاہور ہائیکورٹ کے بہاول پور بنچ کے ایک جج ممبر تھے۔اس وقت تک بلال اے خاں کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔موجودہ قائم مقام وائس چانسلر ڈاکٹر نوید اختر ایسوسی ایٹ پروفیسر کی سیٹ پر سنڈ یکیٹ کے ممبر منتخب ہو کر آئے، یہ ان کا پہلا اجلاس تھا۔وہ ایجنڈے کی مکمل تیاری کر کے آئے تھے۔انہوں نے دوران اجلاس کوئی نکتہ اعتراض اٹھایا تو بلال اے خاں ان کو پڑ گئے کہ آپ سنڈ یکیٹ کا اجلاس سبوتاژ کرنا چاہتے ہیں۔جج صاحب کو پہلے کسی نے بریف کر دیا۔اجلاس شروع ہوا تو بلال اے خاں نے اپنا روایتی انداز اپنایا تو جج صاحب نے کہنا شروع کیا، " آپ اپنے آپ کو عقل کل سمجھتے ہیں، آپ میں اکڑ کس چیز کی ہے، میں آپ کی اکڑ نکالتا ہوں، میں اجلاس کا بائیکاٹ ک) ر کے جا رہا ہوں اور میں اپنی رپورٹ چیف جسٹس کو بھجوادوں گا۔'' ڈاکٹر بلال اے خاں پر گویا اوس پڑ گئی اور وہ بیک فٹ پر چلے گئے اور سنڈ یکیٹ میں ان کے حواریوں نے جج صاحب کی منتیں کرنا شروع کر دیں اور وہ جو ایجنڈے کی کاپی کو اپنے بریف کیس میں ڈال کر اور اسے بند کر کے جانے کے لیے اٹھے مگر منتوں اور ترلوں پر ان کا دل "پسیج" گیا۔اس کے بعد بلال اے خاں کی اکڑی نکل چکی تھی اور تمام اجلاس میں وہ انتہائی لو پروفائل رہے۔ہم سے گاڑیوں کی چابیاں پارکنگ کے مسئلے کی وجہ سے لے لی گئیں اور اجلاس کے اختتام کے بعد جب میں گھر پہنچا تو میری ڈگی میں دو آموں کی پیٹیاں موجود تھیں جو وائس چانسلر کی ہدایت پر ہر ممبر کی گاڑی میں رکھوائی گئیں تھیں۔ان کے بعد ڈاکٹر محمد مختار (بھارہ) آئے اور پہلے اجلاس ہی میں انہوں نے

پالیسی بیان دیا کہ سابق ریاست بہاول پور کی سرزمیں کے بیٹے (Son of soil) ہیں اور خدمت کے جذبے سے معمور ہیں۔ انہوں نے اپنے پالیسی بیان میں یہ بھی کہا کہ سرکلر روڈ پر کمشنر ہاؤس کے ساتھ واقع پر تعیش کیمپ آفس، گارڈز کی فوج ظفر موج اور کاروں کے فلیٹ کو صرف کم از کم ضرورت کے مطابق رکھیں گے۔ ایک ماہ گزرنے پر "سرزمین بہاول پور کے سپوت" نے اپنے پالیسی بیان سے رجوع کر لیا اور دوسرے وائس چانسلروں سے زیادہ سہولتوں اور ٹھاٹھ باٹھ سے مستفید ہوتے رہے۔ ڈاکٹر اسلم ادیب کے پاس رجسٹرار کا اضافی چارج تھا لہٰذا انہوں نے پہلا اجلاس قرینے سے ایجنڈے کے مطابق چلایا۔ اسی اجلاس میں پہلے وی سی کے دور کے سنڈیکیٹ کے آخری دو متنازع اجلاسوں کے منٹس کی روشنی میں کیے گئے فیصلوں پر چار رکنی کمیٹی قائم کی جس کا میں بھی ممبر تھا۔ اس انکوائری کمیٹی نے تین ماہ کی محنت شاقہ سے چالیس صفحات پر مشتمل انکوئری رپورٹ تیار کی اور دونوں اجلاسوں کے منٹس کے مطابق کیے گئے فیصلوں کا تین چوتھائی حصہ غیر قانونی قرار پایا۔ انہوں نے یونیورسٹی کیلنڈر میں بیان کیے گئے قوانین کی دھجیاں اڑائی تھیں۔ سیٹیں موجود نہیں تھیں اور نہ ان سیٹوں کی چانسلر سے منظوری حاصل کی گئی۔ خود ہی آسامیاں منظور کر کے بھرتیاں کر لی جاتیں۔ مثلاً ایک صاحب نے لیکچرر کے لیے درخواست دی، اسے ایسوسی ایٹ پروفیسر بنا دیا، کراچی کے ایک صاحب نے یونیورسٹی سے پوچھا کہ میرا انٹرویو کب ہے، ڈاک میں ملنے والے خط پر لکھا تھا۔ "اسے کہا جائے کہ میں خود کراچی آ رہا ہوں اور وہیں پر ان کا انٹرویو لے لیا جائے گا۔" کمیٹی نے یونیورسٹی ضابطوں اور قوانین کی کسوٹی پر ہر اقدام کو پرکھا اور اپنی رپورٹ تیار کی۔ میری پوسٹنگ یزمان میں تھی مگر میں نے انکوائری کے حوالے سے کسی قسم کا قانونی معاوضہ وصول نہیں کیا۔ موجودہ انچارج وائس چانسلر ڈاکٹر نوید اختر کمیٹی کے سربراہ تھے جنہوں نے فائنل انکوائری رپورٹ وائس چانسلر کے حوالے کی جسے انہیں نے میز کی دراز میں رکھ لیا۔ اس دوران جب بلال اے خاں کو انکوائری رپورٹ جمع ہونے کی خبر ملی تو انہوں نے پیش بندی (Pre-emption) کے طور پر وائس چانسلر کو انتقامی کارروائی کیے جانے پر قانونی نوٹس بھیج دیا جس سے ان کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر محمد مختار کے ایک خیر خواہ دوست اور سنڈیکیٹ کے ایک ممبر جو خود کسی پبلک یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، نے یہ نصیحت نما مشورہ دیا کہ اس انکوائری رپورٹ کو مسترد کر دیں، اگر آپ نے اس مسئلے کو ہوا دی تو آپ کی مدت ختم ہونے پر آپ کے خلاف بھی انکوائریوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا، یوں محنت سے تیار کی گئی اس انکوائری رپورٹ کو غائب کر دیا گیا۔ باقی رہے اللہ کا نام۔

اب ہر وائس چانسلر کے دور کی بجائے 2025 کے دوران گذشتہ 22 سال کے دوران کیے جانے والے اقدامات کے نتائج کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ 1975 کے سال جب اسے چارٹر یونیورسٹی کا مقام ملا، سے لے کر اگلے 30 سال تک کے مقابلے میں آج اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور سوفی صد سے کہیں زیادہ ترقی کر کے پاکستان کی یونیورسٹیوں میں بالخصوص اور علمی سطح پر بالعموم اپنی

شاندار شناخت قائم کر کے انفرا سٹرکچر کے لحاظ سے جدید ترین یونیورسٹی کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ 22-2021 اور 23-2022 کی سالانہ رپورٹوں اور 2022 اور 2013 کے پراسپیکٹس کی حد تک اس وقت یونیورسٹی کے بہاول پور ڈویژن میں کل سات کیمپس ہیں۔ 1- بغداد الجدید کیمپس، 2- عباسیہ کیمپس، 3- خواجہ فرید کیمپس، 4- بہاولنگر کیمپس۔ (اپنی عمارت و 22 شعبہ جات)، 5- رحیم یار خان کیمپس (اپنی عمارت و 32 شعبہ جات)، 6- احمد پور شرقیہ کیمپس (اپنی عمارت اور 26 شعبہ جات) 7- لیاقت پور کیمپس (اپنی عمارت۔ 26 شعبہ جات)۔ 23-2022 کے دوران 15 فیکلٹیز اور تین یونیورسٹی کالجز کے 142 شعبہ جات میں کل وقتی اساتذہ کی تعداد 800 پی ایچ ڈی سمیت کل 1400 تھی۔ جب کہ 1335 جز وقتی سٹاف اس سے وابستہ تھے۔ کل طلبا و طالبات کی تعداد 65341 تھی جو بیچلر، ایم ایس وایم فل اور پی ایچ ڈی سطح کے کل پروگرام بالترتیب 132، 118 اور 55 میں زیر تعلیم تھے۔ باقی انفرا سٹرکچر میں 8 بیچلر ہوسٹل، 21 سٹوڈنٹ ہوسٹل، 202 رہائش گاہیں برائے یونیورسٹی سٹاف اور 72 بسوں اور کوسٹرز کا فلیٹ اور گیسٹ ہاؤس شامل ہیں۔ یونیورسٹی انتظامیہ کی جدید خطوط پر تنظیم نو کے بعد تمام متعلقہ شعبوں کو 21 ڈائریکٹریٹس اور ڈویژنوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔-2022 اور 2023 کی سالانہ رپورٹوں اور پراسپیکٹس میں یونیورسٹی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ جدید عصری تقاضوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ 2022 تک تین اور 2023 سے دو شفٹوں کی تعلیم و تدریس سے طلبا کی تعداد میں جو اضافہ ہوا وہ اس سے قبل دیکھا نہ سنا گیا۔ انتظامیہ نے بظاہر ترقیاتی منصوبوں پر بہت زور دیا مگر یونیورسٹی کا تعلیمی کلچر مستحکم ہونے کی بجائے کمزور ہوا۔ انڈر گریجویٹ، گریجوایٹ، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی فیسوں کے نرخ بہت زیادہ ہیں، ان گروپس کی آرٹس اور سائنس کے مضامین میں بالترتیب ایک سمیسٹر کی اندازے کے مطابق اوسط فیس 50 ہزار، 70 ہزار اور 90 ہزار ہے جب کہ دس فیصد سالانہ شرح اضافہ بھی ہے۔ ماضی میں پبلک یونیورسٹیوں کی فیسوں کا یکساں تعین ہائر ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کیا کرتا تھا۔ اب یونیورسٹیاں سنڈیکیٹ کے ذریعے سیاہ سفید کی مالک ہیں۔ طلبا کی جتنی تعداد بڑھا دی گئی یونیورسٹی کا انفرا سٹرکچر اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ نظم و ضبط اتنا کمزور ہے کہ ایک فرضی سکینڈل کے غبارے نے داخلوں میں بہت زیادہ کمی کر دی۔ تجربہ گاہیں بنیادی سامان سے محروم ہیں اور طلبا کو اپنی جیب سے کیمیکلز خریدنے پڑتے ہیں۔ ایک ہی قسم کی تجربہ گاہیں رکھنے والے شعبہ جات میں ایک دوسرے کی تجربہ گاہیں استعمال پر پابندی ہے۔ کمپیوٹنگ فیکلٹی کے شعبہ جات سہولتوں کے لحاظ سے یورپ کا مقابلہ کرتے ہیں مگر دیگر شعبہ جات کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ٹرانسپورٹ کا موجودہ حجم اتنا کم ہے کہ بسوں کی چھتوں پر اور بسوں کے ساتھ لٹکے سٹوڈنٹس نظر آتے ہیں۔ رہائشی طلبا کے لیے ہوسٹلیں اتنی کم ہیں کہ صرف 50 فیصد طلبا و طالبات ہی جگہ حاصل کر سکتے ہیں۔ باقی شہر کی خود ساختہ نجی ہوسٹلوں میں رہائش رکھنے پر مجبور ہیں۔ اس مسئلے نے شہر کے معاشرتی ڈھانچے کو بہت متاثر کیا ہے اوپر سے یونیورسٹی کو ورثے میں ملنے والے بہت بڑے مالی واجبات کے

بوجھ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ 2025 کی پہلی سہ ماہی کے دوران تک مالی طور پر یونیورسٹی کی حالت بہت پتلی ہو چکی ہے اور اسے سنبھلنے میں وقت لگے گا۔ پنشنوں اور ریگولر تنخواہوں کا ایک چوتھائی حصہ ادا کیا جا رہا ہے۔ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ والی کیفیت ہے۔

1995 میں میرے سمیت نواز کاوش، اسلم ادیب اور نجیب جمال نے چولستان فورم کی بنیاد رکھی۔ یہ اس گروپ کا کارنامہ تھا جس کی کسی قدر تفصیل بتانا ضروری ہے۔

علمی و ادبی چولستان فورم' بہاول پور کی طویل علمی، ادبی اور تہذیبی تاریخ کا ایک ایسا سنگ میل ہے جس کے ذکر کے بغیر یہاں کی ادبی و علمی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ یہ یہاں کی 65 سالہ ادبی سرگرمیوں کا تسلسل بھی ہے اور ان سب سے منفرد اور مختلف بھی کیوں کہ اس نے ماضی کے برعکس خود کو صرف ادبی سرگرمیوں کے لیے محدود نہیں رکھا بل کہ یہاں کی فکری اور معاشرتی زندگی کو بھی موضوع بنایا ہے۔ بہاول پور کے ادبی منظر پر متعدد فورم اور ادبی تنظیموں کی تاریخ بہت پرانی ہے مگر چولستان فورم کی طرح بھرپور انداز اور تسلسل کے ساتھ موجود نہیں رہیں، چولستان فورم کے قیام کو تیس سال کا عرصہ ہونے کو ہے اور یہ غیر معمولی مستقل مزاجی سے یہاں کی ادبی اور علمی تاریخ کا نیا باب رقم کر رہا ہے۔ 1995 کے نصف اول میں ماضی کے برعکس بہاول پور میں قابل ذکر ادبی سرگرمیوں کا فقدان تھا۔ سرکاری ادارہ ''بہاول پور آرٹس کونسل'' کبھی کبھار کسی علمی تقریب کے انعقاد سے منجمد ادبی ماحول میں ارتعاش پیدا کر لیتا تھا۔ 1995ء کے دوران ڈاکٹر نجیب جمال ملتان سے بہاول پور آ چکے تھے۔ ڈاکٹر اسلم ادیب، نواز کاوش اور راقم پہلے سے موجود تھے۔ ان لوگوں نے چولستان فورم کے قیام کا تصور پیش کیا۔ دو تین نشستوں میں فورم کے خدوخال واضح کر لیے گئے اور مقامی شاعروں اور ادیبوں سے رابطہ کر کے انہیں اس میں شامل کرنے پر قائل کر لیا اور اس کی تنقیدی نشستوں کے لیے پریس کلب کی مرکزی جگہ کا انتخاب کیا۔ پریس کلب کے عہدیداروں نے ایک ادبی اور علمی تنظیم کی حوصلہ افزائی کے لیے پریس کلب کے استعمال کی باقاعدہ اجازت دے دی اور چولستان فورم کا پہلا اجلاس 20 ستمبر 1995ء کو ایک مذاکرے کی صورت میں منعقد ہوا جس میں ''موجودہ دور میں ادب کا جواز'' کے موضوع پر بحث کی گئی۔ اس اجلاس میں بہاول پور کے ادیبوں شاعروں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اور اس مذاکرے میں ہونے والی گفتگو میں موجودہ عہد میں ادب کے جواز کو ثابت کر کے ''چولستان فورم'' کے قیام کے جواز کو تسلیم کیا گیا اور اس تنظیم سے شاندار اور بہترین توقعات وابستہ کی گئیں۔

اس ضمن میں یہ بات بنیادی اہمیت کی حامل ہے کہ جب ''چولستان فورم'' کی تشکیل کے وقت اس کے دائرہ کار کا تعین کیا گیا تو طے پایا کہ چولستان فورم صرف ادبی سرگرمیوں تک محدود نہیں ہوگا بل کہ اس کے ساتھ ساتھ علمی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا فروغ بھی اس کی تشکیل کے بنیادی مقاصد میں شامل ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ اس کا نام چولستان ادبی فورم کی بجائے چولستان فورم تجویز کیا گیا اور گذشتہ تمام عرصے کے دوران اس

کی کارکردگی کو دیکھیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کی تشکیل کے مثبت مقاصد کی خاصی حد تک تکمیل ہوئی اور اس ادبی تنظیم کے تحت جہاں تنقیدی، شعری نشستیں، ادیبوں کے ساتھ شاموں کا انعقاد، مرحوم شعرا اور ادیبوں کی یاد میں ادبی ریفرنس اور ادبی موضوعات پر مذاکرے منعقد ہوئے وہاں اس فورم کے تحت علمی، سائنسی اور ثقافتی موضوعات پر لیکچر، مذاکرے اور فنکاروں کے ساتھ شاموں کا شاندار سلسلہ بھی نظر آتا ہے اور ان تمام سرگرمیوں میں متوازن ادبی و علمی روایات کو پیش نظر رکھا گیا اور تمام علمی وادبی حلقوں میں ان سرگرمیوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا، تمام لوگوں نے چولستان فورم کے انداز اور معیار کی دل کھول کر تعریف کی۔ علاوہ ازیں وقتاً فوقتاً چولستان فورم کے اجلاس ایسی بحثوں کے لیے بھی مختص کیے گئے جن میں اس فورم کی کارکردگی کو خوب سے خوب تر بنانے میں تمام شرکا سے مشاورت کی گئی اور ان سرگرمیوں اور اقدامات کی روشنی میں یہ فورم صرف چند افراد کا فورم نہ رہا بلکہ تمام اہل علم اور اہل ذوق اس فورم کو اپنی علمی وادبی شخصیت کا ناگزیر حصہ تصور کرنے لگے۔ مستقل عبارت پر مشتمل ایک دعوت نامہ تحریر کر لیا گیا جس میں پروگرام اور تاریخ کی جگہ خالی رکھی گئی۔ اس دعوت نامے میں خالی جگہ پر کر کے اس کی فوٹو کاپیاں کرالی جاتیں۔ کل کی بات لگتی ہے جب میں اور نواز کاوش ان کو ہر اہم ادیبوں وشاعروں کے گھروں میں تقسیم کرتے پھرتے تھے۔ گھر بند ہونے کی صورت میں ان کے دروازوں کے نیچے سے دعوت نامہ اندر سرکا دیتے۔ ایک خاص مدت تک دعوت ناموں کا یہ سلسلہ جاری رکھا گیا مگر اس فورم کے معیار اور باقاعدگی میں اس قدر اضافہ ہوا کہ دعوت ناموں کی تقسیم کی روایت ختم ہوگئی اور صرف پروگرام کا اعلان ہی کیا جاتا رہا۔ شرکا از خود اس کے ہفتہ وار اجلاسوں میں شرکت کرنے لگے۔

چولستان فورم کی کامیابی میں اس نکتے کو بنیادی اہمیت حاصل رہی کہ اس میں زیر بحث آنے والے موضوعات کے لیے مکمل علمی رویے کو اختیار کیا گیا اور مباحث کا ایسا معیار قائم ہوا جسکی گونج ملک کے معروف ادبی مراکز میں بھی سنی گئی۔ اس کی رکنیت کے لیے روایت سے انحراف کر کے شرکت ہی کو معیار بنایا گیا۔ اس کے تحت مقامی ادبی ٹیلنٹ کی حوصلہ افزائی کی گئی اور اس طرح بہت سے ادیب وشاعر دریافت ہوئے یا بطور شاعر وادیب ان کی واضح شناخت قائم ہوئی اور اس ادبی تنظیم نے جو علمی وادبی فضا قائم کی اس سے بیشتر شاعروں اور ادیبوں کا تخلیقی عمل متحرک ہوا۔ مقامی تخلیق کاروں کے ساتھ ساتھ دیگر شہروں بشمول ملتان، اسلام آباد، لاہور اور کراچی سے بہاول پور آنے والے شاعروں ادیبوں اور سکالرز کے ساتھ نشستوں کا اہتمام کیا گیا حتیٰ کہ بیرون ملک سے بہاول پور تشریف لانے والے غیر ملکی سکالرز کے لیکچرز کا اہتمام بھی کامیابی کے ساتھ کیا جاتا رہا۔

چوں کہ چولستان فورم کے قیام کا بنیادی مقصد علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا فروغ تھا لہٰذا مقامی اداروں اور تنظیموں کا تعاون بھی حاصل کیا گیا جس میں آرٹس کونسل اور بزم اہل قلم بہاول پور شامل ہیں۔ آرٹس کونسل کے تعاون سے ایک محفل موسیقی اور روایتی ''شب شعر'' کی بجائے ''شام افسانہ'' کا انعقاد کیا گیا جس

میں پانچ افسانہ نگاروں نے افسانے پیش کیے جب کہ معروف سکالرز نے اردو افسانہ نگاروں اور بہاول پور کے افسانوی ادب پر گفتگو کی۔ بزم اہل قلم کے تعاون سے متعدد شعری نشستوں کا اہتمام کیا گیا۔ جہاں تک ثقافتی سرگرمیوں کا تعلق ہے تو اس ضمن میں مقامی فنکاروں کے ساتھ موسیقی کی محفل سجانے کے علاوہ ریڈیو پاکستان بہاول پور کے پروگرام منیجر جناب اکرم شاد کے خصوصی لیکچر ''خواجہ خورشید انور ایک عہد ساز اور رجحان ساز موسیقار'' کا انعقاد کیا گیا۔ اسی طرح ایسے موضوعات جو خالصتاً علمی، سائنسی اور فنی نوعیت کے تھے، ان پر بھی لیکچرز اور مباحث کو رواج دیا گیا جن میں برطانیہ کی مانچسٹر یونیورسٹی سے تشریف لانے والے پروفیسر ایلکس رابرٹسن کا لیکچر ''برطانیہ نظام تعلیم کے آئینے میں''، پروفیسر ٹونی بشم کا ''برطانیہ میں تحقیق کا معیار'' اور میڈم گبرئیل کا ''تھیوری آف بگ بینگ'' پر خصوصی لیکچر شامل تھے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر نصر اللہ خان ناصر کا خصوصی لیکچر ''خطہ بہاول پور کا تاریخی سفر''، ڈاکٹر جاوید اقبال کے'' کی ہول سرجری''، اور ''کلوننگ'' پر لیکچرز خصوصی اہمیت کے حامل تھے بل کہ کی ہول سرجری کے ویڈیوز بھی دکھائے گئے۔ فورم میں باقاعدگی سے مختلف ادبی، فکری اور معاشرتی موضوعات پر متعدد مذاکروں کا اہتمام کیا گیا۔ ان مذاکروں میں ایسے موضوعات بھی زیر بحث آئے جو ہماری اجتماعی نفسیات میں خلاف معمول تصور کیے جاتے ہیں۔ ان پر گفتگو کی علمی سطح کے باعث یہ معمول کے موضوع بن کر سامنے آئے۔ چولستان فورم میں ہونے والی گفتگوؤں اور مباحث کو کبھی متنازع نہیں بننے دیا گیا اور نہ ہی مناظرے کی کیفیت پیدا کی گئی۔ اس کے ہفت وار اجلاسوں میں شرکت کرنے والے شعراء، ادیبوں اور دیگر شرکا کو بلا امتیاز عزت و احترام دیا جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ چولستان فورم کے پہلے 100 اجلاس مکمل ہونے پر سرکٹ ہاؤس میں نوجوانوں کے خصوصی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ قیام سے لے کر اب تک چولستان فورم کے کریڈٹ پر متعدد شعری نشستیں، شامیں، لیکچرز، کتب کی رونمائی کی تقاریب، مقامی ادبی اداروں کے ساتھ مل کر تقاریب کا انعقاد اور ان کے ساتھ باہمی تعاون کی فضا کو فروغ دینا، جیسے اقدامات شامل ہیں۔ چولستان فورم کے اجلاس تواتر کے ساتھ پریس کلب کے ہال میں ہوتے رہے۔ وہاں جب پریس کلب کی عمارت کا مسئلہ پیدا ہوا تو پریس کلب کو شفٹ کر دیا گیا لہٰذا دو سے تین ماہ تک فورم کے اجلاس نہ ہو سکے۔ بعد میں سنٹرل لائبریری میں یہ سلسلہ شروع کیا گیا مگر لائبریری کی انتظامیہ کے عدم تعاون کے باعث وہاں دو ماہ تک اجلاس جاری رہ سکے جس کے بعد ٹیکنیکل ہائی سکول کے لائبریری ہال میں اجلاسوں کا سلسلہ شروع کیا گیا جو 2010 تک جاری رہا۔ پھر نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس کے ماڈل ٹاؤن اے کیمپس بہاول پور کا انتخاب کیا گیا جہاں یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ہر شاعر و ادیب کی خواہش ہوگی کہ مستقبل میں بھی چولستان فورم اسی طرح اپنا متحرک کردار ادا کرتا رہے۔

اس بیس سال کی مدت کے دوران میں نے بہاول پور میں معاشرتی سطح پر ایک متحرک اور فعال

زندگی گزاری۔ مختلف دوستوں کے ساتھ انفرادی اور اور فیملی کی سطح کے تعلقات کو اخلاص اور اخلاق کی بنیاد پر قائم رکھا۔ اگرچہ یہاں منتقل ہونے سے پہلے ہی بہاول پور میں میرے دوست موجود تھے اور انہوں نے مجھے کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیا البتہ دوستوں کی اکثریت کا تعلق تدریس ہی سے تھا۔ حاصلپور اور یزمان کے ڈگری کالجوں میں بطور پرنسپل پوسٹنگ کے دوران سب رفقائے کار سے کم یا زیادہ دوستی ہی کا تعلق قائم رہا۔ پھر تعلیمی بورڈ اور یونیورسٹی میں جو مختلف ذمہ داریاں ملتی رہیں ان کے دوران بھی ہر متعلقہ فرد سے اخلاقی سطح پر اچھے تعلقات قائم ہوئے۔ میں نے بیک وقت ان تعلقات کو بھی نبھایا اور تدریسی، انتظامی اور مختلف اداروں کی ذمہ داریوں کو بھی نیک نیتی اور جوش وجذبے سے سرانجام دینے کی انسانی اختیار کی حد تک کوششیں کیں۔ بورڈ کی پہلی ذمہ داری کمیٹی آف کورسز کے اجلاس میں شرکت تھی۔ سید اسرار حسین شاہ بحیثیت سیکریٹری بورڈ اس اجلاس کی صدارت کرتے تھے۔ اس میں تمام امتحانات اور مضامین کے پرچہ سازوں، صدر اور نائب ممتحنوں کی تقرریوں کی سفارشات مرتب کی جاتی تھیں۔ ابتدا سے اس ضمن میں ایک ہی کمیٹی یہ کام کرتی تھی۔ بعد میں تمام ڈویژن سے مختلف مضامین کے ایک ایک استاد کو اس کام کے لیے ایک ہی دن بلانا شروع کیا گیا اور بورڈ کے ہال میں تمام لوگ اکٹھے ہوتے اس طرح ڈویژن بھر کے کالج اساتذہ سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ بورڈ کے امتحانات میں نقل کرتے ہوئے پکڑے جانے والے امیدواروں کے کیسز کا فیصلہ کرنے کے لیے مختلف ڈسپلنری کمیٹیاں تشکیل دی جاتی تھیں۔ میں بھی ان کمیٹیوں کا ممبر رہا۔ میری کوشش ہوتی کہ کیس ثابت ہو جانے پر ایسے طلبا کے مستقبل کو بچانے کے لیے کوئی معمولی سی سزا تجویز کروں پھر بھی طلبا کے متعلقین اور خود بورڈ کے اندر سے بہت سفارشیں کی جاتیں۔ بورڈ میں تبدیلی نام و تاریخ پیدائش کا بورڈ کیلنڈر میں ایک طے شدہ طریقِ کار ہے جس سے تجاوز کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ میں اس کمیٹی کا کئی بار رکن اور چیئرمین رہا۔ اس کے لیے بھی اندر اور باہر سے بہت سفارشیں آتیں لیکن متعلقہ طریقِ کار کو اپنانا بھی لازمی تھا۔ اس میں انسان کا رویہ بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ ایک تو میں کمیٹی کے اجلاس کی فضا کو خوشگوار رکھتا تھا دوسرے دوستانہ رویے سے لوگ مطمئن ہو جاتے باقی فیصلہ تو بہر حال بورڈ کے قوانین کے مطابق ہی ہوتا۔ جب میں ای ڈی او ایجوکیشن بہاول پور تھا تو بلحاظ عہدہ بورڈ کا ممبر بھی تھا، بورڈ کی بجٹ کمیٹی اور بھرتی و ترقی کمیٹی کا ممبر بھی رہا۔ بورڈز میں جب مرکزی نشان زدگی (Centeralized Marking) کا آغاز ہوا تو پہلے پہل تو اس مقصد کے لیے بورڈ کے بڑے ہال اور ضمنی امتحان کی مارکنگ کے لیے میٹنگ ہال کو استعمال کیا جاتا رہا جس میں ڈویژن بھر کے اساتذہ اپنے اپنے مضامین کے پرچوں کی جانچ کے لیے آتے۔ بعد میں پہلے ضلعی اور پھر تقریباً ہر تحصیل ہیڈکوارٹرز کو مرکزی مارکنگ کا مرکز بنایا جانے لگا۔ ان دنوں دوستوں اور اساتذہ سے باہمی میل جول عروج پہ ہوتا۔ پنجاب کے تمام بورڈز کو ملا کر ایک بورڈز کمیٹی قائم تھی جس کی چیئرمین شپ باری باری ہر بورڈ کو ملتی تھی اور اس دوران بورڈز کے ہر قسم کے اجلاسوں کی میزبانی اور فیصلوں کا اجرا میزبان بورڈ کے ذریعے ہی ہوتا۔ 2000 کے بعد

سائنس کے مضامین اور 2006 سے دیگر مضامین کی پرچہ سازی کا طریقِ کار تبدیل کر دیا گیا۔ ہر بورڈ کو تین سے چار مضامین کی پرچہ سازی کی ذمہ داری تفویض کر دی جاتی جہاں پنجاب بھر کے متعلقہ مضامین کی پرچہ سازی کے لیے تین سے چار دنوں تک یکساں تاریخوں میں ان مضامین کے پرچہ ساز اس بورڈ میں اکٹھے ہوتے۔ یہ تاریخیں عموماً پرچہ اے اور بی کے لیے بالترتیب دسمبر اور جنوری کے پہلے ہفتے کے دوران رکھی جاتی۔ پہلی بار یعنی 2006 میں پنجابی، فارسی، کیمسٹری اور شماریات کے مضامین ڈیرہ غازی خان کو ملے اس لیے پہلے سال میں اپنی گاڑی میں دیگر تین مضامین کے دوست اساتذہ کو بھی لے کر گیا۔ میں نے اور پنجابی کے چودھری محمد افضل نے وہاں کی پاکیزہ ہوٹل کے وی آئی پی بلاک میں قیام کیا۔ اگرچہ اصولی طور پر چاروں دن بورڈ میں آ کر پرچہ سازی کرنی ہوتی مگر پہلے دن کی حاضری کے بعد ہوٹل ہی میں پرچہ سازی کی اجازت مل گئی بل کہ آئندہ برسوں میں یہ ایک روایت بن گئی کہ پہلے دن بورڈ میں حاضری دے کر سٹیشنری وصول کی جاتی اور پرچہ سازی کا کام اپنی ہوٹلوں ہی میں کیا جانے لگا۔ میزبان بورڈ کی حدود میں واقع کالجوں میں سے ایک سینئر استاد کو اپنے اپنے مضمون کا کوارڈینیٹر بنا دیا جاتا۔ عموماً دو دنوں کی مسلسل محنت سے پرچے تیار کیے جانے کے بعد کوارڈینیٹر کو جمع کرا دیے جاتے۔ ہر بورڈ تین پرچوں کی اصل و آفس کا پیاں بنواتا جب کہ لاہور بورڈ پانچ کا پیاں بنواتا۔ اس طرح ہر مضمون کے کوارڈینیٹر کے پاس مہر بند کل انتیس پرچے جمع کرائے جاتے۔ اب کوارڈی نیٹر کو بھی پتا نہیں چل سکتا تھا کہ کونسا پرچہ کس نے بنایا ہے اور کس کا بنایا ہوا پرچہ کس لفافے میں ہے۔ وہ تمام پرچوں یا لفافوں میں سے ہر بورڈ کے لیے تین پرچوں کو ایک نئے لفافے میں ڈال کر مہر بند کرتا۔ اس طریقے سے کسی کو کچھ معلوم نہ ہو پاتا کہ کس کا پرچہ کس بورڈ کو گیا۔ صرف متعلقہ بورڈ کے چیف سیکریسی آفیسر کو بوقت چھپائی ہی معلوم ہوتا جو کسی ابہام کی شکل میں متعلقہ استاد سے رابطہ کر سکتا تھا مگر ایسا کم ہی دیکھا گیا۔ بہر حال دو دن کے بعد ہر استاد پرچہ جمع کرانے کے بعد گھر واپس دوڑنے کی کوشش کرتا۔ مضمون کے رابطہ کار بعد میں بورڈ کا جاری کردہ حاضری سٹیفکیٹ ہر استاد کو بھیج دیتا۔ تین سال تک ہم تمام ڈیرہ غازیخان بورڈ جاتے رہے۔ وہاں پر خواجہ فرید کالج رحیم یار خان کے دور کے ایک رفیق کار، دوست اور گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازیخاں میں بیالوجی کے استاد جناب امین الدین (المعروف سائنسدان) سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے وہاں کی مچھلی کی معروف ہوٹل میں مزید اڈنر کی بھی میزبانی کی۔ گورنمنٹ کالج خان پور میں پرانے رفیق کار اور شماریات کے استاد نجیب ملغانی سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کا سسرال خان پور میں ہے۔ ان کی ایک بیٹی ڈاکٹر نتاشا نجیب جب قائداعظم میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھیں تو ان سے ملاقات سنٹرل لائبریری بہاول پور میں ہوئی جہاں چیف لائبریرین رانا جاوید اقبال نے ان سے متعارف کراتے وقت کہا کہ یہاں ایم بی بی ایس کر رہی ہیں مگر انہیں کتب کے مطالعے کا بھی بہت شوق ہے جس کے لیے لائبریری آ جاتی ہیں۔ لٹریچر کا بہترین ذوق رکھتی ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ہمارے دوست کی صاحبزادی ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ کا

ننھیال خان پور میں ہے جس کی انہوں نے تصدیق کی۔ تیسرے سال کی پرچہ سازی کے دوران ایک دن بورڈ نے گاڑی فراہم کی تا کہ دلچسپی رکھنے والے اساتذہ مٹھن کوٹ میں خواجہ فرید کا مزار دیکھ سکیں۔ خواجہ غلام فرید سرائیکی ثقافت و ادب اور روحانیت کا ایک غیر معمولی استعارہ ہیں۔ یہ دورہ بہت دلچسپ رہا۔ مزار پر دعائے مغفرت کے بعد محفل سماع منعقد کی گئی۔ ہمیں روایتی چادریں پہنائی گئیں۔ خواجہ فرید میوزیم بھی تفصیلاً دیکھا جس کی تصاویر اور ویڈیو فلم میرے پاس محفوظ ہیں۔ اس کے بعد کھانے سے تواضع کی گئی۔ ہم سب کی بڑی خواہش تھی کہ چوں کہ وہاں سے دریائے سندھ نزدیک تھا اور اس کے قریب نواب کا دیا گیا تحفہ دخانی قسم کی کشتی یا اب نا قابل استعمال بہت ہی چھوٹا بحری جہاز موجود تھا اسے بھی دریائے سندھ کے کنارے دیکھ لیں مگر ڈرائیور اور کچھ ساتھیوں نے دیر ہو جانے کا بہانہ بنایا اور ادھر نا جا سکے۔

2009 میں چیئرمین کمیٹی کی سربراہی اور میزبانی بہاول پور بورڈ کے پاس تھی۔ میں نے اپنے ایک افسر دوست سے کہا کہ اس سال چوں کہ پرچہ سازی کی سکیم آپ تیار کریں گے تو پرشین والے گروپ کے لیے فیصل آباد کا بورڈ الاٹ کر دیں تا کہ اس بہانے جدید فیصل آباد کو اچھی طرح دیکھ لیں گے۔ اس طرح 2009 سے 2011 کے تین سال فیصل آباد بورڈ میں پرچے سیٹ کرنے گئے مگر اب یہ روایت بن چکی تھی کہ پہلے دن آ کر حاضری لگاؤ، مضمون کے رابطہ کار سے اپنی فائل لو اور بے شک شہر میں ہوٹل یا جہاں قیام ہو، آخری تاریخ سے پہلے پرچوں کے مہر شدہ لفافے رابطہ کار کے پاس جمع کراؤ، سابقہ یا ایڈوانس حاضریاں لگاؤ اور پھر اپنے اپنے گھر یا شہر لوٹ جاؤ۔ اس طرح یہ تین سال فیصل آباد کی میزبانی میں گزر گئے۔ مجھے سہولت یہ تھی کہ میرا بیٹا وجاہت نسیم جو کارپوریٹ سیکٹر کی ایک معروف فرم میں تھا، ملتان اور فیصل آباد ریجن اس کے پاس تھے لہٰذا میری پرچہ سازی کے دنوں میں وہ ٹور پروگرام رکھ لیتا، مجھے فیصل آباد میں سرینا ہوٹل میں رکھتا جہاں میں اپنا کام بھی کرتا اور فیصل آباد کی سیر بھی کراتا۔ اس سے اگلے تین سال یعنی 2012 تا 2014 تک کے لیے فارسی کے گروپ کی پرچہ سازی بہاول پور بورڈ کے حصے میں آ گئی۔ اس طرح میں ایک پرچے میں پرچہ ساز تھا تو دوسرے پرچے میں رابطہ کار۔ تمام پرچہ ساز بہاول پور آئے اور مجھے ان کی میزبانی کا موقع ملا۔ فیصل آباد سے ڈاکٹر منیر جہاں اور ان کی فیملی اور بچوں نے میرے گھر قیام کیا۔ نزدیکی شہروں مثلاً ساہیوال، ملتان کے دوست فائلیں لے کر گھر چلے گئے، کچھ نے بہاول پور ہی میں قیام کیا اور چار دنوں کے اختتام پر تمام پرچے میرے سپرد کر دیے گئے جنہیں متعین طریقِ کار کے تحت ترتیب دے کر بورڈ کی سیکریسی برانچ میں جمع کرا دیا۔ 2013 میں بھی اسی طرح ہوا۔ سیکریسی برانچ کے شفیق الرحمان اور مشتاق وڑائچ بہت مدد اور تعاون کرنے والے دوست تھے۔ تیسرے سال 2014 کو پرچہ سازی سے پہلے 13 نومبر کو میں بہاول پور سے ترک سکونت کر کے لاہور منتقل ہو گیا۔ یہ سب کچھ تفصیل سے لکھنے کا بنیادی مقصد یہ بتانا ہے کہ بہاول پور رہ کر کالج کی انتظامی اور تدریسی زندگی کے دوران اپنی کالج اساتذہ کی برادری سے متعدد مواقع پر آشنائی سے لے کر

دوستی کا سفر طے کیا اور طرح طرح کے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔

اب بہاول پور کے چند دوستوں کا ذکر ہو جائے۔ آغاز آٹھ دوستوں کے گروپ سے کرتا ہوں۔

منور جمیل قریشی (شاعر، ادیب): 1987 کے آخر میں اسلامیہ یونیورسٹی میں شعبہ فارسی کے بورڈ آف سٹڈیز کے اجلاس کے لیے بہاول پور آنا ہوا تو اتنا سریع رفتار اطلاعاتی نظام تو تھا نہیں۔ پہلے سے فون پر اطلاع دینے کا ذریعہ انتہائی محدود تھا لہٰذا مہمان اپنے کسی دوست کے پتہ پر اسے ملنے پہنچ جاتا تھا۔ اب یہ مہمان کا مقدر تھا کہ میزبان اسے گھر پر دستیاب ہوتا تھا یا نہیں۔ سیٹلائیٹ ٹاؤن میں مجھے اپنے میزبان کے گھر کی تلاش تھی کہ کمرشل ایریا میں مجھے یونیورسٹی میں زیر تعلیم رحیم یار خان کے شاگرد مل گئے سو ان کی معاونت میں گھر کی تلاش کی تو مطلوبہ میزبان عدم موجود پایا گیا۔ ان طلبا نے مجھے بغداد کیمپس میں اپنے ہوسٹل چلنے کی دعوت دی جو کسی رد و کد کے بغیر قبول کر لی گئی۔ غالباً یونیورسٹی بس کے انتظار میں کمرشل ایریا کے پوائنٹ پر کھڑے تھے کہ طلبا نے ایک ایسے موٹر سائیکل کی طرف اشارہ کیا جس پر ایک صاحب اور ایک خاتون پر مشتمل جوڑا سوار تھا۔ بغیر پوچھے ہی انہوں نے وضاحت کی کہ ان صاحب کا نام "منور جمیل قریشی" ہے اور پیچھے بیٹھی "لڑکی" کا نام "نوشی گیلانی" ہے، دونوں شاعر ہیں، منور جمیل استاد ہیں اور خاتون ان کی شاعری میں شاگردی کے مقام پر فائز ہے اور شہر میں اسی حالت میں اکثر دیکھے جاتے ہیں اور شہر سے باہر کہیں بھی مشاعرہ ہو تو دونوں اکٹھے جاتے ہیں۔ خلقت خدا کہتے پائی گئی ہے کہ دونوں کا تعلق استاد شاگرد سے سوا ہے۔ اس کے بعد شائد کسی ڈائجسٹ میں ان کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون پڑھنے کو ملا جس میں ان کے ہندوستان کے کسی مشاعرے میں شرکت کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی کے دور کے ہمارے ایک دوست سعید ظفر کا بھی ذکر تھا اور مضمون نگار نے مضمون لکھتے وقت ایک "دل جلے" کا کردار ادا کیا تھا۔ ادیبوں شاعروں کے آپس کے ادبی مناقشے ہوتے ہیں مگر وہ مضمون غیر ادبی اور "بدتمیزی" کا شاہکار تھا لہٰذا جلد ذہن سے محو ہو گیا۔

1994 میں بہاول پور میں منتقل ہوا تو ایک دو ہفتے کے بعد میں سرائیکی چوک کی مارکیٹ میں واقع کارواں بک سنٹر کا چکر ضرور لگاتا تھا۔ ایسے ہی ایک روز میں وہاں تھا تو ایک اور صاحب بھی وہاں پر موجود تھے جو کتابوں کو دیکھنے کے میرے شوق کا مشاہدہ کرتے پائے گئے۔ کاؤنٹر پر بیٹھے سعد خاں نے ان صاحب کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ان کو جانتا ہوں، میں نے نفی میں جواب دیا تو بتانے لگے کہ یہ بہاول پور کے معروف شاعر منور جمیل ہیں۔ اس دوران میں نے موٹے شیشوں سے جھانکتی ہوئی دو آنکھوں کو اپنی طرف مائل دیکھا۔ وہ آگے بڑھے، ہاتھ ملایا اور کہا، منور جمیل قریشی، میں نے اپنا تعارف کرایا۔ یہ ان سے میری پہلی ملاقات تھی۔ آئندہ ایک سال کے دوران سرکٹ ہاؤس میں دو تین تقاریب میں جانے کا اتفاق ہوا جنہیں منور جمیل نے ترتیب دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خود پیچھے رہ کر دوستوں کو آگے رکھتے ہیں۔ منور جمیل نے "قلم قبیلہ" کے نام سے ایک ادبی تنظیم قائم کی تھی جس نے عرش صدیقی کی کتاب "باہر کفن سے پاؤں" کی

تقریب رونمائی 6 ستمبر 1978 کومنعقد کی۔ 1979 میں کل پاکستان مشاعرہ کرایا۔ کتب کی رونمائی، مختلف علمی و ادبی موضوعات پر مذاکروں اور ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ شامیں منانے کے علاوہ قلم قبیلہ کے کریڈٹ پر تین روزہ" کل پاکستان ظہورنظر کانفرنس" ہے جو 23 تا25 اکتوبر 1985 کومنعقد ہوئی جس کی گونج دور دور تک سنی گئی۔ اس کانفرنس میں تینوں دن نوشی گیلانی نے سٹیج سنبھالے رکھا جس سے پہلی بار وہ ادبی افق پر نمودار ہوئیں۔ چند بڑی سطح کے مشاعرے کے علاوہ 1981 سے "سائبان" کے نام سے ادبی مجلّے کی اشاعت کا آغاز کیا جس کے نصف درجن سے زائد شمارے شائع ہوئے۔ جب مرتضی برلاس بہاول پور کے کمشنر بنے تو قلم قبیلہ کو مہمیز ملی۔ منور جمیل کی شاگرد "شاعرہ" بھی مقامی اور قومی شعری منظر نامے پر ابھر کر سامنے آئیں۔ جب مجھ سمیت ڈاکٹر نواز کاوش، ڈاکٹر نجیب جمال اور ڈاکٹر اسلم ادیب نے "ستمبر 1995 میں "چولستان فورم" کی داغ بیل ڈالی تو چند ماہ کے بعد منور جمیل بھی اس کا حصہ بن گئے۔ سرکٹ ہاؤس میں فورم کے تحت متعدد تقاریب کے انتظامی معاملات منور جمیل اپنے ذمے لے لیتے۔ ایک بار انہوں نے مجھے بتایا کہ چند دوست جن کے نام وہ منکشف نہیں کر سکتے، مجھ پر بہت اعتماد کرتے ہیں اور کسی بھی ادبی تقریب کے اخراجات کے لیے بلاحیل و حجت بہت تعاون کرتے ہیں۔ 2003 کے دوران انہوں نے چولستان فورم کے زیر اہتمام "سائبان انٹرنیشنل" کے نام سے ایک معیاری پرچہ ایسے ہی ذرائع کی کفالت سے شائع کیا۔

جس دور میں ان سے میری ملاقات ہوئی اس وقت منور جمیل کے زیر تربیت نشاط مسعود سے نوشی گیلانی تک کا سفر کرنے والی شاعرہ کا شعری مجموعہ "محبتیں جب شمار کرنا" شائع ہو چکا تھا اور اس کی مختلف شہروں میں تقاریب رونمائی بھی منعقد کی گئیں بل کہ اسلام آباد میں منعقدہ ایک ایسی تقریب میں چار وفاقی وزرا کی شرکت بھی بتائی جاتی ہے۔ اس کے بعد منور جمیل کا مجموعہ "دیکھو یہ میرے زخم ہیں" شائع ہوا۔ اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بطور استاد نشاط مسعود کی تقرری میں بھی منور جمیل کا کردار تھا۔ 1994 میں جب وہ مشاعرہ پڑھنے امریکہ گئیں تو ان کی ایکس پاکستان لیو کی منظوری بھی انہیں کی دلچسپی سے ہوئی۔ پھر اس شاعرہ کا مجموعہ "اداس ہونے کے دن نہیں" اشاعت پذیر ہوا۔ اس کے بعد ان دونوں کے تعلقات میں ایسی دراڑ آئی کہ ان کے باہمی تعلقات کی نوعیت اور وجوہات معاشرتی اور ادبی حلقوں کا مرغوب موضوع بن گیا۔ منور جمیل کو میں نے اس موضوع پر لب کشائی کرتے نہیں دیکھا۔ کچھ مخلص دوستوں بشمول ڈاکٹر اسلم ادیب نے صلح جوئی کی مخلصانہ اور کچھ نے نیم دلانہ کوششیں کیں مگر زیادہ تر نے تماشا دیکھنے پر اکتفا کیا۔ کس کا کتنا قصور تھا، اب یہ بحث لا حاصل ہے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ منور جمیل جیسی تہذیبی شخصیت کی اس واقعے کے بعد کی شاعری بھی ''اسی'' کے گرد ہی گھومتی رہی۔ وہ کبھی بھی اس کے مابعد اثرات سے نہ نکل سکے حتیٰ کہ ان کو تنہائی کے عفریت اور بے حس معاشرے کی لاپرواہی نے نگل کر موت کے سفر پر روانہ کر دیا۔ البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ اپنے دوست ادیبوں کے اعزاز میں ادبی تقاریب منعقد کرتے رہے مگر ان کی زندگی میں ان کے اعزاز

میں منعقدہ کوئی بڑی تقریب مجھے یاد نہیں۔

ڈاکٹر محمد اسلم ادیب۔(ماہر تعلیم، افسانہ نگار، نقاد) ڈاکٹر اسلم ادیب کی جس طرح کی شخصیت ہے اس کو لفظوں میں جکڑنا اتنا آسان نہیں ہے۔ جو شخص داڑھ کے شدید درد کو درد کُش دوا کی بجائے "مراقبے" سے دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، جسے اپنے مخاطب مجمعے کو بیک وقت رلانے اور ہنسانے پر ملکہ حاصل ہو، اختلاف کرنے والے کو دلائل سے ادھ موا کرنے پر قادر ہو، ایسی شخصیت کو تحریر کے جن میں بند کیا جانا خاصا مشکل ہے۔ اگر میں ایک ہی جملے میں اس کی شخصیت بیان کرنا چاہوں تو اتنا کہنا بھی کافی ہے کہ وہ جلال و جمال کی ایک مخلوط صورت ہیں۔ ہم دونوں نے دو مختلف تعلیمی اداروں سے ایک ہی سیشن میں ایم اے کیا۔ یہ اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں چلے گئے اور میں کالج کیڈر سے وابستہ ہو گیا۔ مجھے ان سے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے شعبہ اردو کے سیشن فیلو ڈاکٹر شفیق احمد نے ایک سفر کے دوران متعارف کرایا۔ ان دونوں نے اکٹھے شعبہ اردو میں اپنے تدریسی سفر کا آغاز کیا۔ اسلامیہ یونیورسٹی کا یہ ابتدائی دور تھا جب نئے استاد رکھے جا رہے تھے تاہم مختلف شعبوں کے سربراہ دوسری یونیورسٹیوں کے سینئیر یا ریٹائرڈ اساتذہ کو معاہدے کی بنیاد پر لیا جاتا تھا۔ شعبہ اردو میں اورینٹل کالج لاہور کے شعبہ اردو کے سینئیر استاد ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کو لیا گیا جو ڈاکٹر شفیق احمد کے براہ راست استاد تھے۔ باہمی فکری بُعد کے باعث یہ دونوں استاد، رفیق کار تھے، دوست نہیں تھے۔ ڈاکٹر شفیق احمد کا اپنا مزاج اور ترجیحات تھیں جب کہ اسلم ادیب لبرل انداز فکر، اپنے تدریسی اسلوب سے شاگردوں پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت اور کسی بھی بحث میں دلیل کے ساتھ غالب آنے کے اوصاف رکھتے تھے۔ ان دونوں ہمکاروں کے درمیان بڑھتے ہوئے مغالطے اور اختلافات مبینہ طور پر اسلم ادیب کی ایڈہاک استاد کے طور پر برخاستگی پر منتج ہوئے۔ انہوں نے ایک باہمت شخص کی طرح اس دھچکے کو برداشت کیا اور اپنی خودداری بھی برقرار رکھی۔ بے روزگاری کی بحرانی کیفیت میں انہیں اور کچھ عرصہ بعد ان کے دوست احمد فاروق مشہدی کو ایجوکیشن کے مضمون میں برطانیہ کی یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کا وظیفہ مل گیا اور دونوں دوست آگے پیچھے پی ایچ ڈی کرنے چلے گئے۔ اسلم ادیب جب ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد واپس آئے تو وہ ایک مختلف انسان تھے گویا ان کی کایا کلپ ہو چکی تھی۔ یو کے سے پی ایچ ڈی کر کے انہوں نے وہ حاصل کر لیا جس کا دس فیصد بھی یہاں سے نہیں مل سکتا تھا۔ وہ جدید اور وسیع تر فکر اور ویژن کے حامل ایک بہترین استاد کا درجہ حاصل کر چکے تھے جس کے لیے اسلامیہ یونیورسٹی میں ایجوکیشن یا علم التعلیم کا شعبہ متعارف کرایا گیا جس کو ڈاکٹر صاحب نے جدید خطوط پر استوار کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ان کا شعبہ یونیورسٹی کا معیاری اور داخلے کے لحاظ سے پرہجوم شعبہ بن گیا۔ اس شعبے نے نئی تعلیمی اقدار اور تدریسی و معاشرتی معیار سے روشناس کرایا۔ ڈاکٹر صاحب کو انگریزی بولنے پر دسترس حاصل تھی اور اس شعبہ میں مختلف سیمینار اور خصوصی لیکچر کے لیے غیر ملکی ماہر اساتذہ نے آنا شروع کر دیا۔ شعبے میں بڑے پیمانے پر سالانہ تقریب کی روایت کا آغاز کیا گیا۔ ڈاکٹر

صاحب جنون کے ساتھ اور منظّم انداز سے کام کرتے تھے جس سے ان کے کام کی رفتار بڑھ جاتی۔ شعبے کی تدریسی سٹاف میں وہی استاد ان کی قربت حاصل کر سکتے تھے جن کے فکری معیار اور استعداد کی فریکوئینسی ان سے ملتی تھی۔ جو اساتذہ اس معیار پر پرکھے جانے پر معترض تھے انہوں نے اپنی لابیوں کے ذریعے ایجوکیشنل ٹریننگ کا شعبہ الگ قائم کرالیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایجوکیشن کی فیکلٹی قائم کرائی اور ریلوے روڈ کیمپس سے براہ راست بغداد کیمپس میں ایجوکیشن فیکلٹی کی عمارت میں شفٹ ہوئے۔ بظاہر یہ سخت اور ٹف نظر آنے والا شخص اپنے دوستوں کی مشکلات اور تکالیف میں ان کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ ایک بہترین افسانہ نگار اور نقاد ہیں، چولستان فورم میں لوگ خاص طور پر انہیں سننے آتے تھے۔ اب کچھ مختلف باتیں کہ کسی کو بھی ان کے مزاج اور ردعمل میں اتار چڑھاؤ کی کیفیات کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ ان کی بات کو ان کے تناظر میں نا سمجھ سکنے سے آپ ان کی طرف سے سخت جملے بھی سماعت کر سکتے ہیں۔ ان کے کام کرنے کی رفتار اور معیار سے مسلسل عدم ہم آہنگی ان کی جلالی کیفیت کو مہمیز بھی کر سکتی ہے۔ اگر آپ کی بات نے ان کو تکلیف پہنچائی ہو تو ممکن ہے کہ وہ اسے نا بھول سکیں اور کسی نا کسی صورت میں اس کا کسی مناسب موقع پر ردعمل سامنے آ سکتا ہے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ آج کل ان کی سوچ میں بتدریج اعتدال آتا جا رہا ہے اور وہ لوگ جن کے ساتھ ان کے اختلافات، معرکے یا مناقشے رہے اب یہ ان سے بہتر تعلقات کے خواہاں ہیں گویا وہ ان کے حق میں دستبردار (Surrender) ہونے کو ترجیح دیتے ہیں اور آخری بات کہ وہ اپنے دوستوں کو جوڑ کر رکھتے ہیں۔ جو بھی ان کا بہت پرانا دوست ہے اس سے ان کا بندھن (bond) بھی اٹوٹ ہے۔ اب جب بھی اکیلے یا مشترکہ دوستوں کے ساتھ وہ لاہور آتے ہیں تو مجھے اور نجیب جمال کو ملنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ نجیب اور مجھ سے ان کے تعلق کی مدت بالترتیب پچاس اور تیس سال ہے۔ ویسے تو ان سے سال کے بارہ ماہ ملاقات ہو سکتی ہے لیکن سال کے دوران چند دن ایسے بھی ہیں جب وہ صرف اپنے لیے وقف کرتے ہیں۔ قصہ کوتاہ، دوستی ہو یا معاشرتی تعلق، تدریس ہو یا تحقیق، تنقید ہو یا تخلیق، ہر ایک میں پرفیکشن کی حد تک جاتے ہیں۔

ڈاکٹر نواز کاوش (استاد، شاعر، نقاد) نواز کاوش سے میری پہلی ملاقات کاشف انوار پرنٹنگ پریس رحیم یار خان پر اسی کی دہائی میں ہوئی تھی جب ان کی پوسٹنگ گورنمنٹ کالج صادق آباد میں تھی۔ ہم دونوں اپنے کالجوں ہی کے کام سے وہاں آئے تھے۔ مجھے وہ بہت بھلے انسان لگے اسی لیے جب میں بہاول پور آیا تو ان سے بہت جلد قریبی تعلق قائم ہو گیا۔ ان کی بیوی (مرحومہ) اور میری بیوی دوپٹہ بدل بہنیں بن گئیں۔ حج سے واپسی کے روز بھابی کی بے وقت رحلت سے میری بیوی کو بھی بہت دکھ پہنچا اور اس دکھ کی ٹیس وہ آج بھی محسوس کرتی ہیں اور کسی سبب ان کا تذکرہ کرتی رہتی ہیں۔ نواز کاوش ان دنوں "بہاول پور میں اردو ادب" پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ مکمل کر کے جمع کرانے والے تھے۔ ان کے گائیڈ ڈاکٹر محمد سلیم ملک تھے جنہوں نے مقالے کا معیار برقرار رکھنے کے لیے نواز کاوش کو قدرے ٹف ٹائم دیا جس سے وہ کسی قدر گھبراہٹ کا شکار بھی رہے۔

وہ ایک بھلے مانس اور مکمل شریف انسان ہیں جو خود کو پہنچنے والی تکلیف اور دکھ کو خود برداشت کرتے ہیں اور اس کی آنچ کسی دوست تک نہیں پہنچنے دیتے۔ اتنے بامروت اور رواداری کے حامل ہیں کہ دوستوں کی طرف سے ملنے والی تکلیف یا رنجش کا چہرے یا زبان سے کبھی اظہار نہیں کرتے اور کسی موقع پر ایسا کرنا پڑ بھی جائے تو بہت نرمی اور سادہ دلی سے کرتے ہیں مگر مداوا کی امید نہیں رکھتے۔ ان کی عاجزی اور انکساری کا ایک زمانہ قائل ہے۔ وہ ایک باوقار استاد، اچھے ذوالسانی (اردو، سرائیکی) شاعر، نقاد اور محقق ہیں۔ اپنی اساتذہ کی برادری میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ بہاول پور میں مشکل وقتوں کے ایک دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھے ہوئے تھے کہ حادثہ ہو گیا اور ان کی ٹانگ شدید زخمی ہو گئی۔ جب صحت یاب ہوئے تو دائیں ٹانگ میں ایک معمولی سا خم رہ گیا مگر اس کو انہوں نے اپنی کمزوری نہیں بننے دیا۔ پہلی بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی کی تو پہلے بچوں کے لیے کچھ نفسیاتی مسائل پیدا ہوئے مگر انہوں نے کبھی کسی سے کوئی اظہار نہیں کیا بل کہ سب کچھ وقت پر چھوڑ دیا اور کچھ عرصہ بعد ان کی اچھی منصوبہ بندی اور معاملہ فہمی سے تمام مسائل حل ہو گئے۔ وہ ہر معاملے میں دوستوں کی رائے کا احترام کرنے والے انسان ہیں اور اگر ان سے رائے طلب بھی کی جائے تو کہیں گے کہ آپ کی رائے مستحسن ہے۔ ان سے میں نے کبھی بھی کسی کو رنجیدہ ہوتے نہیں دیکھا۔ کبھی کبھار تو وہ مجھے تسلیم ہی تسلیم کی تجسیم محسوس ہوتے ہیں۔ یہ دوستوں کی مرضی کو اپنی مرضی بنا لیتے ہیں۔ خود کو لو پروفائل اور دھیما رکھتے ہیں۔ بے جا بحث کے عادی ہیں نہ قائل۔ بہاول پور کے اردو و سرائیکی حلقوں میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ طبعاً کم گو ہیں۔ چولستان کے پہلے چار ارکان میں سے ایک ہیں۔

ڈاکٹر نواز کاوش نے قادر مصطفیٰ سے ملاقات کروائی جو چولستان ترقیاتی اتھارٹی میں ملازم تھے کہ نکالے گئے تاہم ان کا کیس ہائی کورٹ میں چل رہا تھا۔ انہوں نے موبائل فوٹو گرافر کا پیشہ اختیار کیا اور چولستان فورم کے علاوہ بہاول پور کی اکثر ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی کامیاب فوٹو کوریج کرتے رہے۔ ہائیکورٹ نے ان کے حق میں فیصلہ کیا تو واپس اپنا محکمہ جوائن کر لیا تاہم فوٹو گرافی کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔ اس وقت میرے پاس چولستان فورم اور دیگر تقریبات کی تمام تصاویر اسی مرحوم کی یادگار ہیں۔

ڈاکٹر نجیب جمال (استاد، ماہر تعلیم، نقاد) 1994 کے دوران جب محمد بلال سکھیرا اسلامیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو انہوں نے اپنے ماضی کے مخالفین سے اپنی رنجیدگیوں کو بالکل نہیں چھپایا اور جہاں انہیں موقع ملا حسب خواہش اپنے دوستوں کی قدر کی۔ کالج اساتذہ کی سیاست کے ایک ماہر دوست کے ساتھ سکھیرا صاحب سے ملاقات ہوئی تو میرے دوست نے انہیں کہا کہ آپ اب صاحب اختیار ہیں اور جہاں انتہائی ضرورت ہے وہاں آپ باہر کی یونیورسٹیوں سے بہترین لوگ کیوں نہیں لاتے۔ انہوں نے کہا کہ جناب انتظار فرمائیں۔ ملتان سے اردو کے ایک ہائی پروفائل استاد کو پروفیسر کے لیے مختلف ذرائع سے قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ استاد ڈاکٹر نجیب جمال تھے جو شعبہ اردو میں پروفیسر سلیکٹ ہوئے اور اردو

شعبہ کے چیئر مین بھی بنا دیے گئے۔ اسلم ادیب کے عزیز ترین دوست تھے اور ان سے پہلی ملاقات کے بعد بہت کم دنوں میں ایک اچھا اور قریبی تعلق بن گیا۔ ڈاکٹر صاحب صلح کل کے مکتب سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی شخص کے بارے میں ان کو یقین ہو کہ وہ ان کو نقصان پہنچانے میں اپنی آخری حد تک جا سکتا ہے تو وہ اس کے ساتھ بھی بہت رواداری اور تہذیب سے پیش آئیں گے۔ شائستگی اور متوازن جمالیاتی ذوق ان کی شخصیت میں رچے ہوئے ہیں۔ ان کو اپنے چہرے کے تاثرات کو قابو میں رکھنے کی مہارت حاصل ہے۔ خوشی، گرمجوشی، سنجیدگی، اور مسرت کے تاثرات کو حسب ضرورت ظاہر کریں گے۔ انتہائی سنجیدگی ان کے اندر کے طلاطم کا پتا دے گی۔ مجموعی طور پر وہ معتدل شخصیت کے مالک ہیں۔ کسی کی تعریف کے اظہار میں بخیلی نہیں کریں گے اور تنقید کی صورت میں اعتدال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔

چولستان فورم کے قیام میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ شعبے میں بھی پسندیدہ اقدار کو فروغ دیا۔ سنیں گے سب کی مگر کریں گے جو ان کے اپنے خیال میں درست ہوگا۔ کھانے کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے نہایت خوش خوراک ہیں۔ دوستوں کی محفل میں چہک اٹھیں گے اور کوئی بعید نہیں کہ ایسی محفل میں ان کے قہقہے بھی سننے کو مل جائیں۔ اگر اپنے کسی فیصلے میں تیقن کی حد کو پہنچ جائیں تو پھر وہ کام کرنے کے بعد دوستوں کو خبر کرتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ بہت سے معاملات میں یہ ٹھنڈے مزاج کے حامل پائے گئے ہیں۔ کم اہم، غیر ضروری معاملات اور محبت کے جذبے کے زیر اثر دوستوں کو فون کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ بہت زیادہ ضروری فون کی کبھی کبھار حرکت سرزد ہو سکتی ہے۔ فون پر ان کے سلام دعا کا اپنا انداز ہے۔ سلام کے جواب میں ہاں کو ذرا لمبا کریں گے، کہیں گے ہاااں نسیم، کیسے ہو، خیریت سے فون کیا! چند جملوں کی گفتگو کے بعد کہیں گے۔ ذرا مہمان بیٹھے ہیں یا میں ایک ضروری کام مکمل کرلوں، پھر میں آپ کو فون کرتا ہوں، میں جانتا ہوں کہ اس طرف سے کبھی فون نہیں آئے گا۔

1998 سے 2002 کے دوران اردو چیئر پر قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی میں ڈیپوٹیشن پر اردو کی تدریس کی اور وہاں کی تہذیب وثقافت کو قریب سے دیکھا۔ اردو چینی لغت کے پروجیکٹ پر چند ماہ چین بھی جا چکے ہیں۔ ان ممالک سے واپس آئے تو انہوں نے وہاں کے تجربات ومشاہدات کو اپنے علمی ویژن اور رویے میں اس سلیقے سے سمویا کہ اپنے اسلوبِ گفتگو اور علمی وادبی مباحث کے حوالے سے ہمیں ایک نیا نجیب جمال نظر آیا۔ پہلے کسی بھی ایسی گفتگو میں وہ موضوع کے پس منظر کو بنیادی اہمیت دیتے تھے جو کبھی کبھی طویل بھی ہو جاتا تھا۔ پھر وہ موضوع کے پس منظر سے استخراج کر کے اس پر گفتگو کیا کرتے مگر اب ان کی گفتگو اس قدر جامع اور مربوط ہو چکی تھی کہ کم از کم وقت میں بڑی مہارت اور قرینے سے وہ موضوع پر اپنی گفتگو کو سمیٹتے ہیں۔ ان کی گفتگو سن کر خوشی بھی ہوتی اور رشک بھی آتا۔ اہل زبان ہیں، لہجے اور تلفظ کی سند سمجھے جاتے ہیں۔ حکومت پاکستان کی طرف سے حسن کارکردگی کے اعزاز کے حامل ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پہلے انٹرنیشنل اسلامک

یونیورسٹی اسلام آباد کو جوائن کیا۔ کچھ عرصہ این سی بی اے کے بہاول پور اور رحیم یار خان کیمپس میں تدریس کی۔2016 سے لاہور میں ایف سی کالج یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔لاہور آ کر جب اس ادارے کو جوائن کر لیا تو دوستوں کو بتایا۔ بہت کم عرصے میں لاہور کے علمی ادبی حلقوں میں اپنا مقام بنایا۔اپنی گفتگو کے ہنر کے باعث بیشتر سیمینار اور کانفرنسوں میں بلائے جاتے ہیں۔ کچھ تو مصروف رہتے ہیں اور کچھ اپنی افتادِ طبع کے باعث اجنبیت اور خاموشی بل کہ سرما خوابی یا(nationHiber) میں چلے جاتے تھے۔انہوں نے ایف سی کالج یونیورسٹی کے رفقائے کار کے ساتھ ایک مہر بند گروپ بنا رکھا تھا جن میں شعبہ اردو کے ڈاکٹر علی محمد خاں (82 سالہ بزرگ پروفیسر اور محقق حال استاد شعبہ اردو)،ڈاکٹر اشفاق ورک(26 کے مصنف اور شگفتہ مزاج استاد) ڈاکٹر غفور شاہ قاسم(منکسر المزاج محقق اور استاد) اور نجیب جمال شامل تھے۔نجیب کی تجویز اور تمام شامل لوگوں کے اتفاق سے ایک سال سے میں بھی اس گروپ کا حصہ ہوں جس کا نام "پانچ درویش" ہے۔ہم ہر ہفتے ترجیحاً پنجاب یونیورسٹی کلب میں ملتے ہیں، خوب باتیں کرتے ہیں، ڈنر کرتے ہیں اور پھر یہ لوگ مصروف ہفتہ گزارتے ہیں اور میں اگلے ہفتے کے ایسے دن کا انتظار۔

ڈاکٹر نصر اللہ خاں ناصر(براڈ کاسٹر۔شاعر،نقاد) رحیم یار خاں کے سینئر ایڈووکیٹ اور لبرل مفکر جناب عظیم اشرف نے بہاول پور منتقلی کے وقت مجھے بہاول پور ریڈیو کے سینئر پروڈیوسر سے ملنے کی تاکید کی تھی۔ چند ماہ کے بعد میں نے انہیں فون کیا اور حوالہ دیا تو مجھے ملنے کی دعوت دی۔ جب میں پہنچا تو ملاقات کے پانچ منٹ کے بعد کہنے لگے،آپ تشریف رکھیں میں ابھی واپس آتا ہوں۔ میں نے تیس منٹ انتظار کیا اور وہاں پر موجود عملے سے پوچھا کہ ناصر صاحب کہاں ہیں، مجھے پانچ منٹ کا کہہ گئے تھے،انہوں نے ہنس کر جواب دیا کہ وہ کم از کم آج آپ سے نہیں مل پائیں گے کیوں کہ اسلامیہ یونیورسٹی سے طلبا و طالبات کا ایک گروپ ریڈیو سٹیشن دیکھنے آیا ہوا ہے اور جب تک وہ چلے نہیں جاتے وہ آفس نہیں آئیں گے لہٰذا میں وہاں سے چلا آیا۔اس کے بعد میری ان سے ذاتی سطح پر کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ بہاول پور میں گزرے بیس سال کے دوران ان سے متعدد ملاقاتیں رہیں مگر دیگر دوستوں کے ساتھ یا علمی و ادبی محافل میں بل کہ جب وہ بہاول پور کے ریڈیو سے بطور سٹیشن ڈائریکٹر 2006 میں ریٹائر ہوئے تو چولستان فورم نے منور جمیل اور دیگر احباب کی کاوشوں سے مقامی ہوٹل میں ان کے اعزاز میں جو تقریب منعقد کی اس کو فورم کے سیکرٹری کی حیثیت سے میں نے ہی کنڈکٹ کیا تھا۔انہوں نے'' سرائیکی شاعری دا ارتقا'' کے موضوع پر جنوبی پنجاب کے پہلے پی ایچ ڈی مہر عبدالحق کی رہنمائی میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ پنجابی کے تحت ڈاکٹریٹ کا مقالہ مکمل کیا۔ یہاں میں ان کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ وہ اوپر بیان کردہ میرے دوستوں کے گروپ میں شامل تھے۔''زمین کا سپوت'' کی پہچان پر فخر کرتے ہیں اور سرائیکی شناخت پر نازاں ہیں۔دوستوں کے حوالے سے بہت انتخابی ہیں اور دوستی اپنی پسند پر کرتے ہیں۔داستان گوئی کا ہنر بھی جانتے ہیں اور جہاں انہیں کوئی اچھا سامع مل جائے تو ان کے

اس ہنر کے جوہر کھلتے ہیں۔ حال ہی میں انہیں حکومت پاکستان کی طرف سے حسن کارکردگی کا اعزاز دیا گیا ہے۔ وہ سرائیکی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں بل کہ سرائیکی کلچر کے لوگ انہیں اپنا ہیرو تصور کرتے ہیں۔ (رحیم یار خاں میں پندرہ سال کے باب میں جہاں لیاقت پور کے شعرا اور ادیبوں کا ذکر ہوا ہے وہاں ان کا تفصیلی تعارف بھی موجود ہے)

محمد طارق چوہان (استاد، کتابدار) بہاول پور آمد کے بعد ٹیکنیکل سائیڈ پر اسلامیات کے استاد، میرے سینئر شاگرد اور دوست رانا حبیب اللہ رحیم یار خان سے ملنے کے لیے آئے تو انہوں نے بہاول پور میں مقیم گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف کامرس حاصلپور کے لائبریرین طارق چوہان سے میرے ہی گھر پر متعارف کرایا۔ پہلی ملاقات میں ان کی طرف سے ایک مہذب نفیس اور دوستوں سے محبت و احترام سے پیش آنے والے انسان کا تاثر ملا اور جلد یہ تعلق دوستی میں تبدیل ہو گیا۔ ڈاکٹر نصر اللہ خاں ناصر کی طرح یہ بھی "زمین کے سپوت" یعنی (Son of Soil) ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوست بنانے اور پھر ان سے موقع کی مناسبت سے کام لینے اور دوستوں کے کام آنے کے فن میں یکتا ہیں۔ خود بھی دوستوں کے کام آ کر خوش ہوتے ہیں۔ ڈیپوٹیشن پر اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری سائنس کو جوائن کیا جہاں ان کی بیگم بھی تدریس پر مامور تھیں۔ وہ جب پی ایچ ڈی کرنے برطانیہ گئیں تو وہ بھی ان کے ہمرقاب تھے۔ بیگم نے تعلیم حاصل کی اور انہوں نے وہاں دوست بنائے۔ آمدنی میں اضافے کو ممکن بنایا اور وہاں کے ماحول سے خوب استفادہ کیا۔ وہ دوست جو مستقبل میں کارآمد ثابت ہو سکتے تھے، ان سے فعال رابطے رکھے۔ ان کی بیگم کی پی ایچ ڈی مکمل ہوئی تو واپس آئے اور اپنے استوار شدہ تعلقات کے زور پر اسلامیہ یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری کے قابل توسیع کنٹریکٹ پر لائبریرین اور چیف لائبریرین کا عہدہ حاصل کیا۔ گذشتہ نو برسوں میں ان سے ایک ہی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ دیگر دوستوں کے ساتھ لاہور آئے۔

سید آصف جاہ جعفری (صحافی، ایڈیٹر، ادیب) منور جمیل اور آصف جاہ یک جان دو قالب دوست تھے۔ ان کا تعلق ملتان سے ہے۔ 1981 میں آصف نے بہاول پور سے خواتین ڈائجسٹ نکالنے کا پروگرام بنایا تو اس کے لیے خاتون مدیر کا ہونا ضروری تھا تو اس وقت انٹر کی طالبہ عظمی ناز تک ان کی رسائی ہوئی۔ جب پہلے شمارے کی ادارت کا کام شروع ہوا تو عظمی ناز نے اپنی ایک دوست نشاط مسعود کو بھی مجلس ادارت میں شامل کرنے کی فرمائش کی جو قبول کر لی گئی۔ عظمی تو انٹر کے بعد ایم بی بی ایس کرنے قائداعظم میڈیکل کالج چلی گئیں جب کہ نشاط مسعود کو منور جمیل نے شاعرہ کے طور پر متعارف کرانے اور اس ضمن میں مزید تربیت کے لیے "گود" لے لیا گویا adopt کر لیا۔ نشاط مسعود سے جب نوشی گیلانی نکلی تو اسے ایک زمانہ جانتا تھا۔ ہمارا گروپ جب بھی ملتان جاتا تو سید آصف ایک مہربان دوست اور میزبان کے طور پر اپنی آنکھوں پر بٹھاتے۔ ہمارا قیام انہی کے مہمان خانے میں ہوتا۔ انہوں نے متعدد روزنامے جاری کیے اور ایک خلقت کو صحافی بنایا

لیکن " سوہنی دھرتی" کے نام کا اخبار ان کا مستقل ساتھی بن گیا۔ انہوں نے ایک درجن کے قریب اہم موضوعات پر کتابیں لکھیں یا مرتب کیں جن میں منور جمیل کا اہم کردار ہوتا۔ موقع محل کے حساب سے موضوع یا شخصیت کا انتخاب کرتے۔ ایسی ہی ایک کتاب انہوں نے پرنس کریم آغا خاں پر "عالم اسلام کا خاموش شہزادہ" کے نام پر شائع کی۔ منور جمیل نے بتایا کہ جب پرنس کریم گلگت آئے تو یہ دونوں بھی ان کی ملاقات کے لیے وہاں پہنچ گئے اور ان کی خدمت میں کتاب پیش کی۔ انہوں نے پانی کا ایک گلاس منگایا اور اس سے ایک گھونٹ پانی پی کر انہیں دے دیا اور وہاں سے پرنس روانہ ہو گئے۔ بعد میں ان کے عقیدت مندوں نے وہ گلاس اچھی بھلی قیمت میں ان سے خرید لیا۔ آصف اپنی کتابیں تمام تعلیمی اداروں کو بنا مانگے بذریعہ پیڈ پوسٹ (VPP) بھیجتے رہتے ہیں اور ان میں سے اکثریت کو وصول کر لیا جاتا ہے۔ زندہ دل ہیں۔ اپنی اسائنمنٹ بدلتے رہتے ہیں۔ خلوص سے ملیں گے۔ بنیادی طور پر رواداری اور محبت کے قائل ہیں، بہت مدت کے بعد ملیں گے تو بیچ کے خلا کو محسوس نہیں ہونے دیں گے اور بہت خوشی اور محبت کا اظہار کریں گے۔

سعید ایاز (استاد، افسانہ نگار) اس گروپ کے آخری اور آٹھویں ستارے سعید ایاز تھے جو ٹیکنیکل ایجوکیشن کے کامرس گروپ میں اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر اور ملتان میں فنی تعلیم کے ڈائریکٹوریٹ میں ڈپٹی ڈائریکٹر تھے۔ وہ اسلم ادیب اور نجیب جمال کے نصف صدی قبل کے دوست تھے۔ انہیں موسیقی، موسیقاروں اور نغمہ نگاروں کی معلومات پر کمال حاصل تھا۔ ویسے تو وہ پرخلوص اور دوستوں کا از حد خیال رکھنے والوں میں تھے تاہم ان کی تنک مزاجی کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایک لمحے وہ محفل کو کشت زعفران میں بدلنے اور اگلے لمحے متنازع فضا میں بدلنے کی صفت رکھتے تھے۔ ان کے مزاج میں ایک ذہین شخص کی سی چالاکی اور ٹھہراؤ تھا لیکن جس بات کو وہ اپنے نقطۂ نظر سے درست نہیں سمجھتے تھے تو فوراً اپنا اختلافی نوٹ درج کراتے۔ نصر اللہ خاں ناصر اور ان کی بہت ٹھنتی تھی۔ ناصر جب کسی ذاتی واقعے کو داستانی عناصر میں لپیٹ کر مبالغے کی انتہائی حدو کو چھونے کی کوشش کرتے تو سعید ایاز انہیں ٹوک کر فوراً احتجاج کرتے، سر پر دوہتھڑ مار کر کہتے، "ہم بے عقل بھینسیں ہیں کہ جن کے سامنے آپ لایعنی قسم کی بین بجا رہے ہیں۔ کیا ہم آپ کو شکل سے بیوقوف لگتے ہیں۔ آپ داستان گو ہوں گے اپنے گھر میں، آپ کی اس گفتگو پر احتجاجاً واک آؤٹ کرتا ہوں۔" تمام موجود دوستوں کے قہقہے دور تک سنے جا سکتے تھے۔ وہ خود ایک اچھے افسانہ نگار تھے۔ ان کا ایک جملہ دوستوں میں بہت معروف ہوا جو وہ ایسے مواقع پر ضرور ادا کرتے، "ہم تو بھئی لگی لپٹی رکھے بغیر بات کرتے ہیں" سعید ایاز طویل رخصت لے کر فیملی سمیت امریکہ چلے گئے۔ ریٹائرمنٹ پر واپس آئے اور محکمے سے اپنے تمام امور نپٹا کر واپس چلے گئے۔ پھر سنا کہ ان کی بیگم سخت علیل ہیں اور کوئی نا قابل علاج مرض تھا۔ وہ طویل عرصے مصنوعی تنفس کے ذریعے ہسپتال میں رہیں اور دو تین سال کے بعد اسی حالت میں انتقال کر گئیں۔ سعید ایاز سے فیس بک پر رابطہ رہتا ہے۔ وہ ایک دو سال بعد خود بھی پاکستان کا چکر لگا لیتے ہیں۔

1995 کے وسط تک دوستوں کا ایک گروپ بن گیا جس میں مجھ سمیت آٹھ لوگ تھے۔ ان سات دوستوں کا اوپر میں نے ذکر کیا ہے۔ اسے آپ ایک غیر معمولی اتفاق کہہ سکتے ہیں کہ ہم تمام لوگ مختلف مزاجوں کے تھے مگر دوستی کے بندھن نے ہمیں جوڑ رکھا تھا۔ اس گروپ کی ایک بنیادی خوبی یہ تھی کہ اس میں شامل تمام افراد کی باہمی آسودگی (comfort) کی سطح کمال کی تھی۔ تمام لوگ ایک دوسرے کے سامنے پوری طرح عیاں تھے اور یہ دوستی اور یگانگی کی بنیاد پر تھی۔ جب بھی اس گروپ پر اضمحلال آتا تو اسلم ادیب اپنا کردار ادا کرتے بل کہ اس گروپ کو طویل مدت تک جوڑے رکھنا انہی کا کام تھا۔ یہ گروپ کبھی نہیں ٹوٹا البتہ سکڑ ضرور گیا ہے۔ میں اور نجیب جمال لاہور آ گئے، سعید ایاز امریکہ سدھار گئے، منور جمیل دنیا چھوڑ گئے۔ آصف جاہ ملتان کے ہو کر رہ گئے۔ سال میں چند بار پاکستان میں موجود یہ دوست ضرور ملتے ہیں اور پرانی یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔

پہلے یہ گروپ سات لوگوں پر مشتمل تھا جس میں نصر اللہ خاں ناصر 2000 کے بعد شامل ہوئے۔ دوستوں کے اس گروپ نے 1996 کے موسم گرما کی تعطیلات میں جون کے مہینے میں سوات اور مری کا پروگرام بنایا۔ سفر کو بہر حال ایک دوسرے کو جاننے کا مؤثر وسیلہ کہا جاتا ہے۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ سات لوگوں کا یہ گروپ مختلف مزاجوں یا heterogeneous عناصر کا گویا تال میل تھا جس کا اظہار عموماً ہوتا رہتا تھا لیکن یہ اظہار ضرر رساں نہیں تھا۔ اس گروپ کے مانیٹر اسلم ادیب تھے جن کی اپنی باتیں بھی تنازع کا باعث بنتیں مگر مکالمے کے ذریعے سنبھال لیا جاتا۔ اس ٹور کے پہلے مرحلے میں بذریعہ ٹرین بہاول پور سے راولپنڈی پہنچے جہاں سے ویگن نے تین گھنٹوں میں مینگورہ پہنچایا۔ سوات میں ہمارا قیام گورنمنٹ جہاں زیب کالج سیدو شریف کے بیچلر ہاسٹل میں تھا۔ پہلے دن تو دیر سے تیار ہوئے اور سہ پہر سے شام تک کا وقت دریائے سوات کے کنارے واقع "فضا گھٹ" میں گزارا۔ اس علاقے میں پہلی بار آنے کی وجہ سے میرے لیے یہ ٹور بہت زیادہ دلچسپی کا حامل تھا۔ اس سے اگلے دن ہم مدین سے ہوتے ہوئے بحرین پہنچے جہاں رات کے لیے قیام کیا۔ یہاں ایک دلچسپ صورت حال پیش آئی۔ جس ہوٹل میں ہم ٹھہرے وہ دریائے سوات کے کنارے واقع تھا۔ سعید ایاز کے حصے میں بستر عین اس جگہ آیا جہاں سے دریا اس ہوٹل کو چھو کر گزرتا تھا۔ سعید ایاز نے خوف کے مارے وہاں سونے سے انکار کر دیا۔ میں نے ان سے بستر تبدیل کر لیا مگر مجھے وہاں سونے میں کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔ اگلے دن کالام اور اس کے قریب گلیشیر تک گئے۔ رات کو واپس سیدو شریف پہنچ گئے۔ اگلا دن خالی رکھا گیا مگر میں، طارق چوہان اور نواز کاوش بن بتائے باہر نکل گئے۔ سوات کا میوزیم اور اس میں گندھارا تہذیب کی باقیات ہماری توجہ کا مرکز تھیں۔ پھر ہم تینوں مالم جبہ چلے گئے۔ یہ ایک پر لطف سفر تھا۔ مالم جبہ اس وقت تک سیاحوں کی نظر میں نہیں آیا تھا۔ وہ اتنی بلندی پر واقع ہے کے وہاں سے دور دور تک پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ وہاں آسٹریا کے تعاون سے جدید طرز کا چار منزلہ موٹل موجود تھا جسے تعمیر کے بعد جیسے ترک

کر دیا گیا تھا۔ یہ وہی موٹل ہے جسے 2008 میں شر پسندوں نے جلا دیا تھا، دو منزلیں تو مکمل جل گئی تھیں۔ اُس سال تک مالم جبہ ایک اچھا تفریحی مرکز بن چکا تھا۔ بعد میں وہاں پر بننے والے کیبل کار سسٹم اور ایک موسمیاتی مرکز کو بھی تباہ کر دیا تھا۔ مالم جبہ سے واپس آئے تو پہلے سے موجود احباب نے شدید احتجاج کیا اور ایک عدالت قائم کی گئی مگر عدالت کے متعصب ہونے کی وجہ سے ہم نے اس عدالت کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس سے اگلے روز مری پہنچے۔ یہ وہ دور تھا جب انسٹا فون اور پاکٹل جیسی میڈیا کمپنیوں نے منتخب شہروں کے مختلف علاقوں میں ٹیلیفون بوتھ قائم کر رکھے تھے۔ انہیں استعمال کے لیے چند مخصوص دکانوں سے مختلف مالیت کے کارڈز ملتے تھے جنہیں بوتھ کے اندر لگے کالنگ سسٹم میں ڈال کر کال کی جاتی تھی اور ساتھ ہر ایک منٹ مکمل ہونے پر بیپ سنائی دیتی تھی۔ مری پہنچنے کے بعد رات گیارہ بجے ہم سب نے کارڈ خرید کر گھروں میں فون کیے۔ میں نے جب فون کیا تو پتا چلا کہ میری بڑی بیٹی فریحہ نسیم کو اپینڈکس کی سرجری کے لیے ہسپتال داخل کرایا گیا اور آج سرجری ہو چکی تھی۔ میں بہت پریشان ہوا اور اگلے روز صبح سویرے مری سے گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ راولپنڈی کے فیض آباد بس اڈے سے بس لی اور لاہور سے رات کو عوامی ایکسپریس لی جس نے صبح بہاول پور پہنچا دیا۔ اس طرح مجھے وہ ٹور ادھورا چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔

اس کے بعد ہم نے ہر سال مری جانے کی روایت کو قائم کیا اور اگلے دس سال کے دوران تقریباً آٹھ بار مری جانے کا پروگرام بنتا رہا۔ ہم تمام زیادہ تر راولپنڈی پوائنٹ سے کشمیر پوائنٹ کے درمیان کے علاقے اور مال روڈ تک محدود رہتے۔ ہمارا زیادہ تر وقت گپ شپ میں گزرتا۔ ہماری گفتگو کا بڑا موضوع بہاول پور میں ادبی اور علمی سرگرمیوں کو فروغ دینا اور ایک معیاری جریدہ نکالنے کا منصوبہ ہوتا۔ ان دوروں کی کچھ ناقابل فراموش یادیں بھی ہیں۔ ایک دورے کے دوران ریاض حسین پیرزادہ ہمارے میزبان تھے۔ اس وقت وہ سابق صدر فاروق احمد لغاری کے ساتھ مل کر ایک نئی سیاسی جماعت بنانے کے ضمن میں بحث و مباحثہ کے مرحلے سے گزر رہے تھے۔ ان مباحث میں انہوں نے ہم تمام لوگوں کو بھی شامل کر لیا۔ ان کو اس دوران جب بھی کوئی شخصیت ملنے آتی تو وہ ہم سب کو یہ کہہ کر تعارف کراتے کہ بہاول پور سے دوستوں اور دانشوروں کا ایک وفد میرے گھر ٹھہرا ہوا ہے۔ انہوں نے فاروق احمد لغاری سے بھی ہماری ملاقات یہی کہہ کر کرائی اور ان سے گفتگو کا بہت لطف آیا۔ ایک بار ہمارا قیام کمرشل کالج کی ہوسٹل میں تھا اور منور جمیل بھی ساتھ تھے۔ کالج کے پرنسپل اور ان کے دوستوں کے سامنے جب منور جمیل نے شاعری سنائی تو وہ داد دیتے نہ تھکتے تھے۔ ہائی وے ریسٹ ہاؤس میں قیام کے دوران ملتان سے تعلق رکھنے والے ضلع راولپنڈی کے ایکسین بلڈنگز محکمہ تعمیرات جناب انعام ہاشمی ہمارے میزبان تھے۔ انہوں نے خاصا وقت ہم سب کی رفاقت میں بہترین میزبانی کے ساتھ گزارا۔ ایک دورے کے دوران اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور سے ایم فل کرنے والے اشفاق عباسی کو مری میں ہمارے قیام کا پتا چل گیا تو وہ زبردستی ہمیں اپنا گاؤں دکھانے لے گئے۔ اس وقت ایکسپریس وے بن رہی تھی۔ بھوربن کی پانچ

ستاروں والی ہوٹل کا چکر لگانا بھی معمولات میں شامل ہوتا۔اس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے لوگوں کی کلاس ہی کوئی اور محسوس ہوتی۔ہم یہ بھی دیکھتے کہ مری کے دکاندار اور ہوٹل والے پاکستان بھر سے آئے ہوئے سیاحوں کا کس قدر استحصال کرتے ہیں۔کئی دفعہ وہاں سرِ راہ حسن اتفاق سے کبھی نا مل سکنے والے دوستوں سے بھی ملاقات ہو جاتی۔مری کے ایسے دورے ہماری زندگیوں میں در آنے والی یکسانیت کو ختم کر کے ہمیں شادمان اور تروتازہ کر دیتے۔ایک بار تو ہم راول ڈیم کے ریسٹ ہاؤس میں بھی ٹھہرے تھے جہاں ہمیں بتایا گیا کہ ذوالفقار علی بھٹو طویل عرصہ نظر بند رہے تھے۔مجھے وہ لمحہ بھی یاد ہے جب ہم مری جا رہے تھے تو لاہور سے اسلام آباد والی موٹر وے شروع ہو چکی تھی تو پنڈی بھٹیاں کے فوراً بعد دور سے موٹر وے نظر آئی تو ہم سب نے تجسس، حیرت اور خوشی کے ملے جلے احساسات سے اسے دیکھا تھا۔پہلی بار 1996 میں بذریعہ ٹرین راولپنڈی اور اس کے بعد ویگن کے ذریعے سوات گئے تھے۔1997 میں موٹر وے بنی تو بہاول پور سے اسلام آباد کوئی بس دستیاب نہیں تھی۔صادق آباد سے ایک دو ٹائم اسلام آباد براستہ بہاول پور، ملتان ملتے تھے۔ایک بار تو ہمیں ملتان سے اسلام آباد کے لیے بس لینا پڑی۔2000 میں جب ڈائیوو نے بہاول پور سے اسلام آباد کے لیے سروس شروع کی تو پھر اس سے جانا معمول بنا لیا۔2006 میں اس گروپ نے اپنا آخری دورہ کیا۔سال میں ایک یا دو بار ملتان کا اجتماعی ایک روزہ چکر بھی لگتا جہاں سید آصف جاہ جعفری ہمارے میزبان ہوتے۔وہ بھی اس گروپ کا ناگزیر حصہ تھے۔وہ ہمیشہ اپنا دل اور آنکھیں فرش راہ کرتے۔ہم کسی نا کسی دوست کو ملنے والی خوشی کے باعث اس پر واجب بہترین کھانا کھاتے۔رات گئے دنیا جہان کی باتوں کی محفل برپا ہوتی اور اگلی صبح میزبان ملتان کے بہترین ناشتے سے تواضع کرتے۔بیکن بکس پر جبار صاحب کی طرف سے چائے پر مدعو ہوتے، یونیورسٹی اور کسی کالج میں دوستوں سے ملتے، کینٹ میں ہلکی پھلکی شاپنگ کرتے اور واپسی کی راہ لیتے۔ یہ معمول بھی برسوں رہا۔

اب کچھ ذکر ان دوستوں کا جن کا تعلق بہاول پور کے کالجوں سے تھا۔

اس فہرست میں ہمایوں کبیر چودھری دوستی اور تعلق کی قدامت کے لحاظ سرفہرست ہیں۔ان سے تعلق گذشتہ چھیالیس برس سے ہے، میری کلاس دو سالہ پاس کورس کی آخری اور ان کی سمیسٹر سسٹم کی پہلی کلاس تھی۔پھر لیکچرار اور اسسٹنٹ پروفیسر کے سیلیکشن بیچ ایک ہی تھے۔یہ رحیم یار خان آتے یا میں بہاول پور، ایک دوسرے کو شوق سے ملتے۔ان کی شادی بھی رحیم یار خان ہوئی تو ان کا وہاں آنا جانا زیادہ ہو گیا۔طلبا سیاست کا تو زیادہ علم نہیں لیکن اساتذہ کی سیاست میں متحرک کردار ادا کیا۔ان کے اسلوب سیاست سے گروپ کو اختلاف بھی ہوتا تو یہ اپنی رائے کو مقدم رکھتے۔باہر سے لبرل مگر اندر سے خاصے قدامت پسند تھے۔ مشورہ ہر ایک سے کرتے مگر فیصلہ اپنی مرضی کا کرتے۔ذات کے حوالے پر نازاں رہے۔میرا ان سے اتنا کھل کھلا (frankness) تھا کہ ہم ایک دوسرے کو آپ نہیں کہہ سکتے تھے۔بہاول پور میں میری آمد کو انہوں نے

ہی ممکن بنایا۔ان سے خاصے گھریلو تعلقات تھے۔

اگر میں احتیاط سے ان کی شخصیت کو بیان کروں تو وہ بہت تہہ دار اور مختلف کیفیات کی مظہر تھی۔ بعض اوقات ان کی باتوں میں حقیقت کی شرح کو ڈھونڈنا پڑتا تھا۔ چودھراہٹ ان کی گھٹی میں تھی۔ جہاں ان کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا وہاں اپنی الگ راہ اختیار کرتے۔ اگر ان کا مفاد کسی سے متصادم ہوتا تو فیصلہ اپنے حق میں کرتے۔ باتوں کے دھنی اور سیکرٹیریٹ کے امور کے علم میں غنی تھے۔ جب سے ان کا کچھ ملے جلے مسائل کی وجہ سے لاہور سیکرٹیریٹ میں آنا جانا اور بیوروکریسی کے ساتھ ملنا جلنا ہوا تب سے گفتگو میں انگریزی الفاظ کا برمحل استعمال کرنے لگے تھے۔ ایک دفعہ انہیں مجبوراً ایک ماہ کی تعطیلات پر جانا پڑ گیا تو چارج میرے پاس آ گیا۔ میں نے پرنسپل آفس اور وائس پرنسپل آفس میں خوشگوار تبدیلیاں کیں۔ واپسی پر اپنے آفس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے جب کہ وائس پرنسپل کے آفس میں آئی تبدیلیوں پر ناخوشی کا اظہار کیا۔ اپنے کچھ کاموں کو اس وقت تک انتہائی صیغہ راز میں رکھتے جب تک کہ ان کا حصول ممکن نہ ہو جاتا۔ بظاہر مضبوط اعصاب کے مالک تھے اس لیے انتہائی بحرانی کیفیت میں ہوش وحواس بحال رکھتے۔ اس بات سے بے پرواہو کر کہ لوگ کیا کہیں گے''دل نے جو کہا اسے کر دکھایا''۔ دوستوں کی صلاحیتوں کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے پر قادر تھے جس کا دوستوں کو بہت بعد میں پتا چل پاتا۔ 1994 کے دوران محکمہ تعلیم پنجاب نے مختلف مضامین میں ایسوسی ایٹ پروفیسرز کے براہ راست انتخاب کے لیے سیٹوں کا اعلان کیا جس کے لیے مدت ملازمت کے علاوہ صرف دو تحقیقی مضامین کی منظور شدہ مجلوں میں اشاعت کی شرط رکھی گئی۔ انہوں نے بھی درخواست دے دی۔ میں بہاول پور آ چکا تھا اور ایک دن ہم دونوں صادق آباد کالج میں ریاضی کے استاد اعجاز احمد ملک کی شادی میں شرکت کے لیے شجاع آباد جا رہے تھے۔ راستے میں انہوں نے بتایا کہ ان کے تحقیقی مضامین کو ماہر مضمون نے رد کر دیا ہے۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ کمیشن میں درخواست دے دو کہ ان کے ضمن میں ماہر مضمون نے تعصب سے کام لیا ہے لہٰذا ان کا کیس کسی دوسرے ماہر کو بھیجا جائے۔ درخواست کے تمام نکات بھی میں نے بالترتیب بتائے اور شاید لکھ کر بھی دیے۔ وہ درخواست قبول کر لی گئی اور یہ اپنے پسندیدہ ماہر سے مثبت نتیجہ لینے میں کامیاب ہو گئے اور اپنی تکنیک کے ذریعے منتخب بھی ہو گئے۔ ان کی تقرری لیاقت پور کے کالج میں بطور پرنسپل ہوگئی۔ 29 ستمبر 1996 کو یہ اچانک گورنمنٹ انٹر کالج بہاول پور آئے اور ان کے ہاتھ میں کالج کی بطور ڈگری اپ گریڈیشن اور ان کی پرنسپل کے طور پر تقرری کا حکم تھا اور یہ جوائن کرنے آئے تھے۔ اس سے پہلے انہوں نے کام ہونے تک مکمل رازداری برتی۔ ہر کام معمول کے مطابق ہو رہا تھا کہ کچھ عرصے بعد دھماکا ہو گیا۔ کل کے جگری دوست یعنی خضر اقبال ملک اور ہمایوں کبیر چودھری دو مختلف سمتوں میں ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے تھے۔ باقی کے معاملات تا حد ریٹائرمنٹ تمام لوگ جانتے ہیں۔ ان کو مرد بحران کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انہوں نے اپنی سروس کی آخری ڈیڑھ دہائی تھکا دینے والی جدوجہد میں گزارے جو

"ہماوشما" کےبس سے باہر ہے۔ان کے ساتھ ایک اور نام جڑا ہوا ہے جنہیں لوگ عبدالباسط نظامی پروفیسر شعبہ اردو ایس ای کالج کے نام اور کام سے واقف ہیں۔ یہ برادر خورد، برادر بزرگ کے مطیع اور فرمانبردار رہے ہیں بل کہ اپنے بھائی کے لیے تسلیم کے خوگر پائے گئے۔ ہمہ صفت انسان ہیں جن میں ہر طرح کی روح پائی جاتی ہے۔ جوتے خریدیں گے تو بہت بڑی الماری میں انہیں رکھنے کی جگہ نہیں ملے گی۔شرٹس کا شدید شوق انہیں اپنی طرف مائل کرے گا تو الماری میں ایک ہینگر میں تین شرٹس کو لٹکانا پڑ سکتا ہے۔ان کے سنگھار میز پر کلون کی بوتلیں ہی بوتلیں نظر آئیں گی۔اب معلوم نہیں کہ ''پرانی اشیا'' کو ترک بھی کرتے ہیں یا نہیں۔ڈش کا دور آیا تو لوگوں نے ان کی چھت پر بارہ فٹ کی دیو ہیکل ڈشیں دیکھیں۔جنون (passion) میں آئے تو اردو کے پروفیسر فزکس کے استاد بن گئے اور دیسی ڈش رسیور تیار کر لیا اور اسے مختلف سیاروں کے سامنے لانے کے لیے ڈش کو متحرک رکھنے والا آلہ بھی تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔اپنی ایجادات کو خود تو کم ہی استعمال کیا مگر ہم جیسے حاجت مندوں کو نا صرف یہ سہولت فراہم کی بل کہ تنصیب بھی کر دی۔ڈش سازی اور اس کے متعلقات کے ضمن میں اتنی مہارت حاصل کی کہ شہر بھر کے ڈش سازی کے مکینکوں نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور انہوں نے ان کو مفید مشورے دینے اور رہنمائی کرنے میں کوئی بخیلی نہیں کی۔ڈش سازی میں ان کا شہر بھر میں سکہ چلنے لگا۔اس سہولت سے مجھے خوب فیض یاب کیا اور جواب میں صرف خوشی اور اطمینان کی دولت سے ہی مالا مال ہو سکے۔

سید اُسرار حسین شاہ انگریزی کے ایک قابل استاد تھے جن کے انتظامی جوہر اس وقت کھلے جب وہ دو مقررہ مدتوں سے زیادہ عرصے کے لیے بہاول پور تعلیمی بورڈ کے سیکرٹری رہے۔دوست نواز انسان ہیں۔ دوستوں کی بورڈ کی مختلف ذمہ داریوں کے حصول میں مدد کی۔ان کا فائل ورک انگریزی زبان و بیان اور فنی دلائل کے باعث بورڈ کا یادگار دور تھا۔جب میں یونیورسٹی سے واپس آیا تو یہ اس کالج میں واپس آ چکے تھے۔ ان سے ایسی غیر معمولی صحبتیں رہیں جو میری زندگی کا ایک سرمایہ ہیں۔ان سے سیکھی ہوئی انگریزی ڈرافٹنگ نے میری انتظامی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ایک وقت تھا کہ اردو کے استاد لئیق انور زیدی اور اسرار حسین شاہ ایک دوسرے کی پرچھائیں تھے۔لئیق بہت میٹھی طبیعت کے نفیس انسان ہیں۔ان کی کایا کلپ نے ان کی زندگی کا رنگ ہی بدل دیا۔شاید نیک اور وفا شعار رفیقہ حیات قدرت کی طرف سے انہیں عطیہ کی گئی۔شائستہ اور شستہ انسان ہیں، دوستوں سے رابطہ رکھتے ہیں۔انگریزی کے استاد محمد طارق خاں سے پہلی ملاقات کے بعد ہی دوستی ہو گئی۔انہوں نے اپنی سروس کا ایک بڑا حصہ ڈیپوٹیشن پر محکمہ تعلیم پنجاب اور ڈی پی آئی کالجز پنجاب کے دفاتر میں گزارا۔اس واقفیت اور اثر و رسوخ کا فائدہ دوستوں کو بھی پہنچایا۔ بوجوہ انہوں نے اور اسرار حسین شاہ نے ڈگری کالج سے ایس ای کالج میں تبادلے کرا لیے۔ان سے تواتر سے ملاقاتیں رہیں۔ میرے لاہور شفٹ ہونے کے چند برسوں بعد طارق خاں کی اچانک اور بے وقت رحلت سے بہت دکھ پہنچا۔

انگریزی ہی کے راؤ انعام الحق کالج میں ہم دوستوں کا ایک ناگزیر حصہ تھے جن کا مذاق بہت کاٹ دار ہوتا۔ محفل کو گرمانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کا خاندان طویل مدتوں سے قائم پور اور بہاول پور میں آباد تھا مگر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ اب وہ راولپنڈی میں شاد و آباد ہیں۔ اردو کے استاد سید زوار حسین سے میرے تعلق کی کئی جہتیں ہیں۔ ان سے مل کر بہت آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان سے ملتے یا بات کرتے ہوئے میری حس مزاح جاگ اٹھتی ہے اور وہ اپنے جاندار قہقہوں سے جواب دیتے ہیں تو بہت لطف آتا ہے۔ تاریخ کے استاد علامہ محمد طاہر سلیم الفطرت انسان ہیں اور بہاول پور کی تاریخ و تہذیب پر اتھارٹی تصور کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر میری ہمیشہ خلوص دل سے رہنمائی کی ہے۔ سیاسیات کے استاد اور محمد عابد اور علامہ طاہر کے درمیان ہونے والی نوک جھوک دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ ان کی مثلث تاریخ کے استاد آفتاب گیلانی سے مکمل ہوتی ہے جو کالج سے یونیورسٹی چلے گئے اور اپنی صلاحیتوں کا خوب استعمال کیا۔ صدر شعبہ تاریخ اور کسی فیکلٹی کے ڈین بھی رہے۔ ہمیشہ دوستوں کے لیے خیر کا سبب بنتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پاکستان کرکٹ بورڈ کے رول پر طویل عرصے تک فرسٹ کلاس کرکٹ کے یہ مایہ ناز ایمپائر امریکہ شفٹ ہو گئے۔

تعلیمی بورڈ بہاول پور میں مرکزی مارکنگ ہو رہی تھی۔ وہاں ایجوکیشن کے محمد اسلم خالد کھڑے تھے اور کسی سے محوِ کلام تھے۔ میں نے ہاتھ ملانے کے لیے بڑھایا، ہاتھ تو ملایا مگر ہاتھ ملانے والے کو مڑ کر نہیں دیکھا، جب باتوں سے فارغ ہوئے تو میں نے انہیں کہا کہ جس سے ہاتھ ملاتے ہیں اس کی طرف دیکھ بھی لیتے ہیں ورنہ اچھا تاثر نہیں ملتا۔ انہیں یہ بات ایسی بھائی کے مجھ سے دوستی ہو گئی۔ فون پر بات ہوتی رہتی ہے، لاہور میں آ کر ہر دفعہ مجھے ملاقات کی خوشی سے سرشار کرتے ہیں، تاریخ کے خلیل عباسی کا قہقہہ، کیمسٹری کے استاد اور ایس ای کالج کے سابق پرنسپل رانا محمد صدیق (ماڈل ٹاؤن سی میں میرے ہمسائے)، اسلامیات کے عطاالرحمان کا مہربانہ رویہ، ریاضی کے میرے بیٹے وجاہت نسیم کے محبوب استاد راشد محمود بودلہ اور ان کی غیر معمولی سماجی و تخلیقی خدمات، منفرد لہجے اور اسلوب کے شاعر ذیشان اطہر، انگریزی کے سراپا اخلاق اساتذہ عبدالناصر اور زاہد فاروق، خضر اقبال ملک جیسے مہربان پرنسپل، محفل میں بہار کی مانند قہقہوں کی بہار کھلانے والے انگریزی کے انوار الصمد (مرحوم)، شائستہ اور شستہ امتیاز سلیم لودھی، فارسی کے اسم بامسمیٰ محمد شریف، فارسی ہی کے بظاہر "سادگی کا پیکر" محمد ادریس، سراپا اخلاق خالد جاوید، محفل ساز منظور شاد اور احمد حسن خان کی جوڑی، محنتی، مقبول اور جفاکش استاد اور ایک اچھا قہقہہ لگانے والے کیمسٹری کے زاہد حسین صدیقی، عظیم باپ کے فرض شناس فرزندان سجاد رموز اور شہزاد رموز، دوستوں کے دوست لائبریرین سہیل اقبال، دوستی نبھانے والے فردوس احمد، پیار ہی پیار ملک محمد اکبر اور فدائے اطہر کی جوڑی، ایک بھولے ہوئے اسلامیات کے استاد محمد بخش آسی (مرحوم)، شرافت ہی شرافت ریاضی کے قاضی رؤف احمد (مرحوم)، ایجوکیشن کے پیارے خیر خواہ

واجد عزیز، تاریخ کے فنا فی المرشد استاد محمد ندیم خان جن کی کایا کلپ کا ارتقائی عمل میرے سامنے وجود میں آیا میری پرنسپل شپ کے دوران کالج ڈائریکٹوریٹ میں طویل عرصے کے ساتھی، مددگار اور مجھ پر کوئی آنچ نہ آنے دینے بل کہ پرنسپلز میں نمایاں تر کرنے والے تاریخ کے استاد اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر، ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر، ڈپٹی ڈائریکٹر کالجز سے پرنسپل تک کا سفر کرنے والے شیخ محمد اکبر جیسی شخصیات میرے بایوڈاٹا کا ناگزیر حصہ ہیں۔اور بھی خاصے دوست ہیں جن سے کسی نہ کسی طرح ملاقات ہوتی رہتی ہے۔

یونیورسٹی کو لیں تو سب سے پہلے میں ڈاکٹر شاہد حسن رضوی کا ذکر کروں گا۔سراپا اخلاق اور اخلاص ہیں۔نرم گفتاری اور عجز وانکسار ان کے خمیر میں ہے۔ان سے ملاقات بہاول پور آنے سے پہلے کی ہے۔ان کے والد محترم شہاب دہلوی بہاول پور میں تحریر و تحقیق کی نابغہ روزگار حیثیت کے حامل ہیں۔شاہد کو یہ سب کچھ ان کے والد سے ورثے (Legacy) میں ملا اور انہوں نے اس ورثے کو تسلسل کے ساتھ اس طرح آگے بڑھایا کہ والد کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔اردو اکیڈمی بہاول پور کے زیر اہتمام بہاول پور کے مختلف پہلوؤں پر جو کام سامنے آیا وہ غیر معمولی اور حیران کن ہے۔اکیڈمی کا سہ ماہی مجلّہ "الزبیر" بہاول پور کی ادبی اور تحقیقی شناخت ہے جو 1961 سے باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔اس کے ذریعے یہاں اور ملک بھر سے ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور محققین کی ایک بہت بڑی تعداد کو متعارف کرایا جا رہا ہے۔ان سے میرے گھریلو مراسم ہیں۔یہ تمام خاندان ہی تہذیب و شائستگی کا مظہر ہے۔ان کی والدہ محترمہ میری بیوی سے بہت محبت کرتی تھیں۔ان کے چچا محترم سید اشرف علی شاہ علیگ تھے اور خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان میں میرے پہلے پرنسپل تھے۔انہوں نے وہاں سات سال کا کامیاب عرصہ گزارا۔ان کے بڑے بھائی شہود رضوی سے تو میری یاری تھی۔ریڈیو پاکستان بہاول پور سے وابستہ یہ شخص اپنی سوچ، گفتگو اور تخلیقی رویے سے ایک اوریجنل براڈ کاسٹر لگتا تھا۔کیا خوب آدمی تھا، ملتا تو گرمجوشی اور خوشی سے اس کا چہرہ دمک اٹھتا۔ایک دفعہ یوم اقبال کی مناسبت سے انہیں کچھ فارسی کلام ایرانی لہجے میں درکار تھا تو فون آیا، کہاں ہو، بتایا گھر پر، جواب ملا بس گھر پر رہنا میں دس منٹ میں آ رہا ہوں اور ہاں! میرے آنے تک چائے تیار ہونی چاہیے۔بے تکان، بے تکلف اور بے ساختہ انداز میں بات کرتے تھے۔وقت سے بہت پہلے چلے گئے۔بہت یاد آتے ہیں۔

شعبہ اردو کے رحیم یار خان سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر محمد سلیم ملک سے میری پہلی ملاقات 1990 میں عباسیہ کیمپس میں گھوٹوی ہال والی بلڈنگ میں قائم یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری کی بالکونی میں ہوئی تھی۔اس وقت وہ "امتیاز علی تاج" پر ڈاکٹریٹ مکمل کر چکے تھے۔ان کے مقالے کا ایک اہم حصہ انارکلی کا عدم وجود بھی تھا۔جب وہ رحیم یار خان میں آئے تو میں انہیں ڈاکٹر عبدالخالق کے "حلقہ دوستاں" کے ہفتہ وار اجلاس میں لے گیا جہاں انہوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ انارکلی کا کوئی حقیقی یا تاریخی وجود نہیں ہے۔میں نے ان کی گفتگو اور حاضرین کے سوالات کو مقامی روزنامہ "شہادت" میں ایک کالم کی صورت قسط وار شائع کیا تھا۔بہاول پور

میں میری مستقل آمد پر انہوں نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔ ہماری متعدد ملاقاتیں رہیں۔ مجموعی طور پر ان کے چہرے پر سنجیدگی غالب رہتی مگر ہونٹوں پر کوئی نا کوئی شرارتی جملہ بھی مچل رہا ہوتا۔حسن اتفاق کہیے یا میری خوش نصیبی کہ میں نے انہیں کھل کھلا کے ہنستے ہوئے بھی کئی بار دیکھا ہے۔چین ڈیپوٹیشن پر مکمل تیاری پکڑ چکے تو کسی نے ان کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر دی اور یہ نا جاسکے۔ یہ بات انہیں ہمیشہ رنجیدہ رکھتی۔ میں جن دنوں ڈیپوٹیشن پر یونیورسٹی میں تھا تو جولائی 1997 کے دوران اسلام آباد کے مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان کے زیر اہتمام تین ہفتے کا ایک ریفریشر کورس منعقد ہوا۔ میں انہیں بھی ساتھ لے گیا۔ بلیوایریا میں واقع مرینا ہوٹل میں ہمارا قیام اور کورس کی کلاسز منعقد ہو رہی تھیں۔ ہم دونوں ہم اطاق بھی قرار پائے اور تین ہفتے ایک ہی کمرے میں رہے۔اس دوران صرف ہلکی پھلکی گپ شپ ہی رہی اور کسی بھی ذاتی معاملے پر ہماری کبھی کوئی بات نہیں ہوئی ورنہ ایک ہی کمرے میں رہنے والوں میں ایک ایسی سطح کی قربت وجود میں آتی ہے جس میں ذاتی مسائل یا معاملات کے ذکر پر اکثر بات چل پڑتی ہے۔انہوں نے ان تین ہفتوں میں اپنی ذات کے کمرے کو تالہ لگا کر چابی گم کر دی۔ میں بھی محدود ہی رہا۔کبھی کبھار یہ ہوٹل سے باہر چلے جاتے اور دیر سے واپسی ہوتی۔کورس کے اختتام پر ملتان تک تو پی آئی اے کی پرواز سے ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچے۔ دوپہر کی جھلسا دینے والی گرمی میں دو بجے بہاول پور سے ویگن پر پہنچے تو کہنے لگے کہ یار یہ " کیسی بلندی، کیسی پستی" تھی۔اسلام آباد سے ملتان تک کا طویل ترین راستہ ڈیڑھ گھنٹے میں آسودگی سے طے ہو گیا اور چند کلومیٹر کا راستہ شدید گرمی اور پریشانی میں طے ہوا، میں ہنس دیا اور ان سے اتفاق کیا۔ بہاول پور کے فوارہ چوک میں ایک فوٹوسٹیٹ کی دکان پر ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ میں الماتی اردو چئیر پر جا رہا ہوں اور اسی سلسلے میں چند دستاویز کی فوٹو کاپیاں کرانے آیا تھا۔تب مجھے یاد آیا کہ وہ اسلام آباد کی ہوٹل سے کبھی کبھار کہاں غائب ہو جاتے تھے اور اس سارے کام کی مجھے یعنی ہم اطاق کو بھنک تک پڑنے نہیں دی۔ شاید پہلے تجربے کی روشنی میں بہت محتاط ہو گئے تھے۔ان سے میری آخری ملاقات پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے شعبہ اردو میں ہوئی جب وہ صدر شعبہ تھے۔ بعد میں ریٹائرمنٹ کے بعد وہ فیملی سمیت امریکہ جا بسے، فیس بک پر کبھی کبھار نظر آجاتے ہیں۔

شعبہ سیاسیات کے ڈاکٹر خواجہ محمد علقمہ سے بہاول پور آنے سے بہت پہلے شیخ عظیم اشرف نے ملاقات کرائی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ ان کے والد معروف بنگالی مسلم لیگی رہنما خیرالدین ہیں جو 1946 میں مسلم لیگ کی صوبائی مجلس عاملہ کے رکن بنے۔ مارشل لا کے دوران بلدیہ ڈھاکہ کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ اسی سال صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ جب خواجہ ناظم الدین کی قیادت میں مسلم لیگ بحال ہوئی تو انھوں نے خواجہ خیرالدین کو مرکزی مجلس عاملہ کا رکن مقرر کر دیا۔ 1965ء کے انتخابات میں سرکاری امیدوار اور صوبائی وزیر خواجہ حسن عسکری کو بھاری اکثریت سے شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1970ء کے عام انتخابات میں عوامی لیگ کے امیدوار کے ہاتھوں شکست کھائی۔ دسمبر 1971ء تا اگست

1975ء کا زمانہ بڑا تلخ گزارا۔ بنگلہ دیش میں شیخ مجیب کا تختہ الٹے جانے کے بعد پاکستان آ گئے۔ کچھ عرصہ کراچی میں قیام کیا پھر لندن چلے گئے۔ مارشل لا کے نفاذ کے بعد پاکستان واپس آ گئے۔ ان کے صاحب زادے ڈاکٹر خواجہ محمد علقمہ بہت متوازن ترقی پسند سوچ کے حامل دانشور ہیں اور شہر کے حلقوں میں باعلم لوگوں سے سماجی رابطے رکھتے تھے۔ یونیورسٹی چوک میں ان کے گھر پر متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کے ڈیپارٹمنٹ بھی چلا جاتا تھا۔ وہ یونیورسٹی کی سیاست کا شکار تھے اور خاصے عرصے سے انہیں اسسٹنٹ پروفیسر سے آگے نہیں جانے دیا گیا۔ آخر ملتان یونیورسٹی چلے گئے جہاں بہت جلد پروفیسر بنا دیے گئے اور وائس چانسلر کے عہدے تک پہنچے۔ یوسف رضا گیلانی کے ذاتی دوست تھے۔ گیلانی جب وزیر اعظم تھے تو انہیں بنگلہ دیش میں ہائی کمشنر لگانا چاہتے تھے لیکن بنگلہ دیش کی حسینہ واجد حکومت نے یہ تجویز رد کر دی اور پھر ان کے خلاف جو سازش رچی گئی تو چشم فلک نے ایسے مناظر دیکھے جنہیں سوچ کر ہی دکھ کی لہر اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے، میرا قلم لکھنے سے عاجز ہے۔ نیب کے ذریعے انہیں بہت اذیت سے گزرنا پڑا۔ آج کل ملتان میں رہائش پذیر ہیں۔

اسلامیہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر محمد بلال سکھیرا کی شخصیت بہت بڑی دلچسپ تھی۔ ان کی گفتگو میں قطعاً کوئی بناوٹ نہیں تھی اور زبان و بیان سے بہت بیباک تھے۔ دیسی آدمی تھے جنہیں ملنے کے لیے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی، بس آفس کا دروازہ کھولو اور مل لو۔ آخری سال کے دوران دوستوں نے مشورہ دیا کہ ملاقاتیوں کے لیے کوئی ضابطہ ہونا چاہیے۔ کہنے لگے یہ کیسے ہو سکتا ہے، تم لوگ چاہتے ہو کہ کل جب میں اس سیٹ پر نہیں ہوں گا تو کوئی مجھے منہ نا لگائے۔ اپنی تجویز اپنے پاس رکھو۔ بے تکلفی ان کی طبیعت کا جز و اعظم تھا۔ وہ اپنے دستخط کے لیے انگریزی میں اپنا پورا نام "محمد بلال" بڑی خوبصورتی سے لکھتے۔ جب میں یونیورسٹی میں ڈیپوٹیشن پر تھا تو میں ان کے پاس شعبہ کے ریسرچ جرنل اور فارسی بول چال کی کلاسز کی تجویز پر مبنی سمری لے کر گیا تو انہوں نے بغیر کسی لیت و لعل کے فوراً منظوری دی۔ مجھے شعبے میں فرنیچر کی ضرورت تھی تو مجھے کہنے لگے کہ آپ فرنیچر بنوالیں اور میں ادائیگی کے وقت معمول کی کاروائی میں رعایت کی منظوری دے دوں گا۔ ان کا اعتماد میرے لیے خوشی کا باعث تھا۔ ان کی گردن میں کبھی سریا نہیں دیکھا گیا۔ اپنی مدت کے خاتمے کے بعد ڈائریکٹر جنرل لائبریریز پنجاب لاہور مقرر ہوئے تو سرکاری گاڑی پجارو بھی ملی۔ گاڑی کی اس سہولت کو بڑے فخر یہ انداز میں بیان کرتے۔ میرا ایسوسی ایٹ پروفیسر کے لیے کیس تیار ہو رہا تھا تو ایک روز میں یونیورسٹی کے دور کی سالانہ خفیہ رپورٹس (ACRs) پر ان کے توثیقی دستخط کرانے ماڈل ٹاؤن اے میں ان کے گھر گیا تو بہت تپاک سے ملے۔ گپ شپ کے وہ بادشاہ تھے لہٰذا خوب باتیں ہوئیں۔ تمام باتوں میں سے یہ بیان بہت سبق آموز تھا "سب لوگ کرسی کو سلام کرتے ہیں اور مجھے اس وقت بہت دکھ ہوا جب ایک دفعہ میں یونیورسٹی گیا۔ میں نے اپنی پیجارو روکی تو میری نظر ذرا فاصلے پر کھڑے دو پروفیسر پر پڑی جنہیں میں نے بطور چیئرمین سلیکشن بورڈ بھرتی کیا تھا یا اگلے گریڈ میں سلیکشن کی تھی۔ میں ان سے ملنے کے لیے ان کی جانب

بڑھنے لگا، جب ان دونوں نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھا تو گھبرا کر وہ وہاں سے جانے لگے۔ میں نے فوراً قدم روک لیے اور اپنی پیجارو پر بیٹھ کر واپس ہولیا۔"

جب میں یہ سطور تحریر کر رہا ہوں تو اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر اطہر محبوب کی مدت ختم ہونے کے بعد فارمیسی کے استاد اور ڈین ڈاکٹر نوید اختر کو قائم مقام وائس چانسلر بنایا گیا ہے۔ بلال اے خاں کے دور میں سنڈیکیٹ کا ممبر بنا تو اسی سال ڈاکٹر نوید اختر ایسوسی ایٹ پروفیسر کی سیٹ پر منتخب ہو کر سنڈیکیٹ کے ممبر بنے۔ یہ ان سے پہلا تعارف تھا۔ بلال اے خاں کے بعد جب ڈاکٹر محمد مختار بھارہ آئے تو سابقہ وائس چانسلر کے دور کی دو سنڈیکیٹ اجلاسوں میں کیے گئے فیصلوں کی انکوائری کے لیے سنڈیکیٹ سے ایک انکوائری کمیٹی ڈاکٹر نوید اختر کی سربراہی میں تشکیل دی گئی جس کا میں بھی ممبر تھا۔ وہ انکوائری تقریباً تین ماہ تک چلی اور گیسٹ ہاؤس کا ایک کمرہ کمیٹی کو دے دیا گیا۔ جب تک کمیٹی کے اجلاس جاری رہے کمرے میں ریکارڈ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ان تین ماہ میں انکوائری کے ساتھ ساتھ خوب گپ شپ بھی لگتی رہتی۔ نوید اختر بہت سادہ دل اور ہر ایک کی خیر چاہنے والے نظر آئے۔ بہاول پور میں تو کبھی نہ کبھی ملاقات ہو جاتی تھی لیکن میرے لاہور آنے کے بعد دو چار مرتبہ فون پر ہی بات چیت ہو سکی۔

سرائیکی ڈیپارٹمنٹ جب ریلوے روڈ کیمپس میں تھا تو فارسی کا ہمسایہ شعبہ تھا۔ جاوید حسان چانڈیو (معروف سرائیکی محقق اور ادیب میر حسان الحیدری کے فرزند)، ریاض حسین سندھڑ اور سید صفدر حسین شاہ سے با قاعدہ ملاقاتیں رہیں مگر بغداد کیمپس میں منتقلی کے بعد یہ ملاقاتیں کم ہو گئیں۔ محمد اقبال چنڑ صوبائی وزیر تھے تو انہوں نے کمشنر کے کمیٹی روم میں سرائیکی ادیبوں اور یونیورسٹی کے شعبہ سرائیکی کے اساتذہ کا ایک اجلاس بلایا جس میں سرائیکی کی کالج کی سطح پر تدریس کا ایک نکاتی ایجنڈا تھا۔ میں نے تجویز پیش کی کہ محکمہ تعلیم پنجاب میں بہت سی پوسٹیں پول میں پڑی ہوئی ہیں اور ان کا استعمال نہیں کیا جا رہا۔ نئی پوسٹوں کی منظوری ایک مشکل کام ہے۔ اگر وزیر صاحب پول کی ان پوسٹوں میں سے فی الحال تیس پوسٹیں کسی طریقے سے اچک لیں اور جنوبی پنجاب کے سرائیکی بیلٹ کے مختلف کالجوں کے نام الاٹ کرالیں تو کالج کی سطح پر سرائیکی کلاسز شروع کی جا سکتی ہیں۔ نتیجتاً تیس پوسٹوں کو سرائیکی کے مضمون کے لیے لینے میں کامیاب ہو گئے پھر ان پوسٹوں کو دیگر مضامین کی پوسٹوں کے ساتھ کمیشن کو لیکچرر بھرتی کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ اب سنا ہے کہ ان پوسٹوں کی تعداد خاصی زیادہ ہو چکی ہے۔

جناب ایوب الحسن بغداد روڈ کالج کے شعبہ اردو کے استاد تھے۔ ان کے ایک صاحب زادے مسعود ندیم (اب پی ایچ ڈی) ڈیرہ نواب (احمد پور شرقیہ) کے صادق عباس گورنمنٹ کالج میں نفسیات کے لیکچرر تھے۔ ایک دن میرے گھر تشریف لائے اور کہنے لگے کہ آپ نے ڈیپوٹیشن پر یونیورسٹی میں کام کیا ہے۔ میری خواہش بھی ایسی ہے لہٰذا مجھے مشورہ دیں کہ کیا یہ میرے لیے مفید رہے گا اور اس کا طریقِ کار کیا ہے۔ میں

نے ان کی رہنمائی کرتے ہوئے کہا کہ کالج اور یونیورسٹی میں تدریس کے معیار میں بہت بڑا فرق ہے۔اگر تو ایک ہی ڈگر میں ایک محدود اور عمومی سطح کی تدریس کرنی ہے تو کالج بہترین ہے تاہم اگر آپ اپنے مضمون کی گہرائی، جامعیت، جمالیاتی، تحقیقی وتنقیدی بصیرت اور نئی جہتوں کے ساتھ مضمون پڑھانے کے تجربے سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو پھر ڈیپوٹیشن پر یونیورسٹی چلے جائیں۔آپ کا شعبہ ابھی نیا ہے اور آپ اس میں مستقل بھی کیے جا سکتے ہیں۔ڈاکٹریٹ بھی کر سکتے ہیں۔اس کے بعد میں نے انہیں ڈیپوٹیشن کے پورے طریقِ کار سے تفصیل سے آگاہ کیا۔اب وہ ڈاکٹریٹ بھی کر چکے ہیں اور پروفیسر بھی سلیکٹ ہو چکے ہیں۔

سلیم طارق خاں، ڈین فیکلٹی آف اسلامک لرننگ تھے، ڈاکٹر محمد مختار بھارہ کی مدت مکمل ہونے کے بعد چند ماہ کے لیے انچارج وائس چانسلر بھی رہے۔لاہور میں ہمارا تعلیمی ادارہ ایک ہی تھا جہاں میں ایم اے کے آخری سال میں تھا جب کہ یہ پہلے سال میں تھے۔یونیورسٹی کی سیاست کی وجہ سے یا دیگر عوامل کے باعث ان سے تعلق آشنائی سے آگے نہ بڑھ سکا۔2002-4 کے دوران جب ان کی شریک حیات ڈاکٹر عائشہ سلیم ای ڈی او ایجوکیشن بہاول پور بنیں تو میں نے ان کو کالج چائے کی دعوت دی۔اس دوران ہمارے درمیان کالجوں کی ترقی کے ضمن میں بہت مثبت باتیں ہوئیں اور ان کا ایک جملہ مجھے اب بھی یاد ہے۔کہنے لگیں، بلوچ صاحب۔ماضی کی باتیں بچگانہ تھیں، ہمیں مثبت سوچ کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔بعد میں جب وہ گورنمنٹ گرلز کالج دوبئی محل روڈ کی پرنسپل بنیں تو نئے کالجوں کی رجسٹریشن اور چند انکوائری کمیٹیوں میں ہم شامل تھے تب ایک اچھے تعلق کی بنیاد پڑی اور ڈاکٹر سلیم طارق سے آشنائی دوستی میں بدل گئی۔دونوں اطراف سے بچوں کی شادیوں کی تقریبات میں بھی مدعو کیا گیا۔سوشل میڈیا پر کبھی کبھار ایک دوسرے کی خیریت بھی پوچھ لیتے ہیں۔ شعبہ کمپیوٹر سائنس میں ماضی کے استاد اور حال فیکلٹی آف کمپیوٹنگ کے ڈین دوست محمد خاں سے محبت اور احترام کا رشتہ رہا ہے۔1994 میں شعبہ لائبریری سائنس کے چیئر مین فاضل خاں بلوچ سے خوب باتیں ہوتی تھیں، کافی دیر سے ان کا کوئی اتہ پتہ نہیں ہے، نجانے کہاں کھو گئے۔شعبہ صحافت کے پروفیسر ڈاکٹر شبیر بلوچ بھی ریٹائر ہو گئے اور نئی منزلوں کی تلاش میں نکل گئے۔عاجزی اور انکساری کے حامل صحافت کے سابق چیئر مین ڈاکٹر سجاد پراچہ کنٹرولر امتحانات کی اہم اور حساس پوسٹ پر محنت سے کام کر رہے ہیں۔البتہ شعبہ جغرافیہ کے چیئر مین ڈاکٹر شیر محمد ملک اور طبیعاتی اور ریاضیاتی علوم کی فیکلٹی کے ڈین ڈاکٹر سعید احمد بزدار کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے بل کہ مؤخر الذکر دوست سے سنڈیکیٹ کی میٹنگز میں خوب ملاقاتیں رہیں۔گذشتہ دنوں حسن اتفاق سے پنجاب یونیورسٹی کے کلب میں ان سے ملاقات ہوئی، مل کر بہت خوشی ہوئی۔اکنامکس کے اسسٹنٹ پروفیسر راشد ستار میرے وقت میں گورنمنٹ کالج حاصلپور اور تاریخ کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر مظہر حسین گورنمنٹ کالج یزمان سے اپنی قابلیت کے زور پر یونیورسٹی آئے۔آج کل ڈاکٹر آصف خاں شعبہ انگریزی کے چیئر مین ہیں، یہ بھی کالج کی طرف سے ادھر آئے۔چولستان فورم کے شروع کے متعدد اجلاسوں

میں آتے رہے۔ اردو نظم کمال کی کہتے ہیں اور شاید انگریزی میں شاعری بھی۔ دو دن قبل غالباً 10 نومبر 2023 کو اسلامیہ یونیورسٹی کا ایک خصوصی کانووکیشن ہوا جس میں بہاول پور سے تعلق رکھنے والے گورنر پنجاب اور چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی کی طرف سے یونیورسٹی شعبہ صحافت کے سابق طالب علم اور کالم نگار، صحافی اور وی لاگر جاوید چودھری اور سرائیکی کے معروف شاعر شاکر شجاع آبادی کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں عطا کی گئیں۔ اس تقریب کو سوشل میڈیا پر براہ راست دکھایا گیا۔ اس بڑی تقریب میں فیکلٹی آف لینگوئجز و آرٹس کے موجودہ ڈین اور چیئر مین شعبہ سرائیکی جاوید حسان چانڈیو اور ہمارے دوست محمد طارق چوہان کی شریک حیات ڈاکٹر روبینہ طارق چیئر پرسن شعبہ انفارمیشن مینجمنٹ اور ڈین فیکلٹی آف سماجی علوم کی حیثیت سے سٹیج پر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

اب کچھ دیگر دوستوں کے بارے میں چند باتیں۔

ایک باریش اور طبیعت کے کھلے سرجری کے ڈاکٹر نے چولستان فورم میں اپنی شاعری سنا کر حیران کر دیا۔ ابھی ہم ایک سرجن کے شاعر ہونے کی حیرت سے نہیں نکلے تھے کہ وہ ڈاکٹر شاعر بہاول پور سے غائب ہو گیا۔ شاید بیسویں صدی کے آخری یا اکیسویں صدی کے پہلے سال کے موسم گرما کی تعطیلات کے دوران ہمارا گروپ مری گیا ہوا تھا کہ وہاں کی مال روڈ پر وہی ڈاکٹر مل گئے جن کے ہاتھ میں با قاعدہ ایک واکنگ سٹک تھی۔ بڑی محبت اور اپنائیت سے ملے اور بتایا کہ وہ (ایلیٹ کلاس) کے الشفا انٹرنیشنل (ہسپتال) سے وابستہ ہیں۔ یہ تھے ڈاکٹر سرجن جاوید اقبال۔ اس ملاقات کے تھوڑے ہی عرصے بعد انہوں نے چولستان فورم کے اجلاس میں شرکت کر کے بتایا کہ وہ واپس بہاول پور آ چکے ہیں۔ تمام احباب نے انہیں خوش آمدید کہا اور خوشی کا اظہار کیا۔ پھر وقتاً فوقتاً ان کی شاعری سننے کو ملتی رہی۔ ایک دفعہ انہوں نے ایک نظم سنا کر بتایا کہ یہ نظم انہوں نے ایک سرجری کے دوران کہی ہے۔ پہلے وقت میں وہ قائداعظم میڈیکل کالج شعبہ سرجری اور بہاول وکٹوریہ ہسپتال کے ایک سرجیکل وارڈ سے وابستہ تھے اور دوسرے وقت سرجیکل آپریشنز کے لیے احمد پور شرقیہ روڈ پر واقع برق ہسپتال سے منسلک تھے۔ ان کی رہائش میڈیکل کالونی میں تھی۔ بہت جلد ان کا حلقہ احباب وسیع ہو گیا اور وہ اور مقامی شاعر و ادیب باہمی محبت کے رشتے میں بند گئے۔ ان کے مزاج کی شگفتگی، بات کرنے کے انداز اور دوستانہ اور بے تکلف رویے نے سب کو اپنا اسیر بنا لیا۔ ان کی شاعری اور گفتگو میں ایک طرح کی تاثیر نے سب کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ گویا وہ تمام شاعروں ادیبوں اور ان کی فیمیلیز کو پیش آنے والے طبی مسائل کو خوش دلی اور خلوص سے اور بلا معاوضہ حل کرنے لگے۔ اس ضمن میں ایک مثال کافی ہوگی کہ بہاول پور کے شاعر اور چولستان فورم کے رکن اسلم جاوید کا بیٹا رات گئے موٹر سائیکل پر گھر ٹبہ بدر شیر جا رہا تھا کہ راستے میں ڈاکوؤں سے مڈھ بھیڑ ہوگئی، مزاحمت پر اسے شدید زخمی کر دیا گیا۔ نازک حالت میں ہسپتال لایا گیا اور ڈاکٹر صاحب کو خبر کی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کے پیچیدہ آپریشنز میں ذاتی دلچسپی لی اور اللہ تعالی کی مہربانی سے وہ نوجوان

جلد زندگی کی طرف لوٹ آیا۔ ان کا ایک شعری مجموعہ شائع ہوا تو سرکٹ ہاؤس میں چولستان فورم کے تحت تعارفی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ بہت جلد انہوں نے پروفیسر آف سرجری کا سٹیٹس حاصل کر لیا اور ایک سرجیکل وارڈ کے انچارج یا نگران بھی بن گئے۔ اسی دوران چوک فوارہ سے محمدی کالونی روڈ پر ان کا اپنا (اقبال) ہسپتال بننا شروع ہو گیا جو ان کے والد کی ملکیت تھا۔ وہ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اور والد سے ان کی یاری تھی۔ ایک دن بتانے لگے کہ میرے والد کی سرکاری نوکری میں اجلاس اور دورے بہت تھے اور وہ مجھے ہمیشہ ساتھ رکھتے۔ ایک دن میں نے باہر کسی سرکاری ٹور پر جانا تھا تو والد نے بھی جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو میں نے کہا کہ ابا جی، یہ ایک سرکاری دورہ ہے تو والد نے یہ کہہ کر مجھے شرمندہ کر دیا کہ میرے دورے کیا غیر سرکاری ہوتے تھے! ان سے معافی مانگی تو شرمندگی دور ہو سکی۔ ان کی شخصیت کا ایک پیارا سا ہالہ تھا جس میں آ کر بہت راحت ملتی۔ ان کے ساتھ بلا کی بے تکلفی تھی۔ میں جن دنوں حاصلپور پرنسپل تھا اور روزانہ بہاول پور سے جاتا آتا تھا تو چند بار ایسا ہوا کہ ہارون آباد یا بہاولنگر سے واپسی پر کالج آ جاتے اور مجھے واپس ساتھ لے لیتے، خوب گپ شپ رہتی۔ اسلامی عبادات کے پابند تھے اور معاملات کے بھی۔ ان کے والد محترم جب اچانک رحلت کر گئے تو یہ غم انہوں نے تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر بڑی ہمت سے برداشت کیا۔ جب وہ قائداعظم میڈیکل کالج کے پرنسپل تھے تو انہوں نے اس فرض کو بہترین انداز میں نبھایا۔ انہوں نے اپنے آفس میں ایک تختی رکھی جس پر لکھا ہوا تھا۔ ''No Anger Area'' لاہور آنے کے بعد ان سے ایک طویل عرصے سے ملاقات نہیں ہو سکی مگر جب بھی بات کریں گے گرم جوشی اور بے تکلفی کے ساتھ۔ جب سے وہ زندگی کو اعلیٰ و ارفع مقصد کے تحت گزارنے کی ترغیب و تحریک (Motivation) دینے والے مقرر کے طور پر سامنے آئے ہیں، طبی پیشے اور شاعر کے ساتھ انہیں ایک "مفکر" کی حیثیت سے لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ اس وقت ان کی یوٹیوب چینل پر ان سے تحریک پانے اور پسند کرنیوالے ہم خیال لوگوں (Subscribers) کی تعداد 1-81 ملین (1801000) سے تجاوز کر چکی ہے۔ اب انہیں بین الاقوامی شخصیت کا درجہ حاصل ہے۔ ان میں انکساری اور عاجزی کے وصف نے ان کو اعتدال پر رکھا ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے جب بھی آئندہ کبھی بغلگیر ہو کر ملیں گے تو پہلے کی طرح کان میں سرگوشی کے سے انداز میں کوئی مختصر سا لطیفہ ضرور سنائیں گے جس سے ہم دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑیں گے!!!

بات ڈاکٹروں کی چل پڑی ہے یہاں دو ڈاکٹروں کا ذکر کرتا چلوں۔ پہلے ڈاکٹر کا نام ہے ڈاکٹر منیر اظہر، 1999 میں قائداعظم میڈیکل کالج میں میڈیسن کے شاید اسسٹنٹ پروفیسر تھے اور میڈیکل کالونی میں اپنے گھر میں عصر سے رات تک مریض دیکھتے تھے۔ میں نے سنا کہ مریض کو بڑے غور سے سنتے ہیں اور انداز بھی دوستانہ ہوتا ہے۔ میرے معدے کے السر کا مسئلہ تھا اور میں نے ان سے علاج کا فیصلہ کیا۔ ملاقات ہوئی تو ابتدائی تعارف کے دوران معلوم ہوا کہ (غالباً) ان کا تعلق بوریوالہ سے ہے اور انٹر گورنمنٹ کالج ساہیوال

سے کیا۔ ان کے بڑے بھائی نے بھی ساہیوال کالج سے ہی بی اے کیا تھا۔ ان کے بھائی کو میں پہچانتا تھا اور وہ ایک سال مجھ سے سینئر تھے۔ جی سی ساہیوال میں ایک روایت چلی آ رہی تھی کی سال اول اور سال سوم کے سالانہ پروموشن امتحانات کالج خود لیتا تھا تو ان امتحانات میں مجموعی پوزیشنوں، مضامین کے گروپس اور مضامین میں پوزیشنز لینے والے طلبا کو تعلیمی انعامات کتابوں کی صورت میں ایک بہت بڑی تقریب میں دیے جاتے تھے۔ 1972 میں میرا بھی ایک انعام تھا۔ اس سال ان کے بھائی نے تقریباً مجموعی طور پر کلاس، گروپ اور مضامین میں پہلی پوزیشن کے 15 کے قریب انعامات حاصل کیے اور ایسے طالب علم کی کالج میں ایک بہترین پہچان بننا لازمی تھا اور میں انہیں کبھی نہیں بھول پایا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے وہ بھائی سعودی عرب میں کسی کارپوریٹ فرم سے منسلک تھے۔ اس تعارف کے بعد ان سے دوستانہ تعلق قائم ہو گیا تھا۔ انہی دنوں معدے کے ایک مرض ایچ پائلوری (h.pylori) کے علاج کی ایک نئی ریسرچ آئی تھی۔ وہی علاج انہوں نے مجھ پر آزمایا اور میں آئندہ چھ سال تک تندرست رہا اگرچہ بعد میں وہ مرض لوٹ آیا۔ فیس لیتے تھے نا انتظار کراتے تھے۔ ایک دفعہ عید کے دو دن بعد میں ان کے پاس گیا تو بتانے لگے کہ آپ کے آئیڈیل سعودی عرب سے عید منانے میرے پاس آئے ہوئے ہیں،، کیا آپ ملنا چاہتے ہیں، میں نے کہا یقیناً، بہت خوشی کی بات ہے۔ مگر معلوم نہیں پھر ان کے ذہن میں کیا آیا کہ کہنے لگے پھر کبھی مل لینا اور وہ پھر کبھی بہاول پور میں 2014 تک تو نہ آ سکے۔ میں ان کی اس بات سے بہت حیرت زدہ رہا۔ اس کے بعد میں ان کے پاس طبی مشورے کے لیے کبھی نہ جا سکا۔ کسی ادبی یا معاشرتی مجلس میں کبھی اتفاقیہ ملاقات ہی ہو پائی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے بہترین دوست ہیں، دونوں شاعر ہیں اور ہم پیشہ بھی۔

دوسرے ڈاکٹر فرحت عباس تھے جنہیں پہلی بار 1982 میں ضلع کونسل ہال بہاول پور میں منعقدہ اہل قلم کانفرنس میں دیکھا تھا لیکن تعارف نہیں تھا۔ اس کانفرنس کے مدارالمہام وہی تھے۔ 1995 میں انہوں نے چولستان فورم کے اجلاس میں آنا شروع کیا تو براہ راست تعارف ہوا جو دوستی میں بدل گیا۔ پھر قربت بڑھی تو فیملی تعلقات قائم ہو گئے۔ میرے بچوں کے انکل اور معالج بھی بن گئے۔ ٹاہلی والے محلے کے قریب کسی جگہ ان کا کلنک تھا۔ نسخہ لکھ کر کہتے کہ میڈیکل سٹور سے ادویات خرید کر میرے پاس لا کر دکھائیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو بتایا کہ صرف ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے کہ ادویات اصلی ہیں یا نقلی۔ یہ ہدایت وہ تمام مریضوں کو دیتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے تاکید کی کہ اینٹی بایوٹک ادویات کبھی دودھ کے ساتھ نہیں لینی کیوں کہ دودھ اینٹی بایوٹک ادویہ کے انجذاب میں مزاحم ہوتا ہے اور انہیں بے اثر بنا دیتا ہے۔ یہ بات عمومی روایت سے ہٹ کر تھی اس لیے حیرت ہوئی مگر میری حیرت میں اس وقت غیر معمولی اضافہ ہوا جب میں نے سنا کہ ڈاکٹر فرحت عباس بہاول پور سے ترک مستقر کر گئے مگر وجوہات کا علم آج تک نہ ہو سکا۔ کافی دیر بعد پتا چلا کہ وہ راولپنڈی کے کسی ہسپتال میں ہوتے ہیں۔ کچھ ماہ پہلے کچھ دوست راولپنڈی گئے ہوئے تھے تو ان کی ملاقات ڈاکٹر فرحت عباس

سے بھی ہوئی تو انہوں نے میری ان سے بات کرائی اور اتنے سال کے بعد بھی ہم صرف ایک دوسرے کا حال ہی پوچھ سکے۔ بہرحال "ڈاکٹروں میں ڈاکٹر اور دوستوں میں دوست" ڈاکٹر فرحت عباس جہاں بھی رہیں، انہیں بھلایا نہیں جا سکتا۔

مئی 1974 میں پاکستان کی پارلیمنٹ نے ایک ایکٹ پاس کیا جس کے مطابق فاصلاتی نظام تعلیم کے لیے پیپلز اوپن یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ 1977 کے دوران علامہ اقبال کی صد سالہ یوم پیدائش کی تقریبات کے وقت یہ ادارہ ان کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔ ابتدائی طور پر اس یونیورسٹی کے قیام کا بڑا مقصد تعلیم کو پاکستان کے ان علاقوں تک پھیلانا تھا جو بڑے دھارے میں نہیں آتے۔ فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت تعلیم کو ان بچوں اور بچیوں کے گھروں کی چوکھٹ تک پہنچانا اس یونیورسٹی کا بنیادی ہدف تھا۔ شروع شروع میں فاصلاتی تعلیمی نظام کا تصور بہت مبہم سا تھا مگر جیسے جیسے یونیورسٹی کام کرتی گئی وہ ابہام دور ہوتا گیا۔ مسئلہ اس وقت پیش آیا جب اس یونیورسٹی کے سرٹیفکیٹ اور ڈگری حاصل کرنے والے طلبا و طالبات کو مزید تعلیم کے حصول کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں نے داخلے دینے سے انکار کر دیا۔ حکومت پاکستان نے ایک نوٹیفکیشن کے ذریعے قرار دیا کہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبا کے سرٹیفکیٹ اور ڈگریوں کی وہی اہمیت ہے جو دیگر اداروں کی ہے۔ یوں یہ مسئلہ حل ہوا۔ 1983 میں سندھ سے تعلق رکھنے والے دانشور جی۔ الانہ کو اس یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے بہاول پور کو دو تحفے دیے۔ پہلا تحفہ یہ تھا کہ بہاول پور میں یونیورسٹی کا سب ریجنل آفس قائم کیا گیا اور دوسرا بہترین تحفہ تھا اوچ شریف سے تعلق رکھنے والے ایک خوبصورت اور جوان رعنا خواجہ صابر حسین کی بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے تقرری۔ خواجہ صاحب کی شخصیت محبت اور مٹھاس کا پیکر تھی۔ انہوں نے جانفشانی، محنت، عوامی تعلقات اور دیانتداری کے ساتھ بہت جلد اس مرکز کو فعال کر دیا۔ انہوں نے سکولوں اور کالجوں میں تمام قابل اساتذہ ٹیوٹرز منتخب کیے۔ ان کے ملنے کا انداز اتنا پرخلوص تھا کہ ہر ملنے والا ان کو ذاتی دوست سمجھتا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ ٹیوٹرز کی تقرریوں کے لیے ان کے پاس سفارشیں آنے لگیں۔ ان کے دوستانہ رویے نے انہیں مقبولیت کی معراج عطا کی۔ مجھے نہیں لگتا کہ کوئی ان سے ناراض بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے جیسے یہ مرکز اپ گریڈ ہوتا گیا ویسے ویسے خواجہ صاحب کا درجہ بھی بڑھتا گیا۔ یہیں پر وہ ڈپٹی اور پھر ریجنل ڈائریکٹر ہوئے۔ انہوں نے اپنے ذاتی تعلقات کو بھی یونیورسٹی کو مقبول بنانے میں استعمال کیا اور علاقائی مرکز کی اپنی وسیع تر اور خوبصورت بلڈنگ ان کے دور کی مجسم یادگار ہے۔ بہاول پور ریجن میں خواجہ صابر حسین نے اوپن یونیورسٹی کے تحت فاصلاتی تعلیم کے مبہم تصور کو عوام میں جس طرح مقبول بنایا وہ ایک تاریخ ہے۔ دو تین مختصر ترین وقفوں کے سوا ریٹائرمنٹ تک ایک طویل عرصہ یہاں پوری لگن سے کام کیا لہٰذا بہاول پور ریجن میں خواجہ صابر حسین اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کو ایک ہی وجود (entity) تصور کیا جاتا رہا ہے۔

چند دوست ایسے تھے جن سے بہاول پور منتقلی سے پہلے کا تعلق تھا۔ سید زاہد رضا کاظمی حاصل پور کے ایک نامور اور باوقار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے بڑے بھائی فرقہ وارانہ دہشت گردی کا شکار ہو گئے۔ بہت صابر و شاکر فیملی ہے۔ رضا جمال نے ان سے تعارف کرایا جو بہت جلد دوستی میں بدل گیا۔ بہاول پور میں ان کے ایک کزن ڈاکٹر مصطفیٰ رضا کاظمی بہت مہربان رویے کے حامل ہیں۔ بہاول وکٹوریہ ہسپتال کے سامنے ان کی فیملی کا عوامی میڈیکل سٹور بھی تھا۔ ان کی مشاورت اور رہنمائی سے میں نے اپنے والد کے بڑھے ہوئے پراسٹیٹ غدود کے آپریشن کرانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت پیشاب کی نالی کے راستے سے ٹی یو آر آپریشن کی تکنیک نئی آئی تھی اور پنجاب کے معروف یورالوجسٹ حنیف عارف کے اپنے زیر تکمیل ہسپتال ملتان میں 1992 میں اس آپریشن کی سہولت دستیاب تھی۔ ڈاکٹر مصطفیٰ نے ہمیں بہاول پور جوائن کیا اور ملتان گئے۔ ان کی کاظمی فیملی ڈاکٹروں کے لیے معروف ہے۔ اپنی نگرانی میں آپریشن کرایا اور دو دن کے بعد چھٹی ملی تو بہاول پور سے اپنی گاڑی منگوا کر ہمیں رحیم یار خان چھوڑ آئے۔ آج کل امریکہ میں امریکن سکول آف میڈیسن بار بڈوس میں ڈین ہیں۔ حاصلپور کے مشہور بزنس مین عبدالشکور چودھری خلوص اور پرانی شرافت کا بہترین نمونہ ہیں۔ سید زاہد کاظمی کے بہترین دوست ہیں۔ میں نے ان سے ذاتی تعلق کو استعمال کر کے گورنمنٹ کالج حاصل پور کے بہت سے منصوبے مکمل کرائے۔ بہاول پور میں ہاکی کے معروف کھلاڑی شیخ سہیل یونائٹڈ بنک لمیٹڈ بہاول پور میں آفیسر تھے۔ آخری دنوں چشتیاں یا بہاولنگر میں تھے۔ ہفتے کے اختتام پر گھر واپسی پر لائبریری چوک میں رکشے سے اترے اور گھر کی سڑک عبور کر رہے تھے کہ کسی گاڑی نے ٹکر مار دی۔ ایک ہفتہ موت و حیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد جانبر نہ ہو سکے۔ ایک پرخلوص دوست سے محرومی کا بہت دکھ ہوا۔ ساہیوال میں میرے ایک دوست اور کلاس فیلو اشتیاق احمد کا سسرال بہاول پور میں تھا۔ ان کی خوشدامن گورنمنٹ ٹیچرز ٹریننگ کالج بہاول پور کی پرنسپل بھی رہیں۔ ان کے چھوٹے برادر نسبتی رضا جمال بھی متذکرہ بالا دوستوں کے گروپ کا حصہ تھے۔ ان کی طرف سے بھی بہت احترام اور محبت ملی۔ ان تمام دوستوں سے فیملی کی سطح کے تعلقات تھے۔ رضا جمال کی والدہ کو ہم خالہ جی کہتے تھے۔ اواخر عمر میں الزائمر کا شکار ہو گئیں۔ رضا جمال بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بھرپور انداز میں زندگی جینے کی امنگ رکھنے والے رضا جمال کی بے وقت رحلت کا سن کر بہت صدمہ ہوا۔ اب سنہ ہے کہ رضا جمال کے والد جناب شاہد صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہ جب رحیم یار خان میں ڈپٹی کمشنر آفس کے سپرنٹنڈنٹ تھے تو ان سے خاصی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ بہت بھلے مانس اور معتدل مزاج کے مالک تھے۔ اواخر عمر میں نسیان (Dementia) کے مرض کا شکار ہوئے۔ اسی مرض کی وجہ سے اپنے بیٹے رضا جمال کے بیوقت انتقال پر صرف خاموشی اختیار کی، کسی ردعمل کا اظہار نہ کر سکے۔ دانشور اور ہائی کورٹ کے ایڈووکیٹ شیخ لیاقت لکی سے احترام اور پیار کا تعلق ہے۔ کبھی کبھار رابطہ ہو جاتا ہے۔

سید اسرار حسین شاہ پاک کمپیوٹرز والے (وہ اپنے نام کا تلفظ اِصرار کرتے اور لکھتے ہیں) جنہوں نے پچیس سال کی محنت اور ریاضت کے بعد شہر کے تجارتی حلقوں میں ایک اچھا مقام حاصل کیا۔ آج کل وہ بہاول پور کی مرکزی انجمن تاجراں کے صدر ہیں۔ ایسوسی ایٹ سیٹ پر وہ متعدد بار بہاول پور کے چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری میں اہم عہدوں پر براجمان رہے۔ میں انہیں تاجروں کی تنظیموں کا بادشاہ گر کہتا ہوں۔ انگریزی اچھی بول لیتے ہیں، ان کا انداز گفتگو بھی مدلل اور قائل کرنے والا ہوتا ہے۔ میری ان سے ملاقات اس وقت ہوئی جب میں گورنمنٹ کالج حاصل پور کے لیے کمپیوٹر کی خرید کے لیے کوٹیشن لینے گیا۔ ان کے نرخ اور کوالٹی مجھے معقول لگے لہٰذا میں نے ان سے غالباً پینٹیم 2 خریدنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس وقت برانڈڈ کمپیوٹر نہیں آتے تھے بل کہ مدر بورڈ، پراسیسر، ریم، سی پی یو، سی ڈی روم، مانیٹر، ہارڈ ڈسک، اور مانیٹر، ماؤس اور دیگر پرزہ جات کا کوالٹی اور قیمتوں کے لحاظ سے ایک سیٹ تیار کیا جاتا تھا اور پھر اسے سی پی یو باکس میں جوڑا (اسمبل) جاتا تھا۔ شاہ صاحب اس وقت خود ہی یونٹ تیار کرتے تھے۔ ہر قسم کے سکریوتک کا استعمال خود کرتے تھے۔ شاہ صاحب کمپیوٹر اور یو پی ایس 100 کلومیٹر دور کالج میں جا کر انسٹال کر آئے تھے۔ پھر جیسے جیسے کمپیوٹر کی دنیا ترقی کرتی گئی ویسے ویسے ان کا بزنس دنوں میں ترقی کرتا گیا – تعلقات سازی کے ماہر تھے۔ کمپیوٹر ہر گھر اور ہر فرد کی ضرورت بن چکا تھا، گاہکوں کو مختلف سہولتیں پہنچانے اور ان کے مسائل حل کرنے سے گاہکوں اور دکاندار یعنی شاہ صاحب کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ گاہکوں اور ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے والوں میں فوجی افسران اور بیوروکریسی کے لوگ بھی شامل تھے۔ شاہ صاحب کو اس بزنس نے مالا مال کر دیا۔ جب مالی آسودگی مکمل طور پر حاصل ہوگئی چوں کہ ذہین آدمی ہیں اس لیے شہر بھر میں تعلقات سازی کے بعد اپنی مارکیٹ کے یونٹ سے الیکشن لڑنے اور جیتنے کا آغاز کیا اور پھر انہوں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ عقلمند آدمی تھے مرحلہ وار موزوں منصوبہ بندی سے آگے بڑھتے گئے۔ کاروبار اپنے اکلوتے بیٹے کے سپرد کر دیا۔ اب برانڈڈ کمپیوٹر کی لاٹیں خریدتے ہیں اور دنوں میں بیچ کر نئی لاٹ منگوا لیتے ہیں یا پھر دکان کی صرف مجموعی کارکردگی پر تھوڑی بہت نظر رکھتے ہیں۔ میرا تو ان کے ہاں کھاتہ کھلا ہوا تھا اور جو چیز بھی پسند آتی اٹھا لیتے اور سہولت کے ساتھ ادائیگی کرتے رہے۔ شاہ صاحب سے تو دوستی کا تعلق رہا اور اب بھی وہ میرے دل کے بہت قریب ہیں اور ان سے اکثر بات ہوتی رہتی ہے۔ انہی کی دکان پر اقبال بھائی سے ملاقات ہوئی جو ویسے تو ایگریکلچر آفیسر تھے مگر اس وقت کے لحاظ سے نوآمدہ ڈیوائس کمپیوٹر کے مددگار پرزوں (accessories) کی مرمت کے سستے، ماہر اور کامیاب مرمت کنندہ تھے۔

ایس ای کالج میں شماریات کے پروفیسر اور بعد میں وائس پرنسپل محمد خالد کی نگرانی میں نور ہائی ٹیک کمپیوٹرز نے لائبریری چوک کے ایک چھوٹے سے پلازا کی بیسمنٹ میں کام کرنا شروع کیا تو وہاں جانے کا اتفاق بھی ہوتا رہا لیکن خالد صاحب اتنے سنجیدہ انسان ہیں کہ ان کے چہرے پر ایک ہی طرح کے تاثرات نظر

آتے ممکن ہے دوستوں میں کھلتے ہوں گے۔ پھران کی دکان نیشنل بنک ڈسٹرکٹ کورٹس برانچ کے پیچھے بننے والے U شیپ پلازہ میں شفٹ ہوگئی۔ وہ جگہ رسائی کے باعث زیادہ آسان تھی بل کہ راستے میں پڑتی تھی۔ ان کے ہاں زیادہ کوالٹی نظر آئی تو جانے آنے سے کچھ کھلتے گئے اور پھر انہیں ہنستے اور کھلکھلاتے بھی دیکھا اور سنجیدہ تو وہ پہلے ہی سے تھے۔ان سے میں نے سام سنگ کی ٹیب لی۔اپنہ پہلے والا ذاتی کمپیوٹر کسی بچے کو دے کر نئے ماڈل کا کمپیوٹر خرید لیتا، وہاں بھی کھاتہ کھل گیا اور نئی سے نئی چیز اٹھا لیتا۔ بہاول پور چھوڑتے وقت میں نے ان کے تمام ادھار چکا دیے۔ میں بھی خوش اور وہ بھی۔اب وہ یہ کاروبار ترک کر چکے ہیں تاہم کسی مسئلے یا مشورے کی صورت میں ان سے بات ہو جاتی ہے۔ان کی دکان پر محسن نہم کا نوجوان کام کرتا تھا جو ان کی رہنمائی میں آنے والی شکایات کا ازالہ کرتا تھا اور کچھ تو اس نوجوان کا شوق اور پھر ان کی رہنمائی نے اسے کمپیوٹر کے معاملات میں ماہر بنہ دیا۔ آجکل بہاول پور کے قریب کسی شوگر ملز میں کام کرتا ہے۔ جب بھی مجھے کوئی مسئلہ در پیش ہوتا ہے تو وہ ایک چھوٹی سی ایگزی فائل سے میرے کمپیوٹر کو اپنی دسترس میں لے کر انتہائی مختصر وقت میں مسئلہ حل کر دیتا ہے۔

علی معین ملتان آرٹس کونسل کے سابق ڈائریکٹر اور معروف دانشور جناب فخر الدین بلے کے فرزند ہیں۔تخلیقی عمل ان کے خون میں شامل ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادب میں ماسٹرز کیا اور نیشنل بنک ڈسٹرکٹ کورٹس برانچ بہاول پور میں خاصی دیر تک کام کیا بعد میں بوجوہ یہ ملازمت چھوڑ نا پڑی۔ سینٹ ڈومنکن اسکول بہاول پور میں زیر تعلیم رہے۔ بہاول پور کے ادبی منظر پر چولستان فورم کے پلیٹ فارم سے نمایاں شہرت ملی۔اگر چہ ان کی نظم اپنے اسلوب اور فکر سے بہت متاثر کرتی ہے مگر غزل بھی اتنی ہی مہارت سے کہتے ہیں۔ ان کے اکثر اشعار سہل ممتنہ کا نمونہ ہیں۔نصف درجن سے زیادہ نظم ونثر اور کالموں کی کتب شائع ہو چکی ہیں۔شو بز کی دنیا میں گئے تو وہاں شہرت کمائی۔ٹی وی ڈرامے "سرمایہ" سے آغاز کیا۔کراچی شفٹ ہو گئے اور درجنوں ڈرامے، ڈراموں کے ٹائٹل سونگ اور متعدد ٹیلی فلمیں لکھیں۔شو بز دنیا کے جانے پہچانے نام ہیں۔انہیں متعدد ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔کراچی جانے سے پہلے بہاول پور میں تھے تو بہاول پور کی ادبی اور علمی سرگرمیوں میں نمایاں کردار ادا کیا۔کراچی میں ہونے کے باوجود بہاول پور سے محبت کرتے ہیں اور اس شہر کو ادبی سرگرمیوں کا مرکز دیکھنے کے متمنی ہیں۔ یہاں کے تمام شاعروں، ادیبوں اور دوستوں سے رابطے میں رہتے ہیں۔ مجھ سے پندرہ سال چھوٹے ہیں مگر علم وفن اور اپنے کام کے لحاظ سے میرے "بزرگ" ہیں۔ بلا کے بذلہ سنج ہیں۔ بہاول پور میں تھے تو خوب ملاقاتیں رہیں۔آج کل سوشل میڈیا سے رابطے میں ہیں۔ ہماری ایک ذاتی چھیڑ خوانی ہے، جب بھی ملیں گے یا فون پر رابطہ ہوگا کہیں گے، "ابے سن!" میری طرف سے جواب آئے گا، "ابے سنا"۔ بہاول پور آتے ہیں تو دوستوں کے ساتھ خوب مجلس کرتے ہیں۔

نیشنل بنک کے آج کل اسسٹنٹ وائس پریزیڈنٹ (AVP) " ضیاالحق" میری زندگی کی ایک

لازوال خوبصورتی ہیں۔ وہ جتنے سادہ اورآسان ہیں ان کی شخصیت کو بیان کرنے میں کہیں زیادہ مشکل درپیش ہے۔ وہ میرا احترام کرتے ہیں، محبت کرتے ہیں، خیال رکھتے ہیں، مشکل میں کام آتے ہیں، مخلص ہیں، صحیح سمت میں رہنمائی اور مشورہ دیتے ہیں۔ دیانت دار ہیں، صاف گو ہیں، دوستوں میں اتنے مقبول ہیں کہ ہر دوست ان سے ذاتی تعلق کا دم بھرتا ہے۔ معاشرتی طور پر اور سماجی وفلاحی کاموں میں متحرک ہیں۔ میری طرح وہ بھی سیلف میڈ انسان ہیں بل کہ ان کی نسبت مجھے تو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں۔ میری طرح ان کو بھی پرائمری سے کالج تک کے استاد یاد ہیں اوران کا نام بہت عزت سے لیتے ہیں۔ عموماً کہا کرتے ہیں کہ اگر ایک ایم اے فارسی پروفیسر و پرنسپل بن جائے یا ایک دور دراز کے گاؤں کے عام سے بی ایس ای کو بنک میں آفیسر کی جاب مل جائے تو اللہ کا کتنا کرم ہے۔ یزمان سے فورٹ عباس جائیں تو تحصیل ہیڈکوارٹر سے دس کلومیٹر پہلے ان کا گاؤں ہے۔ ایف ایس سی انٹر کالج فورٹ عباس سے کی اور ڈگری میں گورنمنٹ کالج بہاولنگر میں بھی پڑھتے رہے۔ بطور بنک آفیسر پہلی پوسٹنگ نیشنل بنک خیر پور میرس میں ہوئی۔ ان کے والد تحصیل فورٹ عباس کے امیر جماعت اسلامی بھی رہے اس لیے اکثر ہنسی میں یہ بات کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی ہماری رگوں میں خون کی طرح دوڑتی ہے۔ جب میں گورنمنٹ کالج حاصل پور میں پرنسپل تھا تو یہ نیشنل بنک کی بڑی (chest) برانچ کے منیجر تھے۔ ہم دونوں روزانہ کی بنیاد پر جاتے آتے تھے۔ پاور انٹرنیشنل کی بس کا ایک ٹائم صبح ساڑھے سات بجے براستہ حاصل پور لاہور جاتا تھا جو حاصلپور اور خیر پور ٹامیوالی جانے والے ملازمین کے لیے بہت مناسب تھا اس لیے بس کھڑے اور بیٹھے لوگوں سے بھری ہوتی تھی۔ اسی سفر کے دوران ان سے ملاقات ہوئی، کالج کے اکاؤنٹس بھی انہی کی برانچ میں تھے۔ بس میں ہم سیٹ فیلو تھے۔ بس والے ہمارا اتنا خیال رکھتے تھے کہ جس دن ہم دونوں یا ہم میں سے ایک نہ جاتا تو وہ اس سیٹ کو شہر سے باہر کے آخری سٹاپ تک خالی رکھتے۔ میری درخواست پر کالج کے کئی چھوٹے بڑے پروجیکٹ مکمل کرائے۔ پھر ہمارے گھریلو مراسم قائم ہو گئے۔ میں نے جس پلاٹ پر گلشن بہاول پور میں گھر بنایا وہ انہی کا تجویز کردہ تھا پھر گھر بنانے میں بہت معاونت کی۔ چوں کہ مجھ سے 10 سال سے کچھ زیادہ چھوٹے ہیں اس لیے میرے بچوں کے چچا کہلائے۔ میرے بچوں کی شادیوں کی جو تقاریب بہاول پور میں ہوئیں ان کے منتظم وہی تھے۔ لاہور میں ہونے والی شادیوں میں البتہ بیوی بچوں سمیت شریک ہوئے۔ لاہور میں میری منتقلی کے بعد اور گھٹنوں کی شدید تکلیف کے باوجود اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ پہلے لاہور آئے پھر مجھے لے کر پہلے ٹور میں دیر بالا اور وادی کمراٹ کا تفریحی دورہ کرایا، دوسری بار آزاد کشمیر میں مظفر آباد، باغ اوران کے گردونواح کے تفریحی مقامات کی سیر کرائی۔ تیسری بار وادی نیلم از مظفر آباد، کنڈل شاہی، اٹھ مقام، کیرن، شاردا، کیل اور تاؤبٹ تک گئے۔ وادی نیلم پاکستان کی ریاست آزاد کشمیر میں ایک جنت نظیر وادی ہے۔ یہ مظفر آباد کے شمال اور شمال مشرق میں دریائے نیلم کے دونوں اطراف میں واقع ہے۔ نیلم دراصل ایک گاؤں کا نام ہے جو کیرن سے 2.5 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اسی

کے نام پہ دریا اور وادی کا نام نیلم رکھا گیا۔ اپنے گھٹنوں کے درد میں شدت کے باعث میں نے مزید کہیں جانے سے اب معذرت کر لی ہے۔ لاہور آتے ہیں تو ملتے ہیں۔ کبھی کبھار صرف مجھے ملنے آ جاتے ہیں۔ کسی بھی تعطیل والے دن 3 بجے آتے ہیں تو پہلے ہم فالکن کمپلیکس میں میری کلب میں جاتے ہیں، وہاں چائے پیتے ہیں، لابی میں بیٹھ کر خوب باتیں کرتے ہیں، پھر ان کی کلب رائل پام میں چلے جاتے ہیں جہاں کھانا کھاتے ہیں، پرانی انارکلی سے لاہور کا معروف ترین یوسف فالودہ بطور سویٹ ڈش کھاتے ہیں اور پھر میں انہیں بہاول پور کی بس پر خدا حافظ کہتا ہوں۔ ہمیں قریب لانے میں ان کے اس وصف نے بھی بنیادی کردار ادا کیا ہے کہ وہ مسلکی اعتبار سے کٹر (Rigid) نہیں ہیں بل کہ بعض معاملات کے اعتبار سے بہت ترقی پسندانہ سوچ اور وسیع ظرف کے حامل ہیں۔

میں نے بہاول پور شہر میں 5 اکتوبر 1994 سے 13 نومبر 2014 تک کا عرصہ گزارا۔ میں نے اس سے قبل اس کہانی کے شروع میں کسی متعلقہ مرحلے پر 1994 کے بہاول پور کا ایک تفصیلی جائزہ لیا تھا۔ گذشتہ 30 سال کے دوران بہاول پور شہر نے بے حد ترقی کی ہے اور آج یہ شہر اپنی تمام جہتوں کے ساتھ جدید اور معاصر تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ میں چند دن قبل انٹرنیٹ پر ایک پوڈ کاسٹ سن رہا تھا جس میں کراچی کے انگریزی معاصر روزنامہ ڈان کے سنڈے ایڈیشن ''سمو کرز کارنر'' کے تحت مستقل کالم نگار ندیم فاروق پراچہ سے گفتگو چل رہی تھی۔ وہ کہنے لگے کہ "میں جب بھی بہاول پور کے بارے میں تصور کرتا اور سوچتا تو ایک پسماندہ اور ریتلے صحرائی شہر کا سا محسوس ہوتا۔ کچھ دن قبل وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مجھے ایسے محسوس ہوا کہ میں 1980 کی دہائی کے اسلام آباد میں آ گیا ہوں۔" اس سے پہلے میں نے پرانے بہاول پور کو دروازوں والے پرانے شہر کی شبیہ کہا تھا مگر آج یہ شہر بہت بڑے اور جدید شہر کے اوصاف والا نسبتاً چھوٹا شہر ہے گویا یہ ایک بڑے شہر کا نمونہ یا replica ہے۔ 1994 میں اس کی کوئی بڑی سڑک یک طرفہ نہیں تھی۔ آج اس کی تمام سڑکیں شہر تک نہیں بل کہ سو کلو میٹر کے دائرہ کار (Radius) سے بھی زیادہ اطراف میں یک طرفہ ہیں۔ دستی ریلوے پھاٹک کی جگہ خوبصورت اوور ہیڈ برج بہاول پور میں داخل ہونے کے حوالے سے شہر کا پہلا بہترین تاثر پیش کرتا ہے۔ ان سہولتوں کی فراہمی سے شہر کی تعمیر و ترقی کے حوالے سے یہ فرق وہی جان سکتا ہے جس نے یہ شہر تین دہائیاں پہلے سے دیکھ رکھا ہے۔ اس وقت کراچی سے پشاور بل کہ تمام ملک سے یہ شہر بذریعہ نجی ٹرانسپورٹ دن اور رات کے فرق کے بغیر منسلک ہے۔ ائیر کنڈیشنڈ بسوں کا خصوصی بس سٹینڈ ہے جس کی عمارت میں ہر سہولت میسر ہے۔ جنرل بس سٹینڈ پر 24 گھنٹے ٹرانسپورٹ کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ریلوے سٹیشن کا درجہ بڑھا کر 28 کروڑ کی خطیر رقم سے بہاول پور کے تاریخی فن تعمیر سے ہم آہنگ ریلوے سٹیشن کی خوبصورت بلڈنگ کی تعمیر نو کی گئی ہے اور تمام اہم ریلوے گاڑیاں یہاں ٹھہرتی ہیں۔ ریزرویشن کوٹہ بھی معقول حد تک دستیاب ہے۔ 1986 میں اس وقت کے وزیر اعظم محمد خاں

جونیجو نے ہوائی اڈے کا افتتاح کیا تھا۔ یہ مان روڈ پر ششماہی نہر کے بائیں کنارے ہوائی اڈے تک چار کلو میٹر کی اپروچ روڈ بنا کر اسے شہر سے منسلک کیا گیا تھا۔ افتتاح کے موقع پر وزیر اعظم نے انتظامیہ کو ڈانٹ پلائی کہ ہوائی اڈے کو شہر سے بہت دور صحرا میں کیوں بنایا گیا۔ اس ہوئی اڈے کے قیام کے ڈیڑھ سال بعد ہی اگست 1988 کے وسط میں یہاں سے پرواز بھرنے والا سی 130 طیارہ پرواز کے دو تین منٹ بعد ہی بستی لال کمال کے قریب تباہ ہو گیا تھا جس میں اس وقت کی مقتدرہ کے پہلی صف کے بیشتر افراد سوار تھے۔ متحدہ عرب امارات کی حکومت کے تعاون سے پہلے ٹرمینل سے دو کلومیٹر پہلے ایک نیا اور جدید ٹرمینل تعمیر کیا گیا جس کی تعمیر کی نگرانی دوبئی سول ایوی ایشن اتھارٹی نے کی۔ اس کا نام دوبئی کے حکمران شیخ راشد بن سعید المکتوم کے نام پر رکھا گیا ہے۔ (2025 کی ابتدا میں جب یہ سطور لکھی جا رہی ہیں تو بہاول پور کے لیے ہر قسم کی پروازیں معطل ہیں گویا ائیر پورٹ ہی فعال نہیں رہا)

ریلوے روڈ اور اور اس سے آگے ختم نبوت چوک سے شروع ہونے والی سرکولر روڈ فرید گیٹ سے بھی آگے تک دائیں جانب کی گورنمنٹ رہائش گاہوں، میڈیکل کالج اور ہسپتال وسنٹرل لائبریری اور ہینڈی کرافٹس کی دکان تک کو چھوڑ کر سرکولر روڈ دونوں اطراف میں تجارتی حب بن گیا ہے۔ شہر کو ہر طرف سے کھانے، کپڑوں اور الیکٹرونکس کے برانڈز کے جال (chains) نے گھیر لیا ہے۔ نئے موبائل فون اور اس کی سروسز کے پلازے جگہ جگہ اگ آئے ہیں۔ شہر سے ملحق رہائشی ماڈل ٹاؤن اے، بی، سی، ٹرسٹ کالونی اور سیٹلائیٹ ٹاؤن کے کمرشل سنٹرز نے بھی بڑی مارکیٹوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ قدیم دروازوں کے اندر کے شہر کے بازاروں میں صرف ٹف ٹائل کی تبدیلی ہی آ سکی ہے۔ گاہکوں کا حجم بڑھنے کی وجہ سے ہجوم اور تجاوزات میں بے حد اضافہ ہو چکا بل کہ یہ کہنا چاہیے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ شاہی بازار، فتح خاں اور مچھلی بازاروں کے نکتہ اتصال سے شروع ہو کر شہزادی چوک پر گری گنج اور احمد پوری بازروں کے اپنے اندر ضم کرنے والے چوک بازار میں جب پانچ بازار آن ملتے ہیں ہیں تو وہاں چلنا تک دشوار ہو جاتا ہے۔ اوپر سے اس کمترین طوالت کے بازار میں دکانوں کے سامنے کی تین چوتھائی جگہ دکانداروں نے کرائے پر دی ہوئی ہے اور باقی بچ جانے والے بازار میں پیدل، موٹر سائیکلوں اور مال بردار ریڑیوں کی دوطرفہ آمد و رفت کس قدر مشکل ہو گی۔ اس بازار کا ہر حصہ مسلسل بلاک رہتا ہے۔ کبھی کبھار تجاوزات کے خاتمے کی مہم چلتی ہے، مہم کے خاتمے کے فوری بعد بازار اپنی اصل حالت پر لوٹ جاتا ہے۔ تجاوزات کے خلاف ایسی ہی مہم ان سطور کو تحریر کرتے وقت بھی سننے میں آئی ہے۔ نوے کی دہائی کے آغاز میں ماڈل ٹاؤن بی کے مکینوں کے تمام تجاوزات گرا دی گئی تھیں اور یہ آبادی اتنی کھلی ہو گئی تھی کہ پہچاننا مشکل تھا کہ یہ واقعی ماڈل ٹاؤن بی تھا۔ تینتیس سال کے بعد آجکل پھر ان تجاوزات کے گرانے کی مہم زوروں پہ ہے۔ تمام ساتوں دروازوں کو بحال کر دیا گیا ہے۔ پرانے دروازے دراصل سرکلر روڈ کے پیچھے واقع بند روڈ پر موجود تھے مگر چند ایک کی بحالی کے وقت ان کی اصل جگہ کو نظر انداز کر دیا گیا مگر یہ بہر حال

ایک مستحسن اقدام ہے۔شہر کی صفائی کے خودمختار ادارے (WMA) کی کاوشوں سے شہر کی بڑی یک طرفہ سڑکوں کی صفائی اور ہارٹیکلچر اتھارٹی کی محنت سے ان سڑکوں پر درختوں اور سبزے سے اچھا تاثر ملتا ہے مگر بارش کے دنوں میں اگر چہ اب فوارہ چوک میں کشتیاں چلانے کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی مگر سرکولر روڈ پر دونوں اطراف کی ڈرینز بند ہونے سے پانی کھڑا ہو جاتا ہے جس سے دکانوں تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے بل کہ وہاں تجارتی سرگرمیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔ جب ایک طویل عرصے پر مبنی جدوجہد کے بعد سبزی منڈی کو کراچی موڑ سے پہلے احمد پور شرقیہ روڈ پر منتقل کیا گیا تو پرانی سبزی منڈی کی جگہ کا بہترین استعمال کر کے ''بہاول پور کرافٹ بازار'' کی دیدہ زیب عمارت تعمیر کی گئی اور وسیع پارکنگ کے علاوہ مقامی فنکارانہ جوہر قابل کی حوصلہ افزائی کے لیے خاصی تعداد میں دکانیں تعمیر کی گئیں مگر 2014 کے آخر تک ایک درجن سے بھی کم دکانیں آباد ہو سکیں۔اب کی صورت حال کا نہیں معلوم۔

گذشتہ چند سال سے شہر نے نئی رہائشی آبادیوں کی صورت میں چاروں اور پھیلنا شروع کر دیا ہے حتیٰ کہ اسلامیہ یونیورسٹی کے بغداد الجدید کیمپس کے سامنے موجود 1980 والی کوآپریٹو ہاؤسنگ سکیم کی بھی سنی گئی اور وہ یقیناً ایک بڑی سکیم تھی جو آدھی سے زیادہ آباد ہو چکی ہے۔ بہاول پور میں گورنمنٹ کی سکیمیں متعارف کرائی گئیں جب کہ نجی اور غیر منظور شدہ سکیمیں بھی بڑی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی اور بغداد کیمپس کے اطراف تک دونوں جانب کی جگہ چھوٹی بڑی خود ساختہ رہائشی آبادیوں نے گھیر لی ہے۔ یزمان روڈ پر اسلامی کالونی کے نزدیک ریلوے پل کے بعد بہت عرصہ تک علی ٹاؤن نامی سکیم چند گھروں تک محدود رہی مگر اب وہ بھی خاصی آباد ہو چکی ہے۔ دراصل ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی (DHA) نے ششماہی نہر اور چک نمبر 11 کے درمیان کی زمین لے کر اس پر شاندار ترقیاتی کام کرائے ہیں۔ڈی ایچ اے نے شہری آبادی میں شہری (civic) سہولتوں کے جدید رجحانات کو متعارف کرایا ہے جس سے یہاں اچھی شہری آبادی کی سکیموں کو تحریک ملی ہے بل کہ یہ کہنا زیادہ قرین انصاف ہے کہ انہوں نے اس ضمن میں شہر کی کایا کلپ کر دی ہے۔احمد پور روڈ اور ملتان روڈ پر بھی نئی سکیموں کا رجحان زور پکڑ رہا ہے۔ دیوان والی پلی سے شروع ہونے والی ڈیرہ بکھا روڈ پر بھی متعدد سکیمیں وجود میں آ چکی ہیں۔حکومت اور متعلقہ محکمہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ غیر معیاری اور غیر منظور شدہ آبادی کی سکیموں کی حوصلہ شکنی کرے اور قانون وقواعد وضوابط پر سختی سے عمل کرنے والی سکیموں ہی کی منظوری دے۔ قانون میں ایسی سکیموں کی منظوری کے لیے معیاری اور مناسب شہری سہولتوں کی ضمانت دی گئی ہے۔ اگر اس طرف توجہ نہ دی گئی تو شہر ناہموار اور غیر معیاری انسانی آبادیوں کا مرکز بن جائے گا جہاں مسائل ہی مسائل ہوں گے۔

بہاول پور ایک تاریخی شہر ہے جہاں 1866 سے تعلیمی ادارے قائم ہونا شروع ہوئے اور ارتقائی مراحل سے گزر کر اس شہر میں اب شاندار تعلیمی اداروں کی صورت میں بہترین تعلیمی خدمات میسر ہیں۔

اسلامیہ یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم ہے جب کہ پرانے اور تاریخی گورنمنٹ صادق گرلز کالج کو طالبات کی چارٹرڈ یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ 1944 میں صادق انٹر گرلز کالج کو 1957 میں ڈگری کالج کا درجہ دیا گیا اور اسے چارٹرڈ یونیورسٹی کا درجہ 2013 کے گورنمنٹ صادق کالج خواتین یونیورسٹی ایکٹ کے تحت ملا۔ اس میں کل چار فیکلٹیز اور 16 مضامین کی تدریس کی جاتی ہے۔ گورنمنٹ کی تین چارٹرڈ یونیورسٹیوں بشمول چولستان یونیورسٹی آف ویٹرنری اینڈ اینیمل سائنسز) کے علاوہ دو نجی یونیورسٹیوں کے کیمپس بھی کام کر رہے ہیں۔ 1886 میں گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج انٹر کی سطح پر قائم کیا گیا۔ 1927 میں بی اے آرٹس اور 1955 میں بی ایس سی کی کلاسز کا آغاز کیا گیا۔ یہاں چند سال قبل تک متعدد مضامین میں پوسٹ گریجوایشن کرائی جاتی رہی۔ اب یہاں صبح اور شام کی کلاسوں میں بالترتیب بی ایس کے 15 اور 6 مضامین کی تدریس کی جاتی ہے۔ انٹرمیڈیٹ کی کلاسز ان کے علاوہ ہیں۔ ماضی کے انٹر اور ڈگری کالج ون یونٹ چوک نے معیاری شناخت قائم کی ہے۔ ایک گرلز کالج تو یونیورسٹی بن گیا البتہ شہر میں دو خواتین کالجز موجود ہیں۔ گورنمنٹ اور پرائیویٹ سکولوں اور نجی کالجوں کا خاصا بڑا نیٹ ورک موجود ہے۔ محلوں اور تعلیمی اداروں کے اس عظیم اور ترقی یافتہ جدید طرز کے اس شہر کے بارے میں کہ جس کا اڑھائی سو سال کا ماضی اس کے حال سے مربوط ہے، روزنامہ ڈان کے کالم نگار ندیم فاروق پراچہ کے بیان کی روشنی میں یہ دعویٰ کرنا حقیقت پر مبنی ہے کہ "بہاول پور ایک منی اسلام آباد کی صورت اختیار کر چکا ہے۔"

نکہتِ یاد: کالج کے فارسی استاد کی کہانی

لسانی تاریخ اس دعوے کی شہادت دیتی ہے کہ انڈو یورپین خاندان کی ذیلی شاخ انڈو ایرانین سے تعلق رکھنے والی فارسی زبان اڑھائی ہزار سال سے بھی زیادہ قدیم ایرانی تہذیب کی کامیاب ترجمان رہی ہے۔ اسلام کی ایران میں آمد سے پہلے کے ادوار میں اس نے کئی نام بدلے اور آخر میں پہلوی کہلائی۔ ایران میں اسلام کی اشاعت کے ساتھ عربی زبان بھی آئی تو دوسو سال کے عرصہ میں اس نے فارسی کو نا صرف نیا رسم الخط دیا بلکہ اس میں زبان و بیان کی قدرت پیدا کرنے کے لیے اسے نئی لغات سے بھی مالا مال کر دیا۔ اس کے بعد پھر دنیا نے دیکھا کہ اس زبان میں فلسفہ ومنطق، اخلاقیات، حکمت و دانائی، تاریخ و ہندسہ اور شعروادب کے شاہکار تخلیق کیے گئے۔ تاریخ طبری کا سب سے پہلا ترجمہ فارسی میں ہوا۔ ایران کا اصل نام فارس یا پرشیا تھا، ایران تو 1935 میں رکھا گیا۔ برصغیر پاک و ہند میں اس زبان نے ایک ہزار سال حکمرانی کی اور ایران کے مساوی یہاں بھی تاریخ، تصوف اور علم وادب کا ناقابل فراموش خزانہ سامنے آیا۔ اس کا بے مثال اخلاقی وشعری ادب برصغیر کے مدرسوں کے نصاب کا لازمی حصہ بنا۔ فارسی زبان سرکاری زبان کے ساتھ ساتھ بہترین تہذیب وتمدن اور معاشرتی مرتبے کی علامت قرار پائی۔ 1835 میں میکالے رپورٹ اور 1857 کی جنگ آزادی نے مسلمانوں اور فارسی زبان کی بساط الٹ دی تاہم اسلامی تعلیمی اداروں میں یہ اُسی طرح مروّج رہی تا آنکہ 1870 میں مدرسۃ العلوم شرقیہ، 1872 میں اورینٹل سکول اور پھر اورینٹل کالج کہلایا جہاں دیگر علوم کے ساتھ ساتھ مشرقی زبانوں بالخصوص عربی، فارسی اور ہندی زبانوں کی ڈگری کی سطح کی تعلیم بھی دی جانے لگی۔ 1882 میں پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی۔ اورینٹل کالج کی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے السنہ شرقیہ کی فیکلٹی آف اورینٹل لرننگ متعارف کرائی گئی۔ یہاں پرمنشی، منشی عالم اور منشی فاضل کی تدریس ہونے لگی تاہم 1921 سے ایم۔اے فارسی اور ڈاکٹریٹ کی سہولت مہیا کر دی گئی۔ 1864 میں جب گورنمنٹ کالج لاہور قائم ہوا تو یہاں عربی کے ساتھ فارسی کو ملا کر شعبہ قائم کیا گیا۔ 1925 میں بہاول پور میں جب مصر کی جامعہ الازہر کو ماڈل بنا کر جامعہ عباسیہ قائم ہوئی تو اس کے مختلف درجات مثلاً مئودب، مولوی عالم، مولوی فاضل اور علامہ کے نصاب میں عربی کے ساتھ فارسی کو بھی اساسی حیثیت حاصل رہی۔ موجودہ ہندوستان میں مختلف اوقات میں قائم ہونے والی یونیورسٹیوں بالخصوص علی گڑھ، یو۔پی اور حیدر آباد میں فارسی کی تدریس کو

خصوصی اہمیت حاصل رہی۔ جب ایک طویل لسانی ارتقا کے بعد فارسی اور دیگر زبانوں اور مقامی بھاشاؤں کے باہمی تال میل سے ریختہ چند منازل طے کر کے اردو بنی تو اس کی تشکیل پذیری میں فارسی نے بڑا اور بنیادی کردار ادا کیا۔ اردو کی نشو ونما میں فارسی نے 65 سے 70 فیصد الفاظ ہی نہیں دیے بل کہ اردو ادب کی تخلیق کے لیے مہمیز اور بنیاد کا کام بھی کیا۔

قیام پاکستان کے بعد متعارف ہونے والی تعلیمی پالیسیوں میں فارسی کو چھٹی کلاس سے شروع کیا گیا۔ تعلیمی بورڈز کو یہ اجازت دی گئی کہ جو امیدوار فارسی یا عربی کے ادیب، عالم اور یونیورسٹی کی سطح پر فاضل کے امتحانات پاس کر لیں اور اس کے ساتھ متعلقہ درجے کے لازمی مضامین بھی پاس کر لیں تو وہ انٹر، بی اے اور ایم اے میں داخلہ لے سکیں گے۔ ایف۔ اے اور بی اے میں فارسی کو 200 نمبر کے اختیاری یا ایلیکٹو مضمون کا درجہ دیا گیا اور بی۔ اے میں آرٹس اور زبانوں کے مضامین میں 100 نمبر کا انتخابی یا آپشنل مضمون رکھا جا سکتا تھا تاہم یہ پابندی بھی لگائی گئی کہ انٹر میں بیک وقت زبان کے دو اختیاری اور بی۔ اے میں کسی اختیاری مضمون کے ساتھ وہی انتخابی مضمون نہیں رکھ سکتے البتہ انگریزی یا اردو بطور لازمی مضمون کے ساتھ انہیں اختیاری کے طور پر بھی رکھا جا سکتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں جن مضامین میں تین سال کا بی۔ اے آنرز ہو رہا تھا اس کے کامیاب طلبا ایم اے کے فائنل ائیر میں داخل ہو کر ایم اے کی ڈگری کے اہل تھے۔ زبانوں اور آرٹس کے مضامین میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے باقاعدہ طریقِ کار کے تحت متعلقہ یونیورسٹی سے رجسٹریشن کرانی پڑتی تھی اور ایک رہنما استاد کی نگرانی میں کسی قطعی نئے موضوع پر مقالہ لکھنا ہوتا تھا جس میں تین سے پانچ سال لگ جاتے تھے۔ طلبا کی زیادہ تعداد کے باعث اس وقت انٹر میں اختیاری اور بی۔ اے میں آپشنل فارسی میں سیکشن بنائے جاتے تھے۔ چھٹی سے بی۔ اے تک پنجاب بھر میں فارسی مضمون کا ایک ہی نصاب تھا۔ دیگر صوبوں میں فارسی کا نصاب اسلوب کے لحاظ سے یکساں جب کہ انتخاب نثر وشعر کی حد تک مختلف ہوسکتا تھا۔ اس وقت پنجاب میں یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور، کراچی یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی جام شورو، پشاور یونیورسٹی اور شاید بلوچستان یونیورسٹی میں فارسی شعبے برائے ایم۔ اے و پی ایچ ڈی موجود تھے۔ بعد میں نمل ڈپلومہ کے لیے ان میں شامل ہوگیا۔ پاکستان کے بڑے شہروں میں ایرانی ثقافتی مراکز فارسی بول چال کی کلاسز کے لیے انتہائی مفید و موزوں تھے جو فارسی سیکھنے کے لیے مفت خدمات مہیا کرتے تھے۔ انجمن دوستی ایران و پاکستان کے زیرِ اہتمام لاہور کے ایک معروف ہوٹل میں "پاکستان میں فارسی" کے عنوان سے 22 تا 28 جون 1970 تک سات روزہ سیمینار منعقد کیا گیا جس کا افتتاح اس وقت کے پاکستان میں ایرانی سفیر ڈاکٹر محمد حسین مشایخ فریدنی نے کیا۔ اس سیمینار میں تمام پاکستان (بشمول راجشاہی اور ڈھاکہ) کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے منتخب اساتذہ اور کراچی، لاہور، کوئٹہ، پشاور اور راولپنڈی کے ایرانی ثقافتی مراکز اور فارسی اکیڈمی اسلام آباد (اب مرکز تحقیقات فارسی) کے سربراہوں اور پاکستانی وزارت تعلیم کے افسران نے

شرکت کی۔ راجشاہی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر محمد کلیم سہسرامی نے ''فارسی زبان کے تدریسی اور معاشی مسائل کا تجزیہ'' کے عنوان سے بہت مئوثر مقالہ پیش کیا جس سے ایک اقتباس پیش ہے ''ہمارے ملک میں ایم اے کی تعلیم کا مقصد اب تک یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ ایک ایسا طالب علم تیار کیا جائے جو فارسی کی تدریس کے فرائض انجام دے سکتا ہو یا کسی دفتر میں قلم کی جنبش سے روزی حاصل کر سکتا ہو۔ زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ فارسی کا نصاب اس نہج پر تیار کیا جائے کہ ایک طالب علم ایم اے پاس کرنے کے بعد سکول، کالج یا یونیورسٹی میں مدرسی کے فرائض انجام دینے کے علاوہ ایران اور اس کے متعلقہ موضوع پر لکھنے پڑھنے کی بخوبی صلاحیت رکھتا ہو تا کہ اس کے معاشی مسائل کا حل اس طرح ہو سکے کہ وہ صحافت کے میدان میں بھی کامیاب رہے، سفارتخانوں میں بھی مترجم کے فرائض انجام دے سکے، شعبہ تاریخ میں ایران کے موضوعات پر بھی تدریس کر سکے اور حکومت پاکستان کے غیر ملکی شعبے میں اور ثقافتی و تحقیقی اداروں میں بھی کامیاب زندگی گزار سکے'' سات دنوں تک ان وجوہات پر غور کیا گیا کہ پاکستان میں فارسی زبان کی تدریس انحطاط پذیر کیوں ہے؟ اور طلبا پہلے کی نسبت فارسی مضمون سے گریزاں کیوں ہیں؟ اس قسم کے دیگر متعدد امور پر غور کیا گیا۔ اس دوران پیش کی گئی قراردادوں کی روشنی میں متعدد سفارشات سامنے آئیں جن میں مختلف درجوں کے فارسی نصابات کی ترمیم و اصلاح، ایم اے اردو کے نصاب میں فارسی پرچے کی شمولیت اور ایران پاکستان کے درمیان اساتذہ اور طلبا کے وفود کے باہمی تبادلے بھی شامل تھے۔ اس کانفرنس کی سفارشات کے نتیجے میں پاکستان سے اساتذہ کے پہلے وفد نے فارسی زبان کے ریفریشر کورس کے لیے 1973 کے دوران ایران کا تین ماہ کا دورہ کیا۔ اور اس کے ایک سال بعد کا واقعہ ہے جب میں نے ایم۔اے فارسی میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ موضوع سے متعلق میری کہانی کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔

میں سکول میں ایک لو پروفائل طالب علم تھا۔ مجھ سے پہلے میرے گاؤں کی جو لاٹ سکول سے کالج پہنچی ان میں سے کچھ تو کہیں راستے میں کھو گئے اور کچھ کو کمپارٹمنٹس نے ادھ موا کر دیا اور وہ ہمارے آئیڈیل بن سکے اور نہ رہنما۔ 1971 کے دوران سکول سے کالج تک گاؤں کے مجھ سمیت دو لوگ پہنچنے میں کامیاب ہوئے مگر انٹر صرف میں ہی پاس کر سکا۔ گاؤں میں اگر کوئی پوچھ لیتا کہ پڑھ کر کیا بنو گے تو میں کہتا پروفیسر۔ یہ تو کالج آ کر معلوم ہوا کہ کالج کا استاد جو عرف عام میں پروفیسر کہلاتا ہے دراصل صرف ایک مضمون ہی پڑھاتا ہے۔ چھٹی سے آٹھویں تک فارسی پڑھ چکا تھا مگر کچھ یاد نہیں تھا جب کہ کالج میں انٹر اور ڈگری کی سطح پر فارسی بطور اختیاری مضمون پڑھا۔ ڈگری کی سطح پر فارسی کے استاد پروفیسر سید محمد اکبر کی شخصیت کی مختلف جہتوں نے اتنا متاثر کیا کہ میں نے بھی کالج کا استاد بننے کا فیصلہ کیا اور وہ بھی فارسی زبان و ادب کا۔ جب میرے دیگر مضامین کے اساتذہ کے علم میں یہ بات آئی تو انگریزی کے جناب بشیر احمد گل اور جناب علی اظہر نقوی نے بالخصوص مجھے فیصلے پر نظر ثانی کی ہدایت کی۔ اس ضمن میں ایک اور واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ ساہیوال ہال کے

سامنے والے حصے کی بالائی منزل میں بزم فکروادب کی لائبریری واقع تھی۔ بی۔اے کا امتحان دینے کے بعد میں وقتاً فوقتاً وہاں اخبارات اور کتب کے مطالعے کے لیے چلا جاتا۔ بزم فکروادب کے مدارالمہام لوگوں میں معروف شاعر جناب مجید امجد بھی شامل تھے جو اکثر وہاں اخبار پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ جب بھی ملاقات ہوتی تو میں سلام ضرور کرتا۔ایک دن مجھ سے پوچھنے لگے کہ آج کل کیا کر رہے ہو؟ میں نے کہا کہ جناب بی۔ اے کا امتحان دے رکھا ہے، نتیجے کا انتظار ہے۔اگر پاس ہو گئے تو ایم اے فارسی میں داخلہ لینے کا خیال ہے۔ کہنے لگے کہ فارسی کی بجائے انگلش مناسب رہے گی مگر مجھ پر فارسی کی دھن سوار تھی اس لیے جب بی۔اے کے امتحان میں پاس ہوا تو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں ایم۔اے فارسی میں داخلہ لے لیا۔11 مارچ 1974 کو اس عظیم اور تاریخی درسگاہ میں میرا پہلا دن تھا۔ 1870 میں قائم ہونے والے اس ادارے کی 1972-73 کے دوران جاری رہنے والی صد سالہ تقریبات کا کامیاب انعقاد کیا گیا تھا۔اس ضمن میں 12 تا 17 مارچ 1973 ایک بین الاقوامی کانگرس ماہرین علوم شرقیہ منعقد ہوئی جس میں ملک کی یونیورسٹیوں کے نامور ادبا، اساتذہ اور محققین کے علاوہ برطانیہ، ترکی، مصر، امریکہ، سعودی عرب، سوئٹزرلینڈ، روس، فرانس اور ہالینڈ کے علاوہ ایران کی تہران یونیورسٹی اور مشہد یونیورسٹی ایران کے سات معروف ترین اساتذہ اور ایرانی سفیر نے شرکت کی۔اس چھ روزہ کانفرنس میں افتتاحی اور اختتامی اجلاسوں کے علاوہ اردو، عربی، فارسی اور پنجابی کے لیے ایک ایک دن کے سیشن رکھے گئے تھے۔ جب میں یہاں داخل ہوا تو اس بین الاقوامی کانگرس کے شاندار اور کامیاب انعقاد کا تاثر فضا میں ابھی قائم تھا۔شعبہ فارسی کے معروف استاد اور صدر شعبہ پروفیسر وزیرالحسن عابدی چند ماہ پہلے ریٹائر ہو چکے تھے۔ہمیں بتایا گیا کہ فارسی زبان کے حوالے سے وہ ایک بڑا نام تھے جنہیں ایرانی حلقوں میں بھی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ جب میں داخل ہوا تو پروفیسر ڈاکٹر عبدالشکور احسن صدر شعبہ تھے۔کہا جاتا ہے کہ یونیورسٹی کی سطح پر دو طرح کے استاد پائے جاتے ہیں۔ایک وہ جن کا انداز تدریس بہت متاثر کن ہوتا ہے اور دوسرے وہ جو تحقیق یا ریسرچ کا قابل قدر ریکارڈ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن کی شخصیت میں یہ دونوں خصوصیات جمع ہو گئی تھیں۔انہوں نے ہمیں چوتھا پرچہ "تاریخ ادبیات ایران" اور تیسرا پرچہ "ادبیات معاصر ایران" پڑھایا۔ان کی شخصیت مرعوب کن تھی مگر کلاس کے علاوہ ان سے ملاقات یا رہنمائی کا کوئی موقع نہیں ملتا تھا کیوں کہ وہ طالب علموں کو ذرا فاصلے پر رکھتے تھے۔ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کی ان کی شخصیت جلال و جمال کا امتزاج تھی۔ ڈاکٹر احسن 1951 سے یونیورسٹی سے منسلک تھے اور ایران کے متعدد دورے کر چکے تھے۔متعدد ہم عصر ایرانی ادیبوں اور شاعروں سے ان کی دوستی اور میل ملاقات تھی۔ ایران کے معاصر ادب میں ان کو تخصص حاصل تھا۔14 جنوری 1975 کو وہ ریٹائر ہو گئے۔فارسی کلاسیکل نثر کا پہلا پرچہ ڈاکٹر بشیر حسین نے پڑھایا۔انہوں نے ایران سے "فعل مضارع" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی تھی۔ان کا یہ تھیسس پاکستان میں شائع ہو چکا تھا۔ان کا ایک کتابچہ "فارسی

زبان کا ایرانی لہجہ" بھی فارسی کے طالب علموں کے لیے بہت مددگار تھا۔ رہنمائی یا مشاورت کے لیے ان کے آفس بلا روک ٹوک جایا جاسکتا تھا۔ (طویل علالت کے بعد 1983 کے دوران رحلت فرما گئے۔) ڈاکٹر سید محمد اکرم ماہر اقبالیات تھے اور انہوں نے تہران یونیورسٹی سے علامہ اقبال اور مولانا روم (جنہیں ایران میں مولوی کہا جاتا ہے) کے حوالے سے ڈاکٹریٹ کی اور ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "اقبال در راہ مولوی" کے عنوان سے شائع بھی ہوا۔ فارسی کے باکمال شاعر تھے اور 'اکرام' تخلص کرتے تھے۔ اقبالیات کا چھٹا پرچہ انہوں نے پڑھایا۔ ان سے رہنمائی کے لیے طلبا انہیں مل سکتے تھے مگر مختصر اور ضروری بات تک محدود رہنا پڑھتا تھا۔ 1993 میں ریٹائر ہوئے اور 2020 تک اقبالیات شعبہ کے چیئر مین رہے۔ پانچویں پرچے "ایران کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ" اور دوسرے پرچے "کلاسیکل فارسی شاعری" کی تدریس پروفیسر ڈاکٹر آفتاب اصغر کے ذمے تھی۔ ان کی تدریس کا انداز روایت سے ہٹ کر بہت نرم خو اور دوستانہ تھا، ذاتی مسائل و معاملات میں بھی ان سے رہنمائی اور معاونت حاصل کی جاسکتی تھی۔ ان سے شعبے کے علاوہ گھر پر بھی ملاقات کی جاسکتی تھی۔ وہ ایک دوست اور رہنما استاد تھے۔ میری کلاس جب فائنل میں پہنچی تو اورینٹل کالج کی تاریخ کی پہلی خاتون استاد ڈاکٹر نسرین اختر جنہوں نے تہران یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی تھی، کا تقرر بطور لیکچرر ہوا۔ انہوں نے ساتویں پرچے کے آپشن "زبان شناسی" کی تدریس کی مگر میں کلاس کا واحد طالب علم تھا جس نے تحقیقی مقالے کا آپشن لیا اور ڈاکٹر محمد اکرم اکرام کی رہنمائی میں "اقبال اور ایران" پر تحقیقی مقالہ مکمل کیا۔ ڈاکٹر نسرین اختر بیل باٹم پہنتی تھیں اس لیے ان پر کسی ایرانی خاتون کا گمان ہوتا تھا۔ ان کی آواز دھیمی اور رویہ بہت دوستانہ تھا۔ اسی سال پہلی دفعہ فارسی بول چال کا آٹھواں پرچہ متعارف کرایا گیا۔ ایران سے تشریف لانے والے پروفیسر بہمن حبیبی نے فارسی بول چال کے پرچے کی تدریس کی مگر دقت یہ تھی کہ ایران کی بزرگ نسل انگلش کی بجائے فرانسیسی زبان سے آشنا تھی، انگلش تو بہت بعد میں وہاں کی ثانوی زبان بنی۔ دراصل انیسویں صدی کے اواخر سے بیسویں صدی کے نصف اول کی درمیانی مدت میں ایران نے فرانسیسی زبان و ثقافت کے بہت سے اثرات قبول کیے بل کہ دلچسپ بات یہ ہے کہ پہلے اس ملک کا نام فارس یا پرشیا تھا۔ 1935 میں رضا شاہ کبیر نے ایک غیر ملکی یورپی سفیر کی مشاورت سے اس ملک کا نام ایران رکھ دیا۔ اس طرح پروفیسر بہمن حبیبی فارسی اور فرانسیسی سے واقف تھے۔ ان کے خالص فارسی لہجے کو سمجھنے میں بہت دقت پیش آتی۔ انگریزی سے اگر وہ واقف ہوتے تو ہمارے لیے آسانی کا باعث ہوسکتا تھا۔ ان کے فارسی لہجے کو سمجھنے میں ایک سال لگ گیا تب کہیں ان کی باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ یہاں دو دیگر اساتذہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر آغا یمین خاں (لاہوری) گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی کے صدر شعبہ تھے، انہوں نے ایران کی سیاسی و ثقافتی تاریخ کا کچھ حصہ بطور وزٹنگ استاد ہمیں پڑھایا۔ مزاج کے سادہ اور طلبا سے محبت سے پیش آتے۔ ان کو گھر ملنے جاتے تو ان کی خوشی دیدنی ہوتی۔ اب میں ایک ایسے استاد مکرم کا ذکر کرنے جا رہا ہوں کہ جن کے ذکر کے بغیر یہ تحریر

نامکمل رہے گی اور وہ ہیں پروفیسر ڈاکٹر ظہور الدین احمد، انہیں پاکستان میں فارسی کے جگت استاد اور محقق کا درجہ حاصل ہے۔ان کے پاکستان میں فارسی ادب کے تحقیقی کام کے حجم اور معیار کا ایران میں بھی اعتراف کیا گیا۔ 1970 میں وہ گورنمنٹ کالج سے بطور سربراہ شعبہ فارسی ریٹائر ہوئے۔اس وقت تک وہ فارسی زبان وادب کے طلبا کے لیے ''نیا ایرانی ادب'' اور ''ایران شناسی'' جیسی کتب لکھ چکے تھے اور 1971 میں یونیورسٹی کے شعبے تاریخ ادبیات کے تحت 20 جلدوں پر مشتمل "تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند" کی فارسی ادب سے متعلق تین جلدوں میں بھی ان کے تحقیقی مضامین شامل تھے۔ریٹائرمنٹ کے بعد وہ نسبت روڈ کے پرتاب سٹریٹ پر واقع اپنے گھر سے صبح پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری کے اورینٹل سیکشن میں بلاناغہ آ جاتے۔اس دوران وہ اپنے تحقیقی پروجیکٹ "پاکستان میں فارسی ادب" پر کام کرتے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ فارسی کے طلبا کے علمی و تحقیقی مسائل میں خوش دلی اور مشفقانہ انداز سے رہنمائی بھی فراہم کرتے۔جب تک یونیورسٹی لائبریری 1988 میں اپنی نئی بلڈنگ نیو کیمپس شفٹ نہیں ہوئی ان کا یہی معمول رہا۔اس پندرہ سال کی مدت میں ان کی پاکستان میں فارسی ادب کی چھ ضخیم جلدیں شائع ہوئیں۔مرکزی لائبریری کی نیو کیمپس منتقلی کے بعد انہوں نے اپنی تحقیقی سرگرمیوں کے لیے یونیورسٹی اورینٹل کالج کی لائبریری کو مرکز بنایا اور متعدد تحقیقی کتب منصہ شہود پر آئیں اور فارسی میں ایم اے، ایم فل اور پی۔ایچ۔ڈی کرنے والے طالب علموں کی بلاتعطل و تعمل رہنمائی بھی جاری رکھی۔ان کے معمول میں تب فرق آیا جب بھولنے یا الزائمر کی بیماری انہیں لاحق ہوئی اور وہ گھر کا راستہ بھولنے لگے۔اس کے لیے بعض طلبا انہیں گھر سے لے آتے اور چھوڑ بھی آتے۔میں نے دوران طالب علمی ان سے بہت اکتساب کیا اور ایم۔اے میں میرے تحقیقی مقالے "اقبال اور ایران" میں درحقیقت وہی میرے "گائیڈ" تھے۔اواخر عمر تک لائبریری کی سیڑھیاں چڑھنا اترنا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔انہیں رائٹرز گلڈ کا انعام اور حکومت ایران کی طرف سے ایرج افشار نامی ایوارڈ ملے۔پاکستان میں جہاں مختلف ایوارڈ ریوڑھیوں کی طرح بانٹے جاتے ہیں، اس سو سالہ بزرگ استاد کی ساٹھ سے زیادہ کتب کسی کو نظر نہ آئیں۔

ماضی بعید میں پنجاب یونیورسٹی بالخصوص اورینٹل کالج میں اساتذہ کی سروس کا ڈھانچہ اس طرح سے تھا۔لیکچرر، سینئر لیکچرر، ریڈر اور پروفیسر۔کالج میں صرف ایک سینئر ترین استاد ہی پروفیسر ہوتا جو اورینٹل کالج کا پرنسپل بھی ہوتا تھا، بعد میں ان چار درجاتی عہدوں کا نام تبدیل ہو گیا جو لیکچرر، اسسٹنٹ پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر اور پروفیسر پر مشتمل تھا۔میں جب داخل ہوا تو ڈاکٹر عبادت بریلوی پرنسپل تھے۔ماضی میں اس کالج کے چند پرنسپل ایسے بھی تھے جو بیک وقت اورینٹل فیکلٹی کے ڈین اور اپنے شعبے کے سربراہ بھی تھے۔اساتذہ کے درمیان سیلیکشن بورڈ کے ذریعے اوپر کے درجے میں آنے اور دیگر عہدوں کے لیے کشمکش بھی چلتی رہتی تھی۔شعبہ فارسی کے سربراہ ڈاکٹر محمد باقر اور ڈاکٹر سید عبداللہ دونوں ریڈر تھے تو دونوں کے درمیان کالج کا پرنسپل بننے کی چپقلش کی کہانیاں عام تھیں جس سے اساتذہ میں گروپ بندی کو فروغ ملا۔ڈاکٹر سید عبداللہ

بڑے سخت گیر پرنسپل رہے تھے۔ وہ ہر بات اور ہدایت تحریری انداز میں کرنے کے قائل تھے بل کہ اس پر ڈسپیچ نمبر بھی لگایا جاتا اور اگر دستی موصول کرایا جاتا تو موصول کرنے والے کے peon بک پر دستخط کرائے جاتے۔ ان کے کمرے کے باہر کاغذ کی چٹیں موجود ہوتیں جن پر ملنے والا اپنا نام لکھ کر بھیجتا۔ چاہتے تو بلا لیتے یا پھر آئندہ آنے کو کہتے۔ بل کہ بعض اوقات چٹ پر کام؟ لکھ دیتے۔ کچھ شرارتی طلبا چٹ بھیجتے اور ان کے کام؟ کے آگے سلام لکھ کر اندر بھیجتے اور غائب ہو جاتے۔ یہاں کی گروپ بندی کا زیادہ اظہار سیلیکشن بورڈ کے دوران ہوتا جہاں ہر گروپ اپنے پسندیدہ استاد کی سیلیکشن یا کنفرمیشن کے لیے ہر قسم کا حربہ استعمال کرتا۔ اورینٹل کالج کی تاریخ ایسے متعدد واقعات سے بھری پڑی ہے جن کی تفصیل 1922 میں اورینٹل کالج سے استاد کی حیثیت سے وابستہ اور پروفیسر سے کالج کے پرنسپل کے عہدے تک پہنچنے والے اور لندن میں ایڈرڈ جی براؤن کے شاگرد ڈاکٹر شیخ محمد اقبال جو 21 مئی 1948 کو اچانک فوت ہو گئے، ان کے فرزند، عربی کے سکالر اور بین الاقوامی یونیورسٹیوں کے استاد ڈاکٹر داؤد رہبر کی تصانیف میں جا بجا ملتی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی بہت شائستہ، شستہ اور بہترین استاد تھے جنہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے 1942 میں ایم اے اور 1946 میں پی ایچ ڈی کی تھی، پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے خصوصی پیش کش کی روشنی میں انہوں نے 1951 میں اورینٹل کالج میں بطور ریڈر (ایسوسی ایٹ پروفیسر) جوائن کیا۔ 1961 میں سکول آف اورینٹل اور افریقن سٹڈیز لندن میں اردو کے استاد ڈاکٹر رالف رسل کی خصوصی دعوت پر وہاں کے شعبہ اردو میں تدریس پر مامور ہوئے۔ 1966 میں واپس آئے اور پروفیسر بنا دیے گئے جب کہ 1970 میں پرنسپل مقرر ہوئے۔ تادم ریٹائرمنٹ تیس سال کی مدت کے بعد انقرہ بطور استاد اردو چلے گئے۔ ایک سو سے زائد کتابوں کے اس مصنف نے ''یاد عہد رفتہ'' کے نام سے آپ بیتی تحریر کی جس میں انہوں نے بڑی دردمندی اور دیانتداری سے پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج میں اپنے تجربات کو بلا کم و کاست بیان کیا ہے۔ آج جب میں یہ کہانی رقم کر رہا ہوں تو جن اساتذہ کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ان میں سے کوئی بھی حیات نہیں۔ ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام آخری نشانی تھے جو 2022 کے دوسرے نصف میں 95 برس کی عمر میں رحلت فرما گئے۔

ایرانی استاد پروفیسر بہمن حبیبی کے فارسی میں فارسی پڑھانے سے جو دقت پیش آ رہی تھی اسے ایرانی ثقافتی مرکز کی فارسی بول چال کی کلاسز نے آسان بنا دیا۔ میں نے آغاز میں عرض کیا تھا کہ خانہ فرہنگ ایران کے نام سے ایرانی ثقافتی مراکز پاکستان کے بڑے شہروں بشمول راولپنڈی، کوئٹہ، پشاور، کراچی اور لاہور میں قائم تھے، فارسی زبان کی تدریس اور ثقافتی سرگرمیوں میں بہت فعال تھے۔ لاہور میں گلبرگ اور مال روڈ پر دو مراکز میں کلاسز ہوتی تھیں جہاں ہمارے شعبے کے اساتذہ ہی کلاسز پڑھاتے تھے۔ میں اور میری کلاس کے طلبا و طالبات نے ترجیحاً مال روڈ والی برانچ میں کلاس چہارم میں داخلہ لیا۔ ٹیکسٹ بکس وہیں سے دستیاب ہو جاتی تھیں۔ لاہور کا مال روڈ پر پینوراما کے نام کا سب سے پہلا شاپنگ سنٹر جو ہمارے سامنے تعمیر ہوا، سے تین چار

دکانیں چھوڑ کر دائیں جانب اس ایرانی ثقافتی مرکز کی زمینی منزل میں لائبریری تھی اور ڈائریکٹر آقای بہاؤالدین اورنگ کا دفتر تھا اوراس کی بالائی منزل میں کلاس روم تھے۔لائبریری میں فارسی اخبارات ورسائل اور کتب پڑھنے کی سہولت موجود تھی۔ میں نے دونوں سینئر کلاسیں یعنی چہارم اور پنجم استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر آفتاب اصغر سے پڑھیں۔ ہر کلاس کے اختتام پر امتحان لیا جاتا اور پہلی تین پوزیشن اور بہترین حاضری پر انعامات دیئے جاتے۔تقسیم انعامات کی تقریب گلبرگ والی برانچ میں ہوتی۔1975 کے دوران ایک ایسی ہی تقریب میں مجھے بھی انعام ملا تھا جس کی بلیک اینڈ وائیٹ تصویر بطور یادگار میرے پاس موجود ہے۔کافی عرصے کے بعد مال روڈ والی برانچ ''بوجوہ'' ختم ہوگئی تاہم گلبرگ والی برانچ اب بھی موجود ہے۔خانہ فرہنگ ایران کی دونوں برانچوں میں جو کلاسیں پڑھائی جاتیں اس میں کوئی بھی داخلہ لے سکتا تھا،کلاسیں مکمل فری تھیں۔ ہمارے ایک ہم جماعت فلمساز و ہدائتکار سبطین فضلی بھی تھے جو اپنی نئی فلم کے پریمئیر شو میں تمام کلاس کو مدعو کرتے۔کلاس جب ختم ہوتی تو ڈاکٹر آفتاب اصغر مرکز کے باہر موجود ہم طالب علموں کے ساتھ کافی دیر تک کھڑے باتیں کرتے رہتے۔کئی دفعہ وہ اپنی گاڑی میں ہوسٹل چھوڑنے بھی گئے۔شعبے میں اکثر پروفیسر بہمن حبیبی کے آفس چلا جاتا اوران سے فارسی بولنے کی مشق کرتا۔وہ فارسی زبان کے میرے شوق سے متاثر تھے۔ ایک دن انہوں نے مجھے بہت سے ایرانی ثقافتی اور علمی وادبی رسائل وجرائد دیئے۔ان میں سخن، یغما، زن روز، بانوان، اطلاعات ھفتگی اور کیہان ورزشی کے متعدد شمارے تھے۔ایران کے اسلامی انقلاب کے بعد کا منظر نامہ چوں کہ پہلے سے سراسر مختلف ہے اس لیے یہ تمام جرائد جنہیں میں نے جلد کرالیا تھا آج بھی آرکائیوز کے طور میرے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہیں جن سے 1974 تا1977 کے دور کے ایران کے علمی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی رجحانات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اب میں ایم اے فارسی میں میں جو نصاب پڑھایا گیا اس پر ایک نظر ڈالتا ہوں۔سماجی علوم کی نسبت زبان وادب سے متعلق مضامین کے نصاب کا اسلوب یکسر مختلف ہوتا ہے۔ انگریزی اوراردو کے مضامین تو بہرصورت انہیں زبانوں ہی میں پڑھائے جاتے ہیں مگر دیگر زبانوں مثلاً عربی اور فارسی کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ایم اے کی سطح کا کسی بھی زبان وادب کا مضمون ہو، اس میں آدھے سے زیادہ پرچے قدیم وجدید شاعروں ونثر نگاروں کی تصانیف کے منتخب متون کے اردو ترجمے یا تشریح اوران پر تنقیدی سوالات پر مشتمل ہونگے۔زبان وادب کی تاریخ میں مختلف اصناف ادب کا مکمل یا عہد بعہد ارتقا اور زبان کی تشکیلی جہات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔اس کے لیے اس زبان کے ملک یا خطے کی سیاسی وسماجی تاریخ کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔متعلقہ زبان کو سیکھنے اور بولنے کو بھی ترجیح دی جاتی ہے لہٰذا زبانوں کا سلیبس اسی دائرے کے اندر محدود رکھا جاتا ہے۔ اردو زبان وادبیات میں اصول تنقید کا پرچہ تھا اصول تحقیق کا نہیں تھا مگر فارسی میں دونوں اہم موضوعات پر کوئی پرچہ نہیں تھا۔ ہمارے مضمون کا نصاب اتنا پرانا تھا کہ شاید ہمارے اساتذہ کی اکثریت نے بھی وہی پڑھا تھا۔

پہلا، دوسرا اور تیسرا پرچہ بالترتیب قدیم نثر، قدیم شاعری اور جدید نظم ونثر کے منتخب حصوں کا اردو ترجمہ/تشریح (60 نمبر) اور تنقیدی سوالات (40 نمبر) معاصر فارسی ادب میں پہلی دفعہ ہماری فائنل کلاس میں تین نئے شعرا کا اضافہ ہوا جن میں نادر نادر پور، نیما یوشیج اور فریدون تولّلی شامل تھے البتہ اقبالیات کے چھٹے پرچے میں دونوں حصے یعنی ترجمہ وتشریح اور تنقیدی سوالات پچاس پچاس برابر نمبرات کے حامل تھے۔ چوتھا پرچہ فارسی ادب کی تاریخ طویل ترین نصاب پر مشتمل تھا جس میں ایران کے ساتھ ساتھ مغلیہ عہد بھی شامل تھا جب کہ پانچواں پرچہ ایران کی ابتدا سے معاصر عہد تک کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ پر مشتمل تھا۔ ساتواں پرچہ فارسی لسانی مباحث یا تحقیقی مقالہ جب کہ آخری اور آٹھواں پرچہ فارسی بول چال اسی سال شروع کیا گیا تھا۔ ہماری کلاس دو سالہ پاس کورس کی آخری کلاس تھی کیوں کہ ہماری سال اول یا پریویس کلاس میں سیمیسٹر کا نظام نافذ کر دیا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ سٹوڈنٹس یونین نے دو سال کے بعد چاروں سمسٹرز کا کمپری ہینسو ٹیسٹ ختم کرا دیا گویا سمسٹر کی روح ہی ختم کر دی گئی۔ اگر میں اپنے نصاب کا بنظر غائر جائزہ لوں تو یہ روائتی قسم کا تھا۔ اس کے مطالعے سے فارسی ادب کے بارے میں تنقیدی بصیرت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ رٹا کی حوصلہ افزائی کرنے والے اس نصاب میں اچھے نمبر لے کر پاس کرنے کی صلاحیت تھی۔ یہ نصاب تنقیدی اور تفصیلی مطالعے اور فارسی زبان کو مکمل سیکھنے کی ترغیب نہیں دیتا تھا۔ متون کے تراجم کے لیے کلاس لازمی تھی جب کہ معاون اردو کتب کی سہولت نہایت محدود تھی۔ ایم اے فارسی میں سعدی کی بیس حکایات اور علامہ اقبال کی پندرہ نظموں پر مشتمل فارسی آپشنل پڑھنے والے بھی داخلہ لے سکتے تھے۔ آج تو ایم۔اے کے ساتھ ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ریگولر کلاسز ہو رہی ہیں اور معاون اور ریفرنس کتب کی دستیابی ہارڈ یا سافٹ شکل میں کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ہمارے وقتوں میں اقبالیات پر تو متعدد کتب تھیں مگر دیگر پرچوں کی مختلف کتب میں تاریخ ایران اور ادب نامہ ایران از مرزا مقبول بیگ بدخشانی، نیا ایرانی ادب اور ایران شناسی از ڈاکٹر ظہور الدین، رضا زادہ شفق اور ای جی براؤن کی کتب کے اردو تراجم پر مشتمل کتب تھیں یا پھر کلاس نوٹس تھے۔ ان دنوں تاج بک ڈپو اردو بازار لاہور ایم اے کے پرائیویٹ امیدواروں کے لیے اردو، تاریخ، سیاسیات اور اسلامیات کے مضامین کے لیے ہر پرچے کی ایک مکمل کتاب شائع کرتا تھا مگر فارسی کے لیے اس نے بھی تمام پرچوں کو تنقیدی سوالات کی حد تک صرف ایک جلد میں شائع کیا ہوا تھا اور وہ کوئی معیاری نوٹس نہیں تھے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ تھی کہ پاس کورس کے نظام امتحان میں ہر کوئی بی اے کے بعد دو سال کی مدت مکمل ہونے پر پہلا ایم اے کا امتحان دے سکتا تھا۔ اس کے بعد ہر سال وہ کسی بھی غیر سائنسی مضمون میں ایم اے کر سکتا تھا۔ ایک اور سہولت کے تحت کوئی بھی ایم اے کے امتحان سے ایک ہفتہ قبل تک پانچ روپے کے عوض رول نمبر جاری کرا کے پیپر دے سکتا تھا۔ اس کا رزلٹ عدم ادائیگی واجبات کے سبب روک لیا جاتا۔ پاس ہو گئے تو بقیہ فیس ادا کر کے نتیجہ حاصل کر لیا جاتا ورنہ خاموشی۔ دو سال مکمل ہونے کے بعد جون جولائی 1976 کے دوران امتحان لیا گیا اور جنوری 1977 میں

رزلٹ آ گیا مگر میرا آپشن تحقیقی مقالے کی تکمیل اوراس کے شفاہی امتحان کے بعد آیا۔ یہ واحد ایم اے تھا کہ جس میں فارسی زبان کا سمجھنا کافی تھا اس کے بولنے پر قادر ہونا ضروری نہیں تھا -اب کالج کا استاد بننے کی بنیادی شرط تو پوری ہو چکی تھی مگر اس نصب العین کا حصول کب ممکن ہوگا اس کا علم تھا نا اس کی پیش گوئی ممکن تھی ہاں رجائیت پسندی یا خواب دیکھنے (آئیڈیلزم) پر کوئی قدغن نہ تھی۔ میں نے مطلوبہ منزل کے حصول تک لاہور کے بڑے دھارے یا مین سٹریم سے نہ نکلنے کا فیصلہ کرلیا۔ میری ہوسٹل کی مدت ختم ہو چکی تھی لہٰذا میں ساتھ کی لا کالج ہوسٹل میں ایک دوست کے کمرے میں منتقل ہو گیا۔

اگر چہ میری شخصیت کے ابتدائی خط و خال گورنمنٹ کالج ساہیوال کی متحرک اور فعال فضا میں ترتیب پا چکے تھے لیکن پنجاب یونیورسٹی اور لاہور کی سماجی، علمی اور ادبی فضا میں سیکھنے کا ارتقائی عمل خاصا تیز ہو گیا بل کہ ایم اے کرنے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے بعد کا دور شعوری ارتقا کے لحاظ سے غیر معمولی رہا۔ اس دوران میں عمومی یا جنرل مطالعے کی طرف راغب ہوا اور فلسفہ، تاریخ، اردو، انگریزی ادب اور سماجی، ادبی اور تہذیبی موضوعات پر تفصیلی مطالعات نے میری کایا کلپ کر دی۔ لبرل طرز فکر اور علمی رویے نے مجھے گویا حیات نو بخشی۔ میں نے ایم اے اردو بھی کرلیا۔ اسلامیہ کالج سول لائنیز کے کیمپس میں واقع حمایت اسلام لا کالج 1972 میں قومیائے جانے کے بعد پہلے گورنمنٹ حمایت اسلام لا کالج کہلایا۔ پھر اسے صوبائی محکمہ قانون کے حوالے کر کے اس کا نام گورنمنٹ لا کالج رکھا گیا مگر ایک سال بعد ہی قائداعظم لا کالج کے نام سے پنجاب یونیورسٹی کے سپرد کر دیا گیا تو میں نے اس کی ایف ای ایل کلاس میں داخلہ لے لیا اور پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس کی ہوسٹل نمبر 19 میں رہائش کی سہولت مل گئی۔ 8 فروری1978 کو میں یہاں نیو کیمپس شفٹ ہو گیا۔ اولڈ کیمپس کے بعد نیو کیمپس رہنا ایک منفرد تجربہ تھا۔ یونیورسٹی لا کالج نیو کیمپس منتقل ہوا تو اولڈ کیمپس والے دوست بھی یہاں شفٹ ہو گئے، کچھ نئے دوست بنے اور ہم سب نے مل کر ایک ادبی تنظیم " کیمپس فورم" کی بنیاد رکھی جس کے ہفتہ وار تنقیدی اجلاس سٹوڈنٹس ٹیچرز سنٹر (ایس ٹی سی) ہال کی بالائی منزل میں ہونے لگے۔ قاضی جاوید، راشد متین، ممتاز کنول، شرجیل انظر، زاہد مسعود، سعید ظفر اور میں اس کا بنیادی حصہ تھے۔ آج پینتالیس سال قبل کیمپس فورم کی کچھ باتیں ذہن میں آج بھی تازہ ہیں۔ مثلاً پہلے اجلاس میں قاضی جاوید نے "بے معنویت کا عہد" کے عنوان سے اپنا مضمون پڑھا۔ دوسرا اجلاس ہوا تو میں نے "ایران کی باغی شاعرہ۔۔۔فروغ فرخ زاد" پر مضمون پیش کیا۔ جن ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ مکالمہ ہوا ان میں عطاالحق قاسمی، منیر نیازی اور موسیقار حسن لطیف کے نام یاد رہ گئے ہیں۔ فارسی افسانوں کا اردو میں ترجمہ کرنا شروع کیا اور فری لانسر کے طور پر روز نامہ امروز، مساوات اور آزاد میں لکھتا رہا۔ لاہور کا میرا یہ عہد اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس دوران دوستوں کی جو صحبت ملی اور اس دوران فلسفہ اور تاریخ و دیگر سماجی علوم کی جو کتب مطالعے میں آئیں تو ان سے جو ذہنی افق میں پہلے کی نسبت بے حد اضافہ ہوا، اس نے میرے اندر ایسی طاقت اور خود

اعتمادی پیدا کر دی جس نے میری شخصیت کو نئی جہتوں سے آشنا کیا اور یہ باتیں مجھے عملی زندگی کے دوران بہت کام آئیں۔

اب واپس فارسی کی جانب آتے ہیں۔ جولائی 1977 کو جب جنرل ضیاالحق نے جمہوریت پر شب خون مارا تو بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس نے بسر اقتدار آنے کے بعد تمام وفاقی اور صوبائی محکموں میں ایڈ ہاک اور مبینہ طور پر میرٹ سے ہٹ کر کی گئی تقرریوں کو بیک جنبش قلم منسوخ قرار دے دیا۔ دیگر محکموں کا تو معلوم نہیں مگر ماہ مئی 1978 کے دوران پنجاب پبلک کمیشن کی طرف سے مختلف مضامین کی خالی سیٹوں پر باقاعدہ بھرتی کا اعلان کیا گیا۔ اس کے چند دن بعد ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن (ڈی پی آئی) پنجاب نے ایڈ ہاک تقرریوں کے لیے پینل بنانے کے لیے فارسی سمیت دیگر مضامین کے لیے درخواستیں طلب کیں۔ 10 جون 1978 کو میں نے ایڈ ہاک لیکچرر فارسی کا انٹرویو دیا جس میں ڈاکٹر حامد خان حامد صدر شعبہ فارسی گورنمنٹ کالج لاہور نے بطور ماہر مضمون شرکت کی اور ڈی پی آئی پروفیسر ڈاکٹر سید صفدر حسین تھے۔ میرے نقطۂ نظر سے یہ انٹرویو نا صرف شاندار رہا بل کہ یکم جولائی کو پنجاب پبلک سروس کمیشن میں ہونے والے انٹرویو برائے مستقل تقرری میں کامیابی کا بھی پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اب اطمینان تھا کہ کالج کا استاد بننے کا خواب پورا ہونے جا رہا تھا مگر ایک افتاد نے آلیا۔ جب کمیشن نے تمام مضامین کی سفارشات محکمہ تعلیم کو بھیج دیں اور ان کی روشنی میں تقرریوں کا عمل شروع ہونے جا رہا تھا کہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر (سی۔ ایم۔ ایل۔ اے) کی طرف سے حکمنامہ موصول ہوا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ کمیشن کی سفارشات کو منسوخ کر کے این۔ ڈی۔ وی۔ پی استادوں کو باقاعدہ کیا جائے۔ یہ ایک انہونی تھی جس نے میرے جیسے متعدد بیروزگاروں کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ پتا یہ چلا کہ بھٹو دور حکومت میں نیشنل ڈویلپمنٹ والنٹئر پروگرام یعنی این۔ ڈی۔ وی۔ پی کے تحت مختلف مضامین میں ایم اے پاس نوجوانوں کو 335 روپے ماہوار کے متعین وظیفے پر مختلف کالجوں میں پڑھانے کے لیے تعینات کیا گیا تھا۔ ان کے ایک وفد نے سی ایم ایل اے کی خدمت میں حاضر ہو کر دہائی دی کہ ہم کئی برسوں سے ایک متعین اور معمولی مشاہرے پر ریگولر اساتذہ کے معیار پر تدریس کر رہے ہیں لہٰذا انصاف کا تقاضا ہے کہ انہیں مستقل کیا جائے جس سے متاثر ہو کر یہ حکم جاری کیا گیا۔ محکمہ تعلیم نے جوابی سمری میں مؤقف اپنایا کہ کمیشن کی سفارشات منسوخ نہیں کی جا سکتیں البتہ این۔ ڈی۔ وی۔ پی استادوں کو کمیشن میں ایک خصوصی انٹرویو سے گزارا جا سکتا ہے۔ یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ کل این۔ ڈی۔ وی۔ پی استادوں کے برابر پوسٹیں محفوظ کر لی جائیں اور ان کی تعداد سے زائد والی پوسٹوں والے مضامین کی تقرریوں کا عمل شروع کر دیا جائے۔ اسے منظور کر لیا گیا اور اکتوبر میں اس پر عمل درآمد شروع کر دیا گیا۔ ہمارے جیسے مضامین پر تقرریاں روک دی گئیں اور یوں ہمیں این ڈی وی پی کے انٹرویو تک انتظار کی سولی پر لٹکا دیا گیا۔ میرے مضمون میں ظاہر کردہ چار سیٹیں اور چار ہی این ڈی وی پی تھے۔ اس کے باوجود کہ فارسی کی متعدد پوسٹیں خالی پڑی تھیں مگر

بیورو کریسی کا کام کرنے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔۔نومبر کے آخر تک زیادہ تر مضامین میں تقرریوں کا عمل مکمل ہو چکا تھا اور کمیشن میں این ڈی وی پی استادوں کے خصوصی انٹرویو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔جنوری 1979 کے آخری ہفتے معلوم ہوا کہ خصوصی انٹرویو میں صرف دو این ڈی وی پی کامیاب ہوئے۔اس طرح اب تقرری کے لیے راستہ صاف ہو چکا تھا۔محکمہ تعلیم نے مختلف مضامین کی خالی پوسٹوں کا دوبارہ جائزہ لیا تو سیٹیں زیادہ ہو گئیں۔اب طے یہ ہوا کہ ڈی پی آئی نے جو پینل ایڈ ہاک کے لیے بنائے تھے اس میں کامیاب امیدواروں کو تقرر نامے خود محکمہ تعلیم جاری کرے گا اور ریگولر تقرری کے لیے آفر لیٹر محکمہ جاری کرے گا اور تقرری کا لیٹر ڈی پی آئی کی طرف سے جاری ہو گا مگر خالی سیٹوں کے حوالے سے دونوں میں ہم آہنگی کا فقدان تھا۔4 فروری 1979 کو میرا آفر لیٹر اور 13 فروری کو خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان کے لیے تقرر نامہ جاری کر دیا گیا۔میرا ایک طویل خواب پورا ہونے جا رہا تھا،اضطراب اور بے چینی جاتی رہی مگر ایک تشویش ضرور تھی کہ مجھے تو رحیم یار خان کی صحیح لوکیشن کا بھی علم نہیں تھا۔دوسری طرف ذہنی طور پر تیار ہونے کے باوجود تقریباً پانچ سال لاہور میں رہنے کے بعد اس شہر کو چھوڑنا جذباتی طور پر مشکل سا لگ رہا تھا اس لیے آئندہ پانچ دن میں نے لاہور میں اپنے معاملات کو آخری شکل دی اور 18 فروری کو گاؤں چلا آیا جہاں پرنسپل خواجہ فرید کالج رحیم یار خان کی طرف سے ایک خط موصول ہو چکا تھا جس میں پندرہ روز کے اندر جوائن کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ محکمہ تعلیم نے محمد شریف چودھری کو ایڈ ہاک پر میری سیٹ کے آرڈر دے کر بھیج دیا تھا۔ میرے آرڈر بھی وہاں پہنچ چکے تھے مگر پرنسپل نے ایڈ ہاک کی بجائے کمیشن کے سفارش کردہ مستقل استاد کو ترجیح دینے کا فیصلہ کیا اسی لیے مجھے 15 روز کی مجوزہ مدت کے اندر جوائن کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ میں 20 فروری کو صبح دس بجے ساہیوال سے اباسین گاڑی پر سوار ہوا اور دس گھنٹے کی طویل اور تھکا دینے والی مسافت کے بعد شام آٹھ بجے رحیم یار خان کی سرزمین پر پہلا قدم رکھا اور کسے معلوم تھا کی یہ پہلا قدم پھیل کر سولہ سال کا طویل دورانیہ بن جائے گا۔بہرحال میں نے 21 فروری 1979 کو کالج میں جوائن کیا اور اتفاق سے فارسی کے معروف استاد اور ہمارے استادوں کے کلاس فیلو پروفیسر عبدالعزیز جاوید اس دن قائم مقام پرنسپل تھے جنہوں نے بخوشی مجھے جوائن کرایا۔اب میں کالج میں فارسی کا باقاعدہ استاد بن چکا تھا گویا زندگی کا ایک خواب شرمندہ تعبیر ہونے کے ساتھ ایک نئی آزمائش کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔بقول منیر نیازی:۔

ایک اور دریا کا سامنا تھا منؔیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

وہ آزمائش کیا تھی اس کی تفصیل سے پہلے دو مختصر باتیں۔جب میں فارسی میں ایم اے کا طالب علم تھا تو تب سے لوگ مضمون کے بارے میں پوچھتے تو میں کہتا: فارسی۔جواب آتا، "پڑھو فارسی بیچو تیل" تو میں اسے مکمل کر دیتا: دیکھو قدرت کے یہ کھیل"۔پوچھنے والا اور جواب دینے والا دونوں مسکرا دیتے۔استاد بننے

کے بعد جب مضمون کے جواب میں "فارسی" کہتا تو حیرت کے ساتھ جواب ملتا اچھا!! کیا فارسی اب بھی لوگ پڑھتے ہیں تو میں دفاعی انداز میں کہتا، جی بالکل پڑھتے ہیں۔ میں جب لاہور چھوڑ رہا تھا تو ہوسٹل نمبر 14 کے درمیانی لان میں گورنمنٹ کالج ساہیوال کے کلاس فیلو دوست اور انگلش کے آخری سیمیسٹر کے طالب علم فرید فرخ (جو فارن سروس میں چلے گئے) کے ساتھ بیٹھا تھا تو میں نے اسے بتایا کہ میری تقرری بطور لیکچرر ہو چکی ہے اور میں ایک دو دن تک جوائن کرنے جا رہا ہوں، ابھی تمہارا تو سمیسٹر چل رہا ہے۔ اس نے جو جواب دیا وہ میرے ذہن سے چپک سا گیا۔ کہنے لگا: تم پہلے جاؤ یا میں بعد میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر ایک بات یاد رکھو، ہم جب اور جہاں بھی ہونگے، تم فارسی کے استاد اور میں انگریزی کا استاد ہونگا، فرق تم خود دیکھ لینا۔ اس کی بات میں بہت بڑی حقیقت اور معنویت تھی جس کا احساس مجھے جوائن کرنے کے فوراً بعد ہی ہو گیا تھا جب مجھے پتہ چلا کہ فارسی کی تو کلاس ہی نہیں تھی۔ میں نے تو استاد بننے کے بعد خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے کہ کلاس روم میں بہت سے طالب علم ہونگے اور میرا طریقہ تدریس ایسا ہونا چاہیے جو مجھے اپنے اساتذہ سے میراث میں ملا۔ میں بطور استاد ایک مہربان رہنما کا کردار ادا کروں گا۔ جب بھی میری ضرورت ہو گی ہمیشہ اپنے بچوں یعنی طلبا کی رسائی میں رہوں گا۔ انہیں نصاب کے ساتھ ساتھ عمومی یا جنرل مطالعے کی ترغیب دوں گا جس سے ان کا ذہنی افق وسیع ہو گا اور ان میں خود اعتمادی پیدا ہو گی۔ ان کی شخصیت کی تہذیب اور نصب العین کے حصول میں کردار ادا کروں گا۔ میں نے استاد کا یہ تصور اپنے متعدد اساتذہ اور مغلیہ عہد میں فارسی کے ایرانی شاعر نظیری نیشاپوری کے اس شعر سے کشید کیا تھا۔

درس ادیب گر بود زمزمہ محبتی
جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پای را

(اگر استاد کا سبق محبت کا گیت بن جائے تو مکتب سے گریزاں بچہ چھٹی (جمعہ) کے روز بھی آئے گا)

اب میں نے یہ جان لیا کہ فارسی مضمون کی وہ اہمیت نہیں رہی جو ہمارے کالج کے دنوں میں تھی گویا صرف پانچ سال کی مدت میں یہ صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ دراصل نئے مضامین کے آ جانے سے مقابلے کی فضا جنم لے چکی تھی۔ سوشیالوجی، پنجابی، ہیلتھ اینڈ فزیکل ایجوکیشن، لائبریری سائنس سے براہ راست مقابلہ تھا اور فارسی، فلسفہ، عربی اور تاریخ آخری سانسوں پر تھے بل کہ کالجوں میں فلسفے کے مضمون کی تو موت واقع ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن اور عظیم سماجی مرتبے کی علامت فارسی زبان کا اپنا مرتبہ یہاں تک آ گیا تھا کہ لوگ مضمون کے حوالے سے استاد کی شخصیت کے بارے میں ایک اوسط درجے کی رائے قائم کرتے تھے اور مذاقاً وہ سوال پوچھتے یا ریمارکس دیتے تھے جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اب فارسی میرے لیے ایک طویل جدوجہد اور بقا کا نام بن چکا تھا۔ پھر فارسی کے عظیم شاعر اور معلم اخلاق سعدی شیرازی کے اس شعر نے مجھے جدوجہد کرنے اور آگے بڑھنے کی ترغیب دی۔

گر در طلبت ما را رنجی برسد شاید
چون عشق حرم باشد سہل است بیابانہا

(اگر تیری محبت میں ہمیں تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو یہ اچھا بھی ہے کیوں کہ اگر کعبے کا عشق سچا ہو تو (راستے میں آنے والے) جنگل وصحرا بھی آسان ہو جاتے ہیں۔

اس شعر نے مجھ پر گویا یہ واضح کر دیا کہ نصب العین سے کمٹ منٹ ہو تو کچھ مشکل نہیں رہتا۔ میں نے بازار میں آنے والے دیگر مضامین (پروڈکٹس) کے مقابلے میں اپنی پروڈکٹ یعنی فارسی مضمون کا سیلز مین بننے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے لیے مجھے مضامین کی اس مارکیٹ میں اپنے مضمون کی طرف طلبا کو مائل کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے میں نے اپنے ذہن میں مرحلہ وار مختلف اقدامات اور ترجیحات کو ترتیب دیا۔ فارسی کی لسانی و ادبی اہمیت تو مسلمہ تھی مگر ان باتوں کو نئے دور میں اہمیت حاصل نہیں تھی لہٰذا میں نے فارسی مضمون کو ایک "معاون اور سپورٹنگ مضمون" کے طور پر متعارف کرانے کا فیصلہ کیا یعنی فارسی رکھو اور ڈویژن بہتر بناؤ۔ سب سے پہلے میں عربی کے استاد سے ملا اور ان سے درخواست کی کہ مجھے عربی کی بی اے آپشنل کلاس کے کچھ طالب علم دے دیں تاکہ میں بطور استاد اپنا کام شروع کرسکوں۔ انہوں نے کمال مہربانی سے کہا، آپ تمام کلاس ہی لے لیں یوں میں نے 25 طلبا سے کلاس کا آغاز کیا اور عربی کے استاد میرے بہت ممنون بھی ہوئے کہ میں نے ان کا بوجھ بانٹ لیا تھا حالانکہ ان کے پاس اختیاری کی صرف ایک کلاس ہی تھی۔ ایک ہفتے کے بعد دیگر مضامین کے آپشنل طلبا بھی میری کلاس سے آن ملے اور یوں ہفتے میں گو مجوزہ پیریڈ تین تھے مگر میں نے ایک پیریڈ بڑھا دیا جس میں نصاب کی بجائے طلبا کی تربیت کے نقطۂ نظر سے جنرل موضوعات پر گفتگو کی جاتی جو طلبا کو بہت بھائی اور میں نے اسے اپنے ارتقاپذیر تدریسی اسلوب کا ایک مستقل حصہ بنالیا اور ہفتے میں ایک جنرل پیریڈ ہمیشہ اور ہر کلاس میں جاری رہا۔ اب میں اردو لازمی کی مختلف کلاسز میں گیا اور انٹر سال اول کے لیے اختیاری مضمون کے سات طلبا کی کلاس بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اس کلاس کو فوراً نصاب پڑھانا شروع نہیں کیا بل کہ ایک ایسا انداز اختیار کیا جو مستقل طور پر میرے تدریسی اسلوب کا ایک بنیادی وصف قرار پایا مثلاً میں ہر نئی کلاس کے پہلے پیریڈ میں تعارف کے بعد اپنی گفتگو کا آغاز کچھ اس طرح کرتا۔ (اسے آپ فارسی مضمون کی سیلز مین شپ کا پہلا مرحلہ کہہ سکتے ہیں)۔

''پیارے طلبا! میں آپ کو فارسی کی کلاس میں خوش آمدید کہتے ہوئے آپ کو مبارک پیش کرتا ہوں کہ آپ نے ایک اچھے سپورٹنگ یا معاون مضمون کو منتخب کیا ہے جو صرف آپ کی ڈویژن ہی بہتر نہیں بنائے گا بل کہ آپ کی قومی زبان اور لازمی مضمون اردو کو بہتر بنانے میں بھی آپ کی مدد کرے گا۔ اگر میں آج آپ سے یہ کہوں کہ آپ فارسی زبان سے واقف ہیں کیوں کہ آپ اردو جانتے ہیں تو آپ کو تعجب نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ آپ اردو کے ذریعے فارسی زبان کے متعدد الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو فارسی سے اردو میں آئے۔

آپ جانتے ہیں کہ انگریزی میں جسے آپ 'ورب' کہتے ہیں، اردو میں وہ 'فعل' ہے اور فارسی میں 'مصدر' کہلاتا ہے۔ اردو میں فعل کی نشانی یہ ہے کہ اس کے آخر میں "نا" آتا ہے جیسے آنا، جانا، کہنا، سننا، پڑھنا، اٹھنا، بیٹھنا وغیرہ۔ اس طرح فارسی میں مصدر کے آخر میں "ن" آتا ہے جیسے آمدن، رفتن، شنیدن، خواندن، برخاستن، نشستن وغیرہ۔ فعل مضارع بھی فارسی سے اردو میں آیا۔ متکلم (فرسٹ پرسن) حاضر (سیکنڈ پرسن) اور غائب (تھرڈ پرسن) کے صیغے بھی فارسی سے آئے۔ آپ آمد ورفت کہتے ہیں تو یہ فارسی کے آمدن اور رفتن سے ہے۔ آمدن سے آنا اور رفتن سے جانا، رفتار اور روانگی ہے۔ گفتن سے گفتگو اور شنیدن سے سننا اور شنید، خواندن سے خواندگی، برخاستن سے برخاست، نشستن سے نشست، شناختن سے شناخت اور شناسائی، کاشتن سے کاشت اور کاشتکار، دانستن سے دانست، دانستہ اور دانا، خوابیدن سے خواب، خریدن سے خرید اور خریدنا وغیرہ"۔ اس کے بعد میں فارسی زبان کے الف با یعنی حروف تہجی بتاتا۔ اس لیکچر کا اگلا حصہ جملہ بنانا ہوتا۔"

یہ فارمولہ قسم کی گفتگو ہر پہلی کلاس کے پہلے ایک دو دن کے لیے ہمیشہ متعین رہی۔ اس سے طلبا خاصے پرسکون ہو جاتے۔ یوں پہلی بار ایک اختیاری اور ایک آپشنل کلاس سے میرا سفر شروع ہو گیا۔ سال اول کے سات طلبا بڑھ کر 16 ہو گئے اور میری پہلی کوشش بارآور ثابت ہوئی۔ انٹر کے نصاب کے لیے دو سال کے دوران ایک ہی کتاب "جواہر ادب" پڑھانی تھی، یہی نصاب ہم نے بھی پڑھا تھا اور شاید ہمارے کالج کے استادوں نے بھی، بعد میں ہر سال کے لیے ایک کتاب کا نصاب آیا یعنی فارسی یازدہم اور فارسی دوازدہم۔ ڈگری پر اختیاری کی دو کتابوں کا نصاب گنج دانش اور گنج ادب اور آپشنل کا نصاب سب پنجاب یونیورسٹی کے منظور کردہ تھے۔ تدریسی سٹاف کے لوگ پہلے رشک اور طنز کی ملی جلی کیفیت کے حامل جملے کستے، " کتنے خوش قسمت ہو بھائی کہ کوئی پیریڈ ہی نہیں، عیش ہیں بھائی، جب کہ ہمیں روزانہ چار چار پیریڈ ادھموا کر دیتے ہیں۔ جب میری کلاسز بن گئیں تو کہنے لگے یار دیکھو تمہارا ایک ڈیڑھ پیریڈ روزانہ اور ہمارے۔ !! کسی بھی تعلیمی ادارے یا کالج میں سٹاف روم ایک سماجی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی جگہ تمام تدریسی سرگرمیوں کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ اساتذہ یہیں سے پڑھانے جا رہے ہیں یا پڑھا کر آ رہے ہیں۔ چائے پینے، ریلیکس ہونے، تعلقات سازی، باہمی ملاقاتوں اور گفتگو کا مرکز بھی سٹاف روم ہی ہوتا ہے۔ میں نے آغاز ہی سے اس سماجی اکائی کا نمایاں حصہ بننے کی کوشش کی اور یہاں کی گپ شپ میں بھرپور حصہ لینا شروع کیا جس سے میرے بارے میں فارسی استاد کے پائے جانے والے اوسط اور روایتی تصور کے برعکس رائے قائم ہوئی۔ اس میں ان مختلف سماجی علوم کی مبادیات اور اردو وانگریزی ادب کے مطالعے کا شوق اور معمول کا بھی کردار تھا کہ جس سے میں ہمیشہ گفتگو اور علمی مباحث میں گرم جوشی سے حصہ لیتا رہا۔ کتب اور ادبی وعلمی رسائل وجرائد کی خرید اور مطالعے کا جنون گورنمنٹ کالج ساہیوال کے دور سے شروع ہو کر زندگی بھر ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ کالج کی طرف سے دی گئی کسی بھی اسائنمنٹ کو نیک نیتی اور خلوص سے ادا کرتا رہا۔ شہر یا کالج کی سماجی زندگی میں نظریاتی

وابستگی سے بالا ہو کر تعلقات بنتے رہے۔ میں بنیادی طور پر محبت، اخلاق اور خلوص کا قائل رہا ہوں اور کسی بھی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنا آپ سو فیصد دینے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ میرا مضمون بھی اس طرح کی محنت کا طالب اور متقاضی تھا۔

فارسی کے استاد کے طور پر جوائن کرنے کے بعد آئندہ دو سال اپنے مضمون کی کلاسیں بنانے اور کالج میں اپنی شناخت بنانے میں گزر گئے۔ اب مضمون کی ترقی اور پھیلاؤ کے لیے متعین کردہ ترجیحات میں مزید پیش رفت کرنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ میں نے بہاول پور ڈویژن کے کالجوں میں اُس وقت موجود فارسی کی پوسٹوں اور اساتذہ کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں اور فارسی کے اساتذہ کو خط لکھا جس کا متن قریب قریب مندرجہ ذیل تھا۔

"جناب/محترمہ۔۔۔۔۔۔السلام علیکم۔ میں ہوں نسیم بلوچ استاد فارسی خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان۔ میں آپ کی توجہ اپنے مضمون فارسی کی موجودہ حالت زار کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ نئے مضامین متعارف ہونے کی وجہ سے ہمارے مضمون کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ ماضی میں جس مضمون کی ایک کلاس میں سیکشن ہوا کرتے تھے وہی اب کالج کی سطح پر بہت پیچھے چلا گیا ہے۔ بہاول پور ڈویژن کے موجودہ 27 کالجوں میں فارسی کی کل پوسٹیں چودہ ہیں جب کہ دس پر اساتذہ موجود ہیں مگر طلبا و طالبات کی کل تعداد اتنی کم ہے کہ ورک لوڈ پورا نہ ہونے کے باعث خصوصاً خالی پوسٹیں کنورشن کے خطرات سے دوچار ہیں۔ علاوہ ازیں طلبا کی انتہائی کم تعداد کے باعث بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانات میں سنگل ممتحن سے ہی کام چلایا جا رہا ہے۔ میں نے کچھ عرصہ قبل فارسی کا "معاون" یا سپورٹنگ مضمون کا تصور پیش کیا تھا جس میں کامیابی حاصل ہوئی یعنی ڈویژن بہتر بنانے کے لیے اس مضمون کو رکھیں اور اچھے نمبر حاصل کریں کیوں کہ اس میں اردو میں تراجم اور تشریح کے سوالات کا حصہ اسی فی صد تک ہے۔ اس کے لیے سینئر اساتذہ جو پرچہ ساز اور ممتحن ہیں ان سے درخواست کی جائے کہ وہ ترجمے اور تشریح کے لیے نسبتاً دلچسپ اور آسان متن اور اشعار کو پرچے میں شامل کریں۔ صحیح ترجمے، معقول تشریح، شاعر یا نثر نگار پر اچھے نوٹ پر اچھے نمبر دیے جائیں۔ اردو سے فارسی کے لیے آسان جملے یا عبارت کا انتخاب کریں۔ اس اقدام سے نمبر زیادہ آئیں گے تو طلبا و طالبات کی تعداد بڑھے گی۔ اس میں صرف فارسی ہی نہیں بل کہ ہماری بھی بقا ہے۔" میری اس درخواست کا خاطر خواہ اثر ہوا اور سینئر اساتذہ نے بھی تعاون کیا اور یوں فارسی مضمون کے پھیلاؤ کا آغاز ہوا اور ایک اندازے کے مطابق اگلے پانچ سال میں طلبا و طالبات کی تعداد پچاس فی صد تک بڑھ گئی۔ سینئر اساتذہ ریٹائر ہو چکے تھے۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں فارسی کا شعبہ 1985 سے آغاز کر چکا تھا اور بورڈ آف سٹڈیز میں اب میرے جیسے اساتذہ کی باری تھی۔ میں نے اس حیثیت میں پرچہ سازی اور ممتحن کے لیے کالجوں کے اساتذہ کو ترجیح دلائی اور فارسی مضمون کو گویا پر لگ گئے۔ ریگولر کی نسبت پرائیویٹ امیدواروں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ

اب ایک صدر ممتحن اوراس کے ساتھ تین یا چار نائب ممتحن ہوتے۔فارسی شعبہ کے اساتذہ کو ہم نے اس طرف نہیں آنے دیا تا آنکہ کالجوں کے فارسی اساتذہ کم پڑ گئے تو مجبوراًان کی طرف بھی پرچوں کے بنڈل بھیجے جانے لگے البتہ انٹر کی مارکنگ کالج اساتذہ تک محدود رہی۔ محکمہ تعلیم کالجز ونگ کچھ سالوں کے بعد تمام مضامین کی اسسٹنٹ پروفیسر کی کچھ خالی پوسٹیں ڈائریکٹ سلیکشن کے لیے پنجاب پبلک سروس کمیشن کو بھجتا تھا۔ 1984 میں ایسا ایک اشتہار شائع ہوا-اس کے لیے تدریسی تجربہ پانچ سال اور فرسٹ ڈویژن بنیادی شرط تھی۔اس موقع سے میں اس لیے فائدہ نہ اٹھا سکا کیوں کہ درخواستوں کی آخری تاریخ تک میرے تدریسی تجربے میں دس دن کم تھے۔اس کے چار سال بعد 1988 بیج کے لیے ڈائریکٹ پوسٹوں کا ایک اور اشتہار آیا تو میں نے بھی درخواست بھیج دی۔اس وقت لیکچررز کی طرح فرسٹ ڈویژنز اور انٹرویو کے چالیس چالیس نمبر اور 20 نمبر متفرق کیٹگریز کے تھے۔میں اس بیج میں ڈائریکٹ سیلیکٹ ہوگیا مگر انٹرویو میں ایک سوال کے معیار نے مجھے حیران کر دیا۔ماہرین نے تو مضمون کے حوالے سے سوال کرنے ہی تھے۔سیلیکشن بورڈ کے سربراہ نے بھی مجھ سے لیپ سال کی وجوہات کا سوال پوچھا جس کا میں نے درست جواب دے دیا۔محکمانہ نمائندہ نے مجھ سے یہ سوال پوچھا۔اسلام کے ارکان کتنے ہیں؟ اب یہ تو ہر مسلمان بچے کو ابتدا ہی سے معلوم ہوتا ہے بل کہ اسلام کا پہلا اور بنیادی سبق ہی یہی ہے۔اٹھارویں گریڈ کی اسسٹنٹ پروفیسر کی پوسٹ کے انٹرویو میں اس وقت جنرل نالج کے سوالات کا معیار یہی رہ گیا تھا؟ بہر حال اپریل 1989 میں میری پوسٹنگ گورنمنٹ کالج خان پور ضلع رحیم یار خان ہوگئی تاہم میری رہائش رحیم یار خان ہی میں رہی اور روزانہ کی بنیاد پر میں خان پور آتا جاتا رہا۔اب تک فارسی میں طلبا کی نسبت طالبات کی تعداد میں بے حد اضافہ ہو رہا تھا۔جب میں خان پور کالج میں تھا تو گرلز کالج میں فارسی کی استاد کی سیٹ خالی ہوگئی۔پرنسپل کی درخواست پر میں نے ہفتے کے تین روز اپنی کلاسز پڑھا کر گرلز کالج کی انٹر اور ڈگری کلاسز کو فی ہفتہ ایک پریڈ ایک کلاس پڑھانا شروع کر دیا۔طالبات کی تعداد کا ایک کلاس روم میں سمانا مشکل ہو جاتا لہٰذا ایک تین سٹوڈنٹس والے بینچ پر چار چار طالبات کو بیٹھنا پڑتا۔ جب میں خان پور سے ٹرانسفر ہوا تو یہ سلسلہ ترک ہوگیا۔میں تو فارسی کا استاد تھا اور فارسی کے مضمون کی مقبولیت کو بڑھانا میرا مشن تھا اس لیے میں نے کسی مالی منفعت کے بغیر پڑھایا جب کہ میرے بعد جس پرائیویٹ استاد کو پڑھانے پر مامور کیا گیا اس نے انٹرو ڈگری پارٹ اول و دوم اور ڈگری آپشنل کی پانچ کلاسوں سے فی طالبہ ایک متعین رقم وصول کی۔رحیم یار خان میں میرے سولہ برس گزرے۔اس عرصہ کے دوران میں نے وہاں کی تہذیبی اور علمی سرگرمیوں میں فعال اور متحرک کردار ادا کیا۔تین سال تک ہر ماہ خواجہ فرید گورنمنٹ کالج کا گزٹ شائع کیا۔1988 کے دوران بزم فیض قائم کی اور سیکرٹری کی حیثیت سے چھ سال تک بائیں بازو کے شاعروں،ادیبوں اور دانشوروں کو اس فورم پر پہلے پندرہ روزہ اور بعد میں ہفتہ وار اجلاسوں میں اکٹھا کیے رکھا - فارسی کے معروف استاد پروفیسر عبدالعزیز جاوید کے بھانجے اور رحیم یار خان کی وضع دار تہذیبی اور سماجی

شخصیت ڈاکٹر عبدالخالق کے حلقہ دوستاں کا چھ سال تک حصہ رہا۔ خان پور کالج سے کالج میگزین کے تین شمارے نکالے جن میں آخری شمارہ "ضلع رحیم یار خان نمبر" تھا جسے بہت پذیرائی ملی۔ ستمبر 1994 کو میں نے اپنا تبادلہ بہاول پور کے ڈگری کالج میں کرالیا۔

1982 سے 1985 کے درمیان جو ڈائنامکس متعین کر دی گئی تھیں ان کے تحت بہاول پور ڈویژن کے کالجوں میں فارسی اب مقبول ترین مضمون کا درجہ اختیار کر چکی تھی اور ہر سال اس میں تیزی سے اضافہ جاری تھا۔ بیچ میں کچھ دیر اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی میں ڈیپوٹیشن پر چلا گیا جہاں دن رات ایک کر کے شعبے کو گمنامی سے نکال کر یونیورسٹی میں اس کی نمایاں شناخت قائم کی۔ اس دوران بھی میں کالج کی سطح پر فارسی کی اشاعت سے غافل نہیں رہا بل کہ اب یہ اضافہ ایک خودکار طریقے سے جاری تھا۔ 1995 کے دوران یونیورسٹی اور کالج کے مجھ سمیت چار دوستوں نے "چولستان علمی و ادبی فورم" کا آغاز کیا جو ایک کارواں کی صورت اختیار کر گیا اور اب تک یعنی 2025 میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ گورنمنٹ ڈگری کالج بغداد روڈ میں وائس پرنسپل رہا اور کالج آفس اور اکیڈیمک شعبہ کی ذمہ داریاں نبھائیں۔ یہاں پر خاص طور پر انگریزی ڈرافٹنگ کو خاصی حد تک بہتر بنایا۔ یکم اگست سے 14 اگست 1996 کے دوران ایرانی ثقافتی مرکز ملتان میں دو ہفتے کے فارسی دورہ باز آموزی میں شرکت کی جب کہ جولائی 1997 میں مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد کے تحت منعقدہ 21 روزہ ریفریشر کورس میں بہت کچھ جاننے اور سیکھنے کو ملا۔ اس کورس کے دوران پاکستان بھر کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے منتخب اساتذہ سے ملاقات اور تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔ 1998 میں ایران کے شہر تہران میں فارسی کے ایک ماہ پر مشتمل ریفریشر کورس (دورہ دانش افزائی) میں شرکت کی۔ ایران کے شہر تہران میں گزرا ایک ماہ ایران کی معاشرتی اور ثقافتی اقدار کو جاننے کے حوالے سے بہت اہم تھا۔ منتظمین کی نظر ہر شرکت کنندہ پر تھی۔ ہم صرف وہاں جا سکتے تھے جہاں وہ ہمیں لے جاتے۔ صبح اور شام کو ایک مختصر وقفے سے اساتذہ کی تربیت کنندہ یونیورسٹی (دانشگاہ تربیت مدرس) میں کلاسیں ہوتیں۔ ہفتہ وار دو تعطیلات میں مقامی سطح پر کوئی ٹور پروگرام ہوتا۔ ہفتے میں ایک بار شام کو ''مخبرات''، یعنی ٹیلیفون ایکسچینج لے جاتے یا شاہ کے محلات دکھائے گئے جنہیں ''عبرت کدوں'' کے طور پر محفوظ کیا گیا تھا۔ باہر کا ٹور صرف مشہد کا لگا جہاں امام رضا کے روضے کی زیارت اور نادر شاہ افشار کے مقبرے کا مشاہدہ شامل تھا۔ علاوہ ازیں مشہد کے قریبی شہر نیشاپور، طوس اور سبزوار میں عمر خیام، فردوسی، فریدالدین عطار اور قاچاری دور میں جدید ایرانی مصوری کے موجد کمال الملک کے مقابر اور امام غزالی کا مدرسہ بھی دیکھے۔ ایران میں ایسی جگہیں دیکھتے وقت بہت خوشگوار حیرت اور خوشی کے ملے جلے احساسات ہوتے کہ جن شاعروں اور جگہوں کے بارے میں کتب میں پڑھتے آ رہے تھے ان میں سے چند ایک کو اصلی صورت میں بھی دیکھ لیا۔ تہران میں غزالی فلم سٹوڈیوز، فوک میوزک شو اور تہران کا عجائب گھر جانا بھی اچھا لگا۔ تین منزلہ کتابوں کی دکان ''شہرِ کتاب اور تہران یونیورسٹی کے سامنے خیابان آزادی پر

واقع کتابوں کی دکانوں سے دل کھول کرخریداری کی۔ٹور کے اختتام کے بعد روانگی سے قبل ایک دن کے لیے شہر میں آزادانہ گھومنے کی اجازت ملی۔قدیم ترین تہذیبی اثرات کے تحت ان کی اجتماعی جمالیات تو بلا مبالغہ زبردست ہے مگر اداروں میں گروہ بندی، انتہائی تکلفات پر مبنی گفتگو، منافقت، انگریزی سیکھنے کا جنون اور شدید قسم کی ضعیف الاعتقادی جیسی باتیں بھی دیکھنے کو ملیں۔

2 مئی 2000 کو ایسوسی ایٹ پروفیسر بنا تو گورنمنٹ کالج حاصل پور میں پرنسپل کے طور پر تقرری ہوگئی۔اب مجھے یہ بھی ثابت کرنا تھا کہ فارسی کا استاد ایک کامیاب منتظم بھی ہوسکتا ہے۔نومبر 2004 میں پرنسپل گورنمنٹ کالج یزمان ضلع بہاول پور میں بطور پرنسپل تقرر ہوا۔دونوں کالجوں کے بیچ میں کچھ دیر ایگزیکٹو ڈسٹرکٹ آفیسر ایجوکیشن ضلع بہاول پور کے طور پر بھی کام کیا۔ یہاں بھی میں نے اپنے مضمون سے ملنے والی اخلاقیات کو استعمال میں لا کر مطلوبہ معیار کی اقدار کو فروغ دیا۔ پرنسپل کی حیثیت سے میں نے طالب علم پر فوکس کیا اور ادارے کے مفاد میں اپنی انتظامی، تخلیقی، اخلاقی اور جمالیاتی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کرنے کی بھرپور کوشش کی۔دونوں کالجوں میں تعلیمی کلچر کی اچھی اقدار قائم کیں۔عزت نفس کی بنیاد پر تعلقات کار کے ذریعے اساتذہ کی عزت و وقار کو مقدم رکھا۔تعلیمی کیلنڈر کو محنت سے مرتب کر کے اسے پوری طرح نافذ کیا۔طلبا کی شخصیت سازی کی فضا استوار کی اور ان کو باور کرایا کہ وہ تعلیم اور شعور جو وہ یہاں حاصل کرنے اور سیکھنے آتے ہیں وہ ان کی شخصیت، گفتار اور رویوں سے منعکس ہونا چاہیے۔انفراسٹرکچر میں کئی گنا اضافہ کیا اور پہلے سے موجود سہولتوں کی اصلاح کی۔مثلاً یزمان میں کثیر المقاصد ہال، لائبریری کمپلیکس جو ریڈنگ روم اور لائبریری ہال، لائبریری سے متعلقہ دفاتر اور بڑے سیمینار روم پر مشتمل تھا اور ضرورت سے کہیں زیادہ فرنیچر کی فراہمی شامل تھی۔آخر میں طالب علم کو سب سے اہم، بڑا اور مرکزی سٹیک ہولڈر کا تصور پیش کیا جو کالج کی سٹاف، سہولتوں اور تمام اثاثوں کا جواز فراہم کرتا ہے۔حاصل پور میں کالج گزٹ کے علاوہ کالج میگزین "پیش منظر" کا بہاول پور نمبر شائع کیا جب کہ یزمان میں کالج گزٹ کی روایت کو مستحکم رکھا جس کے ایک حصے گزٹ میگزین میں یزمان اور بہاول پور کے بارے میں مضامین بھی شامل ہوتے تھے۔2013 کے دوران نہ صرف میری ترقی بطور پروفیسر ہوئی بل کہ 30 اپریل 2013 کو تقریباً پینتیس سال کی سروس کے بعد ریٹائر (فارسی میں بازنشستہ) ہو گیا۔میں نے سروس کے آخری 13 سال انتظامی امور کی انجام دہی میں گزارے مگر اپنے مضمون کے خیال سے غافل نہیں رہا۔جہاں میں پرنسپل رہا وہاں میں اپنا مضمون بھی پڑھاتا رہا۔فارسی مضمون کی بحالی اور مقبولیت سے جو میکینزم تشکیل دیا اس سے 2012 میں بہاول پور ڈویژن کی حدود میں واقع بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانات میں ریگولر اور پرائیویٹ امیدواروں کی تعداد اپنی آخری حدود کو چھو رہی تھی۔انٹر سال اول میں 7000، سال دوم 6500، ڈگری پارٹ 1 میں 7000 اور ڈگری پارٹ 2 میں 7000 جب کہ بی اے آپشنل میں 5500 یعنی کل تعداد تقریباً 33000 ہو چکی تھی۔ایک وہ وقت تھا کہ ہم دیگر مضامین کے

استادوں پر رشک کرتے تھے کہ ان کے بنڈل خاصے وزنی ہوتے۔ یونیورسٹی کے بنڈل ہوں یا بورڈ کی مرکزی مارکنگ میں پرچوں کی تعداد، اب دیگر مضامین کے استاد فارسی والوں پر رشک کرنے لگے۔ فارسی کو تو ان کالجز میں بھی پڑھایا گیا جہاں استاد ہی موجود نہیں تھا بل کہ یونیورسٹی اور بورڈ سے ان اداروں کا فارسی مضمون کا الحاق بھی نہیں تھا، استاد کا مقامی طور پر بندوبست کیا گیا۔ بس یہی اس کا عروج تھا مگر کہتے ہیں نا، "ہر عروجی راز والی است،" بس یہی کچھ فارسی کے ساتھ بھی ہوا۔ جو ٹیم میں نے بنائی تھی اس کے صرف ایک استاد رہ گئے ہیں مگر کالجوں میں فارسی مضمون کا زوال شروع ہو چکا۔ 1996 کے بعد بہاول پور ڈویژن میں جنرل کالجوں کی تعداد تقریباً دگنی یعنی 54 ہو چکی ہے۔ 2000 کے بعد جتنے نئے کالج بنے ان کی تدریسی سیٹوں کی منظوری کا جو پیٹرن یا ماڈل سامنے آیا اس میں فارسی کا مضمون کہیں نظر نہیں آتا۔ جہاں کوئی فارسی کے استاد ریٹائر ہوئے تو ان پوسٹوں کو دوسرے مضامین میں بدل دیا گیا۔ اس وقت بہاول پور کے 54 کالجوں میں فارسی کی کل 18 سیٹیں ہیں جن میں سے چودہ خالی پڑی ہیں۔ اگر ان پر اساتذہ کو نالایا گیا تو آہستہ آہستہ یہ دیگر مضامین میں کنورٹ کر دی جائیں گی اور اگر ریشنلائزیشن کا عمل شروع ہو گیا تو سٹوڈنٹ ٹیچر تناسب کی بنیاد پر یہ تمام جاتی رہیں گی کیوں کہ کسی مضمون میں طالب علموں کا وجود ہی اس سیٹ کا جواز فراہم کرتا ہے۔ دوسری بری خبر یہ ہے کہ بہاول پور ڈویژن کے کسی کالج میں بھی بی ایس فارسی موجود نہیں ہے اور ایسوسی ایٹ ڈگری کی وجہ سے ڈگری کی سطح پر فارسی بطور اختیاری اور آپشنل مضمون ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ اب صرف اور صرف انٹر کی سطح پر یہ مضمون موجود تو ہے مگر دونوں سالوں میں اس کے باقاعدہ اور پرائیویٹ امیدواروں کی تعداد 55 فی صد کم ہو چکی ہے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ ہم فارسی کے استادوں نے اتنی تعداد کے باوجود فارسی کی ٹیوشن کبھی نہیں پڑھائی بل کہ مشن سمجھ کر مفت رہنمائی فراہم کی۔ ماہانہ تنخواہ کے علاوہ صرف پرچوں کی مارکنگ تھی جس کا معاوضہ آہستہ آہستہ تعداد بڑھنے کے ساتھ بڑھتا گیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ایک ایک استاد نے کل ملا کر ایک سال میں دو سے اڑھائی ہزار کی تعداد میں بھی پرچے دیکھے۔ یہ واحد مالی منفعت تنخواہ کے علاوہ تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد نومبر 2014 کو میں لاہور شفٹ ہو گیا۔ اس دوران پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج یونیورسٹی میں فارسی کے سب سے سینئر دو دوستوں سے ایک ملاقات کے دوران ذاتی ماحول میں گپ شپ ہو رہی تھی کہ ان میں سے ایک دوست نے کہا کہ فارسی نے جو آپ کو جو دینا تھا دے لیا، اب لاہور میں فارسی آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ میں حیران رہ گیا کیوں کہ میں نے کسی طور بھی کسی ایسی خواہش کا ذکر تک کیا تھا اور نا کوئی ایسا تاثر دیا تھا۔

آخر میں دو واقعات کا سرسری ذکر کرتا چلوں کہ شاید 2008 کا سال تھا، مجھے شعبہ فارسی اورینٹل کالج میں ایک استاد کی تقرری کے لیے بطور ماہر مضمون بلایا گیا۔ صدر شعبہ، ڈین اور پرنسپل کالج اور وائس چانسلر کے علاوہ معروف بیوروکریٹ اور مصنف مختار مسعود بھی موجود تھے۔ میں نے اپنے مزاج کے مطابق بطور ماہر مضمون

ایک غیر روایتی انداز اختیار کیا۔ آخری امیدوار سے میں نے از راہ تفنن پوچھا کہ کیا وہ ایرانی اسلامی انقلاب کے بارے میں لکھی گئی کتاب ''لوح ایام'' کے مصنف جناب مختار مسعود کو جانتے اور پہچانتے ہیں، امیدوار نے کہا جی بالکل، میں نے اگلا سوال کیا کہ کیا وہ انہیں دیکھ کر پہچان لیں گے، کہنے لگے جی بالکل، میں نے یہ جملہ کہہ کر اس امیدوار کو جناب مختار مسعود کی طرف ریفر کردیا ''جناب اب یہ آپ کے حوالے''۔ فارسی کے ایک استاد نے بتایا کہ گزشتہ دس سال کے دوران جوابی کاپیوں کے معاوضے کو جمع کر کے میں نے اپنی زرعی زمین میں اضافہ کر کیا ہے!!!

شاید یہ 2007 کے موسم سرما کا کوئی دن تھا جب پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فارسی نے یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس (موسوم بہ ایگزیکٹو کلب اور اب یونیورسٹی کلب) کے بڑے ہال میں ایک نشست نما سیمینار منعقد کیا تھا جس میں مختلف تحقیقی مقالات کے شفاہی امتحان لینے والے یونیورسٹیوں کے اساتذہ، کالجوں کے تین چار فارسی اساتذہ، شعبہ فارسی کے ماضی اور حال کے موجود تمام اساتذہ، ایرانی ثقافتی مرکز لاہور کے سربراہ اور یونیورسٹی کے رجسٹرار نے شرکت کی اور فارسی مضمون کے بہتر مستقبل کے ضمن میں مختلف تجاویز اور امکانات پر تفصیل سے گفتگو ہوئی۔ میں نے اپنے شعبے یعنی کالج اساتذہ کے موجودہ اور مطلوبہ کردار پر روشنی ڈالی۔ وہ تجاویز کہاں گئیں، کسی کو کچھ بھی خبر نہیں ہے۔ مستقبل کے آئینے میں مجھے فارسی کا کچھ ایسا منظر نامہ نظر آرہا ہے کہ کالجوں میں بی اے تو جاتا رہا۔ صرف انٹر باقی ہے جو مائل بہ زوال ہے۔ فارسی کا مضمون صرف یونیورسٹیوں میں رہ جائے گا جہاں بی ایس، ایم ایس اور ڈاکٹریٹ پڑھائے جائیں گے اور باقی رہے گا اللہ کا نام مگر ایک بات سوچنے کی ہے،" کیا 54 سال قبل 1970 میں انجمن دوستی ایران و پاکستان کے زیر اہتمام لاہور میں منعقدہ سات روزہ آل پاکستان فارسی اساتذہ کانفرنس برائے (بحالی) " فارسی در پاکستان " کی نصف صدی سے زائد عرصے کے بعد آج کہیں زیادہ ضرورت نہیں ہے؟ اگر ایسا کرنا ممکن نا ہو تو کم از کم اس کانفرنس کی سفارشات کو ہی دیکھ لیا جائے جو 1971ا میں ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوئیں اور اس کی ایک کاپی پنجاب یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری میں موجود ہے۔ اس کانفرنس میں پیش کیے گئے مضامین فارسی کے شاندار ماضی کے ساتھ ساتھ فارسی کی صورت حال کے بارے میں المیہ داستان سناتے ہوئے سفارشات کی صورت امید کی شمع بھی جلاتے نظر آتے ہیں''۔ ان سفارشات کا انتخاب بہت معمولی ترامیم کے ساتھ درج ذیل ہے۔

ہفت روزہ سیمینار فارسی منعقدہ 22 تا 28 جون 1970 کی منظور شدہ قراردادیں (انتخاب)

1 ۔ درسی کتب کی طباعت میں املا، اعراب اور اوقاف کی صحت کا خاص خیال رکھا جائے ۔2- چھوٹی اور بڑی سب جماعتوں کی درسی کتب میں آسان زبان استعمال کی جائے اور موضوعات کے انتخاب میں اخلاقی اقدار کو پیش نظر رکھا جائے ۔3 ۔ جہاں تک ممکن ہو پورے پاکستان کے لیے فارسی کی ایک ہی درسی کتاب ہو اور تمام

یونیورسٹیوں میں فارسی کا نصاب یکساں ہو۔4۔حکومتِ پاکستان سے درخواست کی جائے کہ وہ ان قراردادوں کی روشنی میں فارسی کے فروغ کے لیے مؤثر اقدامات کرے۔5۔اردو زبان میں فارسی عنصر کی اہمیت کے پیش نظر میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے اردو کے کورس میں پچیس فی صد فارسی کا نصاب شامل کیا جائے۔6۔بی۔اے (اب بی ایس وایم ایس) میں تاریخِ اسلام اور تاریخِ پاکستان و ہند کے طلباء کے لیے اضافی فارسی کا پرچہ لازمی قرار دیا جائے۔7۔تاریخ اور اردو ایم۔اے (اب بی ایس وایم ایس) کے نصاب میں فارسی زبان وادب کا ایک پرچہ لازمی قرار دیا جائے۔8۔پاکستانی یونیورسٹیوں میں تحقیق کرنے والے طلبا کو معقول وظیفہ دیا جائے تا کہ فارسی زبان و ادب کے مختلف موضوعات پر تحقیق ہو سکے۔9۔فارسی کے تحقیقی مقالات اور مخطوطات کی اشاعت کے لیے ہر یونیورسٹی میں مناسب رقم مخصوص کی جائے۔10۔یونیورسٹیوں میں جدید فارسی زبان کے لیے دوسری خارجی زبانوں کی طرح ڈپلومہ اور سرٹیفکیٹ کلاسیں کھولی جائیں۔11۔حکومتِ پاکستان سے درخواست کی جائے کہ: 1۔فارسی زبان وادب کے اساتذہ اور طلبا کو ایران میں جانے اور فارسی سیکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کی جائیں۔2۔یورپی ممالک کے کتب خانوں کے اہم فارسی مخطوطات کی مائیکروفلمیں (اب پی ڈی ایف سوفٹ کاپی) حاصل کرنے کا اہتمام کیا جائے۔3۔ممتاز ایرانی دانش مندوں کو گاہے گاہے پاکستان میں آنے کی دعوت دی جائے 4۔ایران کے اہم مراکز میں خانہ ہائے فرہنگِ پاکستان قائم کیے جائیں۔5۔ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن سے فارسی زبان سکھانے کا انتظام کیا جائے۔(اب اس مقصد کے لیے یوٹیوب کو استعمال کیا جا سکتا ہے اور ایسا کیا بھی جا رہا ہے۔ 6۔ایرانی یونیورسٹیوں میں اردو کی تدریس کے لیے ایسے اشخاص کا انتخاب کیا جائے جو نہ صرف اردو میں ایم۔اے (بی ایس اور ایم ایس و پی ایچ ڈی) کی سند رکھتے ہوں بلکہ کسی ایرانی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل بھی ہوں تا کہ خاطر خواہ طریقے سے اپنے منصب کو ادا کر سکیں۔7۔ایران میں پاکستانی سفارت خانے میں ایسے کلچرل اتاشی مقرر کیے جائیں جنہوں نے کسی ایرانی یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی ہو۔8۔فارسی نثر کی بہترین کتاب لکھنے والے کو ہر سال حکومت پاکستان اور ایران کی طرف سے انعام ملنا چاہیے۔9۔مختلف یونیورسٹیوں میں سائنسی انداز میں زبان کا مطالعہ کرنے والے لسانیات کے شعبے کھولے جائیں۔10۔حکومتِ ایران سے درخواست کی جائے کہ وہ 1۔فارسی زبان و ادب کے اساتذہ اور طلباء کو زیادہ سے زیادہ وظائف اور دیگر سہولتیں فراہم کرے:2۔پاکستان کے تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کو اہم کتب و رسائل (اور دستاویزی فلمیں) فراہم کرے۔3۔پاکستان میں خانہ ہائے فرہنگِ ایران پاکستانی اساتذہ کو جدید فارسی زبان سے روشناس کرانے کے لیے ریفریشر کورسز کا انتظام کرے۔4۔فارسی کی خالی پوسٹوں کو پُر کیا جائے اور فارسی کی پوسٹوں کی دیگر مضامین میں منتقلی پر پابندی لگائی جائے نیز کالجوں میں بی ایس فارسی کو شامل اور ادبیات اور عمرانی علوم میں فارسی کا پرچہ شامل کیا جائے)

دیارِ علم میں نئے خوابوں کی آبیاری

(اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی میں ڈیپوٹیشن)

یونیورسٹی کا تصور اعلیٰ تعلیم کے ایک ایسے ادارے کا ہے کہ جہاں قدرتی، سماجی اور دیگر متفرق علوم پر جزوی اور کلی یا مائیکرو میکرو سطح پر مفصل تحقیق کی جاتی ہے اور اس طرح سے سامنے آنے والے تحقیقی نتائج کو بنیادی طور پر اور عالمی سطح پر معاشرے اور انسانیت کی بہتری، ترقی، فلاح اور اعلیٰ تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا یونیورسٹی اور تحقیق لازم و ملزوم ہیں شاید اسی لیے کالج کی نسبت یونیورسٹی کے استاد کو نسبتاً زیادہ عزت و توقیر کا حق دار تصور کیا جاتا ہے۔ 1925 کے دوران جامعہ از ہر مصر کی طرز پر جامعہ عباسیہ بہاول پور کا قیام عمل میں لایا گیا- 1950 میں جامعہ کی عباسیہ کیمپس والی شاندار عمارت کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ 1955 میں ریاست بہاول پور پاکستان میں ضم ہوئی تو اسے ایک ڈویژن کا درجہ ملا۔ 19 اکتوبر 1963 کو جامعہ عباسیہ کو جامعہ اسلامیہ کا نام دے کر محکمہ اوقاف کے سپرد کر دیا گیا اور 6 دسمبر 1965 میں سائنس بلاک کا افتتاح ہونے کے بعد جدید علوم کی تدریس کا بھی آغاز کر دیا گیا۔ 1980-1972 کی تعلیمی پالیسی کی روشنی میں 4 مارچ 1975 کو پنجاب اسمبلی کے پاس کردہ ایکٹ کے تحت "دی اسلامیہ یونیوسٹی آف بہاول پور" قائم ہوئی۔ پہلے وائس چانسلر ڈاکٹر ابوبکر غزنوی کا تقرر ہوا۔ پھر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اور پروفیسر عبدالقیوم قریشی آئے۔ مئوخر الذکر کو اپنے پیشرو کی طرح نامکمل ٹرم میں بوجوہ جانا پڑ گیا۔ اب تک یونیورسٹی کے ابتدائی خط و خال واضح ہو چکے تھے اور محکمہ اوقاف کے وقت کے اساتذہ مثلاً جناب زبیر قریشی (اکنامکس) اور جناب مہدی مخدوم (اردو) کے علاوہ مقامی کالجز کی وزٹنگ فیکلٹی سے کام چلایا جا رہا تھا۔ سب سے پہلے جن مضامین کی تدریس شروع کی گئی ان میں عربی، اسلامیات، تاریخ، معاشیات، سیاسیات، اردو اور انگریزی، شماریات، کیمسٹری، فزکس، ریاضی اور قانون شامل تھے۔ انتظامی سٹاف بھی محکمہ اوقاف کے وقت کا ہی کام آیا۔ عباسیہ کیمپس کے ساتھ ساتھ عباسیہ ہائی سکول کے ہوسٹل کو ایک روپیہ کرائے پر حاصل کر کے اس کا نام ریلوے کیمپس رکھا گیا۔ ملک کے نام ور اساتذہ کو کنٹریکٹ پر یونیورسٹی لایا گیا۔ اس کے بعد دو لگاتار وائس چانسلرز پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹر رفیق احمد (صدر شعبہ اکنامکس) اور ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک (پروفیسر شعبہ عربی و پرنسپل یونیوسٹی اورینٹل کالج) تشریف لائے۔ ان دونوں کے آنے سے پہلے سیلیکشن بورڈز کے ذریعے تمام

شعبوں میں ایڈہاک اور ریگولر بنیادوں پر تدریسی سٹاف آنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک کے دور میں جغرافیہ، ایجوکیشن، صحافت اور فارسی (1985) کے شعبوں کا اجرا کیا گیا۔ پروفیسر عبدالقیوم کے دور کے منصوبے بغدادالجدید کیمپس کی تکمیل کے بعد تینوں فیکلٹیز (سائنس، آرٹس۔ اسلامک لرننگ) کی عمارتیں مکمل ہو چکی تھیں۔ اب یونیورسٹی کے پاس تین کیمپس تھے۔ فارسی شعبے کو اسلامک لرننگ کی کشادہ عمارت میں ایک اچھا اور مکمل پورشن مل گیا۔ اسی سال خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان میں فارسی کے استاد پروفیسر عبدالعزیز جاوید ریٹائر ہو چکے تھے جنہیں کنٹریکٹ پر صدر شعبہ بنایا گیا اور انہوں نے مقامی کالجوں سے اساتذہ کی جز وقتی خدمات حاصل کیں اور شعبے کا آغاز ہو گیا۔ 1985 کے دوران، میں فارسی کے بورڈ آف سٹڈیز کا ممبر تھا اور اس اجلاس میں موجود تھا جس میں ایم اے فارسی کے نصاب کے لیے سفارشات مرتب کی گئیں۔ دیگر مضامین کی طرح فارسی کے لیے بھی پنجاب یونیورسٹی کے نصاب کو ہی اختیار کیا گیا۔ پروفیسر عبدالعزیز جاوید کے کنٹریکٹ کی مدت ختم ہونے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے فارسی کے ریٹائرڈ استاد پروفیسر ڈاکٹر آغا یمین خاں صدر شعبہ کے طور پر تشریف لائے۔ ان کے علاوہ 1985 تا 1988 کے درمیانی تین سال کے دوران لاہور ہی سے جناب نوازش علی شیخ، محترمہ راحیلہ قریشی اور جناب سلیم مظہر تشریف لاتے رہے۔ ان تین سالوں کے دوران مستقل اساتذہ کے نہ ہونے اور مضامین میں مقابلے کی فضا کے باعث شعبہ فارسی تعلیمی و تحقیقی سطح پر اپنی مضبوط شناخت قائم نہ کر سکا اور سالانہ داخلے دو ہندسوں میں کبھی نہ آ سکے۔ طلبہ کی نسبت طالبات کی تعداد زیادہ ہوتی حتی کہ 1988 کی ابتدا میں ہونے والے داخلوں میں صرف آٹھ طالبات ہی تھیں۔ مطالعاتی دوروں یا غیر نصابی سرگرمیوں کی بھی کوئی قابل ذکر روایت موجود نہیں تھی۔

کسی بھی یونیورسٹی کا جائزہ کئی پہلوؤں سے لیا جا سکتا ہے۔ ایک تو بنیادی ضروری سہولتوں کے ساتھ تدریسی و تحقیقی اور غیر نصابی سرگرمیاں جن کا بنیادی مرکز وہاں کے طلبا و طالبات ہوتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ تدریسی سٹاف کی تعلیمی، تحقیقی مہارت، پیشہ ورانہ اخلاقیات اور باہمی تعلقات کا معیار کیسا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پاکستان میں خصوصاً وائس چانسلر کو یونیورسٹی میں اختیارات کا مرکزی سرچشمہ تصور کیا جاتا ہے۔ پاکستان کی سب سے قدیم پنجاب یونیورسٹی ہے۔ 1977 تک یہاں کی تعلیم یافتہ لاٹ ہی اسلامیہ یونیورسٹی کے تدریسی منظرنامے پر طلوع ہوئی اور پنجاب یونیورسٹی کی تدریسی سٹاف کے باہمی تعلقات کار کی روایات اس نوزائیدہ یونیورسٹی کو ورثے میں ملیں۔ ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک کے دور میں سٹاف کی سیاست کا آغاز ہو چکا تھا۔ لابیاں بن چکی تھیں جو مختلف انداز سے یونیورسٹی امور خاص طور پر سیلیکشن بورڈز پر بھی اثر انداز ہونے کی صلاحیت حاصل کر چکی تھیں۔ یہ تمہید میں نے فارسی کی دو لیکچرر کی آسامیوں پر ہونے والی سیلیکشن کے حوالے سے باندھی ہے۔ ان آسامیوں پر دو امیدوار تھے۔ پنجاب یونیورسٹی سے جناب اقبال شاہد اور اسلامیہ یونیورسٹی سے پرائیویٹ ایم اے فارسی کرنے والے (مولانا) منیر احمد جنہوں نے ایم۔ اے

اسلامیات (اورشاید عربی) بھی کر رکھا تھا اور ان کا غالب رجحان اسلامیات کی طرف ہی تھا۔ ان کے سرپرست گروپ نے مبینہ طور پر اسلامیات میں ان کا راستہ روکنے کا توڑ یہ نکالا کہ انہیں فارسی میں ہی سلیکٹ کرا دیا جائے۔ چوں کہ وہ وائس چانسلر پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے لہٰذا باوجود اس کے کہ لاہور سے ڈاکٹر سید محمد اکرم اور ڈاکٹر محمد باقر جیسے عظیم ماہرین مضمون انٹرویو لینے آئے اور بقول ڈاکٹر سید محمد اکرم انہوں نے ایک ہی امیدوار جناب اقبال شاہد کو سلیکٹ کیا تھا۔ جب سلیکشن بورڈ کا نوٹیفیکیشن آیا تو نمبر ایک پر (مولانا) منیر احمد اور نمبر دو پر جناب اقبال شاہد تھے اور انہیں اسی ترتیب سے اور کچھ وقت کے فرق سے جوائن کرایا گیا اور مولانا کو چند گھنٹے کا سینیئر قرار دے کر شعبے کا انچارج بنا دیا گیا۔ یوں یونیورسٹی کی سیاست اور مسلکی دباؤ اور سفارش جیت گئے اور میرٹ ہار گیا۔ دونوں منتخب شدہ اساتذہ سے اس وقت تک میری واقفیت تھی اور نہ میں ان سے کبھی ملا تھا۔ مولانا منیر احمد کی سلیکشن میں اپنائی گئی چابکدستی کی خبر میں نے بھی سنی لیکن میں اس کی سب سے پہلے تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ میں کسی کام سے لاہور گیا تو استاد محترم ڈاکٹر سید محمد اکرم سے بھی ملا تو انہوں نے نا صرف "زبان خلق" کی تصدیق کی بل کہ سارے انٹرویو اور سوالات و جوابات کی تفصیل بھی بتا دی۔ (اس تفصیل کو بیان کر کے میں اپنی ایک درست سمت میں جاتی تحریر کو عدم توازن سے دوچار نہیں کر سکتا)۔ وہیں پر موجود ایک دوست نے طنزاً فارسی کا یہ شعر پڑھ دیا۔

خشت اول چوں نہد معمار کج   تا ثریا می رود دیوار کج

(اگر عمارت کی پہلی اینٹ ہی معمار ٹیڑھی لگائے گا تو دیوار آسمان تک ٹیڑھی ہی جائے گی)

ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک اچانک طویل رخصت پر چلے گئے اور ان کی جگہ شعبہ کیمسٹری اور یونیورسٹی کے سینئر استاد ڈاکٹر مصباح العین خاں کو وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ چوں کہ وہ اسلامیہ یونیورسٹی کے اپنے استاد تھے لہٰذا یونیورسٹی کے کلچر میں زبردست تبدیلیاں آتی گئیں اور وائس چانسلر آفس میں جانے کے لیے کسی کو پہلے سے وقت یا اجازت لینے کی ضرورت نہ تھی۔ اب واضح طور پر یونیورسٹی اساتذہ وائس چانسلر کے مخالف اور حمائتی دو گروہوں میں بٹ گئے۔ 1990 کے دوران مجھے بورڈ آف سٹڈیز کے اجلاس میں شعبہ فارسی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ان دو سال کے بعد ریگولر اساتذہ کے آنے سے کوئی خاص فرق نہ پڑ سکا تھا۔ میں اجلاس کے وقت سے پہلے پہنچ گیا تا کہ "صدر شعبہ" سے ملاقات ہو سکے۔ جیسے ہی میری نظر ان پر پڑی تو محسوس ہوا کہ وضع قطع اور لباس سے ایک مکمل مذہبی شخصیت جوتے اتار کر اور ایک پاؤں کرسی پر رکھے تشریف فرما ہے۔ میں نے سلام کیا اور انہوں نے اسی انداز میں بیٹھے بیٹھے بے تاثر چہرے سے ہاتھ ملایا۔ میں سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو جواب میں خاموش رہے۔ میں ان کے سامنے مزید 20 منٹ بیٹھا رہا۔ میں نے فارسی مضمون، شعبے، طالب علموں اور دیگر موضوعات پر بات کرنے کی کوشش کی، وہ میری ہر بات کا جواب ہاں یا ناں میں ہی دیتے رہے۔ میرا ان کے بارے میں جو بنیادی تاثر بنا وہ یہ تھا کہ صدر شعبہ فارسی ایک داخلیت

پسنداور یک رخی شخصیت کے مالک ہیں اور سر سے پاؤں تک ایک معروف اور سخت گیر مسلک کے پیروکار ہیں۔ ادب یا فارسی مضمون پر گفتگو سے پرہیز کرتے ہیں کیوں کہ فارسی ادبیات خصوصاً ادب وتصوف کی بہت سی باتیں ان کے مسلک سے متصادم ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دفتری طریقِ کار اور معاملات سے بھی مکمل نا آشنا ہیں ۔کلرک جو کچھ لکھ کر لائے یا کسی دفتری پروفارمے پر جہاں ضروری ہو دستخط کر دیتے ہیں۔ طلبا اور یونیورسٹی سٹاف سے میل ملاقات نہ ہونے کے برابر ہے۔

ان سے ملاقات کے بعد ایک دوسرے کمرے میں جناب اقبال شاہد سے ملاقات ہوئی جو بڑے تپاک اور گرمجوشی سے ملے اور ساتھ ہی بلند آواز میں کہا، "بڑی دیر کی مہربان آتے آتے"۔ کہنے لگے کہ جناب میں نے آپ کے بارے میں بہت سن رکھا ہے، چلو آپ سے ملنے کی خواہش پوری ہوئی۔ آپ فیلڈ کے مرد میدان ہیں اور امید کرتا ہوں کہ آپ شعبے کی ترقی کے حوالے سے اپنا کردار ادا کریں گے۔ پہلے پانچ منٹ میں ہی مجھے محسوس ہوا کہ جیسے ہم پہلے سے ہی ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اس کے بعد بورڈ آف سٹڈیز کا اجلاس ہوا۔ اس میں صدر شعبہ مسلسل خاموش رہے اور اپنی کسی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ جناب اقبال شاہد کی شعبے میں موجودگی تقویت کا باعث تھی اور ان کی شخصیت سماجی حوالے سے خاصی متحرک نظر آئی اور وہ اپنے تعلقات سے شعبے کو فائدہ پہنچائیں گے مگر وہ یونیورسٹی کی کسی لابی سے وابستہ نہیں تھے جب کہ صدر شعبہ جیسے فارسی زبان سے "لاتعلق" فرد کو یہاں تک لانے والی لابی بہت مضبوط تھی۔ جب شعبے کے بارے میں یونیورسٹی میں چہ میگویاں شروع ہوئیں کہ شعبے کا تدریسی اور تحقیقی کام نہ ہونے کے برابر تھا اور شعبہ یونیورسٹی پر بوجھ ثابت ہو رہا ہے تو وائس چانسلر نے جناب اقبال شاہد کو بلا کر ان کے سامنے ایک تجویز پیش کی کہ کیوں نا آپ کو شعبہ اردو واقبالیات میں اور (مولانا) منیر احمد کو شعبہ اسلامیات میں بھیج کر شعبہ فارسی کو ختم کر دیا جائے۔ جناب اقبال شاہد کے مطابق انہوں نے وائس چانسلر کو یہ جواب دیا۔ "جناب میں کسی طور پر بھی اپنے شعبے کے قتل میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتا"۔ باوثوق ذرائع نے بتایا کہ شعبہ اسلامیات کے کارپردازوں کی طرف سے بھی اس تجویز کی مخالفت کی گئی۔ تب 92-1991 کے سیشن کے دوران وائس چانسلر نے شعبہ فارسی کے داخلے معطل کر دیے اور صرف فائنل کلاس ہی چلتی رہی۔ صدر شعبہ نے اس ضمن میں کوئی ردعمل دینے کی بجائے خاموشی اختیار کی جب کہ جناب اقبال شاہد نے مجھے بذریعہ فون وخط مطلع کیا اور اس ضمن میں کردار ادا کرنے کو کہا۔ میں نے انجمن فارسی پاکستان کی ذیلی تنظیم برائے بہاول پور ڈویژن کو متحرک کیا۔ اس کا ایک پیڈ چھپوایا جن پر تمام عہدیداروں کے جو نام لکھے وہ اس طرح تھے۔ رئیس انجمن: آقای عبدالعزیز جاوید استاد بازنشستہ فارسی، رئیس دانشکدہ اسلامیہ رحیم یار خان۔ معاون رئیس: پروفسور خانم کشور قریشی رئیس دانشکدہ بانوان خان پور۔ دبیر عمومی: آقای نسیم بلوچ دانشیار فارسی دانشکدہ دولتی خان پور۔ معاون دبیر: آقای خلیل ہاشمی استاد فارسی دانشکدہ دولتی خواجہ فرید رحیم یار خان، دبیر مالیہ: خانم زاہدہ حمید، استاد فارسی، دانشکدہ دولتی بانوان بہاول

پور۔ دبیر اطلاعاتی: آقای اقبال شاہد استاد گروہ فارسی دانشگاہ اسلامیہ بہاول پور۔

اب میری مہم کا آغاز ہونے جا رہا تھا۔ میں ان دنوں رحیم یار خان سے خان پور روزانہ آتا جاتا تھا۔ رحیم یار خان کی پریس اور اخباری نمائندوں سے میرے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ میں ہر روز پیڈ پر پریس ریلیز جاری کرتا جس میں شعبہ فارسی کے داخلوں کی بندش کا ذکر ہوتا اور یونیورسٹی اتھارٹیز سے داخلے بحال کرنے کی اپیل کی جاتی۔ اگلے دن مقامی وقومی اخبارات میں خبر شائع ہوتی جس کے تراشے یونیورسٹی کے شعبہ تعلقات عامہ کو بھجوا دیئے جاتے۔ اس کے علاوہ یہی مطالبہ پیڈ پر لکھ کر مع اخباری تراشے بار بار وائس چانسلر کو براہ راست بھی بھجوا دیے جاتے۔ جناب اقبال شاہد سے مسلسل رابطہ رہا۔ اس وقت خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران کی ایک برانچ ملتان میں موجود تھی۔ انجمن فارسی پاکستان قسمت بہاول پور کی طرف سے ان سے بھی درخواست کی گئی کہ وہ فارسی کے طلبا کے لیے وظائف کا اجرا کریں اور وائس چانسلر سے درخواست بھی کریں کہ وہ ایم اے فارسی کے داخلوں پر پابندی ختم کر دیں۔ آخر ہم سب کی کوششیں رنگ لائیں اور اس سے اگلے سال ایم اے فارسی کے داخلے بحال ہو گئے اور ایران کلچرل سنٹر کی طرف سے وظائف بھی جاری کر دیئے گئے۔ جناب "صدر شعبہ "اس تمام عمل کے دوران لاتعلق رہے اور "واحد غائب" پر عمل پیرا رہے۔ ڈاکٹر مصباح العین وائس چانسلر اگرچہ کیمسٹری کے استاد تھے مگر ایک تہذیبی شخصیت بھی تھے۔ غالباً فروری 1992 کی بات ہے جب انہیں اسلامی انقلاب کی سالگرہ کی تقریب میں ڈائریکٹر خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ملتان نے شرکت کی دعوت دی۔ یونیورسٹی کوسٹر میں میرے علاوہ ڈاکٹر شفیق احمد چیئر مین شعبہ اردو، جناب محمد سلیم مظہر، جناب اقبال شاہد کے علاوہ اساتذہ اور طلبا بھی شریک تھے۔ وہاں جناب وائس چانسلر نے فارسی کے اشعار سنا کر حیران کر دیا۔ ان کو اپنی مدت مکمل ہونے سے خاصا عرصہ قبل لاہور میں واقع کسی سائنسی تحقیق کے ادارے میں بھیج دیا گیا اور ان کی جگہ پر شعبہ فزکس کے سربراہ ڈاکٹر محمد بلال سکھیرا نے 15 جون 1993 کو وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالا۔ یہ اس یونیورسٹی کی سٹاف سے دوسرے وائس چانسلر تھے جو بہت بے تکلف مزاج کے حامل تھے بل کہ ان کی گفتگو" بے تکلفی" سے بھی آگے نکل جاتی۔ ان کے آنے سے گویا ماضی کی حزب اختلاف اقتدار میں آ گئی تھی۔ ان تک رسائی بہت آسان تھی۔ وہ ہر ایک کی دسترس میں تھے۔ ان کی بھی اپنی ترجیحات تھیں اور انہوں نے اپنے حمائتیوں سے کئی وعدے کیے ہوئے تھے۔ ان کی آمد پر "صدر شعبہ فارسی" نے ان کی شان میں ایک قصیدہ لکھا اور فریم کر کے ان کی خدمت میں پیش کیا جس کی وجہ سے ان کے دل میں مولانا کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا۔ انہوں نے صدر شعبہ فارسی سے کہا کہ وہ شعبے کو ریلوے کیمپس شفٹ کر دیں کیوں کہ شعبہ فارسی کی موجودہ جگہ پر وہ شعبہ صحافت کو منتقل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ان پر بہت دباؤ ہے۔ مولانا نے اس میں کوئی تاخیر نہیں کی اور ان کی خواہش پر فوراً عمل درآمد کر دیا۔ اس خدمت کے صلے میں انہوں نے مولانا کا سیلیکشن بورڈ کرایا اور انہیں اسسٹنٹ پروفیسر بنا دیا۔ جناب اقبال شاہد نے بتایا کہ وہ اس

وقت پی ایچ ڈی کے لیے ایران جانے والے تھے اور انہوں نے وائس چانسلر سے سلیکشن بورڈ بہت جلدی نہ کرانے کی درخواست کی جس کے جواب میں جناب سکھیرا صاحب کے الفاظ مولانا کو دی گئی کمٹ منٹ کے حوالے سے سونے سے لکھنے کے قابل تھے۔ انہوں نے ارشاد فرمایا "دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے، تم لوگ اس کو جو سمجھو، اسے فارسی کی الف بے بھی نہ آتی ہو، اس کا سلیکشن بورڈ ہو کے رہے گا"۔ ان کے اس ارشاد کے بعد جناب شاہد اقبال تہران یونیورسٹی ایران پی ایچ ڈی کرنے چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد دو مستقل اساتذہ کی سلیکشن ہو گئی جس کی روشنی میں 1994 کے دوران محترمہ روزینہ انجم نقوی (ایم اے فارسی پنجاب یونیورسٹی) اور پھر محترمہ مسرت واجد (ایم اے فارسی اسلامیہ یونیورسٹی) نے جوائن کیا تاہم شعبہ طالب علموں کی تعداد و سرگرمیوں کے لحاظ سے حسب معمول گذشتہ چھ سال سے "مجھولی" کیفیت سے دوچار تھا۔ 1994 وہی سال ہے جب ستمبر کے دوران میری ٹرانسفر گورنمنٹ ایس۔ای کالج بہاول پور میں ہوئی مگر دوستوں کے اصرار پر جناب سید سعید احمد اسسٹنٹ پروفیسر کو ایس ای کالج بھیج دیا گیا اور میں نے گورنمنٹ ڈگری کالج بغداد روڈ جوائن کر لیا۔ باقاعدہ طور پر میں 5 اکتوبر 1994 کو بہاول پور منتقل ہوا تھا۔

بہاول پور میرے لیے کوئی نیا شہر قطعاً نہیں تھا۔ دوستوں سے ملنے اور یونیورسٹی اور بورڈ کے امور میں اکثر بہاول پور آنا جانا لگا رہتا تھا۔ پہلے لیکچرر اور پھر اسسٹنٹ پروفیسر میری سروس کو اس وقت سولہ سال ہو چکے تھے۔ اگلے چھ ماہ کے دوران مختلف اوقات میں میری وائس چانسلر ڈاکٹر محمد بلال سکھیرا سے تین چار ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ میں نے ان ملاقاتوں میں یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے حوالے سے کبھی بات نہ کی۔ جن دنوں شعبہ فارسی کے داخلے معطل کیے گئے تھے اور میں نے پریس کے ذریعے جو مہم چلائی تھی تو ہر پریس ریلیز ایک سے زیادہ اخبارات کی زینت بنتا تھا تو اس حوالے سے شاید وہ میرے نام سے آشنا تھے۔ ایک دن ایک دوست کو ان سے کام تھا تو مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ دوران ملاقات کہنے لگے "یار تو فارسی دا سینئر استاد این تے ساڈے شعبے وچ پارٹ ٹائم کیوئیں پڑھاندا" یار تم فارسی کے سینئر استاد ہو، ہمارے شعبے میں پارٹ ٹائم کیوں نہیں پڑھاتے''۔ مجھ سے پہلے میرے دوست بول پڑے، ان کو کیا اعتراض ہے، آرڈر دیں تو کل سے شروع کر دیں گے۔ انہوں نے متعلقہ اسسٹنٹ رجسٹرار کو بلا کر میرا نام اور کالج کا نام بتایا اور وہ تھوڑی دیر بعد ایک دو سطری آرڈر لے کر آ گیا۔ اگلے روز شعبے میں میری ملاقات انچارج شعبہ مولانا منیر احمد سے ہوئی۔ شعبے کی کاپی وہاں پہنچ چکی تھی۔ اس ملاقات میں جو دومنٹ جاری رہی میں نے انہیں آگاہ کیا کہ میں ادبیات فارسی معاصر کا پرچہ پڑھاؤں گا اور وہ بھی پہلے پیریڈ میں۔ اس سے اگلے دن میں نے پہلا پیریڈ پڑھایا اور اپنے کالج چلا گیا۔ چوں کہ مولانا صاحب میرے بعد کے پیریڈ میں پہنچتے اس لیے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی جو سلام تک محدود رہتی۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں ماسوائے ایم اے اسلامیات، ہر مضمون کے سال اول میں اسلامیات کا مضمون پڑھانا لازمی تھا۔ مولانا منیر احمد ریلوے کیمپس میں قائم ایک دو شعبوں میں ہفتے میں دو یا تین دن فی

شعبہ اسلامیات لازمی بھی پڑھاتے تھے جس کا معاوضہ علیحدہ سے ملتا تھا، دیگر دنوں کی نسبت ان پیریڈز کے دن وہ البتہ شعبے میں شاید کچھ دیر زیادہ بیٹھتے۔ اگر کالج میں تاخیر سے جانا ہوتا تو کبھی دیگر تدریسی سٹاف سے ملاقات اور بات چیت ہوتی رہتی یا پھر میں ساتھ کے سرائیکی شعبہ میں جناب ریاض سندھڑ، جناب جاوید حسان چانڈیو اور سید صفدر شاہ کے علاوہ لائبریری سائنس کے صدر شعبہ ڈاکٹر فاضل خان سے مل لیتا۔ میں نے فارسی شعبے میں عموماً سکوت کی فضا دیکھی۔ سٹوڈنٹس ایک ہندسے میں تھے اور دیگر دو خواتین اساتذہ تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ ان کا سٹاف روم میں چائے کا انتظام تھا لیکن میں نے وہاں دیگر شعبوں کے اساتذہ کو آتے کم کم ہی دیکھا۔ اس شعبے میں ایک سال کے دوران ایک دن رونق دیکھنے کو ملتی جب بورڈ آف سٹڈیز کا اجلاس ہوتا۔ اس دن چائے وغیرہ کا خصوصی اہتمام کیا جاتا۔ اس کے علاوہ دوسرا سالانہ ایونٹ اس وقت ہوتا جب ایرانی ثقافتی مرکز کی طرف سے وظائف لا کر تقسیم کیے جاتے۔ میرے لیے کالج کی نسبت یونیورسٹی میں پڑھانے کا تجربہ بہت منفرد تھا وہ اس لحاظ سے کہ کالج میں آپ طلبا کی ذہنی سطح پر آ کر پڑھاتے ہیں جب کہ یونیورسٹی میں شعر و نثر کا متن ہو یا کسی شاعر یا ادیب کے بارے میں گفتگو ہو، آپ نے اس کی تمام فکری اور فنی جہتوں کو بہتر درجے کے جمالیاتی اور تنقیدی زاویوں کے ذریعے واضح کرنا ہوتا ہے۔ متعلقہ فن پارے کا اس انداز میں جائزہ لینا ہوتا ہے جس سے طلبا کے تنقیدی شعور کی تشکیل ہو سکے۔ میرا پرچہ اس نوعیت کا تھا کہ جس کے بارے میں زیادہ ریفرنسز دستیاب نہیں تھے۔ مجھے ہر لیکچر کی تیاری کر کے آنا پڑتا تھا۔ میں نے ایک مکمل تعلیمی سال پڑھایا۔ اس سال کے دوران ایک بار ایران کلچرل سنٹر ملتان کے ڈائریکٹر وائس چانسلر سے خصوصی ملاقات کے لیے آئے تو میں بھی ان کے آفس گیا جہاں میں نے تھوڑا بہت مترجم کا کردار بھی ادا کیا۔ یہ ملاقات بہت خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ علاوہ ازیں ایک دفعہ ایرانی ثقافتی مرکز میں فارسی بول چال کی کلاس کے طلبا و طالبات ڈائریکٹر اور تعلقات عامہ کے انچارج ڈاکٹر بشیر انور کے ساتھ لال سوہانرا تفریحی ٹرپ پر آئے تو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ریجنل ڈائریکٹر بہاول پور جناب خواجہ صابر حسین مجھے بھی ساتھ لیتے گئے۔ اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے چند طلبا و اساتذہ صدر شعبہ جناب منیر احمد کے ہمراہ وہاں موجود تھے۔ اس موقع پر ڈائریکٹر سنٹر، ڈاکٹر بشیر انور اور دیگر سے خوب باتیں ہوئیں۔

زندگی اور جاب کے امور حسب معمول چل رہے تھے۔ جون 1996 کا کوئی دن تھا کہ پرنسپل نے مجھے بتایا کہ وائس چانسلر آفس سے فون آیا تھا کہ آپ وائس چانسلر سے ملیں۔ اگلے دن میں ان سے ملا تو وہ یوں گویا ہوئے، "شعبہ فارسی کے انچارج کی عدم دلچسپی سے شعبے کی جو حالت ہے اسے سن سن کر میں عاجز آ گیا ہوں، اگر آپ کو اپنا مضمون عزیز ہے تو ڈیپوٹیشن پر میں آپ کو لا سکتا ہوں"۔ میں نے پوچھا کہ صرف استاد کے طور پر! کہنے لگے شعبے کے انتظامی امور بھی آپ کو دیں گے۔ میں نے حامی بھر لی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر نجیب جمال اور ڈاکٹر اسلم ادیب نے انہیں یہ تجویز دی تھی۔ دو دن بعد رجسٹرار آفس سے کالج فون آیا کہ

آپ اپنا بایوڈیٹا (سی وی) جمع کرائیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ وائس چانسلر صاحب کی خواہش ہے آپ کی خدمات برائے شعبہ فارسی محکمہ تعلیم سے ڈیپوٹیشن پر حاصل کی جائیں۔ آپ اپنے کوائف رجسٹرار آفس میں مع دستاویزات جمع کرائیں تا کہ ڈیمانڈ بھجوائی جا سکے، میں نے تعمیل کی۔ میری ڈیپوٹیشن کا کیس ڈائریکٹر ایجوکیشن (کالجز) بہاول پور ڈویژن اور ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشنز (کالجز) پنجاب لاہور سے ہوتا ہوا محکمہ ہائر ایجوکیشن پنجاب پہنچ گیا۔ اس میں ایک ماہ صرف ہوگیا ویسے بھی موسم گرما کی تعطیلات چل رہی تھیں۔ ستمبر کے آخری ہفتے پرنسپل کالج پروفیسر خضر اقبال ملک کی جگہ پروفیسر ہمایوں کبیر چودھری نے جوائن کیا اور اس کے دو دن بعد میری ڈیپوٹیشن کا نوٹی فکیشن موصول ہوگیا۔ نئے پرنسپل نے مجھے نہ جانے پر قائل کرنا چاہا اور اگر میں ڈیپوٹیشن پر جانے سے انکار کرتا تو اس میں میری سبکی تھی۔ وہ دوست تھا، میں نہ مانا تو مجھے فراغت نامے کے خالی پروفارمے پر دستخط کر دیئے اور کہا کہ تاریخ تم جو چاہو ڈال لینا۔ میں یکم اکتوبر کو وائس چانسلر سے ملا۔ ڈیپوٹیشن لیٹر کی کاپی وہاں پر بھی پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے رجسٹرار کو بلایا اور ان کو کچھ ہدایات دیں۔ کچھ دیر بعد وہ ایک مختصر سا نوٹیفکیشن دستخط کر کے لے آئے جس میں مجھے بطور انچارج شعبہ کام کرنے کا بھی کہا گیا تھا۔ میں اس نوٹیفکیشن کی شعبے کی کاپی لے کر مولانا منیر احمد کی خدمت میں حاضر ہوا جسے پڑھ کر ان کا چہرہ حسب معمول بے تاثر رہا۔ چارج کی تبدیلی محض یہ تھی کہ انہوں نے سٹاف روم میں بیٹھنا شروع کر دیا اور میں لمبائی اور چوڑائی میں آٹھ بائی آٹھ فٹ کے کیوبیکل کمرے میں بیٹھ گیا۔ میں نے اگلے دن تدریسی پیریڈز کے بعد ایک سٹاف میٹنگ بلائی جس میں مولانا نے کسی دلچسپی کا اظہار کیا اور نہ وہ اس میٹنگ میں آئے۔ میں توقع بھی یہی کر رہا تھا اس لیے مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ میں نے اس میٹنگ میں اپنی مندرجہ ذیل ترجیحات کو سب کے سامنے رکھا۔

☆ جاری داخلوں کے سیزن میں طالب علموں کی تعداد میں اضافہ کرنا۔ ☆ نصابی کے ساتھ ساتھ زائد از نصابی سرگرمیوں کا اجرا ☆ شعبہ کے انفراسٹرکچر کو بہتر بنانا ☆ دو پارٹ ٹائم اساتذہ کا انتظام ☆ شعبہ فارسی کے دیگر شعبوں سے روابط کو بہتر بنانا ☆ شعبہ میں طالب علموں کو فوکس کر کے ان کی تعلیم و تربیت کے لیے مئوثر اقدامات کرنا ☆ فارسی بول چال کی کلاس متعارف کرانا ☆ شعبے کے لیے ریسرچ جرنل کا اجرا ☆ ہر اس ادارے اور فرد سے رابطہ کرنا جو شعبے کو فعال کرنے میں معاون ہو سکتا ہو۔ ☆ ذاتی تعلقات کو شعبے کے مفاد میں استعمال کرنا ☆ سیلف ریسپیکٹ یا باہمی عزت و احترام کے ساتھ تعلقات کار کا قیام ☆ بی اے اور ایم اے کے نصاب میں ضروری ترامیم۔

اس سے اگلے روز میں نے اپنے ایک پرانے شاگرد اور اس وقت کے معروف برانڈ ویٹا بریڈ کے بہاول پور میں قیام پذیر ایم ڈی جناب میاں خالد شاہین کو چائے پر بلایا اور اس ملاقات کے نتیجے میں انہوں نے آفس کے لیے ڈسپلے بورڈ، شعبے کے نام کا بورڈ۔ چھ لکڑی اور بانس کی بُنائی والی کرسیاں اور انچارج شعبے

کے آفس کی کارپیٹنگ کرادی۔ آئندہ دنوں میں نے ایک خوبصورت آفس ٹیبل، کچھ ضمنی فرنیچر اپنی جیب سے بنوایا اور واوَچر لگا کر وائس چانسلر سے منظوری لی اور مطلوبہ رقم کلیم کر لی۔ چوں کہ داخلے جاری تھے اس لیے اگلا ہدف طالب علموں کی تعداد میں اضافہ تھا جس کی نگرانی میں نے براہ راست فارسی کے سیلز مین کی طرح کی اور ایم اے سال اول میں 36 طلبا و طالبات کی تعداد داخل کرنے میں کامیاب ہوگئے جس سے شعبہ کی رونق ایک دم بڑھ گئی اور شعبے کے قیام 1985 سے اب تک کی یہ معقول حد تک زیادہ تعداد تھی۔ فائنل کی چھ کی تعداد کو ملا کر یہ تعداد 40 سے بھی بڑھ گئی۔ شعبہ گویا جاگ اٹھا۔ ہم سب نے امیدواروں کے انٹرویو کیے اور جو ایک دفعہ انٹرویو میں شریک ہوا سمجھو داخل ہو گیا۔ سٹاف روم کے مانند پڑے ہوئے فرنیچر کو بھی پالش کرا کر بحال کیا۔ موجود اساتذہ کرام کے ذریعے دو پارٹ ٹائم خواتین اساتذہ محترمہ نگہت یاسمین اور محترمہ اُم حبیبہ کا انتظام کیا اور انہیں مئوقتی اساتذہ کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ یونیورسٹی یا اس سے باہر کا کوئی مہمان آتا تو ان کی چائے اور لوازمات سے تواضع کی جاتی جو میں اپنی ذاتی گرہ سے کرتا۔ دونوں کلاسز کا ٹائم ٹیبل اس طرح مرتب کیا کہ ہر جمعرات کو دو گھنٹہ کا کمبائنڈ سیمینار پیریڈ کا اجرا کیا۔ شہر کے معروف ادیبوں اور شعرا کو سیمینار میں مدعو کرتے۔ پہلے میں ان کا تعارف کراتا پھر وہ اپنی تخلیقات پیش کرتے جس کے بعد ان کے فکر و فن کے بارے میں گفتگو کی جاتی۔ طلبا و طالبات کو ترجیحاً گفتگو کی دعوت دی جاتی تا کہ ان کے اندر تنقیدی بصیرت پیدا کی جا سکے۔ تفریحی اور مطالعاتی دوروں اور تقریبات کا مختصر خاکہ یہ تھا۔

☆ محترمہ روزینہ انجم تقوی کے ایک کزن کرنل امام جو جی۔ ایس۔ او I ایجوکیشن بہاول پور کور ہیڈ کوارٹر تھے، کے توسط سے دن کے اوقات میں گیریزن پارک کھلوا کر نئی کلاس کو ویلکم پارٹی دی گئی۔ اس تقریب میں تقاریر کے بعد خصوصی طور پر تیار کردہ لنچ پیش کیا گیا۔ ☆ مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے ملتان کے شاہ شمس پارک اور ملتان کینٹ کی جھیل اور ایرانی ثقافتی مرکز کا مطالعاتی اور تفریحی دورہ رکھا گیا۔ ☆ اوچ شریف اور ہیڈ پنجند کا مطالعاتی و تفریحی دورہ۔ ☆ ایرانی ثقافتی مرکز ملتان کے اقبال سیمینار میں تمام شعبے کی شرکت اور مقالات و تقاریر میں حصہ۔ ☆ دو پیازہ ریسٹورنٹ بہاول پور میں افطار پارٹی کا اہتمام کیا گیا۔ ☆ قلعہ دراوڑ کا تفریحی و مطالعاتی دورہ ☆ فائنل کلاس کی الوداعی تقریب کا گیریزن کلب میں انعقاد۔ ☆ ایرانی ثقافتی مرکز ملتان اور بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی کے تعاون سے ایرانی ثقافتی قونصلیٹ اسلام آباد کے زیر اہتمام "اسلامی ثقافت کی اساس اور اس کے فروغ میں ہمارا کردار" کے عنوان سے ایک سیمینار ملتان کے ضلع کونسل ہال میں 26 دسمبر کو منعقدہ ہوا۔ اگر طالب علموں کو اچھی تعلیم و تربیت کا ماحول دیا جائے تو وہ اساتذہ کی دلی تعظیم کرتے ہیں۔ یہ سیمینار مجھے اس لیے بھی غیر معمولی طور پر یاد ہے کہ ایرانی ثقافتی مرکز ملتان کے ڈائریکٹر آقای علی رحیمی نے مجھے تمام طالب علموں کے ساتھ شرکت کی درخواست کی جب کہ موسم سرما کی تعطیلات کے وسط میں اس سیمینار کا انعقاد کیا گیا تھا۔ تمام طالب علم گھروں کو اور کچھ تعطیلات گزارنے اپنے رشتہ داروں کے گھر گئے ہوئے تھے

لیکن میرے ایک دفعہ کہنے سے جو جہاں تھا وہ اس روز وہاں سے آیا اور اسی روز واپس بھی چلا گیا۔☆ ہمارا ایک ہفتے کا طویل تفریحی اور مطالعاتی دورہ بھی تھا جس میں محترمہ روزینہ انجم نقوی ہمراہ تھیں۔ اس طویل ٹور میں بہتر پلاننگ کی گئی۔ اسلام آباد میں ہمارے میزبان مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان کے ڈائریکٹر آقای دکتر مہدی توسلی اور ان کا سٹاف تھے۔ ان کی طرف سے ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا اور بلیو ایریا میں واقع ایرانی ریسٹورینٹ "عمر خیام" میں لنچ دیا گیا جس میں ایرانی قونصلیٹ اسلام آباد سے بھی مہمانوں نے شرکت کی۔ اس دن عصر اور مغرب کے وقت دامن کوہ اور اگلے روز مری اور پیٹریاٹہ چیئر لفٹ کی سیر کی۔ اس کے بعد سوات پہنچے۔ اگلے دن مالم جبہ اور اس سے اگلے دن کالام اور گلیشیر گئے۔ آخری روز پشاور آئے جہاں ایران کے ثقافتی مرکز میں ہمارے اعزاز میں ایک تقریب منعقد ہوئی۔ حیات آباد سے ٹور کے شرکا نے خریداری کی اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ جب بہاول پور کے سٹیشن پر اترے تو ٹور کے تمام شرکا نے ٹور کی کامیابی اور اپنے ساتھ گئے ہوئے اساتذہ کے لیے اس بات پر تالیاں بجائیں کہ تمام ٹور کے دوران ان کا رویہ تمام کے تمام شرکا سے بہت مہربان اور مکمل طور پر یکساں اور برابری کا رہا۔☆ جولائی 1997 کے دوران اسلام آباد میں تین ہفتوں پر مشتمل فارسی زبان کے تیسرے ریفریشر کورس میں شرکت کے لیے دعوت دی گئی جس میں محترمہ مسرت واجد، میں اور دونوں پارٹ ٹائم خواتین اساتذہ محترمہ نگہت یاسمین اور محترمہ امت الزہرا کے ساتھ ساتھ ایم اے اردو میں فارسی کا پرچہ پڑھانے والے ڈاکٹر سلیم ملک کو بھی اعزازی طور پر شرکت کے لیے لے گئے اور ہمارے شعبے کے اساتذہ کی کارکردگی نمایاں رہی۔ تمام پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے شریک ہونے والے فارسی اساتذہ کے ساتھ خوب انٹرایکشن رہا۔ 28 جولائی کو واپسی ہوئی۔☆28 جنوری تا 28 فروری 1998 کے دوران راقم اور محترمہ روزینہ انجم نقوی نے تہران ایران کی دانشگاہ تربیت مدرس میں ہونے والے دورہ دانش افزائی میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کی نمائندگی کی۔ اس کورس میں پاکستان کے علاوہ مختلف یورپی اور افریقی ممالک کے 80 اساتذہ وطلبا نے شرکت کی۔ -☆ شعبہ فارسی کے اپنے ریسرچ جرنل کی میں نے وائس چانسلر سے تحریری منظوری لی۔ مئورخہ 25 نومبر 1996 کو ملنے والی منظوری جن الفاظ میں دی اس کا ترجمہ اس طرح ہے۔" کم از کم اخراجات کی بنیاد پر سمری منظور کی جاتی ہے۔" میں نے مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں کے سکالرز کو جرنل کے بارے میں مطلع بھی کیا جس کے جواب میں پانچ مضامین بھی موصول ہو گئے جن میں ڈاکٹر ظہورالدین احمد کا مضمون "زبیدہ صدیقی" بھی شامل تھا۔ اسی دوران اخراجات کا اندازہ کرنے کے لیے تین پرنٹنگ پریس سے کوٹیشنز بھی طلب کی گئیں۔ 45 روپے فی شمارہ کی کوٹیشن کم از کم تھی۔ (تمام مضامین میرے ریکارڈ میں موجود ہیں) ☆ فارسی بول چال کی کلاس کے قواعد و ضوابط اور داخلہ فارم بھی مرتب کر لیے اور اس ضمن میں اخبار میں اشتہار بھی دے دیا جو مئورخہ 21 فروری 1997 کو روزنامہ نوائے وقت ملتان اور 23 فروری کو روزنامہ جنگ لاہور میں شائع بھی ہو گیا۔ اس اشتہار کا

بل مبلغ 1729 روپے رجسٹرار کے پاس برائے ادائیگی آیا تو اسے اعتراض لگا کر شعبے میں بھیج دیا کیوں کہ وہ اشتہار یونیورسٹی کے متعلقہ شعبے کی طرف سے بھیجا جانا تھا مگر میں نے اخبار میں براہ راست بھیج دیا۔اشتہار میں فارسی بول چال کی کلاس یکم مارچ کو شروع ہونا تھی۔

ترجیحات کی فہرست میں یہ بات درج ہے "ہر اس ادارے اور فرد سے رابطہ کرنا جو شعبے کو فعال کرنے میں معاون ہوسکتا ہو"۔اس سلسلے میں میری مراد خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ملتان اور اس کے ڈائریکٹر آقای سید محمد علی رحیمی سے تھی۔یکم اگست تا 14 اگست 1996 میں بہاول پور اور ملتان وڈیرہ غازیخان ڈویژن کے منتخب کالج اساتذہ کا پہلا ریفریشر کورس سندباد ہوٹل ملتان میں ہو رہا تھا تو ان سے ہر روز ملاقات ہوتی تھی۔ان دنوں میری ڈیپوٹیشن کا کیس محکمہ تعلیم کو گیا ہوا تھا۔میں نے انہیں صورت حال بتائی اور کہا کہ اگر میرا کیس منظور ہو جاتا ہے تو ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہوگی۔انہوں نے شعبہ فارسی کے لیے ہر قسم کے تعاون کی یقین دہانی کرائی۔شعبے میں آنے کے بعد میں نے انہیں دو خطوط ارسال کیے۔شعبے کے طالب علموں کے ساتھ چند بار خانہ فرہنگ کی دعوت پر ملتان بھی جا چکے تھے۔اس دوران میں نے ان سے تعاون لینے کے ضمن میں اہم امور کی لسٹ تیار کرنا شروع کر دی۔ایران سے فارسی کتب کے کیٹیلاگ منگوا کر تقریباً 500 کتابوں کی لسٹ بھی تیار کر لی۔آخر ان سے مئورخہ 18 فروری 1997 بروز منگل ملاقات طے پا گئی۔ میں، محترمہ روزینہ انجم نقوی اور محترمہ مسرت واجد مقررہ وقت پر پہنچ گئے۔انہوں نے گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا اور کہا کہ آپ میری زبان کی ترقی کے لیے کام کر رہے ہیں میں آپ کا ممنون ہوں اور آپ سے تعاون کر کے مجھے بہت خوشی ہوگی۔ان سے ہماری میٹنگ تقریباً تین گھنٹے جاری رہی اور ہم نے ہر مسئلے اور نکتے پر مکمل حقیقت پسندی کے ساتھ بحث کی اور مندرجہ ذیل امور طے پا گئے۔اس ملاقات میں ڈاکٹر بشیر انور بھی شریک رہے۔

☆ فارسی بول چال کلاس کا آغاز حسب پروگرام یکم مارچ سے کر دیں۔ٹیکسٹ بکس ہم دیں گے اور استاد کا معاوضہ بھی ادا کریں گے۔☆ شعبے کی لائبریری کے لیے آپ پاکستان میں جتنی فارسی کتب دستیاب ہیں ان کا آرڈر دے کر بل ہمیں بھجوا دیں۔اسی طرح آپ کی لسٹ کے مطابق ایران سے کتب منگوا کر آپ تک پہنچا دی جائیں گی۔ کتب کے لیے پانچ الماریاں خرید لیں اور بل بھجوا دیں۔☆ ہماری طرف سے بہتر رابطے کے لیے فون کی تنصیب بھی کرا لیں۔☆ کمپیوٹر اور پرنٹر بھی جلد آپ تک پہنچ جائیں گے۔☆ دیگر امور کے لیے ہم رابطے میں رہیں گے جس میں فارسی کے طلبا و طالبات کے پہلے سے جاری وظائف میں اضافے کا معاملہ بھی شامل تھا۔

صاف ظاہر تھا کہ انہوں نے اس میٹنگ کے منٹس تیار کرنے کے بعد اپنی متعلقہ اتھارٹی کو بھیجنے تھے اور اس کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ہم اس کامیابی پر بہت خوش خوش واپس آئے۔طالب علموں اور دوستوں کو بھی اس خوشی میں شریک کیا۔ابھی ہماری خوشی کو 48 گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک دوست کا فون آیا جو ایک

بم سے کم نہیں تھا۔ کہنے لگے، کل آپ ایرانی ثقافتی مرکز کے ڈائریکٹر کے ساتھ دو دن پہلے کی ایک کامیاب میٹنگ کا ذکر کر رہے تھے۔ ٹی وی سنو، آج کچھ دہشت گردوں نے مرکز پر حملہ کر کے ڈائریکٹر کو قتل کر دیا ہے۔ اس حملے میں کچھ باہر سے آئے ہوئے اور عملے کے سات دیگر لوگ بھی مارے گئے۔ مجھے شدید رنج ہوا۔ یہ کیسا اتفاق تھا کہ یکم مارچ کو شروع کی جانے والی فارسی بول چال کی کلاس کے لیے داخلہ نوٹس کا اشتہار اسی تاریخ اور اسی اخبار میں شائع ہوا جس میں شہید محمد علی رحیمی کے قتل کی شہ سرخی چھپی تھی۔ ہماری تمام محنت ضائع ہو چکی تھی۔ شعبے کے حوالے سے دیکھے گئے اچھے خواب چکنا چور ہو چکے تھے۔ شکر ہے کہ ان کی بیوی بچے، اکاؤٹنیٹ ظہیر الحسن اور ڈاکٹر بشیر انور بچ گئے تھے۔ اس کے بعد کچھ دیر کے لیے مرکز کو معطل کر دیا گیا تھا۔ بعد میں شہید سید محمد علی رحیمی کے چالیسویں کی دعا میں شرکت کے لیے مرکز جانا ہوا۔ اس دن وہ چہرے جو سیکیورٹی پر ہمیں خوش آمدید کہتے تھے کوئی بھی نظر نہ آیا کیوں کہ سات مارے جانے والے افراد میں وہ سب بھی شامل تھے۔ بعد میں اسلام آباد اور ایران کے دانش افزائی کے دوروں کے سلسلہ ہی میں وہاں جانا ہو سکا۔ بحیثیت صدر شعبہ میں نے تمام سٹاف کے ساتھ مل کر جو اقدامات کیے ان سے شعبے کی یونیورسٹی بھر میں اچھی شناخت قائم ہوئی اور گمنامی سے نکل کر ایک فعال اور متحرک شعبے کے طور پر سامنے آیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کی اس دوران مولانا منیر احمد کا کردار اور رویہ کیسا رہا۔ درحقیقت انہوں نے خود کو ان سرگرمیوں سے علیحدہ کر لیا تھا۔ وہ ہمارے کسی پروگرام یا میٹنگ کا کبھی حصہ نا بن سکے۔ تصویر کشی کے وہ خلاف تھے۔ ایرانیوں سے تعلق و ربط رکھنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ بہت سے اقدامات جو اٹھائے جا رہے تھے ان کے مسلکی و فکری نظریے سے متصادم تھے۔ اسلامیات لازمی کا پیریڈ وہ باقاعدگی سے پڑھاتے نظر آجاتے۔ میں نے طالب علموں سے کبھی نہیں پوچھا کی وہ اپنے پرچے کا پیریڈ لیتے ہیں یا نہیں۔ طرفہ تماشا یہ تھا کہ ان کے پاس جو پرچہ تھا اس کا بیشتر متن اور سوالات تصوف سے متعلق تھے جب کہ اس سے اتفاق یا قبول کرنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ دراصل مجھے ان سے ہمدردی بھی تھی کہ وہ جس مضمون یعنی اسلامیات کے لیے ہی موزوں تھے مگر ان کی لابی کے دوستوں نے انہیں فارسی میں پھنسوا دیا اور ساتھ انچارج بھی بنوا دیا۔ اب لوگ ان کی کارکردگی کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے اور پرکھتے تھے۔ اگر یہ ذمہ داری ان کے پاس نہ ہوتی تو وہ نسبتاً پرسکون رہتے۔ انتظامی تقاضوں اور ضروریات سے ہم آہنگ ان کا مزاج تھا اور نہ صلاحیت اور شعور اس لیے وہ اکثر تنقید کی زد میں رہے جس نے ان کو ذہنی و جذباتی طور پر خلفشار سے دوچار کر دیا تھا اور وہ زیادہ تر داخلیت پسندی کی طرف چلے گئے۔ اس کا اظہار ان کے بے تاثر چہرے سے کبھی ظاہر نہ ہوا۔ ہم نے شعبے کے حوالے سے مختصر مدتی اہداف مکمل کر لیے تھے اور طویل مدتی اہداف کے حصول کی طرف رواں دواں تھے مثلاً ریسرچ جرنل، فارسی بول چال کی کلاس اور فارسی زبان و ادب کے حوالے سے ایک یا دو روزہ سیمینار جس کی وائس چانسلر باقاعدہ منظوری دے چکے تھے۔ میں جب سے ڈیپوٹیشن پر یونیورسٹی میں آیا تھا کالج میں میری سیٹ ابھی تک خالی پڑی تھی۔ ایک دن پرنسپل میرے گھر آئے اور عمومی قسم کی گپ شپ کے علاوہ انہوں نے

بہت سنجیدگی سے کہا کی شاید میں آپ کی سیٹ کی زیادہ دیر حفاظت نہ کر پاؤں کیوں کہ کچھ لوگ اسے کسی اور مضمون میں بدلوانے کی کوشش میں ہیں اور مجھ پر این او سی کے لیے زور دے رہے ہیں۔ میں آج آپ کو یہی بتانے آیا تھا اور مزید یہ کہ آپ کی ترقی کا کیس بھی مانگ لیا گیا ہے مگر جب تک آپ کی ڈیپوٹیشن ختم نہیں ہوتی آپ کی ترقی کا کیس بھی نہیں بھجوایا جا سکتا۔ دوسری طرف مولانا نے تمام وقت اپنی لابی کے ذریعے وائس چانسلر پر دباؤ بڑھانے کی مہم شروع کر رکھی تھی۔ وائس چانسلر نے ایک دن مجھے بلایا اور پہلے میری محنت کی تعریف کی اور کہا کہ آپ نے بہت جلد ثابت کر دیا ہے کہ میرا انتخاب صحیح تھا۔ اب تو یہ وہ شعبہ ہی نہیں رہا کہ جس کا ذکر لوگ میرے سامنے کرتے تھے، تمہارے جیسے محنتی آدمی کی ہمیں ضرورت تو ہے مگر میری بحیثیت وائس چانسلر بہت سی مجبوریاں بھی ہیں۔ مولانا نے اپنی لابی کے ذریعے مجھ پر پریشر کی انتہا کر دی ہے۔ سنڈیکیٹ اور دیگر باڈیز میں مجھے ان لوگوں کی مدد کی ضرورت رہتی ہے۔ میں آرڈر کرنے سے پہلے آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ بیشک آرڈر جاری کر دیں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ میں بنیادی کام کر کے شعبے کی پہچان کرا چکا ہوں ویسے بھی میری اپنی پروموشن قریب ہے اور میں مزید اپنی خدمات جاری نہ رکھ سکوں گا۔ تین چار دن کے بعد مولانا منیر احمد کو شعبے کا انچارج بنا دیا گیا تو طلبا و طالبات نے کلاسز کا بائیکاٹ کر دیا۔ میں نے ان کو سمجھا دیا کہ یہ تبدیلی مجھے بتا کر کی گئی ہے اور آپ لوگ کوئی ایسی صورت حال پیدا نہ کریں کہ جس سے بعد میں آپ کو نقصان پہنچ سکے۔ وائس چانسلر نے میرے کہنے پر اس بات کی مجلس انتظامیہ سے منظوری لے لی کہ شعبہ فارسی کو اسلامک لرننگ سے نکال کر آرٹس فیکلٹی میں شامل کر دیا جائے اگرچہ بعد میں اس پر مکمل عمل درآمد نہ ہو سکا۔ ایک ہفتے کے بعد میں نے چھ سات صفحوں کی اپنی کارکردگی کی ایک رپورٹ انگریزی میں تیار کی اور ساتھ ہی اپنے اصل محکمے میں واپس بھیجے جانے کی درخواست لکھی اور وائس چانسلر کے پاس برائے حصول منظوری لے گیا۔ انہوں نے رپورٹ پڑی، شاباش دی اور کہا کہ میں بھاری دل کے ساتھ آپ کے واپس جانے کی منظوری دے رہا ہوں۔ میری درخواست محکمہ تعلیم کو بھیج دی گئی۔ اب بھی میں شعبے کا حصہ تھا اور محکمے کی طرف سے جب تک میری اپنی سیٹ پر پوسٹنگ آرڈر نہیں آ گئے میں ڈیپارٹمنٹ میں رہا اور درمیانی عرصے کے دوران میں نے لونگ ٹور کی منظوری لی اور ایک بہترین لونگ ٹور کا پلان بنایا جس میں 21 طالبات اور چھ طلبا شریک ہوئے۔ یہ ٹور بہت یادگار اور کامیاب رہا جس کی تفصیل میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ اس کے علاوہ اس دوران 7 تا 28 جولائی 1997 کو مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد میں ہونے والے تیسرے دورہ بازآموزی میں بہاول پور سے مجھ سمیت فارسی کے پانچ اساتذہ نے شرکت کی۔ اس دوران میرے کالج کی اپنی سیٹ پر پوسٹنگ آرڈر آ گئے۔ یونیورسٹی سے فارغ ہوا اور اسسٹنٹ پروفیسر/ وائس پرنسپل کے طور پر اپنے کالج جوائن کر لیا۔ 1998 میں ڈاکٹر اقبال شاہد ڈاکٹریٹ کے بعد ایران سے واپس آ گئے۔ 1999 میں انہیں بھی اسسٹنٹ پروفیسر بنا دیا گیا۔ اسی سال شعبے میں ایک ایسوسی ایٹ پروفیسر کی پوسٹ آ گئی۔ اس وقت

ڈاکٹر شفیق خاں وائس چانسلر تھے۔ یونیورسٹی میں سیاسی جوڑ توڑ اپنے عروج پر تھا۔ اس سیٹ کے لیے صرف ڈاکٹر اقبال شاہد ہی اہل تھے جنھوں نے اپلائی بھی کر دیا مگر ڈاکٹر شفیق خان نے سیلیکشن بورڈ ہی نہیں ہونے دیا۔ پھر ڈاکٹر منیر اختر وائس چانسلر بنے تو ان سے بھی ڈاکٹر اقبال شاہد نے سیلیکشن بورڈ کی درخواست کی مگر انہوں نے بتا دیا کہ مجھ پر سیلیکشن بورڈ نہ کرانے کے لیے خاصا دباؤ ہے۔ ڈاکٹر اقبال شاہد مایوس ہو کر پنجاب یونیورسٹی میں بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر چلے گئے۔ بعد میں ان کی سیلیکشن گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں بطور پروفیسر ہوئی اور اور شعبہ فارسی کے چیئر مین ہو گئے دو مدتوں تک ڈین فیکلٹی آف آرٹس، اور ینٹل اینڈ اسلامک لرننگ کے طور پر کام کیا۔ آج کل ریٹائرمنٹ کے بعد پروفیسر ایمرطس ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی جو میرے وقت شعبہ فارسی میں طالب علم تھے وہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ میں یہ بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ کالج سیکٹر میں، میں نے استاد سے لے کر وائس پرنسپل، پرنسپل اور انتظامی معاملات میں ہمیشہ مثبت طرز عمل اپنانے کی کوشش کی۔ وائس چانسلر بلال اے خان جو ملاقاتیوں کو گھنٹوں انتظار کرانے کی روایت پر عمل پیرا تھے اور ذرا راسخ طبیعت کے تھے، ان کے دور میں مجھے پرنسپل کی سیٹ پر سنڈیکیٹ کا ممبر بنایا گیا۔ اگر میں پرشین ڈیپارٹمنٹ کے صدر شعبہ کو ان کی گذشتہ 20 سال کی "مجہولی" کارکردگی کو بنیاد بنا کر پریشان کرنا چاہتا تو اتنا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا مگر میں اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے کوئی غیر مہذب انداز اختیار کر ہی نہیں سکتا تھا۔

کورونا کے دوران یا فوری بعد شعبہ فارسی کے تحت ایک ورچوئل ویبی نار منعقد ہوا جس میں، میں نے اٹھارہ منٹ کی گفتگو کی۔ اس سے دو اقتباس:

''اسلامیہ یونیوسٹی بہاولپور کے شعبہ زبان و ادبیات فارسی نے کورونا وائرس کے ہاتھوں تہہ و بالا ہونے والے سماجی اور تعلیمی ڈھانچے کے پیش نظر سیمینار کی بجائے ویبی نار کے انعقاد کا جو اچانک ڈول ڈالا ہے یہ اس شعبے کی تاریخ کا غیر معمولی واقعہ ہے کیونکہ ہم نے اس قسم کی کاوش کا برسوں پہلے خواب دیکھا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی تعریف کی جانی چاہیے کیونکہ 35 سال قبل وجود میں آنے کے بعد تھوڑی بہت استثنا کے ساتھ اب یہ شعبہ ایک خواب گراں سے اٹھ کر اس منزل کی طرف گامزن ہے جس کا تعین کیا گیا تھا۔ یہاں دو بہت زیادہ محترم اساتذہ موجود ہیں، وہ اس وقت بھی موجود تھیں اور ہم نے شعبے کو لائم لائٹ میں لانے کی انتہائی کوشش کی تھی، انتہائی محنت کی تھی اور ایک دفعہ یہ دکھا دیا تھا کہ شعبے پر محنت کی جائے تو یہ نمایاں کردار ادا کر سکتا ہے۔ 97-1996 میں ہم نے مختلف حوالوں سے شعبے کو ایک شناخت دی تھی۔ بہر حال آج کے ویبی نار کا موضوع بہت اہم اور دلکش ہے۔ ''سعدی شیرازی اور آج کے تقاضے'' میں اس کے انعقاد پر آپ سب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔۔۔ فارسی ادب میں موجود اکثر شعرا کے ساتھ نصابی سطح پر پسندیدگی کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ پکی دوستی جو ہے بہت پکی دوستی تو چار شاعروں سے ہو سکی۔ اس میں بالترتیب پہلی دوستی

فردوسی جیسے قادرالکلام اور نیشنلسٹ شاعر سے ہوئی جس نے تیس سال کی محنت سے عجم کو شاعری کے ذریعے زندہ کر دیا اور اپنے کرداروں کے ذریعے اپنے نظریات کے اد پر کوئی سمجھوتہ نہ کر سکا، دوسری دوستی مولوی سے ہوئی جو دن کی روشنی میں چراغ لے کر انسان کی تلاش میں رہا، تیسری دوستی سعدی سے ہوئی جب کہ چوتھی دوستی سعدی کے ہم شہر اور سعدی کی وفات سے ایک صدی بعد دنیا میں آنے والے روشن و خوش بین شاعر حافظ شرازی سے لیکن زیادہ پر تاثیر دوستی سعدی سے رہی اور وہی دوستوں کی طرح مجھے کھینچ کر فارسی کے طرف لے آئے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کے شرق و غرب میں قرآن مجید کے بعد سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اور متعدد زبانوں میں ترجمہ ہونے والی کتاب گلستان ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تہذیب کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔آج بھی اس کتاب سے ماضی کی طرح شخصیت سازی اور متوازن معاشرے کی تشکیل کا کام لیا جا سکتا ہے۔ تجربہ، مشاہدہ اور تخلیقی قوت یکجا ہوں تو گلستان جیسی کتاب وجود میں آتی ہے جو ہر عہد اور ہر معاشرے میں کارآمد اور مستقل دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔۔۔گلستان اور بوستان میں سعدی ایک سائیکوتھراپسٹ کے طور پر سامنے آتے ہیں اور انسانی نفسیات کے ایسے پہلوؤں کو سامنے لا کر ہر دور کے انسان کی رہنمائی کرتے نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔۔ بنی آدم اعضای یک دیگرند۔۔۔کہ در آفرینش ز یک گوہرند (کئی یہاں پر جو ہرند بھی پڑھتے ہیں) چو عضوی بہ درد آورد روزگار۔۔۔ دگر عضوہا نہ ماند قرار۔۔۔تو کز محنت دیگران بے غمی۔۔۔ نشاید کہ نامت نہند آدمی (تمام انسان جسم کے اعضا کی طرح ہیں یعنی ایک دوسرے کے اعضا کی مانند ہیں کیونکہ سب کی تخلیق ایک ہی جوہر یعنی مٹی سے ہوئی ہے۔ جب ایک عضو کو کسی وجہ سے تکلیف لاحق ہوتی ہے تو جسم کے دیگر جو عضو ہیں وہ بھی بے چین ہو جاتے ہیں یعنی سارا جسم بے چین ہو جاتا ہے اور اگر ایک انسان دوسرے انسانوں کے درد سے بے فکر ہے تو اسے آدمی کہنا، انسان کہنا آدمیت کی توہین ہے۔ یہ جو تین اشعار میں نے پیش کیے ہیں ان کے بارے میں وثوق سے کہا جاتا ہے کہ عالمی ادارے یا اقوام متحدہ کا بنیادی خیال (Concept) انہی اشعار سے لیا گیا ہے۔اور یہ اشعار ترجمے کے ساتھ اقوام متحدہ کی عمارت پر نمایاں طور پر لکھے ہوئے ہیں۔

مولانا منیر احمد آغاز تقرری 1988 سے بتیس سال شعبے کے انچارج رہے اور بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر 2020 کے دوران ریٹائر ہو گئے۔ وہ شعبہ جہاں نئی سیٹ کا صرف خواب ہی دیکھا جا سکتا تھا وہاں اب تین خواتین پروفیسر بی ایس 21، ایک مرد اسسٹنٹ پرفیسر بی ایس 19 کام کر رہے ہیں۔ بی ایس کی کلاس منظوری کے باوجود شروع نہیں ہو سکی۔ اکا دکا ایم فل اور پی ایچ ڈی البتہ کرائی جا رہی ہے۔سوشل میڈیا پر شعبہ نئی روایات اور فعال شعبے کا تاثر دے رہا ہے لیکن مولانا منیر احمد کے 32 سالہ "سائے" سے مکمل طور پر نکلنے کے لیے شعبہ فارسی کو کچھ نا کچھ وقت تو لگے گا۔آخر میں مجھے معروف شاعر منیر نیازی کا یہ شعر یاد آ گیا جو اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کی گذشتہ کارکردگی کے حوالے سے نہایت موزوں ہے۔

منیرؔ اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے　　　　کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

مگر خدا گواہ ہے کہ اسلامیہ یونیوسٹی کے شعبہ فارسی کا گذشتہ 32 سال کے دوران کا سفر تو آہستہ تھا ہی، حرکت اس سے بھی آہستہ رہی۔ میری دعا ہے کہ مکمل سٹاف کے اس شعبہ میں بی ایس اور تمام متعلقہ کورسز کے لیے طلبا و طالبات بھی عطا کرے اور سٹاف کو بھی اللہ تعالیٰ شعبے کی ترقی اور شاندار روایات قائم کرنے کے جنون سے آشنا کر دے تا کہ یہ شعبہ ماضی کی مجہولیت سے نکل کر فعالیت کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

گاؤں کی مٹی سے شہر کے خوابوں تک

انگریزوں نے 1849 میں دو انگریز سکھ لڑائیوں کے بعد پنجاب پر قبضہ کیا تو متحدہ پنجاب یا مغربی پنجاب ایسا نہیں تھا جیسا یہ اب نظر آتا ہے۔ پنجاب کے پانچوں دریا جب سیلاب کی صورت کناروں سے بہہ نکلتے تو دریا کے دونوں کناروں کی جانب دور دور تک سیلابی مٹی زمین کو زرخیز بنا دیتی۔ اس طرح چراگاہیں وجود میں آئیں اور قبائل کی صورت موجود انسانوں کی زندگی کی بقا کا باعث بنیں۔ یہ قبائل دریاؤں کے دوآبوں کے درمیان یا دریاؤں کے ساتھ نشیب یا کچے کے علاقے میں متحرک قبائل کی شکل میں یا کچے اور مٹی گارے کے مکانات میں رہائش پذیر تھے۔ ان کی معاشرتی، ثقافتی، تہذیبی اور لسانی شناخت تھی۔ سارا پنجاب باروں یا جنگلوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہاں کی منفرد جنگلی حیات اور درخت و نباتات (Flora and Fauna) بکثرت موجود تھے۔ 1857 کی جنگ آزادی کے دوران ساہیوال کا علاقہ گوگیرہ تھوڑی بہت مزاحمت کا مرکز بنا مگر 82 سال کے دلیر بوڑھے پنجابی احمد خاں کھرل کی شہادت پر منتج ہوا۔ جنگ آزادی اور اس کے مابعد اثرات سے سنبھلنے اور ہندوستان کے مقبوضات کے ایسٹ انڈیا کمپنی سے برطانوی حکومت کے براہ راست زیر نگین آنے کے بعد انگریز پنجاب کے حوالے سے مختلف منصوبوں کے بارے میں سوچنے لگے۔ سب سے پہلے انہوں نے پنجاب کی تمام تجارتی اور زرعی زمین کو سرکاری (State Land) قرار دے دیا۔ انگریز مدراس اور بنگال میں سیاسی اور لینڈ ریونیو بندوبست اور انتظام و انصرام کا کامیاب تجربہ کر چکے تھے لہٰذا انہوں نے پنجاب کو "زرعی انقلاب" کا کامیاب نمونہ یا ماڈل بنانے کا فیصلہ کیا۔ 1886 کا پنجاب لینڈ ریوینو ایکٹ اور 1900 کا پنجاب لینڈ Alienation ایکٹ کا اجرا اسی نصب العین کی کڑیاں تھیں جو پنجاب کالونی ایکٹ 1912 پر منتج ہوا۔

برطانیہ میں نہری نظام کا کوئی وجود نہیں تھا مگر انہوں نے اپنے بہترین انجنیئرز کے ذریعے پنجاب میں دنیا کا بہترین نہری نظام متعارف کرانے اور آبادکاری کرنے کا بہت بڑا منصوبہ بنایا جس کے لیے محکمہ سروے آف انڈیا کے تحت سطح سمندر سے مجوّزہ نہروں کے علاقوں کا کشش ثقل کے اصول کے تحت لیول معلوم کیا۔ ان نہروں کے خاکے، ڈیزائین اور روٹ مقرر کیے گئے۔ سروے کے آلات اتنے بھاری تھے کہ انہیں گدھوں پر لاد کر مطلوبہ جگہوں تک لایا گیا۔ مقامی جغرافیائی وارضیاتی خصوصیات کا مطالعہ و تجزیہ کیا گیا۔ اس عظیم منصوبے کی فیزیبلٹی رپورٹس اور نقشوں کو محنت سے تیار کیا گیا غرض یہ کہ آبادکاری کے دیوہیکل

منصوبے کی تمام جزئیات کو سائنسی انداز میں تیار کیا گیا۔نہروں کی کھدائی کا کوئی مشینی انتظام نہیں تھا لہٰذا مقامی مزدوروں کے علاوہ افغانستان سے بھی ڈونکی لیبر منگوائی گئی جنہیں اصطلاحاً ئُر کار کہتے تھے، پنجاب کی باروں کے تمام جنگلوں کو صاف کیا گیا، انگریزوں نے یہاں کی باروں میں رہنے والے مقامی باشندوں کو تحقیر کے ساتھ ''جانگلی'' کہہ کر پکارا اور لکھا۔ ہر نہر کی کھدائی کے آغاز سے پہلے آبادکاری کی متعدد سکیموں کے تحت زمینوں کی تقسیم کا منصوبہ مرتب کیا گیا۔ دیہہ کو چک کا نام دے کر اس کے تحت چک بندی کی گئی۔ ہر چک کو ایک نمبر دے کر اس میں آباد کردہ لوگوں کو رہائشی پلاٹ یا احاطے الاٹ کیے گئے اور آبادی اور زمینوں کے لحاظ سے اس دیہات سے نہری پانی سے سیراب ہونے والی زمین منسلک کی گئی۔ چک کے معانی کھیت یا فارم کے ہیں اور چک کو زرعی بندوبست، انتظام اور ریونیو کی بنیادی اکائی قرار دیا گیا۔ دیگر آبادکاری سکیموں کے علاوہ ایک آبادکاری سکیم " گھوڑی پال" بھی تھی جس میں متعلقہ زمیندار گھوڑی پال کر فوج کے لیے خچر اور گھوڑے فراہم کرتے تھے۔ اس سے پہلے فوج کے لیے گھوڑے آسٹریلیا سے منگوائے جاتے تھے جو بہت مہنگے پڑتے تھے۔ اس سکیم کے انتظام کے لیے فوج کے تحت ریماؤنٹ کا محکمہ قائم کیا گیا جس کا انچارج کرنل کی سطح کے حیوانات کے ڈاکٹر کو بنایا گیا اور ہر بیس چکوک پر اصطبل کے نام سے ''گھوڑا ہسپتال'' قائم کیے گئے جنہیں مقامی زبان میں اصطبل کہا جاتا تھا۔ زمین تقسیم کرنے والا افسر زمین کے عرضی گزار کا انٹرویو کرتا اور پہلے اس کے ہاتھ اور جسم کا معائنہ کرتا کہ وہ زرعی زمین کو آباد کرنے کی محنت کرنے کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ پھر خاندان میں ایسے افراد جن کے بیٹے یا مرد زیادہ ہوں انہیں ترجیح دی جاتی۔ تمام چکوک کے نقشے ایک ہی طرح کے تھے۔ انگریزوں نے چکوک پر مشتمل زرعی معاشرے کے لوازمات کا خیال رکھا۔ زرعی ڈھانچے میں خدمات مہیا کرنے والی کلاس کو بھی تشکیل دیا گیا اور ان کے لیے رہائش اور کام کرنے کی جگہیں فراہم کی گئیں جن میں چوکیدار، لوہار، ترکھان، حجام، ماچھی، ماشکی اور کمہار حتیٰ کہ امام مسجد بھی شامل تھے۔ پہلے مرحلے میں پنجاب کے اہم علاقوں سے اچھی کاشتکاری کی صلاحیتوں کی حامل اقوام کو مختلف ترغیبات دے کر آبادکاری سکیموں کے ذریعے تمام کالونی علاقوں میں لا کر بسایا گیا اور نقد آور فصلوں یا کیش کراپس کے اگانے کی ہدایات جاری کیں۔ مقامی آبادی کی باری بعد میں آئی۔

تین نہریں جن کو "انہار ثلاثہ" کا نام دیا جاتا ہے اس میں پہلی نہر اپر جہلم، دوسری نہر اپر چناب اور تیسری نہر لوئر باری دوآب تھیں۔ 216 کلومیٹر میل (134 میل) طویل اور ہیڈ بلوکی سے نکلنے والی پنجاب کی تیسری بڑی نہر لوئر باری دوآب سے پانی اس وقت کے ضلع منٹگمری اور ملتان کی تحصیل خانیوال کے علاقے جہانیاں تک کی زمینوں کو دیا گیا۔ ساہیوال سے اس نہر کا فاصلہ 118 کلومیٹر یا 73 میل ہے۔ میرا گاؤں 1900 کی پہلی دہائی کے دوران ساہیوال سے سات کلومیٹر یا ساڑھے چار میل دور عارف والہ روڈ پر وجود میں آیا اور 9 ایل کی نہر سے سیراب ہونے والے اس گاؤں کو 101 نمبر جاری کیا گیا۔ نہر میں پانی اگرچہ 1913

میں آیا مگر زمینوں کی تقسیم اور چک بندی اس سے بہت پہلے منصوبہ بندی کے تحت وجود میں آ چکی تھی۔ پنجاب کالونی ایکٹ 1912 کے تحت اس تمام عمل کو قانونی شکل دے دی گئی۔ محکمہ مال میں ضلع کا سربراہ ڈسٹرکٹ کلیکٹر یا ڈپٹی کمشنر کو بنایا گیا۔ اس کے بعد اسسٹنٹ کمشنر، تحصیلدار، نائب تحصیلدار، قانون گو، گرداور اور مالی و نہری پٹواریوں کے سلسلہ وار مناصب قائم ہوئے مگر گاؤں کی سطح پر لمبردار کو اس متعارف ہونے والے نظام میں پہلی اور بنیادی اکائی کی حیثیت حاصل تھی جو حکومتی عمال اور پبلک کے درمیان رابطہ کار کا کام کرتا تھا۔ کسی بھی محکمے کے افسر یا ملازم کا میزبان لمبردار ہوتا تھا اور جس کام کے لیے وہ گاؤں آتے تھے اس میں وہ ان کی معاونت کرتا تھا۔ مزید برآں محکمہ مال وانہار کی طرف سے نہری پانی کی فراہمی پر آبیانہ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا جسے مقامی زبان میں ''ماملہ'' کہا جاتا تھا۔ نہری پٹواری اس ٹیکس کا تعین کرتا تھا اور محکمہ مال اپنے مالی پٹواری کی نگرانی میں لمبردار کے ذریعے نہری پانی استعمال کرنے والے زمینداروں جنہیں اصطلاحاً آب نوش کہنا چاہیے، سے آبیانہ وصول کیا جاتا تھا۔ سال میں دو فصلوں یعنی خریف اور ربیع کی پیداوار کے بعد وصول کیے جانے والے ٹیکس یا محصول کو تکنیکی اعتبار سے ''دھار باچھ'' کہتے تھے مگر مقامی طور پر اس ٹیکس کی تفصیل کی فہرست کو ''ڈھال واش'' کہا جانے لگا۔ ہر گھر پر ایک چوہلا اور چوکیدارہ ٹیکس بھی وصول کیا جاتا تھا۔ ترغیب کے طور پر لمبردار کو کل جمع کیے گئے ٹیکس سے ایک مقررہ تناسب سے کمیشن کی ادائیگی بھی کی جاتی۔ وراثتی یا خریدی گئی زمین کے انتقال پر لمبردار کی گواہی اور شناخت لازمی تصور کی جاتی تھی۔ پولیس کی تفتیش اور ملزموں کو پولیس کے سامنے پیش کرنے میں معاونت بھی اسی کا کام تھا۔ لمبردار کو ان خدمات کے لیے ساڑھے بارہ ایکڑ زمین خاص طور پر الاٹ کی گئی۔ مالکانہ حقوق والی زمین کے علاوہ چند لمبرداروں کو گھوری پال مربعے بھی الاٹ کیے گئے۔

ہر گاؤں کے مرکز میں ایک کنواں ہوتا تھا جسے چوک کہتے تھے۔ اس کے چاروں اطراف 200 فٹ کے فاصلے پر مکانات بنانے کی اجازت تھی۔ مرکز کی چاروں برابر اطراف میں گلیاں گاؤں سے باہر کی طرف نکل جاتی تھیں۔ ایک 100 فٹ گلی چاروں گلیوں کو برابر فاصلے پر چاروں طرف قطع کرتی اور ملاتی تھی۔ یہ ترتیب گاؤں کو چار برابر حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ گاؤں کے مرکز کے شمال مغربی کونے میں مسجد تعمیر ہوئی اور امام مسجد کا گھر اس سے ملحق تھا۔ ہر گاؤں سے باہر جانب ایک بڑا تالاب بھی تھا جہاں بارش کا پانی جمع ہو جاتا۔

1865 سے قبل گوگیرہ ضلعی ہیڈکوارٹر تھا۔ 1865 میں جب لاہور تا ملتان ریلوے لائن بچھائی گئی تو موجودہ کچہری کے قرب وجوار میں ساہو قبیلہ کی ایک چھوٹی سی بستی تھی جس کے نام پر یہاں کے ریلوے سٹیشن کا نام "ساہیوال" رکھا گیا۔ اس نام کو ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ 1865 ہی میں ساہیوال کو ضلع بنا دیا گیا اور اس شہر یا ضلع کا نام پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر رابرٹ منٹگمری کے نام پر "منٹگمری" رکھ دیا گیا۔ ضلع بننے کے بعد اس شہر کو وسعت اور شہرت ملی۔ 1868 میں یہاں کی آبادی 2413، 1875 میں 2588 اور 1881 میں 3178 نفوس پر مشتمل تھی۔ آہستہ آہستہ شہر بھی پھیلتا رہا اور یہاں شہری سہولتوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔

ڈسٹرکٹ لیول کے تمام دفاتر قائم ہونے لگے۔ بازاروں میں ہندو دکانداروں کی تعداد زیادہ تھی۔ ریلوے سٹیشن سے ملحق غلہ منڈی فعال ہونے لگی اور پنجاب کا زرعی انقلاب اجناس کی نقل وحمل اور غلہ منڈی میں لگے ان کے انباروں سے منعکس ہونے لگا۔ زرعی اقدار پر مشتمل معاشرہ وجود میں آ چکا تھا۔ بازاروں میں دکانیں اشیا سے بھری پڑی تھیں تاہم اس نسبت سے گاہکوں کی تعداد کم تھی جو آبادی کی افزائش کے ساتھ بڑھتی رہی۔ یہاں کے تجارتی اور معاشرتی ڈھانچے میں صدر تبدیلیاں اس وقت رونما ہوئیں جب پاکستان وجود میں آیا۔ اس کے نتیجے میں یہاں کا آبادیاتی ڈھانچہ یا ڈیموگرافی مکمل تبدیل ہوگئی۔ مشرقی پنجاب کے متعدد شہروں اور علاقوں سے مہاجرین نے منٹگمری کا انتخاب کیا اور جلد وہ یہاں رچ بس گئے اور سب نے اس شہر بے مثال میں تعمیر وترقی کے ایک نئے پرعزم سفر کا آغاز کیا۔

پرائمری سکول کے واحد دستاویزی ثبوت کے مطابق میں سال 1953 کے ایک صدا کیسویں دن یعنی یکم مئی بروز جمعہ اس دنیا میں "تشریف فرما" ہوا۔ اس وقت تک اکلوتا ہونے کی وجہ سے میری آمد والدین کے لیے ازحد خوشی کا باعث بنی۔ "ست ماہا" ہونے کی وجہ سے میری صحت قابل رشک نہیں تھی جس سے میری والدہ پریشان رہتی تھیں مگر جیسے جیسے مجھے دنیا کی ہوا لگتی گئی میں صحت کے لحاظ سے بہتر ہوتا گیا مگر میری والدہ مطمئن نہیں تھیں۔ کسی نے میری والدہ سے کہا کہ اگر تم اپنے نومولود کو دریا کے درمیان کے پانی میں ڈبکی دلاؤ تو اس کی صحت دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے گی۔ میری والدہ ظہری بی بی میری دادی راجن بی بی کے ہمراہ مجھے لے کر دریائے راوی کے چیچہ وطنی پتن پر پہنچیں۔ ملاح کو اس کا کام سمجھایا، چار آنے ڈبکی کے اور ایک آنہ مضبوطی سے پکڑنے کا دیا۔ ڈبکی کے بعد مجھ روتے بلکتے کو گود میں لیا اور گھر کی راہ لی۔ بقول والدہ اس مہماتی ڈبکی سے میں ان کی خواہش کے مطابق اچھا نہ ہوسکا۔ ان دنوں گرائپ واٹر نیا نیا آیا تھا کسی نے کہا اسے وہ پلاؤ، سو اس نے کام دکھایا اور میں بہتر ہوتا گیا حتی کہ میں گرائپ واٹر کی مدد سے انتہائی بچپن کے خطرات سے نکل آیا۔

میرا گاؤں ساہیوال سے چار میل کے سنگ میل کے بعد چار فرلانگ کے مزید فاصلے پر واقع ہے۔ عارف والہ روڈ سے اس کا زیادہ سے زیادہ فاصلہ 200 میٹر تھا جو کم ہوتے ہوتے اب تقریباً ختم ہونے کو ہے۔ ساہیوال عارفوالہ روڈ ایک سنگل روڈ تھی جہاں گاڑیوں اور تانگوں کو فرنٹ سے کراس کرنے کے لیے ایک پہیہ نیچے اتارنا پڑتا تھا۔ جب دو گاڑیوں کا کراس ہوتا تو فضا مٹی سے اسقدر آلودہ ہو جاتی کہ مٹی بیٹھنے تک کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اوورٹیک کے وقت بھی ایسی ہی صورت حال ہوتی۔ صبح سے شام تک روڈ پر واقع گاؤں کے اڈے پر تانگوں کی سرگرمیاں جاری رہتیں۔ گاؤں کی معاشرتی زندگی بہت زیادہ فعال نہیں تھی، وہاں ہر قسم کی سرگرمی کا محور زرعی امور اور ان کے تقاضے ہوتے تھے۔ کھلی فضا اور خالص خوراک، پرامن ماحول اور سادگی اس کے بنیادی اوصاف تھے۔ آج سے ستر سال قبل کا ماحول زیادہ پرامن اور محفوظ ہوتا تھا۔ بچوں کو اجازت تھی کہ وہ

گاؤں میں کسی کے گھر بھی بلا روک ٹوک آ جا سکتے تھے۔ بچپن کی میری پہلی یاد جواب تک ذہن سے چپکی ہوئی ہے یہ تھی کہ میں ایسی گلی میں موجود تھا جہاں سے ساہیوال شہر جانے والوں کی گزرگاہ تھی۔ میں نے دیکھا کہ میرے ابو اور امی شہر جا رہے ہیں تو میں نے بھی جانے کی ضد کی۔ ان کے کہنے پر وہاں پر موجود میری چچی کے بھائی نے مجھے باہوں میں دبوچ لیا۔ میں بہت رویا کو دا مگر ان کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکا۔ انہوں نے مجھے میرے گھر لا کر چھوڑ دیا۔ میں کچھ دیر مزید رو کر چپ ہو رہا۔ عصر کے وقت جب میرے والدین شہر سے واپس آئے تو میرے لیے ایک کھلونا لائے اور میں بہت خوش ہو گیا۔ وہ میری زندگی کا پہلا کھلونا تھا جو ٹرانسپیرنٹ پلاسٹک کی ایک گول ڈبی تھی جس کے اندر گھوڑے کا نقش بنا ہوا تھا اور اوپر ایک بٹن گھمانے سے وہ گھوڑا چند ثانیے گھومتا رہتا تھا۔ میں جب بھی خود کو پکڑنے والے شخص کو دیکھتا، مجھے یہ واقعہ ضرور یاد آ جاتا شاید اسی لیے یاد رہ گیا۔ میرے نانا گاؤں کے لمبردار تھے اس لیے ان کے ڈیرے پر اکثر سرکاری عمال آتے رہتے تھے اور ان کے لیے کھانے بنائے جاتے۔ جب بھی ایسے مہمان آتے ہم دوڑ کر اپنے نانا کے گھر چلے جاتے۔ ایک بار گدھا گاڑی کسی کی اینٹیں لائی۔ واپسی پر ہم کچھ بچے اس گدھا گاڑی پر سفر کا لطف اٹھانے کے لیے پختہ روڈ تک آئے۔ ہم میں کچھ بڑے بچے بھی تھے۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی ایک سرخ رنگ کی بس وہاں سے گزری تو بڑے بچوں نے بس پر پتھر پھینکے اور ہم سب بھاگ نکلے۔ ہم چھوٹے بچوں نے کیا بھاگنا تھا، بس رکی اور بس کے کنڈکٹر نے مجھے پکڑ لیا۔ گاؤں کا ایک شخص وہاں موجود تھا جس نے مجھے اس کے چنگل سے چھڑایا۔ اس کے ایک کان میں پیلے رنگ کی اڑسی ہوئی پنسل تھی جس کا سکہ گیلا کرنے سے نیلا ہو جاتا تھا اور اسے پکی پنسل کہا جاتا تھا۔ بعد میں خاصے دنوں تک ہم سب بچوں کو پولیس کا خوف لاحق رہا۔ جب کبھی والدین کے ساتھ شہر جانے کا اتفاق ہوتا تو مجھے تانگے پر کسی ایک کی گود میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ نہر نوابل کی پل کے بائیں جانب واقع ایک بہت اونچی عمارت کی چمنیوں سے نکلتا دھواں دور ہی سے نظر آ جاتا۔ یہ عقدہ بہت دیر کے بعد کھلا کہ یہ بجلی گھر کی چمنیوں کا دھواں تھا۔ شہر میں پہنچتے تو والد یا والدہ میں سے ایک کی انگلی کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا بہت لازمی تھا کیوں کہ انگلی چھوڑنے کا صاف مطلب گم شدگی تھا۔ بازاروں میں اکثر تانگوں پر اور مسجدوں سے بچوں کی گم شدگی کے اعلانات سنائی دیتے تھے۔ اگر مجھ سے ان کی انگلی چھوٹ جاتی تو وہ فوراً میرا بازو پکڑ لیتے۔ جب کبھی والدین کے ساتھ بس میں سفر کرنے کا موقع میسر آتا تو ''آدھی سواری کو سیٹ نہیں ملے گی'' کے اصول کے تحت مجھے کسی ایک کی گود میں بیٹھنا پڑتا۔ جب میں کھڑکی کی جانب دیکھتا تو مجھے لگتا جیسے بس نہیں بلکہ درخت دوڑ رہے ہوتے اور یہ ایک ایسی حیرت تھی جو بڑا ہونے کے بعد ہی دور ہو سکی۔ ایک اور حیرت بھی بس کے حوالے تھی کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا ڈرائیور اور پچھلے دروازے پر کھڑا ہوا کنڈکٹر ایک دوسرے سے جب بات کرتے تھے تو اتنے فاصلے کے باوجود وہ ایک دوسرے کی بات کیسے سمجھ لیتے تھے۔ ہمارے گاؤں کی جنوبی سمت سے ایک سڑک عارف والہ روڈ سے شروع ہو کر دو کلومیٹر دور اگلے گاؤں 102 / 9 ایل تک جاتی

ہے۔اس سڑک کی دونوں اطراف میں گاؤں کی زرعی زمینیں ہیں۔گاؤں سے کچھ دوراس سڑک پرایک کھجور کا درخت تھا جس کے بارے میں مشہور کر دیا گیا کہ اس پر جنوں کا بسیرا ہے۔اس بات کو مستند بنانے کے لیے دو تین قصے بھی مشہور کر دیے گئے تھے۔میرے اندراس کھجور کے درخت کا خوف بیٹھ گیا تھا اوراس کے قریب سے گزرتے وقت میں خوف کے مارے منہ دوسری طرف کر لیتا بعد میں کھجور کا درخت کاٹ دیا گیا۔ایک اور حیرت بھی یاد آ گئی،گاؤں کے جنوبی طرف ایک وسیع تالاب تھا جس سے گھروں کو پوتنے والی مٹی کھود کرا ٹھائی جاتی جس سے یہ تالاب گہرا ہوتا گیا۔عموماً یہ خشک ہی رہتا۔جب تیز بارش ہوتی تو یہ گاؤں کی گلیوں کے پانی سے بھر جاتا اور ہم بچے اس میں خوب نہاتے پھرتے حتیٰ کہ پونگوں کی صورت مچھلیاں بھی نظر آ جاتیں،حیرت یہ تھی کہ خشک تالاب میں بارش کا پانی آ جانے سے مچھلیوں کے بچے کہاں سے آ جاتے،کیا وہ بارش کے ساتھ اوپر ہی سے آتے تھے؟ گاؤں سے تین کلومیٹر دور ساہیوال شہر ختم ہونے کے بعد رلوئر باری دوآب سے نکلنے اور عارف والا کی طرف جانے والی فیڈر نہر کے قریب 1951 سے میرے میرے دادا کے نام ایک مربع زمین تھی جہاں بچپن میں فصل بونے،فصل اٹھانے اور دیگر مواقع پر اکثر جایا کرتا۔ہماری زمین سے پہلے جن کے کھیت تھے وہاں بیری کا ایک شاندار درخت تھا جس کے بڑے اور پکے ہوئے بیر کھانے کا اپنا ایک لطف تھا۔بیری کے درخت والوں نے معروف کر دیا تھا کہ یہاں جنوں کا بسیرا ہے۔میں اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ہمراہ ایک دفعہ اس کے بیر کھانے گیا۔جنوں کے ڈر کی وجہ سے ہم نے اپنے سانس روک رکھے تھے اور اپنی جھولیاں پھیلائے صرف گرے ہوئے بیروں پر اکتفا کرتے جاتے۔بیر بھی اکٹھے کرتے جاتے اور شاخوں کے درمیاں جنوں کو دیکھنے کی بھی کوشش کرتے جاتے۔جان بچی سولاکھوں پائے کے مصداق بیر بھی کھا لیے اور جنوں سے بھی بچ گئے۔بس سکول میں داخل ہونے ے پہلے کی یہی یادیں ذہن مین محفوظ رہ گئیں۔

ہمارے گاؤں میں پرائمری سکول نہیں تھا۔ہمارے گاؤں کے برابر ایک کلومیٹر سے بھی کم فاصلے پر چک نمبر 100 / 9-ایل میں سکول تھا۔ان دونوں گاؤں کی زرعی حدود مشترک ہیں۔ہمارے گاؤں کے بچوں کے لیے بھی وہی سکول تھا۔یہ گاؤں اتنا قریب ہے کہ مقامی طور پر کہا جاتا کہ اگر اپنے گاؤں سے گلاس سے پانی پھینکو تو گرتا اس گاؤں میں تھا۔میرے والد مجھے پڑھانے کا شدید شوق رکھتے تھے۔اس وقت پانچ سال کے بچے کو اول ادنی (کچی) کلاس میں داخل کیا جاتا تھا مگر میں ابھی چار سال کا تھا تو میرے والد نے میری انگلی پکڑی اور مجھے سکول داخل کرانے کے لیے لے گئے۔ہیڈ ماسٹر صاحب نے تاریخ پیدائش پوچھی،والد صاحب نے کہا کہ گذشتہ پانچ سال پہلے کی آج کی تاریخ لکھ لیں یوں میری پیدائش کی تاریخ یکم مئی 1953 قرار پائی۔یہ واقعہ 1958 کا ہے۔میری والدہ نے میرے لیے کپڑے کا ایک تھیلا سی دیا جسے بستہ قرار دیا گیا۔بستہ ایک سلیٹ،اس پر لکھنے کے لیے سفید رنگ کی سلیٹی،ایک ابتدائی اردو قاعدہ،لکڑی کی ایک تختی اوراسے پوچنے کے لیے ملتانی مٹی کا ٹکڑا یا گاچنی،اس پر چار عدد لائنیں لگانے کے لیے برقی سیل سے نکلا ہوا سکہ،

سرکنڈے کی قلم اور کپڑے کا ٹکڑا، پانی اور سیاہ پاؤڈر ڈال کر بنائی گئی سیاہ روشنائی کی دوات کے کل اثاثے پر مشتمل تھا۔ داخل ہونے کے بعد میں بھی چھوٹے چھوٹے ڈگ بھرتا سکول جانے اور واپس آنے والے گروہ کے ساتھ ہو لیتا۔ پڑھائی کے لیے والد صاحب کا خوف پہلے دن ہی ساتھ ہو لیا۔ چھٹی کرنے کا دور دور تک کوئی تصور نہیں تھا۔ استاد کا اس قدر ڈر اور رعب تھا کہ سر اور آنکھیں نیچے کر کے ان کی ہدایت یا حکم سنا جاتا یا ان کی کسی بات کا جواب دیا جاتا۔ بلاوجہ غیر حاضری پر مار بھی پڑتی اور ہیڈ ماسٹر گھر تک پہنچ جاتے تھے۔ ہمارے سکول میں کل دو استاد تھے، ایک ہیڈ ماسٹر محمد صادق صاحب اور سیکنڈ یا چھوٹے ماسٹر احمد اللہ صاحب۔ سیکنڈ ماسٹر صاحب جو ساہیوال کے قریبی دیہات 9/135-ایل سے آتے تھے، شفیق سے زیادہ غصیلے تھے لہٰذا کوئی خوش نصیب ہی تھا جس کے ہاتھ ان کے "مولا بخش" سے آشنا نہ تھے۔ ان کے احترام سے ان کا خوف زیادہ تھا۔ چوں کہ چھوٹی کلاسیں ان کے پاس تھیں اس لیے تمام بچے انہیں اپنے وقت کا "جلاد" تصور کرتے۔ مجھ سمیت اکثر بچے ان کو بد دعا بھی دے دیتے اور ان کے تبادلے کی دعا بھی کرتے تھے۔ جس روز وہ چھٹی پر ہوتے ہمیں سکول جنت محسوس ہوتا۔ ایک دفعہ تو ان کے تبادلے کی افواہ اڑی تو ہم سب نے اسے دعاؤں کی قبولیت کا نتیجہ سمجھا مگر وہ افواہ نکلی۔ سکول میں بیس منٹس کا وقفہ تفریح کہلاتا تھا اور وہ ہمارے لیے صحیح معنوں میں تفریح ہوتی۔ اس دوران ہم سکول والے گاؤں کے چوک میں واقع ایک دکان پر آتے جہاں بھنے ہوئے چنے، ابلی ہوئی شکر قندی، چنے کی دال اور سویّوں والی نمکو اور میدے و کھانڈ سے تیار کی گئی میٹھی لمبی ڈلیاں المعروف ''ٹانگر'' باری باری مزے لے لے کر کھاتے۔ اس تفریح کا ہم سب بے چینی سے انتظار کرتے کیوں کہ اس سے استاد کی سختی کی کلفت بھی دور ہو جاتی اور بھوک بھی۔ دن کی آخری سرگرمی پہاڑے یاد کرنے کا وقت ہوتا جو چھٹی کی نشانی تھی۔ ایک لڑکا چیخ کر پہاڑے پڑھتا اور باقی اس سے زیادہ طاقت کے ساتھ اس کو دہراتے۔ سکول میں سب سے بڑا دن سالانہ نتیجے کا ہوتا تھا، تمام طلبا ممکنہ نتیجے کے حوالے سے پریشان اور سہمے ہوئے ہوتے۔ دل کی دھڑکن اتار چڑھاؤ کا شکار ہوتی۔ یہ دن جتنا سخت ہوتا، کامیابی کی خوشی اس سے دو چند ہوتی ہفت روزہ تعطیل گویا عید کا دن ہوتا۔ والد صاحب نے مجھے کبھی ایک چپت تک نہیں لگائی مگر ان کا ڈر اور رعب بہت تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھے سامنے بٹھالیا اور سلیٹ پر کوئی سوال حل کرنے کا حکم دیا، ساتھ ہی مصالحہ کوٹنے والی کونڈی کا مخصوص تین انچ موٹا ڈنڈا (مقامی زبان میں لون مرچوں والا سوٹا) رکھ لیا۔ اب میں سوال کیا حل کرتا، ڈنڈے پر نظر پڑتی تو خوف کے مارے آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے جس سے سلیٹ پر لکھا سوال مٹ جاتا۔ ایسے میں میری امی میرے بچاؤ کے لیے آ گئیں اور والد صاحب سے کہنے لگیں کہ چھوڑیں جی، آپ نے میرے بچے کے سانس سکھا رکھے ہیں، سیکھ اور پڑھ لے گا، اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ غالباً 1962 کے دوران ملک میں کرنسی کا اعشاری نظام متعارف کرایا گیا۔ اس سے قبل چار پیسے کا ایک آنہ، چار آنے کی چونی، آٹھ آنے کی اٹھنی اور سولہ آنے یا چونسٹھ پیسوں کا ایک روپیہ ہوتا تھا۔ اب متعارف کرائے جانے والی کرنسی سکیم میں سو پیسے کا روپیہ کیا گیا

اوراس کا ایک پیسہ ٹیڈی پیسہ کہلایا جنہیں ہم بچے سوٹیڈی پیسے جمع کر کے حیرت زدہ ہوتے تھے۔اس کے پچیس اور پچاس پیسوں کے سکے چونی اوراٹھنی ہی کہلائے۔

کچی (اول ادنی)، پکی (اول)، دوم اور سوم کلاس تک چار سال لگ گئے۔ چوتھی کلاس میں فرق یہ پڑا کہ ہماری کلاس ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس آ گئی جو طبعاً مہربان اور نرم خو تھے لیکن نظم وضبط یا پڑھائی پر وہ صرفِ نظر کے قائل نہیں تھے۔ ڈنڈا ان کا بھی چلتا تھا مگر ناگزیر صورت حال میں۔ان کے حوالے سے مجھے دو واقعات یاد ہیں۔ ہماری کلاسیں سکول کے مرکزی لان میں موجود درختوں کے نیچے ہوتی تھیں۔ بارش کی صورت میں دائیں بائیں دو دیواریں کھڑی کر کے ان پر سرکنڈوں کی چھت والا لمبائی کی اطراف میں کھلا ہوا "ہال" موجود تھا جسے مقامی زبان مین''چھپر''یا''چھپرا'' کہتے ہیں۔ میرے پھوپھی زاد مقیم خاں نئے نئے داخل ہوئے تھے اور میں سینئر ہونے کے ناطے اپنی کلاس چھوڑ کر اس کے پاس بیٹھا تھا کہ ہیڈ ماسٹر کی آواز آئی واپس آ ؤ اپنی کلاس میں، جسے میں نے نظر انداز کر دیا جس کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے ڈنڈے کو چند گز کے فاصلے سے اتنی مہارت سے میری طرف پھینکا کہ مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا اور ٹھک سے میرے بازو پر آ لگا۔ آخر مجھے واپس کلاس میں آنا پڑا۔ایک واقعہ تو ایسا ہے کہ جس نے میری زندگی اور سوچ پر بہت دیرپا اثرات مرتب کیے۔سکول کے استاد سکول میں لگے ہوئے پودوں کی گوڈی متعلقہ مہارت رکھنے والے طلبا سے کراتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بڑی محبت سے گلاب کے تین پودے لگوائے ہوئے تھے جن پر ایک ایک پھول بھی آیا ہوا تھا۔ایک دن انہوں نے حسب معمول چار پانچ طلبا سے باری باری کُھرپے سے گوڈی کرنے کو کہا۔اس دوران میں نے بھی فرطِ شوق سے ایک ساتھی طالب علم سے دستی کدال جسے پنجابی میں کھرپا یا رمبہ کہتے ہیں، پکڑا اور لگا گوڈی کرنے کہ میرے ایک ہی وار سے گلاب کا ایک پودا زمین پر آ رہا۔ ساتھی طلبا نے مجھے بہت ڈرایا کہ آج تمہاری خیر نہیں، تم نے کل تین پودوں میں سے ایک زمین بوس کر دیا۔ میرا سانس خشک ہو گیا اور میں ذہنی طور پر خود کو ایک کلاسیکل قسم کی مار کے لیے تیار کرنے لگا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو اس "نقصان عظیم" کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے انتہائی غیر متوقع ردعمل ظاہر کرتے ہوئے اس وقت تک کی میری زندگی کے تاریخی الفاظ کہے۔"اسے مارنے سے کٹا ہوا پودا واپس تو نہیں آ جائے گا۔" یہ جملہ میرے اندر گھر کر گیا کیوں کہ یہ محض ایک جملہ نہیں تھا، ایک رویے، سوچ اور طرزِ عمل کا نام تھا۔ میں عمر بھر اس جملے اور اس میں بیان کردہ حقیقت کے اثرات کے تابع رہا۔

اس دور میں اوپر خدا اور نیچے استاد کا درجہ تھا۔ استاد اگر سامنے سے آ رہا ہوتا تو شاگرد فوراً مؤدب ہو جاتے۔ اگر استاد آگے جا رہا ہوتا تو آگے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سائیکل سوار بھی سائیکل سے اتر کر پیدل ہو لیتے۔ ہمارا سکول براہ راست عارف والہ روڈ سے اتنا قریب تھا کہ سڑک سے گزرنے والی ٹرانسپورٹ کو سکول سے با آسانی دیکھا جا سکتا تھا لیکن چوں کہ سکول گاؤں کے شمال مشرقی کونے پر واقع تھا اس لیے گاؤں

کوآنے والی سڑک کے بعد سکول آنے کے لیے کچھ فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ اگرچہ اس سمت مٹی اور گارے کی دیوار بنی ہوئی تھی پھر بھی سکول آنے والا سکول سے نظر آ جاتا تھا۔ ہم اکثر نوٹ کرتے کہ کبھی کبھار ہمارے استاد اس طرف نظریں اٹھا کر دیکھ لیتے تھے۔ ایک دن پینٹ اور قمیض میں ملبوس ایک شخص جس نے سر پر انگریزی ہیٹ لے رکھا تھا سائیکل پر سکول کی جانب آتا دکھائی دیا۔ دونوں استادوں کی بے چینی اور اضطراب بڑھ گیا۔ ایک دم وہ حرکت میں آئے اور لمحوں میں سکول میں بکھرے کاغذ اور دیگر چیزیں صاف کروائی گئیں۔ تمام کلاسز کو ترتیب سے بٹھایا گیا اور کسی نا کسی درسی سرگرمی میں مصروف کر دیا۔ تمام کلاسوں کے درمیان کرسی اور میز رکھ دیے گئے تا آنکہ وہ شخص سکول آ پہنچا۔ سیکنڈ ماسٹر صاحب نے ان سے سائیکل پکڑنے کی کوشش کی مگر انکار ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر (ADI) یعنی آج کے ڈپٹی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر تھے اور سکول کے اچانک معائنے کے لیے آئے تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور دونوں استاد ہاتھ باندھے ان کے سامنے کھڑے تھے۔ اے ڈی آئی نے سگرٹ منہ سے لگایا اور اسے سلگانے کے لیے ماچس کی تیلی کو آگ دکھائی تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے تیلی کو ہوا سے بجھنے سے بچانے کے لیے ایک رجسٹر سامنے کیا جسے اس نے بڑی رعونت سے ایک طرف کر دیا اور کہا، "رہنے دو میں سب جانتا ہوں۔" ہیڈ ماسٹر صاحب اپنا سا منہ لے کے رہ گئے۔ پھر اس نے کچھ رجسٹر منگوا کر چیک کیے اور کسی رجسٹر پر کچھ تحریر کیا۔ اس تمام واقعے سے ہم طلبا کی انا کو بہت تسکین ملی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جنہیں ہم خدا کے بعد سمجھتے ہیں ان سے اوپر بھی کوئی ہے کہ جن کے سامنے وہ ہاتھ باندھ کر اور نہایت مؤدب انداز میں کھڑے تھے۔ جب پنجاب میں نہروں کا جال بچھایا گیا تو مناسب فاصلوں پر کینال ریسٹ ہاؤس بھی تعمیر کیے گئے جہاں افسران بوقت سرکاری دورہ قیام کرتے تھے۔ ہمارے گاؤں سے دو کلومیٹر دور عارف والا روڈ کی بائیں جانب "بلّے والہ بنگلہ" کے نام کا کینال ریسٹ ہاؤس تھا۔ پختہ سڑک چوں کہ بعد میں بنی تو اس بنگلے کی وجہ سے عارف والا روڈ کو دائیں جانب موڑ دیا گیا اور بنگلے کی حدود ختم ہونے کے بعد پھر اس سڑک کو بائیں جانب موڑ کر سیدھا کر دیا گیا اس لیے اسے بلے والا موڑ بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں محکمہ انہار کے علاوہ محکمہ مال کے عمال بھی آتے رہتے تھے۔ بچپن میں مجھے یاد پڑتا ہے کہ گھوڑی پال سکیم کے تحت زمیندار جو گھوڑیاں پالتے تھے ان کی انسپیکشن بھی یہیں پر کی جاتی تھی۔ تحصیلدار اس بنگلے سے ملحقہ جتنے بھی گاؤں تھے ان کی وراثتی یا دیگر انتقالات کے امور بھی یہیں پر نپٹاتے تھے۔ بی ڈی ممبرز کے الیکشن کی ووٹنگ بھی یہیں ہوتی تھی۔ یہاں پر ٹیلیفون کی سہولت بھی میسر تھی۔ پانچویں کلاس میں جب ٹیلی فون کے بارے میں پڑھایا گیا تو ہمارے استاد تمام کلاس کو اسی بنگلے پر ٹیلیفون اور اس کا کام دکھانے کے لیے لے کر گئے۔ وہاں پر کسی بیلدار سے ملے اور آنے کا مقصد بتایا۔ اس نے ٹیلیفون والا کمرہ کھول دیا۔ یہ سیاہ رنگ کا ٹیلیفون اپنے دور کے مروجہ ماڈل کا تھا۔ اس نے کسی کو فون ملا کر بتایا کہ سکول کے طلبا ٹیلیفون دیکھنے آئے ہیں ان سے بات کر لیں۔ آگے سے فون پر بات کرنے کی بجائے اسے بند کر دیا گیا۔ اس طرح فون تو دیکھ لیا مگر

اس کا کام نہ دیکھ سکے۔اسی کلاس میں ہڑپے کا ایک تفریحی ٹور بھی یاد ہے۔ ہڑپہ جانے والی موکل بس سروس پر باہر والے موڑ سے بیٹھے اور آدھ گھنٹے میں ہڑپہ پہنچ گئے۔ وہاں سے آثار قدیمہ کی جگہ پر آئے۔ اگرچہ ہم نے تمام جگہیں بشمول نوگزی قبر کو دیکھ لیا لیکن اس جگہ کے بارے میں صحیح طور پر آگاہ نہیں تھے، یہ محض ایک تفریحی ٹور تھا، مطالعاتی ہوتا بھی تو ہمیں کون سا سمجھ آنی تھی کہ آثار قدیمہ کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔اس وقت کا میوزیم مجھے یاد نہیں ہے، موجودہ میوزیم تو 1967 میں تعمیر ہوا اور میں اس سے پانچ سال پہلے کی بات کر رہا ہوں۔

1963-64 کے تعلیمی سال کے دوران میں پانچویں کلاس میں پہنچا تو پرائمری سکول کی فائنل اور آخری کلاس کا سٹوڈنٹ تھا۔اس سال میں نے باقاعدگی سے ماہ رمضان المبارک کے روزے رکھنے شروع کیے۔ظہر کی نماز باجماعت ادا کرنے کا سکول میں انتظام کیا گیا تھا۔کالج کے سامنے سے ایک نہری کھال گزرتا تھا اور اس کے کنارے پر سکول کا نلکا لگا ہوا تھا۔شدید سردیوں کا موسم تھا۔کھال کا پانی شفاف ہوتا تھا اور سخت سردی بھی مگر نلکا خراب ہونے کی صورت میں وضو وہیں سے کرتے تھے۔اس سرد پانی کا احساس اب بھی مجھے یاد ہے۔ایک دن ٹڈی دل نے حملہ کر دیا تو ہم ہیڈ ماسٹر کی حسب ہدایت اپنی سلیٹوں کو تختیوں پر مار کر شور پیدا کر کے کے پودوں پر بیٹھی ٹڈی دل کو اڑاتے رہے۔ملک میں پہلے پانچ سالہ منصوبے کے تحت مختلف ترقیاتی امور سرانجام دیے جا رہے تھے۔انہی میں شہر کے قریبی دیہاتوں میں بجلی کی فراہمی بھی شامل تھی۔ہم بجلی کے کھمبوں کی تنصیب کے مرحلے کو سکول ہی سے دیکھتے رہتے تھے۔ان پر جب تاریں کھینچیں گئیں تو تانبے کا سنہرا رنگ دور سے چمکتا دکھائی دیتا۔عارف والہ روڈ پر چک نمبر 135، 101 اور 100 / 9-ایل تک ایک ہی لائن کھینچی گئی۔جب ان تاروں میں بجلی کی رو چھوڑی گئی تو گاؤں کے ان گھروں میں جنہوں نے کنکشن کی درخواستیں دی تھیں بجلی کے میٹر لگنے شروع ہوئے۔ایک دن میں سکول سے گھر پہنچا تو ہمارے گھر میں بجلی کا میٹر لگایا جا رہا تھا جس کے بعد بلب روشن کر کے چیک کیا گیا۔گاؤں میں بلب کو انڈا کا نام دیا گیا۔ابتدا میں یہ بات اڑا دی گئی کہ بجلی کے کرنٹ سے انسان مر جاتا ہے تو خاصے لوگوں نے بجلی کے لیے درخواستیں ہی نہیں دیں۔ ہمارے وقتوں میں پانچ یا چھ کے قریب پرائمری سکولز کے لیے اس علاقے کا سنٹر مڈل سکول ہوتا تھا جہاں سالانہ ٹورنامنٹ اور پانچویں کلاس کا امتحان لیا جاتا تھا جسے سنٹر کا امتحان کہتے تھے۔ ہمارا سکول پاکپتن روڈ پر واقع 99 / 9-ایل (ابھولے کی جھوک) کے مڈل سکول سے ملحق تھا جہاں سالانہ کھیلوں کے مقابلے بہت بڑی تفریح مہیا کرتے تھے۔ہمیں بھی سپورٹس یونیفارم پہن کر جانے کی ہدایت تھی۔بعض سکول اس موقعے کی مناسبت سے بہت زیادہ تیاری کر کے آتے تھے۔دو ایک سکولوں کے پی ٹی شو بڑے شاندار ہوتے۔اس ایک دن کا انتظار بڑی بے چینی سے ہوتا۔آخر مارچ 1964 کے وسط کی کوئی تاریخ پانچویں کے سنٹر امتحان کے لیے مقرر ہوئی۔ایک ہی دن آدھ آدھ گھنٹے کے پانچ پرچے لیے گئے۔جس سکول کے طلبا پرچہ حل کر لیتے وہ فوراً کھڑے ہو جاتے۔گویا کون سے سکول کے بچے کون سا پرچہ پہلے حل کرتے ہیں کا مقابلہ بھی تھا۔اسی وقت

پرچوں کی مارکنگ کی جاتی۔سنٹر کی پانچویں کلاس سمیت تمام سکولوں کے کل امتحانی امیدوار ساٹھ سے زیادہ نہیں تھے۔اسی روز ہیڈ ماسٹر صاحب کو رزلٹ رجسٹر میں درج کر کے دے دیا جاتا مگر 31 مارچ سے پہلے نتیجے کی بھنک تک نہیں پڑنے دی جاتی تھی۔ یوں نتیجے کے اعلان کے لمحے تک طلبا اپنے مقدر کے فیصلے کے انتظار میں گویا کانٹوں پر لوٹتے۔ 31 مارچ 1964 کو یہ اعلان ہوا کہ میں پانچویں کلاس پاس کر چکا تھا۔ میرے والد کی خوشی دیدنی تھی۔ میرے ایک کزن ظفر (مرحوم) فائنل امتحان سے پہلے ہی سکول چھوڑ چکے تھے اور میں اور میرا ماموں ذوالفقار دونوں آگے پڑھنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ میرے دو کلاس فیلو شہادت خاں اور مرید خاں نے 99 /9-ایل کے مڈل سکول میں داخلہ لے لیا جب کہ میں اور میرے ماموں نے گورنمنٹ ہائی سکول ساہیوال میں چھٹی کلاس میں داخلے کا ٹیسٹ دیا جو اپریل کی موسم بہار کی دس تعطیلات کے بعد اس وقت کی ہوسٹل کے وسیع تر گراؤنڈ میں لیا گیا اور ہوسٹل کی دیواروں پر ہی ٹیسٹ کے نتائج کو چسپاں کر دیا گیا۔ اپنے والد کے ساتھ اگلے دن جا کر ٹیسٹ دیکھا تو ہم دونوں کامیاب ہو گئے تھے۔ والد محترم نے انتہائی خوشی کے عالم میں میرے ماتھے پر بوسہ دیا۔ یہ محض ایک بوسہ نہیں تھا، یہ استعارہ تھا میرے مستقبل میں آگے بڑھنے کا۔ اس بوسے سے مجھے ہمیشہ ایک طرح کی تحریک ملتی رہی۔

گورنمنٹ ہائی سکول ساہیوال جیسے تاریخی اور مؤقر تعلیمی ادارے میں داخلہ ہو چکا تھا۔ اب مسئلہ جانے آنے کا تھا۔ ابھی میں سائیکل چلانے کے قابل تصور نہیں کیا جا رہا تھا۔ ایک مستقل تانگے کا انتظام کرنے کا فیصلہ ہوا۔ میرے اور ماموں ذوالفقار کے لیے نصف کی شراکت سے تانگہ گھوڑا اور کوچوان کا انتظام کر دیا گیا۔ سکول چھوڑنے کے بعد کوچوان تانگے کو قریب کے کسی درخت کے نیچے گھوڑا کھول کے کھڑا ہو جاتا۔ جیسے ہی چھٹی کا وقت ہوتا تو تانگہ جوت لیتا اور ہم گھر کی راہ لیتے۔ شہر کے اچھے تعلیمی ادارے میں داخل ہونے سے خود اعتمادی میں بھی اضافہ ہوا۔ چھٹی کلاس میں غالباً پچاس پچاس طلبا کے چھ سیکشن بنائے گئے۔ میرا سیکشن اے تھا۔ اس ادارے میں بھی ہمیں ٹاٹ ہی بیٹھنے کو ملے بل کہ کمرے کی بجائے سکول کی عقبی یا شمالی جانب دو عمودی دیواروں پر سرکنڈوں کی چھت ڈال کر ٹاٹ بچھا دیے گئے تھے۔ بنچوں پر بیٹھنے کا خواب چکنا چور ہو چکا تھا۔ تمام سیکشنوں کو ایک ایک" کمرہ" الاٹ کر دیا گیا۔ وہ طلبا جو کانونٹ سکول سے پرائمری کر کے آئے تھے اور انہوں نے انگریزی کا مضمون بھی پڑھ رکھا تھا وہ بھی ٹاٹوں پر بیٹھ کر چھٹی کی انگریزی کی پہلی کتاب ہمارے ساتھ پھر سے شروع کر رہے تھے۔ چھٹی کلاس کا صرف ایک واقعہ حافظے میں محفوظ رہ گیا۔ انگریزی کے پیریڈ میں استاد مختلف الفاظ کے انگریزی ہجے پوچھ رہے تھے۔ جیسے ہی وہ سوال کرتے بہت سارے طلبا جواب دینے اور اپنی دھاک بٹھانے کے لیے ہاتھ کھڑے کرتے۔ استاد کسی ایک سے جواب پوچھ لیتے۔ ایک بار انہوں نے چیئر (کرسی) کے انگریزی ہجے پوچھے تو بہت سارے کھڑے ہاتھوں میں 138 /9-ایل کے رحمت اللہ کا انتخاب ہوا۔ انہوں نے فوری جواب دیا" چی اے آئی آر"۔ یہ صاحب بعد میں یونائیٹڈ بنک کے درجہ اول کے

افسر بنے۔ بوجوہ تانگہ گھوڑا چند ماہ ہی چل سکا۔ ماموں نے چھوٹا سائیکل خرید لیا اور مجھے سیٹلائیٹ ٹاؤن (بعد میں فرید ٹاؤن) کے سٹریٹ نمبر ایک میں واقع ایک گھر میں گاؤں کے چند نوجوان جو کالج میں زیر تعلیم تھے، کے ساتھ رہائش فراہم کی گئی۔ کالج کے وہ طلبا اپنے تایا کے بیٹے جہان خان کی سرپرستی میں رہتے تھے جو بی اے میں کمپارٹ آنے کے بعد اسے پاس کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھے۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ کھانے کے لیے ایک باورچی کا انتظام کیا گیا۔ جس مکان میں ہم رہتے تھے اتفاق سے وہ میرے سیکشن فیلو اور کلاس مانیٹر رانا سعید احمد کا تھا۔ رمضان ختم ہونے کے بعد کالج والے طلبا نے بتایا کہ کسی جمعہ کو گورنمنٹ کالج ساہیوال کے "سینما گھر" میں نور جہاں کی فلم انارکلی دکھائی جا رہی ہے۔ ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ کالج کا پراکٹوریل بورڈ غیر متعلقہ افراد کو داخلے سے باز رکھنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ ہم بچے بھی داؤ لگا کر اس شامیانے تک پہنچ گئے اور وہاں کسی کونے میں دبک کر بیٹھ گئے اور کسی نا کسی طور پوری فلم دیکھ لی۔ میری زندگی کی یہ دوسری فلم تھی۔ پہلی فلم پانچویں کلاس کے دوران عارف والہ کی ایک کچی ٹاکی میں دیکھ چکا تھا جس کا نام "شیخ چلی" تھا۔ یہ دو فلمیں دیکھنے کے بعد پھر آئندہ پانچ سال تک کوئی فلم دیکھنے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ شہر سے سیٹلائیٹ ٹاؤن کے درمیان ایک بس تمام دن چکر لگاتی رہتی تھی۔ ہم سکول جانا آنا اسی بس سے کرتے۔ اس کا آخری سٹاپ یا اڈا موجودہ یونائیٹڈ بینک ہائی سٹریٹ کے سامنے ہوتا تھا۔ یہ اپنے روٹ کے مطابق گورنمنٹ ہائی سکول کے ساتھ کچہری کو مڑ جاتی جہاں سے گورنمنٹ کالج کے دائیں جانب پہلی سڑک کی جانب مڑ جاتی اور اس کا آخری سٹاپ مارکیٹ ہوتا تھا۔ اس وقت فرید ٹاؤن تھا ہی کتنا۔ 2 جنوری 1965 کو ایوب خاں اور محترمہ فاطمہ جناح کے درمیان صدارتی الیکشن ہونا قرار پائے تو اس سے پہلے ایک ماہ تک الیکشن مہم چلی، ان میں سے کسی ایک کا انتخابی نشان گلاب کا پھول تھا۔ لوگ ان نشانوں کی تصویر کو جیبوں کے اوپر یا سینوں پر سجا لیتے۔ مجھے بھی گلاب کے پھول کا سٹکر لگانے کا بہت شوق تھا۔ جب کسی نے مجھے وہ سٹکر دیا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ مارچ 1965 میں چھٹی جماعت کا سالانہ امتحان ہوا اور 31 مارچ کو امتحان کا نتیجہ نکلنا تھا۔ میں نے امتحان دے کر شہر کی رہائش ترک کر دی اور گھر والوں سے سائیکل کی فرمائش کر دی۔ جس دن نتیجہ نکلنا تھا اس دن میں جب شہر کے تانگہ سٹینڈ پر اترا تو میں نے ایک جوتشی کو دیکھا۔ اسے بتایا کہ میرے امتحان کا نتیجہ نکلنا ہے بتاؤ میں پاس ہو جاؤں گا۔ اس نے پوچھا تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں، میں نے کہا چار آنے، کہنے لگا چلو اتنے پیسوں سے کام چل جائے گا۔ میں نے اپنا پچیس فیصد سرمایہ اس کے حوالے کیا اور اس نے اپنی سلیٹ پر دو ہندسے لکھے اور اس میں سے ایک ہندسہ کراس کرنے کو کہا جو میں نے کر دیا، اس نے بتایا کہ میں نتیجے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ سکول پہنچے، اسمبلی ہوئی اور بتایا گیا کہ نتیجے کا اعلان تھوڑی دیر بعد کیا جائے گا پھر معلوم نہیں کیوں اعلان کیا گیا کہ نتائج کا اعلان گیارہ بجے ہو گا۔ تب تک وقت گزارنے کے لیے بازار آ گیا، اقبال مٹھائی ہاؤس سے دو سموسے کھا کر پیٹ کی آگ بجھائی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ سکول پہنچا۔ کچھ دیر بعد نتیجے کا اعلان کیا گیا، 31

مارچ 1965 کو میں ساتویں کلاس میں جا چکا تھا۔نئی کلاس کے لیے ہائی سٹریٹ کی دیوار کے ساتھ نئے تعمیر شدہ کمروں میں سے ایک کمرہ دیا گیا مگر اس بار بھی ٹاٹ ہی بیٹھنے کو ملے۔

گھر والوں نے کامیابی کا تحفہ سائیکل کی صورت میں دیا۔120 روپے کا نیا ایگل سائیکل خریدا گیا مگر مشورہ دیا گیا کہ سائیکل چلانے کا فن کرائے کے سائیکل پر سیکھنا چاہیے۔سائیکل پر کپڑا ڈال کر ایک کمرے میں کھڑا کیا مگر اندر سے کُھد بُد ہوتی رہی کہ سائیکل کو آج ہی سیکھنا چاہیے۔چوری سائیکل نکال کر گاؤں میں سائیکل سکھانے کے لیے شہرت پا جانے والے گرو کے پاس گیا۔مدعا بیان کیا، کہا فکر نہ کرو۔اس نے کسی نہ کسی طرح مجھے سائیکل پر بٹھایا اور تھکا دے دیا، میں نے پیڈل مارنے شروع کیے، خود کو ساتویں آسمان پر محسوس کیا۔سائیکل کو گاؤں کے چوک میں لے آیا کیوں کہ تمام نئے سیکھنے والے چوک میں کنویں کے گرد کھلی جگہ پر چکر لگا کر اپنا ہاتھ پختہ کرتے تھے۔میں نے پہلا چکر کامیابی سے مکمل کیا۔دوسرے چکر میں مسجد کے سامنے سے بائیں طرف گھمایا۔اس کے فوری بعد مزید دائیں طرف گھمانا بھول گیا اور جس طرف میرا رخ تھا اس طرف ایک عدد نلکا اور اس کے آگے اس کے ضائع شدہ پانی کا بہت بڑا پول (ٹویا) تھا، لوگوں نے چیخ چیخ کر موڑ مڑنے کا یا سائیکل کو بریک لگانے کا مشورہ دیا اور بتایا کہ سیدھے "ٹوئے" میں جا رہے ہو۔بریک لگا کر روکنے کا تو استاد نے بتایا ہی نہیں تھا لہٰذا میں پانی میں گرنے کا انتظار کرنے لگا۔اگلے ہی لمحے میں نیچے پانی میں اور سائیکل میرے اوپر آ رہا گویا میں ساتویں آسمان سے زمین پر آ گیا تھا۔لوگوں نے بھاگ کر سائیکل اور مجھے گندے پانی سے نکالا۔مجھے اس نلکے کے پانی میں کپڑوں سمیت نہلایا گیا، میں سائیکل کی حالت جاننے کے لیے بے چین تھا کہ کہیں اسے چوٹ تو نہیں آئی۔بعد میں سائیکل کو پانی سے دھویا۔اسے چند خراشیں آ چکی تھیں۔گھر لا کر کپڑے سے ڈھک دیا۔چوں کہ والد کی نافرمانی کر کے سائیکل کی یہ گت بنی تھی اس لیے اگلے کچھ گھنٹے والد صاحب کی ناراضگی اور ردعمل کے شدید خوف سے گزرے۔انہیں جب علم ہوا تو مجھے بلایا، پیار کیا اور کہا، "تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی۔" بہرحال طے پایا کہ ایک ماہ تک میں تانگے یا بس میں سکول جاؤں گا اور اس دوران میں سائیکل پر ہاتھ پختہ کروں گا۔اس طرح سائیکل چلانے اور ایک ماہ بعد اس پر سکول جانے کا پروانہ عطا کیا گیا۔جب سائیکل پر ہاتھ پختہ ہو گیا تو سائیکل پر سکول جانے کی اجازت ملی۔اب میں ایک آزاد پرندے کی طرح سائیکل پر یہاں وہاں پھرا کرتا البتہ عارف والہ روڈ پر مجھے احتیاط کرنا پڑتی۔سڑک سنگل تھی اور سڑک کے شولڈر مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔جب کوئی بس کسی ٹانگے یا دوسری بس کو اوورٹیک یا کراس کرتی تو مٹی کا طوفان فضا میں پھیل جاتا۔ایک بار تو میں نے پیچھے سے آتی ہوئی بس کے خوف سے سائیکل کو نیچے اتارا تو مٹی میں پھنس کر گر پڑا۔بس میری سائیکل سے صرف چھ انچ کے فاصلے سے گزری مگر میں یہ واقعہ پی گیا کیوں کہ والدین کو بتانے سے کچھ پابندیوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔گاؤں سے سکول پہنچنے میں 35 منٹ لگتے تھے، پہلے بیس منٹ باہر والے اڈے تک اور 15 منٹ سکول تک۔واپسی میں کچھ تاخیر ہو جاتی۔ریلوے سٹیشن

کے قریب گزرنے والی لوئر باری دوآب نہر کا پل پار کرنے کے بعد بائیں کونے میں نہر کنارے ایک مسجد ہے جس کا پانی بہت ٹھنڈا ہوتا تھا اس لیے وہاں سے پانی پینا روایت بن گیا۔ ساہیوال کے ریلوے پلیٹ فارم کو پاکستان کے طویل ترین پلیٹ فارم کا درجہ حاصل تھا۔ اپ اور ڈاؤن گاڑیوں کا دو حصوں پر مشتمل ایک ہی طویل پلیٹ فارم تھا۔ ریلوے پھاٹک سے پہلے ڈاؤن والے پلیٹ فارم کی طرف مڑ جاتے اور لوہے کا جنگلہ عبور کر کے وہاں کے الیکٹرک کولر سے خوب پانی پیتے اور گاڑیوں کا آنا جانا بھی دیکھ لیتے۔ اس وقت تو جانوروں تک کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ چوں کہ اس وقت سواری کے لیے تانگوں کا رواج تھا لہٰذا سٹیشن کے خارجی راستے پر تانگوں کے گھوڑوں کے لیے بھی ایک پختہ آبخانہ بنا ہوا تھا جہاں سے ریلوے سٹیشن جانے آنے والے تانگوں کے علاوہ باہر سے گزرنے والے کوچوان بھی اپنے گھوڑوں کو پانی پلا لیتے تھے۔ ریلوے والا نہر کا پل ایک بڑی جھال کی مانند ہے جہاں گریوٹی فلو کے تحت پانی دس فٹ نیچے گرتا ہے جس کا شور ایک خوفناک منظر پیش کرتا ہے، مجھے ہمیشہ اس منظر سے خوف محسوس ہوتا۔ بہرحال اس آنے جانے میں ساتویں کلاس سے آٹھویں کلاس میں چلا گیا۔ آٹھویں کلاس میں محنت کرنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ سالانہ امتحان میں کچھ زیادہ ہی محنت کر بیٹھا جس کا علم رزلٹ کے اعلان کے بہت دن بعد اس وقت ہوا جب ہمارے گاؤں میں رنگریز فیملی کے استاد میاں محمد اقبال کہیں باہر سے تبدیل ہو کر ہمارے سکول میں آئے تو والد صاحب نے ان سے میرے نمبروں کی تفصیل مانگی۔ انہوں نے پتا کر کے بتایا کہ ریاضی میں سو میں سے سو ہیں، باقی مضامین میں بھی 80 فی صد سے زیادہ ہیں لیکن اسلامیات لازمی میں 31 نمبر ہیں۔ لازمی امتحان میں فیل ہونے کا مطلب مکمل فیل ہونے کے ہوتے تھے۔ مجھے باقی مضامین میں اچھے نمبر لینے کی وجہ سے اسلامیات لازمی میں دو رعایتی نمبر دے کر پاس کر دیا گیا۔ والد صاحب نے اجتماعی طور پر خوشی کا اظہار کیا لیکن اسلامیات لازمی میں دو نمبروں سے فیل ہونے کی اپنے انداز میں خوب خبر بھی لی۔ گورنمنٹ ہائی سکول میں پہلے تین سال کا سنگ میل عبور ہو چکا تھا۔ میرے ماموں نے آٹھویں کلاس میں ہی پڑھائی چھوڑ دی اور اپنے باپ یعنی میرے نانا کی وفات کے بعد گاؤں کے اپنے حصے کی لمبرداری سنبھال لی۔ ان تین برسوں کے استاد اور ان کے نام تک بھول چکا ہوں۔ تین اساتذہ کسی وجہ سے یاد رہ گئے۔ چھٹی کلاس میں انگریزی کے استاد کا چہرہ یاد ہے مگر نام یاد نہیں۔ ساتویں کلاس میں ریاضی کے استاد فاضل صاحب گلّے والی پگڑی باندھتے تھے اور سوال حل کراتے وقت الفاظ کی ادائیگی یا تلفظ کو توڑ کر مزاح پیدا کرتے تھے۔ ساتویں ہی میں ایک استاد تھے حبیب صاحب، انہوں نے ایک بار کلاس میں 1966 یعنی 60 سال قبل ایک پیش گوئی کی تھی جو سو فیصد درست ثابت ہوئی۔ انہوں نے طلبا سے ایک دن پوچھا کہ آپ میں سے کسی نے لاہور دیکھا ہے، بہت سے ہاتھ کھڑے ہوئے، پھر پوچھا کہ لاہور کی دومنزلہ بس پر اشتہار لگے دیکھے ہیں۔ سب نے ہاں میں جواب دیا اور پھر فرمانے لگے۔ "ایک دن ایسا آئے گا کہ لوگ ایسی بنیان نما قمیصیں پہنیں گے جن پر اشتہارات لگے ہوں گے اور اشتہار والے کپڑے پہن کر اس کا معاوضہ وصول

کریں گے''۔آج وہ پیش گوئی ہر لحاظ سے پوری ہو چکی ہے۔قومی کرکٹ ٹیم کے یونیفارم میں اگر کوئی کمپنی محض اپنا لوگو یا نام چھپوائے تو اسے کروڑوں روپے معاوضہ ادا کرنا پڑتا ہے۔آٹھویں میں ہمارے انگریزی کے استاد جناب بشیر اختر تھے، ہوم ورک نہ کرنے پر ان کی سزا لازمی ہوتی۔ڈائریکٹ ان ڈائرکٹ پر انہوں نے بڑا ٹف ٹائم دیا۔ ہر غلطی پر دونوں ہتھیلیوں پر ایک ایک چھڑی کی ضرب اور ہر بار غلطی پر، سردیوں گرمیوں میں یکساں معیار سزا، سردیوں میں تو چھڑی کی ہر ضرب پر خدا یاد آ جاتا تھا۔ ہم طلبا آپس میں یہ گفتگو کرتے نظر آتے کہ کیوں کہ ان کی شادی نہیں ہوئی اور ان کے اپنے بچے نہیں ہیں اس لیے یہ سزا کا ظلم ڈھانے کے عادی ہیں۔ ہم مل کر ان کی شادی کی دعا مانگتے تھے۔ پرائمری پاس کرنا پہلا سنگ میل تھا جب کہ مڈل کرنا دوسرا۔ ان دونوں مرحلوں کو میں بخوبی طے کر آیا تھا، اب میٹرک کے تیسرے مرحلے نے مستقبل کی سمت متعین کرنا تھی۔

گورنمنٹ ہائی سکول میں نویں کلاس کا آغاز ایک نئے انداز میں ہوتا تھا۔ چھٹی تا آٹھویں کلاس تک تو ماسوائے سکول چھوڑ کے جانے والوں کے تمام کلاس فیلو یکساں رہے۔ نویں میں سکول کے اپنے طلبا کے علاوہ خاصی تعداد میں مضافاتی مڈل سکولوں کے کامیاب طلبا کو براہ راست داخلہ دیا جاتا تھا اس لیے نویں کلاس کے سیکشنوں کو کسی فارمولے کے تحت نئی ترتیب دی جاتی۔ اس طرح ہمیں نویں کلاس کا جو سی سیکشن الاٹ ہوا اس میں پرانے صرف پندرہ کلاس فیلو رہ گئے جب کہ باقی تمام دوسرے سیکشنوں سے آئے ہوئے اور نویں میں نئے داخل ہونے والے تھے۔ خاصی حد تک نئے طلبا کے آ جانے سے کلاس کی فضا یک سر بدل گئی۔ نئے طلبا کے ساتھ آشنائی نے وقت لیا لیکن آٹھویں تک کے جو ساتھی تھے ان سے واقفیت اور آشنائی کا دورانیہ تو 1964 یعنی چھٹی کلاس سے تھا۔ اب اساتذہ بھی یکسر نئے تھے اور مضامین بھی کسی حد تک نئے۔ فزکس، کیمسٹری اور ہائی جین، فزیالوجی کی کلاسیں سائنس لیب کے لیکچر تھیٹر میں ہوتیں اور اس کے لیے اصل کلاس روم سے ادھر جانا پڑتا تھا۔ ہمارے کلاس انچارج انگریزی کے رانا محمد الطاف طارق تھے، ان کا مزاج جلالی اور جمالی تھا بل کہ جلالی تناسب زیادہ تھا اور رانا ہونے کی وجہ سے ذات کے گلٹ کا شکار تھے۔ اکثر کہا کرتے۔ ''اچھا تو تم رانا صاحب کو چکر دیتے ہو، رانا صاحب کو کوئی چکر نہیں دے سکتا۔" نویں کلاس کے سیکشن سی کا کمرہ دائیں سمت کے بلاک کی پہلی لائن میں تھا۔ میرا رول نمبر ایک تھا اور (آج کل لاہور میں ایڈووکیٹ) سید فضل محمود کا شاید دو تھا اور ہم فرنٹ لائن میں ایک ہی بنچ پر بیٹھتے تھے۔ ایک دن جمعہ کے روز بزم ادب کے پیریڈ کا آغاز تلاوت قران حکیم کی ایک چھوٹی سورۃ سے ہو رہا تھا، تلاوت کرنے والا درمیان میں بھول گیا۔ خاموشی کی پابندی ہو تو ایسے میں ہنسی بہت آتی ہے۔ ہم دونوں کو ہنسی آئی تو ہم نے منہ نیچے کر کے اپنے اپنے ناک کو بند کر لیا تا کہ ہنسی کی آواز نہ آئے، اس سے اور زیادہ ہنسی کے بل پڑتے۔ آخر اس کیفیت میں ہم پکڑے گئے۔ رانا صاحب نے کہا، "اچھا ہنسی تلاوت کے دوران اور وہ بھی رانا صاحب کے پیریڈ میں۔" کلاس کے سامنے مرغا بننے کا حکم ہوا۔ رانا صاحب نے ڈھیلے ہاتھ سے ایک ایک ضرب ہماری پشتوں پر اس قدر شدید لگائی کہ ہم

تکلیف سے فرش سے آ لگے اور گیلی آنکھوں اور جھکے سروں کے ساتھ واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

فزکس، کیمسٹری اور ہائی جین کے سیکشنز میں غالباً ہر سیکشن کے لڑکے ہوتے تھے۔ یہ مخلوط قسم کے سیکشن تھے۔ یہ تینوں مضامین جناب کرم دین پڑھاتے تھے۔ وہ نرم دم گفتگو تھے مگر میں شاید سائنس کی طرف زیادہ مائل نہیں تھا۔ وہ جب ہڈیوں کے مطالعے کے دوران ان کے نام لیتے تو وہ مجھ سے کبھی یاد نہ ہو پائے۔ فزکس میں نیوٹن کے حرکت کے تین اصولوں میں صرف یہ ایک ہی سمجھ میں آ سکا، "ردعمل عمل کے برابر ہوتا ہے"۔ کیمسٹری لیب میں البتہ بہت لطف آتا مگر تمام عناصر کے نام یاد نہ ہو سکے بل کہ اس کا بھی کوئی جواب نہ مل سکا کی سوڈیم کو NA کیوں لکھتے ہیں۔ ایک بار ہمیں کلورین گیس بنانے کا عمل سکھایا گیا۔ میرے بیکر میں جو گیس تھی میں نے اس کا ڈھکنا ہٹا کر سید فضل محمود کے ناک کے سامنے کھول دیا جس سے گیس اس کے نتھنوں میں چلی گئی اور وہ کم آواز میں چلایا تاہم کوئی مسئلہ نہیں بنا۔ نویں میں ریاضی کے ہمارے استاد جناب خادم حسین تھے۔ ریاضی جیسے مضمون کو وہ اس قدر شگفتہ اور پر اثر انداز سے پڑھاتے کہ کلاس ہی میں یاد ہو جاتا۔ 67-1966 کے دوران پنجاب کے مختلف منتخب شہروں میں عالمی بنک کی مدد سے یورپین طرز کے کمپری ہنسو سکول متعارف کرائے گئے جن کا انفراسٹرکچر شاندار تھا۔ ان میں ایک بوائز سکول ساہیوال کے حصے میں بھی آیا۔ آٹھویں کلاس پاس کرنے والے ہمارے اکثر کلاس فیلوز گورنمنٹ کمپری ہینسو سکول کی نویں کلاس میں چلے گئے۔ اسی طرح کچھ اچھے اساتذہ کے بھی تبادلے اس سکول میں کر دیے گئے۔ ریاضی کے ہمارے یہ استاد بھی وہاں چلے گئے جس کا ہمیں بہت دکھ ہوا اور ہم نے انہیں بہت یاد کیا۔ دسویں کلاس کے سیکشن سی کو سائنس لیب اور اس کے لیکچر تھیٹر کے ساتھ والا کمرہ ملا۔ کلاس انچارج اور انگریزی کے استاد جناب رانا الطاف طارق ہی تھے۔ ریاضی کے لیے حافظ سرور صاحب جیسا بہترین استاد ملا۔ اردو چودھری عابد حسین منور صاحب نے پڑھائی۔ معاشرتی علوم سید باقر حسین جعفری صاحب جیسے دھیمے اور نرم لہجے کے استاد کے حصے میں آئی۔ آٹھویں کلاس کے دوران کالج کے استاد اور ٹیوشنر نذیر احمد قریشی سے کوچنگ لی تھی۔ ان کی خواہش کے پیش نظر انہیں نقد کی بجائے گندم کی صورت میں ادائیگی کی جاتی۔ وہ مجھے کہا کرتے کہ کسی کو بتانا نہیں کہ میں تم سے کم پیسے لیتا ہوں۔ ممکن ہے وہ ہر ایک سے یہی بات کرتے ہوں۔ اس کوچنگ سے نمبر بہت اچھے آئے تھے لیکن میٹرک کے دوران بے سمتی کا شکار ہو گیا۔ میٹرک میں اچھے نمبر لینے کے لیے امتحانی نقطۂ نظر سے ایک اچھی کوچنگ کی ضرورت تھی مگر اس ضمن میں کسی قسم کی رہنمائی میسر نہیں تھی۔ دسہرہ گراؤنڈ کی آبادی میں میرے گاؤں کے ننھیال کا گھر تھا۔ اوپر کی منزل میں فیملی رہتی تھی جب کہ نیچے کے دو کمرے خالی تھے۔ امتحان کے دنوں میں گاؤں سے آنے جانے کی کوفت اور وقت کے ضیاع سے بچنے کے لیے میں ان میں سے ایک کمرے میں شفٹ ہو گیا۔ کلاس کی پڑھائی کو بنیاد بنا کر از خود ہی تیاری کی۔ سائنس کے مضامین کی تیاری کمزور رہی کیوں کہ بہت سارے تصورات واضح نہیں تھے جس کے لیے کوچنگ ضروری تھی مگر ادھر مائل نہ ہو سکا جس سے

صرف ابتدائی درجے کی فرسٹ ڈویژن ہی لے پایا۔سکول کی بریک کے دوران سکول کے گیٹ پر ریہڑیوں او رخوانچے والوں کا رش لگ جاتا مگر چھولے (چنے) والا چاچا نہیں بھلایا جا سکتا جو ایک پلیٹ میں چنے اور ڈبل روٹی کے دو حصے کر کے دیتا۔اس کی وجہ سے بریک کا بے چینی سے انتظار کیا جاتا۔میرے خیال میں چنوں والے چاچا کا کردار ہر سکول کے مین گیٹ کے باہر پایا جاتا تھا کیونکہ کئی لوگوں نے اس کردار کا ذکر کیا ہے۔
سردیوں میں تفریح کا وقفہ 40 منٹس کا ہوتا اس لیے اردو بازار کے آغاز میں واقع خان سویٹس یا دوسری طرف اقبال سویٹس سے کچھ کھا کر وقت پر واپس آ جاتا۔پی ٹی آئی شیخ احمد علی حسن نظم وضبط کے انچارج تھے۔ہر سیکشن کے لیے لکڑی کا ایک گول پاس ہوتا تھا جس پر کلاس اور سیکشن لکھا ہوتا۔پانی پینے یا ٹائلٹ جانے کے لیے یہ گویا اجازت نامہ تھا۔جس کے پاس نہ ہوتا اسے کلاس سے باہر آوارہ تصور کیا جاتا جس پر پی ٹی آئی یا راؤنڈ پر موجود ہیڈ ماسٹر خود سزا دیتے۔جو طلبا اسمبلی شروع ہونے کے بعد پہنچتے وہ لیٹ شمار ہوتے تو ان کی علیحدہ قطار بنتی اور ہیڈ ماسٹر صاحب خود تاخیر سے آنے والوں کی ہتھیلیوں پر وہ ڈنڈا رسید کرتے جو آفس کے علاوہ ہر وقت ان کے پاس ہوتا۔جس دن بزم ادب کا پیریڈ ہوتا اس دن پیریڈز کی طوالت کم کر دی جاتی یا جس مناسبت سے تقریری مقابلہ ہوتا اس سے باقی پیریڈز کا وقت کم کر دیا جاتا۔ان مواقع پر مختصر پیریڈز بہت اچھے لگتے۔خصوصاً سکول کے طلبا کو چھٹیاں بہت عزیز ہوتی ہیں ان سے یکسانیت ختم ہو جاتی ہے۔ایک رجسٹر سیاہ رنگ کا تھا جس میں صرف چھٹی کا نوٹس ہوتا جسے ہر کلاس میں لے جایا جاتا اور اس وقت کلاس میں موجود استاد چھٹی کا نوٹس پڑھ کر سناتا۔اس رجسٹر کی کلاس میں آمد گویا چھٹی کی نوید ہوتی اس لیے طلبا نے اس سیاہ جلد والے رجسٹر کا نام "کالا کر مانوالہ" رکھ دیا تھا۔ان دنوں بٹالہ مسلم ہائی سکول، اسلامیہ ہائی سکول، ننگل امبیہ ہائی سکول اور محمودیہ ہائی سکول کے ناموں سے نجی تعلیمی ادارے بھی موجود تھے مگر بٹالہ مسلم ہائی سکول وہ واحد نجی تعلیمی ادارہ تھا جو نتائج اور کھیلوں کے لیے ہمارے سکول کی ہمسری کرتا تھا۔دونوں سکولوں کا اکثر کھیلوں کے سالانہ مقابلوں کے فائنل میں آمنا سامنا ہوتا اور عموماً فائنل ہمارے سکول کے سامنے والے گراؤنڈ میں کھیلا جاتا۔اس دوران دونوں سکولوں کے طلبا کا جوش وخروش اپنے عروج پر ہوتا۔جیتنے والا سکول اکثر اس جیت کی خوشی میں چھٹی کا اعلان کرتا۔سکول کے سامنے اور ہوسٹل والے دونوں گراؤنڈ میں تمام کلاسز کو پی ٹی بھی سکھائی جاتی تھی اس کے لیے خاص یونیفارم پہننا پڑتی۔ساہیوال کے سٹیڈیم میں چند مواقع پر ہم طلبا نے پی ٹی کا مظاہرہ کیا۔اس ضمن میں پی ٹی آئی شیخ احمد علی حسن بہت محنت کرتے اور پی ٹی سکھانے کے عمل کے دوران ڈنڈے کا استعمال بھی خوب کرتے۔میں نے میٹرک کا سالانہ امتحان اپنے سکول کے سنٹر ہی میں دیا۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہمارا میٹرک کا پہلا مکمل امتحان تھا جو ملتان تعلیمی بورڈ نے لیا تھا۔اگر میں ان گذشتہ پانچ برسوں کا جائزہ لوں تو وہ یہ ہے کہ مجھ دیہات کے سکول میں پڑھنے والے کے لیے شہر کے سکول میں پڑھنا ایک اہم تجربہ تھا مگر مزاجاً میں ایک کم آمیز اور صلح جو قسم کا طالب علم تھا جس کے باعث کئی طلبا میرے پنجاب کے مقامی لہجے والی پنجابی کا مذاق

بھی اڑاتے اور پریشان بھی کرتے۔ادبی سرگرمیوں،تقریری مقابلوں یا سپورٹس میں حصہ لینے کی طرف میں کبھی مائل نہ ہوسکا۔جلد ہی میں شہری لہجے میں پنجابی بولنا سیکھ گیا تو زبان کے لہجے کے حوالے سے مذاق ختم ہو گیا۔سکول جانا آنا ہی لگا رہتا۔آٹھویں کلاس میں کوچنگ لینے سے نمبر بہت اچھے آئے تو خوداعتمادی میں اضافہ ہوامگر مستقبل کے تعین کے لیے میٹرک میں زیادہ محنت اور کاوش کی ضرورت تھی مگر کسی قسم کی کوئی رہنمائی یا تحریک میسر نہیں تھی۔میں خود بھی اس ضمن میں فعال نہیں رہا تھا۔والدین سکول روزانہ جانے آنے کو ہی کافی سمجھتے رہے۔سائنسی مضامین کے بہت سے تصورات میں ابہام کا شکار تھا جو دور نہ کیا جا سکا۔گاؤں کے جو صاحب کالج میں پڑھتے تھے ان سے رہنمائی لینا بعید از قیاس تھا۔ان حالات میں فرسٹ ڈویژن ہی کو غنیمت تصور کیا۔ایک اور صاحب تھے جنہوں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا اور تھرڈ ڈویژن سے چند نمبر اوپر ابتدائی نوعیت کی سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو سکے۔انہوں نے اپنی طرف سے ایک فارمولہ بنایا اور کہا کہ میں نے سیکنڈ ڈویژن لی ہے اور انہوں نے فرسٹ ڈویژن میں صرف ساٹھ نمبر اوپر لیے ہیں تو انہوں نے اتنی محنت کے باوجود مجھ سے صرف ساٹھ نمبر ہی زیادہ لیے نا!!!

گورنمنٹ ہائی سکول شہر کی ایک کلیدی جگہ پر واقع تھا۔کالج کے اکثر طلبا چھٹی کے وقت اسی گزرگاہ سے گھروں کو لوٹ رہے ہوتے جہاں ہمارا سکول واقع تھا۔سکول کے متعین اوقات کے برعکس کالج کے بارے میں بتایا جاتا کہ جب طلبا کے مضامین کی مناسبت سے مقررہ پیریڈ ختم ہو جائیں تو طالب علم کو چھٹی ہو جاتی ہے۔ڈگری میں مضامین کم ہونے سے وہ تین یا چار پیریڈز کے بعد ہی فارغ ہو جاتے ہیں۔ہماری تفریح ہوتی اور کالج کے طلبا سفید قمیضوں اور خاکی پینٹوں میں ملبوس وہاں سے گزرتے بہت بھلے لگتے۔میں سوچا کرتا کہ ایک دن میں بھی سکول سے نکل کر ایسی ہی یونیفارم پہن کر کالج جایا آیا کروں گا۔

میٹرک میں کامیابی سے ایک اور سنگ میل طے کر لیا تھا۔والد صاحب نے نئے سہراب سائیکل کا تحفہ دیا جس کے چین پر بھی پورا کور تھا۔اب کالج میں داخلہ لینا تھا۔میں نے پری میڈیکل میں داخلے کے لیے داخلہ فارم جمع کرایا مگر پہلی فہرست میں نام نہ آ سکا۔گاؤں میں شریکا بہت ہوتا ہے۔ہمارے گاؤں کے ایک صاحب امیر محمد خان جنہوں نے بعد میں گاؤں کے پہلے وکیل بننے کا اعزاز حاصل کیا،سال چہارم کے طالب علم تھے۔انہوں نے اپنا داؤ لگایا اور میرے والد کو قائل کیا کہ پری میڈیکل میں داخلے کو بھول جائیں اور اس سے پہلے کہ داخلہ ختم ہو جائے آرٹس میں داخل کرا دیں۔انہیں ڈر تھا کہ چار دن بعد دوسری لسٹ میں نام آنے کے قوی امکانات تھے اور کہیں میں واقعی پری میڈیکل میں داخل نہ ہو جاؤں۔انہوں نے عام سے مضامین رکھوا دیے اور اسی دن فیسیں ادا کروا دیں حتیٰ کہ ان کی ہدایت کی روشنی میں کتابیں بھی خرید لی گئیں حالانکہ کلاسز کے آغاز میں ابھی دیر تھی۔بہرحال 1969 میں گورنمنٹ کالج ساہیوال میں سال اول آرٹس میں داخل ہو چکا تھا۔امیر محمد نے متعصّبانہ رہنمائی سے پراسپیکٹس میں موجود فارمولے کے تحت لازمی مضامین (اس وقت

اسلامیات اور مطالعہ پاکستان لازمی مضامین نہیں تھے) کے علاوہ بتائے گئے مضامین کے گروپوں سے مطلوبہ تین اختیاری مضامین کا انتخاب کرالیا۔ معاشیات، سوکس اور فارسی۔ کالج میں پہلے دن فرسٹ ایئر فول بننے کا موقع میں نے خود فراہم کیا۔ داخل تو سائیکل سٹینڈ کے گیٹ سے ہونا تھا مگر اس سے پہلے کالج چوک والا گیٹ بھی کھلا تھا لہٰذا میں بڑی خوداعتمادی سے اس گیٹ سے داخل ہو گیا گویا خود کو سائیکل سمیت سال اول کو بے قوف بنانے والوں کے منہ میں دھکیل دیا۔ مجھ سے ایک دوسوال پوچھے گئے جن کا میں نے بڑی تابعداری سے دیا۔ انہوں نے مجھے واپس بھیج دیا کہ سائیکل سٹینڈ والے گیٹ سے آؤ، سو میں نے تعمیل کی۔ اب میں نے کالج یونیفارم میں کالج آنا شروع کر دیا جس سے ایک پرانا خواب شرمندہ تعبیر ہو چکا تھا۔ سکول کی نسبت یہاں کا ماحول اور طریقہ تدریس یک سر مختلف تھا۔ ہر مضمون کے پیریڈ میں حاضری لگائی جاتی۔ پیریڈ اٹینڈ نہ کرتے تو کوئی استاد پوچھتا تھا نہ کوئی سزا ملتی تھی۔ میں سال اول کے پروموشن ٹیسٹ تک صرف نصابی کلاسز تک محدود رہا۔ کچھ سمجھ آئی، زیادہ تر باتیں سر سے گزر جاتیں۔ محض حاضریاں پوری کرنے پر زور رہا۔ میرے سیکشن کی سوکس اور معاشیات کی کلاسز میں سوال و جواب کی سہولت میسر نہیں تھی۔ معاشیات کے استاد جناب عبدالرشید تھے جو اپنا بزنس بھی کرتے تھے۔ سلیم انجم چاولہ نے بتایا کہ ان کے پاس کوکا کولا کی ایجنسی ہے۔ معاشیات میں طلب اور رسد کی بنیاد پر قیمت کا تعین اور شربت کے پہلے اور دوسرے گلاس سے پیاس کی تسکین میں فرق کے ذریعے قانون تقلیل افادہ مختتم ہی سمجھ آسکے باقی سب رٹا، سوکس میں ریاست کے عناصر تک سمجھ محدود رہی، باقی رٹا۔ سوکس کے استاد کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ یہ دونوں استاد آتے، حاضری لگاتے اور سٹوڈنٹس سے ابلاغ پیدا کیے بغیر یک طرفہ لیکچر دے کر چل دیتے۔ فارسی کے استاد جناب محمد طفیل سراپا اخلاق اور عاجزی تھے۔ اردو اور انگریزی کے استاد بھی طلبا سے باقاعدہ ربط پیدا کر کے پڑھاتے۔ اردو کے استاد جناب رئیس احمد عباسی تھے۔ وہ بہت شائستہ اردو بولتے تھے۔ ان کی تدریس کے انداز سے نا صرف ہماری اردو بہتر ہوئی بل کہ اردو ادب کا چسکا بھی لگ گیا۔ انگریزی کے جناب شاہد حمید کالج کی ٹرانسلیشن سوسائٹی کے انچارج تھے اور بعد میں وہ ادبی اور علمی حلقوں میں بہترین ترجمہ نگار کے طور پر سامنے آئے۔ روسی ناول نگار لیوٹالسٹائی کے انگریزی میں ترجمہ شدہ ضخیم ناول وار اینڈ پیس کا ترجمہ جنگ اور امن کے نام پر کیا جو بہت مقبول ہوا۔ انہوں نے انگریزی شاعری اور نثر اس مؤثر انداز سے پڑھائی جس سے انگریزی زبان و ادب سے آشنا ہوئے۔ (ان کی آپ بیتی ''گئے دنوں کی مسافت'' 2016 میں ان کی وفات سے دو سال پہلے شائع ہوئی جس میں ساہیوال اور کالج کا بہت ذکر ملتا ہے۔)۔ ان سے پڑھنا بہت بڑا اعزاز تھا۔ خالی پیریڈ میں زیادہ تر اخبار سٹینڈز پر اخبارات کا مطالعہ کر لیتا یا پھر شعبہ جغرافیہ سے ملحق ریڈنگ روم میں کسی رسالے کی ورق گردانی میں گزر جاتا۔ سال اول کا پروموشن ٹیسٹ پاس کر لیا۔ اس ٹیسٹ میں ایسا کامیاب رٹا لگایا کہ اکنامکس میں 80 سے زیادہ نمبر آئے۔ شہریت سے البتہ میں موافقت پیدا نا کر سکا۔ سال دوم بھی تقریباً اسی انداز سے گزر گیا۔ گاؤں سے کالج، کالج سے واپس

گاؤں آنا جانا لگا رہا۔اس وقت میرا سب سے بڑا مسئلہ انٹر میں کامیاب ہونا تھا۔ مجھے اس بات کا پوری طرح ادراک تھا کہ اگر کسی مضمون میں کمپارٹمنٹ آ گئی تو آگے کا راستہ رک جائے گا کیوں کہ ایک تو سلسلہ ٹوٹ جائے گا اور دوسرا یہ کہ گاؤں کے معاشرتی ماحول میں حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے ایسے نوجوان کو طنز اور تشنیع سے اس قدر زچ کیا جاتا تھا کہ اس کی خود اعتمادی ہی ختم نہ ہوتی بل کہ اس کا حوصلہ بھی ٹوٹ جاتا۔ یہ بہت بڑا دباؤ اور سٹریس تھا جس کے دوران انٹر کے امتحان کی تیاری کی جاتی رہی۔ 1971 کے اپریل اور مئی کا نصف اول امتحان میں کٹ گئے۔16 جون 1971 کو میرا آخری پرچہ شہریت دوم کا تھا۔اگر اس دن میں ہمت نہ کرتا تو پرچہ نکل جاتا۔ میں نے صبح اٹھ کر ممکنہ سوالات کے جوابات پر سرسری نظر ڈالی۔آسمان پر بہت گھرے بادل چھائے ہوئے تھے۔میں جب گاؤں سے سڑک تک پہنچا تو شدید بارش شروع ہوگئی۔گاؤں کے اڈے پر ایک چھوٹی سی مسجد میں پناہ لی۔ پرچہ آٹھ بجے شروع ہونا تھا۔میں نے سائیکل کی بجائے بس پر سوار ہونے کا فیصلہ کیا، برستی بارش میں تاخیر سے بس آئی تو بائیں طرف کی تمام سواریاں بارش کے پانی کی وجہ سے درمیان میں کھڑی تھیں۔ مجھے جہاں کھڑا ہونے کی جگہ ملی وہاں اوپر کے سوراخ سے پانی کی دھار گر رہی تھی ادھر ادھر سرکنے کی جگہ نہیں تھی۔شہر میں بس سے اتر کر تانگے پر بھیگتا بھاگتا کالج سنٹر پہنچا تو ابھی بارش جاری تھی تاہم اس کی شدت کم ہو چکی تھی۔سنٹر کے باہر سے مکمل خاموشی نظر آئی۔میں گھبرا گیا کہ پرچہ کب کا شروع ہو چکا ہوگا مگر معلوم یہ ہوا کہ شدید بارش کی وجہ سے ابھی امتحانی عملہ اور امیدوار ہی نہیں پہنچے تو میری سانس میں سانس آئی۔ میرے پہنچنے کے پون گھنٹہ بعد پرچہ شروع ہو سکا۔اگست کے اواخر میں نتائج کا اعلان ہوا۔اللہ نے کرم کیا اور میں بہتر نمبروں سے کامیاب ہو گیا تھا۔امتحان کے نتائج کے بعد میں ایک مختلف انسان تھا جس کے لیے آگے بڑھنے کے دروازے وا ہو چکے تھے۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال جیسے کرشماتی ادارے نے مجھے نئے جذبے اور آگے بڑھنے کے جنون اور مواقع سے آشنا کیا۔سال سوم میں داخلے کے بعد میں ایک پر اعتماد طالب علم تھا جس نے اپنے مستقبل کے اہداف کا بھی تعین کر لیا تھا یعنی مجھے کالج کا استاد بننا تھا!! گورنمنٹ کالج ساہیوال میں ایک غیر تحریری تعلیمی کیلنڈر نافذ تھا جس کا ذکر پراسپیکٹس یا کسی دیگر دستاویز میں نہیں ملتا تھا مگر اس تعلیمی کیلنڈر کی روایت ماضی سے چلی آ رہی تھی۔تمام تعلیمی، نصابی اور ہم نصابی سرگرمیاں اپنے وقت پر وقوع پذیر ہو جاتیں۔ تدریسی کام، سالانہ پروموشن ٹیسٹ کا انعقاد اور اس کے نتائج کا اعلان، سالانہ کھیلیں، سٹوڈنٹس یونین کے انتخابات، بین الکلیاتی تقریبات، ٹیوٹوریل پیریڈ، کانووکیشن، پروموشن ٹیسٹ میں اجتماعی اور مضمون وار پوزیشنز کے تعلیمی انعامات کی تقریب، کالج میگزین "ساہیوال" کی باقاعدہ اشاعت اور کالج کے اپنے پروجیکٹر کے ذریعے بڑی سکرین پر ہفتہ وار انگریزی اور ایک دو ماہ بعد اردو فلم اس تعلیمی کیلنڈر کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ یہ تمام روایات اور ان پر عمل درآمد کالج کا پختہ کلچر بن چکا تھا۔بی۔اے میں متعدد اساتذہ سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔انگریزی آرٹس میں تین پرچے ہوتے تھے۔ جناب شاہد حمید، جناب اقبال پارس، جناب

بشیر احمد گل، جناب مختار احمد، جناب انوار الحق، جناب دلدار پرویز بھٹی اور جناب علی اظہر نقوی نے دو سال کے مختلف اوقات میں انگریزی کا مضمون پڑھایا۔ جناب مختار احمد حاضری لگانے کے بعد ایک ایسی شاعرانہ تخلیاتی فضا میں اس طرح لے جاتے ایسے لگتا تھا جیسے زمین سے تمام کلاس کا رابطہ ٹوٹ جاتا، پیریڈ بجنے پر استاد اور شاگرد واپس آ جاتے۔ جناب علی اظہر نقوی اپنی بلند آہنگی سے کیٹس، شیلے اور ورڈز ورتھ کی دنیا میں لے جاتے۔ ان تمام اساتذہ نے ہمیں صرف نصاب ہی نہیں پڑھایا بل کہ انگریزی کے مختلف ناولز، ڈراموں اور شاعروں کا عمومی مطالعہ کرنے کی بھی ترغیب دی۔ اکنامکس کے استاد جناب محمد اسلم نے ہم پر اکنامکس کے تصورات واضح کیے تو معلوم ہوا کہ یہ کس قدر طاقتور مضمون ہے۔ (انہوں نے بعد میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر لی اور گورنمنٹ کالج لاہور میں صدر شعبہ معاشیات اور پروفیسر کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ ابھی لاہور سکول آف اکنامکس لاہور میں پڑھا رہے تھے کہ 2018 میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی آپ بیتی ''کڑی دھوپ کا سفر'' ان کے بیٹے نے بعد میں شائع کی۔) عربی آپشنل کے استاد جناب عبدالرشید فاروقی نے مختصر نصاب کے ساتھ ساتھ عربی گرامر کی مبادیات سے بھی آگاہ کیا۔ فارسی کے استاد جناب سید اکبر علی شاہ نے نا صرف نصاب پڑھایا بل کہ زندگی کا قرینہ بھی سکھایا۔ عملی زندگی کے حقائق کو سمجھنے کا ادراک پیدا کیا۔ ان اساتذہ کے علاوہ کالج میں موجود کسی بھی استاد سے سماجی علوم کے بنیادی نظریات اور مفید علمی و ادبی کتب ورسائل کے ضمن میں رہنمائی لینا معمول کی بات تھی بل کہ بعض استاد تو اس قدر شفقت کا مظاہرہ کرتے کہ کالج لائبریری سے اپنے نام پر کتابیں جاری کروا کر مطالعے کے لیے دے دیتے یا روز گارڈن میں واقع کینٹین پر اگر ملاقات ہو جاتی تو چائے بھی پلاتے اور اگر کوئی تعلیمی مسئلے پر رہنمائی درکار ہوتی تو وہ بھی فراہم کرتے۔ اساتذہ کے انتہائی دوستانہ رویوں کی وجہ سے میں نے نصابی اور غیر نصابی سطح کا جو معاون مطالعہ کیا وہ زندگی کے نصب العین کے حصول میں بہت کام آیا اور استاد بننے کے بعد بھی۔ میں اپنے تجربے کی روشنی میں یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوں کہ گورنمنٹ کالج ساہیوال تعلیم و تربیت کا بہترین مرکز تھا۔

پروفیسر آغا امجد علی نے 1970 کے دوران پرنسپل کے طور پر چارج سنبھالا تو انہوں نے ہم نصابی یا ایکسٹرا کریکولر سرگرمیوں کو ایسی مہمیز لگائی جس سے کالج تدریسی اوقات کے بعد علمی ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا جو مغرب تک جاری رہتیں۔ ہر مضمون کی سوسائٹی کے ساتھ ساتھ جنرل سوسائٹیز بھی بنائی گئیں۔ کچھ سوسائٹیز کی جڑیں تو ماضی میں پیوست تھیں مثلاً ترجمہ سوسائٹی اور فوٹوگرافی کلب۔ مضامین کے علاوہ جنرل سوسائٹیز میں حلقہ علم وفن (Arts and study Circle) مجلس حالات حاضرہ (Current Affairs Society) پنجابی ادبی سنگت نمایاں تھیں۔ ہر سوسائٹی کا ایک یا دو استاد انچارج ہوتے۔ ہر سوسائٹی کے سٹوڈنٹ عہدیدار ہوتے اور اساتذہ کے ذریعے سیلیکشن کے بعد تمام متحرک سوسائٹیز کی افتتاحی تقریباتِ حلف برداری ہوتیں اور اس کے بعد اپنے اہداف کے مطابق ایک یا دو ہفتے یا ماہانہ خصوصی اجلاس منعقد

ہوتے۔تمام طلبا کسی بھی سوسائٹی کے اجلاس میں شریک ہو سکتے تھے کوئی پابندی یا شرط نہیں تھی۔ان اجلاسوں یا نشستوں میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لیے پرنسپل صاحب نے ایک مؤثر نظام یا میکینزم وضع کر رکھا تھا۔کسی بھی سوسائٹی کے اجلاس کی صورت میں کالج آفس سے ایک چھپا ہوا کوپن ملتا تھا جس کی خانہ پری کر کے انچارج استاد اس پر توثیقی دستخط ثبت کرتے اور پرنسپل اس پر حاضرین کی متوقع تعداد کے مطابق بیس، پچیس یا تیس روپے لکھ کر دستخط کر دیتے۔اس کے بعد ایک نوٹس پر اجلاس کا مجوزہ پروگرام، تاریخ اور وقت لکھ کر سٹینڈنگ یا کرش ہال میں موجود نوٹس بورڈ پر لگا دیا جاتا۔دلچسپ بات یہ تھی کہ نوٹس کے آخر میں نمایاں طور پر یہ جملہ ضرور لکھا جاتا۔''اجلاس کے آخر میں چائے کا خصوصی انتظام کیا گیا ہے۔''اجلاس کا انداز یہ ہوتا تھا کہ متعلقہ انچارج اور دیگر شریک اساتذہ کی موجودگی میں اگر کسی موضوع پر طلبا حصہ لیتے یا کسی تنقیدی اجلاس میں تمام شرکا بحث میں حصہ لیتے تو اجلاس کے اختتام کے بعد ٹیبل ٹاک کے ذریعے اساتذہ متعلقہ موضوع پر کی گئی گفتگو کی روشنی میں مزید رہنمائی فراہم کرتے۔اس کے ساتھ چائے اور لوازمات کا دور بھی چلتا رہتا۔چائے کے ایک کپ کے ساتھ ایک کیک پیس اور ایک سموسے کی کل قیمت 75 پیسے بنتی۔اس طرح بیس روپے میں پچیس سے کچھ زائد شرکا مستفید ہو جاتے۔معاوضے کے طور پر ''کوپن'' کینٹین پر جمع کرا دیا جاتا جس میں مذکورہ رقم کینٹین کے مالک کو کالج ادا کر دیتا۔میں نے تدریسی وقت کے بعد ان سہ پہر کے بعد ہونے والی سرگرمیوں سے بھرپور استفادہ کیا۔تین یا چار سوسائٹیز کا میں عہدیدار تھا یا پھر کسی گفتگو میں حصہ لے لیتا یا سن لیتا۔ان سرگرمیوں نے میرے ذہنی افق کو ہی وسیع نہیں کیا بل کہ روسٹرم کی جانب سے کھڑے ہو کر مدلل بات کرنے کی تربیت بھی دی۔کتاب اور مطالعے کا ذوق پیدا کیا، کتاب میرا بہترین ساتھی بن گئی۔بات کو علمی رویے کے ساتھ آگے بڑھانے کا سلیقہ اور دوسروں کی رائے کا احترام سکھایا۔کالج کی لائبریری جسے پبلک لائبریری کا درجہ حاصل تھا، عشا کی اذان کے بعد بند ہوتی اور وہاں اپنی کتب اور لائبریری کتب کے مطالعے کی سہولت دستیاب تھی۔کالج میں سٹینڈز پر رکھے متعدد اخبارات کے مطالعے سے مستفید ہوتے۔کالج کا ریڈنگ روم جو تدریسی اوقات تک کھلا رہتا، وہاں پر مطالعے کے بہترین ماحول میں موجود متعدد رسائل و جرائد طلبا کے مطالعے کے منتظر ہوتے۔ادبی رسائل میں فنون، اوراق، سیپ، افکار اور نقوش اور بین الاقوامی جرائد میں نیوز ویک، ٹائمز اور ریڈرز ڈائجسٹ اور دیگر متعدد میگزین خالی پیریڈ میں وہیں پڑھنے کو ملتے۔کالج میں ایک اور بہت خوبصورت روایت موجود تھی۔ماضی سے موجود اس روایت میں مختلف گروپ فوٹو کالج ہال، انتظامی بلاک اور سٹاف روم جو پرنسپل آفس کے اوپر واقع تھا، کے باہر کی دیواروں پر آویزاں تھے جنہیں طلبا شوق سے دیکھتے اور پرانے نامور طلبا کو دیکھ کر تحریک حاصل کرتے۔جس دور کی میں بات کر رہا ہوں ان دنوں کالج میں داخلے کے لیے فیڈنگ ایریا بہت زیادہ تھا۔ریگولر فیڈنگ ایریا کمالیہ، میاں چنوں، خانیوال، وہاڑی، بوریوالہ، عارف والا، پاکپتن، دیپالپور، گوگیرہ اور اوکاڑے تک پھیلا ہوا تھا۔بہاولنگر، فیصل آباد اور دیگر شہروں کے لیے بھی یہ

کالج قابل ترجیح تھا۔ یہاں کی ہوسٹل ''جناح ہال'' شاندار رہائشی سہولتوں اور بہترین روایات کی امین تھی۔ میں نے جنوری 1972 کے دوران یہاں داخلہ لیا تاکہ مستقبل میں ہوسٹلوں میں رہنے کی تربیت حاصل کی جا سکے۔ اس وقت سیاسیات کے استاد احمد شفیع چودھری جناح ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے جو سوکس کے موضوع پر اپنی ٹیکسٹ بکس کے لیے بھی بہت معروف تھے۔ ہوسٹل دراصل ایک ایسی معاشرتی اکائی ہوتی ہے جہاں طلبا معروضی سطح پر زندگی گزارنا سیکھتے ہیں۔ ایمرجنسی طبی سہولت، ہوسٹل کا میس اور اس کا معیاری کھانا، کمروں میں مطالعے کے اوقات، الگ دارلمطالعہ، سالانہ کھانے کی تفریح سے بھرپور تقریب، ہوسٹل میں آنے اور جانے کے مقررہ اوقات، معاشرتی آداب اور وہاں کی سہولتوں سے استفادے کے اصول وضوابط کی پابندی کے لحاظ سے یہ ایک بہترین رہائش گاہ تھی۔ ہوسٹل میں رہائش پذیر طلبا کو شام کے اوقات میں کالج لائبریری میں مطالعے کی سہولت بھی مہیا تھی۔ موسم گرما کی تعطیلات عموماً جولائی کے پہلے ہفتے میں ہوتی تھیں مگر 1972 کے سال اچانک جون کے پہلے ہفتے میں کر دی گئیں لہٰذا چند گھنٹوں کے مختصر وقت میں جناح ہال کے سالانہ ڈنر کی تقریب منعقد کرنا پڑی۔ انگریزی کے استاد جناب دلدار پرویز بھٹی نے اپنے منفرد انداز میں کھانے کے بعد منعقد ہونے والے تفریحی پروگرام کو چار چاند لگا دیئے۔ ہوسٹل میں داخلے کا میرا بنیادی مقصد پورا ہو چکا تھا اس لیے میں نے ہوسٹل میں رہائش ترک کر دی۔ ہوسٹل سیکیورٹی واپس لی تو ہوسٹل کے دارالمطالعہ کے ادبی جریدے فنون کا ایک شمارہ میرے ذمہ تھا جسے واپس کرنے کی بجائے میں نے اس کی قیمت اور جرمانہ منہا کرانے کو ترجیح دی۔ ایک اور روشن روایت تھی جسے میں نے کبھی کسی اور کالج میں نہیں دیکھا۔ اب تو سال اول اور سال دوم کے لیے بورڈ ہی امتحان لیتا ہے۔ ہمارے وقتوں میں سال اول اور سال سوم کے پروموشن ٹیسٹ کالج لیا کرتا تھا۔ یہاں روایت یہ تھی کہ اس امتحان میں مختلف کیٹیگریز میں تین تین اجتماعی پوزیشنز کا اعلان ہوتا تھا۔ تمام مضامین میں پہلی اور دوسری پوزیشن کا بھی اعلان ہوتا بشرطیکہ پوزیشن لینے والا کسی مضمون میں فیل نہ ہو۔ ان تعلیمی انعامات کی تقسیم کے لیے ایک بڑی تقریب کا انعقاد کیا جاتا اور انعامات صرف کتابوں پر مشتمل ہوتے۔ اب جب کہ میری ذاتی لائبریری میں متعدد کتب ہیں اور بہت سے رسائل کی مکمل یا نامکمل جلدیں موجود ہیں، ڈیجیٹل لائبریری اس کے علاوہ ہے مگر 1972 کی انعامی تقریب میں ملنے والی کتاب اور انعام وصول کرنے کی تصویر آج ترپن سال کے بعد بھی میرے پاس محفوظ ہیں بلکہ اس بوسیدہ ہوتی تصویر کو مصنوعی ذہانت کے ذریعے ایسی تصویر بنا دیا جیسے وہ آج کھینچی گئی ہو مگر اسے بلیک اینڈ وائیٹ ہی رہنے دیا۔

گورنمنٹ کالج ساہیوال کا کیمپس اپنی وسعت، حسن ترتیب اور خوبصورتی کے لحاظ سے لازوال کشش کا حامل ہے۔ اس کے اکیڈیمک بلاک کی چمکتی اور سورج کی کرنوں کی طرح glow کرتی اکیڈیمک بلڈنگ کی خوبصورتی اور رعب ایسا ہے جو ہر دیکھنے والے پر متاثر کن اثرات مرتب کرتا ہے۔ اکیڈیمک بلاک کے سامنے کا سبزہ زار ایک جادوئی اثر رکھتا ہے۔ اس کے روز گارڈن میں گلاب کی بہت سی

اقسام خوشبو بکھیرتی ہیں۔ ہمارے دور میں روز گارڈن اور اس میں واقع کینٹین سہ پہر سے شام تک ادبی و علمی سرگرمیوں کا مرکز تھے۔ اس سے ملحقہ لائبریری کو پبلک لائبریری کا درجہ حاصل تھا جو صبح آٹھ سے شام آٹھ بجے تک کھلی رہتی۔ شعبہ جغرافیہ کے ساتھ ایک منی ہال تھا جسے ریڈنگ روم کا نام دیا گیا۔ تمام فرش پر جیوٹ کا کارپٹ بچھا تھا اور چاروں طرف دیوار کے ساتھ بہترین ڈیزائن کیے ہوئے ریڈنگ ٹیبل یا ریکس رکھے ہوئے تھے۔ ہر ریک کے ساتھ ایک کرسی رکھی ہوتی۔ ان ریکس کو اس طرح سے بنایا گیا تھا کہ طالب علم انفرادی مطالعہ کرتے وقت آگے اور پیچھے کے ریکس پر بیٹھے طالب علموں کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہال کے درمیان مناسب فاصلے پر گول میز اور چار کرسیاں رکھ دی گئی تھیں جن پر بیٹھ کر بھی مطالعہ کیا جا سکتا تھا۔ اس ریڈنگ روم کی فضا اتنی پرسکون اور پرکشش تھی کہ طلبا خالی پیریڈ میں یہاں آ کر مطالعہ کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ کالج کا سنکن گارڈن پودوں کی خوبصورتی اور ترتیب کے علاوہ طرزِ تعمیر سے شالیمار گارڈن لاہور کا کوئی حصہ لگتا تھا۔ جناح ہوسٹل کی دو منزلہ کشادہ اور خوب صورت عمارت اور اس کے اندرونی باغیچے کی خوبصورتی کمال کی تھی۔ 182 ایکڑ کے کالج کے رقبے پر پھیلی ہوئی ہر عمارت، گراؤنڈز اور لانز کی لوکیشن شاندار اور متناسب طریقے پر کی گئی ہے اور اوپر سے ان کی دیکھ بھال کا مثالی انتظام کیمپس کی خوبصورتی دو چند کر دیتا ہے۔

1971 کے سقوط ڈھاکہ سے تمام ملک میں اداسی اور صدمے کی کیفیت تھی۔ سب لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے مگر اظہار نہ کر پاتے۔ ملک میں تین سال قبل سے نیشنل سروس کے نام سے فوجی ٹریننگ کا پروگرام چل رہا تھا۔ جو طلبا اس کورس کو مکمل کر لیتے تو انہیں عمر میں ایک سال کی رعایت اور فوج میں کمیشن پر کچھ اضافی نمبر دیے جاتے۔ انہی دنوں یہ افواہ بھی اڑی کی نیشنل سروس مکمل کرنے والے نوجوانوں میں چند ایک کو لڑنے کے لیے وار فرنٹ پر بھیج دیا گیا تھا۔ اسی ماحول میں حکومت کی طرف سے ہدایات موصول ہوئیں کہ طبی معائنے میں کامیاب تمام میٹرک پاس نوجوانوں کو ایک سال کے لیے نیشنل سروس کی لازمی تربیت دی جائے گی۔ جو جہاں پڑھ رہا ہے، تربیت کی تکمیل کے بعد اسے وہیں سے شروع کرایا جائے گا۔ مجھ سمیت گورنمنٹ کالج کے کافی طلبا کو میڈیکل ٹیسٹ کے بعد یکم جنوری 1972 کو 65 پنجاب رجمنٹ ملتان رپورٹ کرنے کو کہا گیا سو ایسا ہی کیا گیا۔ ہمیں یونیفارم بھی جاری کر دی گئی۔ کئی لڑکوں نے اس کی فٹنگ بھی کرا لی۔ ٹریننگ دینے کے لیے ریٹائرڈ فوجیوں کو بلایا گیا تھا۔ قوم کا اجتماعی مورال بہت گر چکا تھا اور ایسے ماحول میں ایسی ٹریننگ پر بہت اعتراض بھی کیا گیا۔ 12 دنوں کی ڈرل کے بعد ایک دن تمام نوجوانوں کو ایک گراؤنڈ میں جمع کیا گیا جہاں ایک کمانڈنگ آفیسر نے خطاب کرتے ہوئے فی الحال اس تربیت کے خاتمے کا اعلان کیا اور یہ بھی کہا کہ اگر ضرورت پڑی تو آپ لوگوں کو واپس بلا لیا جائے گا۔ تمام سے وردیاں اور بوٹ واپس لے لیے گئے۔ خاصی تعداد میں نوجوان گھروں کو چلے گئے مگر میرے گروپ کے دوستوں نے دو دن مزید گزار کر ملتان شہر کی سیر کی اور ڈیرہ اڈا پر واقع ایک سینما میں تازہ ریلیز ہونے والی فلم ''تہذیب'' دیکھی اور پس انداز کردہ

پیسوں سے ریلوے کی انٹر کلاس میں سفر کرنے کا لطف لیا۔آخر کار 15 دنوں کی کالج سے غیر حاضری کے بعد کالج میں دوبارہ حاضر ہو گئے۔

جس طرح کوئی انسان نور کے ہالے کی طرح ہوتا ہے یا اس کا ایک AURA ہوتا ہے اور جو اس ہالے میں آ جاتا ہے وہ بھی روشن ہو جاتا ہے۔گورنمنٹ کالج ساہیوال بھی نور اور روشنی کے ہالے کی مانند تھا جو یہاں ایک دفعہ داخل ہو گیا اس کا مستقبل بھی روشن ہو جاتا تھا۔میں نے جو آخری دو سال یہاں گزارے اس نے مجھے ایک اچھا انسان بننے کی ترغیب دی۔یوں کہہ لیں کہ کالج بہترین تعلیمی،تہذیبی،علمی اور ادبی اقدار کا شاندار مرکز تھا جس نے انکساری، عاجزی اور وقار کے ساتھ زندگی گزارنے اور نصب العین کے حصول کے لیے خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کیا۔اس کے ماحول نے مجھے خود شناسی کی دولت سے مالا مال کیا۔دلیل کے ساتھ بات سننے اور کرنے کا علمی رویہ اسی کے ماحول کی دین تھا۔ان دنوں اتنے بہترین اساتذہ جمع ہو گئے تھے جنہیں رول ماڈل بنایا جا سکتا تھا۔مجھے ذاتی طور پر جس استاد نے بہت زیادہ متاثر کیا وہ پروفیسر سید اکبر علی شاہ صاحب تھے۔ان کی ذات میں بہت ساری خوبیاں جمع ہو گئی تھیں۔کالج بطور تعلیمی ادارہ اور شاہ صاحب بطور استاد میرے آئیڈیل میں ڈھل گئے۔ان کی طرح کا استاد بننا اور گورنمنٹ کالج ساہیوال دونوں میری انسپائریشن بن گئے۔

میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ جب میری سلیکشن بطور استاد ہوئی اور تقرری کا انتظار تھا تو خیال تھا کہ پہلے ساہیوال کے کسی قریبی شہر میں جوائن کروں گا اور جیسے کوئی سیٹ دستیاب ہوئی،اپنے محبوب ادارے یعنی گورنمنٹ کالج ساہیوال تبادلہ کرا لوں گا اور گویا اپنے خواب کی تعبیر بھی پا لوں گا مگر ”من در چہ خیالم و فلک در چہ خیال“ یعنی میں کیا سوچتا ہوں اور آسمان (میرے بارے میں) کیا سوچتا ہے!! گورنمنٹ کالج ساہیوال سے حاصل ہونے والی تعلیم و تربیت،شعور اور اعتماد نے اگرچہ مجھے گمنامی سے نکال کر ایک نصب العین کے تعین میں مدد دی پھر اس نے میرے اندر موجود صلاحیتوں کو اس حد تک اجاگر اور صیقل کیا کہ متعین شدہ ہدف کا حصول ممکن ہو گیا مگر یہاں پڑھانے کا جنون پورا نہ ہو سکا۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنی مادر علمی سے میرا ربط و تعلق ٹوٹ گیا تھا۔اس سے عشق اور ہجر نے اس تعلق کو ایک نئی جہت اور معنویت عطا کی وہ یہ کہ یہاں کے رول ماڈل استاد اور یہاں کی تہذیبی اور علمی روایات،اقدار اور میراث انسپائریشن میں ڈھل کر میرے ساتھ ساتھ چلے۔میں نے اپنے رویے،کردار اور مزاج کے لحاظ سے اپنے اساتذہ کے تتبع میں ایک مفید اور اچھا استاد بننے کی کوشش سروس کی تکمیل تک جاری رکھی۔اپنے اساتذہ کی طرح میرا بھی بحیثیت استاد اپنے شاگردوں کے ساتھ رویہ مشفقانہ،دوستانہ اور رہنمایانہ رہا اور اپنے سبق کو محبت کا گیت بنایا جس سے میں نے اپنے مضمون سے بھی کمٹ منٹ نبھائی۔استاد کے طور پر میری کارکردگی گورنمنٹ کالج ساہیوال میں حاصل کردہ تربیت کی مرہون منت تھی۔بطور استاد میں نے اپنے محبوب کالج میں بالواسطہ یا بلا واسطہ پڑھانے،

سکھانے والے اساتذہ کی خوبیوں بالخصوص استادِمکرم پروفیسر سید اکبر علی شاہ کی شائستہ اور شستہ شخصیت کے پہلوؤں کو سامنے رکھا جب کہ انتظامی ذمہ داریوں کے لیے میرے پیش نظر میری مادرِ علمی گورنمنٹ کالج ساہیوال کا تعلیمی کیلنڈر، نصابی و ہم نصابی روایات اور انفراسٹرکچرل سہولتیں تھیں۔ مجموعی طور پر فارسی کے استاد اور پرنسپل پروفیسر آغا امجد علی کا انتظامی اسلوب اور اس کالج کے سابقہ پرنسپلز کی کاوشوں کی مثالیں میرے سامنے تھیں۔ اگر چہ میں اپنے محبوب کالج کے ساتھ ہجر کا شکار رہا لیکن بطور استاد اپنے وقت کے یہاں کے اساتذہ کا اسلوب اور انتظامی طور پر یہاں کا انفراسٹرکچر اور انتظامی اسلوب میرے ساتھ ساتھ چلے۔ میں اگر اس عظیم ادارے کی تجسیم کروں تو اس میں مجھے خوبصورت، طاقتور اور اساطیری اوصاف نظر آتے ہیں جس نے ساہیوال کی کئی نسلوں کی تعلیم و تربیت کر کے انہیں مفید انسان بنا کر معاشرے کے سپرد کیا ہے کیوں کہ گورنمنٹ کالج ساہیوال۔۔۔۔۔۔۔ ایک کرشماتی درسگاہ ہے!!!!

ساہیوال شہر میری سانسوں میں بستا ہے۔ رزق کے لیے اڑان بھرنے سے پہلے بیس سال یعنی والد کی انگلی پکڑنے سے کالج کی تعلیم مکمل کرنے تک اس شہر کی ہر گلی، بازار، مقام پر بکھری یادیں میرے شعور اور تحت الشعور کا ایک ناگزیر حصہ ہیں۔ اب میں اس بات کا تعین تو نہیں کر سکتا کہ بچپن میں پہلی بار کب ساہیوال شہر آیا بس اتنا یاد ہے کہ ساہیوال شہر آنا ہمیشہ زندگی کی بہت بڑی تفریح، خوشی اور آسودگی کا باعث رہا ہے۔ بنیادی طور پر اس خوشی کا سبب یہاں سے کچھ کھانا پینا اور پسند کی کوئی چیز لینا ہوتا تھا۔ دیہات کے باسیوں کو ہمیشہ شہر سے مٹھائی کھانا بہت مرغوب رہا ہے۔ اس وقت ساہیوال میں معیار کے لحاظ سے پہلے نمبر پر اقبال مٹھائی ہاؤس آتا تھا۔ اس کا ہر آئیٹم لاجواب تھا۔ گاہکوں کے لیے نیچے کے علاوہ اوپر دو منزلیں تھیں۔ وہاں ہر وقت خوب رش رہتا۔ مٹھائی کی یہ دکان گویا ساہیوال کی پہچان تھی۔ دیگر شہروں سے آنے والوں کے لیے بھی یہاں آنا ایک طرح کی ترجیح ہوتا تھا۔ دوسرے نمبر پر اردو بازار کے آغاز میں خان مٹھائی ہاؤس تھا۔ یہ اگر چہ ایک چھوٹی دکان تھی اور یہاں بیٹھ کر کھانے کی سہولت بھی محدود تھی تاہم اس کی برفی اور حلوے کی اقسام بہر حال معقول تھیں۔ تیسری اور انتہائی اوسط درجے کی دکان مائی کی مسجد والی گلی میں خوشیا کی تھی مگر اس کی مٹھائی کھانا مجھے کبھی پسند نہیں رہا۔ میرے بچپن کے دور میں کھانے کا کوئی معیاری ہوٹل مجھے یاد نہیں۔ اقبال سویٹس کے سامنے والے کونے میں " گلبرگ" ہوٹل تھا جس تک رسائی حاصل کرنا آسان نہیں تھا تاہم چند بار جب میں اپنے والدین کے ساتھ شہر آیا تو یہاں سے کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ یہ اس وقت کے لحاظ سے ایک مہنگا ہوٹل تھا جو بہت دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ اس وقت ساہیوال میں ایک بظاہر دیہاتی اور سادہ ہوٹل تھا جہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ اس کے چنوں کی تمام شہر میں دھوم تھی۔ چنوں کے علاوہ یہاں گوشت کے ناغے کے دن مرغ اور دیگر ایام میں صرف مٹن قورمہ ملتا تھا۔ مائی کی مسجد کے سامنے غلام نبی کے چنے والا یہ ہوٹل صرف لنچ کے اوقات میں کھلتا تھا۔ اس کے چنے شہر بھر میں پسند کیے جاتے۔ 1980 تک تو میں نے اس ہوٹل کو چلتے

دیکھا ہے۔سٹیڈیم ہوٹل اور کیفے ڈی روز کے کھانے بھی پسند کیے جاتے تھے۔کیفے ڈی روز میں گرمیوں کے موسم میں بھی کھانے کے بعد کئی بار گاجروں کا حلوہ کھانے کا اتفاق ہوا۔

میرے بچپن سے خاصی دیر تک ساہیوال شہر میں تین ڈاکٹر تھے جن کے پاس گاؤں والے جاتے تھے یا ہم بچوں کو بیماری کی صورت میں علاج کے لیے لے جایا جاتا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہو۔درجے کے لحاظ سے پہلے نمبر پر ڈاکٹر عبدالقادر خان تھا جسے پٹھان ڈاکٹر کہا جاتا تھا۔پاشا سٹریٹ میں سلنکی عینکوں والے کے تقریباً سامنے کونے میں ان کا کلنک تھا۔ان کا رنگ بہت سفید تھا اور سر پر انگریزی ہیٹ پہنتے تھے، تھے پٹھان مگر پکے انگریز لگتے تھے۔وہ بازاری نسخہ نہیں لکھتے تھے اور نہ اس وقت تک رواج پڑا تھا،تمام ادویات ان کی ڈسپینسری سے دستیاب تھیں۔ان کا مریض دیکھنے کا انداز یہ تھا کہ وہ پہلے مریض کو پوری طرح سے چیک کرتے،ایک چٹ پر اس کا نام،مرض اور ادویات لکھ لیتے۔جب چند مریض دیکھ لیتے تو ڈسپنسری میں پڑے ہوئے رجسٹر پر جھک جاتے اور اس میں پہلے سے لیے گئے نوٹس کے مطابق نمبر شمار کے ساتھ مریض کے کوائف،مرض اور اس کی مجوزہ ادویات کا اندراج کرتے اور پھر سے مریض دیکھنا شروع کر دیتے۔ان کا ڈسپینسر جان محمد اس رجسٹر میں اندراج کے مطابق انجکشن لگاتا اور ادویات جاری کرتا اور معاوضہ وصول کرتا۔اس "پٹھان" ڈاکٹر کے پاس دیگر شہروں سے بھی مریض آتے۔دوسرے نمبر کے ڈاکٹر کو اس کی داڑھی کے فرنچ کٹ کی وجہ سے "ڈاکٹر مرزئی" کہتے تھے۔اقبال سویٹس سے سیدھی سڑک کے آخر میں اس کا مطب تھا جہاں چیدہ چیدہ مریض ہی جاتے مگر وہاں اتنا رش نہیں ہوتا تھا۔تیسرے ڈاکٹر کو جناح کیپ پہننے کی وجہ سے "ٹوپی والا ڈاکٹر" کہتے تھے۔شربت بازار میں واقع اس کے کلنک میں بھی کوئی رش دیکھنے میں نہیں آتا تھا۔1970 کے قریب ٹوپی والے ڈاکٹر کی دکان سے آگے ایک نئے ڈاکٹر کا کلنک بھی دیکھا جس کے نام کے ساتھ ایل ایس ایم ایف لکھا ہوا تھا مگر وہاں مریضوں کا ہجوم کبھی نظر نہیں آیا۔1970 کی دہائی کے بعد ضلعی ہیڈ کوارٹر ہسپتال کے ایک دو بڑے ڈاکٹروں نے اپنی سرکاری رہائش گاہوں پر پرائیویٹ پریکٹس شروع کی تو ادویات کے نسخوں کا رواج عام ہوا۔

ہائی سٹریٹ سے شربت بازار میں داخل ہوں تو پہلے چوک کے دائیں کونے میں ایک دکان تھی جس کے اندر کوہلو لگا ہوا تھا۔اس کوہلو کے گرد ایک بیل دن کے اوقات میں گھومتا رہتا۔یہ ایک ایسے پنساری کی دکان تھی جہاں اصلی مصالحہ جات اور تیل دستیاب تھے۔شربت بازار میں دو حکیم تھے جن میں سے ایک کا نام شاید حکیم بشیر احمد تھا اور دوسرے کا نام حکیم عصمت اللہ تھا۔اس بازار کا نام یہاں پر موجود شربت کی کل چار دکانوں کی وجہ سے پڑ گیا تھا۔اب جب کہ شربت کی ایک دکان بھی نہیں بل کہ پلاسٹک سے بنی اشیا کی دکانوں سے یہ بازار اَٹ گیا ہے مگر یہ اب بھی شربت بازار کے نام ہی سے معروف ہے۔میرے لیے شربت بازار کی بہت زیادہ اہمیت رہی ہے وہ اس طرح کہ ایک حکیم کی دکان کے سامنے ہمارے گاؤں کے میاں ریاض حسین

کی کپڑے کی دکان تھی جو پورے گاؤں کا مرکز تھی۔شہر میں آنے کے بعد اس دکان پر حاضری دی جاتی پھر باقی سرگرمیاں یہیں سے وجود میں آتیں۔خاص طور پر گاؤں کی خواتین مختلف دکانوں سے سامان خرید کر اس دکان پر رکھ دیتیں اور پھر مزید اشیا خریدنے نکل جاتیں اور واپس یہیں پر آتیں۔ہمارے لیے یہ دکان ایک ایسا مرکز تھی کہ اِدھر اُدھر جا کے لوٹ کر اسی دکان پر واپس آتے بل کہ بعض اوقات یہاں پر آرام بھی کر لیتے۔موسم گرما میں سکول سے واپسی کے وقت سخت گرمی ہوتی تو اس دکان پر آ کر بیٹھ جاتا (یا چرچ سے جو سڑک کچہری جاتی ہے اس پر ایک خوبصورت پارک تھا اس کے کسی گھنے درخت کے نیچے گھنے گھاس پر لیٹ کر ستا لیتا۔بعد میں کنعان پارک بھی بہت کام آیا) بہر حال دکان بھی چلتی رہتی اور گاؤں کے لوگ بھی آتے جاتے رہتے۔گاؤں والے اکثر ادھار پر کپڑا لے جاتے اور یہ ادھار دکان کے ساتھ ساتھ گاؤں میں بھی وصول کر لیا جاتا۔شربت بازار سمیت شہر کے دیگر بازار اتنے کشادہ تھے کہ یہاں تانگوں کا چلنا ایک معمول تھا۔شربت بازار ہی میں ایک شخص مچھلی اور پکوڑوں کی ریڑی لگاتا تھا جو ہر وقت خریداروں سے گھرا رہتا۔پاک پتن بازار کی دکانیں بند ہو جاتیں تو وہ اپنی ریڑی پاک پتن بازار میں لے آتا۔ویسی مچھلی اور بہترین ذائقے اور اشتہا آور خوشبو والے پکوڑوں کا لطف آج بھی میری زبان پر پڑا ہے۔ساٹھ کی دہائی میرے عنفوان شباب کا عہد ہے۔کپڑے کی جس دکان کا میں نے ذکر کیا ہے اس کے سامنے ایک حکیم صاحب کے مطب کا ایک کونہ شربت کے لیے مخصوص تھا جہاں ریڈیو مسلسل بجتا رہتا۔مہدی حسن،نور جہاں اور دیگر مقبول گانے اکثر بجتے ہوئے سنائی دیتے۔وہ گانے آج بھی سنتا ہوں تو وہ زمانہ تازہ ہو جاتا ہے جب ساہیوال ایک شانت اور پرسکون اور کھلے بازاروں کا شہر تھا جہاں تانگے بھی آسانی سے چلتے تھے۔

ساہیوال ایک ایسی مرکزی جگہ پر واقع ہے جہاں ملتان،بہاولنگر،بوریوالہ،عارفوالہ،پاکپتن،قطب شاہانہ اور نور شاہ سے آنے اور جانے والی ٹریفک جمع ہو جاتی تھی۔یہاں کا جنرل بس سٹینڈ پرہجوم اور مصروف ہوا کرتا تھا جہاں سے لاہور،ملتان،بہاولنگر اور دیگر اطراف میں بسوں کے ٹائم جاتے تھے۔پاکپتن،عارف والہ،چیچہ وطنی،اوکاڑے جانے آنے والی بسوں کو لوکل کہتے تھے۔عارف والا سے آنے والی ایک ایسی لوکل بس مجھے یاد ہے جو آتے جاتے ریلوے روڈ پر واقع بڑے ڈاکخانے کے ایک گیٹ سے داخل ہوتی اور ڈاک چھوڑتی یا لیتی اور دوسرے گیٹ سے باہر نکل جاتی۔ملتان،بہاولنگر اور وہاڑی روٹس سے براہ راست لاہور جانے اور واپس آنے والی بسوں کے لیے ملتان روڈ پر "باہر کا اڈا یا باہر لا موڑ" کے نام سے اڈا قائم ہو گیا۔جنرل بس سٹینڈ کے ساتھ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کا بہت بڑا ٹرمینل تھا۔ریلوے روڈ پر نذیر عنایت اللہ کی فیصل آباد روٹ کی بسوں کا خصوصی ٹرمینل قائم ہوا۔پاک پتن کے لیے ان کا روٹ بہت مقبول ہوا۔شہر اور باہر کے اڈے کے درمیان تانگے بہترین وسیلے کا کام کرتے تھے۔1972 سے پہلے باہر کے اڈے سے شہر آنے والی ٹریفک موجودہ اوور ہیڈ برج کے نیچے سیدھ میں واقع ریلوے پھاٹک سے گزرتی اور نہر سے پہلے دائیں جانب

ریلوے سٹیشن کی جانب مڑ جاتی جہاں سے بائیں جانب نہر کا پل عبور کر کے جنرل بس سٹینڈ اور شہر کی دیگر اطراف میں چلی جاتی۔مصروف ترین ریلوے سٹیشن کی وجہ سے ریلوے پھاٹک اکثر بند ملتا جس سے دونوں طراف میں ٹریفک کی قطاریں لگ جاتیں۔سائیکل سوار اور پیدل لوگ البتہ ریل آنے تک گزرتے رہتے۔ پیپلز پارٹی کے دور میں یہاں اور ہیڈ برج کا مطالبہ مانا گیا۔پل 972 میں جب مکمل ہوا تو فوری بعد ٹریفک کے لیے نہیں کھولا گیا تھا البتہ سائیکل سواروں کے لیے کوئی پابندی نہیں تھی لہٰذا مجھے اس پل سے پہلی بار گزرنے کا پر لطف لمحہ ابھی بھی اس طرح یاد ہے کہ جیسے کل کی بات ہو۔یہ پل ریلوے لائن اور نہر کو ایک ہی طوالت سے پار کرتا تھا۔اس سے گزر کر دائیں جانب واقع پیراڈائیز سینما کے سامنے سے گزر کر شہر کی جانب جانا پڑتا تھا۔اس سے شہر آنے جانے والی ٹریفک کے لیے بہت آسانی ہوگئی جب کہ ریلوے سٹیشن سے یادگار ساہیوال تک ریلوے روڈ کا حصہ ٹریفک کے لحاظ سے بارونق نہ رہا۔

عارف والا روڈ پر واقع ہمارے گاؤں کا اڈا ایک ایسی مرکزی جگہ پر واقع تھا جہاں سے پچھلے سات کلومیٹر تک کے چکوک کے تانگے یہاں اکٹھے ہو جاتے۔چوں کہ بس کا سٹاپ منظور نہیں تھا اس لیے اگر کوئی مقامی یا دیگر بس رک جاتی تو وہ کرایہ پچھلے منظور شدہ اڈے سے وصول کرتے۔تانگوں کی اکثریت تو باہر کے اڈے سے شہر چلی جاتی لیکن چند سواریوں نے غلہ منڈی جانا ہوتا تو وہ تانگہ براستہ غلہ منڈی اور پل بازار تانگوں کے اڈے پر پہنچتا۔غلہ منڈی سے یاد آیا، یہاں پر ایک بہت ہی معروف حکیم تھا جو سنارے حکیم کے نام سے معروف تھا۔لوگوں کو اس پر بہت اعتقاد تھا، 1982 کا واقعہ ہے رحیم یار خان میں میرے والد کو شٹیکا کا درد لاحق ہو گیا۔ایلو پیتھک اور ہومیو پیتھک ڈاکٹروں سے علاج کرایا مگر افاقہ نہ ہوا۔اس کے بعد وہ ساہیوال آئے اور حکیم سنارا کے پاس گئے۔واپس آئے تو شٹیکا کی تکلیف سے افاقہ محسوس ہوا، انہوں نے حکیم سنارا کی تعریف کی کہ اس کا نسخہ کارگر ثابت ہوا ہے۔اس نسخے کی ادویات اس نے اپنے مطب سے دی تھیں۔جب میں نے ادویات دیکھیں تو بہت تعجب ہوا کہ ساری ادویات ایلو پیتھک تھیں۔ایک یونانی حکیم کا شٹیکا کے لیے نسخہ ملاحظہ کریں۔بروفین 400، پیراسٹامول 500، ایک انڈوسڈ درد کشا کیپسول، ایک عدد سٹیرائیڈ گولی ڈیلٹا کارٹل یا پیڈنیسلون۔جب بھی درد ہوتا وہ حکیم کی یہ دوائی کھا لیتے اور آرام پاتے۔

1947 سے پہلے ہمارے گاؤں میں ہندو بھی رہتے تھے اس لیے ان کے تہذیبی اور معاشرتی اثرات سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا تھا۔پارٹیشن کے بعد جب فوج نے پنجاب میں مہاجرین کی کھوئی ہوئی خواتین کو تلاش کرنے کی مہم شروع کی تو ہمارے گاؤں میں بھی آئی، میری ایک پھوپھی نے ماتھے پر بندی لگائی ہوئی تھی تو اسے ہندو لڑکی سمجھ کے پکڑ لیا۔انہوں نے قرآن کی تلاوت سنائی تو خلاصی ہوئی۔ہندو جب یہاں سے کوچ کر گئے تو ایک ہندو دکاندار اپنی دکان میرے پھوپھا محمد علی خاں کے سپرد کر گیا۔میں نے اس دکان اور فرنیچر کو دیکھا ہوا ہے۔انہوں وہ دکان رجو ماچھی کو دے دی تھی۔اس نے آگے وہ دکان اپنے بیٹے کو منتقل کر دی

اور 1975 تک وہ دکان سلامت رہی۔ محمد علی خان کو گاؤں میں خاصی مقبولیت حاصل تھی اور انہوں نے ایوب کے دور میں بی ڈی ممبر کا الیکشن دو بار جیتا۔ 1967 میں ان کا اچانک انتقال ہو گیا جس سے ہمارے خاندان کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا۔ گاؤں میں شادی اور فوتگی کی رسمیں آج سے بہت الگ تھیں۔ تمام شادیاں خاندان ہی میں ہوتی تھیں۔ کسی نوجوان کی باہر شادی کرنے کی ایک آدھ روایت تو موجود تھی مگر بیٹیوں کو خاندان سے باہر بیاہنے کا سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ پہلے نائی کے ذریعے شادی کی دعوت دی جاتی تھی جسے "گنڈ" کہتے تھے۔ نائی کو باہر سے آنے والے مہمانوں کے نام اور پتے بتا دیئے جاتے اور وہ مدعوین کی تعداد کے برابر سرخ دھاگے لے لیتا اور مدعو کرتے وقت وہ دھاگے کو گانٹھ لگا کر ان کے سپرد کر دیتا۔ گاؤں میں البتہ میزبان کی حیثیت کے مطابق منتخب یا پھر تمام لوگ ہی مدعو ہوتے تھے۔ تین دن جاری رہنے والی اس شادی کے پہلے دن دلہن کو مہندی لگائی جاتی اور گاؤں کی عورتیں گھر سے اناج چنگیروں میں ڈال کر دلہن کے گھر لا کر ایک مقررہ جگہ پھینک دیتیں جواباً انہیں کوئی میٹھی چیز پیش کی جاتی۔ اگلا روز لڑکے والوں کا ہوتا۔ دلہا کو سرخ دھاگوں سے تیار کردہ "گانا" باندھا جاتا اور مہندی لگائی جاتی۔ دلہا والوں کی طرف سے گاؤں اور باہر کے مہمانوں کو کھانا دیا جاتا اگر کوئی با حیثیت ہوتا تو گاؤں میں ہر گھر کھانا پہنچایا جاتا۔ رات بارہ بجے کے قریب بارات روانہ ہوتی۔ مجھے بچپن میں بارات دیکھنے کا موقع نہ مل سکا کیوں کہ تا دیر جاگنا ممکن نہ تھا۔ کچھ بڑے ہوئے تو باراتوں کو چڑھتے دیکھا۔ سب سے آگے ڈھولچی ہوتے۔ ڈھولوں کی آواز پر آگے دلہا ہوتا جس پر سرخ رنگ کا کپڑا تان دیا جاتا، اس کے ساتھ شہبالا اور پیچھے دلہا کی بہنیں سر پر مٹی کا چھوٹا مٹکا سر پر رکھ لیتیں۔ اس رسم کو گھڑولی بھرنا کہا جاتا۔ دلہا دلہن کے گھر ساتھ ساتھ یا بہت قریب ہوتے مگر برات کو گاؤں کا پورا چکر لگانا پڑتا۔ برات کے آگے دو مشعل بردار چل رہے ہوتے۔ پہلے رواج تھا کہ دلہا راستے میں آنے والے برگد کے ایک قدیم درخت کا چکر لگاتا مگر بعد میں اسے مسجد میں دو نوافل ادا کرنے سے بدل دیا گیا۔ اس اثنا میں مٹی کا چھوٹا مٹکا مسجد کے کنویں کے پانی سے بھر لیا جاتا۔ اسے گھڑولی بھرنا کہتے تھے۔ کئی خواتین نے لڑکے والوں کی طرف تحائف یا بری کی پراتیں بھی سروں پر اٹھائی ہوتیں۔ بارات رات کے دو بجے لڑکی کے گھر پہنچتی جہاں دلہا کو لکڑی کے ایک چھوٹے تخت پر بٹھا کر نہلایا جاتا جسے کھارے چڑھنا کہتے تھے۔ لڑکی والوں کی طرف سے فراہم کردہ لباس دلہا کو پہنایا جاتا اور وہ رات لڑکی والوں کے مہمان کے طور پر بسر کی جاتی۔ اگلا دن لڑکی والوں کا ہوتا۔ رواج کے مطابق تمام جہیز کو ایک کھلے صحن میں ترتیب سے سجا دیا جاتا اور لڑکی والوں کی طرف سے نیوندرا (نقد رقم اور تحائف) وصول کیے جاتے جس کا نائی بڑے اہتمام سے اعلان کرتا اور اسے تحریر بھی کر لیا جاتا۔ اس تقریب کے اختتام پر جہیز دلہا کے گھر پہنچا دیا جاتا اور ایک ڈولی لائی جاتی جس میں دلہن اپنی ایک دو سہیلیوں کے ساتھ سوار ہوتی۔ دلہن کے دوپٹے یا چادر کو دلہا کی چادر سے گانٹھ دی جاتی اور دلہا ڈولی کے بانسوں کے درمیان چلتا۔ چار کہار ڈولی کو اٹھا لیتے۔ ڈولی کے آگے ڈھولچی ڈھول بجاتے اور دیگر خواتین اور مرد ڈولی کے پیچھے ہو لیتے۔

دلہا کے گھر دلہن کو ڈولی سے اتار کر گھر میں داخلے سے پہلے دلہن کے جہاں پاؤں پڑتے وہاں روئی کی پونیاں رکھی جاتیں اور یوں شادی کی تمام رسمیں ختم ہو جاتیں۔ایک روایت ماضی سے آ رہی تھی جو بعد میں شاید ختم کر دی گئی کہ دلہا اگلے ایک ہفتے تک سلامی لینے کے لیے گاؤں کے ان گھروں کا چکر لگاتا جنہوں نے یادداشت کے مطابق اس کے خاندان سے ایسے گذشتہ مواقع پر سلامی وصول کی تھی۔

کسی بھی عمر کے فرد کے انتقال اور تدفین کے بعد اگلے سات دن اس گھر میں دن کے وقت چارپائیوں پر بیٹھا نہیں جاتا تھا۔اس رات کے دوران گھڑوں کا پانی انڈیل دیا جاتا اور ریڈیو بجانا بند کر دیا جاتا۔خواتین گھر کے اندر صحن یا کسی موزوں جگہ پر بیٹھ جاتیں اور منہ ڈھک کر اجتماعی طور پر بین کرتیں۔ایک خاتون ان کو لیڈ کرتی اور المیہ لے میں کورس کی صورت میں یہ بین مرحوم کے متعلق یا بین میں شریک خواتین کے ذاتی دکھوں کے محسوسات کا اظہار ہوتا۔گھر کے باہر کسی مناسب جگہ پر پرالی یا بھوسہ بکھیر دیا جاتا او وہاں بیٹھ کر آنے والے لوگ مرحوم کی مغفرت کی دعا بھی کرتے اور اس کی خوبیاں بھی بیان کرتے۔پھر ساتے کی رسم تک یہی سلسلہ جاری رہتا۔کہنے کو تو یہ ساتویں کی رسم ہوتی مگر عموماً پانچویں دن کھانے پینے اور نئے خریدے گئے کپڑوں کی نمائش اور گاؤں کے امام مسجد کی دعاؤں کے ساتھ مغفرت کی مجلس منعقد کی جاتی۔مغفرت کی محفل میں رکھی گئیں اشیا پر قطعی استحقاق امام مسجد کا ہوتا اور شرکا کی کھانے سے تواضع کی جاتی۔مغفرت کی اس تقریب کے بعد چارپائیوں پر بیٹھا جا سکتا تھا۔برادری کے زیادہ ہونے کی وجہ سے افسوس کا یہ سلسلہ دو ماہ تک جاری رہتا تھا۔دور نزدیک کے ہر گاؤں سے لوگ اجتماعی طور پر افسوس کے لیے آتے رہتے۔اب تو یہ رواج ختم ہو چکا ہے مگر ماضی قریب تک افسوس کے لیے آنیوالے کچھ رقم فوت ہونے والے کے پسماندگان کو "امداد" کے طور پر دیتے تھے جسے "فائتہ" کہا جاتا تھا۔یہ لفظ مقامی زبان میں شاید "فاتحہ" پڑھنے سے نکلا ہے یا پھر لفظ وفات یا فوتگی سے،اس کا باقاعدہ اندراج کیا جاتا۔

جہاں کم علمی یا جہالت ہو وہاں مختلف توہمات (Taboos) پھیلنے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔مجھے دو چار یاد رہ گئے ہیں۔اگر گاؤں کا کوئی آدمی صبح سویرے کسی کام کی غرض خصوصاً شہر کی جانب گاؤں سے باہر سفر کے لیے گھر سے نکلتا تھا اور کوئی شخص سب سے پہلے اس کے سامنے آ جاتا اور اس کا کام نہ ہو پاتا تو وہ سب سے پہلے سامنے آنے والے شخص کو ذمہ دار ٹھہراتا اور اگر ایسا اتفاق دوبارہ ہو جاتا تو اسے منحوس قرار دے کر سارے گاؤں میں مشہور کر دیا جاتا اور ہر کوئی اس شخص کے سامنے آنے سے کترانے لگتا۔گھر سے کسی کام کے لیے نکلنے کے فوری بعد پیچھے سے آواز دینا برا شگون ہوتا کہ اب یہ کام نہیں ہوگا لہٰذا کئی لوگ جانے کا ارادہ ہی ترک کر دیتے۔اگر کسی مریض کی دوائی کی شیشی ٹوٹ جاتی تو اسے صحت مندی کے لیے اچھا شگون قرار دیا جاتا کہ اب بیمار شفایاب ہو جائے گا۔کسی فوت ہونے والے شخص کو جہاں آخری غسل دیا جاتا تو پہلی رات اس جگہ اس خیال سے دِیا جلایا جاتا کہ فوت ہونے والے کی روح پہلی رات ایک دفعہ ضرور واپس آتی ہے۔اسی

طرح نو جوان لڑکیوں کے جسم میں جنوں کے گھس آنے والے واقعات بھی اکثر دیکھنے سننے میں آتے جس کے لیے دعا کے لیے گاؤں آنے والے پیروں سے دعا کرائی جاتی۔ لگتا ہے اب جنوں نے گاؤں ہی چھوڑ دیا ہے۔ کچھ درختوں یا جگہوں کو بھاری مشہور کر دیا جاتا جہاں جانے سے لوگ کتراتے۔ گاؤں میں موسموں کا بھی اپنا ایک لطف اور ان سے وابستہ خوشیاں ہوتیں۔ سردیوں کی بارشوں کے دوران ہر گھر میں کڑاہیاں چولہوں پر چڑھا دی جاتیں اور گاؤں کی روایتی میٹھی سوغات ''پھلجیرا'' (ایک خاص قسم کا حلوہ) تیار کیا جاتا اور اسے گرم گرم کھانا بہت لطف دیتا۔ پنجابی میں اسے پنجیری کہا جاتا تھا جسے محفوظ بھی کر لیا جاتا۔ مہمانوں کی تواضع بھی اسی سے کی جاتی۔ اسی طرح ایک روایت ماضی سے آ رہی تھی کہ محرم کے دنوں میں میٹھی ٹکیاں جنہیں مقامی زبان میں ''ٹکڑے'' کہا جاتا تھا ہر گھر میں تیار کی جاتیں اور اس سوغات کو آئندہ کے لیے بھی محفوظ کر جاتا۔

آج سے پچاس سے ستر برس پہلے گاؤں میں عیدوں کا اپنا رنگ تھا۔ اس وقت مسجد بھی وہی تھی جو گاؤں بسنے کے وقت بنائی گئی تھی۔ رمضان المبارک میں روزے جوش وخروش سے رکھے جاتے۔ میں نے 1963 سے پرائمری کے دوران ہی روزے رکھنے شروع کر دیے تھے۔ مسجد میں خشک چمڑے سے بنایا ہوا ایک نقارہ (مقامی زبان میں نگارا) تھا جسے انتہائے سحر اور افطار کے وقت بجایا جاتا تھا۔ کبھی کبھار ہوا کے رخ کی وجہ سے شہر کے سائرن کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ کئی گھروں سے افطاری کے لیے اشیا مسجد میں بھیجی جاتی تھیں۔ تراویح امام مسجد ہی پڑھاتا تھا اور جو قرآنی سورتیں اسے یاد ہوتیں انہی پر اکتفا کرتا۔ 1970 کے بعد کسی حافظ قرآن کے انتظام کا آغاز ہوا اور 27 ویں کی رات ختم قرآن ہوتا۔ اس رات معمول سے ہٹ کر کھانے تیار کیے جاتے تھے۔ عید کے دن کھیتوں میں دودھ دوہنے اور جانوروں کو چارہ ڈالنے کے بعد نئے کپڑے پہن کر مسجد کا رخ کیا جاتا اور عید کی نماز عموماً گیارہ بجے کے قریب پڑھی جاتی۔ چند نوجوان شہر میں صبح ہی کو عید پڑھ کر آ جاتے اور یہاں کی عید کی نماز میں بھی شامل ہو جاتے۔ عید پڑھنے سے پہلے امام مسجد اور حافظ قرآن کے لیے خصوصی چندہ جمع کیا جاتا۔ ایسا صرف سال میں ایک بار ہی ہوتا۔ فطرانے کی رقم بھی امام مسجد کے چندے میں شمار کی جاتی۔ امام مسجد نے اپنے مالی مفاد کی خاطر یہ کبھی نہ بتایا کہ فطرانہ کی رقم اسے دینا جائز نہیں ہے۔ عیدالضحیٰ کے دن بھی اسی وقت عید پڑھی جاتی جس کے بعد تمام دن ترجیحاً بڑے جانوروں کی قربانی کا سلسلہ چلتا رہتا۔ باہر سے قربانی کے جانور خریدنے کا رواج نہیں تھا۔ قربانی کی کھالوں کا پہلا حقدار امام مسجد کو قرار دیا جاتا۔ 1966 یا 67 کی ایک عیدالفطر بڑی مختلف تھی۔ چاند نظر نہ آنے کا اعلان ہو چکا تھا اور کئی لوگ سحری کھا کر روزہ بھی رکھ چکے تھے کہ ریڈیو کی سحری کی ٹرانسمشن میں بار بار یہ اعلان کیا گیا کہ عید کا چاند نظر آ گیا ہے اور کل بروز جمعرات عید ہو گی۔ پاکستان میں آدھے لوگ روزے سے تھے جنہوں نے اعلان سن لیا انہوں نے عید پڑھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایسا ملک کے صدر ایوب خاں کی ہدایت پر کیا گیا تھا کیوں کہ انہیں یہ مشورہ دیا گیا کہ جمعہ کی عید بھاری ہوتی ہے جو ان کی حکومت کے لیے نقصان دہ تھی۔

دیہاتی ثقافت میں میلے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ہر میلے کا تعلق کسی نہ کسی بزرگ کے سالانہ عرس سے ہوتا۔ ہمارے علاقے میں بھی ایک ایسا میلہ لگتا جس کی جڑیں ایک ڈیڑھ صدی سے زائد عرصے میں تھیں۔ ساہیوال سے 30 اور ہمارے گاؤں سے 23 کلومیٹر کے فاصلے پر عارف والہ سے 15 کلومیٹر پہلے کمیر نام کا ایک قصبہ ہے جہاں پاکپتن کے بابا فرید گنج شکر کے ایک مرید بابا عبدالکریم کے پیروکار قبلہ محمد پناہ ڈیڑھ صدی سے زائد عرصہ قبل مدفون ہوئے، ان کا عرس ہر سال دیسی مہینے چیت کی 18 اور جنوری کی 31 تاریخ کو شروع ہوتا ہے جو تین دن تک عروج پر رہتا ہے۔ پچھلے ستر سال کا ریکارڈ ہے کہ دیسی یا بکرمی مہینے چیت کی 18 کو عیسوی مہینے مارچ کی ہمیشہ 31 تاریخ ہی ہوتی ہے۔ بکرمی یا دیسی کیلنڈر عیسوی کی نسبت بہت کامیاب کیلنڈر ہے جس میں چار سال بعد کسی لیپ سال کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ میلہ مقامی یا باروں کے رہنے والے پرانے اور مقامی پنجابیوں کی تہذیبی، ثقافتی اور تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بن جاتا۔ ہمارے گاؤں کا کوئی ایسا فرد نہیں جس کی اس میلے پر جانے کی خواہش نہ ہوتی۔ بچپن میں ہم بچے اس میلے کا انتظار کرتے تھے۔ ہمارے گاؤں کے دو چار لوگ بھی یہاں دکانیں سجا لیتے۔ میں آخری بار 1972 میں یہ میلہ دیکھنے کے لیے گیا۔ ان تین دنوں میں جہاں میلوں کے تقاضوں کے مطابق تفریحی سرگرمیاں عروج پر ہوتی تھیں، جانوروں کی خرید وفروخت بھی اس میلے کا اہم پہلو تھا۔ پاک پتن علیحدہ ضلع بننے کے بعد ضلع ساہیوال کی حدود میں اس میلے کی نسبت سے 18 مارچ کو لوکل تعطیل ہوتی ہے۔ اگرچہ اب اس میلے کا وہ ثقافتی رنگ نہیں رہا مگر میرے بچپن میں عالم لوہار اور عنایت حسین بھٹی کے تھیٹر اس میلے کی جان ہوا کرتے تھے۔ بڑے میلے کے بعد جمعہ کا روز خواتین کے میلے کے لیے وقف ہوتا تھا جو صرف مزار پر حاضری اور روائتی قسم کی اشیا کی خریداری تک محدود تھا۔ اس علاقے کا ایک اور عرس جو کئی صدیوں سے نہایت عقیدت اور گرم جوشی سے منایا جاتا تھا وہ پاک پتن میں بابا فرید شکر گنج کا تھا۔ اس میں مرکزی کردار بہشتی دروازے کا رہا ہے۔ محرم میں انعقاد کی وجہ سے بڑے پیمانے پر ثقافتی سرگرمیاں دیکھنے میں نہیں آتیں۔ صدیوں میں پیوست عرس کے آغاز کی قدیم رسموں کے علاوہ قوالوں کی ٹولیاں ان دنوں ادھر کا رخ کرتی ہیں اور عارفانہ کلام سے سماں باندھ دیتی ہیں۔ پہلے ضلع ساہیوال اور اب ضلع پاک پتن میں اس عرس کی مقامی چھٹی کی جاتی ہے۔ میں کالج کے چاروں سال کے دوران مہینے میں کم از کم دو بار جمعہ کی نماز پاکپتن پڑھتا جس سے بہت روحانی ح سکون ملتا۔ بچپن کا ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔ کمالیہ سے ریلوے کے ذریعے ماموں کانجن کی جانب سب سے پہلا سٹیشن دریا بل آتا ہے مگر مقامی زبان میں اسے دریا مل کہتے تھے۔ اس سٹیشن سے آدھا کلومیٹر شمال کی جانب اسی نام کا گاؤں تھا جہاں طوطا چنڑ کے نام سے معروف میرے والد کے دوست رہتے تھے۔ ایک بار ہم تمام فیملی ان کے ہاں ان کی دعوت پر ان کے مہمان ہوئے۔ کمالیہ کے گھڑے بہت معروف تھے اور واپسی پر انہوں نے تحفے میں مٹی کے گھڑے دیے اور میرے لیے دو کبوتر بھی ساتھ کر دیے گئے۔ اب ایک مسئلہ آن پڑا، کسی نے کہا کہ کبوتروں کا گاڑی میں کرایہ لگے گا اور یوں پرندوں کو

ریلوے پر لے جانے کی اجازت نہیں اس لیے کبوتروں کو گھڑوں میں ڈال لیا جائے اور اوپر سے ڈھکنے رکھ دیے جائیں سو ایسا ہی کیا گیا۔ ریلوے سٹیشن کے قریب پہنچے تو کسی نے یاد دلایا کہ گھڑوں میں کبوتر تو دیکھو لہٰذا ڈھکنے اٹھا کر دیکھا گیا تو کبوتر مر چکے تھے، یہ واقعہ دیہاتی معصومیت یا سادہ لوحی کی بہترین مثال تھا۔ کمالیے کی جانب رجانے کے آس پاس ہماری برادری کے چند گاؤں ہیں۔ وہ راوی کے پار دوسری جانب کے کچے کے علاقے کے رہنے والے تھے، انہیں نہری نظام اور کالونی ایکٹ کی روشنی میں زمینیں وہاں ملیں۔ وہ ہماری جانب کو اور ہم ان کی جانب کو اختصار سے "پار" یعنی دریا کے پار کہتے تھے۔ ان چکوک میں بچپن ہی سے خوشی یا غمی کے موقعوں پر یا میل ملاقات کے لیے اکثر جانا آنا رہتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں سکول تب بنا جب میں گورنمنٹ ہائی سکول میں ساتویں کا سٹوڈنٹ تھا۔ سکول کے گراؤنڈ میں والی بال کھیلنے کا آغاز ہوا۔ والی بال کھیلنے کی روایت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتی گئی۔ قریب کے گاؤں اور کمالیے کے ساتھ برادری کے چکوک کے ساتھ بھی والی بال کے دوستانہ میچ ہونے لگے۔ اس روایت میں زیادہ دلچسپی اس وقت پیدا ہوئی جب اس میں ٹوکن کے طور پر کچھ رقم لگائی جانے لگی۔ یہ گیم آج بھی کھیلی جاتی ہے۔ بچپن کی ایک اور یاد تازہ ہے کہ گاؤں کی سڑکوں کو صاف اور تجاوزات سے پاک رکھنے کی نگرانی محکمہ بلدیات کرتا تھا۔ ہر چھ ماہ کے بعد محکمہ بلدیات کے نمائندے اچانک چھاپے کی صورت آتے رہتے۔ گندگی کی صورت میں جرمانہ کیا جاتا۔ چھاپے کی خبر پہلے ہی پہنچ جاتی تو تمام لوگ اپنے گھروں سے ملحقہ سڑکوں کی صفائی پر لگ جاتے۔ جانوروں کو آبادی کے علاقے میں باندھنا جرم کہلاتا تھا۔ گاؤں کی زیادہ تر زمینوں کی آبپاشی کے لیے جو کھالہ یا مائنر استعمال ہوتا تھا اس کا مقامی زبان میں لُنڈو" نام پڑ گیا۔ اسی نام سے ایک مائنر کمالیہ تارجانہ روڈ پر بھی موجود ہے اور اس کھالے کی پل پر بس سٹاپ کا نام کھالے کے نام پر ہے۔ ہمارے گاؤں کا یہ طویل ترین کھالہ گاؤں کی 80 فیصد زمینوں کو آبپاش کرتا تھا، یہ محض ایک پانی کا کھالہ نہیں تھا بل کہ زمینداروں کے لیے دل کی شریان یا آرٹری تھا۔ ہر مقررہ مدت کے بعد اس کی بھل صفائی کی جاتی تھی۔ آبپاشی کے لحاظ سے اس میں جن لوگوں کی زمینوں کو اس سے پانی لگایا جاتا، ان کا ایک ایک نمائندہ شامل ہوتا۔ جو لوگ غیر حاضر ہوتے ان کا کام موقع پر موجود لوگ کر دیتے مگر اس کے لیے غیر حاضر لوگوں کو جرمانہ کیا جاتا جو حاضر لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ 1967 کے دوران میرے دادا اور ان کے دو بھائیوں کی اولاد نے ٹیوب ویل لگانے کا فیصلہ کیا۔ زرعی بنک نے ٹیوب ویل کی کل لاگت کے برابر 12 ہزار روپے کا قرضہ منظور کیا۔ بور زرعی انجینئرنگ والوں نے کیا جس کی لاگت بنک نے براہ راست انہیں ادا کی البتہ لیبر ہم نے فراہم کی۔ بجلی کی مین لائن عارف والہ روڈ کے قریب واقع تھی جہاں سے آٹھ بجلی کے پول، تاروں اور ٹرانسفارمر کی تنصیب کی قیمت براہ راست واپڈا کے اکاؤنٹ میں منتقل کی گئی۔ موٹر اور بجلی کے آلات کا معاوضہ بھی دکاندار کو دیا گیا۔ زرعی بنک نے اس قرض کا کوئی پیسہ زمیندار کو نہیں دیا۔ اتنا بڑا کام صرف 12 ہزار میں مکمل ہو گیا۔ گاؤں میں ہماری ٹیوب ویل کا نمبر تیسرا تھا۔ اس سے

پہلے دو ٹیوب ویل دیگر زمینداروں کے تھے جس سے ان کے کھیتوں کو پانی دستیاب ہوتا تھا۔ فی گھنٹہ کے حساب سے پانی زمینداروں کو بیچا بھی جاتا تھا۔ ہم اپنے کھیتوں میں لگے ٹیوب ویل پر خوب نہاتے تھے۔

گاؤں کے معاشرتی اور زرعی ڈھانچے میں دو مواقع بہت اہم اور خوشی سے بھرپور ہوتے ہیں اور وہ ہیں جب فصلیں تیار ہونے کے بعد ان سے آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ اپریل اور مئی کے دوران گندم پک کر تیار ہو جاتی تھی تو اس کی کٹائی اور گہائی کی گہما گہمی شروع ہو جاتی اور آخر کار فصل اٹھانے کا وقت آ جاتا۔ اس دن ہم بچے بھی بہت خوش ہوتے کہ چند کلو گندم ہمیں بھی دی جاتی جس کو بیچ کر ہم خوب عیاشی کرتے۔ ایسی ہی صورت حال سردیوں کے دوران کپاس کی چنائی کے وقت بھی ہوتی۔ کھیتوں میں جانوروں کی دیکھ بھال اور انہیں سردی یا گرمی سے بچانے کے لیے باڑے موجود تھے جب کہ ملازمین کی رہائش کے لیے دو چار کمرے بھی تعمیر کیے جاتے جسے ڈیرہ یا ڈھاری کہا جاتا۔ ہمارے کھیتوں میں جامن اور شہتوت کے درخت تھے جن کا پھل خود توڑ کر کھانے کے لیے ہم خصوصی طور پر وہاں جاتے۔ گنے سے گڑ یا شکر نکالنے اور کپاس کی چنائی کے دنوں میں تو کئی دفعہ جانا ہوتا۔ کپاس کی چنائی کے دنوں کا واقعہ ہے جب میں ابھی سکول داخل نہیں کیا گیا تھا۔ گھر میں تو روک ٹوک تھی لیکن کھیتوں میں ہر کوئی مصروف ہوتا۔ ایسے ہی ایک دن میں کھیتوں میں موجود تھا جہاں میں نے چارہ کاٹنے والی مشین کے کمرے کا رخ کیا۔ میں نے اس کے چکر کو اس خیال سے گھمایا کہ اس کے بلیڈز سے چارے کے اس کے اندر موجود تنکے کٹ جائیں گے مگر وہ کٹنے کی بجائے جھک جاتے۔ میں نے بائیں ہاتھ سے ان تنکوں کو پکڑا اور دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہینڈل یا دستے کو چھوڑ دیا جس کے وزن سے بلیڈ گھوم گئے اور ایک بلیڈ میرے بائیں ہاتھ کی کلائی میں پیوست ہو گیا۔ اگر بلیڈ تیز ہوتا تو پورا ہاتھ کلائی سے علیحدہ ہو سکتا تھا۔ اب میں اپنی کلائی سے بہنے والا خون دیکھ کر رونے لگ گیا۔ والدین کو خبر ہوئی تو پریشان ہوئے اور خوب ''عزت افزائی'' کی۔ جلدی میں ہلدی گرم تیل میں ڈال کر کلائی پر پٹی باندھ دی گئی اور جب زخم مندمل ہوا تو کلائی پر ایک ڈیڑھ انچ کا نشان رہ گیا جو بعد میں میرا شناختی نشان بن گیا۔ جس کی عبارت کچھ یوں ہے: ''بائیں ہاتھ کی کلائی کی پشت پر کٹ کا نشان۔''

گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہونے سے پہلے کے نو سال کے دوران ہر سال 10 محرم کے دن تعزیہ دیکھنے جانا تو ایک معمول تھا۔ بعد میں ہائی سکول میں داخل ہونے اور سائیکل ملنے سے کسی بزرگ کے ساتھ جانے کی پابندی بھی ختم ہو گئی۔ ہمارے گاؤں کی خواتین سیاہ لباس میں ملبوس گاؤں کے خصوصی تانگوں پر رات دس بجے حیدری محلّہ دیپالپور بازار والے بڑے امام باڑے میں مرثیہ خوانی سننے جاتیں اور انہی تانگوں سے 12 بجے سے پہلے لوٹ آتیں۔ گاؤں میں چھوٹے بڑوں کے بالوں کی کٹائی گاؤں کے حجام ہی کرتے جس کا معاوضہ انہیں فصل پر ملا کرتا۔ میری والدہ میری بالوں کی کٹائی پاک پتن بازار میں چٹائی پر بیٹھے ہوئے کسی حجام سے کراتیں۔ میرے والد جب بھی شہر جاتے تو میں اپنے لیے اقبال کی مٹھائی کی فرمائش کرتا۔ میری

والدہ اپنی دوسہیلیوں کے ساتھ بچوں کے ہمراہ شہر جاتیں تو سوڑی گلی کا چکر ضرور لگتا۔اقبال مٹھائی ہاؤس کے ساتھ گولڈن ملک شیک اور آئس کریم کی شہر بھر میں معروف دکان تھی جہاں سے ملک شیک ضرور پیا جاتا، میں دودھ نہیں پی سکتا تھا اس لیے میں اس نعمت سے محروم رہتا۔میری ماں بہت اصرار کرتیں مگر میری طرف سے انکار ہی ہوتا۔کسی ایسے دن میرے جی میں آئی اور میں نے ضبط کر کے ملک شیک کا ایک گھونٹ پی لیا۔آم کا فلیور ایسا ذائقہ دار لگا کہ میں ماضی میں ملک شیک نہ پینے پر بہت پچھتایا۔پھر تو وہاں سے آئس کریم کھانا اور ملک شیک پینا معمول بن گیا۔عید کے دن میرے خالوزاد بیربل خان اور ان کے دوست گاؤں کا سپیشل تانگہ کر کے ساہیوال آتے اور مجھے بھی ساتھ لے لیتے۔تھوڑا بہت گھومنے کے بعد اسی دکان سے آئس کریم کھانا میرے لیے عید کی عیاشی ہوتا۔میری والدہ سوڑی گلی کی کسی دکان سے دیگر سامان کے ساتھ اپنے اور والد صاحب کے علاوہ میرے لیے بھی بنا کا برش اور ٹوتھ پیسٹ خریدتیں یوں گاؤں میں ہونے کے باوجود ہمارے گھر میں اکثر و بیشتر بنا کا ٹوتھ پیسٹ ہی استعمال ہوتا رہا۔والد صاحب جب آج کی اصطلاح میں " گروسری" کرنے آتے تو کبھی کبھار میری ضد پر مجھے بھی ساتھ لے لیتے۔مچھلی بازار میں فضل دین کریانہ سٹور کا تقریباً سارا گاؤں ہی گاہک تھا مگر میرے لیے یہ مرحلہ بہت کوفت والا ہوتا۔اس کی دکان پر رش لگا رہتا۔باری آنے پر وہ گاہک کے مطلوبہ سودے کی لسٹ تیار کرتا اور متعلقہ لڑکے کو تھما دیتا جو باری آنے پر سامان نکالتا،سامان کی ایک ایک چیز کو دیکھ کر بل بنایا جاتا اور قیمت کی ادائیگی کے بعد اسے گاہک کے سپرد کر دیا جاتا۔ یہ تمام مرحلہ میرے لیے سوہان روح ہوتا مگر اقبال کی مٹھائی کھانے کی امید میں یہ سب برداشت کر لیا جاتا۔ والد صاحب سامان اٹھاتے،شربت بازار میں گاؤں کی دکان پر رکھتے اور پھر اقبال مٹھائی ہاؤس کا رخ کرتے اور یوں شہر کی واحد اور حسب خواہش تفریح کا حصول ممکن ہو جاتا اور میں خوشی خوشی گھر واپس آتا۔

گاؤں میں مذہبی اقدار کا اپنا میکنزم ہوتا ہے۔سکول نہ ہونے سے خاصی دیر تک رسمی تعلیم کا کوئی رواج نہیں تھا۔چند لوگ ہی تھے جو غیر رسمی تعلیم سے شعور کے نسبتاً بہتر درجے پر تھے لیکن جہاں تک مذہبی علم اور رسوم کی بات ہے تو وہ اتنا ہی جانتے تھے جتنا امام مسجد نے انہیں مختلف اوقات میں بتایا تھا۔اس تمام علم کی جڑیں قدامت پرستی میں بہت گہری تھیں۔امام مسجد کی کوئی لگی بندھی تنخواہ نہیں تھی لہٰذا اس نے اپنے مفاد میں عید کی کھالوں اور فطرانہ کو اپنے اوپر حلال کر لیا تھا۔اس کے گزارے کے لیے ایک نظام موجود تھا وہ یہ کہ ہر گھر میں امام مسجد کی ایک اضافی روٹی پکتی تھی جسے "میاں جی کی روٹی" کہا جاتا تھا۔میاں جی سر شام ایک بالٹی ہاتھ میں پکڑتے،ایک چادر کو تھیلا بنا کر بائیں کندھے سے لٹکاتے اور دوسرے ہاتھ میں کتوں سے بچنے کے لیے لاٹھی لے لیتے اور ہر گھر جاتے جہاں انہیں ''میاں جی کی روٹی'' یا دودھ کا گلاس دے دیا جاتا۔میاں جی کی روٹی کو کھانا گناہ تصور کیا جاتا۔مرغی ذبح کرنا بھی میاں جی کا کام تھا۔اس مرغی کی سری، پوٹا اور کلیجی پر ان کا استحقاق تھا۔انہیں معاوضہ عیدوں کے علاوہ سال میں ایک بار گندم کی فصل اٹھنے پر ملتا۔اس معاوضے میں گاؤں میں

زرعی اور معاشرتی خدمات فراہم کرنے والے افراد بھی ہوتے۔ پرانے دور میں گندم کی کھیتوں سے زمیندار کے گھر تک کی حمل ونقل (Logistics) کمہار کے پاس ہوتی جس کے پاس گدھوں کی مناسب تعداد اور ڈبل بوریاں یعنی ''چھٹیاں'' ہوتیں۔ ہر زمیندار کی گندم اٹھنے کا شیڈیول بھی کمہار کے پاس ہوتا تھا اور باقی تمام لوگ اس سے رابطے میں ہوتے۔ گندم اٹھنے پر یہ تمام افراد اور امام مسجد وہاں جمع ہو جاتے اور خاص مقدار سے ان کو گندم دی جاتی۔ مقامی زبان میں اس کو "سیپی" کہتے ہیں جو دراصل ان کی خدمات کا سالانہ معاوضہ ہوتا تھا۔ امام مسجد بچوں کو قرآن بھی پڑھاتا تھا۔ جب کوئی بچہ قرآن ختم کر لیتا تو امام مسجد کو بچے کے والدین کی طرف سے ان کی مالی حیثیت کے مطابق کچھ تحفے تحائف بھی مل جاتے۔ جمعہ امام مسجد ہی پڑھاتا۔ اردو میں جو خطبہ دیتا وہ اس کی اپنی فہم اسلام کے مطابق ہی ہوتا اور وہی فہم نمازیوں کو منتقل ہوتی۔ گاؤں میں پیر یا مرشد کا بہت اعلی درجہ ہوتا ہے۔ جس کا پیر یا مرشد نہ ہو اس کو "بے مرشدا یا بے پیرا" کہا جاتا ہے جسے اس کی خامی تصور کیا جاتا ہے اور اس جذبے کے سامنے کوئی دلیل کارگر نہیں ہو سکتی۔ اپنی خواہش کے حصول یا مسئلے کے حل کے لیے پیروں سے دعائیں کرائی جاتی ہیں یا بزرگوں کے درباروں پر جا کر دعا کی جاتی ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کو پیران پیر سمجھا جاتا ہے اور ہر چاند کی گیارہویں کا دودھ غوث پاک کے ایصال ثواب کے لیے تقسیم کیا جاتا ہے۔ حصول مقصد کے لیے درباروں پر جانا اور وہاں نوراتیں (نوراتے) کاٹنے کا بھی رواج ہے۔ نوراتے کے لیے بوریوالہ کے قریب دیوان حاجی شیر کا دربار موزوں خیال کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی پیر گاؤں میں آجائے تو اس کی حد درجہ عزت وتکریم کی جاتی ہے اور اس کے بیٹھنے کے لیے رنگیلے پلنگ پر چادر اور نئے تکیے بچھا دیے جاتے۔ اگر کوئی آ کر خود کو پیر کے طور پر متعارف کرائے تو اس کے بارے میں تحقیق وتفتیش کو بہت برا خیال کیا جاتا ہے۔ ہمارے گاؤں میں مختلف افراد مختلف پیروں کے مرید ہیں جو اپنے مریدوں سے نذر ونیاز لینے کے لیے اپنے مریدوں کے پاس چکر لگاتے رہتے ہیں۔ جس کا پیر یا مرشد نہ ہو اس کے ایمان کو نامکمل خیال کیا جاتا ہے۔ کسی پیر سے گستاخی کو ناقابل معافی جرم اور بدشگونی تصور کیا جاتا ہے۔ چند برسوں سے ہمارے گاؤں میں بڑے پیمانے پر میلاد کی محفل منعقد کی جاتی ہے جس میں شناختی کارڈ کی فوٹوسٹیٹ کاپی جمع کر کے حج اور عمرے کی مفت ٹکٹوں کے لیے قرعہ اندازی کی جاتی ہے۔ اوپر بیان کیے گئے مذہبی یا عقیدتمندی کی اَقدار کے ڈھانچے کو جدید دور کا اطلاعاتی انقلاب بھی متاثر نہیں کر سکتا۔

گاؤں میں آگہی کم ہونے کی وجہ سے اتائیت نے بہت فروغ پایا۔ ساتھ والے گاؤں کے ایک عالم شیر نامی صاحب ڈاکٹر کہلاتے تھے۔ ان کے تھیلے میں بخار، درد کُش اور عام عارضوں کے سٹیرائیڈ سمیت متعدد انجیکشن اور شربت وگولیاں ہوتیں۔ اب جو شخص انسانی جسم کی ساخت (Anatomy) اور نظام ہی سے ناواقف تھا اسے ان دوائیوں کے اثرات کا بھی علم نہیں تھا اوپر سے دیہات میں ٹیکے کو بہت اہمیت دی جاتی ہے کہ اس سے مریض جلد شفایاب ہا جاتا ہے۔ مریض کے معائنے اور علاج کے لیے اسے بلایا جاتا تھا اور جو اس

کی سمجھ میں آ تا اس لحاظ سے وہ ٹیکے یا گولیاں دے دیتا چاہے اس دوا کے مضر اثرات سے مریض اور مرض کا بیڑا غرق کیوں نہ ہو جائے۔ ان کی دیکھا دیکھی کچھ دیگر میٹرک پاس پڑھے لکھے نوجوان بھی اس میدان میں کود پڑے۔ البتہ گاؤں کے ایک نوجوان محمد علی نے لاہور کے طبیہ کالج سے مستند حکیم کی سند حاصل کی۔ کسی اور گاؤں کے ایک نوجوان نے اس کی شاگردی اختیار کی جو خاصا تیز تھا۔ اس نوجوان نے ساہیوال سے متصل نوایل نہر پر واقع اڈے پر ایک میڈیکل سٹور کھول لیا اور دھڑلے سے لوگوں کا علاج کرنے لگ گیا۔ اس پر ہمارے گاؤں والوں کا ایسا رش پڑا کہ جس مریض کو دیکھو وہ اس "ڈاکٹر" یا اتائی کی ادویات کی دکان یا "مطب" کا رخ کر رہا ہے۔ مریض بھی بہت جلد شفایاب ہونے لگے اور اس کی دولت بھی مسلسل ترقی پذیر رہی۔ بعد میں اس کی ادویات کے مریضوں پر مضر اثرات کیا مرتب ہوئے اسے کون دیکھتا ہے۔ فوری طور پر تو مرض دب گیا اور مسئلہ حل ہو گیا۔ پاکستان میں ڈسپینسری کا کورس کر کے میڈیکل سٹور کھولنے والوں نے اتائیت کو فروغ دینے میں بنیادی کردار ادا کیا اور کیا شہر اور کیا گاؤں ہر جگہ ان کی بہتات ہو گئی۔ رحیم یار خان کے علاقے میاں والی قریشیاں میں ایک اتائی ڈسپینسر نے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے تنخواہ پر ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر رکھا ہوا تھا۔ میری اگر اس ڈاکٹر سے ملاقات نہ ہوتی اور اس نے خود تصدیق نہ کی ہوتی تو شاید میں اس بات پر اعتبار نہ کر پاتا۔

میرے والد محترم ایک کثیر الجہات شخص تھے۔ وہ اپنے دور کی پڑھی لکھی شخصیت تھے۔ انہوں نے سکول کی پانچ جماعتیں پڑھی تھیں مگر کون سے سکول سے، وہ پردہ اخفا میں ہے۔ ان کا طرز نگارش اتنا پختہ اور متاثر کن تھا کہ گمان ہوتا ہے کہ انہوں نے مڈل تک تعلیم ضرور حاصل کی ہو گی۔ میرے پاس ان کے وہ خطوط محفوظ ہیں جو انہوں نے میرے یونیورسٹی کے دور میں میرے نام لکھے۔ ان کے خطوط کا اسلوب ان کے دور میں خط لکھنے کی اقدار سے مکمل طور پر ہم آہنگ تھا۔ گاؤں کے لوگ مروجہ انداز میں ان سے جانوروں اور زرعی پیداوار کی خرید و فروخت کی رسیدیں لکھواتے تھے اور یہ کام رضا کارانہ ہوتا تھا۔ 1958 سے 1962 کے برسوں کا ایک روائتی "بہی کھاتا" محفوظ ہے جس میں ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی رسیدیں، میری رسم گل تراشی کی تقریب میں وصول ہونے والے تحائف اور وصول شدہ رقوم کی تفصیل دی گئی ہے اور اس میں کھیتوں میں کام کرنے والے نوکروں کا حساب کتاب بھی ملتا ہے۔ ان تحریروں میں انہوں نے عربی اور ہندی ہندسوں کا استعمال کیا ہے۔ وہ لباس کے لحاظ سے روایت پسند، نفیس اور خوش پوشاک تھے۔ تمام عمر چادر اور کرتہ استعمال کیا۔ کندھے یا سر پر ایک بڑا رومال استعمال کرتے تھے۔ جب کہیں باہر جاتے یا مجھے یونیورسٹی ملنے آتے تو مائع لگی روایتی پگڑی (پگ) سر پر ہوتی۔ دیسی جوتی کو ہمیشہ ترجیح دی۔ عمر کے آخری تیس سال جب مذہب اور نماز اور تہجد کی طرف مائل ہوئے تو سفید براق لباس زیب تن کرتے۔ پہلے سر پر رنگ وغیرہ لگاتے رہے لیکن جب داڑھی رکھی تو سر کے بال اور داڑھی کا رنگ سفید تھا۔ ان کا اپنا گورا رنگ اور سفید لباس انہیں بہت جچتا

تھا۔ان کی اپنی ایک کِٹ تھی جس میں ایک قینچی،نوز ٹیوزر،کنگی،نظر کی عینک اور کورو دیگر استعمال کی اشیا تھیں۔ تمام کِٹ ان کی یاد کے طور پر میرے پاس محفوظ ہے۔ اپنے اجلے لباس پر ایک چھینٹا بھی پڑ جاتا تو فوراً دھلاتے۔اردو کی کتب اور اخبارات کو روانی سے پڑھ لیتے۔انگریزی اخبارات کے کچھ آسان الفاظ بھی اٹھا لیتے تھے۔مذہبی کتب کی طرف زیادہ مائل تھے، میں جب پہلی مرتبہ 1967 میں لاہور گیا تو حفیظ جالندھری کا" شاہنامہ اسلام" فرمائش کر کے منگوایا۔ ہیر وارث شاہ ان کی انتہائی پسندیدہ کتاب تھی جس کے اشعار میں وہ متصوفانہ معنویت تلاش کرتے۔ ہیر وارث شاہ کو وہ عام رومانوی کتاب نہیں سمجھتے تھے۔ ہیر کی ڈولی میں رخصتی اور ڈولی اٹھانے والے چار کہاروں کو وہ دنیا سے روانگی سے تشبیہ دیتے تھے۔ رانجھے اور ہیر کے تعلق کو وہ روح اور بت کے باہمی تعلق سے تعبیر کرتے۔"ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں"پڑھتے اور سنتے وقت ان پر ایسی رقت طاری ہوتی کہ رونے لگ جاتے۔ہم اکثر ساؤنڈ سسٹم پر ان کو ہیر رانجھا فلم کی نور جہاں کی گائی ہوئی ہیر سناتے تو وہ ہر دفعہ رو پڑتے۔اگر وہ غصے میں ہوتے تو ان کے موڈ کو ملائم کرنے کے لیے ہم انہیں ہیر سنا دیتے اور وہ غصہ بھول جاتے۔ان کی چند کتب کی وراثت میں ہیر وارث شاہ، حفیظ جالندھری کا شاہنامہ اسلام، حضرت علی ہجویری المعروف داتا صاحب کی" کشف المحجوب" بھی شامل تھیں۔ایک اور پنجابی کتاب تھی جس میں بارہ دیسی مہینوں کے حوالے سے ہر مہینے کا احوال منظوم انداز میں بیان کیا گیا ہے، شاید یہ صنف سخن"بارہ ماسے" کہلاتی ہے۔زبان و بیان کے لحاظ سے بات کو مکمل کرنے اور سننے کے قائل تھے۔ مجھے ہدایت کیا کرتے کہ کوئی چیز خریدنے سے پہلے تین دکانوں سے نرخ لینے چاہئیں بل کہ اس کو کسی حدیث سے منسوب کرتے تھے۔دکاندار کے بتائے ہوئے نرخ پر چیز فوراً نہیں خرید لیتے تھے بل کہ یہ اپنے نرخ سے آغاز کرتے اور دکاندار اپنی بتائی ہوئی قیمت سے نیچے آنا شروع کرتے، درمیان کے کسی نرخ پر چیز کی قیمت طے ہوتی۔

کھیتوں کی دیکھ بھال اور دنیاوی امور کے علاوہ ان کی زندگی کا بہت بڑا نصب العین مجھے تعلیم سے آراستہ کرنا اور بہتر مقام پر دیکھنا تھا۔ میں ان کی اکلوتی اولاد تھا مگر اس نصب العین کے حصول میں مطلوبہ معیار کی کوششوں پر کوئی سمجھوتا کرنے کے قائل نہیں تھے۔ پیار، محبت اور لاڈ کی باری اس کے بعد آتی تھی۔ میرے ساتھ ان کی محبت ایک لازوال حیثیت کی حامل تھی اور میری بیماری یا تکلیف پر بہت مضطرب ہو جاتے تھے۔ انہیں اگر میں مصور قرار دوں تو میں ان کی وہ تصویر تھا جس میں انہیں اپنے خوابوں اور خواہشوں کے رنگ بھرنے کا جنون تھا۔ ہمارے گاؤں میں ایک روایت شروع ہوگئی تھی کہ وہ لوگ جو تھوڑی بہت انگریزی جانتے تھے یا عمومی معلومات کا ادراک رکھتے تھے ان کی محفل میں اگر کوئی طالب علم بیٹھتا تو اس سے وہ مختلف سوال پوچھتے تھے یا اردو سے انگریزی ترجمے کا سوال پوچھ لیتے۔اس محفل میں میرے والد ہوتے اور میں اگر کسی سوال کا صحیح جواب دے دیتا تو وہ موقع پر ہی ایک روپیہ انعام کا اعلان کرتے۔اسی طرح جب میں نے پرائمری پاس کر لی تو ان کی خوشی دیدنی تھی۔ جب میں نے گورنمنٹ ہائی سکول ساہیوال کا داخلہ ٹیسٹ پاس کر لیا تو میرے

ماتھے پر فرطِ مسرت سے بوسہ دیا جسے میں اپنی کامیابی کا نقیب اور طاقت تصور کرتا ہوں۔ وہ مجھے کہا کرتے کہ میری یہ شدید خواہش ہے کہ میں تمہیں پینٹ، کوٹ اور ٹائی میں دیکھوں۔ مجھے آٹھویں کلاس ہی میں کوٹ اور پینٹ سلوا کر دی۔ سال اول میں یونیفارم میں یہ گنجائش تھی کہ بلیزر اور پینٹ کے ساتھ ٹائی بھی لگائی جا سکتی تھی کچھ اچھا پہننے کی میری بھی خواہش تھی۔ بی اے اور ایم اے میں مختلف اوقات میں مجھے گرم سوٹ لے کر دیتے رہے۔ میں انٹر، بی اے اور ایم اے میں پاس ہوتا گیا اور ان کی خوشیاں بٹورتا رہا۔ لیکچرر کا نصب العین حاصل کیا تو پھولا نہیں سماتے تھے اور بتاتے پھرتے تھے کہ میرے بیٹے نے از خود اپنی قابلیت کی بنیاد پر ستارہویں گریڈ کی ملازمت حاصل کر لی ہے اور یوں اس مصور کی تصویر مکمل ہو چکی تھی۔ میرے پاس رحیم یار خان آ گئے اور تادمِ آخر اپنی اس تصویر کو سامنے رکھا۔

میں جب ان کی زندگی کے مختلف مراحل اور ان کی شخصیت کو دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ساہیوال سے سات کلو میٹر دور عارف والہ روڈ پر واقع چک نمبر 101 /9-ایل کے ایک متوسط درجے کے زمیندار نے اپنی اکلوتی اولاد کے لیے اپنی شخصیت کے جلال و جمال پر مبنی دو بڑے اوصاف کو کس دانشمندی اور توازن سے استعمال کیا اور اپنے خواب کی تعبیر پا لی۔ میں یونیورسٹی میں تھا تو ایک دفعہ مجھے بتانے لگے کہ کس طرح گاؤں کے ایک ایسے شخص نے کہ جس کا اکلوتا بیٹا تھا انہیں اس بات پر سخت سست کہا تھا اور کچھ اس مفہوم کی بات کی کہ "تم عجیب آدمی ہو کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو دو جماعتیں پڑھانے کے لیے خود سے دور کر رکھا ہے، لگتا ہے تمہارا ذہنی توازن درست نہیں" پھر فخر سے سر بلند کر کے اس کو دیا ہوا جواب بھی سناتے۔ "میں نے اپنے بیٹے کی کامیابی کا جو خواب دیکھا ہے اس کے لیے یہ جدائی کچھ بھی نہیں۔ کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ اس جدائی کے بدلے بیٹے کی کامیابی کا جو پھل مجھے ملے گا تم اس کا سوچ ہی نہیں سکتے۔" جسمانی لحاظ سے وہ خوبصورت قد کاٹھ کے حامل ایک وجیہہ شخص تھے۔ داستان طرازی کے فن سے خوب واقف تھے اور انہیں علامہ اقبال سمیت مختلف شعرا کے بیسیوں اشعار زبانی یاد تھے جنہیں وہ موقع و محل کی مناسبت سے پڑھتے۔۔ گھر آنے والے میرے متعدد دوستوں کے ساتھ ان کی بہت بنتی اور وہ ان سے اپنے اوریجنل مقامی لہجے میں بڑے مزے کی گپ شپ لگاتے۔ دوست اکثر مجھ سے ابا جی کا حال بھی دریافت کرتے۔ انہیں ایک بار ہونے والے شٹیکا کے درد کے علاوہ کوئی جسمانی عارضہ لاحق نہیں تھا اور کچھ عرصے کے بعد ٹھیک ہو گئے تھے لیکن 1990 میں انہیں بڑھے ہوئے پراسٹیٹ نے گھیر لیا۔ اس وقت اس کی صرف اوپن سرجری ہوتی تھی۔ انہیں بہت کہا مگر وہ اس کے لیے تیار نا ہو سکے۔ دوستوں سے بھی کہلوایا مگر ان کی ایک ہی جواز تھا کہ میری نماز رک جائے گی اور میں بڑے آپریشن کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ آہستہ آہستہ مرض اپنی جڑیں پکڑتا گیا۔ ملتان میں ایک نئے کھلنے والے الشفا نامی ہسپتال میں معروف یورالوجسٹ ڈاکٹر حنیف عارف پیشاب کی نالی کے ذریعے آپریشن (TUR) پروسیجر لے کر آئے۔ اگست 1992 کے دوران وہاں سے بہاول پور میں ڈاکٹر

مصطفیٰ رضا کاظمی کے ذریعے پروسیجر کرایا جو بظاہر کامیاب رہا۔ وہ میرے دوستوں کو اپنے بے ہوش کیے جانے اور ہوش میں آنے کے قصے خوب سنایا کرتے۔ اس پروسیجر کا مسئلہ یہ ہے کہ پراسٹیٹ پھر سے اپنا سائز بڑھالیتا ہے۔ یہی مشکل والد صاحب کو بھی پیش آئی۔ وہ اس دوران ساہیوال چلے گئے واپس آئے تو مرض لا علاج ہو گیا تھا اور پانی کی کمی کی وجہ سے نیم بیہوشی (Disorientation) کا شکار ہو گئے۔" انہیں فوراً ہسپتال منتقل کیا۔ اپنے وقت کی توانا، چاک و چوبند اور بھرپور شخصیت کے منہ سے نیم بے ہوشی میں آخری یہ الفاظ نکلے،" یار! اب میں چلا جاؤں تو بہتر ہے''۔ ہسپتال میں وہ نیم بیہوشی میں بہت جارحانہ انداز میں ڈرپ کی سوئی نکال دیتے تھے، ڈاکٹر نے ان کو خواب آور انجیکشن لگا دیا پھر بھی وہ جسمانی طور پر احتجاج کرتے رہے حتیٰ کہ ان کے بازوؤں کو بیڈ کی گرل سے باندھ دیا گیا۔ میرے سامنے اب وہ بے بس پڑے تھے۔ انجکشن اور ڈرپس لگتی رہیں، ڈاکٹر پر ڈاکٹر آتے رہے مگر وہ پھر ہوش میں نہ آ سکے اور آخر بروز جمعہ 28 جولائی 1995 بوقت تہجد انہوں نے آخری ہچکی لی۔ اپنی زندگی میں وہ اکثر مجھے کہا کرتے تھے کہ " نسیم یار، مجھے کچھ ہو گیا تو مجھے ریتوں میں نہ دبا دینا، مجھے میرے اصل وطن چک نمبر 101 / 9-ایل ساہیوال لے جانا، میں اب جواب کیا دیتا، میں اکثر خاموش ہو جایا کرتا، اور آج ان سے دل ہی دل میں کیے ہوئے وعدے کو ایفا کرنے کا وقت آ پہنچا تھا۔ اسی روز بعد از نماز جمعہ ان کا جنازہ گاؤں کی اسی مسجد میں پڑھایا گیا جہاں وہ باقاعدگی سے نماز پڑھا کرتے تھے اور چار بجے تک انہیں الوداع کہہ دیا۔ آخری دیدار کرنے والوں کی اکثریت نے کہا کہ " تیس سال سے بھی زیادہ عرصے کے اس تہجد گزار کے چہرے پر کیا خوب نور آیا ہوا ہے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے اور ان کا رتبہ بلند فرمائے۔"

میری والدہ گاؤں کی ایک معصوم، سادہ دل اور بہترین جمالیاتی اور تخلیقی ذوق کی مالک تھیں۔ ان کی شادی تقسیم ہند سے چند ماہ قبل ہوئی تھی۔ وہ مجھے بتایا کرتیں کہ 1947 کی شورش کے باعث کچھ ماہ وہ لوگ گاؤں سے اپنے کھیتوں میں منتقل ہو گئے۔ مجھ سے پہلے ان کی ایک نرینہ اولاد ہوئی مگر وہ جانبر نہ ہو سکی۔ میں ان کی شادی کے سات سال بعد تولد ہوا مگر صحت کے لحاظ سے کوئی قابل رشک نہیں تھا۔ کسی حکیم نے بتایا کہ اسے گرائپ واٹر پلاؤ۔ بقول ان کے میں نے دودھ کم اور گرائپ واٹر زیادہ پیا ہو گا۔ پنجاب کے مقامی قبائل کی بڑی عمر کی عورتیں اور تمام مرد پہناوے میں تہبند کا استعمال کرتے تھے۔ نوجوانوں میں البتہ شلوار کا رجحان فروغ پذیر تھا۔ میں کچھ بڑا ہوا تو وہ ساہیوال شہر جاتیں تو کبھی کبھار مجھے بھی ساتھ لے جاتیں۔ اس وقت شہر جانا عید سے کم نہیں ہوتا تھا۔ کھلونوں سے زیادہ دلچسپی اقبال کی مٹھائی کھانے اور اس کے ساتھ واقع گولڈن ملک شیک کی آئس کریم یا ملک شیک پینے میں ہوتی تھی۔ جب میں نو سال کا تھا تو میرا ایک بھائی بھی اس دنیا میں آیا مگر وہ گاؤں میں شعور اور آگہی کی کمی کا شکار ہو گیا۔ وہ ایسے کہ موسم شدید سردیوں کا تھا۔ والد صاحب نے ایک بوری کوئلوں کی منگوالی۔ جب تک وہ جاگتے رہے، پہلے کوئلوں کی انگیٹھی کو باہر سرخ ہونے دیتے اور پھر

اندر رکھواتے۔ نومولود کسی تکلیف کے باعث رو رہا تھا۔ میری چچی اور دادی امی کے کمرے میں تھیں۔ چچی جیسے ہی جاگتیں، کوئلے انگیٹھی میں ڈال دیتیں۔ صبح کو بچے نے رونا بند کر دیا مگر ادھر کسی کا دھیان نہ گیا، تاہم چچی اور دادی نیم بے ہوش تھیں۔ کسی نے کہا بچے کو دیکھو! بچے کی آواز ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھی۔ والدہ البتہ خیریت سے تھیں کیوں کہ انہوں نے نیند میں سر رضائی سے باہر نہیں نکالا تھا۔ والدہ مجھے بتایا کرتی تھیں کہ "جوڑی ٹوٹنے پر" میں آنسوؤں سے رویا تھا اور یوں میں اکلوتا ہی رہ گیا۔ وہ سلائی مشین پر اپنے، ابا جی اور میرے کپڑے خود سی لیتیں۔ ناظرہ قرآن پڑھی ہوئی تھی اس لیے پنجابی منظوم قصوں کے اشعار خوب پڑھ لیتیں۔ گاؤں میں ایک پٹھان پنجابی قصوں کی کتب اور قرآن مجید ایک گانٹھ میں باندھ کے سال میں ایک بار آتا تھا جو اگلے سال قیمت کی وصولی کے وعدے پر کتب بیچتا تھا۔ والدہ نے یوسف زلیخا۔ ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال کے منظوم قصے اسی سے خرید رکھے تھے۔ میری دلچسپی قران مجید کی نئی کاپی میں ہوتی تھی۔ والدہ نے میرے اور والد صاحب کے لیے چھوٹے سائز کے قران کی جلدوں پر کمال مہارت سے کپڑا چڑھا دیا تھا اور پھر اس کا غلاف بھی سی دیا تھا۔ ان کا اپنا قرآن بڑے یا جہازی سائز کا تھا۔ رمضان المبارک کے مہینے میں میری چچی بھی قران پڑھتی تھیں مگر امام مسجد کی ہدایت کے مطابق وہ قرآن کے سطور پر انگلی پھیرتی جاتیں اور ہر ایک سطر پر "بسم اللہ الرحمان الرحیم" پڑھتی جاتیں اور قرآن ختم کر لیتیں مگر میری والدہ قرآن ناظرہ کے ہر لفظ کو صحت سے پڑھتیں البتہ شین قاف کے فرق کا انہیں علم نہیں تھا۔

پاکستان بننے کے بعد تک ہمارے گاؤں کے اکثر گھر کچے تھے۔ آہستہ آہستہ جیسے لوگ مالی طور پر آسودہ ہوتے گئے اپنے گھروں کو بھی پختہ کرتے گئے۔ میری یاداشت میں اپنے کچے گھر کی کوئی یاد محفوظ نہیں البتہ 1956 کے قریب نئے اور پختہ گھر بننے کے منظر میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ ہمارے گھر میں کل چار کمرے تھے۔ ایک بیٹھک تھی جو باہر کو بھی کھلتی تھی۔ گھر کی مکمل چار دیواری کا ابھی رواج نہیں پڑا تھا البتہ صرف فرنٹ پر دو اڑھائی فٹ کی دیوار بنالی جاتی۔ باقی تین کمروں میں دو کے نام چھوٹا صُفہ اور بڑا صُفہ تھے جس میں بڑا صُفہ صرف سونے اور چھوٹا صُفہ سونے اور باورچی خانے کا کام دیتا تھا۔ ایک بڑا کمرہ "وڈا کوٹھا" کہلاتا تھا جس کے دو جانب صندوق اور متعلقہ سامان بڑی ترتیب سے لگایا گیا تھا۔ اس کا فرش چپس کا تھا۔ فرنٹ کی لمبی دیوار پر دو ریک (مقامی زبان میں سفیل) بنے ہوئے تھے۔ نیچے والے چھوٹے ریک پر کانچ کے برتن اور اوپر والے بڑے ریک پر دھات کے برتن سجائے گئے تھے۔ فرش پر رنگلے پلنگوں کو سجایا گیا تھا جن کے پایوں کے نیچے دو دو رنگین اینٹیں بھی رکھ دی گئیں تھیں۔ یہ بڑا کوٹھا اسی ترتیب سے ہر کھاتے پیتے گھر میں ہوتا تھا جسے خاص اہمیت حاصل تھی۔ میری والدہ گھر اور اس کی اشیا کو بڑے مرتب انداز میں رکھتیں۔ بڑے کوٹھے کی ترتیب و آرائش میں ان کو خاص مہارت حاصل تھی۔ ان کی سہیلیاں اپنے ایسے کمروں کی ترتیب میں ان سے رہنمائی اور مدد کی طالب ہوتیں۔ چوں کہ میرے دوست شہر سے آتے رہتے تھے اس لیے چائے کے ساتھ جو

میٹھی ڈش تیار کرتیں وہ ان کی اپنی ایک منفرد "ترکیب" تھی۔ وہ پہلے گھی اور چینی سے شیرہ بنا لیتیں، گندم کا باریک چھنا ہوا آٹا ڈال کر خوب بھونتیں اور پانی کے چھینٹوں سے اسے نرم کر لیتیں۔ میوے ڈال کر پلیٹوں میں ڈال لیتیں۔ مقامی زبان میں اس کو "پھلجیرہ" کہتے ہیں۔ انڈوں کا میٹھا حلوہ الگ سے تیار کر کے پھلجیرے کی پلیٹوں پر اس کی ایک تہہ بٹھا لیتیں۔ مہمان انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔ میں چوں کہ ان کی اکلوتی اولاد تھا اس لیے مجھے وہ اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک کہا کرتیں مگر پڑھائی کے حوالے سے وہ کسی سمجھوتے کی قائل نہیں تھیں۔ میں بھی ان کو دھوکہ دینے سے باز نہیں آتا تھا، ان سے ذرا فاصلے پر بیٹھ کر میں کورس کی کتاب کھول کر اس پر کوئی دلچسپی کا حامل رسالہ رکھ کر کوئی کہانی پڑھنا شروع کر دیتا حتٰی کہ وہ کہتیں، بہت پڑھ لیا اب ذرا کھیل لو یا آرام کر لو۔ والد صاحب سے کہتیں کہ آپ کے ڈر کی وجہ سے بیچارہ بہت پڑھتا ہے، دماغ کھپاتا ہے کہیں اس کی صحت خراب نہ ہو جائے۔ میں اپنی کامیاب استادی پر خوش ہوتا۔ میں جب یونیورسٹی میں تھا تو میرے جانے پر بہت اداس ہوتیں اور میری آمد پر مجھے چومتی جاتیں۔ میں جب کالج سے واپس گھر دیر سے جاتا تو مجھے کہتیں، تم بلا وجہ دیر نہ کیا کرو، میں تمہارے گھر آنے تک بہت بے چین اور پریشان رہتی ہوں اور تمہاری بخیریت واپسی کی دعائیں مانگتی رہتی ہوں۔ انہوں نے میرے اوپر ایک تجربہ کیا۔ سکول جانے کی تیاری کے وقت وہ لکس صابن کی ہاتھوں پر جھاگ بنا کر میرے چہرے پر لگاتیں اور تولیے سے اس جھاگ کو صاف کر لیتیں یوں میرے چہرے پر ایک طرح کی سن سکرین بن جاتی مگر میرے لیے ایک پرابلم پیدا ہو جاتا وہ یہ کہ سکول میں صبح کی اسمبلی میں کھڑے ہوئے جب پسینہ آتا تو صابن میری آنکھوں میں چلا جاتا جس سے آنکھوں سے پانی بہنے لگتا مگر میں نے کبھی انہیں منع نہیں کیا کیوں کہ اس سے میرا چہرہ مٹی اور دھوپ سے محفوظ رہتا۔ میں نے بھی سکول تک اپنی یہ عادت بنا لی اور جب شیو کرنے لگا تو اس کے بعد میں چہرے پر وینیشنگ کریم لگا لیتا جس سے اسی طرح کا سن سکرین بن جاتا۔ ان میں خود کو تبدیل کرنے کی صلاحیت تھی۔ جب میں نے والدین کو رحیم یار خان بلا لیا تو میری والدہ نے بخوشی تہبند کی بجائے شلوار کا استعمال شروع کر دیا۔ ان کی پیروی میں گاؤں کی بہت سی خواتین نے ان کی روش کو اختیار کیا۔ وہ اٹھارہ سال میرے ساتھ رہیں۔ جب میرے والد کا بہاول پور میں انتقال ہوا تو وہ مجھ سے بہت دکھ کے ساتھ کہا کرتیں کہ میرا بیٹا اکیلا پڑ گیا۔ جب میں، میری بیوی اپنے اداروں اور بچے سکولوں میں چلے جاتے تو گھر میں کام کرنے والی مائی بتاتی کہ آپ لوگوں کے جانے کے بعد بہت روتی ہیں مگر ہمارے سامنے بہت صابر و شاکر نظر آتیں۔ دو دہائی سے زیادہ عرصہ دل، دمے اور گھٹنوں کے درد میں مبتلا رہیں۔ اس ضمن میں رحیم یار خان اور بہاول پور میرے ڈاکٹروں کے بہت چکر لگتے رہے، وہ دوائیاں باقاعدگی سے لیتی رہیں مگر ابا جی کی رحلت کے دکھ نے انہیں نحیف کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنی عدت مکمل ہونے کے کے فوری بعد 8 دسمبر 1995 کو داعی اجل کو لبیک کہا اور مجھے مکمل طور پر "یتیم" کر گئیں۔

میری شریک حیات نجمہ نسیم بنیادی طور پر سہارن پور کے اردو لہجے کی مالک اردو کی اہل زبان ہیں۔

سہارن پور کا میں نے اس لیے حوالہ دیا کہ یو پی کے اس شہر کی حدود پنجاب سے ملتی ہیں اس لیے یہاں پر اردو زبان کا وہی لہجہ ہے جسے نارمل کہنا چاہیے کیوں کہ جیسے جیسے یو پی کے طرف چلتے جائیں گے اردو کا لہجہ بھی تبدیل ہوتا جائے گا۔ ان کے اردو سپیکنگ ہونے اور میرے والدین کے پنجاب کے قدیم پنجابی لہجے سے ہمارے گھر میں کسی قسم کا گنگا جمنی ماحول کبھی نہیں بن سکا۔ ان کی بڑی بہن کی شادی پنجاب کے ارائیں خاندان میں ہوئی تھی اور اس لیے وہ پنجاب کی تہذیب و ثقافت میں آسانی سے رچ بس گئی تھیں۔ میرے ہم زلف جناب محمد حسین چودھری کی دو بیٹیوں کی شادی میرے والد کے ایک بلوچ دوست احمد علی خان کے بیٹوں سے جب کہ ایک کی شادی ارائیں خاندان میں ہوئی۔ میرے والد بہت اچھی اردو بول لیتے تھے اور میری بیوی پنجابی اور سرائیکی کے تمام لہجوں کو سمجھ لیتی ہیں اس لیے کوئی نمایاں قسم کا تہذیبی بُعد پیدا نہیں ہوا۔ میں چوں کہ اکلوتا تھا اس لیے سرکاری ملازمت ملنے کے بعد میرے والدین نے مجھ پر شادی کے لیے دباؤ ڈالا۔ گاؤں میں شادی کرنا میری ترجیح میں شامل نہیں تھا اور پڑھ لکھ کر خاندان سے باہر شادی کرنے والا میں تقریباً پہلا شخص تھا اس لیے مجھے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کے کرنا تھا۔ اگر کسی وجہ سے میری شادی ناکام ہو جاتی تو گاؤں اور برادری کو ہنسی مذاق اور ٹھٹھہ اڑانے کا شاندار موقع ملنا تھا۔ میرے والدین نے میرے ساتھ رہنا تھا اور اگر کسی وجہ سے ان کی ایڈجسٹمنٹ نہ ہو سکتی تو بھی ایک مضحکہ خیز صورت حال میرے انتظار میں ہوتی۔ ساہیوال میں میرے والد کے عبداللہ نامی ایک دوست تھے جن کی دیپالپور بازار ساہیوال میں بٹالہ زرعی آلات کے نام سے ایک دکان تھی۔ زرعی آلات کے باعث ان کا زیادہ تر تعلق ساہیوال کے زمینداروں سے تھا۔ باماں بالا تحصیل اوکاڑہ کے محمد اجمل لشاری (سابق ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول ساہیوال اور ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر بہاولنگر) کو اپنی ایک قریبی عزیزہ کے لیے بلوچ رشتے کی تلاش تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے جناب عبداللہ سے رابطہ کر رکھا تھا جنہوں نے میرا نام تجویز کیا حالانکہ میں ابھی یونیورسٹی میں ایم اے فائنل کا طالب علم تھا۔ لشاری صاحب دو دفعہ مجھے ہوسٹل میں ملنے کے لیے آ چکے تھے۔ جب میں لیکچرر سلیکٹ ہوا تو وہ بہاولنگر میں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر تھے۔ انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور مجھے بہاولنگر آنے کی پرزور دعوت دی۔ میرے خالہ زاد جناب بیربل خاں میرے ساتھ تھے۔ صبح وہ مجھے لے کر ایک لمبی سیر کو نکل گئے اور اس دوران انہوں نے میری سرکاری ملازمت پر خوشی اور میرے کردار پر اطمینان کا اظہار کیا۔ انہوں نے رشتے کو یوں مشروط کرنا چاہا کہ انہیں کوئی ضمانت درکار ہو گی۔ جواباً میں نے عرض کیا کہ اول تو خاندان کے ذریعے رشتے کو دیکھنے اور ہاں ناں کرنے کے مراحل ابھی باقی ہیں اور میرے والدین کی منظوری کے بعد ہاں ہو بھی گئی تو میری ضمانت میرا کردار اور تعلیم ہے۔ یہ میری ان کی دعوت پر ہونے والی آخری ملاقات تھی۔ یہاں ایک بہت دلچسپ صورت حال کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ نجانے میری ملازمت (1979) کی خبر شہر کی دو تین وچولنوں کو کیسے ہو گئی کہ وہ بھی گاؤں کے ایک ملازم نوجوان کے لیے رشتے تجویز کرنے لگیں۔ مجھے اس سارے معاملے

سے الجھن ہونے لگی۔ میرے لیے خاندان سے باہر شادی کرنا ایک آزمائش سے کم نہ تھا اور میں اس سلسلے میں انتہائی محتاط تھا جب کہ اکلوتا ہونے کی وجہ سے والدین میری جلد شادی کے خواہاں تھے۔ جب میں نے خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان جوائن کر لیا اور ساہیوال کے منظر نامے سے غائب ہوا تو یہ سلسلہ کچھ کمزور پڑا۔ والد صاحب کے دوست زرعی آلات والے جناب عبداللہ جن کا میں نے ذکر کیا ہے، چپ کر کے بیٹھنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے میرے والد سے رحیم یار خان میں مقیم اپنے عزیز اور دوست چودھری محمد حسین کا ذکر کیا اور ایک رشتہ تجویز کیا۔ میرے والد اور خالہ زاد بیربل خان دو بار رحیم یار خان کا چکر لگا کے گئے اور چودھری صاحب کو ہاں بول کر گئے۔ میں نے اپنی شادی کے لیے جو شرط رکھی وہ یہ تھی کہ اسلامی احکام کے عین مطابق انتہائی سادگی سے صرف نکاح مسنونہ کی تقریب ہو گی جس میں دونوں اطراف سے قریبی لوگ ہی شرکت کریں گے اور کسی قسم کے جہیز کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ میرے اس فیصلے کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ میری ملازمت کو ایک سال مکمل ہونے کو تھا اور میں ابھی کوئی معقول بچت نہیں کر پایا تھا۔ کھیتوں کی آمدنی گھوڑی پال مربعے کے مقدمے میں صرف ہوتی رہی جب کہ مربعے کا کیس بھی ہار چکے تھے حتیٰ کہ کافی حد تک زیر بار بھی تھے اور میں مزید زیر بار ہونے سے بچنا چاہتا تھا اور میرا یہ فیصلہ حقیقت پسندی پر بھی مبنی تھا مگر میرے والد نے یہ تجویز رد کر دی اور کہا کہ ہمارا ایک ہی بیٹا ہے، ہم نے اپنی رسوم ضرور ادا کرنی ہیں۔ میں نے کہا کہ اسلامی ہدایات اور روایات کے علاوہ کونسی رسوم باقی رہ جاتی ہیں یوں شادی میں تاخیر ہو گئی اور آخر میرے والدین کو میری ضد پر صاد کہنا پڑا۔ 25 دسمبر 1979 کو شادی کے بعد میں نے اور نجمہ نسیم نے کوئی لمبے چوڑے وعدے نہیں کیے۔ ان کا بھائی اور والد فوت ہو چکے تھے اور والدہ آئندہ ایک ماہ میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ میں نے والدین کو اپنے پاس بلا لیا اور یوں چار افراد کا کنبہ خوشی اور امن و آشتی سے ایک مختصر خاندان کی صورت اکٹھا رہنے لگ گیا۔ ہم دونوں پڑھے لکھے تھے۔ ازدواجی معاملات میں بہترین تفہیم اور بزرگوں کی عزت و تکریم کے یکساں قائل تھے۔ میرے گاؤں سے اگر کوئی آ جاتا تو ان کی خدمت اور عزت میں کوئی کمی نہ آنے دیتے جس سے وہ ہمارے گھر کا ایک اچھا اور خوشگوار تاثر لے کر جاتا اور گاؤں والوں کے سامنے بھی توصیف کی صورت پیش کرتا کہ "بہو تو قطب علی خاں کی ہے، ان کا گھر تو امن و آشتی کا مرکز ہے"۔ والد صاحب بھی جب گاؤں جاتے تو یہ بھی وہاں ہمارے لیے تعریفی کلمات بیان کرتے۔ یوں ازدواجی زندگی کا ایک بڑا نصب العین حاصل ہو چکا تھا۔ نجمہ نسیم جب سکول میں تدریسی و انتظامی ڈیوٹی سے واپس آتیں تو ایک گھریلو عورت کا روپ دھار لیتیں۔ گھر میں کھانا پکانے کے امور کی وہی ذمہ دار تھیں۔ ہم نے یہ طے کر رکھا تھا کہ اپنی ازداجی زندگی کو وفاداری، باہمی محبت و احترام اور سرکاری فرائض کو انتہائی ایمانداری سے ادا کرنا ہے اور اپنے بچوں کو حلال کا لقمہ کھلانا ہے۔ ہم نے باہمی اختلاف میں بھی ایک دوسرے کو توہین کی کثافت سے بچائے رکھا اور مکالمے اور دلیل کی راہ اختیار کی۔ زندگی ہم دونوں کے لیے ایک طویل جدوجہد کا نام تھی۔ شادی کے فوری بعد سوئی سے

لے کرا ے سی تک ہم نے اپنے گھر کی تمام ضروری اشیا کی فہرست بنائی جس کا اندراج ایک ڈائری میں کیا۔ جب کسی چیز کا حصول ممکن ہو جاتا تو ہم وہاں سال کا اضافہ کر دیتے۔ وہ ڈائری اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ سولہ سال کی جدو جہد اور کمیٹیاں ڈال کر اس فہرست کی تمام چیزوں کا حصول ممکن ہو سکا۔ فہرست کی آخری چیز فلپس کا اے سی تھا جو 1995 میں بہاول پور کے قیام کے دوران اقساط میں مکمل ہو سکا۔ 15 ستمبر 1984 کو کمیٹی ڈال کر موٹر سائیکل خریدا جو 16 سال میرے پاس رہا۔ 2000 کے دوران پہلی بار دونوں کے جی پی فنڈ سے نا قابل واپسی قرض لے کر ایک سیکنڈ ہینڈ سوزوکی مہران خریدی۔ دونوں کے جی پی فنڈ اور زرعی زمین کی فروخت کی رقوم مکان بنانے اور بچوں کی شادیاں کرنے میں صرف ہو گئیں۔ ان باتوں کا تذکرہ کرنے کا بنیادی مقصد یہ بتانا ہے کہ ہمیں کوئی چیز بیٹھے بٹھائے نہیں مل گئی، اس کے حصول کے لیے صبر، محنت اور بہتر منصوبہ بندی سے کام لیا اور اللہ نے یہ کرم کیا کہ اس نے ہمارا ایمان بھی سلامت رکھا۔

1981 میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں دو جڑواں بچیوں ملیحہ اور فریحہ سے نوازا۔ ان کے بعد 1983 میں تیسری بچی راحیلہ اس دنیا میں آئی تو کسی قسم کا کوئی ملال نہیں ہوا اس لیے کہ بچے اللہ کی دین ہیں۔ بچے اور بچیوں میں فرق کرنا تو جاہلوں کا کام ہے۔ پھر وجاہت نسیم 1985 میں تشریف لائے اور آخر میں ماورا نسیم 1987 میں پیدا ہوئیں یوں وجاہت نسیم کو چار بہنوں کے اکلوتے بھائی کا خطاب ملا مگر ہم میاں بیوی نے باہمی افہام سے بیٹے کو اکلوتا ہونیکی وجہ سے بچیوں پر زیادہ اہمیت دی نہ گھر میں ایسی فضا پیدا ہونے دی۔ بچوں کی تعلیم کے حوالے سے کسی سخت گیر منصوبہ بندی سے کام نہ لے سکے۔ بڑی تینوں بہنیں ایک ہی کلاس میں تھیں اور اپنی ماں کے سکول میں ہی داخل تھیں۔ وجاہت اور ماورا کو آرمی پبلک سکول رحیم یار خان میں داخل کرایا۔ 1994 میں بہاول پور آئے تو 8 ویں کلاس تک تینوں بہنوں نے گورنمنٹ گرلز ہائی سکول ماڈل ٹاؤن اے اور میٹرک صادق گرلز ہائی سکول سے کیا جب کہ وجاہت اور ماورا کو ایک مناسب سے نجی سکول میں داخل کرا دیا جہاں سے دونوں نے میٹرک کیا۔ اس دوران ملیحہ کی اچانک جان لیوا بیماری نے گھر کے ہر فرد کو متاثر کیا اور ڈاکٹر، انجینئر یا یونیورسٹی کا استاد بنانے کی منصوبہ بندی نہ ہو سکی۔ ملیحہ تو انٹر کے بعد بی اے پارٹ ون کے امتحان سے دو ہفتے قبل ہی ایسی بیماری میں مبتلا ہو گئی کہ بتدریج اس کی ایک آنکھ کی مکمل اور دوسری آنکھ کی نوے فیصد بینائی جاتی رہی۔ فریحہ نے ایم اے ایجوکیشن اور اردو کیا جب کہ راحیلہ نے کیمسٹری میں ایم فل کیا۔ وجاہت انٹر پری میڈیکل کے بعد داخلہ ٹیسٹ میں کامیاب نہ ہو سکا تو بہت ڈسٹرب ہوا۔ ہم میاں بیوی اسے نفسیاتی طور یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ ڈاکٹر بننا کوئی ضروری نہیں اور بھی بہت سے میدان تمہارے منتظر ہیں۔ میری ہدایت پر اس نے ریاضی ڈبل اور فزکس میں بی ایس سی کی اور گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور سے ایم بی اے کر لیا اور کارپوریٹ سیکٹر میں ایک اچھا جاب حاصل کر کے ایک اچھا کارپوریٹ پروفیشنل بننے میں کامیاب ہو گیا۔ ماورا کے حوالے سے مجھ سے ایک زیادتی یہ سرزد ہوئی کہ میرے اصرار پر اس نے ایم ایس سی اکنامکس میں

داخلہ لے لیا جب کہ اس کا یہ پسندیدہ مضمون نہیں تھا۔ اس کا مجھے آج تک ایک طرح کا پچھتاوا اور ملال ہے۔ فریحہ کی رحیم یار خان، ملیحہ کی بہاول پور، راحیلہ، ماورا اور وجاہت کی شادی لاہور میں ہوئی اور ہمارے تمام بچے صاحب اولاد ہیں اور جوائنٹ فیملی سسٹم میں خوشگوار ازدواجی زندگیاں گزار رہے ہیں اور کبھی کبھار ضرورت پڑنے پر تمام بچیوں کی متوازن اور حقیقت پسندانہ رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ میری رفیقہ حیات نے کبھی ایسی فرمائش نہیں کی جس سے ہم زیر بار ہوتے بل کہ انہوں نے اپنے اور بیٹیوں کے کپڑوں کی سلائی ہمیشہ خود کی اور اور کوئی بے جا فرمائش نہیں کی بل کہ مجھے بھی بچت کی تلقین کرتیں۔ میری اور نجمہ نسیم کی ازدواجی رفاقت کو 45 سال مکمل ہو چکے ہیں۔ 25 دسمبر 2024 کو طارق گارڈن لاہور کے گھر میں تمام بچوں اور ان کے بچوں نے مل کر ہماری ازدواجی زندگی کے پینتالیس سال مکمل ہونے پر خوب رونق لگائی۔ دعا ہے کہ ہماری اور ہمارے بچوں کی زندگیاں ہماری طرح پرسکون اور باہمی افہام و تفہیم سے گزریں اور ہماری طرح وہ بھی اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھیں۔ (انشااللہ)

کہتے ہیں مصیبت پوچھ کر نہیں آتی۔ کچھ ایسی صورت حال مجھے اور میری فیملی کو 24 مئی 2021 کو پیش آئی جب ہم سب بے بس تھے اور کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ میں لاہور میں ہیومن ریسورس مینجمنٹ کا تین ہفتے کا کورس کر کے 21 مئی کو گھر پہنچا اور 23 مئی کو کالج گیا۔ واپسی پر میری بڑی بیٹی ملیحہ نے جو ان دنوں دو ہفتے کے بعد شروع ہونے والے سال سوم ریگولر (پارٹ ون) کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی، نے مجھے بتایا کہ اس کی آنکھیں سرخ اور گلا خراب اور بخار ہے۔ 23 نومبر کی شام کو ماڈل ٹاؤن سی میں ایک جنرل فزیشین کو دکھایا تو اس نے اس کو بخار اور گلے کی دوائی تو لکھی دی مگر آنکھوں میں کم از کم سطح کے السر ہونے کی وجہ سے آنکھوں کے ڈاکٹر کو دکھانے کو کہا۔ اگلے دن بہاول پور کے آخری نواب کے یوم وفات پر بہاول پور میں مقامی تعطیل تھی۔ میں نے منور جمیل کو فون کیا، ان کے ساتھ سب کے پیارے دوست بہاول وکٹوریہ ہسپتال کے ایم ایس ملک الطاف کے گھر ان سے ملے۔ انہوں نے سٹوموٹائیٹس (stomatitis) تشخیص کیا جس میں منہ کی جھلیوں میں سوزش اور سوجن، الرجی، غذائی کمی یا دائمی انفیکشن لاحق ہو جاتی ہے۔ اس مرض میں منہ اور آنکھوں اور ہونٹوں اور غذا کی نالی میں دانے یا السر نکل آتے ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے خبردار کیا کہ جناب آپ ایک بہت بڑی پریشانی سے دوچار ہو چکے ہیں جسے بہادری، حوصلے اور صبر سے برداشت کرنا ہے۔ چوں کہ دوست تھے لہٰذا انہوں نے گھر پر تین دن تک ڈرپ کے ذریعے اینٹی الرجک اور دافع سوزش و انفیکشن ادویات کے انجیکشن کے ذریعے علاج کیا۔ تین دن تک کوئی افاقہ نہ ہوا تو انہوں نے ایم ایس آفس میں ایک فزیشن اور ایک ماہر امراض جلد کو بلا کر مشورہ کیا اور معلوم ہوا کہ اس بیماری کا نام سٹیون جانسن سنڈرم (SJS) ہے جو کسی دوائی کے ری ایکشن یا جسم کے مدافعاتی نظام میں خلل کے باعث لاحق ہوتا ہے۔ ہسپتال میں داخلے کا مشورہ ایم ایس ڈاکٹر الطاف ملک نے رد کر دیا اور مجوزہ علاج کو گھر پر جاری رکھنے کا مشورہ دیا اور ایک فی میل نرس کی

ڈیوٹی لگائی کہ وہ گھر میں ہی اے سی والے کمرے میں دن میں دو دفعہ ڈرپ میں مطلوبہ ادویات ڈال کر لگائے گی۔ آئندہ دنوں میں ملیحہ کے تمام جسم پر دانے اگ آئے اور پاؤں اور ہاتھوں کے تلووں میں پانی پڑ گیا۔ گلا اور غذا کی نالی السر اور زخموں سے بھر گئی جس سے گلے سے بہت چپکنے والی رطوبت آنا شروع ہو گئی اور بخار بھی نہ اتر سکا۔ جس طرح باقی جسم پر السر آ گئے تھے اس طرح آنکھوں میں بھی تھے اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ صورت حال یہ ہو گئی تھی کہ ہمہ تن داغ داغ شد۔۔۔ پمبہ کجا کجا نہم (یعنی میرا تمام جسم زخموں سے چور ہے، میں مرہم کہاں کہاں لگاؤں)۔ آنکھوں کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔ اگر ایم ایس کے آفس میں میٹنگ کے دوران آنکھوں کے ماہر کو بلا لیا جاتا تو اس کی آنکھوں کا شاید اتنا نقصان نہ ہو پاتا یا آنکھیں شاید بچ سکتی تھیں۔ تقریباً تین ہفتے تک یہی کیفیت رہی۔ اس کی تکلیف کے باعث گھر کا ہر فرد جذباتی طور پر بہت متاثر ہو رہا تھا مگر ملیحہ کی تیمار داری کے لیے تمام بڑھ چڑھ کر مستعد تھے۔ آخر بخار ختم ہوا، جسم کے السرز اور دانوں (Blisters) نے کم ہونا شروع کر دیا۔ ہاتھ اور پاؤں کے تلووں کو کاٹ کر وہاں سے پانی نکال دیا گیا اور پہلے والی جلد بلیڈ سے کاٹ کر اتار دی گئی مگر آنکھیں ابھی بند تھیں۔ جب وہ جسمانی طور پر نارمل ہو گئی تو فکرمندی کے ساتھ آنکھوں پر متوجہ ہوئے۔ میں نے برق ہسپتال میں ڈاکٹر رفعت برق کو دکھانے کا فیصلہ کیا اور آنکھوں کے معائنے کے بعد اس نے جو تشخیص بتائی وہ ہمارے وہم و گمان میں ہی نہیں تھی۔ اس سے میرے اندر جو دھما کہ ہوا اس کی دھمک آج بھی محسوس کر سکتا ہوں۔ دل بجھ سا گیا۔ اس نے کہا، "پروفیسر صاحب آپ کی بیٹی کی دونوں آنکھیں مستقل طور پر خشک ہو چکی ہیں یعنی (Bilateral Dry Eyes) کیوں کہ السرز نے پانی اور آنسوؤں کا وہ سسٹم ہی تباہ برباد کر دیا ہے کہ جس کی مدد سے آنکھیں کام اور حرکت کرتی ہیں اور قارنیا محفوظ رہتا ہے۔ اب تمام عمر اسے مصنوعی آنسو ڈالنے پڑیں گے اور دونوں آنکھوں کی کچھ جھلیاں آپس میں چپک بھی گئی ہیں جنہیں Adhesions کہتے ہیں۔ اگر آنکھوں کو مسلسل گیلا (wet) نہ رکھا گیا تو کارنیا میں السر پیدا ہو جائیں گے جس سے بینائی مستقل طور پر جا سکتی ہے" ڈاکٹر نے آنکھیں جتنی کھل سکتی تھیں کھول دیں۔ دونوں آنکھیں مستقل خشک ہونے کے باوجود ابھی تک دونوں آنکھوں کی نظر درست کام کر رہی تھی۔ کسی نے کہا کہ ڈاکٹر منظور احمد بہت اچھے ڈاکٹر ہیں انہیں دکھائیں دو ماہ تک ان کے کلینک پر خوار ہوتے رہے پھر ڈاکٹر اعجاز لطیف نے "ڈنگ ٹپاؤ" ادویات دیں۔ لاہور کے میڈی کیئر کے علاوہ ڈاکٹر محمد لطیف کا آنکھوں کا ایک خیراتی ہسپتال حاصل پور میں ان کے گاؤں کے قریب واقع تھا جہاں وہ اکثر چکر لگاتے تھے۔ ایک بار وہ یہاں آئے تو انہیں بھی دکھایا مگر وہ ایسی مرض کے ماہر تو نہ تھے لیکن باتیں انہوں نے ڈاکٹر رفعت برق والی ہی کیں۔ ڈاکٹر نذیر آسی جو بہاول پور سے لاہور چلے گئے تھے ان کو دکھانے کا بڑا پریشر پڑا۔ ان کو دکھایا تو انہوں نے جو ادویات دیں ان کے استعمال کے بعد بائیں آنکھ کا قرنیا السر کا شکار ہو گیا اور پھر اس آنکھ کی کی بینائی چلی گئی یوں یہ ایک ناقابل تلافی نقصان تھا۔ بہاول پور میں میڈیکل کالج ہے اور ایک بہت بڑا اور تاریخی ہسپتال بطور

ٹیچنگ ہسپتال کام کر رہا ہے مگر یہاں کسی کو بھی مرض اور اس سے آنکھوں کو نقصان پہنچنے کا علم ہی نہ تھا۔ دائیں آنکھ کی بینائی تو درست تھی اور اسے مصنوعی آنسوؤں سے گیلا رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ بہاول پور کی سطح پر کوئی بھی آنکھوں کا ماہر نہیں تھا جو کوئی درست سمت دکھاتا۔ ہمیں تو آنکھوں کی ایک جزوی (Micro) لیول پر مرض کی مہارت والا ڈاکٹر چاہیے تھا۔ ہمارے ہمسایوں نے کراچی میں اپنے رشتہ داروں کی ایک لڑکی کے بارے میں بتایا جو ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھی اور آغا خان ہسپتال میں زیر علاج رہی تھی۔ کراچی میں اس لڑکی کے معالج کو چیک کرایا مگر کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلا۔ آخر محض اتفاق سے سوشل میڈیا پر عارف والا کی ایک ایسی ہی مریض لڑکی نے اس قسم کے امراض کے ماہر ڈاکٹر محمد طارق کا زینب ہسپتال کلمہ چوک لاہور میں پتہ بتایا کیوں کہ وہ اس کے بھی معالج تھے۔ ان سے ملے تو انکشاف ہوا کہ ان کے پاس تو سٹیون جانسن سنڈروم کے بہت سے مریض ہیں اور ان سے اکثریت لڑکیوں کی ہے۔ انہوں نے معائنے کے بعد کہا کہ جو نقصان ہو چکا اس کو تو لوٹایا نہیں جا سکتا البتہ تکلیف کو کم کیا جا سکتا ہے۔ تین ماہ کے بعد انہوں نے ڈاکٹر عمران اکرم صحاف کے پاس بھیج دیا جنہوں نے ہونٹوں کی جھلی کاٹ کر دائیں آنکھ کے کچھ حصوں پر لگائی جس سے آنکھیں جھپکنے سے رگڑ کی جو اذیت ہوتی تھی وہ کچھ کم ہو گئی۔ اب لاہور چکر لگنے لگے اور ہر مہینے ہم ضرور چیک کروانے کے لیے جاتے اور پہلے سے وقت لینے کے باوجود وہاں اتنا رش ہوتا کہ پانچ پانچ، چھ چھ گھنٹے بعد باری آتی اور بالآخر ڈاکٹر عمران اکرم صحاف جیسے صوفی منش اور بہت ہی اہل ڈاکٹر نے ہمارے کیس کو مستقل لے لیا اور وہ اتنے ماہر ڈاکٹر ہیں کہ ان کے پاس تقریباً کوئی 200 کے قریب ایسے کیسز ہیں۔ وہ اس قسم کی مرض میں مبتلا بچیوں کی امراض سے لڑتے ہیں اور جو اصل نقصان ہو چکا ہوتا ہے اس کا تو مداوا نہیں ہو سکتا لیکن کم از کم وہ اس کو دیکھتے رہتے ہیں اور فالو اپ کے تحت چیک کرتے رہتے ہیں تاکہ ان کی اذیت میں کمی واقع ہو سکے۔ سال میں ایک ماہ تبلیغی جماعت کو دیتے ہیں۔ جنرل ہسپتال لاہور اور میو ہسپتال میں امراض چشم کے شعبوں کے سربراہ رہ چکے ہیں۔ آنکھوں اور اس کے مختلف حصوں کی پلاسٹک سرجری (Oculoplasty) کے ماہر ہیں۔ اتنی مہارت اور شہرت کے باوجود نئے مریض سے چھ اور پرانے مریض سے پانچ سو روپے معائنہ فیس لیتے ہیں۔ ایسے مریضوں کا ان کے ہاں اتنا رش ہوتا ہے کہ وہاں ٹائم لے کر بھی تین چار گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ دوسری آنکھ جس سے پوری طرح نظر آتا تھا اس پر بھی کسی وجہ سے السر کا حملہ ہو گیا اور کچھ نہ پوچھیئے اس کے بعد پھر ہمارے ساتھ کیا ہوا، ہمارے ساتھ کیا بیتی، وہ اب یاد کرتا ہوں تو ڈپریشن میں چلا جاتا ہوں۔ لاہور جانا موقوف ہو گیا تو آج کل نشتر میڈیکل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر راؤ راشد قمر قائداعظم میڈیکل کالج بہاول پور میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے، انہوں نے بائیں آنکھ کو بچانے کا عہد کیا۔ انہوں نے بہت کوشش کی، بہت سے آپریشن کیے لیکن وہ آنکھ نہ بچا پائے اور یوں اس آنکھ کی بینائی بھی چلی گئی اور پھر وہ جو پہلی آنکھ جس کی بینائی چلی گئی تھی تو جب بالکل اندھیرا ہو گیا تو اسی آنکھ کے کونے سے دس فیصد نظر آنے لگا۔ اب وہ اس دس فیصد پر اپنی زندگی گزار رہی

ہے اور پھر بھی اللہ تعالی کا شکرادا کرتی ہے کہ چلو میں کم از کم اپنے بچوں کو دیکھ سکتی ہوں، انہیں سنبھال سکتی ہوں، از خود واش روم جا سکتی ہوں اور گھر میں نقل وحرکت کم از کم خود سے کر سکتی ہوں تو یہ بھی اللہ تعالی کا فضل ہے۔ جب اندھیرا ہو جائے، جب کچھ باقی نہ بچے، جب 100 پرسنٹ ہی چلا جائے اور اس کا 10 پرسنٹ اگر واپس مل جاتا ہے تو پھر وہ بھی بہت لگتا ہے، اسے بھی کافی سمجھا جا سکتا ہے۔ جب آپ پوچھیں گے کہ بیٹا کیسی ہیں تو وہ بہت ہی خود اعتمادی سے جواب دے گی کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، اللہ تعالی کا بہت فضل وکرم ہے اور اللہ تعالی نے اس پر یہ فضل کیا کہ وہ خود بھی جڑواں تھی اور اس کو اللہ تعالیٰ نے جڑواں بیٹی بیٹا عطا کیے جواب ماشاللہ چھ سال سے زائد کے ہوگئے ہیں اور سکول میں داخل ہیں، وہ اس کے کھلونے ہیں، ان سے وہ بہلتی ہے ان سے کھیلتی ہے، ان کو کھلاتی ہے اور بس وہی اس کا ایک بہانہ ہے زندگی کا، زندہ رہنے کا ان کو دیکھ کر اور اپنے قریب پا کر وہ اپنی مرض اور تکلیف بھول جاتی ہے اور اس کے لہجے میں بلا کی خود اعتمادی اور اللہ تعالی کا تشکر پایا جاتا ہے۔ لیکن اس دوران میری فیملی پر جو بیتی کیا بتاؤں، وہ تو جسمانی طور علیل تھی اور ہم جذباتی طور پر اتنے متاثر ہوئے کہ 2015 میں جب تک اس کی شادی نہیں ہوئی تو پچھلے پورے چودہ سال ہم بھی انگاروں پر لوٹتے رہے ہیں۔ جب اس کو آنکھ میں السر کی اذیت ناک تکلیف ہوتی تھی تو ہم سارے بھی اس تکلیف کو محسوس کرتے تھے، اس کے گرد ہم بیٹھ جاتے تھے اور اس کی سائیکوتھراپی کرتے۔ ایسے حالات میں فیملی سپورٹ بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بھائی اور تمام بہنیں اس کی ایک پکار پر حاضر ہو جاتے۔ وہ ہمارے لیے ایک خاص انسان تھی جس کی تکلیف نے ہم سب کو بھی ادھ موا کر دیا تھا پھر میں ان سب کو کہتا۔ وقت اچھا بھی آئے گا ناصر۔۔۔۔غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی۔۔۔۔ یا پھر حافظ شیرازی کا وہ شعر سناتا جس کا مفہوم یہ ہے کہ مجھے خوش خبری ملی ہے کہ غم کے دن نہیں رہیں گے، اگر وہ دن نہیں رہے تو یہ دن بھی نہیں رہیں گے۔

میں اب واپس گاؤں کی طرف آتا ہوں۔ انٹرمیڈیٹ کے دوران میں حکایت نامی ڈائجسٹ پڑھتا تھا۔ اس میں صحت کے حوالے سے بہت اچھے مضامین ہوتے تھے۔ ان مضامین میں بیان کردہ ہدایات پر عمل کرتے ہوئے میں نے انٹر اور بی اے کے دوران اور پھر یونیورسٹی جانے سے پہلے صبح کی سیر کی عادت بنالی تھی۔ صبح تین سے چار کلومیٹر گاؤں کے سرسبز وشاداب کھیتوں اور صاف شفاف فضا میں سیر کرتا اور اس دوران ہلکی پھلکی ورزش بھی کرتا۔ گہرے سانس لینا تو گویا معمول تھا۔ جب سورج طلوع ہوتا تو اس کی طرف رخ کر کے آنکھیں بند کر لیتا اور جب سانس اندر کھینچتا تو نفسیاتی طور پر محسوس کرتا کہ سورج کی توانائی میرے اندر داخل ہو رہی ہے۔ اس مشق کے مجھ پر بہت مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ گاؤں کے قریب ہی ایک آموں کا باغ تھا وہاں کچھ وقت گزارتا۔ میرے مطالعے کے تین مقامات تھے، ایک گھر، دوسرا یہ باغ اور تیسرا ''بلّے والا بنگلہ'' کا خوبصورت پارک۔ پرانے، گھنے اور آسمان کو چھوتے ہوئے درختوں کے درمیان گھری ہوئی اس بنگلے کی عمارت کے قریب ایک دیدہ زیب پارک تھا جہاں بیٹھنے کے لیے بنچ رکھ دیے گئے تھے۔ یہاں پرندوں کی چہکار

اور کوئل کی کوکو کسی اور جہان میں لے جاتی۔ یہاں بغیر کسی مداخلت کے میں گھنٹوں پڑھتا۔ ساہیوال شہر میں میری سب سے بڑی پناہ گاہ اور مطالعے کی مثالی جگہ لوئر باری دوآب کے کنارے بنا ہوا کنعان پارک تھا جہاں شہر سے واپسی پر بیشتر وقت امتحان کی تیاری میں گزرتا۔ ایک اور مختصر واقعے کا ذکر کہ میں اور چند دوست رینالہ خورد کا سر گنگا رام کا بنایا ہوا بجلی گھر بھی دیکھنے گئے تھے۔ اس وقت اس میں چار ٹربائین تھیں جس میں تین چل رہی تھیں اور ایک ریزرو تھی۔ لوئر باری دوآب کا پانی لے کر بجلی گھر میں تین میگاواٹ بجلی پیدا کر کے پھر اس پانی کو واپس نہر میں ڈال دینا بہترین انجینئرنگ کا شاہکار ہے۔

میری طرح ایک صاحب گاؤں کے رہنے والے تھے اور کسی ایسے عہدے پر متمکن ہوئے کہ طویل عرصہ گاؤں نہ جا سکے۔ چند سال بعد گاؤں کا ایک شخص ان سے ملنے گیا۔ ان صاحب نے گاؤں کا حال پوچھا تو ملنے والے نے بتایا کہ اب تو گاؤں نے بہت ترقی کر لی ہے۔ صاحب کہنے لگے کہ یہ بتاؤ، کیا اب بھی لوگ بسکٹ چائے میں بھگو کے کھاتے ہیں، جواب ملا، جی اب بھی ویسی ہی صورت حال ہے تو صاحب نے کہا، "پھر کاہے کی ترقی"۔ اس پیمانے پر ہم بھی گاؤں کے قدیم ماضی کو کھنگالنے کے بعد گذشتہ تیس برسوں کے دوران گاؤں میں ہونے والی بتدریج ترقی اور معاشرتی اور ثقافتی سطح پر آنے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ساہیوال شہر اور میرے گاؤں کا سات کلومیٹر کا فاصلہ خاصی حد تک سمٹ چکا ہے۔ جب نیشنل ہائی وے 5 کا بائی پاس بنا تو وہاں سے فاصلہ تین کلومیٹر رہ گیا تھا اور اب اجواسٹی نام کی ہاؤسنگ سکیم نے گاؤں کی مشرقی جانب کی زمینیں خرید کر سکیم میں ضم کر دی ہیں گویا اب اجواسٹی ہمارے گاؤں کو چھونے لگا ہے۔ چار لینز پر مشتمل یک طرفہ عارف والا روڈ کے منصوبے کی تکمیل میں ایک طویل عرصہ صرف ہوا۔ گاؤں کی جنوبی طرف کی پختہ سڑک عارف والہ روڈ سے چک نمبر 102 / 9 ایل (جوڑیاں) تک دوبارہ بحال ہو چکی ہے۔ گاؤں کی گلیاں کسی وقت کم از کم 100 فٹ ہوتی تھیں اور لوکل گورنمنٹ کا عملہ ہر 6 ماہ کے بعد گاؤں کی گلیوں کا معائنہ کیا کرتا تھا اور تجاوزات یا گندگی کی صورت میں جرمانہ کیا جاتا تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ سو سو فٹ کی گلیاں تجاوزات کے باعث 50 فٹ سے بھی کم کی رہ گئی ہیں اور ان پر گھروں کے استعمال شدہ گندے پانی کی نالیوں نے ان ماضی کی انتہائی کھلی گلیوں کے باقی ماندہ حصے کو مزید تنگ کر دیا ہے۔ ہر گھر نے واٹر پمپ لگا اور سیپٹک ٹینک بنا رکھے ہیں جس سے زیر زمین پانی کی کوالٹی اور سطح متاثر ہوئی ہے۔ گاؤں کی گلیوں میں چند سالوں کے بعد سولنگ لگائی جاتی ہے مگر ان کی دیکھ بھال اور کوالٹی اوسط درجے سے بھی نیچے ہونے کے باعث ختم ہو جاتی ہے۔ گاؤں گذشتہ 50 سال کی نسبت دگنا ہو چکا ہے اور اب چاروں اطراف میں پرانے تالاب کا کچھ حصہ اور مشرقی جانب تھوڑی سی زرعی زمین بچ گئی ہے جسے عنقریب رہائشی مکان اپنے اندر ضم کر لیں گے مگر گاؤں کے گرداگرد سرکاری زمین کا ایک ٹکڑا بھی نہیں بچا۔ زرعی اکائیاں وراثتی تقسیم سے کم از کم ہوتی جا رہی ہیں۔ روزی کمانے کے لیے نئے شعبے اور طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں۔ زیادہ تر توجہ جانوروں کی خرید و فروخت کی طرف

دی جا رہی ہے اور اب تو اس ضمن میں سوشل میڈیا اور آن لائن طریقِ کار کو بھی کامیابی سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ مجموعی طور پر فی کس آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ معیار زندگی بھی بہتر ہوا ہے۔ پہلے درجے کے آسودہ حال کاریں لیے پھرتے ہیں اور اس کے بعد کے لوگ موٹر سائیکل کا استعمال کرتے ہیں۔ زرعی پیداوار میں جدید اور غیر روائتی تکنیکی آلات کا استعمال عام ہے۔ مالی طور پر آسودہ لوگ کاروبار میں جانوروں کی خرید وفروخت میں کسی کے ذریعے جو پیسہ لگاتے ہیں وہ منافع کی بنیاد پر ہوتا ہے، نقصان کے وہ حصہ دار نہیں بنتے۔ پہلے ہمارے گاؤں میں سکول نہیں تھا تو میں نے ساتھ والے گاؤں سے پرائمری کیا مگر 1964 میں یہاں پرائمری سکول کھلا اور 1985 کے دوران ہائی ہو گیا۔ طالبات کا مڈل سکول بھی موجود ہے۔ شرح خواندگی میں خاصا اضافہ ہوا ہے اور اب سکولوں، کالجوں، کچہری اور دیگر محکموں اور مختلف شہروں میں گاؤں کے نوجوانوں کی معقول تعداد کام کر رہی ہے۔ لڑکیوں میں بھی اعلیٰ تعلیم کا شوق بیدار ہو چکا ہے۔ دو درجن سے زیادہ لڑکے اور لڑکیاں ایم۔اے/ ایم ایس سی، ایم فل اور بی ایس آنرز تک تعلیم یافتہ ہیں۔ لڑکیوں میں ملازمت کا رجحان بھی بیدار ہو رہا ہے۔ چوکیدار، ترکھان، لوہار اور کمہار کے پیشے ختم ہو چکے ہیں۔ امام مسجد کو ماہانہ معقول تنخواہ کے علاوہ کچھ دیگر مراعات بھی حاصل ہیں۔ حجاموں نے اپنے حمام کھول لیے ہیں جہاں معاوضہ نقد وصول کیا جاتا ہے۔ جہیز کی اقدار اور رواج بدل چکا ہے اور جس سے بیٹیوں والے مشکلات کا شکار ہیں۔ جہیز میں لڑکے کے گھر میں ایک اضافی کمرہ تعمیر کر کے اس کو جدید ترین اشیا سے مزین کرنا شامل ہے۔ زیادہ آسودہ لوگوں کے لیے کار اور متوسط لوگوں کے لیے موٹر سائیکل سے نیچے بات ہی نہیں کی جاتی۔ شادیوں کی خریداری لاہور سے کی جانے لگی ہے۔ دلہن بیوٹی پارلر میں تیار ہوتی ہے جب کہ ولیمے کی تقریب شہر کے شادی گھروں میں منعقد کی جاتی ہے۔ شادی کی پرانی رسوم البتہ ختم ہو چکی ہیں اور جو اب مروج ہیں ان کی ڈیجیٹل ریکارڈنگ کی جاتی ہے اور فوٹو شوٹ بھی ہوتا ہے۔ گاؤں کے قدیم ماضی سے پیوست یادوں کے حامل میرے جیسے انسان کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب ایک شادی پر دس سے پندرہ لاکھ روپے خرچ ہونا معمول کی بات ہے تو تعجب ہوتا ہے مگر گاؤں میں تہذیبی، معاشرتی، اخلاقی اور معیاری شعور کی اقدار کا جائزہ لیں تو اس لحاظ سے کوئی نمایاں اور مطلوبہ معیار کی ترقی یا بہتری دیکھنے میں نہیں آئی یعنی ماضی کی طرح وہ اب بھی وہیں کھڑے ہیں۔

اب چند مزید باتیں میرے پیارے ساہیوال شہر کی۔ میرا تعلق چوں کہ ایک زمیندار خاندان سے تھا اس لیے کھیت، ان کی پیداوار اور حاصل ہونے والی آمدنی پر ہی سارا دارومدار تھا۔ انگریزوں نے آبادکاری کے لیے مختلف زرعی سکیموں اور ان کی شرائط کا اعلان کر رکھا تھا۔ ان میں سے کچھ سکیمیں مویشی پال بھی تھیں۔ انہی میں سے ایک گھوڑی پال سکیم تھی۔ ایک مربعہ یا 25 ایکڑ کے لیز پر ایک گھوڑی کو پالنا اور اس کے ذریعے خچروں کی نسل کشی ہوتا تھا۔ گھوڑی کی خدمت کرنا اور اس سے خچر پیدا کر کے معمولی سی علامتی قیمت پر فوج کی

ریماؤنٹ کو رفراہم کرنا ہی اس سکیم کی بنیادی شرط تھی، گھوڑی کی اچھی صحت اور مناسب وقفوں سے خچروں کی پیداوار ہی گھوڑی پال زمیندار کے اچھے ریکارڈ کا معیار تھا، ساہیوال کی مال منڈی گراؤنڈ میں سالانہ میلہ مویشیاں منعقد ہوتا تھا جس میں ہر زمیندار کو اپنے مویشی سمیت چند دن وہاں رہنا پڑتا تھا۔ گھوڑیوں کا ایک معیاری معائنہ جاری رہتا اور میلے کے آخری دن جیتنے والوں کو انعامات دیے جاتے اور ان کے ریکارڈ میں اچھے یا برے ریمارکس کا اندراج کیا جاتا۔ چوں کہ گھوڑی پال سکیم کی مناسبت سے ہماری سرکاری گھوڑی کو بھی اس میلے میں لایا جاتا تھا اس لیے میں ہر سال اپنے والد کے ساتھ اس میلے کو ایک دن کے لیے دیکھنے آتا تھا۔ گورنمنٹ ہائی سکول میں داخلے اور سائیکل آجانے سے ساہیوال میں یہاں وہاں اڑتے پھرتے تھے۔ اب تو ماسوائے چھٹیوں کے ہر روز ساہیوال شہر آنا پڑتا تھا لہٰذا ساہیوال کے بازاروں اور اہم جگہوں کا پتہ چلتا جا رہا تھا۔ سیٹلائیٹ ٹاؤن کے راستوں کو تو میں خوب پہچانتا تھا کیوں کہ چند ماہ میں وہاں رہائش اختیار کر چکا تھا۔ منٹگمری سے ساہیوال کا نام جب بدلا گیا تو میں آٹھویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ میں نے تمام تقاریب کو دور اور نزدیک سے دیکھا۔ اصل تقریب 11 نومبر 1966 کو میونسپل کمیٹی کے زیر اہتمام ہوئی جس میں گورنر موسیٰ خاں نے شرکت کی اور ساہیوال کا نام بحال کرنے کا اعلان کیا گیا۔ اس موقع پر فوجی بینڈ نے مختلف دھنیں اور قومی ترانہ پیش کیا۔ شہر بھر میں ہارس اینڈ کیٹل شو اور دیگر تقریبات منعقد ہوئیں۔ قیوم ہسپتال اور تانگوں کے اڈے کے درمیان کی خالی جگہ پر سرکس لگائی گئی۔ اس سرکس میں اس وقت کا ایک ہٹ گانا بار بار بجایا جاتا تھا جس کے بول تھے'': ارے او بے مروت ارے او بے وفا، بتا دے کیا یہی ہے وفاؤں کا صلہ۔'' اس گانے کے ابتدائی بول درج کرنے کا مقصد دراصل وقت کا تعین کرنا ہے۔

اس وقت تک یادگار ساہیوال کی تعمیر کا آغاز نہیں ہوا تھا اور اوور ہیڈ برج کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ ریلوے سٹیشن سے ریلوے روڈ کا آغاز ہوتا تھا۔ شہر جانے کے لیے ڈاکخانے کے بعد دائیں طرف مڑنا پڑتا جب کہ سیدھی سڑک سٹیڈیم کے سامنے سے گزر کر چرچ کو جاتی جو آگے کچہری تک چلی جاتی تھی مگر ہم چرچ سے آگے جا کر دائیں طرف کمرشل کالج والی سڑک پر ہو لیتے جہاں سے کچہری روڈ پر دائیں جانب تحصیل کے بعد سکول کا گیٹ تھا مگر داخل ہونے کا گیٹ ہائی سٹریٹ والا تھا۔ کچہری روڈ پر ہیڈ ماسٹر کی رہائش تھی جہاں سے وہ پیدل سکول آتے۔ اگر وہ آگے جا رہے ہوتے تو احتراماً ہماری مجال نہیں تھی کہ ان سے آگے گزر جاتے۔ وہ آگے اور ادھر سے آنے والے تمام طلبا ان کے پیچھے سائیکلوں سے اتر کر پیدل ہو لیتے۔ جب وہ تحصیل والے گیٹ سے سکول کی طرف مڑ جاتے تو تمام پیدل اپنے سائیکلوں پر سوار ہو جاتے۔ نویں کلاس میں رانا الطاف طارق ہمارے کلاس انچارج تھے۔ وہ ہر ہفتے چیچہ وطنی جاتے تھے۔ سوموار کو واپسی پر بس سے اتر کر وہ کھوکھا بازار سے کچہری روڈ اور پھر دائیں مڑ کے سکول پیدل پہنچتے تھے۔ وہ اگر آگے پیدل مل جاتے تو بھی ہم ان سے آگے نہیں جاتے تھے۔ اگر فاصلہ ابھی پڑا ہوتا اور انہیں محسوس ہو جاتا کہ کچھ طلبا ان کے پیچھے چل

رہے ہیں تو وہ کسی ایک طالب علم سے اس کا سائیکل لے کر اسے آگے بٹھاتے اور سائیکل خود چلاتے اور سکول کے تحصیل والے گیٹ پر اتر جاتے۔ جب یادگار ساہیوال کی تعمیر شروع ہوئی تو ریلوے روڈ سے چرچ کی طرف کا سیدھا راستہ رک گیا تو بائیں جانب والی سڑک پر مڑ کر ساہیوال ہال سے پہلے چرچ کی طرف مڑ جاتے اور آگے کا پرانا راستہ لے لیتے۔ جب ساہیوال ہال کی تعمیر شروع ہوئی تو لوگ دیکھتے اور کہتے کہ ساہیوال میں "ناچ گھر" تعمیر ہو رہا ہے۔ بعد میں یہی ساہیوال ہال یہاں کی ثقافتی سرگرمیوں کا نقیب ثابت ہوا بل کہ 1971 میں یہاں بزم فکر وادب کی لائبریری منتقل ہوئی اور 1972 کے دوران میں نے یہاں اپنی زندگی کا پہلا سٹیج ڈرامہ دیکھا جو معروف اداکار مسعود اختر کی ٹیم نے پیش کیا۔ کالج جانے والہ راستہ تو سیدھا تھا۔ ریلوے روڈ سے بائیں طرف مڑ کر سیدھا راستہ کالج اور سیٹلائیٹ ٹاؤن کو جاتا تھا۔ کالج سے واپسی پر اگر شہر آنا ہوتا تو کینال کالونی کی ٹھنڈی سڑک سے گزر کر مشن ہسپتال کے پاس سے ہائی سٹریٹ کا راستہ لے لیتے۔ گورنمنٹ ہائی سکول کے ہوسٹل بلاک کے قریب ہائی سٹریٹ پر ایک گنڈیری فروش ریہڑی پر برف کا ایک بلاک رکھ لیتا اور اس کے اوپر کے سوراخ سے گنڈیریاں ڈال دیتا جو نیچے آتے آتے بہت ٹھنڈی ہو جاتیں۔ ان ٹھنڈی گنڈیریوں کا اپنا ایک لطف تھا جو اب تک مجھے یاد ہے۔ بسوں کے اڈے کے بعد دیپالپور بازار سے پہلے بائیں جانب ہائی سٹریٹ کا آغاز ہوتا تھا۔ اس جانب بہت بڑے اور سایہ دار اشجار تھے جن کے نیچے سیٹلائیٹ ٹاؤن کی اپنی بس کا اڈا تھا۔ یہیں سے وہ چلتی تھی اور یہیں آ کر رکتی تھی۔ انہی درختوں کے نیچے نور شاہ جانے والی بسوں کا اڈا تھا۔ جنرل بس سٹینڈ کے داخلی راستے کے تقریباً سامنے مرکزی تانگہ سٹینڈ تھا جو ساہیوال کے مضافات سے آنے والے تمام تانگوں کا مرکز تھا۔ یہیں سے لمبے روٹ والے تانگے مختلف سمتوں میں جاتے تھے۔ تمام تانگے میونسپل کمیٹی میں رجسٹر تھے۔ نئے تانگے رجسٹر کرنے کا ایک دن مقرر ہوتا تھا۔ کمیٹی کی ہائی سٹریٹ والی سمت میں ایک کھلی جگہ پڑی تھی جہاں تانگے گھوڑے کو چلوا کر چیک کیا جاتا اور اسے رجسٹریشن کے لیے پاس کیا جاتا اور ایک نمبر پلیٹ بھی جاری کی جاتی جسے تانگے کی ایک سائیڈ پر لگا دیا جاتا۔ ہر تانگہ ہر مہینے ایک مقررہ ٹیکس ادا کرتا۔ کمیٹی کا ایک محکمہ ''بے رحمی جانوراں'' ہوتا تھا جو خاص طور پر تانگوں کے گھوڑوں پر نظر رکھتا تھا اور نحیف وکمزور گھوڑوں کو ''پھاٹک'' بند کر دیا جاتا تھا۔ عارف والا روڈ کی جانب جانے والے تانگوں سے ماہانہ ٹیکس لینے کے لیے باہر والے اڈے پر شہر کی طرف مڑنے سے پہلے ایک ہرکارہ مستقل میز کرسی بچھائے بیٹھا رہتا۔ جو تانگہ ڈیفالٹر ہوتا اسے چالان یا بند کرنے کا اس کے پاس اختیار تھا۔ اسے ہر تانگے والے کی پہچان تھی اور اس کے پاس تمام تانگوں کے میونسپل نمبروں کا ایک رجسٹر ہوتا تھا۔ ایک وقت میں تانگے کی منظور شدہ چار سواریاں ہوتی تھیں۔ زیادہ سواریوں کو اس شرط پر بٹھایا جاتا تھا کہ وہ باہر کے اڈے سے پہلے اتر جائیں گے اور چالان کیے جانے والا علاقہ پیدل عبور کرنے کے بعد دوبارہ سوار ہوں گے۔ باہر کے اڈے پر یونیفارم کے بغیر شرٹ پینٹ میں ملبوس ایک انسپکٹر بیٹھا ہوتا جس کے پاس ایک پرانی طرز کا موٹر سائیکل (بمبو

کاٹ) ہوتا تھا۔ وہ اکثر ٹرکوں اوران سے مماثل گاڑیوں کو چیک کرتا تھا اور اگر کوئی اس کے روکنے پر نہ رکتا تو وہ موٹر سائیکل پر سوار ہو کر جلد ہی اسے جا لیتا۔ میں نے عارف والہ روڈ پر اسے ٹرکوں کا پیچھا کرتے کیے بار دیکھا۔

فوٹو کے لحاظ سے ہمارا زمانہ سیاہ وسفید (بلیک اینڈ وائیٹ) کا تھا۔ نجی تصویروں سے گروپ فوٹو تک سب سیاہ وسفید ہوتے تھے۔ گروپ فوٹو کے لیے ساہیوال میں سیف فوٹو گرافر اور العکاس کا نام بہت معروف تھا، میں نے اپنی دستیاب پہلی تصویر 1967 سے تصویر کھنچوانے کے لیے پل بازار میں موجو سپیشل فوٹو سٹوڈیو کا انتخاب کیا اور اس کے تمام فوٹو بولتے تھے۔ 1979 تک کے میرے فوٹو اسی فوٹو سٹوڈیو کی یادگار ہیں۔ مصروف ترین بازاروں میں پاک پتن بازار کا نام سرفہرست ہے۔ دیپالپور بازار سے نکلنے والے اس بازار کا اختتام صدر بازار کے آغاز پر ہوتا تھا۔ یہاں پر ان سلے کپڑوں، جوتوں، ہوزری، گھڑیوں، منیاری، کراکری اور جنرل سٹور غرضیکہ ہر قسم کی اشیائے ضرورت کی دکانیں تھیں۔ اس بازار کے بغلی بازاروں میں بھی بہت چہل پہل رہتی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ اردو بازار جانا پسند تھا جہاں آغاز ہی میں خان بک ڈپو سے کتب اور سٹیشنری خریدتا۔ کاپیاں، سکول کی کتابیں، رنگدار پنسلیں، روشنائی کی دوات، ایگل کے پن خریدنے کی خوشی دیدنی ہوتی۔ نئی کلاس کی کتب کو فوراً جلد کرالیا جاتا۔ صدر بازار خاصا کھلا تھا۔ یہاں بھی ہر قسم کی اشیا کی دکانیں تھیں۔ استاداں دی ہٹی، خالد بک ڈپو اور رحمت بک ڈپو کالج کی کتب کے لیے معروف تھیں۔ میں نے چائنا کا رِکن سَن پین پہلی بار چار روپے میں اور پریکٹیکل انگلش اردو ڈکشنری خالد بک ڈپو سے نویں کلاس (1968) میں خریدے تھے۔ اپنی بچت سے پہلی کتاب "اردو ادب" از ابوالیث صدیقی بھی اسی دکان سے خریدی تھی۔ صدر بازار میں زمیندارہ ہاؤس سب سے قدیم دکان تھی۔ اس بازار میں جوتے، پنسار، ٹیلرز، گھڑیوں، جنرل سٹور، الیکٹرک سٹور اور میڈیکل سٹور اور زرعی آلات کی دکانیں زیادہ تھیں۔ دیپالپور بازار بہت طویل تھا۔ پل بازار تک تو پاکپتن بازار کا سا انداز تھا۔ اس کے بعد مختلف خدمات از قسم شادیوں پر ٹینٹ، برتن، لاؤڈ سپیکر کرائے پر دینے، نلکے کے بور کا سامان اور، لوہے کی شیٹ سے برتن تیار اور مرمت کرنے کی دکانیں سروس اور فرنیچر کی دکانیں زیادہ تھیں۔ پل بازار بھی ملی جلی دکانوں پر مشتمل تھا مگر نہر کی پل سے سے بہت پہلے یہ لکڑ منڈی کا روپ دھار لیتا تھا۔ نہر اور ریلوے پھاٹک کے درمیان والا حصہ تو دھاتی برتن بنانے والی دکانوں پر مشتمل تھا۔ سوڑی گلی بظاہر خواتین کے لیے مخصوص تھی مگر دکانوں کا تمام عملہ مردوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ مردوں کے استعمال کی نسبت یہاں عورتوں کے استعمال کی اشیا کی دکانیں زیادہ تھیں۔ جس طرح اخبار خواتین کی پیشانی پر لکھا ہوتا۔ "خواتین کا اخبار جسے مرد بھی پڑھ سکتے ہیں" اسی طرح سوڑی گلی خواتین کا بازار تھا جہاں مرد بھی جاسکتے تھے۔

میٹرک تک بالخصوص دو مواقع کا بہت انتظار رہتا تھا۔ پہلا موقع جشن تولد نبی آخرالزمان صلی اللہ

علیہ وسلم کی تقریبات ہوتی تھیں۔12 ربیع الاول کے روز تمام بازاروں خصوصاً پاک پتن بازار کو بہت سجایا جاتا تھا۔خوبصورت محرابی دروازے اور تمام بازار پر روشن بلبوں کی گویا ایک چھت بنادی جاتی تھی، میری اور میرے ہم عمروں کی دلچسپی کا مرکز وہ پہاڑیاں تھیں جو پل بازار، دیپال پور بازار کے آغاز اور پاکپتن بازار میں بڑی محنت سے بنائی جاتی تھیں اور ان میں اپنے اپنے تخیل کے مطابق جدت پیدا کی جاتی تھی۔ ہر پہاڑی ایک دوسرے سے بڑھ کر ہوتی۔ان کو دیکھنے والوں کا ایک ہجوم ہوتا تھا۔ساہیوال میں 12 ربیع الاول کے جلوس کا اس وقت تک مجھے علم نہیں تھا اور نہ میں نے کبھی دیکھا۔دوسرا موقعہ دس محرم کا تعزیہ کا جلوس ہوتا تھا جسے ہم بچپن سے ہی دیکھتے چلے آ رہے تھے۔دیپالپور بازار کے آغاز پر دائیں جانب والی گلی میں بڑا امام باڑہ ہے جہاں سے تعزیے کا بڑا جلوس برآمد ہوتا ہے۔پانچویں کلاس تک تو بڑوں کے ساتھ دیکھنے آتے رہے۔ہمارے گاؤں میں تعزیہ دیکھنے کے لیے جانے کو "تابوتوں پر جانا" کہتے ہیں۔تعزیے کا جلوس روٹ کے مطابق تینوں بڑے بازاروں سے گزر کر عصر کے وقت راستے میں ملنے والے تمام جلوسوں کے انضمام کے ساتھ جناح چوک (سابق گاندھی چوک) میں پہنچتا تھا جہاں شام غریباں منعقد ہوتی تھی۔جلوس کی شام غریباں میں نے پہلی بار نویں کلاس میں سنی۔اس کے بعد جلوس گول چکر سے پہلے کربلا روڈ پر مڑ جاتا۔اس وقت سیکیورٹی کے مسائل کا دور دور تک تصور تک نہیں تھا۔بازاروں کی دکانوں پر واقع مکانوں کی چھتوں سے خواتین اور بچوں کو جلوس دیکھنے کی پوری آزادی تھی۔آج سے 55 سال قبل سنی اور شعیہ فکری اختلافات کہیں نظر نہیں آتے تھے۔اس ضمن میں راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

اب ساہیوال سے جُڑے ہوئے ایک جذباتی سفر کا احوال۔میرا بیٹا وجاہت نسیم 1998 میں آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا کہ گاؤں سے ایک شادی کی دعوت موصول ہوئی۔یہ وہی سال ہے جس کی سردیوں کے موسم میں پہلی بار تمام پنجاب میں دھند کے شام ہوتے ہی تمام فضا پر چھا جانے کا آغاز ہوا تھا۔دسمبر 1998 کے دوران ساہیوال کے اس سفر میں وجاہت نسیم بھی میرے ہمراہ تھا، ہم دونوں کا یہ ساہیوال کا پہلا غیر معمولی سفر تھا۔نو بجے صبح کے وقت والی بس میں دو سیٹیں محفوظ کرائیں اور پندرہ منٹ پہلے بس اڈے پر پہنچ گئے مگر وہاں کسی بس کا نام ونشان نہیں تھا۔ہمیں بتایا گیا کہ ابھی صبح پانچ بجے راولپنڈی سے آنے والا ٹائم بھی نہیں پہنچا۔بسوں کی اس تاخیر کی وجہ سے کوئی واقف نہیں تھا۔بس کے انتظار میں دو گھنٹے ہو گئے تو میرے بیٹے کو سفر پر روانگی کے پروگرام کی تنسیخ کی فکر لاحق ہوئی۔مجھے یاد آیا کہ جب والدین کے ساتھ کبھی ساہیوال شہر جانے کا پروگرام بنتا تو موسم یا کسی دیگر وجہ سے پروگرام کی تنسیخ کا دھڑکا بھی لگا رہتا اور کئی بار ایسا ہوا بھی۔اس بات کو یاد کر کے میں نے وجاہت کو کہا کہ اب ہم گھر سے نکل آئے ہیں اور اگر بس نہ آئی تو لاہور کی جانب

جانے والی دور یل گاڑیوں کے کے اوقات ابھی باقی تھے لہٰذا وہ کسی قسم کی فکر نہ کرے۔اس بات کو ابھی دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ راولپنڈی سے آنے والی بس آ گئی جس سے تاخیر کا پتا چلا کہ راستے میں شدید دھند تھی جس یہ گاڑی کئی گھنٹے تاخیر سے پہنچی تھی۔اس کے بعد لاہور والا ٹائم بھی آ گیا تو بس والوں نے سواریاں اتارنے کے فوری بعد واپسی کی تیاری کی اور یوں ہمارے سفر کا آغاز ہو گیا۔اس بس کا روٹ براستہ لودھراں، کہروڑ پکا، میلسی، وہاڑی، بوریوالہ، چیچہ وطنی اور ساہیوال تھا۔شام پانچ بجے ساہیوال پہنچے۔شہر میں ہمارے میزبان واپڈا کالونی کے میاں اشتیاق احمد تھے جو میرے بی اے کے کلاس فیلو تھے۔کچھ توقف کرنے کے بعد میں اور وجاہت پُل بازار کے راستے پاکپتن بازار پہنچے تو ساڑھے چھ بجے کے قریب دھند ٹڈی دل کی طرح اچانک شہر کی فضا پر چھا گئی مگر ہم دونوں کو یہ بہت اچھا لگا۔ہماری منزل اقبال سویٹ ہاؤس تھا جہاں سے ان کا معروف زمانہ گاجروں کا حلوہ کھایا مگر یہ کیا کہ مٹھائیوں کی یہ معروف زمانہ دکان اب بیکری میں بدل چکی تھی اور حلوے کا بھی وہ معیار نہیں تھا اور اس کی تین چار شاخیں بھی شہر پھیلنے کی وجہ سے کھل چکی تھیں اور اب اس دکان کی مقبولیت میں کمی واقع ہو چکی تھی کیوں کہ ان سے بہتر مٹھائی کی دکانیں بھی ہائی سٹریٹ پر کھل چکی تھیں۔

میرے لیے یہ سفر خاصی معنویت کا حامل تھا۔جن بازاروں اور گلیوں میں انتہائی بچپن سے یونیورسٹی جانے تک میری یادیں بکھری پڑی تھیں ان میں اس دن میرا بیٹا میرے ہمراہ تھا۔ پہلے دن دیپالپور بازار، پاکپتن بازار، صدر بازار اور شربت بازار کی سیر کر سکے۔ساتھ ساتھ میں ان جگہوں سے وابستہ اپنی یادوں کا ذکر بھی کرتا جاتا۔ہم دونوں ایک منفرد سی سرشاری اور خوشی کی کیفیت سے دوچار تھے۔اگلے دن ہم گورنمنٹ ہائی سکول پہنچے جہاں میں نے وجاہت کو اپنے کلاس روم دکھائے اور ہیڈ ماسٹر صاحب سے بھی ملاقات کی۔وہاں سے رکشا پر گورنمنٹ کالج پہنچے۔وہ کلاس روم دکھائے جہاں میں نے انٹر اور بی اے کے دوران مختلف مضامین کی کلاسیں پڑھی تھیں۔روز گارڈن اور سنکن گارڈن کے بعد لائبریری پہنچے جو پبلک لائبریری کی حیثیت سے صبح تا شام کھلی رہتی تھی۔کالج ہال کی طرف سے انتظامی بلاک کی جانب آئے جہاں پرنسپل آفس میں اس وقت کے پرنسپل پروفیسر قمر الزماں خاں نے خوش آمدید کہا۔چائے پر ہلکی پھلکی گفتگو کے بعد انہوں نے کالج میگزین ''ساہیوال'' کا تازہ شمارہ بھی دیا۔اگلے دن روایتی تانگے پر گاؤں پہنچے جہاں حسب سابق خوب خوش آمدید کہا گیا۔اگلے دو دن دیہات کی شادی کی گہما گہمی دیکھی۔گاؤں میں پی ٹی سی ایل کے لینڈ لائن فون پر بہاول پور گھر خیریت سے آگاہ کرنا ایک نیا تجربہ تھا۔ چار دن شہر اور گاؤں میں گزارنے کے بعد خوبصورت یادیں سمیٹے واپس بہاول پور روانہ ہوئے۔

یہ بات میں پھر دہرانا چاہوں گا کہ ساہیوال شہر اور گورنمنٹ کالج میرے شعور اور تحت الشعور کا ناگزیر حصہ تھے۔ ان سے دوری اور ہجر کا عرصہ یونیورسٹی کی تعلیم اور بہاول پور ڈویژن میں سروس کرتے گزر گیا۔ 30 اپریل 2013 کو ریٹائرمنٹ کے بعد ایک سال ریٹائرمنٹ کے بعد کے امور نپٹانے میں لگا۔ ذاتی مکان میں رہائش تھی اور بظاہر بہاول پور کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیوں کہ بہاول پور ایک پرسکون اور بڑے شہر کی خصوصیات اور سہولتوں والا شہر ہے۔ جب فیملی کی سطح پر لاہور شفٹ ہونے کی تجویز سامنے آئی تو میں نے اس سے قطعاً اختلاف نہیں کیا۔ میرے ذہن میں شاید ساہیوال کی قربت کا احساس غالب آ گیا اور اپنے شہر سے قربت تو میری 40 سالہ دیرینہ خواہش تھی۔ 13 نومبر 2014 کو میں فیملی سمیت لاہور شفٹ ہو گیا۔ اب مجھے ایک مشکل نے آ لیا۔ اپنے شہر اور کالج سے محبت اور دوری ایک نفسیاتی ناآسودگی میں بدل گئی۔ کہتے ہیں خواب لاشعور کی ناآسودہ خواہشات کا اظہار ہوتے ہیں۔ مجھے عجیب سے خوابوں نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں نے خوابوں میں عجیب و غریب قسم کے استعاروں، کنایوں اور علامتوں سے ساہیوال اور کالج کو دیکھنا شروع کر دیا۔ مثلاً مجھے لگتا میں ساہیوال کے نصف صدی قبل کے بازاروں میں دوڑتا پھر رہا ہوں۔ ایک خواب تو کمال کا تھا، میں نے دیکھا کہ ساہیوال شہر کے بازاروں کی عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ اسی طرح شربت بازار میں گاؤں کے میاں ریاض کی دکان پر بیٹھا ہوں اور سامنے حکیم صاحب کے مطب کے کونے میں شربت کی دکان پر ریڈیو بج رہا ہے جس پر مہدی حسن کے گانے آ رہے ہیں۔ زیادہ خواب کالج کے تھے جو ادھورے اور تشنہ، غیر واضح اور مبہم سے ہوتے تھے۔ فوراً جاگ جانے سے ان کا کچھ حصہ یاد رہ جاتا تو طبیعت بوجھل ہو جاتی۔ ان مبہم اور غیر واضح خوابوں میں کبھی میں کسی کلاس روم میں پڑھا رہا ہوتا، کبھی سٹاف روم میں چائے پی رہا ہوتا، لگتا جیسے دوستوں سے مل رہا ہوں، کالج لائبریری میں بیٹھا ہوا ہوں۔ تمام چہرے اجنبی اور مبہم ہوتے۔ یوں کہیں کہ مناسب وقفوں سے آنے والے ان خوابوں نے میری مت مار دی۔ آخر میں نے اس نفسیاتی الجھن سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے بیٹے کے ساتھ لاہور سے ساہیوال کا ایک خصوصی دورہ رکھا جس میں پہلے گاؤں گئے، تمام رشتے داروں اور عزیزوں سے ملے۔ ساہیوال شہر آئے، کسی کا ایک موٹر سائیکل پکڑا اور پہلے کالج کا چکر لگایا مگر کالج کی عمارت میں کئی اضافے اور تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ پھر میں نے شہر کا رخ کیا، مشن ہسپتال سے ہائی سٹریٹ پر آیا مگر یہ کوئی اور جگہ محسوس ہوئی۔ ہائی سٹریٹ ہر قسم کی دکانوں سے بھر چکا تھا۔ پاشا سٹریٹ داخل ہوا تو الیکٹرک کے سامان کی دکانیں ہی دکانیں تھیں۔ جناح پارک سے پاک پتن بازار آنے کی کوشش کی مگر راستہ بلاک تھا اور ٹریفک آپس میں گتھم گتھا تھی۔ دس منٹ انتظار کرنے کے بعد واپس ہو لیا اور پاشا سٹریٹ سے ایک تین فٹ کی پرانی گلی سے صدر بازار آیا تو تجاوزات نے اتنے بڑے بازار کو مفلوج کر رکھا تھا اوپر سے مشینی اور غیر مشینی ٹریفک کا اژدہام۔ صدر بازار سے پاکپتن بازار آیا تو جہاں کبھی تانگے چلا کرتے تھے وہاں موٹر سائیکل چلانا مشکل ہو گیا۔ آخری منزل شربت بازار تھی، وہاں شربت کی کوئی دکان نہیں تھی، سب

ختم ہو چکی تھیں بل کہ پلاسٹک کے سامان اور تجاوزات سے بھری دکانیں ہی نظر آئیں۔ گاؤں کی دکان کب کی ختم ہو چکی تھی، اس سے دو دکانیں آگے آیا تو گاؤں کی ایک اور دکان نظر آئی۔ پہلے دکانیں اور ان کے سامنے کے چبوترے (تھڑے) تین سے چار فٹ اونچے ہوتے تھے اور تین سیڑھیوں سے دکان تک جانا ہوتا، اب دکانیں زمین یا سڑک کے ساتھ جا لگی تھیں۔ وہاں موٹر سائیکل کھڑی کی، دکاندار نے پہچان لیا۔ وہاں 15 منٹ بیٹھا، ان کے ساتھ مل کر ماضی کو یاد کیا۔ شربت بازار سے ہائی سٹریٹ کی طرف آیا، کوئی گھومتا ہوا بیل نظر آیا نہ کولہو۔ سارا راستہ پھلوں کی ریہڑیوں نے گھیر رکھا تھا۔ ریلوے روڈ آیا جہاں سے کھوکھا بازار اور پھر چرچ روڈ، کھوکھا بازار اپنی جون بدل چکا تھا۔ چرچ روڈ کا راستہ جمی ہوئی مٹی سے اٹا ہوا، معلوم ہوا کہ اس کے آس پاس سبزی اور فروٹ منڈی ہے اور یہاں بھی انہی چیزوں کی ریہڑیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ بدمزہ ہو کر واپس ہوا، بیٹا منتظر تھا، واپس لاہور ہو لیے۔ گوگل ارتھ پر دو گھنٹے ساہیوال شہر کا جائزہ لیا، ہمارے وقت شہر سے باہر صرف سیٹلائیٹ ٹاؤن کی آبادی تھی جس کا نام بعد میں فرید ٹاؤن رکھ دیا گیا۔ اوکاڑہ جب ضلع بنا تو ساہیوال نامکمل لگا تھا جیسے اس کے وجود کے ٹکڑے کر دیے گئے ہوں، پاک پتن ضلع بنا تو ساہیوال کا ماضی کے مقابلے میں صرف تیسرا حصہ رہ گیا تھا مگر آج ساہیوال ڈویژن ہے جس سے پرانے حصے کسی طور واپس آن ملے، یونیورسٹی، بورڈ، ڈویژنل سطح کے دفاتر اور کیا کیا کچھ اضافے ہو چکے ہیں۔ گوگل میپ نے بتایا کہ اب ساہیوال ماضی کے مقابلے میں چاروں اور اتنا پھیل چکا ہے کہ نئے ساہیوال میں 70 سال پہلے کا ساہیوال تلاش کرنا ایک کارِ لاحاصل اور محض ایک خواب ہے اور اب مجھے ساہیوال سے متعلق ناآسودہ خوابوں سے نجات مل چکی ہے۔

2021 کے دوران آئرلینڈ میں مقیم مائکروسوفٹ کے انجینئر اور گورنمنٹ کالج ساہیوال کے سابق طالب علم میاں عاطف محمود اور ان کے ساتھیوں کی کاوشوں اور کالج کی انتظامیہ کے تعاون سے کالج کے سابق طلبا کے لیے "جی سی ساہیوال ایلومنائی" تشکیل دی گئی جس کا باقاعدہ ایک آئین مرتب کیا گیا اور ایک گورننگ باڈی کی تشکیل کی گئی۔ کالج کی آفیشیل ویب سائیٹ پر ایلومنائی کے لنک کا اضافہ کیا گیا اور گورننگ باڈی کے علاوہ بورڈ آف ایڈوائیزرز، ورکنگ باڈی، سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی اور ر ایلومنائی ممبرز رجسٹریشن اور ممبرز ڈائریکٹری کے سب لنک دیے گئے۔ ایلومنائی کی کاوشوں سے انٹر اور بی ایس کے طلبا کے لیے سالانہ سکالر شپس کا بھی اعلان کیا گیا۔ گذشتہ سال ایک فلاحی ادارے کے تعاون سے معذور طلبا و طالبات کو ویل چیئرز بھی دی گئیں۔ اس ایلومنائی میں اس بات کو بنیاد کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ موجودہ معاشرتی مقام و مرتبہ سے بالاتر تمام ممبرز کالج سے حاصل کردہ تعلیم کی بنیاد پر یکساں اہمیت اور توقیر کے حامل ہیں۔ 2021 کے دوران پہلے سالانہ کھانے کی تقریب کا کامیاب انعقاد کیا گیا۔ مجھے بہت بعد میں سوشل میڈیا کے ذریعے معلوم ہوا۔ میں نے میاں عاطف محمود سے رابطہ کیا اور انہیں ایلومنائی کے قیام اور تقریب کے کامیاب انعقاد پر مبارک باد دی۔ دوسرے سالانہ کھانے کی تقریب 21 نومبر 2022 کو ہوئی جس میں شرکت کے لیے خصوصی طور پر ساہیوال

گیا۔ میرے لیے یہ ایک جذباتی سفر تھا۔" گورنمنٹ کالج ساہیوال ایلومنائی ایسوسی ایشن کے دوسرے ڈنر کی تقریب کے دوران اتری ایک کارروائی" کے عنوان سے ایک جذباتی روداد لکھی جس سے چند اقتباسات پیش ہیں۔

" یہ میری زندگی کی ایک خوبصورت شام تھی۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال ایلومنائی ایسوسی ایشن کا پہلا ڈنر اکتوبر 2021 میں منعقد ہوا تو بہت بعد میں خبر ہوئی۔ 19 نومبر 2022 کی شام دوسرے ڈنر میں شرکت کے لیے کالج پہنچے تو کالج اپنے گذشتہ 70 سال کی تربیت کردہ نسلوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ جیسے ہی سائیکل سٹینڈ کی طرف والے گیٹ سے داخل ہوئے تو میری نظر سائیکل سٹینڈ پر پڑی تو مجھے یاد آیا کہ ہر سائیکل کے لیے نمبر الاٹ ہوا کرتا تھا اور وہ نمبر سائیکل کے پچھلے مڈگارڈ کے نچلے حصے پر لکھوانا ضروری تھا۔ مجھے گاڑی سمیت کالج کے سامنے والی سڑک پر جانے کی اجازت مل گئی۔ میں نے جیسے ہی کالج بلڈنگ پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ کالج کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی جیسے کہہ رہا ہو۔" مجھے معلوم تھا کہ تم اس دفعہ ضرور آؤ گے۔ میں دیگر لوگوں کے ساتھ ساتھ تمہارا بھی منتظر تھا۔ گذشتہ بار تم 1998 میں آئے تھے اور تمہارے ساتھ بیٹھا ہوا تمہارا بیٹا آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا اور تم اسے اپنے چیدہ چیدہ کلاس رومز اور ریڈنگ روم دکھاتے رہے۔ آج تم اتنی مدت بعد آئے ہو تو میں بہت خوش ہوں۔ اس لیے بھی کہ تم نے میرا پڑھایا ہوا پہلا سبق یاد رکھا کہ جو تم لکھتے پڑھتے ہو، اپنی گفتار، کردار اور رویے سے ویسے نظر بھی آؤ۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ تم نے استاد کا پیشہ اپنایا اور اپنے طلبا تک بھی یہ پیغام تا دم ریٹائرمنٹ پہنچاتے رہے۔ خوش آمدید اے میرے نصف صدی پرانے طالب علم!" مجھے یقین ہے کہ کالج نے اپنے مختلف جگہوں سے آئے ہوئے تمام پرانے طلبا کو فرداً فرداً خوش آمدید کہا ہوگا۔ کالج سے گفتگو کا یہ مرحلہ پل بھر میں بیت گیا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ممتاز احمد، ڈاکٹر افتخار شفیع اور ان کے معاونین نے دیگر لوگوں کے ساتھ ساتھ ہمارا بھی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ تمام شرکا کے چہرے اپنی مادر علمی سے مل کر تمتمار ہے تھے۔ وہ ٹولیوں میں ان لمحوں کو اپنے موبائل کیمروں میں منتقل کر رہے تھے۔ میں کالج آفس کے گیٹ کی طرف سے اندر داخل ہوا تو بے ساختہ میں نے کالج کی عمارت کو چوم لیا۔ اس موقع پر میری آنکھیں فرطِ مسرت سے گیلی ہونے کی بجائے روشن ہوگئیں۔ میں کہ سٹک کی سپورٹ سے بھی بمشکل چل سکتا تھا، نجانے طاقت کہاں سے آ گئی، میں نے اکیڈیمک بلاک کے زیریں حصے اور کالج ہال کے سامنے والے گراسی لان اور پرانے ریڈنگ روم کے پورشن کو جی بھر کر دیکھا۔ چند ثانیے پرنسپل آفس میں بیٹھنے کے بعد میں پنڈال میں اپنے نام کی چٹ لگی نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔

میرے سامنے اکیڈیمک بلاک کے پہلے پورشن کا برآمدہ اور اوپر نیچے تمام کمرے جگمگا رہے تھے۔ مجھے ماضی کے بطن میں اترتے ایک لمحہ لگا۔" اوپر سامنے اس وقت کے کمرہ نمبر 12 میں انگریزی کے استاد پروفیسر علی اظہر نقوی طلبا کو ساتھ لے کر ٹرانس میں جا چکے ہیں اور کیٹس کی کسی نظم کی جمالیاتی پرتیں کھلتی چلی جا

رہی ہیں۔ آخر یہ ٹرانس پیریڈ ختم کرنے والی گھنٹی سے اختتام کو پہنچا۔ ساتھ والے کمرے میں دلدار پرویز بھٹی اپنے شگفتہ انداز سے ہم سے محوِ گفتگو ہیں اور دل چاہتا ہے کہ یہ پیریڈ کبھی ختم نہ ہو مگر حقائق خواہشات کے تابع نہیں ہو سکتے۔ پیریڈ کی گھنٹی نجانے کب بجی محسوس ہی نہیں ہوا تا آنکہ اس کمرے میں پیریڈ لینے والے استاد نے دروازہ کھٹ کھٹایا تو احساس ہوا کہ دس منٹ اوپر ہو چکے ہیں۔ نیچے ایک کلاس روم میں پروفیسر سید اکبر علی شاہ جدید فارسی لہجے میں اپنی نرم گفتاری سے حافظ شیرازی کی غزل پڑھ کر اس کی اردو میں تشریح کر رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ حافظ شیرازی کی شاعری کا غالب عنصر امید پسندی اور رجائیت ہے جس کی وجہ سے ایران میں حافظ کے کلام سے فال نکالنے کی رسم بہت پختہ اور پرانی ہے۔ ابھی غزل کے مندرجہ ذیل دو اشعار ہی ہوئے تھے کہ کلاس کا وقت ختم ہو جاتا ہے:

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند　　چنان نماند چنین ہم نخواہد ماند

من ارچہ درنظر یار خاکسار شدم　　رقیب نیز چنین محترم نخواہد ماند

(مجھے خوش خبری ملی ہے کہ غم کے دن نہیں رہیں گے۔ وہ (یعنی خوشی کے دن) نہیں رہے تو یہ بھی نہیں رہیں گے۔ میں اگرچہ محبوب کی نظر میں" کم تر"ہو گیا ہوں مگر رقیب بھی زیادہ دیر"باعزت" نہیں رہے گا)

اگلی کلاس اوپر کے کلاس روم میں ہے۔ ہم جلدی میں سٹینڈنگ ہال سے اوپر جانے والی بائیں جانب کی سیڑھیوں سے کلاس روم میں پہنچتے ہیں کیوں کہ اکنامکس کے پروفیسر محمد اسلم صاحب پیریڈ بجتے ہی کلاس روم میں پہنچ جاتے ہیں اور پانچ منٹ کے بعد کوئی سٹوڈنٹ معقول وجہ بتائے بغیر کلاس روم میں داخل نہیں ہو سکتا۔ وہ بہت توجہ اور محنت سے تیار کیے ہوئے لیکچر میں مگن ہیں- ان کے پیریڈ میں خاص طور پر پن ڈراپ خاموشی ہوتی ہے۔ جو طالب علم سرگوشی کرے اس کو چاک کے ٹکڑے کا تاک کر نشانہ بناتے ہیں کہ کبھی کبھار ہی خطا ہوتا ہے۔ یہی ان کی طرف سے بڑی سزا ہے۔ وہ قانون تقلیل افادہ مختتم کو ایک گراف کے ذریعے سمجھانے میں مصروف ہیں اور طلبا کی طرف بھی دیکھتے جاتے ہیں۔ مجھ سے اگلی قطار میں بیٹھے ہوئے دو طلبا سرگوشی کرتے ہیں، وہ نوٹ کر لیتے ہیں اور تاک کر ان دو طلبا کی طرف چاک کا ٹکڑا پھینکتے ہیں جو خطا جاتا ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ چاک کا ٹکڑا میری جانب آ رہا ہے۔ میں اس سے بچنے کے لیے اپنی گردن کو گھماتا ہوں کہ تقریب میں میرے ساتھ بیٹھا ہوا دوست مجھ سے پوچھتا ہے۔ آپ نے گردن کو بہت تیزی سے گھمایا ہے، خیریت ہے؟ اب میں اسے حقیقت کیا بتاتا کہ میں نصف دہائی قبل کے دور میں ایک کلاس روم میں تھا۔ اب میں واپس آ چکا تھا۔ میں نے اردگرد دیکھا کہ مہمان اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے اور ڈاکٹر افتخار شفیع تقریب کا آغاز کر رہے تھے۔

ہوتے ہوتے سلسلہ کلام مجھ تک پہنچا تو میں نے کچھ کہا، کچھ ان کہا رہ گیا۔ کہی اور ان کہی کو ملا لیں تو بات کچھ یوں بن پائی۔" گورنمنٹ کالج ساہیوال ایلومنائی کے دوسرے سالانہ ڈنر کے انعقاد پر ہم تمام شرکا

پرنسپل صاحب اوران کی ٹیم کے بہت ممنون ہیں اوران کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ یہ ایک خوبصورت خواب تھا کہ جو آج پورا ہو رہا ہے۔ میں کہ ساہیوال کے قریب ایک گاؤں 101 /9-ایل کا ایک لو پروفائل طالب علم تھا اور تعلیم کے ضمن میں بے سمتی کا شکار تھا۔ نہیں معلوم تھا کہ کیوں پڑھ رہے ہیں۔ اس کالج نے سب سے پہلے ہمیں یہ سبق دیا کہ یہاں پر جو تعلیم حاصل کرو اسے اپنے کردار، گفتار اور رویّو ں سے بھی منعکس کرو یعنی پڑھے لکھے نظر بھی آؤ۔ یہاں پر نصف صدی پہلے اساتذہ رول ماڈل ہوا کرتے تھے اورانہی سے متاثر ہوکر استاد بننے کا فیصلہ کیا۔ کالج کی ہم نصابی ماحول نے ہماری تربیت کے ارتقائی عمل کو تیز تر کیا اور آخر استاد بن گئے۔ 1978 میں شروع ہونے والا تدریسی اور انتظامی کیریئر 2013 میں اختتام کو پہنچا۔ اس دوران اس کالج کی تمام روایات میرے ساتھ ساتھ چلیں۔ وہ تمام اچھی باتیں جو یہاں سے سیکھیں انہیں اپنے طلبا اور اداروں کو منتقل کیا۔ اگر یہ کالج نہ ہوتا یا ہم یہاں نہ پڑھ پاتے تو زندگی میں کچھ بھی نہ کر پاتے۔ سلام ہے اس عظیم مادرِ علمی کو۔ اس سے پہلے کہ لکنت ہمارے لہجوں کو پکڑ لیتی یا ہماری بصارتیں آج ملنے والے دوستوں کے خط وخال کو پہچاننے میں دقت محسوس کرتیں، اس تقریب کے انعقاد نے ہمارے اندر زندگی کی روح پھونک دی ہے۔ تقریب کے منتظمین اور معاونین کی محنت اور عجز وانکسار کو بھی خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔" تقریب جاری رہی، کوئی روسٹرم پر آ کر بول رہا تھا کسی کے پاس مائیک پہنچا دیا جاتا اور وہ میری طرح گردشی کارڈلیس مائیک پر اپنی نشستوں پر بیٹھ کر ہی اظہار خیال کر لیتا تا آنکہ تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد عازم لاہور ہونے کے لیے گاڑی میں بیٹھا تو ایک ایک معروف گائیک کی گائی ہوئی غزل کا پہلا شعر ذہن میں گونجنے لگا:

جب اگلے سال یہی وقت آ رہا ہو گا
یہ کون جانتا ہے کون کس جگہ ہو گا

اس سے قبل کہ کالج کے گیٹ سے باہر نکلتے، میں نے مڑ کر کالج کو الوداع کہا۔ مجھے لگا جیسے کالج نے ہاتھ ہلا کر میرا جواب دیا اور کہا، "الوداع میرے بچے الوداع۔ آئندہ سال ضرور آنا، میں تمہارا منتظر رہوں گا۔ کالج سے نکلے تو ساہیوال کی سڑکوں اور بازاروں میں گھومتے، بچپن سے آج تک کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے، عازم لاہور ہوئے۔''

اب گاؤں کے وہ افراد اور شخصیات جن سے میرا کسی نہ کسی طور قریبی تعلق رہا۔

بہادر خاں زآر:- گاؤں کی شخصیات میں ان کا ذکر سب سے پہلے کروں گا۔ ان کی منفرد شخصیت قدرت کی طرف سے ایک عطا تھی۔ ایسا انسان ہماری تہذیبی وثقافتی زندگی میں کبھی پہلے ہوا نہ آئندہ ہوگا۔ اس ایک انسان میں بہت سی خصوصیات جمع ہوگئی تھیں۔ وہ ایک مکمل شاعر، عالم اور روحانی شخصیت تھے۔ وہ سارے گاؤں کے لیے ایک انسپائریشن اور رہنما کا درجہ رکھتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں پرائمری سکول 1964

کے دوران کھلا جب ان کی عمر ساٹھ برس سے زائد تھی۔ یہ عجیب اسرار ہے کہ انہوں نے لکھنے پڑھنے کی تعلیم کہاں سے حاصل کی تھی؟ قرب و جوار میں کوئی دینی تعلیم کا مدرسہ بھی نہیں تھا۔ آخر کار نظر رینالہ خورد کے قریب دریائے راوی کی جانب دیپڑ شریف کی طرف جاتی ہے جہاں پیر سردار علی شاہ کا روحانی فیض جاری تھا۔ کسی نا کسی طرح بہادر خاں اس چشمہ فیض کے دائرہ اثر میں آ گئے ہوں گے، ایک طویل قیام کے بعد وہاں سے نکلے تو مرشد کی تربیت نے انہیں کندن بنا دیا تھا۔ جس شخص کی ذاتی لائبریری میں کیمیائے سعادت اور کشف المحجوب جیسی کتب ہوں ان کا روحانی علم بھی اسی درجے کا ہوگا۔ وہ باروں کی زبان یا پنجاب کے خالص مقامی لہجے کے بے مثل شاعر کے طور پر سامنے آئے اور اپنی شاعری کے حوالے سے بہت پر اعتماد تھے اس لیے اپنی شاعری اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں:۔

سیف زبان ہے ترِکھّی میری تاں میں سِر چڑھائی اے
صَرصر وانگوں فَرفَر چَلّے جس طرَف چلائی اے

میاں بہادر علی زار بلوچ ہمارے گاؤں کی ایک غیر معمولی اور معجزاتی شخصیت کا نام ہے۔ وہ صرف گوشت پوست کے بنے ہوئے ایک عام انسان نہیں تھے بل کہ میرے لیے، میرے بزرگوں اور گاؤں، تمام برادری کے لیے ایک عہد کا نام ہیں۔ وہ عہد ان کی وفات (12 جنوری 1972) کے ساتھ ختم نہیں ہوا بل کہ پانچ دریاؤں اور پنجاب کی ساندل، گنجی اور نیلی باروں کا مقامی ٹھیٹھ لہجہ بولنے والوں میں پانچ دہائیوں سے کچھ زیادہ عرصہ (باون برس) گزرنے کے باوجود بھی وہ شاعری میں تخلیق کردہ کلام اور اپنے آفاقی کلام اور اپنی طاقتور اور متاثر کن شخصیت کے زور پر زندہ ہیں۔ آج بھی ان کی شخصیت اور تخلیقی کام کے اثرات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے دو بیٹوں ظفر علی اور محمد یونس نے ان کے کلام کو اصل ریفرنس سے سنانے کی روایت جاری رکھی۔ محمد یونس کے کچھ عرصہ قبل انتقال تک گاؤں میں ان کا کلام سنا اور سنایا جاتا رہا۔ ان کے کلام کے اصل ذرائع پر اَسرار طور پر کہیں کھو گئے مگر تین عدد رجسٹر موجود ہیں جن میں ان کا کلام نقل کیا گیا ہے گویا ان کا عہد آج بھی جاری ہے۔ میں نے ان کے کلام کی تدوین و ترتیب کر کے 230 صفحات پر مشتمل "میاں بہادر علی زار دا چونواں کلام"، پر مشتمل کتاب گزشتہ دنوں اپنی گرہ سے شائع کی ہے جس کی میں نے کوئی قیمت وصول نہیں کی۔ کتاب کی تمام آمدنی گاؤں کی زیرِ تعمیر مسجد کے لیے وقف کی ہے۔

امام علی:۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا پہلا نام مہابلی تھا جسے بعد میں امام علی سے بدل دیا گیا۔ وہ میاں بہادر علی زار کے چھوٹے بھائی تھے اور تصوف کے حوالے سے بہت شد بد رکھتے تھے۔ وہ میرے والد کے بہت ہی قریبی دوست تھے۔ جب ان کے بڑے بیٹے کی پیدائش ہوئی تو گاؤں کی روایت کے مطابق میرے والد نے ان کے ہاں متعدد تحائف بھیجے۔ ان تحائف کو مقامی زبان میں "روٹی یا ٹکی" کہا جاتا ہے جب میری گل تراشی کی تقریب بڑے پیمانے پر ہوئی تو جواباً انہوں نے بھی "ٹِکّی" بھیجی تھی۔ میں جب کالج اور پھر یونیورسٹی گیا تو وہ

میرے ساتھ مولانا روم سے علامہ اقبال تک کی شاعری اور فلسفے کے بہت سے پہلوؤں پر بحث کرتے تھے۔ اپنے بڑے بھائی کی طرح ان کی طبیعت بھی شاعری کی طرف مائل تھی مگر ان سے وابستہ کوئی شاعری تحریری صورت میں موجود نہیں ہے۔ ان کے بڑے بیٹے زبیر خاں علاقے کے جانے پہچانے لوک گلوکار ہیں۔

محمد علی ولد کرم علی خاں۔ ہمارے گاؤں کے چار حصے ہیں۔ مرکزی چوک سے سیدھی باہر نکلنے والی چار سڑکیں دراصل گاؤں کو چار حصوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ آدھا گاؤں مشرقی اور دوسرا آدھا گاؤں مغربی جانب دو حصوں میں منقسم ہے۔ میرے نانا کل پانچ بھائی تھے۔ بڑے بھائی یعنی میرے نانا گاؤں کے اپنے حصے کے لمبر دار تھے۔ محمد علی بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھے۔ ایوب خاں کے دور حکومت میں بنیادی جمہوریت کا جو تجربہ کیا گیا تھا اس کے تحت ہمارے گاؤں کے دونوں حصوں کی ایک ایک بی ڈی ممبر کی سیٹ تھی۔ محمد علی اس سیٹ کے لیے نہایت موزوں تھے اور دو بار کے الیکشن میں دونوں بار وہ جیتے۔ گاؤں کی سیاست اور پبلک ریلیشنز کے وہ ماہر تھے اور ان کے بہت سے دوست مختلف علاقوں سے آتے رہتے تھے۔ غالباً 1966 کے موسم سرما میں ان کا اچانک انتقال ہو گیا جس سے تمام خاندان کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا۔

فلک شیر خاں۔ میرے والد کے چچازاد تھے۔ ان کے ایک پاؤں کا کسی قدر مسئلہ تھا مگر اسے انہوں نے کمزوری نہیں بننے دیا۔ والدین کے اکلوتے تھے۔ کچھ تعلیم بھی تھی، بہت خوشخط اور باذوق تھے۔ اپنے معاصرین میں شعوری لحاظ سے بہت آگے تھے۔ انہوں نے ایک بیٹھک بنا رکھی تھی جس میں ایک صوفہ بھی تھا جو غالباً ہمارے گاؤں کا پہلا صوفہ تھا۔ پہلے فلپس کا ریڈیو اور بعد میں ٹیپ ریکارڈر رکھنے والے گاؤں کے پہلے شخص تھے۔ کسی کو خط لکھتے تو ان کی عبارت معنویت کا شاہکار ہوتی۔ انشورنس پالیسی لینے والے وہ گاؤں کے واحد شخص تھے، شوقین اتنے کہ باقاعدہ ایک خصوصی ایڈیشن کا تانگہ وگھوڑا مع کوچوان رکھا ہوا تھا جو محض سیر کے لیے وقف تھا۔ 1969 میں اردو ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بنے۔ کسی کی خوشامد تو درکنار، بات منہ پر کرنے کے قائل تھے۔ طبیعت میں ناقدانہ پن اور غصہ بھی تھا جس کا اظہار وہ برملا کرتے۔ ان کے ریڈیو اور ٹیپ پر اکثر میں ہی ہاتھ صاف کرتا۔ بین الشخصی گفتگو کے ماہر اور داستان گوئی میں متاثر کن مہارت کے حامل تھے۔ چند باتوں کو چھوڑ کر ان سے مجھے سیکھنے کو بھی بہت کچھ ملا۔ زندگی کے آخری حصے میں بہت علیل تھے تو میں نے انہیں علاج کے لیے قائل کرنا چاہا تو مجھے یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ "بہت جی لیا، اب میں موت کے ذائقے سے آشنا ہونا چاہتا ہوں'' اور آخر وہ اپنی ہٹ کے پکے نکلے۔

بیربل خاں۔ میرے خالہ زاد۔ پہلی بیوی سے میرے نانا کی دو بیٹیاں تھیں، بیٹا نہیں تھا۔ پھر آگے ان دونوں بہنوں کا ایک ایک بیٹا، بیٹی نہیں تھی۔ میرے نانا نے دوسری شادی کی تو ان سے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی۔ گاؤں میں سگے یا سوتیلے کا کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا۔ میری دوسری نانی اور خالہ بھی ہم دونوں نواسوں سے بے حد پیار کرتی تھیں۔ بیربل خاں میرے ساتھ بہت محبت کرتے تھے اور میرا بے حد خیال رکھتے

تھے۔انہوں نے ہی پہلی دفعہ مجھے لاہور دکھایا اور بعد میں بھی جب کہا، لے جاتے رہے۔میں یونیورسٹی میں تھا تو مجھے تواتر سے ملنے آتے رہے۔رحیم یار خان میں جب میں نے جوائن کیا ہی تھا تو مجھے ملنے آئے اور پھر ان کا آنا جانا لگا رہا۔وہ میرے مربی، رہنما اور دوست تھے۔میں نے بچپن ہی سے انہیں پانچ وقت کی نماز کی پابندی کرتے دیکھا۔شریف النفس اور نفیس الطبع تھے۔گاؤں کے جھگڑوں کا حصہ نہیں بنتے تھے بل کہ صلح کل کے قائل تھے۔اواخر عمر میں بینائی چلی گئی تو مجھے میرے قدموں کی آہٹ سے پہچان لیتے۔میرے والدین کے بعد وہ پہلے شخص تھے جن کی وفات پر میں دکھ کے ساتھ رویا۔

ماسٹر نور احمد۔میرے پرائمری تک کے کلاس فیلو۔میٹرک محمودیہ ہائی سکول ساہیوال سے کیا اور پی ٹی سی غالباً سہالہ راولپنڈی سے کیا۔خودساز انسان تھے۔اپنی ہمت کے بل بوتے پر استاد بنے۔جو کمایا اسے بچایا، بے جا لٹایا نہیں، شاید اس لیے ساہیوال شہر میں اپنا مکان بنانے میں کامیاب ہوئے۔بچت کا انہیں ایسا لطف آیا کہ شہر میں جائیداد بنانے میں مصروف ہو گئے۔شہر کے مکان میں زیادہ تر اکیلے ہی رہے کیوں کہ ان کی فیملی تو گاؤں ہی میں رہی۔میری بہت عزت اور خیال کرتے تھے۔ان سطور کی تحریر کے دوران پتا چلا کہ کسی طبی پیچیدگی کے باعث ہونے والے آپریشن سے جانبر نا ہو سکے۔

ماسٹر شہادت علی۔یہ بھی میرے پرائمری کے کلاس فیلو تھے۔مڈل کے لیے 99/9-ایل کے مڈل سکول کا انتخاب کیا۔میٹرک شاید اسلامیہ ہائی سکول سے کیا۔انٹر سال اول میں گورنمنٹ کالج ساہیوال میں ہم اکٹھے داخل ہوئے مگر چند ماہ کے بعد کالج کی تعلیم ترک کر دی۔پی ٹی سی گورنمنٹ نارمل سکول ساہیوال سے کی۔پرائمری کے استاد بنے۔زیادہ تر 102/9-ایل کے سکول میں رہے۔اپنے گاؤں کے سکول بھی تبادلہ کرایا مگر ہیڈ ماسٹر سے جھگڑا ہو گیا۔اس کے بعد کا حال مجھے معلوم نہیں۔آخری ملاقاتوں میں محسوس کیا کہ لوگوں پر طنز و تشنیع سے کام لے کر لطف لینے لگے تھے۔جگر کی بیماری سے جانبر نا ہو سکے۔مجھے ان کی وفات کا بہت دیر بعد علم ہو سکا۔

محمد الطاف۔کالج میں میرے جونیئر تھے لیکن تعلیم ترک کر دی۔ان کے والد گاؤں کے پہلے فرد تھے جنہوں نے شادی خاندان سے باہر کی۔محمد الطاف کی والدہ کچھ زرعی زمین اور سبزی منڈی ساہیوال میں ایک مکان جہیز میں لائیں لہٰذا یہ گاؤں میں مالی طور پر بہت آسودہ تصور کیے جاتے تھے۔ان کے والد نے سوزوکی موٹر سائیکل اس وقت خریدا جب شہر میں بھی خال خال کسی کے پاس ہوتا تھا۔مالی آسودگی کی وجہ سے گاؤں میں بھی زرعی زمین کی جائیداد بنائی۔گاؤں میں میرے قریبی اور پرخلوص دوست تھے۔دل کا عارضہ لاحق ہوا تو ادویات کا آغاز ہوا۔حج پر گئے تو ادویات میں کچھ لاپرواہی سی ہو گئی۔ان کی وفات کا علم بھی مجھے بہت دیر بعد ہوا۔

ظفر خاں۔میرے چچا زاد، تین بھائیوں میں بڑے، پرائمری سکول میں مجھ سے بڑی کلاس میں

تھے۔ استاد سے کچھ ایسے فرینک سوال کر بیٹھتے جن کا نتیجہ سزا کی صورت میں ملتا۔ سکول یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ پڑھ کر کونسی نوکری مل جانی ہے۔ سیر وسیاحت کے بہت شوقین تھے۔ غصے میں لڑائی بھڑائی کے بھی قائل تھے۔ مری گئے تو ایک بندریا لے آئے۔ شوق پورا ہوا تو بیچ دی۔ گھر سے دو ماہ غائب رہے واپس آئے تو بتایا کہ سندھ گیا تھا، گلے میں تسبیح ڈال کر پیر بن گیا۔ خوب آؤ بھگت کی گئی اور نذر ونیاز سے بھی خوب آمدنی ہوئی۔ 1978 کے دوران ساہیوال شہر سے سائیکل پر گاؤں آ رہے تھے۔ نہر 9 ایل کی پل پر گاؤں کے ایک شخص کو پیچھے سوار کر لیا۔ 135 / 9-ایل کے بعد سامنے سے بس آ رہی تھی، جب بس قریب آئی تو پیچھے بیٹھا ہوا شخص خوف سے سائیکل سے کود گیا، سائیکل کا توازن برقرار نہ رہ سکا اور بس سے ٹکرا کر سر کے بل سڑک پر گرے، سر پر چوٹ سے قومے میں چلے گئے، ایک ہفتہ موت وحیات کی کشمکش میں رہے، موت جیت گئی۔

ذوالفقار علی خاں۔ میرے ماموں، بہت ذہین تھے، پرائمری پاس کرنے کے بعد ہم دونوں نے داخلہ ٹیسٹ پاس کر کے چھٹی کلاس میں داخلہ لیا۔ پہلے ہم مشترکہ ٹانگے پر جاتے آتے رہے پھر انہیں سائیکل کا شوق ہوا تو چھوٹی سائیکل لے لی۔ آٹھویں سے پہلے ہی سکول چھوڑ دیا۔ والد کی وفات کے بعد لمبردار بنے۔ خوش ذوق اور خوش پوشاک تھے۔ میں یونیورسٹی میں تھا تو متعدد بار ملنے آئے، ماموں کی حیثیت سے اچھا کھانا کھلانا اور چند روپے خرچے کے دینا ان کا معمول تھا۔ طویل علالت کے بعد 2004 کے دوران خالق حقیقی سے جا ملے۔

ماسٹر صادق جاوید: تعلق چک نمبر 134 / 9ایل سے مگر ہمارے گاؤں کے پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ خوش پوشاک، خوش گفتار اور نفیس انسان ہیں۔ انہوں نے زندگی میں آگے بڑھنے کی تحریک دی، رہنمائی کی اور زندگی گزارنے کا سلیقہ اور قرینہ سکھایا۔ میں ان کا احسان کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ پچھلے دنوں ان کے بارے میں معلوم ہوا کہ فرید ٹاؤن ساہیوال میں رہائش پذیر ہیں۔ اپنے بیٹے سمیت اس محسن کے دیدار کے لیے حاضر ہوا۔ عمر رسیدگی کی وجہ سے بمشکل پہچانا۔ اب ان کی عمر پچاسی سال کے قریب ہوگی۔ اللہ انہیں صحت والی عمر خضر عطا فرمائے۔

شہزاد احمد۔ ایک اچھا اور سلجھا ہوا نوجوان، میری دوسری خالہ کی نسبت سے میرے خالہ زاد۔ میری خالہ اور ان کی والدہ ان کے بچپن میں ہی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال سے بی ایس ای کی۔ اپنی خود اعتمادی اور ٹیلنٹ کے زور پر گلشن، گلستان سپننگ ملز، حلیب ڈیری اور سینچری پیپر ملز سے ہوتے ہوئے ماسٹر مولٹی فوم میں پروڈکشن منیجر مقرر ہوئے۔ اپنی بہترین صلاحیتوں سے ڈپٹی جنرل منیجر کے طور پر ترقی پائی۔ اپنی فیملی کے ساتھ لاہور میں قیام پذیر ہیں، اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ جدوجہد اور محنت کے لحاظ سے میں انہیں اپنا تسلسل سمجھتا ہوں۔

محمد علی: ہمارے گاؤں میں بزرگ نسل میں اسی نام سے میرے نانا کے بھائی ہو گزرے ہیں جو

سیاسی اور سماجی لحاظ سے بہت متحرک تھے۔ الیکشن بھی لڑتے تھے اور باہر سے دوستوں کی میزبانی بھی بڑی گرمجوشی سے کرتے تھے۔ ایک طویل عرصے کے بعد اسی نام کے حامل محمد علی جن کا گورنمنٹ ہائی سکول میں داخلہ فارم میں نے پر کیا تھا، شروع ہی سے کچھ الگ رجحان کے مالک تھے جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات۔ سیاسی رویے اور دیہات کی روایت کے معاشرتی مزاج کے حامل اس نوجوان کی دوستی ایک ''منصف'' سے ہوگئی۔ اس دوستی کی برکت سے انہوں نے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ پولیس، تھانے، کچہری اور ریونیو کے کلچر کے ماہر ہوگئے۔ گاؤں کے تہذیب وتمدن میں سیاسی طور پر آگے آنے اور کامیاب ہونے کے لیے ایسی خصوصیات کا حامل ہونا بنیادی شرط ہے اور پھر اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس نے اپنے لیے ایک نیا گھر بنایا جس میں ٹیلیفون کی سہولت میسر تھی۔ گھر سے متصل ایک ڈیرہ بنایا جہاں تھانے کچہری وغیرہ کے مسائل کے حل کے لیے لوگوں نے آنا شروع کر دیا جنہیں وہاں کھانا یا چائے پیش کی جانے لگی۔ ایک گاڑی بھی رکھ لی۔ ہوتے ہوتے وہ ضلع کونسل ساہیوال کا ممبر منتخب ہوگیا۔ پھر کیا تھا، اس نے رات دگنی اور دن چوگنی ترقی کرنا شروع کر دی۔ اور پھر ایسا ہوا کہ گاؤں کو اس کی وجہ سے بہت شہرت ملی۔ مجھے کہا کرتا تھا کہ آپ میرے استاد ہیں۔ جب میرے والد کا انتقال ہوا تو میرا وراثتی انتقال کرانے میں اس نے میری بہت مدد کی۔ چند بار بہاول پور میں بھی مجھے ملنے آیا۔ اس کے والد کا انتقال ہوا تو افسوس کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ چالیسویں کی رسم میں ضلع بھر کی سیاسی قیادت اور بیوروکریسی گاؤں میں جمع تھی۔ اس نے گاؤں کو "ماڈل ویلج" بنانے کا منصوبہ بھی منظور کرا لیا تھا۔ اس منصوبے پر عمل درآمد نہ کیا جا سکا کیوں کہ 2006 کے دوران ایک دشمنی کے باعث اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کا خلا پورا کرنا ناممکن تھا۔ ماڈل ویلج کا منصوبہ کوئی اور لے اڑا۔ ایک بیٹے نے لا کی تعلیم حاصل کی اور ساہیوال کورٹس میں پریکٹس کرتا ہے مگر گاؤں میں آج 19 سال بعد بھی محمد علی کی شدید کمی محسوس کی جاتی ہے۔

جہان خاں۔ ہمارے گاؤں کے چار حصے ہیں۔ یہ چاروں ان ناموں سے معروف ہیں۔ شمال مشرقی حصہ "میرن کے"، جنوب مشرقی حصہ "ستّی کے"، جنوب مغربی حصہ "روشن کے" اور شمال مغربی حصہ "مانگ کے"۔ گاؤں کے تین حصے رند بلوچوں پر مشتمل ہیں جب کہ "میرن کے" لشاری بلوچ کہلاتے ہیں۔ جہان خاں کا تعلق گاؤں کے اسی حصے سے ہے۔ میرے انتہائی بچپن میں گاؤں کے جنوب مشرقی حصے کا ایک شخص قتل ہوگیا۔ بتایا جاتا ہے کہ چک نمبر 108 /9-ایل میں کبڈی کا مقابلہ تھا۔ وہاں سے واپسی پر گاؤں کے دو گروہوں میں لڑائی کے بعد ایک آدمی قتل ہوگیا اور قتل کرنے والے گروہ کا تعلق "میرن کے" سے تھا۔ 1962 میں جب میں گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہوا تو اس سے دو سال قبل جہان خاں گورنمنٹ کالج ساہیوال میں بی اے کے سٹوڈنٹ تھے اور کبڈی کے اچھے کھلاڑی تھے۔ سکول میں میرے داخلے کے وقت وہ سیٹلائیٹ ٹاؤن (اب فرید ٹاؤن) میں رہائش پذیر تھے اور بی اے کے انگلش مضمون کو پاس کرنے کے لیے

کوشاں تھے۔ان کے ساتھ ان کے بھائی نصیر احمد، چچازاد امیر محمد خان اور ناصر خاں بھی مقیم تھے۔ میں چوں کہ سائیکل نہیں چلا سکتا تھا اس لیے کچھ عرصے کے لیے والد نے جہان خاں کی سرپرستی میں دے دیا۔ان دنوں ایوب خاں اور فاطمہ جناح کے الیکشن کا دور تھا۔ میں نے جب چھٹی پاس کی تو سائیکل لے لیا اور گاؤں سے جانا آنا شروع کر دیا۔ 1967 کے قریب سنا کہ جہان خاں پولیس میں بطور اسسٹنٹ سب انسپکٹر (ASI) بھرتی ہو چکے ہیں۔ ایک آدھ دفعہ ان کو وردی میں بھی دیکھا لیکن گاؤں میں ان سے کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ جب میں یونیورسٹی میں تھا تو گاؤں سے شہر جانے کے لیے میں جس تانگے میں سوار تھا اس پر ان کی فیملی بھی سوار تھی، میری انہوں نے بہت تعریف کی اور میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ میری ان سے یہ آخری ملاقات تھی۔ پھر سنتے رہے کہ ضلع راجن پور کے علاقے میں انہوں نے خاصی پراپرٹی اور زمینیں خرید لی ہیں۔ ہمارا ایک گھوڑی پال مربعہ تھا جو عدالتی لڑائیوں کے باعث "اوپن" ہو گیا۔ ریماؤنٹ آفیسر نے اس کی الاٹ منٹ کی سفارش کرنا تھی۔ اس میں جہان خاں اور محمد علی بھی کود پڑے۔ پہلے نمبر پر ہماری فیملی اور اگلے نمبروں پر محمد علی اور جہان خاں کا کزن سجاول کے نام شامل کرا دیے گئے۔ جہان خان کا تعلق پولیس سے تھا اور مختلف سیاسی لوگ ان کی رسائی میں تھے، جہان خاں ہمارا وہ مربع سفارش سے لینے میں کامیاب ہو گئے۔ 1986 کے دوران اس مربعے کے قبضے پر بندوقوں سے دو بدو لڑائی ہوئی جس میں محمد علی کا چچازاد اور میرا پھوپھی زاد مرید احمد قتل ہو گیا۔ عجیب سوئے اتفاق ہے کہ گاؤں میں ہونے والے دوسرے قتل کی ذمہ داری بھی جہان خان یا "میرن کے" حصے میں آئی۔ بعد میں مقدمہ چلا۔ محمد علی جہان خاں کا آمدنی سے زیادہ اثاثے بنانے کا کیس نیب لے گیا اور وہ نیب کی حراست میں چلے گئے۔اس دوران مبینہ طور پر جہاں خاں کے کسی بیٹے نے ریکی کر کے محمد علی کو 2006 کے دوران قاتلانہ حملے میں شدید زخمی کر دیا جو جانبر نہ ہو سکے۔ تیسرا قتل بھی انہی کی فیملی کے حصے میں آیا۔ پھر مقدمہ چلا اور شاید صلح ہو گئی۔ ڈی ایس پی ریٹائرڈ جہان خاں میرے سکول کے آغاز کے استاد ہیں مگر مجھے ان سے شدید گلہ ہے۔ وہ پولیس میں تھے اور ان کے تعلقات بھی بہت تھے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ مادی تحریص اور لالچ کی بجائے وہ اپنے مقام، اختیار اور تعلقات کو گاؤں کی ترقی، فلاح اور تعلیمی سہولتوں کی فراہمی کے لیے استعمال کرتے۔ گاؤں میں صلح کُل کی اقدار کو رواج دیتے اور تمام گاؤں میں ایک بڑے کا کردار ادا کرتے ہوئے چھوٹے موٹے تعصّبات کا خاتمہ کرتے اور سب کو ایک لڑی میں پرو دیتے تو وہ یقیناً ہمارے ہیرو ہوتے اور علاقے میں ان کا نام امر ہو جاتا مگر اب ان کے لشاری قبیلے کے ہاتھ گاؤں میں ہونے والے کل تین مقتولوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ اب سنا ہے کہ وہ فالج کا شکار ہیں اور صاحب فراش ہیں۔ ہم پھر بھی ان کی صحت کے لیے دعا گو ہیں کیوں کہ ہماری تعلیم اور شعور نے ہمیں یہی سکھایا ہے۔

اور اب آخر میں ایک نامعلوم شخصیت جس کے لیے مرزا غالب کا ایک شعر:۔

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی

کیوں ترا رہ گزر یاد آیا

ساہیوال کے ایک قریبی دیہات کے رہائشی ہونے کی وجہ سے سکول اور کالج میں روزانہ کی بنیاد پر جانا آنا ہوتا رہا اس لیے ساہیول شہر کی معاشرتی زندگی کا قابل ذکر حصہ تو نہ بن سکا بس اپنے کام سے کام رکھا۔ شہر کی سماجی زندگی بہت متحرک ہوتی ہے اور وہاں انسانی بنیادی ضروریات اور سہولتیں میسر ہوتی ہیں۔گاؤں کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کا اپنا انداز ہوتا ہے۔زرعی معاشرے کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔شہر کے نوجوانوں میں معاشرتی آگہی کا عمل بہتر انداز میں آگے بڑھتا ہے۔ جو سہولتیں انہیں میسر تھیں ہم دیہات والے تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اس لیے دوستیاں اور تعلقات بناتے وقت ان محرکات نے بنیادی کردار ادا کیا۔ اگر چہ سکول کے دور میں آٹھویں کلاس کے دوران چند ماہ حیدری محلے کی ایک شیخ فیملی کا حصہ بنا مگر شہر میں کسی سے دوستی نہ ہوسکی۔سال سوم کے وسط میں گورنمنٹ کالج ساہیوال کے جناح ہوسٹل میں بھی چند ماہ رہا مگر اگر کوئی دوست بنے تو وہ بھی زیادہ تر گاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر بھی جب میں 1964 سے 1974 کے دس سال کا جائزہ لیتا ہوں تو چند شہری اور دیہاتی دوستوں کا ذکر کرسکتا ہوں جن سے قریبی تعلق رہا یا جن سے میں نے زندگی کے حوالے سے سیکھا۔ان میں پہلی ترجیح پر گورنمنٹ ہائی سکول اور گورنمنٹ کالج کے اساتذہ سر فہرست ہیں۔سکول کے اساتذہ میں جناب خادم حسین، جناب رانا محمد الطاف طارق، جناب کرم دین، جناب حافظ محمد سرور۔ جناب عابد حسین اور جناب نذیر احمد قریشی اور کالج میں ڈاکٹر اے ڈی نسیم، جناب علی اظہر نقوی، جناب مختار احمد، جناب بشیر احمد گل، جناب محمد اسلم، جناب شاہد حمید، جناب رئیس عباسی، جناب انوار الحق، جناب دلدار پرویز بھٹی، جناب آغا امجد علی اور سید اکبر علی شاہ کے نام شامل ہیں۔کالج کے اساتذہ کا ذکر کالج کے تذکرے کے دوران کر چکا ہوں۔اب چند ایسے دوستوں کا ذکر جن کی میری زندگی میں کسی نا کسی طور اہمیت رہی ہے۔

شیخ نور الہی: جب میں یادوں پر سے ماضی کی گرد صاف کر کے دیکھتا ہوں تو ایک مہربان چہرہ سامنے آتا ہے جن کا نام شیخ نور الٰہی ہے۔ان سے تعلق کیسے بنا یاد نہیں لیکن انہوں نے سکول سے لے کر کالج تک میرے رہنما کا کردار ادا کیا۔وہ قانون کا امتحان پاس کرنے کے بعد وکیل بنے تو کچہری میں ان سے اکثر ملاقات ہو جاتی تھی۔اسسٹنٹ پبلک پراسیکیوٹر یا سرکاری وکیل بنے-1975 میں جب ان کی بارات موہنی روڈ لاہور آئی تو میں لاہور سے ہی شریک ہوا۔اگلے دن ساہیوال میں ولیمے میں بھی شرکت کی۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی بننے پر اٹک چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے جیسے میں رحیم یار خان اور بہاول پور چلا گیا مگر میں ریٹائرمنٹ کے بعد واپس آیا جب کہ انہوں نے اٹک میں مستقل رہائش اختیار کی۔ان سے فون پر اکثر رابطہ ہو جاتا تھا۔کئی بار دل چاہا کہ ان سے اٹک جا کر ملوں لیکن یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔2024 کے آغاز میں انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ان کے چھوٹے بھائی شیخ پرویز الٰہی سے لاہور میں چند بار ملاقات ہو چکی ہے۔ان

کے منجھلے بھائی شیخ محمود میٹرک میں میرے کلاس فیلو تھے اور آج کل ساہیوال میں ہیں۔

میاں اشتیاق احمد: ان سے مجھے میرے ایک اور دوست جن کا تعلق چک نمبر 152 / 12 -ایل کسوال سے تھا، 1972 میں متعارف کرایا۔ ان کے والد ساہیوال میں واپڈا کے ایس ڈی او تھے اور رحیم یار خان سے ٹرانسفر ہو کر آئے تھے۔ میں انہیں ساہیوال کا ایسا واحد دوست سمجھتا ہوں جن سے میری بہت بے تکلفی تھی۔ ان کی شخصیت میں کسی قسم کی بناوٹ یا تصنع نہیں تھا، ہماری دوستی بہت اور یجنل تھی، ان کے گھر ان کے دادا محترم سے بھی متعدد بار ملاقاتیں رہیں۔ یہی وہ دوست ہیں جنہوں نے مجھے رحیم یار خان پوسٹنگ کرانے کی تجویز دی تھی جو سوئے اتفاق سے پوری ہوئی۔ جب میں بہاول پور ٹرانسفر ہو کر آیا تو ان کی خوش دامن گورنمنٹ کالج برائے ایلیمنٹری ٹیچرز بہاول پور میں پرنسپل تھیں، ان کے سسر ڈی سی آفس رحیم یار خان میں سپرنٹنڈنٹ تھے تو ان سے وہاں خوب ملاقاتیں رہیں۔ بہاول پور میں ان کے برادر نسبتی رضا جمال سے بھی دوستی رہی۔ یہ پہلی فیملی ہے جن سے بہاول پور میں تعلق قائم ہوا۔ میاں اشتیاق احمد کی تمام سروس پاسکو میں گزری۔ اب رابطہ اتنا فعال نہیں رہا۔

جناب اے بی بلوچ: کسوول سے اوکانوالہ والا بنگلہ جانے والی سڑک پر ان کا گاؤں 152 / 12 -ایل ہے۔ 1972 میں ساہیوال کالج میں کلاس فیلو تھے۔ ان کی تمام سروس پنجاب سیکرٹریٹ لاہور میں گزری۔ اچھے مخلص دوست تھے جن کی دعوت پر میں ان کے گاؤں بھی چند بار گیا۔ ان سے زیادہ ملاقاتیں تو صرف کالج ہی میں ہو سکیں اور لاہور آنے پر پنجاب سیکرٹریٹ لاہور میں بھی چند بار ملے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد واپس گاؤں لوٹ گئے۔ الطاف حسین لنگاہ سے گورنمنٹ کالج کے ہاسٹل میں دوستی ہوئی جو اب تک قائم ہے۔ ان کا تعلق کمالیہ کے ساتھ واقع بستی لنگاہ سے ہے۔ کمالیہ کی تحصیل بار ایسوسی ایشن کے رکن رہے اور کامیاب وکالت کی۔ ہم پنجاب یونیورسٹی میں اکٹھے داخل ہوئے تھے، ان کا شعبہ سیاسیات تھا، بعد میں انہوں نے لا کیا۔ ویسے وکیل کبھی ریٹائر نہیں ہوتے لیکن یہ ریٹائر ہو کر زیادہ وقت گھر پر گزارتے ہیں۔ میجر ریٹائرڈ محمد اکرم مرحوم: بی اے کے کلاس فیلو اور دوست معاشیات کے پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم کے چھوٹے بھائی تھے۔ بی اے کے دوران فوج میں چلے گئے۔ ان سے طویل عرصہ بعد ملتان میں ملاقات ہوئی جو آخری ثابت ہوئی۔ زندہ دل اور زندگی سے بھرپور محمد اکرم ریٹائرمنٹ کے بعد دبئی چلے گئے جہاں دل کے مرض نے ان کو آخری سفر پر روانہ کر دیا۔ محمد یعقوب: دیپالپور بازار ساہیوال کے رہنے والے آٹھویں میں کلاس فیلو تھے اور ہم ایک ہی ٹیوٹر سے ٹیوشن پڑھتے تھے۔ 1975 میں پی آئی اے کے سیلز کے شعبہ سے وابستہ ہوئے اور لاہور میں چند روزہ ٹریننگ کے وقت میرے ساتھ ہوسٹل میں قیام کیا۔ پہلی پوسٹنگ فیصل آباد میں ہوئی۔ ترقی کرتے کرتے دوہا قطر چلے گئے جہاں پر مستقل رہائش اختیار کی۔ 2014 کے دوران فون پر گفتگو ہوئی۔ ان کے فیس بک سے پتا چلا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔

محمد اقبال زخمی اور ارشاد ناز: ساہیوال کے ان دونوں بھائیوں سے دوستی کا تعلق تھا۔ دونوں بھائی شاعر تھے بل کہ محمد اقبال زخمی کو تو بیسیوں اشعار یاد تھے اور ارشاد ناز نے ٹیلی فون کے محکمہ کا انتخاب کیا۔ لاہور میں چوبرجی میں ٹیلی فون ریونیو کے آفس میں بہت دیر بعد اتفاقیہ ملاقات ہوئی، بعد میں وکالت کا شعبہ اختیار کیا۔ دل کے بائی پاس آپریشن کے مابعد اثرات سے دوچار ہوئے جنھوں نے مزید جینے کی مہلت نہ دی البتہ ان کے بڑے بھائی محمد اقبال زخمی سے لاہور میں ملاقات ہوجاتی ہے۔ طاہر نسیم اردو کے پروفیسر اے ڈی نسیم کے صاحبزادے میٹرک انٹر اور بی اے کے کلاس فیلو، اکٹھے یونیورسٹی داخل ہوئے۔ پنجابی سے صحافت میں مائیگریشن کرالی۔ کچھ عرصہ صحافت کے کارزار میں گزارا بعد میں وفاقی محکمے سیڈ کارپوریشن میں چلے گئے، اس کے خاتمے کے بعد وفاقی سروس میں ضم ہو گئے۔ ملازمت کا تمام عرصہ اسلام آباد میں گزارا، ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور آ گئے، ان سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ عبدالعزیز اطہر: بزم فکر وادب کے کتب خانے کے کتابدار، جن دنوں میری ان سے ملاقات ہوئی متذکرہ کتب خانہ ساہیوال ہال کی سامنے والی بالائی منزل میں واقع تھی۔ وہ بہت نرم خو اور اچھے دوست تھے۔ میں اس لائبریری سے اپنی پسند کی کتب لے آتا تھا اور پڑھ کر واپس کر دیتا تھا، ایک دو بار وہ میرے گاؤں مجھے ملنے بھی آئے۔ اگرچہ ملاقات کو برسوں بیت گئے مگر ان کی محبت اور احترام آج بھی دل میں موجود ہے۔

اور آخر میں ایک ایسی شخصیت جس نے موجود نہ ہوکر بھی زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی کی اور اانسپائریشن بنے رہے۔ عارفوالا روڈ پر ہمارے گاؤں سے ذرا پہلے بائیں جانب 91 /9-ایل ہے جسے اچلانا کہتے ہیں وہاں کے محمد جہانگیر مردانہ ہمارے کالج کے کلاس فیلو تھے۔ ان کی زمین پر ایک خاندان مزارع تھا جن کا ایک بیٹا عاشق علی انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں مکینکل کے شعبے میں زیر تعلیم تھا اور سہگلوں کا مختص کردہ وظیفہ بھی لے رہا تھا۔ جب وہ آٹھویں کلاس میں تھا تو ساہیوال کی معروف شخصیت شیخ نثار ایڈووکیٹ کے ہاں خدمت گزاری پر مامور ہوا، انہوں نے دیکھا لڑکا اچھا ہے اور اسے پڑھنے کا شوق ہے تو انہوں نے اس کی حوصلہ افزائی کی حتی کہ انٹر میں پوزیشن کے ساتھ کامیاب ہوگیا، ان سے ملاقات ہوئی تو پھر نا صرف رہنمائی میسر آئی بل کہ انہیں نمونے کے طور پر سامنے رکھ کر مجھے بھی زندگی میں آگے بڑھنے کی تحریک ملی۔ انہوں نے 1973 میں ہیوی ملٹری کمپلیکس ٹیکسلا میں اسسٹنٹ منیجر مشین شاپ کی ملازمت اختیار کی اور سب سے بڑے عہدے تک پہنچے۔ گوگل سرچ کے ذریعے معلوم ہوا کہ وہ کچھ عرصہ پاکستان سٹیل ملز کراچی کے چیئرمین بھی رہے۔ میں نے ان کی تمام زندگی کی کامیابیوں سے بہت انسپائریشن حاصل کی اور وہ موجود نہ ہوکر بھی میرے لیے رہنما اور استاد کا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔

اب اس باب کے آخر میں بیان کرنے کے لیے میں نے ایک خاص اور انفرادیت کی حامل بات اٹھا رکھی تھی۔ اپریل 1964 میں جب میں گورنمنٹ ہائی سکول ساہیوال میں داخل ہوا تو گاؤں سے روزانہ کی

بنیاد پر سکول جانا آنا شروع کیا۔ جاتے وقت صبح کو میں نے باہر کے اڈے سے روزانہ اخبار خریدنا شروع کر دیا جس کی قیمت شاید دس پیسے تھی اور کوہستان اس دور کا مقبول ترین اخبار تھا۔ بعد میں روزنامہ مشرق کا اجرا ہوا تو کوہستان اخبار پس منظر میں چلا گیا یا بند ہو گیا۔ کم و بیش میٹرک تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ سکول میں اکثر و بیشتر اساتذہ خصوصاً ساتویں اور آٹھویں کلاسوں کے دوران مجھ سے اخبار لے کر پڑھتے اور واپس کر دیتے۔ انگریزی کو بہتر کرنے کے لیے کبھی کبھار پاکستان ٹائمز اور ڈیلی سن بھی لے لیتا۔ سکول یا کالج سے تعطیلات ہوتیں اور اس دوران والد محترم شہر آتے تو مجھ سے پوچھتے کہ تمہارے لیے کیا لاؤں تو میں اقبال کی مٹھائی اور کوئی بھی انگریزی اخبار لانے کو کہتا۔

جب کالج داخل ہوا تو اخبار کے مطالعے کا انداز اور وقت بدل گیا۔ ہوا یوں کہ دیہات میں صبح سویرے دودھ کو بلو کر گھی نکالنے کا مستقل رواج تھا اور ضرورت بھی۔ دودھ سے گھی نکالنے کے بعد بچ جانے والے مائع کو ''پکی لسی'' کہتے تھے جو زائد از ضرورت ہوتی تو اسے بہا دیا جاتا یا ضائع کر دیا جاتا۔ یہاں یہ وضاحت کر دی جائے کہ ابلے ہوئے خالص دودھ میں پانی ملانے کو ''کچی لسی'' کہا جاتا ہے۔ شہر سے دو افراد نے سائیکلوں کے پیچھے دودھی کا کنستر رکھ کر صبح سویرے گاؤں آنا شروع کر دیا۔ جب ہم کالج جا رہے ہوتے تو وہ مطلوبہ مقدار میں بلا قیمت پکی لسی سے اپنے کنستر بھر کر واپس جا رہے ہوتے جسے وہ ایک روایت کے مطابق ریلوے سٹیشن پر فروخت کرتے اور اس طرح ان کی کمائی ہو جاتی۔ میں نے ان سے فرمائش کی کہ وہ چوں کہ صبح سویرے گاؤں پہنچ جاتے تھے اس لیے میرے لیے باہر کے موڑ سے دستیاب اخبار ہی خرید کر لے آیا کریں۔ وہ اخبار لے آتے اور میں فوراً ادائیگی کر دیتا۔ اس طرح میں صبح سویرے اخبار پڑھ لیتا اور کالج کے لیے تیار ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ 1970 کے عام انتخابات کے دن میرے سامنے تین مختلف اخبارات پڑے تھے۔ یہ بات باعث لطف تھی کہ دیہات میں رہتے ہوئے بھی شہر والوں کی طرح اخبار کا مطالعہ صبح سویرے ہی کر لیتا۔ یہ سلسلہ یونیورسٹی میں داخلے کے وقت مارچ 1974 میں اپنے اختتام کو پہنچا۔ یونیورسٹی میں ہوسٹل میں آنے والے اخبارات کے باوجود میں اپنا اخبار اپنے کمرے میں منگواتا۔ رحیم یار خان، بہاول پور اور پھر لاہور میں بھی اردو اور انگریزی اخبارات گھر میں لگوانے کا سلسلہ جاری رہا اور نئے نئے میڈیم آنے اور ہر قسم کے اخبارات کے انٹرنیٹ ایڈیشنوں کی مفت دستیابی کے باوجود اپریل 2025 تک گھر میں اخبارات منگوانے کی روایت جاری ہے اور یہ مدت تقریباً ساٹھ سال بنتی ہے۔

میرا لاہور کہاں گیا؟

"وہ لاہور...
جہاں ہوائیں خوشبو سنبھالتی تھیں،
گلیوں میں قہقہے بکھرتے تھے،
ہر کوچہ ایک محبت کی کہانی سناتا تھا۔
آج جب ان راہوں پر چلتا ہوں تو
گرد و غبار میں لپٹے خواب،
خاموش دیواریں اور اجنبی چہرے
مجھ سے سوال کرتے ہیں:
کیا تمھیں اپنا لاہور یاد ہے؟
میں ٹھٹھک کر سوچتا ہوں...
میرا لاہور کہاں گیا؟

میرا گاؤں ساہیوال شہر سے سات کلومیٹر (4.5 میل) دور ساہیوال عارفوالہ روڈ پر واقع ہے۔ ساہیوال سے لاہور اور ملتان کا فاصلہ اُس وقت بالترتیب 101 میل اور 120 میل تھا جو 1973 کے دوران سکیل تبدیل ہونے کے بعد 163 اور 194 کلومیٹر سے زیادہ ہو گیا جو اب بالترتیب 197 اور 245 کلومیٹر ہے کیوں کہ بعد میں راستے میں آنے والے شہروں کے بائی پاس بننے سے زمینی فاصلے میں مزید اضافہ ہوا۔ میں پاکستان بننے کے چھ سال بعد پیدا ہوا۔ 1958 میں پرائمری سکول میں داخلہ ہوا۔ 63-1962 میں پرائمری اور 69-1968 میں گورنمنٹ ہائی سکول ساہیوال سے میٹرک کیا۔ پنجاب کا قریب ترین بڑا شہر لاہور تھا لہٰذا گاؤں کے لوگ وقتاً فوقتاً لاہور کا چکر لگاتے اور دلچسپ انداز میں لاہور کا ذکر کرتے اور لاہور لاہور ہے، سن کر پرائمری سے آٹھویں تک پہنچے تو لاہور کا میرے ذہن میں ایک بامعنی تصور قائم ہوا وہ کچھ اس طرح کا تھا جیسے لاہور انسانوں کی طرح کوئی سانس لیتا ہوا کرداری تشخص کا حامل شہر ہے جس کو دیکھنے کی خواہش شدید تر ہوتی گئی۔ میرے خالہ زاد بیربل خاں مجھ سے دس سال بڑے تھے، وہ سال میں ایک دو بار

لاہور جاتے رہتے تھے۔لاہور دیکھنے کے شوق کے ہاتھوں مجبور ہوکر میں نے ان سے لاہور دکھانے کی فرمائش کی جسے انہوں نے آخرکار قبولیت کی سند عطا کی۔اپریل 1967 کے دوران ایک دن مجھے بتایا کہ اگلے ہفتے کے روز وہ مجھے لاہور لے جائیں گے۔جانے سے قبل کی رات خوشی سے نیند نہیں آئی کیوں کہ بچپن سے ہی جو شہرخوابوں میں بسا آرہا تھا میں وہاں جارہا تھا۔وہ مجھے لے کر ساہیوال کے باہر کے اڈے (جسے باہرلاموڑ بھی کہتے تھے) سے ایک ایسی بس میں سوار ہوئے جس میں میری خواہش کے پیش نظر فرنٹ سیٹ ملی۔مجھے یاد پڑتا ہے لاہور کا کرایہ اڑھائی روپے تھا۔میرے والد نے مجھے کل دس روپے دیے تھے۔چارکول اور بجری سے بنی ہوئی ڈبل سڑک درختوں سے گھری ہوئی تھی۔اس پہلے سفر کے جو مشاہدات یادرہ گئے ہیں وہ یہ تھے کہ پہلے ایک خطرناک یا اندھا موڑ آیا جس کے بعد بس یوسف والہ رکی۔پھر قادرآباد اور گیمبر کے اڈے آئے۔میرے سفر کے رہنما نے بتایا کہ گیمبر کے ریلوے سٹیشن پر 1952 میں پاکستان کی تاریخ کا ٹرینوں کا آمنے سامنے سے پہلا حادثہ ہوا تھا اور متعدد مسافر ہلاک ہوگئے تھے۔میں ہلاکتوں کا سن کر ایک دم خوف زدہ ہوگیا۔اس کے بعد اوکاڑہ آیا تو بائیں جانب ستلج ٹیکسٹائل مل کا بورڈ پڑھا۔جس کے بعد رینالہ خورد اور اس کے بعد واں رادھارام کا پھاٹک آیا اور ریلوے لائن دائیں طرف چلی گئی۔پتوکی کا اڈا آیا جس کے بعد کے سنگ میل نے بتایا کہ لاہور 48 میل اس کا مطلب یہ تھا کہ پتوکی ساہیوال اور لاہور کے تقریباً درمیان تھا گویا آدھا سفر طے ہو چکا تھا۔ پتوکی سے چلے تو دائیں جانب ایک شوگر مل آئی اور اس کے بعد ایک بہت بڑی اور خوف زدہ کرنے والی نہر جس کے کناروں پر پہاڑ جیسے مٹی کے تودے پڑے تھے۔معلوم ہوا کہ یہ لنک نہر دریائے ستلج میں گرتی ہے جسے حال ہی میں تیار کیا گیا ہے۔ابھی تک استعمال شدہ دو کرینیں بھی نظر آرہی تھیں۔15 میل کے بعد بھائی پھیرو، 12 میل کے بعد مانگا منڈی کے اڈے آئے۔سڑک پر اندھے موڑ بہت تھے۔کبھی کبھار کوئی بس یا ٹرک سامنے سے گزرتا تو ڈرائیور ایکسیلیٹر سے پاؤں اٹھالیتا۔پھر کچھ میل کے بعد 180 ڈگری کا بائیں جانب موڑ آیا جس سے پہلے دائیں جانب ایک بہت بڑا آموں کا باغ نظر آیا۔موڑ کے بائیں جانب ایک چھوٹی نہر اور اس پر چھوٹا سا پل دیکھا جہاں سے ایک غیر نمایاں سی سڑک رائیونڈ کی طرف جارہی تھی۔بس چند میل کے بعد ملتان چونگی پر رکی۔اس کے بعد میرے رہنما نے بتایا کہ دائیں جانب کی تین عمارتوں میں فلمیں تیار ہوتی ہیں جنہیں فلم سٹوڈیوز کہتے ہیں۔چوک یتیم خانے سے بائیں طرف مڑنے کے بعد دائیں جانب شیزان کی فیکٹری نظر آئی۔اس کے سامنے بائیں جانب لاہور کی واحد اور بڑی بکر منڈی تھی۔پھر بس بند روڈ کی جانب مڑگئی۔ بند روڈ سے شاہی مسجد کے گنبد اور مینار نظر آرہے تھے۔ساتھ ہی ایک مینار زیر تعمیر تھا جس کے بارے میں میرے ہم سفر کو معلوم نہیں تھا۔(یہ مینار پاکستان تھا جس کی تعمیر کا آغاز 1960 میں ہوا اور 1968 میں مکمل

ہوا) صبح دس بجے کی چلی ہوئی بس ایک بجے کے قریب بادامی باغ کے بس اڈے پر پہنچی۔ بس سے اترے تو ساتھ ہی واقع شاہی مسجد اور شاہی قلعے کی طرف آئے۔ پہلے علامہ اقبال کا مقبرہ دیکھا، دعا پڑھی۔ شاہی مسجد میں داخل ہوئے، دائیں جانب کے مینار پر چڑھ کر لاہور شہر کو دیکھا۔ شاہی قلعے آئے، شیش محل کے علاوہ میری سمجھ میں کچھ نا آیا۔ اس کے بعد داتا صاحب کے دربار پر آئے۔ اردو بازار سے ڈیڑھ روپے میں اپنے والد کے لیے حفیظ جالندھری کا "شاہ نامہ اسلام" خریدا۔ اس کے بعد میرے خالہ زاد ہم سفر نے بتایا کہ اب ہم ایک ہوسٹل میں جائیں گے جہاں کا انچارج باورچی ان کا دوست ہے۔ اردو بازار سے آگے آئے تو ایک دیوار پھلانگ کر ہوسٹل میں داخل ہوئے کیوں کہ وہاں سے اس کا صدر دروازہ دور تھا۔ اس باورچی نے کھانا پیش کیا اور اپنے کمرے میں سونے کی سہولت فراہم کی۔ (یہ لا کالج ہوسٹل تھا، کیا معلوم تھا کہ چند برسوں کے بعد مجھے اس ہوسٹل میں طویل وقت گزارنا تھا۔) اگلی صبح عجائب گھر اور پنجاب یونیورسٹی کی عمارات کو باہر سے دیکھتے ہوئے انارکلی بازار آئے جو اتوار کی وجہ سے تقریباً بند تھا۔ مجھے یاد آیا کہ باقی شہروں میں جمعہ کو چھٹی ہوتی تھی اور اس روز دیگر شہروں کے دکاندار جمعہ کو لاہور میں آ کر خریداری کرتے تھے۔ بند دکانوں کے سامنے کچھ لوگ سامان رکھے بیچ رہے تھے۔ وہیں پر ایک صاحب نے اپنے سامنے پانی سے بھری ہوئی ایک کٹھالی رکھی ہوئی تھی جس میں ایک دخانی کشتی چل رہی تھی۔ اس کشتی کی دم والے حصے میں موم بتی کا ایک ٹکڑا جلتا ہوا رکھا تھا۔ مجھے بہت اچھا لگا اور میں نے چار آنے میں اپنے لیے لاہور سے پہلا تحفہ خرید لیا۔ پرانی انارکلی کی کسی ہوٹل سے کھانا کھایا۔ مال روڈ پر پیدل چلتے ہوئے چیئرنگ کراس پہنچے۔ اسمبلی ہال کے سامنے ملکہ برطانیہ کا بت دیکھا۔ بت کے دائیں جانب سڑک سے پار کونے میں ایک بہت بڑی عمارت زیر تعمیر تھی اور تقریباً تکمیل کے قریب تھی جس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ (یہ دراصل واپڈا ہاؤس کی عمارت تھی جس کی تعمیر کا آغاز 1963 کے قریب ہوا)۔ اس کے ساتھ سڑک کی دوسری جانب چڑیا گھر میں دو گھنٹے گزارے۔ وہاں سے ایک ایسی سڑک (ایبٹ روڈ) پر آئے جہاں ہر دو طرف بہت سارے سینما گھر تھے۔ وہاں سے براستہ ریلوے سٹیشن بادامی باغ پہنچے، ایک بجے بس لی اور سہ پہر ساڑھے چار بجے گاؤں بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنے ساتھیوں کو لاہور کی باتیں بتائیں۔ سکول میں بھی کلاس فیلوز پر لاہور دیکھنے کا رعب ڈالا مگر اکثریت کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کسی نے مذاق اڑایا کہ عجائب گھر اور شالیمار باغ نہیں دیکھے تو کیا دیکھا۔ ایک دو نے کہا اتوار کو تو لاہور بند ہوتا ہے، اس دن لاہور کون دیکھتا ہے۔ اس سے دل میں ایک گرہ سی پڑ گئی کہ کیا واقعی لاہور کو چھٹی کے دن کے علاوہ دیکھنا چاہیے تھا۔

چک نمبر 135 /9-ایل اور 90 /9-ایل کے درمیان بڑی سڑک سے عارف والا کی طرف

جائیں تو بائیں طرف پہلے 91/9-ایل (اچلانہ) آئے گا جب کہ اس سے ڈیڑھ کلومیٹر آگے دائیں جانب میرا گاؤں آتا ہے۔ میں نویں کلاس میں تھا کہ معلوم ہوا کہ اچلانہ کے ایک زمیندار کے ہاں ایک مزارعہ ہے جس کا بیٹا عاشق علی یو ای ٹی لاہور میں مکینکل انجینئرنگ کا طالب علم ہے اور سہگلوں کا یو ای ٹی کے لیے مختص میرٹ پر وظیفہ بھی لے رہا ہے۔ مجھے بہت تحریک ملی اور ایک دن عید پر جب وہ اپنے والدین کو ملنے آیا تو میں نے ان سے ملاقات کی اور رہنمائی کی درخواست کی۔ ان سے ایک تعلق بن گیا۔ بہر حال اس نے مجھے لاہور آنے کی دعوت دی۔ ہمیشہ کی طرح میں نے اپنے خالو زاد سے کہا کہ مجھے ان سے ملانے لاہور لے جائے۔ یوں میں دوسری مرتبہ لاہور گیا۔ انجینئرنگ یونیورسٹی میں ہوسٹل کم تھے لہٰذا انتظامیہ نے قریبی کوٹھیاں کرائے پر لے کر انہیں ہوسٹل بنایا ہوا تھا۔ انہی میں سے ایک میں عاشق علی رہائش پذیر تھے۔ انہوں نے خوش آمدید کہا اور رات ہم ان کے ہاں رہے۔ ہوسٹل کی زندگی میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔ یونیورسٹی لے گئے اور تجربہ گاہیں دکھائیں۔ ان کو خدا حافظ کہہ کر پہلے شالیمار باغ دیکھا پھر عجائب گھر دیکھنے جا رہے تھے کہ چیئرنگ کراس پر طلبا کا ایک بہت بڑا جلوس دیکھا جو صدر ایوب کے خلاف احتجاج تھا۔ راستے بند تھے۔ کافی دیر بعد وہاں سے نکلے تو نئی انارکلی سے ہوتے ہوئے صرف داتا صاحب ہی جا سکے اور سہ پہر تین بجے کی بس سے واپس گاؤں آ گئے۔ اس دفعہ لاہور سے ایک مزارعے کے انجینئر بننے والے بیٹے کی شخصیت سے انسپائر ہو کر واپس آیا۔ باقی لاہور بھی اب کی بار پہلے سے دیکھا ہوا لگا۔ کچھ زیادہ جذباتیت نہیں تھی۔

ایک بار عاشق علی گھر آئے ہوئے تھے۔ لاہور واپسی پر وہ مجھے اور ہمارے گاؤں کے پٹوار خانے میں مقیم نہری پٹواری کے بیٹے مقبول احمد کو بذریعہ ٹرین لاہور لے آئے۔ ٹرین کا یہ میرا پہلا طویل سفر تھا۔ جہاں بھی ٹرین رکتی، میں باہر نکل کر پلیٹ فارم اور سٹیشن کے ماحول کو ضرور دیکھتا۔ عاشق علی اور ان کے روم میٹ کے ساتھ فلم دیکھنے کا پروگرام بن گیا۔ انہوں نے احمد بشیر کی تین دن پہلے ریلیز ہونے والی فلم "نیلا پربت" کا انتخاب کیا۔ یہ بنیادی طور پر ایک آرٹ مووی تھی جس کے موضوع کے معیار کو میں نہیں سمجھ سکتا تھا۔ فلم ناکام ہو چکی تھی اور ہال میں صرف 50 کے قریب لوگ تھے۔ آئندہ زندگی کے ایک مرحلے پر میں جان پایا کہ وہ کتنی بڑی فلم تھی۔ اس بار بھی ایک رات رہ کر اور دوبارہ یونیورسٹی دیکھ کر میں مزید انسپائر ہو کر واپس آیا۔ لاہور نے اس بار میرے اندر خود اعتمادی پیدا کر دی اور میں اکیلا اومنی بس پر سوار ہو کر داتا صاحب گیا اور بادامی باغ سے بس پکڑ کر گھر آیا۔ میٹرک کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوئے۔ میرے گاؤں کا امیر محمد خاں لاہور میں اس وقت کے پرائیویٹ حمایت اسلام لا کالج میں داخل تھا اور فلم اسٹوڈیوز کے قریب ایک کالونی میں ساہیوال کے کسی جاگیردار کی کوٹھی کی انیکسی میں مقیم تھا۔ ہم گاؤں کے چار لڑکوں نے مارچ 1970 میں لاہور جا کر اسے

ملنے کا پروگروم بنایا۔اس نے خوش آمدید کہااور کسی فلم کی شوٹنگ دکھانے کا وعدہ کیا۔اتفاق سے اگلے دن شاہنور سٹوڈیوز کے ساتھ بنے ہوئے ایک کنویں پر شام کے وقت پنجابی فلم کے کسی سین کی فلم بندی تھی، وہ ہمیں دکھانے لے گیا۔دیکھنے والوں کا خاصا ہجوم تھا۔ایک رہٹ پر دو گھوڑے دکھائی دیے جن کی لگا میں منور ظریف نے پکڑ رکھی تھیں۔عنایت حسین بھٹی بھی موجود تھے۔سین یہ تھا کہ منور ظریف ایڑیاں اٹھا کر راستے کی جانب دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔"پتا نہیں کہاں رہ گئے، ابھی تک پہنچے نہیں" اور سین فلمبند ہوگیا۔ بڑے بدمزہ ہوئے۔ امیر محمد نے اگلے دن گانے کی ریکارڈنگ دکھانے کا وعدہ کیا۔ وہ ہمیں شاہنور سٹوڈیو لے گیا۔ گیٹ پر فلمی ستاروں کو ایک نظر دیکھنے والوں کا ایک ہجوم تھا۔ ہمارا میزبان ہمیں ریکارڈنگ روم میں لے گیا جہاں پہلے ہی بہت رش تھا۔ یہ ایک پنجابی فلم "شیر پتر" کے گانے کی ریکارڈنگ تھی۔موسیقار ہیڈفون پہنے ایک بہت بڑے پیانو کے سائیز کے ریکارڈنگ پینل پر بیٹھا تھا جس پر وہ ایکوالائیزرز کے ذریعے آواز کے مطلوبہ معیار کو ایڈجسٹ کر رہا تھا۔اس کے بعد سامنے ایک بڑے ہال نما کمرے میں آرکیسٹرا کے لوگوں کو ہدایات دیتے ہوئے ریہرسل میں مصروف ہوگیا۔گلوکارہ کسی کیبن نما کمرے میں موجود تھی۔جب فائنل ریکارڈنگ شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ پنجابی گانا نور جہاں کی آواز میں ریکارڈ ہو رہا تھا۔ریکارڈنگ مکمل ہونے کے بعد مبارک سلامت کی آوازیں بلند ہوئیں۔مٹھائی بانٹی جانے لگی اور نور جہاں بھی ہجوم میں موجود داد سمیٹ رہی تھیں۔ اس وقت ان کی شخصیت کا صرف یہی اندازہ لگا سکے کہ ایک سادہ اور سمارٹ خاتون تھیں جن کی ٹھوڑی کے بائیں جانب تل تھا۔سب خوش تھے کہ نور جہاں کو دیکھ لیا۔ 21 مارچ 1970 کا دن تھا ہم بس سٹاپ پر شہر جانے کے لیے آئے تو وہاں پر تین چار بسیں خالی کھڑی تھیں اور لوگوں کو ترغیب دی جا رہی تھی کہ ان بسوں میں سوار ہو جائیں، شہنشاہ ایران کا استقبال کرنا ہے۔تفریحاً ہم بھی سوار ہو گئے۔ بسوں نے مال روڈ کے کسی حصے میں ہمیں اتار دیا اور دیگر لوگوں کی طرح ہم بھی کھڑے ہو گئے۔ پھر موٹر سائیکلوں اور کاروں کے بہت بڑے سکواڈ کے جلوس میں اس وقت کے صدر جنرل یحیٰی خاں، رضا شاہ پہلوی اور ملکہ فرح دیبا وہاں سے گزرے۔ بس ایک دو سیکنڈ کی جھلک ہی دیکھ سکے۔وہاں سے ہم سب لوگوں نے نابھہ روڈ پرانی انارکلی کی ایک ہوٹل سے کھانا کھایا اور نئی انارکلی کو جی بھر کر دیکھا۔داتا صاحب کے دربار پر گئے۔اسلامیہ کالج سول لائینز میں حمایت اسلام لا کالج کو دیکھا۔ڈبل ڈیکر بس پر واپس رہائش گاہ آئے اور اگلی صبح یتیم خانے سے بس لی اور گاؤں واپس آ گئے۔1970 تک لاہور کے ایک چکر فی سال کی اوسط سے چار چکر لگائے۔اس وقت شہر تھا ہی کتنا۔ایک دن میں تمام اہم جگہوں کی سیر کر کے واپس آیا جا سکتا تھا۔ٹرانسپورٹ کے لیے ڈبل ڈیکر اور سادہ اومنی بس، سیاہ پیلی ٹیکسی اور رکشے بھی تھے۔زیادہ تر مقامات تو پیدل چل کر طے ہوتے تھے۔

1967 سے 1970 کے دوران چار مرتبہ لاہور کو جی بھر کر دیکھنے کے بعد لاہو کے بارے میں پہلے والا تجسس تو نہیں رہا تھا تاہم وہاں ایم اے کی تعلیم حاصل کرنے کا شوق البتہ دوچند ہو چکا تھا۔ اگلے تین سال انٹر اور بی اے کرنے میں گزر گئے۔ 6 دسمبر 1973 کو رزلٹ کا اعلان ہونے جا رہا تھا۔ کمالیہ کی طرف ہماری برادری کے چند گاؤں ہیں، ان میں سے ایک چک نمبر 194 /گ ب کے رہائشی اور ہمارے عزیز مرتضیٰ خاں بلوچ لاہور میں حکومت پاکستان کے محکمہ زراعت شماری میں ملازم تھے۔ چند مرتبہ وہ میرے گاؤں ملنے آئے تو لاہور آنے کی دعوت دے کر گئے۔ خطوط کے ذریعے ان سے مستقل رابطہ رہا۔ ان کا دفتر گلبرگ میں گرومانگٹ روڈ پر تھا۔ 4 دسمبر کو میں پہلی بار اکیلا عوامی ایکسپریس پر سوار ہوا۔ 12 بجے دوپہر سے قبل ریلوے سٹیشن لاہور سے اومنی بس میں سوار ہوا اور گلبرگ ان کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ مل کر بہت خوش ہوئے۔ ایک ہی علاقے کے تین افراد اس دفتر میں کام کرتے تھے، دفتر اور حسین چوک کے درمیان انہوں نے ایک مکان مشترکہ طور پر کرائے پر لے رکھا تھا۔ آفس کے بعد گھر آئے، کھانا کھا کر لبرٹی مارکیٹ کی طرف نکل گئے۔ اس وقت کی لبرٹی مارکیٹ محض ایک نیم دائرے تک محدود تھی اور بہت کھلے پن کا احساس ہوتا تھا۔ وہاں کیپری اور لبرٹی ناموں کے دو سینما گھر تھے۔ ان میں سے ایک میں "رنگیلا اور منور ظریف" مزاحیہ فلم دیکھی۔ اگلا دن بھی ان کے دفتر اور لبرٹی مارکیٹ کی سیر میں گزرا۔ وہ 6 دسمبر کو میرے ہمراہ رزلٹ معلوم کرنے کے لیے اولڈ کیمپس گئے۔ کنٹرولر امتحانات کے دفتر میں ان کا کوئی جاننے والا تھا۔ اس کو انہوں نے میرے رول نمبر کی چٹ رزلٹ معلوم کرنے کے لیے دی جسے اس نے اپنے چپڑاسی کے سپرد کر کے رزلٹ معلوم کرنے کو بھیجا۔ اس کے جانے اور آنے کے

درمیان سات منٹ کا وقت مجھ پر جیسے سات یگ بیت گئے تھے۔ جب وہ واپس آیا تو میں نے اس کے چہرے کے طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں سے لفظ "پاس" نکلا تو میں پرسکون ہوا۔ میرے میزبان نے مجھے گلے لگا کر مبارک باد دی اور اسی شام لبرٹی کے دوسرے سینما میں فلم "ایک تھی لڑکی" دیکھ کر کامیابی کی خوشی منائی۔

21 دسمبر کو طاہر نسیم کے والد پروفیسر ڈاکٹر اے ڈی نسیم نے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر عبادت بریلوی سے معلوم کیا کہ پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے کے داخلے فروری میں شروع ہوں گے۔ اخبارات میں جو نوٹس داخلہ شائع ہوا اس کے مطابق داخلہ فارم جمع کرانے کی آخری تاریخ 7 فروری 1974 تھی۔ میں 4 فروری کو شام پانچ بجے گلبرگ لاہور اپنے میزبان کے پاس پہنچا مگر ان کے دیگر ساتھی موجود تھے، وہ گاؤں گئے ہوئے تھے۔ ان کے ایک ہمسائے نواز خان ہیڈ ماسٹر سے اتفاقاً ملاقات ہوئی۔ اگلے دن ان کے ساتھ ایف سی کالج گیا جہاں داخلے کے شیڈیول کا معلوم کرنا تھا۔ مین مارکیٹ آئے جہاں سے مال

روڈ گئے۔ وہ مال روڈ پر مجھے کتابوں کی مشہور دکان فیروز سنز لے گئے۔ کتابوں کو اتنا بڑا شوروم میں نے پہلی دفعہ دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ میں نے بھی نشانی کے طور پر دوستی سی کتب خریدیں جن میں سے ایک کتاب "اردو کے متروک الفاظ" از اشفاق احمد آج بھی میری لائبریری میں موجود ہے۔ 7 فروری کو میں نے انگلش کے اپنے استاد پروفیسر انوارالحق کی ہدایت پر اورینٹل کالج میں شعبہ فارسی زبان ادب کے دفتر کے سٹینوگرافر گلزار احمد سے مل کر داخلہ فارم جمع کرایا۔ اس نے بتایا کہ داخلہ انٹرویو اسلامی ممالک کی دوسری سربراہی سلامی کانفرنس منعقدہ 20 تا 22 فروری لاہور کے بعد ہوں گے۔ میں نے ان دنوں کے لیے اپنی زندگی کا پہلا طویل تفریحی ٹور ترتیب دیا۔ یو ای ٹی لاہور سے مکینکل انجینئرنگ کرنے والے ساتھ والے گاؤں کے مزارعہ کے بیٹے عاشق علی ٹیکسلا میں ایچ ایم سی میں ٹیکنکل مشین شاپ کے اسسٹنٹ منیجر ہو گئے تھے۔ میں 11 فروری کو ٹیکسلا پہنچا۔ 12 فروری کو فیکٹری کو تفصیل سے دیکھا۔ رسالپور کی پی اے ایف اکیڈمی کے شعبہ کمبائنڈ ملٹری اکاؤنٹس سے میرے ایک رشتہ دار محمد امین خان منسلک تھے۔ 14 فروری وہاں پہنچا۔ 14 سے 18 فروری وہاں رہا۔ 17 فروری کو ان کے ساتھ پشاور کا ٹور لگایا۔ 19 فروری کو راولپنڈی آیا جہاں میرے والد کے دوست کے بیٹے جاوید خان شعبہ تدریس سے وابستہ تھے۔ وہ کئی دفعہ ساہیوال آ چکے تھے، انہوں نے خوش آمدید کہا۔ 21 فروری کو مری میں کئی فٹ برف باری ہو چکی تھی لہٰذا زندگی میں پہلی بار مری گئے، 23 فروری کو ان کے ماموں غلام حیدر نے اپنا ادارہ راولپنڈی کا پولی ٹیکنیکل کالج دکھایا۔ انہوں نے بتایا کہ ایوب خاں کے خلاف احتجاجی تحریک کا آغاز ایک طالب علم کی ہلاکت کے بعد اسی کالج سے ہوا تھا۔ 25 فروری کو فتح جنگ کے قریب ان کے گاؤں بنگو گئے جہاں میرے والد کے بہت سے دوست تھے جو ساہیوال آتے جاتے رہتے تھے۔ ان میں سے مصری خاں کا نام مجھے یاد رہ گیا۔ 25 فروری کو لاہور واپس آیا تو کانفرنس ختم ہو چکی تھی، لیبیا کے کرنل قذافی کے لاہور کے کرکٹ سٹیڈیم میں جلسہ عام سے خطاب اور اورینٹل کالج میں عربی کے استاد ظہور احمد اظہر کے تقریر کے ترجمے کا بہت شہرہ سنا۔ اس خطاب کے دن اس سٹیڈیم کو قذافی سے منسوب کر دیا گیا تھا۔ اگلے دو دن میں داخلے کو کنفرم کیا اور بتایا گیا کہ سوموار 11 مارچ سے کلاسز کا آغاز ہو گا۔ میں نے وولنر ہوسٹل میں کمرے کی الاٹ منٹ کی درخواست بھی جمع کرا دی۔ اس کے بعد میں واپس ساہیوال آ گیا۔ اب میں لاہور سے خاصی حد تک واقف اور مانوس ہو چکا تھا۔ اب مجھے آئندہ طویل عرصے کے لیے لاہور میں رہنا تھا اور اس کے لیے ہر لحاظ سے تیار ہو کر آنا تھا۔

میں اپنے گاؤں کا پہلا فرد تھا جو یونیورسٹی میں باقاعدہ طالب علم بننے جا رہا تھا۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال کی ادبی علمی فضا میں میری ایسی تربیت ہو چکی تھی جو ادبیات کے طالب علم کے لیے نہایت موزوں تھی۔

مجھے لاہور میں میسر علمی سہولتوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنا تھا۔ کالج کی سطح کے تدریسی نصب العین کے ساتھ ساتھ معاشرتی طور پر بھی ایک مفید انسان بننا تھا۔ 1972 کے دوران میں تین مہینے کالج کی جناح ہوسٹل میں گزار کر ہوسٹل میں رہنے کی تربیت بھی حاصل کر چکا تھا۔ 11 مارچ سے یونیورسٹی میں میری کلاسز شروع ہو رہی تھیں۔ 10 مارچ کو میں لاہور آ گیا اور گلبرگ میں مرتضیٰ خان کے ہاں قیام کیا۔ اگلی صبح کلاسز اٹینڈ کرنے وہیں سے آیا۔ اسی روز وولنر ہوسٹل میں کمرہ نمبر 21 میں منڈی بہاؤالدین سے پنجابی کے محمد اکرم سندھو کے ساتھ عارضی طور پر انتظام کر دیا گیا تھا۔ 11 مارچ لاہور کی کسی ہوسٹل میں میری پہلی رات اور 12 مارچ 1974 بروز منگل میرا پہلا دن تھا۔ ہوسٹل میں قیام کا پہلا مرحلہ 31 مئی کو وقت سے پہلے ہونے والی موسم گرما کی تعطیلات تک جاری رہا۔ تعطیلات سے پہلے تک کے یہ تین ماہ پلک جھپکتے ہی گزر گئے جس کا تفصیلی احوال میری 1974 کی ڈائری میں موجود ہے۔ پہلا ہفتہ تو اساتذہ اور کلاس فیلوز سے تعارف میں بیت گیا۔ کلاسز اٹینڈ کرنے، اولڈ کیمپس میں واقع یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری سے استفادہ کرنے کے علاوہ مختلف علمی و ادبی مجالس میں بھی جانا شروع کر دیا۔ ان دنوں کی میری ڈائری کے مطابق 14 مارچ کو گورنمنٹ کالج لاہور کی مجلس اقبال کے زیر اہتمام یوم غالب کی تقریب میں شرکت کی جس میں پروفیسر سجاد باقر رضوی اور ڈاکٹر آغا یمین خاں نے بھی خطاب کیا۔ 17 مارچ کو وائی ایم سی اے ہال میں ایک شعری تقریب میں اچھی شاعری سننے کو ملی۔ 26 مارچ کو الفلاح بلڈنگ میں واقع نیشنل سنٹر لاہور میں منعقدہ مجلس مذاکرہ میں بطور سامع شرکت کی جس کا موضوع "کیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کتابوں کا نعم البدل ثابت ہو سکتے ہیں" تھا۔ اس تقریب میں اشفاق احمد المعروف تلقین شاہ نے خوب باتیں کیں۔ ان کے علاوہ نیشنل سنٹر کی ریذیڈنٹ ڈائریکٹر کشور ناہید، اظہار کاظمی، لئیق اختر اور معروف شاعر قتیل شفائی نے بھی خطاب کیا۔ 27 مارچ کو نیشنل سنٹر ہی میں پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خان کی یاد میں منعقد ہونے والے تعزیتی ریفرنس میں جانے کا اتفاق ہوا جس سے حفیظ جالندھری، ہاجرہ مسرور، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اور ڈاکٹر محمد باقر کی تقاریر سنیں۔ اس سے قبل ریڈیو پاکستان لاہور میں پروگرام "یونیورسٹی میگزین" کی ریکارڈنگ میں حصہ لیا۔ میرے ہمراہ محمد اکرم سندھو اور افضل وڑائچ تھے۔ 28 مارچ کو گورنمنٹ کالج کی "انجمن فارسی" کی ایران کے جشن نوروز کی تقریب دیکھی۔ یہاں ایران کے ثقافتی مرکز مال روڈ لاہور کے ڈائریکٹر رشید فرزانہ پور اور بزرگ استاد ڈاکٹر شجاع ناموس سے ملاقات قابل ذکر تھی۔ محفل موسیقی بھی اس کا حصہ تھی۔ معروف ادیب اور شاعر غلام حسین ساجد بھی اسی ہوسٹل میں مقیم تھے۔ وہ بہت دیر سے لکھ رہے تھے اور یہاں کے ادبی حلقوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ 29 مارچ کو ان کی رفاقت میں نیشنل سنٹر اور برٹش لائبریری کی رکنیت کے فارم لینے گئے۔ مشہور

ادبی جرائدفنون، اوراق اور تحریریں کے دفاتر گئے۔ اظہر سہیل پی آر اور اوی ریان کے ساتھ ان کے دفتر گئے۔ 30 مارچ کو کلاسز آف تھیں۔ تین بجے نیشنل سنٹر کی لائبریری کا رکنیت کارڈ جمع کرایا جس کے بعد آداب عرض رسالے کے دفتر گئے۔ چار بجے یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں اجلاس بیاد شاہ حسین اور چھ بجے ظہیر کاشمیری کی صدارت میں پاک ٹی ہاؤس میں منعقدہ ایک تنقیدی مجلس کی کاروائی دیکھی۔ شام 8 بجے راوی ریان ملز کے مینیجنگ ڈائریکٹر کے گھر گلبرگ میں ایک مشاعرہ سنا جس کی صدارت مولانا کوثر نیازی نے کی اور کلام پیش کرنے والے شعرا کے نام اس طرح تھے۔ شہزاد احمد، عبدالعزیز خالد، عطاالحق قاسمی۔ منو بھائی، عبدالحمید عدم، منیر نیازی، ایوب رومانی، سرور مجاز، اظہر سہیل۔ اس مشاعرے میں عطاالحق قاسمی پہلی بار بطور شاعر متعارف ہوئے۔ عبدالحمید عدم نشے میں دھت تھے اس لیے انہیں دو آدمیوں نے اٹھا کر مشاعرے کے سٹیج پر بٹھایا۔ 31 مارچ کو ملتان سے آئے ہوئے اور ہوسٹل میں ٹھہرے ہوئے عامر فہیم کے مہمان سرائیکی لوک فنکار پٹھانے خاں سے ہاسٹل کے کمرے ہی میں دو گھنٹے تک ہارمونیم کے واحد ساز کے ساتھ کافیاں اور دوہے سنے۔ انہیں اتنے قریب سے سننے کا بصری تجربہ تو مختلف تھا لیکن ان کو سنتے وقت طبعیت میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا ہوئی۔ شام کو نیشنل سنٹر میں احسان بٹالوی کی تصنیف "جنگ اور انسانیت" کی تعارفی تقریب میں شریک ہوا جس کی صدارت چیف الیکشن کمشنر جسٹس سجاد جان نے کی اور طفیل دارا، ڈاکٹر آغا یمین، سید قاسم محمود اور پروفیسر محمد عثمان کے مضامین اور تقاریر سننے کو ملیں۔ یکم اپریل کو برٹش کونسل لائبریری کا رکنیت کارڈ تصدیق کے بعد جمع کرایا، میٹرک اور انٹر کے کلاس فیلو محمد سلیم چاولہ کا پیغام طاہر نسیم نے پہنچایا کہ وہ ہیلی کالج آف کامرس کی ہوسٹل میں رہائش پذیر ہیں اور میرے ملنے کے منتظر ہیں۔ ایران کے وزٹنگ پروفیسر آقای بہمن جیبی سے ان کے دفتر میں ملاقات کی۔ وہ انگلش کی بجائے ثانوی زبان کے طور پر فرانسیسی زبان سے واقف تھے کیوں کہ ان کے دور طالب علمی میں ایران میں فرانسیسی بطور ثانوی زبان نافذ تھی۔ استاد محترم ڈاکٹر آفتاب اصغر اور ڈاکٹر سید محمد اکرم نے مشورہ دیا کہ مجھے ایرانی ثقافتی مرکز مال روڈ میں کلاس چہارم میں داخلہ لینا چاہیے۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال میں بی اے کے کلاس فیلو اور شعبہ سیاسیات کے طالب علم محمد الطاف لنگاہ کو نیو کیمپس ملنے گیا مگر وہ ابھی گھر سے واپس نہیں آئے تھے۔ 2 اپریل کو ہیلی کالج آف کامرس میں بی کام سال دوم کے دوست محمد سلیم چاولہ سے ان کی ہوسٹل میں ملاقات ہوئی۔ نیشنل سنٹر میں "انتظامیہ سماجی تبدیلیوں کے لیے کیا کر سکتی ہے" کے موضوع پر اس وقت کے وفاقی وزیر خورشید حسن میر کی صدارت میں ہونے والی تقریب میں شرکت کی جس کی تمام کاروائی انگریزی میں تھی۔ 4 اپریل کو ایرانی استاد آقای بہمن جیبی سے ایک بار پھر ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے بہت مفید کتب کا تحفہ دیا۔ ان کے حوالے سے ایرانی ثقافتی مرکز کے سربراہ سے ملاقات ہوئی

اور انہوں نے بھی بہت سا لٹریچر دیا۔ 5 اپریل کو اسی مرکز میں چوتھی کلاس میں داخلہ لے لیا، ہفتے میں تین دن کلاسیں ہوتی تھیں۔ 11 اپریل کو مجھے یونیورسٹی میں ایک ماہ ہو گیا تھا۔ میں ابھی تک عاضی طور پر ہاسٹل کے ایک کمرے میں مقیم تھا۔ اس روز مجھے کمرہ نمبر 19 الاٹ ہو گیا۔ اس میں منتقلی کی خاطر مجھے پہلی بار ایک کلاس سے غیر حاضر ہونا پڑا۔ 18 اپریل کو نیشنل سنٹر میں علامہ اقبال کی یاد میں ایک تقریب تھی جس سے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کے چیئر مین عبدالاسلام خورشید کا خطاب بہت مؤثر تھا۔ 24 اپریل کلاسز جاری تھیں کہ کچھ سیاسی طلبا نے اورینٹل کالج میں فائرنگ کر کے خوف کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی، یہ بڑا عجیب تجربہ تھا۔ 25 اپریل کو پرشین سوسائٹی کے زیر اہتمام یوم اقبال کی تقریب جاری تھی کہ اچانک پستول کی ہوائی فائرنگ سے چند گملے اور کمروں کے شیشے ٹوٹنے کی آواز نے تقریب میں شریک اساتذہ اور طلبا کو اس قدر پریشان کر دیا کہ جیسے اورینٹل کالج پر حملہ ہو گیا ہو۔ ساتھ ہی جماعت اسلامی کے فرید پراچہ کی آواز گونجی "باہر نکلو سرخیو؟ اس خوف و ہراس کی وجہ سے ہر استاد جیسے عبادت بریلوی، وحید قریشی، سید محمد اکرم، ڈاکٹر آفتاب اصغر اور تمام شرکا کرسیوں کی آڑ میں نیچے لیٹ گئے۔ یہ صورت حال مضحکہ خیز بھی لگی اور پریشان کن بھی کہ یونیورسٹی میں ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں۔ دل بجھ سا گیا کہ ہم نے اعلیٰ تعلیم کی درسگاہوں کی کیا درگت بنا دی ہے۔ اس واقعے کے بعد کالج کو دو دن کے لیے بند کر دیا گیا۔ 2 مئی کو کو نیشنل سنٹر میں جنگی قیدیوں کی واپسی پر تقریبِ مسرت کا انعقاد ہوا جس کی صدارت صوبائی وزیر تعلیم ڈاکٹر عبدالخالق نے کی۔ اس میں چند فلمی اداکاروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان اداکاروں میں محمد علی، زیبا، حسنہ اور علاؤالدین تھے۔ ان سب نے تقاریر بھی کیں۔ 3 مئی کو پاکستان آرٹس کونسل کے زیر اہتمام علاقائی رقص وسرود اور موسیقی کی محفل میں شرکت کی جس میں اس وقت کے مشیر برائے ثقافت اور معروف شاعر فیض احمد فیض نے بھی خطاب کیا۔ 4 مئی کو نیشنل سنٹر میں ایک متنوع رنگوں کی حامل محفل موسیقی منعقد کی گئی۔ 20 مئی کو ایرانی استاد آقای بہمن حبیبی نے ایران کے سماجی، ثقافتی، علمی اور ادبی رسائل و جرائد کی ایک غیر معمولی تعداد کا تحفہ دیا جو اب بھی مجلد صورت میں میرے پاس موجود ہیں۔ ان دستاویز میں انقلاب اسلامی ایران 1979 سے پہلے کی ایرنی معاشرتی اور ثقافتی زندگی کی رنگا رنگی دیکھی جا سکتی ہے۔ انہی دنوں پاکستان کی تاریخ کا ایک غیر معمولی واقعہ یا واقعات سننے کو ملے۔ غالباً ملتان کے تعلیمی اداروں کے اسلامی جمیعت طلبا سے وابستہ طالب علموں کا ایک وفد جمیعت کے اجتماع میں شرکت کے لیے بذریعہ ٹرین راولپنڈی جا رہا تھا۔ راستے میں قادیانیوں کا شہر ربوہ پڑتا تھا جہاں ٹرین نے مختصر سٹاپ کیا تو طلبا نے وہاں نعرے لگائے اور ایسی زبان استعمال کی جو قادیانیوں کے نزدیک "انتہائی قابل اعتراض'' ٹھہری اور اس سارے عمل کو اپنے لیے توہین آمیز قرار دیا۔ انہوں نے اپنے ذرائع سے

طلبا کی واپسی کی تاریخ معلوم کی۔ جیسے ہی ٹرین واپسی پر وہاں رکی تو قادیانیوں نے طلبا کی بوگی پر حملہ کر دیا۔ بہت سے طلبا شدید زخمی ہو گئے۔ شہادتوں کے بارے میں اب مجھے یاد نہیں رہا۔ یہ واقعہ پورے ملک میں قادیانیوں کے خلاف احتجاجی تحریک کا باعث بنا اور حکومت نے 31 مئی کو موسم گرما کی ہنگامی تعطیلات کا اعلان کر دیا۔ یونیورسٹی اور دیگر تعلیمی اداروں کی ہوسٹلوں کو فوراً خالی کرا لیا گیا اور دوسرے طلبا کی طرح مجھے بھی یکم جون کو واپس گاؤں آنا پڑا جہاں اب آئندہ 75 روز گزارنا اتنا آسان نہیں تھا۔ یونیورسٹی میں گزری پہلی سہ ماہی کو ایک طرح سے پہلی مدت (Spell) کہنا چاہیے۔ اوپر بیان کردہ تفصیل کے ضمن میں یہ بھی وضاحت کر دی جائے کہ اس دوران میں نے صرف ایک کلاس یا پریڈ میں غیر حاضری کی جب مجھے ہاسٹل کے اپنے اصل کمرے میں منتقل ہونا تھا۔ مرکزی لائبریری میں نوٹس کی تیاری اور وہاں پر دستیاب کتب کے مطالعے کا عمل باقاعدگی سے جاری رہا۔ پاک ٹی ہاؤس چند قدم کی دوری پر تھا جہاں ہفتے میں دو یا تین بار جانا لازمی ٹھہرا۔ ہر دوسرے ہفتے گھر جا کر سوموار کی صبح واپسی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ایک اچھی رفتار پکڑنے کے بعد اچانک تعطیلات کے باعث در آنے والے تعطل نے بہت بدمزا کر دیا۔ ماسوائے اس طرح کے خصوصی حالات کے عموماً یونیورسٹی کے ہوسٹلوں کے تعطیلات میں مکمل بند ہونے کی روایت نہیں تھی۔ ان اڑھائی ماہ کی تعطیلات میں ساہیوال ہال میں موجود بزم فکر و ادب کی لائبریری اور اس کے لائبریرین جناب عزیز اطہر نے میرا بہت ساتھ دیا۔ روزانہ یا دو دن کے وقفے سے اس لائبریری میں جانا معمول بن گیا۔ اپنی پسند یا ضرورت کی کتب اور جرائد جاری کروا کر گھر لے آتا۔ جب موسم گرما کی تعطیلات ختم ہونے کو تھیں تو اس وقت کے وزیر اعلیٰ حنیف رامے نے 15 اگست سے تعلیمی ادارے کھولنے کا اعلان کر دیا اور یہ قرار دیا کہ پہلے پندرہ روز تمام تعلیمی اداروں کے طلبا سوشل ورک میں حصہ لے کر اپنے اداروں کی صفائی اور ستھرائی کا کام کریں گے۔ کلاسز بہر حال یکم ستمبر سے شروع ہوئیں۔ اس بار میں گھر سے اپنا سائیکل بھی لے آیا تھا جس نے شہر کے مختلف مقامات تک میری رسائی آسان کر دی تھی۔ فلپس کا تین بینڈ والا ٹرانسسٹر ریڈیو پہلے ہی میرے پاس تھا اور ہوسٹل میں مجھے کمرہ نمبر 31 بھی الاٹ کر دیا گیا تھا جس میں میں اکیلا ہی رہائش پذیر تھا۔ یونیورسٹی کھلتے ہی تعطیلات سے قبل والی تمام سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ یونیورسٹی میں میری اب تک کی مدت کا ایک ایک لمحہ بہت متحرک اور کلاسز کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی محافل اور سرگرمیوں کے لحاظ سے بہت بھرپور تھا۔

پنجاب یونیورسٹی کے اولڈ کیمپس میں کل دو ہوسٹل تھے۔ اورینٹل کالج کا ہوسٹل ''وولنر ہال'' کل 35 کمروں پر مشتمل تھا اور ساتھ ہی واقع لا کالج ہوسٹل کی ایک بڑی عمارت تھی جس میں 250 کے قریب کمرے تھے۔ یونیورسٹی کے ایک وائس چانسلر الفریڈ وولنر سے منسوب ہوسٹل اورینٹل کالج کے اردو، فارسی، عربی اور

پنجابی شعبوں کے طلبا کے لیے مخصوص تھی تاہم ان شعبوں کے طالب علم نیو کیمپس کے ہوسٹلوں میں بھی داخلہ لے سکتے تھے۔ دوسری جانب تقریباً اڑھائی سو کمروں سے زائد کا دومنزلہ ہوسٹل لا کالج ہوسٹل کہلاتا تھا۔ اس کا دس کمروں پر مشتمل ایک آدھا ونگ اورینٹل کالج کے طلبا کے لیے مخصوص تھا۔ وولنر ہوسٹل کا اپنا لیوٹری بلاک نہیں تھا لہٰذا یہاں کے طلبا لا کالج ہوسٹل کا قریب ترین لیوٹری بلاک استعمال کرتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے کسی بھی ہوسٹل میں پنکھے نہیں تھے اس لیے اولڈ کیمپس میں پیسہ اخبار بازار سے کرائے پر پنکھے دستیاب تھے۔ میں نے ایک ٹیبل فین 30 روپے ماہانہ کرائے پر لیا ہوا تھا۔ ویسے کمرے اتنے گرم بھی نہیں ہوتے تھے کیوں کہ ان کی چھتیں اونچی ہونے کے علاوہ مٹی اور گارے کی تھیں، پنکھا آنے سے پہلے رات کو سونے کے لیے اپنی نوار والی تہہ کی جانے والی چارپائی چھت پر لے جاتے۔ جب ٹیبل فین لیا تو رات کو برآمدے میں چارپائی بچھا اور سٹول پر رکھا پنکھا چلا کر سو جاتے۔ 1975 کے دوران گرمیوں کی آمد سے پہلے کلائمیکس کمپنی گوجرانوالہ کے ساتھ معاہدے کے تحت یونیورسٹی کی نیو اور اولڈ کیمپس کی تمام ہوسٹلوں میں پنکھوں کی تنصیب ہوئی۔ اوپر والی منزل میں تو پنکھے کی ہک لگانا آسان تھا مگر نیچے والی منزل کے لیے اوپر والے کمروں کے فرش میں ڈرل کے ذریعے سوراخ کیے گئے۔ ایک سال تو پنکھوں کی سہولت سے خوب فائدہ اٹھایا مگر 1976 کی مون سون کے دوران شدید بارشیں ہوئیں اور گارے اور مٹی کی چھتیں ٹپکنے لگیں۔ اب وہی پانی اوپر والی منزل کے پنکھوں میں بھی آ چکا تھا مگر اس بات کا پتا اس وقت چلا جب انجام سے بے خبر اوپر کی منزل کے چند باسیوں نے پنکھے چلائے تو وہ جل کر خراب ہونے لگے۔ جنہیں اس بات کا پتا چل چکا تھا ان کے کمروں کے پنکھے جلنے سے بچ گئے۔ جب پانی خشک ہوا تو بچ جانے والے پنکھے صحیح سلامت چل پڑے مگر بڑی تعداد میں پنکھے جل چکے تھے۔ کئی مہینوں بعد ایک نئے ٹھیکے کے تحت ان پنکھوں کی مرمت کی جا سکی۔ اولڈ کیمپس کی دونوں ہوسٹلوں میں آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا بل کہ انہیں اوپن ہوسٹل کہنا چاہیے۔ وولنر ہوسٹل میں ہم سے سینئر لوگوں میں جیون سلطان (جھنگ)، ناصر بلوچ (ساہیوال سرگودھا)، عامر فہیم (ملتان)، سلیم اللہ خاں (گوجرانوالہ)، پرویز کیانی (عارف والا)، انوار قیوم نیازی (ساہیوال)، صفدر ملک (پاک پتن)، نیئر صمدانی (چیچہ وطنی) اور ہدایت مرزا تھے۔ سیشن فیلوز میں غلام حسین ساجد (میاں چنوں)، عاشق حسین انجم (بہاول پور)، رفیق بلوچ (جھنگ)، محمد اکرم سندھو (منڈی بہاؤالدین)، توقیر خان (ساہیوال) شامل تھے۔ جاوید منیر احمد (چیچہ وطنی)، محمد یعقوب (آزاد کشمیر)، سید ظہیر شاہ (بوریوالہ) اور محمد اختر (احمد پور شرقیہ) لا کالج ہوسٹل کے مستعار ونگ میں تھے۔ 1974 کے یہی نام 2024 میں یاد رہ گئے ہیں۔ انوار نیازی اپنی شگفتہ مزاجی، لطیفہ سازی اور لطیفہ گوئی میں تمام ہوسٹل کا مرکز تھے۔ وہ کامن روم، میس یا جہاں بھی بیٹھتے وہاں قہقہے بانٹتے رہتے۔ ہماری

ہوسٹل کی میس صرف 30 سٹوڈنٹس کی تھی جب کہ کامن روم بھی ایک مناسب اور چھوٹے کمرے پر مشتمل تھا۔ ہفتے میں دو بھارتی فلمیں لگتیں تو کامن روم بھر جاتا۔ جب ٹی وی خراب ہوتا اور فلم کا دن ہوتا تو ہم رہائشی طلبا چندہ ڈال کر ٹھیک کراتے۔ میں نے ہوسٹل میں پہلی رات یعنی 11 مارچ 1974 کو پہلی بھارتی فلم "دو بدن" دیکھی تھی جو اپنے گانوں کی وجہ سے فقید المثال تھی۔ پھر چل سو چل ہر ہفتے دو فلمیں، چار بار فلمی گانوں کا پروگرام چترہار اور پر ہجوم کامن روم۔ کسی نے بتایا کہ یکم جنوری 1974 کو امرتسر ٹی وی کا آغاز شہرہ آفاق فلم "پاکیزہ" سے ہوا تھا۔ ساتھ ہی بی ڈی ایس کے طلبا کا ہوسٹل تھا، دو چار وہاں کے طلبا بھی اسی کامن روم میں آ جاتے۔ ان میں سے ایک میاں عبدالقیوم بھی تھے جن کا تعلق ضلع بہاولنگر کی طرف کے کسی شہر سے تھا مگر انہوں نے پرائیویٹ پریکٹس کے لیے رحیم یار خان کا انتخاب کیا جہاں میری ان سے 1988 کے دوران اتفاقیہ ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت وہ رحیم یار خان کے مہنگے ترین ڈینٹل سرجن ہیں۔ ٹی وی کے لحاظ سے ہمارا وقت سیاہ وسفید کا دور تھا۔ ہر اتوار کو دوپہر ایک گھنٹے کی نشریات بھی ہوتی تھیں جس میں پی ٹی وی کے پرانے اردو ڈرامے قسط وار دکھائے جاتے تھے۔ ڈارمہ شہزوری اور روحی بانو کے پرانے ڈرامے اسی ٹرانسمشن میں دیکھنے کو ملے۔ ہمارے وقت ہوسٹل کے نگران شعبہ اردو کے استاد اور معروف نقاد اور محقق ڈاکٹر سہیل احمد خان تھے۔ لا کالج اور وولنر ہاسٹل کی ایک عجیب وغریب راویت چلی آ رہی تھی۔ ہفتے میں ایک یا دو بار دونوں ہوسٹلوں کے رہائشی طلبا کے درمیاں جگتوں اور گالیوں کا مقابلہ ہوتا تھا۔ اس کا آغاز کچھ اس طرح ہوتا۔ لا کالج ہوسٹل سے آواز آتی، " فارسیاں عربیاں قلعی کرا لو، ادھر سے جواب آتا، "مفت چھٹے بنوا لو۔" اس کے بعد آدھ گھنٹہ یا اس سے زیادہ وقت تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ جب ایک طرف سے کوئی کمال کا جملہ آتا اور دوسری جانب سے خاموشی ہوتی تو یہ سلسلہ ختم ہو پاتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ روایت بہت پرانی تھی اور ہماری ہوسٹل کے نگران ڈاکٹر سہیل احمد خان جب اس ہوسٹل کے رہائشی تھے تو اس وقت بھی یہ دلچسپ مگر عجیب وغریب روایت زندہ تھی۔

چوں کہ ہماری ہوسٹل اور شعبہ شہر کے تقریباً مرکز میں تھا تو پانچ چھ کلومیٹر کے دائرے میں ادبی مجالس کے اجلاسوں میں شرکت کرنا بہت آسان تھا۔ اس سلسلے میں غلام حسین ساجد ہمارے رِنگ لیڈر تھے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے آدھی قیمت پر کتب خریدنے کا چسکا لگایا۔ انارکلی کے پہلے حصے میں نیلا گنبد چوک سے مال روڈ تک کے دائیں جانب پرانی اور استعمال شدہ یا سیکنڈ ہینڈ کتب کے کباڑیوں کے مستقل ٹھکانے تھے۔ اتوار کے دن تو انارکلی بازار کے متذکرہ بالا حصے کی دونوں اطراف پرانی کتابوں کے سٹالز سے بھر جاتی تھیں اس لیے ہمارے اتوار کا بیشتر حصہ یہیں پر گزرتا۔ اس کے بعد وہ ہمیں علمی وادبی حلقوں میں لیے لیے پھرتے تھے۔ پاک ٹی ہاؤس تو بہت قریب تھا۔ صبح، دوپہر، شام وہاں کسی وقت بھی جایا جا سکتا تھا۔ پاک ٹی

ہاؤس واقعتاً شہر کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا ایک مستقل مرکز تھا جہاں پر چائے اور اس کے لوازمات کے ساتھ ساتھ کھانا بھی دستیاب تھا۔ لاہور سے باہر کے ادیبوں کو مطلوبہ ادیب یہیں پر مل جاتے حتیٰ کہ دیگر شہروں سے کسی بھی ادیب سے بذریعہ فون رابطہ بھی اسی جگہ کیا جا سکتا تھا۔ قدامت پسند، لبرل اور بائیں بازو غرضیکہ تمام دانشوروں کا یہی ٹھکانہ تھا۔ ٹی ہاؤس میں داخل ہونے کے بعد پہلا میز انتظار حسین، سہیل احمد خان اوران کے دوستوں کا تھا۔ اس میز کے گویا ان کے پاس کاپی رائیٹس تھے۔ آزاد اور نثری نظم کے داعی مبارک احمد اور اخبار جہاں کے ادبی کالم نگار اور ادیب اسرار زیدی اور انیس ناگی بھی اپنی مستقل میزوں پر براجمان ہوتے غرضیکہ تمام ادیب و شاعر اپنی اپنی منڈلیاں سجائے اسی جگہ دستیاب ہوتے۔ یہاں پر بیٹھنے والے اصحاب کچھ اس استقلال سے یہاں موجود ہوتے، لگتا تھا جیسے ان اوقات میں ان کا اپنے گھروں میں داخلہ ممنوع تھا۔ اوپر کا ہال صرف تنقیدی اجلاسوں کے لیے مخصوص تھا۔ ہمیں چوں کہ چاروں اور سے ٹی ہاؤس قریب پڑتا تھا اس لیے ہم بھی اکثر و بیشتر یہیں پر موجود ہوتے۔ حلقہ اربابِ ذوق کا ہفتہ وار اجلاس بہت پرہجوم ہوتا تھا جس میں ٹی ہاؤس میں موجود بیشتر لوگ شرکت کرتے۔ میں نے حلقہ اربابِ ذوق کا جو پہلا تنقیدی اجلاس اٹینڈ کیا اس میں ڈاکٹر خواجہ زکریا نے اکبر اللہ آبادی پر اپنا مضمون پیش کیا۔ حلقہ جب منقسم ہوا تو دوسرے گروپ کو حلقہ اربابِ ذوق (سیاسی) کا نام دیا گیا۔ اس کے اجلاس وائی ایم سی اے ہال میں منعقد ہوتے۔ میں جب اولڈ کیمپس میں تھا تو پاک ٹی ہاؤس اکثر جانا ہوتا۔ آج نصف صدی کے بعد کچھ نام یاد رہ گئے ہیں جن سے ملاقات یا گفتگو ہوئی یا جنہیں کثرت سے وہاں دیکھا کرتے اور کسی نا کسی منڈلی میں بیٹھ کر باتیں سنتے یا موقع پا کر کچھ بات چیت بھی کر لیا کرتے۔ شفقت تنویر مرزا، سید سبط الحسن ضیغم، فہیم جوزی، شاہد محمود ندیم، سعادت سعید، عارف عبدالمتین، یوسف کامران، کشور ناہید، یونس جاوید، حسن رضوی، نجیب احمد، خالد احمد، تنویر سپرا، انور سجاد، علی اکبر عباس، مبارک احمد، اسرار زیدی، روحی کنجاہی، قتیل شفائی، قیوم نظر، سرمد صہبائی، منظور اعجاز، رشید مصباح، زبیر رانا، آزاد کوثری، اقبال ساجد، سراج منیر، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، غلام محمد قاصر، انیس ناگی۔ منیر نیازی، شہزاد احمد، افضال نوید، تبسم کاشمیری، سمیع آہوجا، عبدالرشید، صابر ظفر، گلزار وفا چودھری، امجد اسلام امجد، شاہد شیدائی، قائم نقوی، عالم خان، عطاالحق قاسمی کے نام شامل تھے۔ احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کو کم از کم میں نے وہاں کبھی نہیں دیکھا۔

سیشن ختم ہونے کے بعد تمام دوست وولنر ہوسٹل سے ترک سکونت کر گئے تاہم ایم اے کے تحقیقی مقالے کی وجہ سے مجھے مزید تین ماہ رہنے کی اجازت مل گئی جس کے اختتام کے بعد 18 نومبر 1976 کو میں لا کالج ہوسٹل میں ایک دوست کے کمرہ نمبر 46 میں شفٹ ہو گیا۔ اس اجمال کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ وولنر

ہوسٹل کے تمام دوست گھروں کو واپس چلے گئے یا لاہور میں دیگر جگہوں پر رہائش اختیار کر لی۔ میں ایک چھوٹی سی ہوسٹل سے ایک بڑی ہوسٹل کا حصہ بن گیا۔ یہاں بھی چند ادیب و شاعر دوست مل گئے جن کے ساتھ ٹی ہاؤس کے علاوہ اخبارات کے دفاتر کے چکر لگانا اور شہر کے دیگر حصوں میں ادبی سرگرمیوں کا حصہ بننے لگے۔ فیصل آباد سے قانون کے طالب علم ممتاز کنول تھے جنہوں نے شعبہ اردو اور لا کالج میں داخلہ فارم جمع کرائے مگر فیس کی ادائیگی کے وقت بیمار ہو گئے تو لاہور میں مقیم ان کے بھائی نے لا کالج میں ان کی داخلہ فیس جمع کرا دی۔ چوں کہ وہ ایک اچھے شاعر تھے اس لیے لا کالج میں داخلے کو وہ اپنی زندگی کا المیہ شمار کرتے رہے۔ بعد میں انہوں نے فیصل آباد میں پریکٹس کی۔ لا کے ایک اور طالب علم وزیر آباد کے زاہد مسعود تھے جو نظم کے بہت اچھے شاعر تھے ,بہت اچھی جگت لگاتے تھے۔ وہ محکمہ لیبر میں چلے گئے۔ تیسرے دوست لا کے سید احسن محبوب تھے جنہوں نے پرشین ڈیپارٹمنٹ کی طالبہ سے شادی کی اور مقابلے کے امتحان میں پولیس گروپ میں آئے۔ 2017 میں آئی جی پولیس بلوچستان ریٹائر ہوئے۔ ہم چاروں کا ایک گروپ بن گیا اور شہر کی کوئی ادبی تقریب ہم نے نہیں چھوڑی۔ امجد اسلام امجد جب ڈیپوٹیشن پر لاہور آرٹس کونسل کے ڈپٹی ڈائریکٹر تھے تو انہوں نے واپڈا ہاؤس میں بڑے پیمانے پر کل پاکستان مشاعرہ کرایا جس میں تقریباً ہر بڑے شاعر نے شرکت کی۔ یونیورسٹی چھوڑنے سے پہلے یہ آخری بڑی تقریب تھی جس میں ہم موجود تھے۔ لا کالج نیو کیمپس منتقل کیا گیا تو یہ دوست بھی ادھر کی ہوسٹلوں میں منتقل ہو گئے۔ میں فروری 1978 میں پہلے ہی لا میں داخلے کی بنیاد پر 19 نمبر ہوسٹل کے 19 نمبر کمرے میں مقیم تھا۔ ممتاز کنول میرے روم میٹ بن گئے۔ زاہد مسعود ساتھ والی 14 نمبر ہوسٹل میں آ گئے۔ ہم لا کی کلاسز کے بعد اولڈ کیمپس آ جاتے تھے اور عموماً آخری ٹائم کی بس میں نیو کیمپس لوٹتے۔ اولڈ کیمپس میں زیادہ تر ٹھکانہ ٹی ہاؤس ہی ہوتا۔ اس طرح سے میری ادبی تربیت بھی ہوتی رہی اور وقت بھی گزرتا رہا۔ نیو کیمپس میں رہائش اور ماحول کا ذکر آگے آئے گا۔ یہاں ٹی ہاؤس کے ماحول سے پیدا ہونے والے دو نمائندہ واقعات کا ذکر کرتا چلوں۔ جناب غلام حسین ساجد نے بتایا کہ کراچی سے ثروت حسین آ رہے ہیں، وہ منیر نیازی سے ملنا چاہتے ہیں۔ کل ٹی ہاؤس آ جانا۔ ٹی ہاؤس میں میرے اور ساجد کے علاوہ ثروت حسین،، منیر نیازی اور اقبال ساجد ٹی ہاؤس میں ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور عام سی گپ شپ ہو رہی تھی کہ اچانک منیر نیازی نے کہا کہ آئیں گرین ٹی ہاؤس میں چلتے ہیں۔ یہ ٹی ہاؤس چند قدم کے فاصلے پر میکلیگن روڈ پر واقع تھا اور کچھ نوجوان ادیبوں نے اسے اپنا ٹھکانہ بنایا ہوا تھا، خیر وہاں سے اٹھے اور گرین ٹی ہاؤس کی بالائی منزل پر آ کر بیٹھ گئے۔ منیر نیازی نے شلوار کے نیفے میں اڑسی ہوئی ایک چوتھائی سائز کی بوتل نکالی جس کو معروف زبان میں "پوّا" کہتے ہیں۔ اقبال ساجد کی آنکھوں میں ایک دم چمک آ گئی۔ منیر نیازی اور

اقبال ساجد نے پانی میں ملا کے ایک ایک پیگ چڑھایا۔ پانچ منٹ کی مزید گفتگو کے بعد منیر نیازی کہنے لگے کہ یہاں کے اجنبی ماحول سے خاصی وحشت ہو رہی ہے۔ وہاں سے اٹھ کر واپس ٹی ہاؤس آ گئے۔ ٹی ہاؤس میں اکثر دیکھنے میں آیا کہ اقبال ساجد سے لوگ بہت گریزاں رہتے تھے کیوں کہ ان کی شاعری میں بڑے معاصر شعرا کی عظمت کو چیلنج کیا گیا تھا۔ انہوں نے " کچھ بھی نہیں " ردیف میں آٹھ اشعار کی ایک غزل کہی تھی جس کا مطلع یہ تھا: (نئے زمانے میں ان کا جواز کچھ بھی نہیں ۔۔۔ فراق وفیض وندیم وفراز کچھ بھی نہیں) ان کا عموماً سوال یہ ہوتا کہ یار چائے ہی پلا دو! ہم جیسے ادب کے طالب علم بہرحال ان کا احترام کرتے تھے۔ اسی طرح ایک روز اولڈ کیمپس میں رہائش کے دوران ہم چاروں ٹی ہاؤس میں موجود تھے تو سید احسن محبوب سے مخاطب ہو کر اقبال ساجد کہنے لگے " نوجوان! آج سرسبز وشاداب ہونے کو جی چاہتا ہے، اگر تم میرا یہ کام کر دو تو میں تمہیں اپنی شاعری سے شاداب کر دوں گا۔ احسن نے بیس روپے دیے تو وہ کسی میڈیکل سٹور سے بوتل میں کچھ لے آئے، انہیں لے کر ہم لا کالج ہوسٹل میں ممتاز کنول کے کمرے میں لے گئے۔ انہوں نے دو پیگ لگائے تو شاعری میں رواں ہو گئے اور وہ غزلیں سناتے جاتے اور ہم واہ واہ کی آوازیں بلند کرتے جاتے۔ جب محفل عروج پر پہنچی تو نیچے رکھی ہوئی بوتل کو احسن کا پاؤں لگا اور وہ گر گئی۔ یہ ایک دم چیخے " ارے نا ہنجار تم نے میرا امرت گرا دیا "۔ پھر ان کا مزاج بگڑ گیا اور وہ مجلس چھوڑ کر چلے گئے۔ 1984 کی دہائی میں جواز جعفری نے ان کا کلام ''اثاثہ'' کے نام سے مرتب کیا۔

اب میں آپ کو 1974 میں واپس لے چلوں گا۔ پہلے اورینٹل کالج جیسی عظیم اور قدیم درسگاہ کا تاریخی پس منظر خالی از دلچسپی نہیں ہوگا۔ 1870 میں مشرقی علوم کے مدرسے کے طور پر آغاز کرنے والا یہ ادارہ 1872 میں پہلے اورینٹل سکول اور پھر اورینٹل کالج بن گیا۔ کالج کی اپنی کوئی عمارت نہیں تھی اور یہ لاہور میں مختلف جگہوں پر کام کرتا رہا۔ ڈاکٹر لائٹنر کی سرپرستی میں انجمن پنجاب کی انتھک کوششوں سے 1882 میں پنجاب کو ایک مکمل یونیورسٹی مل گئی جب کہ اورینٹل کالج مجوزہ یونیورسٹی میں بالکل جدا اور ممتاز فیکلٹی کی حیثیت اختیار کر گیا۔ یونیورسٹی کے اغراض ومقاصد میں دیسی زبانوں کی ترقی کے علاوہ مشرقی علوم مفیدہ کی تعلیم کے لیے وسائل مہیا کرنا سرفہرست تھا اور اورینٹل کالج نئی یونیورسٹی کا واحد تعلیمی ادارہ تھا جہاں ڈگری کے درجوں کی تعلیم کا انتظام موجود تھا۔ یونیورسٹی کے قیام کے ابتدائی سالوں میں اورینٹل کالج کے اساتذہ نے اس ادارے کی بڑی مدد کی بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ پنجاب یونیورسٹی کے قیام کے لیے اورینٹل کالج نے ایک پلیٹ فارم مہیا کیا۔ 1884 میں گورنمنٹ کالج نے مشرقی علوم کے شعبوں کو بند کر دیا اور مشرقی زبانوں کے اساتذہ اورینٹل کالج بھیج دیے گئے۔ عربی، سنسکرت، گورمکھی، عالم، فاضل اور علوم شرقیہ کی جماعتیں اورینٹل کالج ہی میں جاری

وساری رہیں۔عربی اور سنسکرت میں ایم اے کی کلاسوں کا آغاز 89-1888 میں ہو گیا۔کالج کے قیام کے بیالیس سال کے بعد تک کالج کو اپنی عمارت نہ مل سکی۔جگہ کی تنگی اور طلباء کے لیے دارالاقامہ کا مسئلہ پیچیدہ صورت اختیار کر گیا۔اس عرصہ میں تصنیف اور تالیف کی سرگرمیوں کا دائرہ بھی محدود ہوتا چلا گیا تاہم کالج کی عربی اور سنسکرت کی زبانوں کی تعلیم کے لیے ممتاز ماہر تعلیم میسر آ گئے۔1919 تا1947 تک کا دور کالج میں تحقیق وتصنیف، تدریس اور انتظامی لحاظ سے عظیم الشان قرار دیا جا سکتا ہے۔12 دسمبر 1925 کو بڑی جدوجہد کے بعد اورینٹل کالج کو اپنا گھر (عمارت) مل گیا۔1929 میں کالج کے طلبا کے لیے ہاسٹل تعمیر ہو گیا جس کو ڈاکٹر اے سی وولنر کے نام سے موسوم کیا گیا۔پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی تعمیر وترقی میں اورینٹل کالج کے اساتذہ نے فعال کردار ادا کیا۔کالج میں شام کی کلاسوں کا آغاز بھی ہو گیا۔ایم اے کے علاوہ پی ایچ ڈی کی سطح پر بھی تحقیقی کام کا آغاز ہو گیا۔ایم اے فارسی کی کلاسوں کے اجرا اور طلبہ کی تعلیم وتدریس میں اساتذہ نے بڑے انہماک سے کام کیا۔اس دور میں علوم شرقیہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے طالبات بھی آنے لگی تھیں،ساتھ ساتھ قدیم اور جدید کے تفاوت کو دور کرنے کے لیے کالج میں ضروری تبدیلیوں کا سہارا بھی لیا گیا۔کالج کی سوسالہ تقریبات کا آغاز مارچ 1972 میں ہوا۔یہ تقریبات ایک سال جاری رہیں۔سب سے بڑی تقریب بین الاقوامی کانگرس ماہرین علوم شرقیہ 12 تا17 دسمبر 1973 تک منعقد ہوئی جو ایک ہفتہ جاری رہی جس میں ملک کی یونیورسٹیوں کے نامور علما، فضلا اور محققین کے علاوہ مختلف ممالک کی یونیورسٹیوں کے مندوبین بھی شریک ہوئے۔اس عظیم درسگاہ سے منسلک رہنے والے پروفیسروں، پرنسپلوں اور اساتذہ میں ڈاکٹر لائٹنر، ڈاکٹر سر مارک ارل سٹائن، ڈاکٹر اے ڈبلیو اسٹرٹین، ڈاکٹر سر ٹامس ارن، ڈاکٹر اے سی وولنر، مولانا محمد حسین آزاد، علامہ محمد اقبال، حافظ محمود خان شیرانی، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، سید اولاد حسین شاہ بلگرامی مولانا مفتی عبداللہ ٹونکی، ڈاکٹر عظیم الدین احمد، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر برکت علی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، مولانا عبدالعزیز میمن، ڈاکٹر سید عبداللہ، سید وقار عظیم، مولانا عبدالصمد صارم، ڈاکٹر ابوالیث صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر محمد باقر چند ایسے نام ہیں جن کو علوم شرقیہ سے دلچسپی رکھنے والے کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

اس قدیم وجدید ادارے میں داخل ہو کر کسی ایک مشرقی زبان و ادبیات میں ماسٹرز کی ڈگری لینا بذات خود ایک اعزاز تھی۔جب میں نے یہاں داخلہ لیا تو اس کے بڑے شعبوں میں عربی، فارسی، اردو، پنجابی کے علاوہ کشمیریات، ہندی، ترکی اور فرانسیسی زبانوں کی بھی تدریس کی جاتی تھی۔1870 سے قائم شدہ شعبہ عربی زبان وابیات کے استاد ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کا بہت شہرہ تھا کیوں کہ لاہور میں اسلامی ملکوں کی دوسری

سربراہی کانفرنس منعقدہ 21 فروری کے بعد لیبیا کے سربراہ معمر القذافی نے لاہور کے کرکٹ سٹیڈیم میں ایک عوامی جلسے سے خطاب کیا اور ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے اس کا ساتھ ساتھ فی البدیہہ اور روانی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ رانا احسان الٰہی ظہیر صدر شعبہ تھے۔ دیگر اساتذہ میں ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک، ڈاکٹر امین اللہ وثیر، مولانا عبدالصمد صارم، محمد یحیٰ اور سید محمد کبیر احمد مظہر وابستہ تھے۔ 1920 میں ایم اے اور ڈاکٹریٹ سے آغاز کرنے والے شعبہ فارسی کے اساتذہ کے بارے میں تفصیل میرے الگ سے ایک مضمون "پاکستان میں کالج کے فارسی استاد کی سرگزشت" میں آ چکی ہے جو شامل کتاب ہے۔ 1921 کے دوران اردو کا شعبہ ایک تحقیقی شعبے کے طور پر شروع کیا گیا تاہم ایک مکمل شعبے کے طور پر اس کا آغاز اکتوبر 1948 میں ہوا۔ معروف ماہر تعلیم ڈاکٹر عبادت بریلوی 1974 میں اس کے صدر شعبہ اور کالج کے پرنسپل تھے۔ اس وقت ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر وحید قریشی، عبید اللہ خاں، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر ناظر حسن زیدی اور ڈاکٹر سہیل احمد خان اس شعبے سے وابستہ تھے۔

یونیورسٹی اورینٹل کالج کے قیام کے مقاصد میں دیسی زبانوں کی نشر و اشاعت بھی شامل تھی۔ جب 1870 میں کالج قائم ہوا تو اس وقت (گورمکھی) رسم الخط، پنجابی میں عالم اور فاضل کی کلاسیں بھی شروع ہوئیں۔ یہ کلاسیں باقاعدگی سے جاری رہیں۔ 1928 میں کالج میں اردو، ہندی اور پنجابی کے تحقیقی شعبے قائم کیے گئے اور پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ نے اورینٹل کالج میں اردو، ہندی اور پنجابی کے لیے لیکچروں کی تین اسامیوں کی مزدوری دی چناں چہ پنجابی کی آسامی پر ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کا تقرر ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد ہندی، سنسکرت کے ساتھ ساتھ پنجابی کا شعبہ بھی بند کر دیا گیا۔ نومبر 1971 میں پروفیسر قیوم نظر کو شعبہ پنجابی متعارف ہونے کے بعد تین سال کے لیے افسر بکار خاص مقرر کیا گیا اور وہ صدر شعبہ کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ابتدا میں شعبہ پنجابی میں ایم اے کی کلاسوں کی تدریس کرنے والے اساتذہ میں پروفیسر قیوم نظر، مرزا مقبول بیگ بدخشانی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ڈاکٹر محمد اجمل، مولا بخش خضر تمیمی، ڈاکٹر وحید قریشی، اشفاق احمد، ڈاکٹر غلام علی چودھری، ڈاکٹر عبدالغنی، نجم حسین سید، محمد اسماعیل بھٹی، مرزا محمد منور، محمد اصغر سلیم، ثناءاللہ جمیل اور شریف کنجاہی شامل تھے۔ پنجابی کے ایک تدریسی شعبے کی طرز پر آغاز کے بعد پروفیسر قیوم نظر کے معاہدے کی مدت جب ختم ہوئی تو ان کی جگہ پاکستان اکاؤنٹس گروپ سے تعلق رکھنے والے ادیب اور شاعر نجم حسین سید ڈیپوٹیشن پر ستمبر 1973 میں آئے اور 1976 میں واپس چلے گئے۔ جب میں اورینٹل کالج میں داخل ہوا تو اس وقت اس شعبے کے صدر نجم حسین سید تھے اور پروفیسر شریف کنجاہی، علی عباس جلال پوری، محمد آصف خان اس شعبے کے جز وقتی اساتذہ کے طور پر ایم اے پنجابی کی کلاسوں کو پڑھا رہے تھے۔ جب پنجابی شعبہ اپنی

شناخت بنا چکا تھا تو بہت بعد میں ڈاکٹر شہباز ملک، ڈاکٹر محمد اسلم رانا اور محمد حفیظ تائب بھی اس شعبے میں آئے۔

اورینٹل کالج میں عام طور پر نصابی ماحول تھا۔کلاسیں اور صرف کلاسیں۔دوسال کے دوران شعبوں کے انفرادی یا کالج کی اجتماعی سطح پر کسی موضوع پر کبھی کوئی سیمینار یا کانفرنس منعقد نہیں کی گئی۔ایم اے کی سطح پر اِکا دُکا کسی پرچے کے لیے تحقیقی مقالہ لکھنے کی کم از کم سطح پر روایت موجود تھی البتہ اساتذہ تحقیقی اور تدریسی لحاظ سے غیر معمولی شخصیات تھیں مگر ان کے باہمی مناقشات کی زیریں لہر کو محسوس کیا جا سکتا تھا مگر ان کی آنچ طلبا تک کم ہی آتی تھی۔اوروں کا تو معلوم نہیں مگر شعبہ فارسی میں دوسال کے دوران تین سے چار مرتبہ سیمینار پیریڈ منعقد ہو سکے جن میں سے دو مجھے یاد رہ گئے۔ایک میرا مضمون تھا جس میں اس وقت کی معروف اور آزاد فکر شاعرہ "فروغ فرخزاد" کی شاعری پر بحث کی گئی تھی یا پھر ہماری فائنل کی طالبہ رخسانہ کوثر نے ایسے ہی ایک سیمینار پیریڈ میں ایران کی ایک اور شاعرہ "سیمین بہبہانی" پر مضمون پڑھا تھا مگر یہ تو ایک قسم کی نصابی سرگرمی تھی۔کلاس کا عمومی ماحول بھی خاصا سنجیدہ تھا۔کبھی کبھار مذاق ہو جاتا تھا۔اساتذہ کا رویہ ان کے اپنے مزاج کے مطابق تھا۔ایسے استاد بھی تھے جو دوستانہ رویے کے ساتھ ذاتی معاملات میں بھی رہنمائی کرتے تھے۔کئی استاد ایک غیر ضروری فاصلے کے قائل تھے جب کہ کچھ اساتذہ گفتگو کو مناسب حد تک محدود رکھتے تھے۔مخلوط تعلیم کی وجہ سے طلبا و طالبات کے درمیان لکڑی کے فولڈنگ پردوں کی روایت ماضی سے ہی آ رہی تھی۔طلبا ان پردوں کو ہٹاتے تو طالبات واپس رکھ دیتی تھیں۔فائنل کلاس میں البتہ پردے کا وجود غائب ہو گیا۔یہاں ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا پائی جاتی تھی جس میں کچھ طلبا و طالبات تو بولڈ انداز میں گفتگو کر لیتے تھے لیکن زیادہ تر طالبات چوکنی محتاط اور لیے دیے رہتی تھیں کہ کسی لڑکے سے بات کرتے ہوئے کوئی ایسی ویسی رائے نہ قائم کر لی جائے۔انسانی اور برابری کی سطح پر بات کم ہی ہو سکتی تھی۔ماحول میں ناآسودگی اور فرسٹریشن کو بھی محسوس کیا جا سکتا تھا۔ہر ڈیپارٹمنٹ کی اپنی فضا ہوتی تھی مگر ہر ڈیپارٹمنٹ کے طلبا دوسرے ڈیپارٹمنٹ کے لیے خوش فہمی کا شکار نظر آتے تھے کہ شاید وہاں ہمارے شعبے جیسی "خشک" فضا نہیں ہوگی۔ایک روزہ تفریحی ٹور کالج کے نام پر تمام شعبوں کا مشترکہ طور پر لگایا جاتا۔دوران سفر البتہ انتہائی محدود پیمانے پر کچھ طلبا اور طالبات کے فنی جوہر کھلتے۔دوسال میں صرف تین ایک روزہ ٹور جن مقامات کے لگائے گئے ان میں ہرن مینار اور نندی پور، چھانگا مانگا اور ہیڈ بلو کی کے تھے۔کلاس روم میں البتہ طلبا و طالبات کے درمیان مثبت احساس کے ساتھ نصابی قسم کی گفتگو ضرور ہو جاتی۔اورینٹل کالج کی بلڈنگ یو (U) شکل کی ہے۔اگر چیئرنگ کراس روڈ کی طرف سے دیکھیں تو دائیں جانب کا حصہ لاکالج کے پاس تھا جب کہ بائیں جانب کے حصے میں اورینٹل کالج کے شعبہ جات تھے۔ دونوں حصوں کے درمیان ایک گراسی لان کا فاصلہ تھا۔دونوں حصوں کو مینارڈ ہال آپس میں ملاتا تھا۔ہال کے

اوپر کے آدھے حصے میں شعبہ پنجابی کے دفاتر تھے۔ 1978 میں جب لا کالج نیو کیمپس میں اپنی نوتعمیر شدہ عمارت میں منتقل ہو گیا تو لا کالج والا حصہ بھی اورینٹل کالج کو مل گیا۔ جس میں کالج لائبریری، ڈین و پرنسپل کے دفاتر منتقل ہو گئے۔ بعد میں لائبریری کو پرانے بینارڈ ہال میں شفٹ کر دیا گیا اور اوپر والے حصے کو شیرانی ہال بنا دیا گیا۔ بہر حال لا کالج کے طلبا جہاں 5 فیصد طالبات بھی آ گئی تھیں اور اورینٹل کالج کے طلبا و طالبات آمنے سامنے برآمدوں میں کھڑے ایک دوسرے کو دور دور سے دیکھتے رہتے۔

اوپر کی منزل پر جہاں سیڑھیوں کا اختتام ہوتا ہے، بائیں جانب کا کمرہ فارسی فائنل اور سامنے والا کمرہ فارسی سال اول کا تھا۔ ہمارے کمرے کا دوسرا دروازہ برآمدے میں کھلتا تھا۔ بلیک بورڈ کی جانب سے دیکھیں تو دائیں جانب طلبا اور بائیں جانب طالبات بیٹھتی تھیں اور درمیان میں متحرک اور کھلنے و بند ہونے والا لکڑی کا پردہ تھا جو شاید پچاس سال پرانا تھا۔ دو کلاسوں کے درمیانی وقفے میں لڑکے آپس میں کوئی بات کر لیتے تھے یا برآمدے میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ پہلے دو ماہ تک تو مکمل یکسانیت کے ساتھ سنجیدگی حائل رہی کیوں کہ ہر دو فریقوں کا مخلوط تعلیم کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ 90 فی صد طلبا و طالبات کسی اور شعبے میں داخلہ نہ ملنے کی صورت میں یہاں آئے تھے اور ان میں اکثریت ان کی تھی جو سعدی شیرازی کی دس حکایات پر مشتمل فارسی آپشنل کا مضمون پاس کر کے آئے تھے۔ کلاس کی فضا مکمل مجہولی (passive) کیفیت کی حامل تھی۔ ایک قسم کا یہ احساس بھی کام کر رہا تھا کہ اگر لڑکی اور لڑکے نے آپس میں کوئی بات کر لی تو دیکھنے والے کیا سمجھیں گے۔ یہاں تو کالج کے تفریحی ٹور کے لیے بھی طلبا و طالبات کے لیے علیحدہ بسوں کا انتظام کیا جاتا تھا۔ آج کے برعکس طالبات کی اکثریت گھروں سے سیاہ برقعے میں آتی تھی۔ یہ برقعے آج کے ایرانی حجاب سے ملتے جلتے تھے جس میں چہرے اور ہاتھوں کا حجاب نہیں ہوتا۔ اِکا دُکا لڑکیاں ہی گلے میں دوپٹہ لیتی تھیں۔ گویا مشرقی زبانوں کے یونیورسٹی کے ادارے میں مکمل مشرقی ماحول تھا۔ انسانی اور اخلاقی سطح پر بھی دونوں فریقوں میں ربط کا فقدان رہا تا آنکہ وقت سے پہلے موسم گرما کی تعطیلات ہو گئیں جن کے اختتام پر 15 دنوں کے سوشل ورک کے پروگرام کا حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا۔ اس پروگرام میں اپنے کلاس رومز اور شعبے کے دفاتر کی صفائی شامل تھی۔ یہ پروگرام باہمی رابطے اور مکالمے کی محدود سطح پر تمہید ثابت ہوا۔ مخلوط تعلیم میں دونوں میں پہلا رابطہ نوٹس لینے دینے کا ہی ہوتا ہے۔ نومبر کے مہینے میں جب پنکھے مکمل طور پر بند ہو گئے تو کلاس میں پہلی شرارت لڑکیوں کی طرف سے ہوئی اور وہ یہ تھی کہ کلاس کے اختتام پر سردیوں کے ایک دن پوری رفتار سے پنکھے چلا دیے گئے۔ ہم نے احتجاج کیا تو پنکھے بند ہوئے۔ اب اِدھر اور اُدھر سے متوجہ کرنے کے لیے جملہ بازی شروع ہو گئی مگر ایسی کہ جن سے کسی کے جذبات مجروح نہ ہونے پائیں۔ دو سال کے دوران مختلف تقاریب، تفریحی دوروں اور کلاس

روم کی سرگرمیوں کے دوران تمام کلاس فیلوز کا ایک اچھا اور مثبت باہمی تعامل (Interaction) صورت پذیر ہوا جس نے ہر ایک کی شخصیت سازی اور خود اعتمادی میں اضافہ کیا۔ ان دو برسوں کے دوران اورینٹل کالج کی تدریس وتعلیم اور لاہور شہر کی ادبی، علمی اور ثقافتی وتہذیبی سرگرمیوں اور مختلف مطالعاتی سہولتوں نے میری شخصیت کے ارتقائی عمل کو ایسی مہمیز لگائی کہ میں عملی زندگی کے لیے تیار ہو چکا تھا گویا میری کایا کلپ ہو چکی تھی۔

آج جب 46 سال کے بعد اپنے کلاس فیلوز کے بارے میں سوچتا ہوں تو ماسوائے چند ایک کے تمام کے چہرے اور نام بھول چکا ہوں۔ جو یاد رہ گئے ان کا استحقاق ہے کہ میں ان کے بارے میں چند سطور وقف کروں۔ سید سیف اللہ: ہمارے اقبالیات کے استاد اور صدر شعبہ ڈاکٹر سید محمد اکرم کے بھتیجے، نرم خو اور نرم گفتار۔ دوران طالب علمی شاہدرہ میں ان کا قیام تھا۔ اپنے مہربان رویے کی وجہ سے مجھ سے دوستی کا دم بھرتے ہیں، پہلے ایران ڈاکٹریٹ کے لیے گئے مگر 1979 کے ایرنی انقلاب کے بعد بوجوہ واپس آنا پڑا۔ حکومت پاکستان کے محکمہ اطلات کے شعبہ فلمز اینڈ مطبوعات سے وابستہ ہوئے۔ وفاقی حکومت کے سیکرٹیریٹ گروپ میں انضمام کرالیا اور محکمہ خزانہ سے ایک اچھے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اسلام آباد کو مستقل مسکن بنالیا۔ فون پر ایک دوسرے سے رابطہ رہتا ہے۔ 2014 میں لاہور شفٹنگ کے وقت یونیورسٹی کا واحد گروپ فوٹو ضائع ہوا تو میں نے ان سے رابطہ کیا مگر ان کے ہاں بھی نہ مل سکا۔ چند ماہ کے بعد ان کا فون آیا کہ گروپ فوٹو مل گیا ہے اور اس کی ایک کاپی انہوں نے میرے لیے تیار کرائی۔ میرا بیٹا وجاہت نسیم جب کسی دفتری میٹنگ میں اسلام آباد گیا تو ان سے مل بھی لیا اور گروپ فوٹو کی فریم شدہ کاپی بھی لے آیا۔ اکثر فون پر طویل گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ جاوید منیر احمد کا تعلق چیچہ وطنی سے ہے اور فارسی آپشنل کی بنیاد پر داخلہ لیا۔ چھ فٹ سے زیادہ قد والے اس کلاس فیلو کی چرب زبانی اور کھلنڈرا پن بہت کھل کر سامنے آیا۔ سیاسی ذہن رکھنے والے اس تیز طرار کلاس فیلو نے تعلقات میں بھی سیاسی رویہ اپنائے رکھا، شعبہ فارسی نے ان کی ایسی کایا کلپ کی کہ ڈاکٹریٹ کے لیے ایران گئے۔ 1979 کے انقلاب کے بعد واپس آنا پڑا۔ لیکچرر سے ایسوسی ایٹ پروفیسر اور پرنسپل تک اپنے شہر کے کالج میں رہے اور وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ اگست 1996 میں ملتان کے ایرانی ثقافتی مرکز کے زیر اہتمام سندباد ہوٹل میں فارسی زبان کے ریفریشر کورس میں ان سے ملاقات رہی۔ آخری ملاقات 2013 کے دوران بہاول پور بورڈ میں ہوئی جہاں وہ فارسی مضمون کی پرچہ سازی کے ضمن میں آئے تھے۔ (ڈاکٹر) سحر صابری بہت منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ یونیورسٹی لائبریری کے سامنے ڈینٹل کالج کی ہوسٹل میں مقیم تھے اور بی ڈی ایس کے سال دوم میں تھے۔ چوں کہ بی اے بھی کیا تھا لہٰذا شعبہ فارسی کی ایم اے کلاس میں داخلہ لے لیا۔ امتحان بھی دیا اس کے بعد ان سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ باہر چلے گئے یا بطور ڈینٹل سرجن پاکستان یا لاہور ہی میں

کہیں موجود ہوں گے۔تلاش کرنے کی کوشش کی مگر جدید میڈیا کی مدد بھی کام نہیں آسکی۔محمد مصدق لاہور میں بیڈن روڈ کے رہنے والے تھے۔ بہت زیادہ خوش پوشاک تھے۔ بھٹک کر شعبہ فارسی میں آگئے، ریڈیو یوٹی وی کے کسی کوئز پروگرام کے لیے سوال نامہ تیار کرتے تھے، پھر غائب ہو گئے۔ایک صاحب ارشد بیگ بھی تھے، کسی واقف نے بتایا کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔طالبات کے جو نام یاد رہ گئے ان میں فائنل اور پریولیس نام گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔تسنیم فردوس،عطیہ زہرا،رخسانہ کوثر،غزالہ محمود،غزالہ عباسی،انیسہ قریشی،ریحانہ رضوی، عابدہ اور ریحانہ ہاشمی کے نام یاد رہ گئے۔جب ہم فائنل میں تھے تو ہماری سال اول کا داخلہ سمسٹر سسٹم کے تحت ہوا،سال اول کی دو طالبات زبیدہ پروین اور شہناز کوثر کے نام یاد رہ گئے۔شہناز کوثر کوٹلی لوہاراں کی رہنے والی تھیں۔ان کی شادی اپنے کزن اور آرمی افیسر کرنل احمد سے ہوئی تھی۔ یہ بات مجھے سمسٹر سسٹم کے پہلے سال کے میرے دوست ہمایوں کبیر چودھری نے 1982 یا اس کے بعد بتائی۔ان کی ملاقات دونوں میاں بیوی سے اتفاقاً شاہی بازار میں ہوئی جب مسٹر احمد کی پوسٹنگ بہاول پور میں تھی۔ 2014 میں لاہور شفٹنگ کے وقت جب واحد گروپ فوٹو گم ہو گیا تو میں نے جاوید منیر احمد سے پوچھا تو انہون نے نفی میں جواب دیا۔سید سیف اللہ سے پوچھا تو انہوں نے بھی کہا کہ کہیں رکھ کے بھول گئے ہیں،نہیں مل رہا۔محترمہ شہناز کوثر کا مجھے کوٹلی لوہاراں یاد تھا اور وہ وہاں کے ایک معروف سیاسی اور تاجر سڈل خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں۔ میں نے سیالکوٹ کے ایک دوست سے مدعا بیان کیا تو انہوں نے کرنل احمد کا فون نمبر دیا۔ان سے رابطہ کیا تو انہوں نے دو دن بعد بتانے کا کہا۔ جواب آیا گھر میں بہت تلاش کیا، یاد نہ رہ جانے والی چیزیں تک مل گئی ہیں مگر گروپ فوٹو نہیں ملا۔کرنل احمد اور شہناز کوثر دونوں بہت شائشتہ اور نہایت مہذب لب و لہجے کے مالک ہیں۔جب مجھے سید سیف اللہ نے بتایا کہ گروپ فوٹو مل چکا ہے اور انہوں نے مجھے اس کی کاپی بھجوائی تو میں نے اس کی ایک اور کاپی تیار کرا کے اپنے بیٹے کے ہاتھ اسلام آباد میں کرنل احمد اور محترمہ شہناز کوثر کو بھجوائی۔ میرے بیٹے نے ان کی بہت تعریف کی کہ وہ بہت اچھے انسان ہیں اور دونون میاں بیوی سے میری بات بھی کرائی۔تب سے کرنل احمد اور محترمہ شہناز کوثر سے کبھی کبھار بات ہو جاتی ہے۔

کوئی بھی تعلیمی ادارہ اپنے طالب علموں کو مجوزہ تعلیم و تربیت کی تکمیل کے بعد ڈگری عطا کرتا ہے اور انہیں معاشرے کے سپرد کر دیتا ہے جہاں وہ مختلف شعبوں میں خدمات فراہم کرتے ہیں۔ایک اچھے تعلیمی ادارے میں سابقہ طلبا کو اپنی مادر علمی سے مربوط رکھنے کے لیے مختلف مواقع مہیا کیے جاتے ہیں اور اس ضمن میں سابقہ طلبا کی انجمن یا ایلومنائی کے قیام کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے سابقہ طلبا اپنے تعلیمی ادارے کے حوالے سے ایک طرح کی محبت اور رومانی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں اور جس

کے اظہار کا موقع اسے ایلومنائی یا سابقہ طلبا کی یونین کا فورم دستیاب کرتا ہے۔ ڈگری ایوارڈ کرنے والے مؤقر تعلیمی اداروں میں ایلومنائی کی روایت بہت پرانی ہے۔ پنجاب خصوصاً لاہور کے کچھ تعلیمی اداروں میں یہ فورم بہت فعال رہا ہے اور کالج کی انتظامیہ ایلومنائی میں بہت متحرک کردار ادا کرتی ہے۔ لاہور میں سب سے پرانی اور ماضی میں پیوست ''اولڈ راوین یونین'' کے نام سے ایلومنائی گورنمنٹ کالج (اب یونیورسٹی) لاہور کی ہے جس کا اپنا ایک آئین ہے، جو باقاعدہ رجسٹرڈ ہے اور اس کا دفتر کالج کی عمارت میں واقع ہے۔ اس کے ایک یا دو سال بعد انتخابات کرائے جاتے ہیں جس میں ایلومنائی کے رجسٹرڈ ارکان اپنے نمائندے چنتے ہیں۔ 1935 میں قائم ہونے والی اس ایلومنائی کی 1995 میں کالج انتظامیہ کے تعاون سے تشکیل نو کی گئی۔ اس کالج کے سابقہ طلبا کی ایک اور ایلومنائی بھی کام کر رہی ہے۔ اولڈ راوینز کے دونوں فورم کالج میں فلاحی منصوبوں کے لیے بھی کام کرتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال کے کچھ سابقہ طلبا نے آج سے چالیس سال قبل لاہور میں ایلومنائی قائم کی مگر کالج انتظامیہ کو اس میں شریک نہیں کیا گیا۔ لاہور میں مقیم طلبا لاہور ہی میں ایک دو کھانے کر سکے۔ اس کے انتالیس سال کے بعد گورنمنٹ کالج ساہیوال کے سابق طالب علم اور آئرلینڈ میں مقیم مائیکروسوفٹ کے ایک سوفٹ ویئر انجینئر میاں عاطف محمود نے ایک جذبے کے ساتھ کالج انتظامیہ اور کالج کے سینئر ایلومنائی ممبران کی مدد سے بہترین انتظامی صلاحیتوں اور لازمی تکنیکی بنیادوں پر ''ساہیوالینز'' ایلومنائی ایسوسی ایشن کا آغاز کیا اور صرف 2021 سے 2024 تک کے تین کامیاب کھانوں کے ساتھ جدید اطلاعاتی ذرائع کو استعمال میں لا کر ہزاروں ارکان بنا لیے اور ارکان میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ ایلومنائی مستحق طلبا و طالبات کی بہبود کے متعدد منصوبوں پر کام کر رہی ہے اور اس کا دفتر کالج ہی میں قائم ہے۔

پنجاب یونورسٹی 1982 میں قائم کی گئی جب کہ اورینٹل کالج 1870 میں جسے بعد ازیں یونیورسٹی کی اورینٹل فیکلٹی بنا کر یونیورسٹی کالج کی حیثیت دی گئی۔ دونوں صدر اداروں میں سابقہ طلبا کے کسی قسم کے فورم کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی گئی۔ یونیورسٹی کے اکا دکا شعبہ جات نے انفرادی حیثیت میں شاید اس روایت کو برقرار رکھا ہو لیکن وہ نہ ہونے کے برابر رہا۔ اورینٹل کالج کے اساتذہ کی اکثریت اسی کالج کی فارغ التحصیل تھی لیکن وہ گروبندیوں اور سیلیکشن بورڈز کے مناقشوں میں الجھے رہے اور اتنی پرانی اور تاریخ ساز تعلیمی درسگاہ کے لاہور میں موجود کسی استاد اور سابق طلبا و طالبات کو اس کی ایلومنائی کے قیام کی توفیق نہ ہوئی۔ ایچی سن کالج تو خیر پرانا اور تاریخی کالج ہے اور اس کے سابقہ طلبا کی ایلومنائی کو بہت اہمیت دی جاتی ہے جب کہ لمز تو کل کی بات ہے لیکن ان کے پاس وسائل بھی تھے اور نصب العین بھی اس لیے اس کی ایلومنائی بھی بہت مؤقر قرار پائی۔

25-26 جنوری 2024 کو اورینٹل کالج کے اساتذہ بشمول پروفیسر ڈاکٹر معین الدین نظامی ڈین

فیکلٹی آف اورینٹل لرننگ اور ڈاکٹر شعیب احمد استاد شعبہ فارسی کی کاوشوں سے معروف شاعر منیر نیازی کے نام سے موسوم دو روزہ ادبی میلے کا انعقاد کیا گیا جس میں کالج کے سابق طلبا کے باہمی میل ملاقات کے لیے بھی وقت رکھا گیا تھا مگر اس میں دو طرح کے سابق طلبا نے شرکت کی۔ اول وہ جو خود قدآور استاد یا ادیب تھے اور جنہیں ہر ایک جانتا تھا اور دوم وہ جو خود لاہور کے کالجوں اور نجی یونیورسٹیوں کے اساتذہ تھے۔ اورینٹل کالج کے کل چار پرانے اور قدیم شعبہ جات ہیں جن کے طلبا کا آپس میں رابطہ استثنا کے ساتھ کمزور ہی رہا ہے، وہاں اگر چالیس سال کے پہلے کے سابق طلبا و طالبات بھی چلے جاتے تو انہیں پہچانتا کون لہٰذا یہ ضروری تھا کہ تمام شعبوں کے لیے علیحدہ علیحدہ استقبالیہ ڈیسک بنائے جاتے جہاں اپنے اپنے شعبوں کے طلبا مل کر اپنے ماضی کے حوالے سے گفتگو کرتے، اسی لیے وہاں بہت پرانے کسی طالب علم کو شاذ ہی دیکھا جا سکا، جو گئے بھی تو اجنبیت اور مغائرت کا شکار ہوئے۔ بہرحال اورینٹل کالج کے سابق طلبا کو آپس میں ملانے کی پہلی اور نیم دلانہ کوشش ضرور کی گئی تھی اور یہ غالباً آخری بھی کہ ڈاکٹر معین الدین نظامی یکم فروری سے ریٹائرمنٹ کی تعطیلات پر جا رہے تھے اور اس ہلے گلے کی وجہ سے ان کا یونیورسٹی سے جانا کم از کم یادتو رہے گا۔ ان کے بعد شعبہ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی وقت سے بہت پہلے ریٹائرمنٹ میں کچھ نئی کہانیاں چھپی ہیں جو گزشتہ سطور میں بیان کردہ چند حقائق کی تصدیق کرتی ہیں۔

یونیورسٹی میں وائس چانسلرز کا ایک اچھا تسلسل آ رہا تھا۔ بڑے شاندار وائس چانسلر حمید احمد خاں کے 1969 میں اچانک استعفیٰ کے بعد پروفیسر علامہ علاؤالدین صدیقی نے وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالا۔ ان کے دور میں ایوب خاں کے خلاف طلبا کی تحریک اور سقوط مشرقی پاکستان کے واقعات رونما ہوئے۔ ان کے دور میں اکثر تعلیمی ادارے بند ہوتے رہے۔ 1971 کے بعد کے یونیورسٹی امتحانات میں سوالنامے کا چوائس سو فیصد کی بجائے تین سو فیصد کر دیا گیا یعنی دس سوالات میں سے پانچ سوالات کی بجائے پندرہ اور بیس سوالات میں پانچ سوالات حل کرنے کی رعایت دی گئی۔ میری اس بات کی یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری میں اس وقت کے سوالیہ پرچہ جات کی جلدوں سے تصدیق کی جا سکتی ہے۔ جولائی 1972 میں ڈاکٹر محمد اجمل وائس چانسلر بنے۔ جنوری 1974 سے انگریزی کے نامور استاد پروفیسر سراج الدین وائس چانسلر اور یونیورسٹی لا کالج کے پرنسپل پروفیسر امتیاز علی شیخ پرو وائس چانسلر کے طور پر آئے۔ اسی دوران 11 مارچ 1974 کو میں نے داخلہ لیا۔ اکتوبر 1974 کو پروفیسر سراج الدین نے یونیورسٹی کے کچھ پالیسی امور پر اختلافات کے باعث استعفیٰ دے دیا۔ اس وقت کے پرو وائس چانسلر اور لا کالج کے پرنسپل پروفیسر شیخ امتیاز علی کو وائس چانسلر کی پیش کش کی گئی جسے انہوں نے اس شرط پر قبول کیا کہ وہ پرنسپل لا کالج کا عہدہ بھی اپنے پاس رکھیں گے یا شاید اس طرح

سے تھا کہ وائس پرنسپل پروفیسر محمد اقبال موکل بطور قائم مقام پرنسپل کام کریں گے اور وائس چانسلر کی ٹرم مکمل ہونے کے بعد وہ واپس پرنسپل لا کالج کا عہدہ سنبھالیں گے۔ ان کا ایک خاص مزاج تھا، وہ غصے میں جلد آ جاتے تھے لہٰذا ان کی سٹوڈنٹس یونین سے نہ بن سکی۔ معمولی سے جھگڑے اور احتجاج کے بعد وہ پولیس کو بلا لیتے۔ ان دو سالوں میں آئے دن یونیورسٹی میں پولیس کو آتے جاتے ہی دیکھا۔ سٹوڈنٹس یونین اور یونیورسٹی انتظامیہ کے درمیان کھچاؤ ہی دیکھنے میں آیا۔ اس دوران طلبا کے گروپوں میں بھی جھگڑے چلتے رہے۔ سٹوڈنٹس یونین کے الیکشن میں تو صورت حال بہت بری ہوتی۔ دسمبر 1976 کے دوران پروفیسر شیخ امتیاز علی احتجاجاً اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے اور لا کالج میں پرنسپل کا عہدہ سنبھال لیا۔ ان کی جگہ پر پروفیسر ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا کو لایا گیا۔ وہ پہلے وائس چانسلرز کی نسبت بہت کمزور ثابت ہوئے۔ انہوں نے طلبا لیڈر شپ کے سامنے کبھی مزاحمت نہیں کی، جیسے کہا گیا ویسے ہی کیا گیا حتیٰ کہ طالب علم یونیورسٹی کی پالیسیوں اور سلیکشن بورڈز پر اثر انداز ہونے لگے۔ 1975 کے تعلیمی سال سے شروع ہونے والے سمیسٹر سسٹم کے تحت چار سمیسٹر اور دو سال کی تکمیل کے بعد فائنل جامع ٹیسٹ اس سسٹم کی جان تھا جسے سٹوڈنٹس کے کہنے پر اور اساتذہ کے اختلاف کے باوجود ختم کر دیا گیا جس سے اس سسٹم کی گویا روح جاتی رہی۔ ان کے آفس میں ملنے کے لیے جانے والے طالب علموں کو پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھولتے بھی دیکھا گیا۔ بل کہ یہ کہنا موزوں ہوگا کہ وہ یونیورسٹی سٹاف کی نسبت طلبا کی بات زیادہ مانتے تھے۔ 1977 میں جب جنرل ضیاالحق نے جمہوریت پر شب خون مارا تو اس اقدام کا دائیں بازو نے استقبال کیا۔ پنجاب یونیورسٹی میں ایک خصوصی جلسہ تقسیم اسناد کا انعقاد کیا گیا جس میں جنرل ضیاالحق کو مہمان خصوصی کے طور پر بلایا گیا۔ ان دنوں ڈاکٹر محمد اجمل وفاقی سیکرٹری تعلیمات تھے، وہ بھی مہمان خصوصی کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ ان کی موجودگی کو جماعت اسلامی نے پسند نہیں کیا اور جنرل ضیاالحق کے ساتھ طلبا کے وفد کی طے شدہ ملاقات تھی جس میں یہ مطالبہ بھی رکھا گیا کہ ڈاکٹر محمد اجمل بائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں اور بہت فعال کیمونسٹ ہیں جن کی وفاقی وزارت تعلیم میں موجودگی انہیں پسند نہیں لہٰذا انہیں ہٹا دیا جائے اور اگلے دو تین روز ہی میں ان کے مطالبے کے پیش نظر ان کو اس عہدے سے ہٹا دیا گیا۔

ایم اے کے دوران جو بھی ایک روزہ تفریحی ٹور لگے ان کا اہتمام کالج کے تمام شعبوں کی طرف سے مشترکہ طور پر ہی کیا جاتا تا ہم طلبا اور طالبات کی بسیں الگ الگ ہوتیں۔ ایسے ٹور رزنندی پور کا بجلی گھر، ہرن مینار، ہیڈ بلوکی او چھانگا مانگا تک محدود رہے بل کہ چھانگا مانگا کا ٹور تو صرف شعبہ فارسی کا انفرادی ٹور تھا۔ ایسے ٹورز کے دوران اساتذہ کی شخصیت کے نئے پہلو سامنے آتے۔ ایک میرا انفرادی تجربہ ہے جسے بیان کرنا

مناسب ہوگا۔ 1976 کے دوران شعبہ فارسی کے اساتذہ اور طلبا وطالبات نے مقبرہ جہانگیر پر پکنک کا اہتمام کیا۔ وہاں مقبرے کی بائیں جانب ایک گھنے درخت کے نیچے کھانا اور موقع پر بنائی ہوئی آئس کریم نے پکنک کا لطف دوبالا کر دیا۔ اس کے تیس سال بعد جب میرا بیٹا گورنمنٹ کالج (یونیورسٹی) لاہور کا طالب علم تھا تو ہم دونوں مقبرہ جہانگیر گئے تو میں اسے اس درخت کے پاس لے گیا جہاں تیس سال پہلے ہم نے پکنک منائی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ اپنی ایک وڈیو ریکارڈ کرائی، اس دن ماضی اور حال دونوں ایک ہو گئے۔ اس کے دس سال بعد میں نے اپنے پوتے، پوتی، بہو اور بیٹے کے ساتھ اسی درخت کے نیچے پکنک منائی۔ اس بار چالیس سال کے بعد ہم تینوں نسلیں وہاں اکٹھی تھیں۔

میں یہ پہلے بتا چکا ہوں کہ 15 اگست 1974 کو میں اپنا سائیکل لاہور لے آیا تھا۔ پہلے لاہور میں پیدل یا اومنی بسوں پر دوڑے پھرتے تھے۔ کبھی ایرانی مرکز مال روڈ اور نیشنل سنٹر الفلاح بلڈنگ یا امریکن سنٹر، برٹش لائبریری، بیورو آف ریکنسٹرکشن کی لائبریری مگر پرانے لاہور اور اس کے مضافات کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ سائیکل آیا تو گویا پاؤں کو پہیے لگ گئے۔ مختلف مرحلوں میں دیوار کے اندر والے لاہور اور اس کے مضافات کو مطالعاتی نقطۂ نظر سے خوب دیکھا۔ اگر پرانے لاہور کو جسم اور اس کے ٹکسالی، بھاٹی، موری، لوہاری، شاہ عالمی، موچی، اکبری، دہلی،، یکی، شیرانوالہ، مستی اور روشنائی دروازوں کو دل کی طرز کے والو مان لیا جائے تو لاہور میں کوچوں، گلیوں اور بازاروں کا دل اور جسم کی وریدوں کی طرح آپس میں مربوط اور الجھا ہونیٹ ورک موجود ہے۔ دہلی دروازے کی شاہی گزرگاہ، لوہاری، بھاٹی، ٹیکسالی اور روشنائی دروازوں کا براہ راست ملاپ شاہی مسجد، حضوری باغ اور لاہور کے شاہی قلعہ پر ہوتا ہے۔ وہاں کے سیدھے راستے صرف وہاں کے باسیوں کو ہی معلوم ہیں۔ رنگ محل مختلف بازاروں کا سنگم ہے جو چاروں اطراف میں پھیلے ہوئے ہیں، ایک بازار کے بعد دوسرا اور اس سے آگے مختلف نام کا اگلا بازار، پھر ان سے پھوٹتی چھوٹی بڑی گلیاں اور کوچے۔ وہاں اگر سمت کے تعین سے آگہی نہ ہو تو پرانے لاہور کی گلیوں کے جال سے نکلنا بہت مشکل ہے۔ اندرون لاہور سے باہر میکلوڈ روڈ اور سرکلر روڈ کے درمیان والے علاقے کبھی لاہور کے مضافات کہلاتے تھے۔ ریلوے سٹیشن سے شروع ہونے والے ان تمام بازوروں میں سائیکل دوڑائے پھرتا تھا۔ مزنگ چونگی، سمن آباد، گلبرگ، یو ای ٹی تو بہت دور پڑتے تھے۔ جب سائیکل پر لاہور کو خوب دیکھ لیا تو اس کا استعمال بھی کم ہو گیا، میرا سائیکل ہوسٹل کے تمام رہائشیوں کا مشترکہ اثاثہ بن چکا تھا۔ میرا کمرہ چوں کہ اوپر تھا اس لیے سائیکل اوپر جانے والی سیڑھیوں کے آغاز میں شیڈ کے نیچے کھڑا رہتا تھا۔ اور پھر یوں ہوا کہ شعبہ فارسی کے طلبا و طالبات اور اساتذہ 5 مئی 1975 کو ایک تفریحی دورے پر چھانگا مانگا گئے۔ واپس آیا تو سائیکل موجود نہیں تھا۔ سوچا کوئی پہلے کی طرح

لے گیا ہو گا مگر اسے واپس نہیں ملنا تھا کیوں کہ ہوسٹل کا یہ مشترکہ اثاثہ کوئی لے اڑا تھا۔ شعبہ اردو کے ہدایت مرزا مساوات میں کام کرتے تھے انہوں نے تسلی کے لیے اخبار میں خبر بھی لگوائی۔ ایک چیز چوں کہ کھو چکی تھی اور اس کا واپس آنا محال تھا اس لیے میں نے اسے دل پر نہیں لیا جس کے پیش نظر کئی دوستوں خصوصاً شعبہ اردو کے انوار قیوم نیازی نے یہ رائے قائم کی چوں کہ سائیکل کی گمشدگی پر میں نے کسی ملال کا اظہار نہیں کیا اس لیے کہ میں نے سائیکل بیچ دی ہے اور چوری ہونے کی بات محض ایک افسانہ ہے۔ فلپس کا تین بینڈ کا ایک بہترین ٹرانسسٹر ریڈیو گذشتہ چھ سال سے میرا ساتھی تھا۔ سائیکل چوری ہونے کے چند ماہ بعد تالہ توڑ کر اس کو بھی مجھ سے جدا کر دیا گیا۔ اس کا البتہ مجھے آج تک ملال ہے۔ اس وقت ریڈیو ہی تفریح کا آسان ذریعہ تھا۔ میں نے ہال روڈ سے ایک بینڈ یعنی میڈیم ویو والا جیبی ریڈیو خرید لیا جس کی ریڈیو کے سائیز کی بیٹری بھاٹی دروازے سے دو روپے میں ملتی تھی جسے ربڑ بینڈ سے ریڈیو کے ساتھ جوڑ دیتا۔

1975 کے دوران یا اس سے ذرا پہلے اومنی بسوں کے ساتھ ویگنوں کی سہولت بھی میسر آ گئی۔ ایک اور دو نمبر ویگنیں بادامی باغ سے چلتی تھیں۔ اول الذکر ویگن کا آخری سٹاپ گلبرگ گرومانگٹ روڈ پر وفاقی رجسٹریشن اتھارٹی اب نادرا کے ساتھ تھا جب کہ 2 نمبر ویگن گلبرگ کی مین مارکیٹ، منی مارکیٹ اور لبرٹی مارکیٹ کو چھوتی ہوئی موجودہ کلمہ چوک کی طرف سے ماڈل ٹاؤن چلی جاتی تھی۔ تین نمبر ویگن غالباً ریلوے سٹیشن سے جلو پارک یا ملتان روڈ اور چار نمبر راوی پل سے نیو کیمپس کی ہاسٹل نمبر 14 تک جاتی تھیں۔ یتیم خانہ براستہ سمن آباد کے علاوہ دیگر علاقوں میں بھی ویگنوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ اومنی بس کا کم از کم کرایہ دس پیسے تھا جب کہ ویگنوں کا کم از کرایہ چار آنے تھا۔ ویگنوں میں جگہ نا ہونے کی صورت میں چار پانچ سواریاں رکوع کی حالت میں بھی کھڑی ہوتیں۔ اس پر منو بھائی نے اپنے کالم " گریبان" میں لکھا کہ ویگن ڈرائیور یا کنڈکٹر کے لیے ویگن کے اندر ٹھسی ہوئی سواریاں انسان نہیں ہیں بل کہ ان کے نقطۂ نظر سے چونیاں اور اٹھنیاں ہیں۔ حنیف رامے وزیر اعلی تھے تو تین جنوری 975 کو پنجاب اسمبلی ہال میں سہ روزہ قائداعظم سیمینار منعقد کیا گیا جس میں پنجاب بھر سے منتخب طلبا و طالبات کو مدعو کیا گیا، ان تین دنوں میں صدر مملکت فضل الٰہی چودھری، پیپلز پارٹی والے شیخ رشید، میاں محمد علی قصوری، اے کے بروہی، گورنر پنجاب صادق حسین قریشی، پیر حسام الدین راشدی، سید امجد علی، اعجاز حسین بٹالوی، جی۔ الانہ، یوسف بچ اور حنیف رامے نے خطاب کیا۔ پنجاب اسمبلی میں جانے، سیمینار میں شرکت کرنے اور نامور لوگوں کو قریب سے سننا اب تک کا بہترین تجربہ تھا۔ انہی دنوں پی ٹی وی کے پنجابی پروگرام "ٹاکرا" میں شرکت کی جس کے میزبان گورنمنٹ کالج ساہیوال میں میرے انگریزی کے استاد دلدار پرویز بھٹی تھے۔ مقابلہ ایک سوال سے ہار گئے۔ معاوضے کے طور پر چند پنجابی کتب

اور پچاس روپے کے پرائیز بانڈ دیئے گئے جن سے میں نے پاکستان میں پہلی بار شائع ہونے والے کلیات اقبال فارسی کے دوسرے ایڈیشن کی کاپی خرید لی جو 50 سال بعد بھی میری لائبریری کی زینت ہے۔ متعدد بار ریڈیو کے یونیورسٹی میگزین کے کوئز پروگرام میں شرکت کی جس کا معاوضہ دس روپے فی طالب علم ملتا تھا جو اس وقت وقعت رکھتا تھا۔ ان دس روپوں کا چیک دو چار چکر لگانے کے بعد ہی ملتا تھا۔ 1975 کے دوران امرتسر ٹی وی سے ایک فلم "مغل اعظم" دکھائی گئی جس کے دکھانے کا اشتہار دو ہفتہ پہلے ہی نشر کرنا شروع کر دیا گیا تھا۔ اس فلم کو دیکھنے کے لیے ملک بھر سے لوگ لاہور کھچے چلے آئے اور فلم دکھانے کے دن لاہور کے بازار خصوصاً انارکلی بازار میں اتنا ہجوم تھا کہ وہاں چلنا مشکل ہو گیا۔ مینار پاکستان کے منٹو پارک اور دیگر کھلی جگہوں میں قریب کے شہروں کے لوگ اپنے ٹی وی، انٹینا اور بیٹریاں لے کر آئے اور فلم دیکھی۔ امرتسر ٹی وی نے موقع غنیمت جانتے ہوئے فلم اپنے مقررہ وقت سے بہت دیر سے دکھائی اور اس سے قبل اپنے پروپیگنڈا پر مشتمل مختصر دستاویزی فلمیں دکھائیں۔ ایک اور بات کرتا چلوں کی ایک دن ایک فوجی وولنر ہوسٹل آیا اور بتایا کہ ہیلی کالج آف کامرس کی پرانی ہوسٹل ہمارا مرکز ہے جہاں ہم نیشنل کیڈٹ کور (NCC) کا کورس کرا رہے ہیں جس کی تکمیل پر آپ کو سرٹیفکیٹ جاری کیا جائے گا جس کی بنیاد پر آپ کو کہیں داخلے کے لیے دس اضافی نمبر ملیں گے۔ ہم پانچ طلبا نے اسے جوائن کر لیا اور ہیلی کالج کے قریب یونیورسٹی گراؤنڈ میں ڈرل کے پیریڈ شروع ہو گئے۔ دو بار رائفل کے مختلف حصوں پر تعارفی لیکچر بھی دیے گئے۔ ہمیں یونیفارم بھی دی گئی مگر ہم نے کبھی پہنی اور نہ اس کو اپنی پیمائش کے مطابق سیٹ کرایا۔ ہم صبح سات بجے وہاں پہنچتے اور واپسی پر تیار ہو کر آٹھ بجے کی شعبے کی کلاس بھی اٹینڈ کرتے۔ کئی بار معمولی سی تاخیر سے پہنچنے پر پہلے پیریڈ کے استاد ڈاکٹر عبدالشکور احسن ناراض بھی ہو جاتے بل کہ ایک دن تو انہوں نے کہہ دیا کہ آپ نے دیر سے آنے کا وطیرہ ہی اپنا لیا ہے۔ انہیں حقیقت بتاتے مگر وہ اسے قبول نہیں کرتے تھے لہٰذا میں نے اور بعد میں دیگر دوستوں نے بھی این سی سی کے اس کورس کو ترک کر دیا۔ چند ماہ کے بعد ایک سپاہی ہوسٹل آیا اور اس نے بتایا کہ آپ لوگوں کے نام خارج نہیں کیے گئے تھے۔ کل فائرنگ کے لیے برکی کی جانب جا رہے ہیں، اگر آپ لوگ آ جائیں اور اس میں حصہ لے کر پاس کر لیں تو آپ کو کامیاب قرار دے دیا جائے گا اور پھر۔۔۔۔ فائرنگ یا چاند ماری کے لیے زندگی میں پہلی بار رائفل پکڑی، فائر کیے اور ہمت کر کے فائرنگ کا ٹیسٹ پاس کر لیا اور ہمیں این سی سی کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا گیا جو میرے کبھی کسی کام نہیں آیا البتہ ذاتی ریکارڈ میں محفوظ رہ گیا۔

1976 کے دوران لاہور کی پولیس میں پہلی بار لڑکیوں کا ایک گروپ پولیس میں بطور انسپکٹر پولیس بھرتی کیا گیا۔ ٹریفک کو کنٹرول کرنا ان کی تربیت کا ناگزیر حصہ تھا، مختلف چوراہوں پر لوگ ان کو ٹریفک کنٹرول

کرتے ہوئے دیکھتے تو جمع ہو جاتے یا تعجب کا اظہار کرتے اور کئی تو آوازے بھی کستے۔ انہی دنوں یونیورسٹی لائبریری کے ایک صاحب نے مجھ سے ایک لڑکی کا تعارف کرایا کہ یہ نبیلہ ناہید ہیں، پولیس میں انسپکٹر ہیں اور ایم اے فارسی کرنا چاہتی ہیں اور آپ سے رہنمائی کی طالب ہیں اور آپ سے بہتر کوئی نظر نہیں آتا، ان کا تعلق ساہیوال سے ہے۔ ساہیوال کے ناطے مجھے ہاں کہنا ہی پڑی۔ وہ کوتوالی پولیس سٹیشن نزد دہلی گیٹ کی خواتین کی ہوسٹل میں مقیم تھیں، انہوں نے لائبریری میں مجھ سے رہنمائی لینا شروع کر دی۔ پہلے ہم نے اپنا تعلق یہ طے کیا کہ وہ میری چھوٹی بہن کی طرح ہوں گی تا کہ سمت درست رہے۔ وہ بیک وقت یونیورسٹی لا کالج کی سٹوڈنٹ بھی تھیں اور شاید ایم اے اضافی ترقیوں کے لیے کر رہی تھیں۔ انہوں نے امتحان دیا اور اچھے نمبروں میں پاس بھی ہو گئیں۔ لا کالج میں ان کی ایک دوست مقدس طاہرہ سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ بہت اچھی اور مہذب اور مثبت سوچ کی لڑکی تھی۔ ان کے شاید اکلوتے بھائی کاروبار کرتے تھے جنہیں کسی نے معمولی رنجش پر قتل کر دیا تھا، میں اور نبیلہ ناہید اظہار افسوس کے لیے ان کے گھر بھی گئے تھے۔ نبیلہ کے ہوسٹل میں ایک "خالہ زینب" تھیں جن کا خاندان 1947 میں ختم کر دیا گیا۔ یہ بچ گئی تھیں اور پولیس میں سپاہی بھرتی ہوئیں اور انسپکٹر کے عہدے تک پہنچیں۔ ان کو محکمے میں بہت عزت دی جاتی تھی۔ میں انہیں باجی کہتا تھا اور مجھے بہت مؤدب اور بہتر انسان سمجھتی تھیں۔ ایک بار میری والدہ کے گھٹنوں کے علاج کے لیے میں انہیں لاہور لے گیا۔ اگرچہ ان کا قیام میرے دوست اور ڈسٹرکٹ اٹارنی شیخ نور الٰہی کے بڑے بھائی اور پنجاب کے محکمہ قانون میں کام کرنے والے شیخ عطا الٰہی کے گھر میں تھا مگر دو دن کے لیے نبیلہ ناہید نے انہیں اپنے پاس بلایا اور ان کی خوب خدمت کی اور باجی زینب سے بھی ملایا۔ ان کو میری سادہ و اور معصوم والدہ بہت پسند آئیں کہ ان کی تحسین کرنے کے لیے کہنے لگیں: ''ایسی نیک، سادہ اور معصوم عورتوں کی اولاد نسیم کی طرح ہوتی ہے''۔ میں نے جب لاہور چھوڑا تو لاہور سے 600 کلومیٹر دور ہونے کی وجہ سے لاہور سے منقطع ہو گیا۔ بعد میں سنا کہ نبیلہ ناہید ایس ایس پی کے طور پر ریٹائر ہوئیں اور ان کے میاں کا تعلق بھی شاید پی سی ایس سے تھا۔ وہ ایس پی انویسٹی گیشن ملتان و بہاول پور بھی رہیں مگر ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ ان کی لا کی کلاس فیلو اور دوست مقدس طاہرہ ڈسٹرکٹ اٹارنی کے عہدے سے ریٹائر ہوئیں۔ دونوں لاہور میں ہی رہیں۔

میں آپ کو ستمبر 1975 میں لے جاؤں گا۔ اسی مہینے کا کوئی دن تھا کہ فائنل کلاس میں ایک نئے صاحب نظر آئے، جب کلاس ختم ہوئی تو میں ان سے متعارف ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا نام محمد علی بلوچ ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے فارسی میں تین سال کا بی اے آنرز کر کے حسب دستور ایم اے کی فائنل کلاس میں داخل ہوئے ہیں، انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ تحصیل سمندری کی سب تحصیل تاندلیانوالہ کے ایک گاؤں

کنجوانی کے رہنے والے ہیں۔ کنجوانی نام کا ریلوے سٹیشن بھی ہے اوران کا گاؤں بھی اسی نام سے منسوب ہے۔ میں نے کہا کہ کیا آپ کے گاؤں کا نمبر 455 /گ ب ہے۔ وہ حیرت زدہ رہ گئے کہ میں ان کے گاؤں کو کیسے جانتا ہوں۔ میں نے انہیں پس منظر بتایا کہ میرے نانا ہمارے گاؤں کے لمبر دار تھے اوران کے ایک دوست امیر خان جتوئی محمد پناہؒ کے معروف قصبے کیر کے قریب چک نمبر 40 /ای بی کے لمبر دار تھے۔ 1969 میں امیر خان کے بیٹے کی شادی کی بارات کے ساتھ ان کے گاؤں یعنی کنجوانی جانا ہوا تھا۔ وہاں کے ایک شوکت علی اور شفیق خان سے دوستی ہوئی تو اس کے بعد بھی 1971 اوراس کے بعد دو دفعہ کنجوانی جانے کا اتفاق ہوا۔ تب ان کی حیرت ختم ہوئی اورآئندہ دنوں ہم بہت اچھے اور پرخلوص دوست بن کر سامنے آئے۔ ان کے بڑے بھائی میاں ناصر علی بلوچ اپنے علاقے سے پنجاب اسمبلی کے رکن تھے جو پیپلز پارٹی کے خلاف جمیعت علمائے پاکستان کی ٹکٹ پر 1970 کے انتخابات میں جیتے تھے اور یہ بات عام تھی کہ بھٹو نے وزیراعلی محمد حنیف رامے سے کہا کہ مجھے اس ایم پی اے سے ملاؤ جو میری جماعت کے خلاف الیکشن جیتا۔ ان کے بھائی ایم پی اے ہوسٹل المعروف پیپلز ہاؤس کے کمرہ نمبر 2 میں قیام پذیر تھے۔ وہ اکثر مجھے اپنے ساتھ وہاں لے جاتے اور عموماً ہم کھانا بھی وہیں سے کھاتے۔ ایک بار تو میاں ناصر علی بلوچ وولنر ہوسٹل میں میرے پاس بھی آئے تھے۔

جون 1976 میں ہمارے فائنل امتحانات ہوئے اور میں ایم اے کے ساتویں پرچے کے آپشن تحقیقی مقالے کی تیاری میں مصروف ہو گیا اس وجہ سے مجھے وولنر ہوسٹل میں رہائش کی توسیع مل گئی۔ محمد علی نے یونیورسٹی لاکالج میں ایف ای ایل میں داخلہ لے لیا اور لاکالج ہوسٹل میں کمرہ نمبر 46 الاٹ کرا لیا۔ جب "اقبال اور ایران" کے موضوع پر میرا تحقیقی مقالہ مکمل ہوا تو ہوسٹل میں میرا قیام بھی مکمل ہو گیا۔ محمد علی کی دعوت پر 18 نومبر 1976 کو میں لا کالج ہوسٹل منتقل ہو گیا۔ وہی ماحول اور فضا تھی۔ محمد علی براہ راست اے کلاس (بڑے) تحصیلدار بھرتی ہو گئے تو آج کے ضلع لیہ کے تھل ترقیاتی ادارے (TDA) میں تربیت کے لیے چلے گئے اور میں ان کے کمرے میں مستقل قیام پذیر ہو گیا۔ 1976 کے اوائل میں ایک اور دوست کا اضافہ ہوا وہ شعبہ اردو کے ظفر علی خاں سیال تھے۔ ان کا تعلق جھنگ کے قریب شورکوٹ کے قریبی گاؤں سے تھا۔ وہ چوں کہ ایک سچے مومن ہیں اور پنجاب یونیورسٹی میں امامیہ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آئی ایس او) کے بانی صدر تھے اوراپنی شستہ اور فصیح انداز بیان میں یکتا تھے۔ میں ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ محمد علی خاں، ظفر علی خاں اور میرا تعلق پنجاب کی مقامی یا قدیم زبان وثقافت سے تھا اس لیے ہم آپس میں اپنی تہذیبی زبان بولنے کو ترجیح دیتے۔ سیال صاحب نیو کیمپس کے ہوسٹل نمبر 9 میں رہتے آئے تھے اس لیے ہم نیو کیمپس اور اولڈ کیمپس میں ہر ہفتے ملتے رہتے بل کہ ہم دونوں محمد علی خاں کی دعوت پر ان کے گاؤں کنجوانی بھی دو مرتبہ جا چکے تھے۔ محمد علی

جب بھی ٹریننگ ایریا سے اپنے گاؤں یا فیصل آباد آتے تو ایک دو دن کے لیے لا کالج ہوسٹل ضرور آتے اور لا کالج میں اپنے پیریڈ بھی اٹینڈ کر لیتے۔ 1977 کے اوائل میں ایم اے کے نتائج کا اعلان ہوا تو میں اور محمد علی نہایت معقول نمبروں سے فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہو چکے تھے۔ میں اگر لاہور چھوڑ کر گاؤں چلا جاتا تو بڑے دھارے سے منقطع ہو کر ہیرو سے زیرو ہو جاتا۔ میں نے لاہور سے اس وقت نکلنے کا فیصلہ کیا کہ جب لیکچرر شپ کا تقرر نامہ ہاتھ میں ہوگا۔ میں لاہور ہی میں کچھ تدریسی اور غیر تدریسی ذمہ داریوں سے اپنی کفالت خود کر رہا تھا تو والدین بھی مطمئن تھے۔ لا کالج ہوسٹل میس کے لحاظ سے لاہور کا بہترین ہوسٹل تھا۔ گذشتہ تین برسوں کے دوران کے رمضان المبارک کی افطاری وسحری کا وولنر ہوسٹل میں کوئی انتظام نہیں تھا جس کے باعث دونوں اوقات میں پرانی انارکلی کی ہوٹلوں ہی میں جانا پڑتا مگر اس ہوسٹل میں اوپر اور نیچے دو میس تھے جہاں کا کھانا طویل تعطیلات کے سوا باقاعدگی سے میسر تھا۔ لا کالج ہوسٹل میں اوپر نیچے اڑھائی سو کے قریب کمرے اور اتنے ہی رہائشی طلبا تھے۔ اوپر کے کامن روم میں رنگین ٹی وی اور نیچے کے کامن روم میں اخبار سٹینڈ زیر متعدد اخبارات اور انڈور گیموں کی سہولیات میسر تھیں، یہ وہی ہوسٹل ہے جہاں 1967 میں لاہور کے پہلے دورے کے وقت میں اپنے خالہ زاد بھائی کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ چوں کہ میں اپنے مزاج اور رویے سے اب خاصا سوشل ہو گیا تھا اس لیے اس ہوسٹل میں واقفوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور نئے دوست بھی بننے لگے۔ تین دوستوں کا ملنا کئی دوستوں پر بھاری تھا ان کا ذکر پہلے بھی میں کر چکا ہوں یہاں اس بات کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ لا کالج کے یہ تین دوست تھے، ممتاز کنول (شاعر اور مثالیت پسند) زاہد مسعود (شاعر اور بہت اچھی حس مزاح کے مالک) اور سید احسن محبوب (ادبی ذوق کے حامل)۔ 1977 کے انتخابات کا سارا منظر نامہ میں نے اسی ہوسٹل میں رہ کر مشاہدہ کیا۔ ناصر باغ (پرانا گول باغ) میں ذوالفقار علی بھٹو اور دیگر بڑے سیاسی رہنماؤں کو ان کے جلسوں میں قریب سے دیکھا۔ انتخابات کے لیے تعلیمی ادارے بند کر دیے گئے۔ نیو کیمپس ہو یا اولڈ کیمپس کے ہوسٹل ان کے 90 فیصد رہائشی طلبا لاہور سے 200 کلومیٹر کے اردگرد کے شہروں کے تھے اور ہر ہفتہ وار چھٹیوں میں یہ ہوسٹل ویران ہو جاتے۔ انتخابات کے بعد کشیدگی کی وجہ سے تعلیمی اداروں کے کھلنے کے امکانات نا ہونے کے برابر تھے۔ مئی سے جون کے دو ماہ کی سیاسی تحریک کے دوران ہم 5 طالب علم ہوسٹل میں قیام پذیر تھے۔ جب کرفیو نافذ ہو گیا تو ہماری نقل و حرکت بھی محدود ہو گئی۔ لوہاری گیٹ کی اونچی مسجد اور مال روڈ کے قریبی حصوں میں آنسو گیس کی شیلنگ کے اثرات یہاں بھی محسوس کیے جاتے تھے۔ کرفیو کے وقفوں میں ٹولنٹن مارکیٹ سے کھانے پینے کا سامان خرید کر لے آتے لیکن ہوٹل مستقل بند ہونے اور ایک ہی طرح کی بیکری کی اشیا کھانے سے بہت بوریت ہونے لگی۔ میرے پاس جیبی ریڈیو تھا جس پر خبریں سنی جا

سکتی تھیں۔ایک روز جب ایک بجے سے دو بجے کا کرفیو کا وقفہ جاری تھا، میں کھانے کی بیکری کی اشیا لے کرانارکلی کے کچہری روڈ چوک پر کھڑا ٹریفک کا تماشا دیکھ رہا تھا کہ کرفیو وقت سے پہلے ختم ہونے کی افواہ سے ایسا خوف پیدا ہو گیا کہ ٹریفک میں ہیجان برپا ہو گیا اور ایسا منظر تھا جو بی اے کی ایک انگریزی نثری کتاب کے ایک افسانے میں پانی کا ڈیم ٹوٹنے کے بعد جان بچا کر بھاگنے والوں کا ذکر تھا،اس وقت کا منظر تقریباً ویسا ہی تھا۔ٹی وی کی دوپہر کی خصوصی مجلس میں اور ریڈیو پر اس افواہ کی تردید کی جاتی رہی مگر بے سمتی کا شکار ٹریفک یوں ہی الجھا رہا۔یکم جولائی 1977 بروز جمعہ کو پاکستان کی تاریخ کی پہلی ہفتہ وار تعطیل کا آغاز ہوا۔اس کے چار دن بعد کی رات حکومت اور اپوزیشن میں معاہدہ طے پانے کی خبر پھیلی تو 5 جولائی کی صبح سات بجے کی خبروں میں ممکنہ معاہدے اور دیگر خبروں کے بعد سب سے آخری خبر یہ تھی،''پاکستانی افواج نے ملک کا نظام سنبھال لیا ہے"اس کے بعد پھر تاریخ ہے جس سے تمام واقف ہیں اور جو ہماری قومی تاریخ کا طویل،تاریک اور ناگزیر حصہ ہے۔16 جولائی بروز ہفتہ تعلیمی ادارے کھل گئے اور رونقیں لوٹ آئیں۔پھر وہی ماحول اور ہوسٹل میں گہما گہمی۔شاعر دوستوں کے ساتھ دوبارہ ادبی مجالس میں باقاعدگی سے جانا شروع کر دیا اور دن کا بیشتر حصہ پاک ٹی ہاؤس میں گزرنا شروع ہو گیا۔اس دوران کوئی مشاعرہ نہیں چھوڑا بلکہ ممتاز کنول اور زاہد مسعود نے تو اپنی شاعری حلقہ ارباب ذوق کے تنقیدی اجلاس میں بھی پیش کی۔اسی سال علامہ اقبال کے یوم پیدائش پر صد سالہ تقریبات کی مناسبت سے بین الاقوامی کانفرنس ہوئی جس کی سب سے بڑی تقریب پنجاب یونیورسٹی کے فیصل آڈیٹوریم میں ہوئی جس میں ہندوستان سے علی سردار جعفری،آل احمد سرور اور جگن ناتھ آزاد بھی شریک ہوئے۔ان قدآور شخصیات کو بہت قریب سے دیکھا اور ان سے ہاتھ بھی ملایا۔شاہ حسین کالج میں ان شخصیات کے اعزاز میں ایک مشاعرہ بھی رکھا گیا جس میں فیض احمد فیض کے علاوہ لاہور کے تمام اہم اور معروف شعرا نے شرکت کی۔اسی سال پنجاب یونیورسٹی کا جلسہ تقسیم اسناد یعنی کانووکیشن بھی منعقد ہوا جس میں مجھے بھی ایم اے کی سند عطا کی گئی۔لا کالج ہوسٹل میں متعدد طلبا سے رسمی اور غیر رسمی مباحث اور تبادلہ خیالات ایک معمول بن گیا۔ساجد چیمہ(وکیل)،ظفر عباس لک(سابق آئی جی ہائی وے پولیس)،رانا محمد عارف(سابق ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل پنجاب)،نذیر چوہان(وکیل مقیم لاہور)،سجاد چیمہ، جاوید حیات، رانا سلیم خان،نصیر احمد چیمہ اور بہت سے لوگوں کے ساتھ جن کے اب نام بھی یاد نہیں ہیں،تبادلہ خیال ایک معمول کی بات تھی۔آج چھوٹے بڑے پچاس سے زیادہ شعری مجموعوں کے خالق معروف شاعر صابر ظفر محکمہ زراعت کے میگزین "اپنی زمین" کے ایڈیٹر تھے،ان سے ذاتی مراسم تھے مگر لاہور نے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف نہ کیا تو کراچی چلے گئے۔

اس دفعہ کے رمضان کے مہینہ میں ہوسٹل میں سحری اور افطاری کی بہترین سہولت میسر تھی۔ محمد علی بلوچ کا داخلہ لا میں تھا اور میں ان کے کمرے میں رہائش پذیر تھا، ٹریننگ کے بعد ان کی تقرری بڑے تحصیلدار کی حیثیت سے چنیوٹ ہو چکی تھی، لاہور آمد پر وہ اس کمرے ہی میں قیام کرتے بل کہ ایک دفعہ ان کے اصرار پر میں ان کے ساتھ چنیوٹ بھی گیا تھا، ظفر علی سیال جنہیں وزیر علی انڈسٹریز میں بڑی معقول پوسٹ پر کام مل چکا تھا وہ بھی ہفتے میں کم از کم تین روز میرے ساتھ ہوتے۔ میں نے اپنے کمرے کو نہایت نفاست اور مرتب انداز میں رکھا ہوا تھا جس سے کمرے میں ہر آنے والا تعریف کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ لاہور میں یونیورسٹی لا کالج کے علاوہ حمایت اسلام لا کالج کے نام سے ایک پرائیویٹ تعلیمی ادارہ اسلامیہ کالج سول لائنز میں قائم تھا۔ 1972 کی قومیانے کی پالیسی کے تحت دیگر پرائیویٹ اداروں کی طرح یہ بھی گورنمنٹ کی تحویل میں آ گیا۔ 1976 میں اسے محکمہ قانون پنجاب نے اپنی تحویل میں لے کر اس کا نام گورنمنٹ لا کالج رکھ دیا۔ 1977 کے دوران میں نے بھی اس میں داخلہ لے لیا مگر حاضریاں کم ہونے کی وجہ سے میرا ایف ای ایل کا داخلہ نہ جا سکا تو لا کے پہلے سال میں داخلہ جاری رکھا گیا۔ ستمبر 1977 میں اس کا نام قائداعظم لا کالج رکھ دیا گیا اور اسے پنجاب یونیورسٹی کی تحویل میں دے دیا گیا۔ اس رو سے اب میں بھی یونیورسٹی کی کسی بھی ہوسٹل میں داخلہ لے سکتا تھا۔ اس کے لیے میں نے نیو کیمپس کے ہوسٹل نمبر 19 کا انتخاب کیا جس میں میرا کمرہ نمبر بھی 19 تھا۔ لا کالج ہوسٹل میں 15 جولائی 1977 سے جنوری 1978 تک بہترین وقت گزارنے کے بعد 8 فروری 1978 کو نیو کیمپس میں اپنے نئے ہوسٹل میں منتقل ہو گیا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ میں لاہور سے اس وقت نکلوں گا جب میرے ہاتھ میں لیکچررشپ کا تقرر نامہ ہو گا۔

مارچ 1974 سے 7 فروری 1978 تک ایک ماہ کم چار سال کا عرصہ میں نے اولڈ کیمپس کی وولنر اور لا کالج ہوسٹلوں میں گزارا تھا مگر نیو کیمپس کے ہوسٹلوں کا ماحول میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ ان چار برسوں میں بیسیوں بار اپنے دوستوں کو ملنے نیو کیمپس آ چکا تھا۔ فرق یہ تھا کہ شاپنگ سنٹر سے پہلے والے ہوسٹلوں میں ہی آتا رہا تھا۔ ہوسٹل نمبر 19 جانے کے لیے تین گرلز ہوسٹلوں سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ ماحول اور فضا کے لحاظ سے اولڈ کیمپس اور نیو کیمپس کی ہوسٹلوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یونیورسٹی کا منصوبہ تھا کہ ماسوائے اورینٹل کالج کے اولڈ کیمپس کے تمام شعبہ جات بشمول لا اور ہیلی کالج کو بتدریج نیو کیمپس منتقل کیا جائے گا۔ ہوسٹل نمبر 14 کے ساتھ نئے بننے والے ہوسٹل نمبر 15 میں عارضی طور پر ہیلی کالج آف کامرس کو منتقل کر دیا گیا۔ اولڈ کیمپس کے شعبہ کیمسٹری، انگریزی بھی نیو کیمپس منتقل ہو چکے تھے۔ لا کالج کی عمارت مکمل ہونے کے بعد 1978 کی پہلی سہ ماہی میں اسے بھی نیو کیمپس میں منتقل کر دیا گیا اور یوں خاصی تعداد میں اولڈ کیمپس کی لا

کالج ہوسٹل کے طلبا بھی نیو کیمپس کی ہوسٹلوں میں آ گئے۔ ممتاز کنول میرے ساتھ ہوسٹل نمبر 19 میں روم میٹ بن گیا جب کہ زاہد مسعود ساتھ والے 14 نمبر ہوسٹل میں منتقل ہو گیا۔

نیو کیمپس میں گزرنے والا ایک سال میری زندگی کا ایک اہم ترین سال ثابت ہوا۔ اولڈ کیمپس شہر کے ہنگاموں میں گھرا ہوا تھا اور ضرورت کی کوئی بھی چیز وہاں چند قدم کے فاصلے پر تھی جب کہ نیو کیمپس شہر کے ہنگاموں سے بہت دور ایک پرسکون جگہ تھی جہاں ضرورت کی چیزوں کے حصول کے مقررہ اوقات تھے۔ تمام ہوسٹلوں کے بیچ ایک شاپنگ سنٹر تھا جہاں ایک شیخ جنرل سٹور تھا جو رات نو سے دس بجے کے قریب بند ہوتا تھا۔ کھانے کے لیے کیفے ٹیریا تھا یا پھر ہوسٹلوں میں ٹھیکے پر دیے ہوئے میس جہاں نقد ادائیگی کرنا پڑتی تھی۔ ہوسٹلوں میں جانے آنے کے کوئی اوقات متعین نہیں تھے۔ ہوسٹل نمبر 14 ویگنوں کا آخری سٹاپ جب کہ اس کے ساتھ واقع ہوسٹل نمبر 19 یونیورسٹی بسوں کا ٹرمینل تھا۔ ہوسٹل نمبر چودہ کے بعد کوئی ہوسٹل نہیں تھا اور روڈ مٹیریل ریسرچ کی ایک چھوٹی سی کالونی کے بعد کوئی آبادی نہیں تھی، درختوں میں گھری ہوئی موجودہ ڈاکٹرز ہسپتال کے پاس کہیں سابق گورنر پنجاب مصطفیٰ کھر کی کوٹھی تھی اور بس۔ نہر کے بائیں جانب ہوسٹلوں کی سمت میں ایک سنگل روڈ تھی جو ٹھوکر نیاز بیگ تک جاتی تھی، کوئی ٹریفک نہ کوئی بس، ویرانہ ہی ویرانہ۔ ایک دفعہ ہم تین دوست کسی سے لفٹ لے کر ٹھوکر نیاز بیگ پہنچے مگر واپسی کے لیے کوئی ٹرانسپورٹ نہیں تھی۔ ہم اومنی بس پر چوبرجی اور پھر مزنگ چونگی تک آئے، وہاں سے چار نمبر ویگن ملی تو نیو کیمپس پہنچے۔ دس بجے کے بعد کوئی ویگن نہیں ملتی تھی۔ ساڑھے نو بجے اولڈ کیمپس سے یونیورسٹی کا آخری ٹائم نیو کیمپس جاتا تھا جس کا لبرٹی میں 30 منٹ کا سٹاپ بھی ہوتا تھا۔ سٹیشن سے کوئی ویگن براہ راست نیو کیمپس نہیں آتی تھی۔ ستمبر 1978 میں 33 نمبر ویگن کا آغاز ہوا جو سٹیشن سے ڈیوس روڈ، وہاں سے شادمان ہوتی ہوئی شمع سینما پر فیروز پور روڈ پر آتی تھی اور باقی روٹ چار نمبر والی ویگن کا ہی تھا۔

نیو کیمپس میں بہت دوستیاں اور آشنایاں ہوئیں۔ طرح طرح اور بھانت بھانت کے لوگ ملے۔ بڑا مقصد تو آئندہ زندگی میں کام آنے والے مشاہدات و تجربات کا حصول تھا۔ مجھ پر اپنی ہوسٹل میں ایک ایسے گروہ کا انکشاف ہوا جو پہلے چرس کا دور چلاتا تھا اور اس کے بعد الکحل میں کھانسی کا ایک نشہ آور شربت کوریکس ڈی ملا کر پیتا تھا۔ اس گروہ کا سربراہ ایک لبرل اور بظاہر ایک مہذب نجیب نام کا نوجوان تھا۔ جب میں نے اس سے تصدیق چاہی تو اس نے اپنا ذاتی معاملہ کہہ کر بات ہی ختم کر دی۔ یہاں دوستوں کے کئی ایک گروپ تھے جن سے اکثر ملاقاتوں میں کیمپس کی آوارہ گردی یا سیر کے دوران اور ہوسٹل کی کینٹین پر مختلف بحثیں ہوتی رہیں۔ ایک گروپ تو شاعروں اور ادیبوں کا تھا جن میں ممتاز کنول، زاہد مسعود، قاضی جاوید، راشد متین اور

سعید ظفر تھے۔ مؤخر الذکر دونوں اصحاب جماعت سے مکمل وابستہ تھے بل کہ راشد متین تو جماعت کے نعرہ ساز اور سعید ظفر جماعت کی طرف سے پنجاب یونیورسٹی کی سٹوڈنٹس یونین کے منتخب جوائنٹ سیکریٹری تھے مگر ان کا ذوق اور ذہن ہم لبرلز کے ساتھ ملتا تھا۔ روزانہ رات کے تمام کیمپس میں گھومنا پھرنا اور گپیں لگانا اور سعید ظفر کے ٹیپ ریکارڈر پر موسیقی سننا یا پھر کسی کینٹین پر بیٹھ کر بحث کرنا یا شاعری اور کتب کے حوالے سے گفتگو کرنا اور ادبی مجالس و مشاعروں پر جانا ہی اس گروپ کا نصب العین تھا۔ ممتاز کنول، زاہد مسعود، قاضی جاوید، راشد متین اور سعید ظفر اور راقم نے مل کر اکتوبر 1978 میں کیمپس فورم کے نام سے ایک ادبی تنظیم قائم کی جس کا سیکرٹری میں تھا۔ افتتاحی اجلاس ایس ٹی سی ہال کی بالائی منزل پر منعقدہ ہوا جس کی صدارت عطا الحق قاسمی نے کی اور پہلے اجلاس میں ایران کی بیباک شاعرہ فروغ فرخزاد پر میرا مضمون برائے تنقید پیش کیا گیا۔ آئندہ اجلاسوں میں منیر نیازی۔ موسیقار حسن لطیف اور دیگر شاعر و ادیب شریک ہوئے۔ ایک اجلاس میں قاضی جاوید نے ''بے معنویت کا عہد'' کے عنوان سے مضمون برائے تنقید بھی پیش کیا تھا۔ دوسرا گروپ پنجاب کے مقامی اور باروں کی زبان بولنے والے طالب علم دوستوں کا تھا جس میں ممتاز بکھر (بعد میں کرنل ریٹائرڈ)، مستنیر احمد شعبہ اسلامیات (بعد میں پروفیسر ریٹائرڈ) اور مظہر بھٹی (بعد میں شاید وکیل) اور ان کے ساتھ سید غضنفر علی بخاری متوقع گدی نشین پیر کرمانوالہ نزد اوکاڑہ شعبہ علوم اسلامیہ شامل تھے۔ ممتاز بکھر نے ایم ایس سی ریاضی کیا تھا اور میں ظفر سیال کی زبانی ان کا بہت ذکر سن چکا تھا۔ نیو کیمپس میں ان سے خوب دوستی رہی حتیٰ کہ ان کی شادی پر ان کے گاؤں للیانی تحصیل بھلوال بھی جانا پڑا۔ ان کے ایک کزن امیر خان گلبرگ میں واقع آر سی کولا میں ایکسائز انسپکٹر تھے۔ ان سے ملنے گئے تو انہوں نے فیکٹری کی سیر بھی کرائی اور کہا کہ یہاں پر آپ کو پانی نہیں ملے گا، جب چاہو جتنی چاہو آر سی کولا پی سکتے ہو، بعد میں انہوں نے سہیل ریسرچ سنٹر کے سامنے ایک چھپر ہوٹل پر ہمارے لیے دو کریٹ یعنی 48 بوتلوں کا کوٹہ باندھ دیا تھا جو ہم اکثر ایک ماہ میں ختم کر دیا کرتے تھے۔ ایک پراسرار کردار بھی ملا جس کو لوگ ''پیر جی'' کے نام سے پکارتے تھے۔ بظاہر وہ شعبہ فلسفہ کے فارغ التحصیل تھے اور اپنا نام خالد مسعود رانجھا بتاتے تھے۔ وہ مبینہ طور پر ایک لڑکی جس کو میجر کے نام سے پکارا جاتا تھا کے یک طرفہ عشق میں گرفتار تھے۔ شام کو گرلز ہوسٹلوں، شاپنگ سنٹر اور نہر کنارے اکثر اکیلے ہی سیر کرتے پائے جاتے۔ ہوسٹل نمبر 14 کے نگران اور شعبہ اردو کے مثالی اور پیارے استاد ڈاکٹر سجاد باقر رضوی سے ہوسٹل سے ملحق ان کی رہائش گاہ پر بغیر ٹائم لیے ان سے باتیں کرنے اور چائے پینے کسی وقت بھی جایا جا سکتا تھا۔ ہوسٹل نمبر 10 کے قریب سہیل ریسرچ سنٹر کے وہ منتظم تھے، وہاں بھی انہیں ملنے چلے جاتے۔ افتادگان خاک اور تحلیل نفسی کی دونوں کتب اسی ادارے سے خریدی تھیں جو آج بھی ان کی یاد دلاتی ہیں۔ پنجابی کی

معروف ادیبہ اور پنجابی ادبی بورڈ کی چیئر پرسن محترمہ خالدہ ملک اس وقت نیو کیمپس کی ہوسٹل میں رہتی تھیں۔ ایک دفعہ پنجابی رسالے سانجھاں کے ایڈیٹر اور شاعر تنویر ظہور اور اجمل وجیہہ ان سے ملنے آئے تو ان سے باتوں کا خوشگوار تاثر آج بھی یاد ہے۔ وہ ایک پختہ کار ادیبہ اور پراعتماد شاعرہ تھیں۔ ایک اور ملاقات بھی ان سے ممتاز کنول اور زاہد مسعود کے ساتھ یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں ہوئی۔ نیو کیمپس کی زندگی سے جہاں جی بھر کے لطف اندوز ہوا وہاں سیکھا بھی بہت۔

میں نے گذشتہ دو سال کے دوران اولڈ اور نیو کیمپس اور اس کے شعبوں کی سرگرمیوں کو اخبارات میں شائع کرایا۔ ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے آرٹیکل بھی اخبارات میں شائع ہونے لگ گئے۔ جدید فارسی کہانیوں کے تراجم کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا۔ ٹائم اور نیوز ویک کے مختصر مضامین کے تراجم بھی کیے۔ طاہر نسیم، مرزا ہدایت، سعید آسی، مقصود ثاقب اور آزاد کوثری روزنامہ "آزاد" میں اکٹھے ہو گئے لہٰذا جو بھی لکھا اس کو شائع کرانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اب یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ان چار سالوں میں ایم اے فارسی کے نصاب، علمی و ادبی مجالس اور یونیورسٹی کے اساتذہ اور دیگر سکالرز سے سیکھنے کے علاوہ فکری و مطالعاتی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ فلسفہ اور تاریخ میرے پسندیدہ مضامین قرار پائے۔ فلسفے کے باقاعدہ مطالعہ کے لیے ویل ڈیورانٹ کی کتب سٹوری آف فلاسفی اور پلیثرز آف فلاسفی کے بہت مستند اردو تراجم جو عابد علی عابد نے دو جلدوں میں "داستان فلسفہ" اور ڈاکٹر محمد اجمل نے "نشاط فلسفہ" کے نام سے کیے، ان سے آغاز کیا پھر ان اوریجنل کتب کو پڑھا تو لطف اور تفہیم دوبالا ہو گئی۔ ان کے بعد برٹرینڈ رسل کی مغربی فلسفے کی تاریخ ''ہسٹری آف ویسٹرن فلاسفی'' خرید کر پڑھی۔ شعبہ فلسفہ کے ریسرچ سکالر اور ہوسٹل فیلو قاضی جاوید سے بہت رہنمائی ملی۔ سید علی عباس جلالپوری کی اس وقت تک منظر عام پر آنے والی تین کتب "روایات فلسفہ، "روح عصر" اور "عام فکری مغالطے" نے تہذیبی مطالعے کا ذوق پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ آسان ترین اردو میں سقراط سے بھی پہلے سے لے کر برٹرینڈ رسل اور سارتر تک فلسفے کے تمام مکاتیب سے روشناس کرایا۔ سید سبط حسن کی تین کتب "موسیٰ سے مارکس تک،" "ماضی کے مزار" اور "پاکستان میں تہذیب کا ارتقا" نے سوچنے اور سمجھنے کے لیے بنیاد فراہم کی۔ فنون میں محمد ارشاد اور سید علی عباس جلالپوری کے علمی معرکوں نے علم کی نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ کراچی یونیورسٹی کی چار جلدوں پر مشتمل انگریزی زبان میں لکھی گئی ہسٹری آف پاکستان نے بر صغیر کے قدیم دور سے جدید دور تک کا ابتدائی تاریخی خاکہ ذہن میں راسخ کیا۔ پرانے بیوروکریٹ شیخ محمد اکرام کی موج کوثر، آب کوثر اور رود کوثر نے مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ کے یک طرفہ نقطۂ نظر سے روشناس کرایا۔ فرانسیسی مصنف ڈاکٹر لیوان کی مشہور زمانہ کتاب ''دی ورلڈ آف انڈین سویلائزیشن'' کا سید علی بلگرامی

نے "تمدن ہند" کے نام سے 1913 میں شاندار اردو ترجمہ کیا تھا۔اسی ترجمہ نگار نے اسی مصنف کی ایک کتاب کا اردو میں "تمدن عرب" کے نام سے کیا تھا۔اسی طرح عرب دنیا کی پہلی ڈاکٹریٹ کرنے والی مصنفہ ڈاکٹر نجلا عزالدین کی کتاب ''دی عرب ورلڈ، پاسٹ، پریذنٹ اینڈ فیوچر'' کا اردو ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین نے "عرب دنیا" کے نام سے کیا تھا۔کلاسیک کا درجہ رکھنے والی یہ کتب اپنے موضوعات کے لحاظ اس وقت تک دنیا میں بہت زیادہ پڑھی جانے والی کتب ہیں۔ان کے مطالعے نے عرب اور ہند کی تاریخ وتہذیب پر مکمل معلومات فراہم کیں۔پنجاب یونیورسٹی میں موجود مختلف اضلاع اور ریاستوں کے گزٹیئرز معلومات کا بہت بڑا خزانہ ثابت ہوئے۔شعبہ فلسفہ سے پاکستان فلسفہ کانگریس کی طرف سے مختلف موضوعات کے کتابچے خرید کر اطمینان سے ان کا مطالعہ کرکے ذہن کو روشن کیا۔پروفیسر ایم شریف کی مسلم فلسفہ اور جمالیات کے تین نظریئے،ڈاکٹر وحید عشرت کی مرتب کردہ مختلف دانشوروں کے مضامین پر مشتمل فلسفہ کیا ہے اور زمان ومکان پر کتب اور آغا افتخار حسین کی قوموں کی شکست وزوال کے اسباب کا مطالعہ نے میری مکمل کایا کلپ کردی۔ زبان وادبیات کے مطالعات تو پہلے ہی فطرت ثانیہ بن چکے تھے۔مندرجہ بالا مطالعات تو محض ابتدا تھے۔پھر آئندہ آنے والے دنوں اور کیریئر کے دوران تو مطالعات کا وسیع میدان پڑا تھا جس کی کوئی حدود وقیود نہیں تھیں۔

پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس میں ہوسٹل نمبر دو یا علامہ اقبال ہال دراصل دیگر ممالک سے پنجاب یونیورسٹی میں مختلف کورسز میں داخلہ لینے والے طلبا کے لیے مخصوص تھا۔اس ہوسٹل کو انٹرنیشنل ہوسٹل کا درجہ حاصل تھا اور یہاں کے میس میں ان طلبا کے لحاظ سے کھانے تیار کیے جاتے۔1975-76 کے دوران کسی وقت میری ملاقات ایک ایرانی طالب علم سے ہوئی جس کے نام کا ایک حصہ ''مہدی'' مجھے یاد رہ گیا ہے۔اس کی سوچ شاہ مخالف تھی اور اس کی اپنی ایک فکر تھی۔ممکن ہے وہ آیت اللہ خمینی کا پیروکار ہو۔ایران سے آمدہ استاد پروفیسر بہمن حبیبی نے مجھے خاصی تعداد میں اس وقت کے ادبی اور سماجی رسائل تحفہ کیے۔ان رسائل سے چند تصاویر یا پوسٹر ملے جن میں کسی نہ کسی بڑے شاعر خصوصاً خیام، سعدی اور حافظ کے اشعار میں پیش کردہ تصورات وتخلیات کو بنیاد بنا کر مصورانہ تصویر کشی کی گئی تھی۔ان میں سے دو تین زیادہ دلکش تصاویر میں نے اپنے کمرے میں لگائی ہوئی تھیں۔ایک روز وہ مجھے وولنر ہوسٹل ملنے آئے۔میں چائے کا آرڈر دینے چند لمحوں کے لیے باہر گیا۔واپس آکر میں حیران وپریشان ہوگیا کہ وہ صاحب وہ تمام تصاویر پھاڑ کے ردی کی ٹوکری میں پھینک چکے تھے۔ایک بار انہوں نے مجھے ہوسٹل نمبر دو میں کھانے پر مدعو کیا۔کمرے ہی میں دو پلیٹوں میں چاول اور سبزی لائی گئی، چاولوں کا رنگ زردے کی طرح زرد تھا۔میں سمجھا کہ شاید یہ چاول میٹھے ہوں گے مگر

سبزی کے ساتھ کوئی چپاتی نما چیز نہیں تھی، میزبان نے مجھے چاولوں پر سبزی ڈال کر کھانے کو کہا، کھایا تو دونوں چیزیں انتہائی پھیکی اور بدمزہ تھیں۔ خاصی بوریت ہوئی۔ اس کے بعد اس نے ایک گلاس میں پانی ڈال کر اس میں بجلی کا راڈ ڈالا اور جب پانی ابل گیا تو راڈ نکال کر اس میں چائے کی پتی ڈال دی۔ چائے کا رنگ نکل آیا اور پتی نیچے بیٹھ گئی۔ اس نے چائے کا گلاس مجھے پیش کیا اور ساتھ چینی کی ایک ڈلی منہ میں رکھنے کو دی۔ وہ ڈلی تو بہت جلد منہ میں گھل گئی لہٰذا کڑوی چائے پینا پڑی۔ اتنا بدمزہ کھانا اور اس طرح کی چائے کا پہلے مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ایک روز اس کا ہوسٹل میں فون آیا کہ میں اس سے اگلے دن نیو کیمپس میں ایک بجے ملوں، میں پہنچ گیا۔ مجھے لے کر وہ گورنمنٹ سائنس کالج وحدت روڈ آیا جہاں بی اے کا امتحان چل رہا تھا۔ اس وقت اس کالج کے اردگرد دور دور تک کسی آبادی کا نام ونشان نہیں تھا۔ جس طرف بھی نگاہ جاتی ویرانہ ہی ویرانہ نظر آتا۔ وحدت روڈ نام کی ایک چھوٹی اور ٹوٹی پھوٹی سڑک کالج کے سامنے سے گزر کر ملتان چنگی جاتی تھی جس کے دونوں طرف ویرانہ تھا اور اس پر کوئی ٹریفک بھی نظر نہیں آئی۔ ایرانی دوست سے میں نے یہاں آنے کا مقصد پوچھا تو کہنے لگے کہ میرا ایک پاکستانی دوست بی اے کا امتحان دے رہا ہے، میں نے ایک نگران سے بات کر رکھی ہے جس نے کچھ پیسے لے کر مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ آپ نے نقل کے مواد کی نشان دہی کرنی ہے، نقل پہنچانا میرا کام ہے۔ میں نے بات بناتے ہوئے اسے کہا کہ جب ہم نے امتحان دیا تھا تو نصاب اور تھا جب کہ اب نیا نصاب ہے اس لیے میں اس کام میں اس کی مدد کرنے سے قاصر ہوں۔ اس بات کا اس نے برا منایا اور میں وہاں سے چلا آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پاکستان سے بھارت چلا گیا تھا۔ نیو کیمپس میں رہائش کے دوران شہریار نامی ایک اور ایرانی نوجوان سے ملاقات ہوئی جو اپنے کسی پاکستانی دوست سے پاکستان ملنے آیا تھا اور ان دونوں کا ترجمان کا کام میں نے کیا تھا، وہ واپس جانے لگا تو مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں وہاں سے آپ کے لیے کیا بھیجوں۔ میں نے بلا تکلف اس وقت کی مقبول ترین شاعرہ فروغ فرخزاد کے تمام شعری مجموعے اور معاصر افسانوں کی کتب بھیجنے کو کہا۔ اس کے جانے کے ایک ماہ بعد مجھے ہوسٹل کے پتے پر ایک پوسٹل پیکٹ موصول ہوا جس میں میری فرمائش کردہ کتب موجود تھیں۔ وہ وعدے کا پکا نکلا۔ وہ کتب اب بھی میری ذاتی لائبریری میں موجود ہیں۔ گو اس سے بعد میں کوئی رابطہ نہ رہ سکا مگر ان کتابوں کو دیکھ کر اس کی یاد ضرور آتی ہے۔

جون 1978 کے اوائل میں موسم گرما کی تعطیلات کے ساتھ ہی نیو کیمپس جیسی بارونق، گل وگلزار، خوشبوؤں اور رنگوں سے بھرپور فضا نے ویرانی کا چولا پہن لیا۔ تمام ہوسٹلیں مکمل خالی نہیں ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر خیرات ابن رسا وائس چانسلر تھے اور انہوں نے ہوسٹلوں کو خالی کرنے کا نوٹس دے دیا اور یہ بھی وارننگ دی کہ جو طلبا وطالبات ہوسٹل خالی نہیں کریں گے تو پولیس کے ذریعے خالی کرائے جائیں گے۔ ان کی رہائش گاہ پر تمام

متاثرہ لوگ اکٹھے ہوئے اور انہیں نوٹس واپس لینے کے لیے درخواست کی مگر وہ نہ مانے۔ متاثرہ فریق کی جانب سے ہائیکورٹ میں رٹ دائر کی گئی تو وائس چانسلر اگر چہ مانے تو نہیں مگر کچھ ڈھیلے پڑ گئے اور کوئی سختی نہیں کی گئی مگر خالی کرانے کا تاثر برقرار رکھا۔ چند دن تو ہم چوکیدار سے مل کر سوتے وقت باہر سے تالا لگوا لیتے تھے یا سامنے والے دروازے کو تالہ لگا کر عقبی دروازے سے اندر آ کر سو جاتے تھے۔ بیچ میں پولیس کے متوقع چھاپے کی اطلاع ملتی تھی تو میرے ایک دوست نے روڈ مٹیریل ریسرچ کی رہائشی کالونی میں ایک ایسے فلیٹ کا انتظام کر دیا جس کا رہائشی لاہور سے باہر گیا ہوا تھا۔ میں چار پانچ بار رات گیارہ بجے وہاں جا کر اور پیڈسٹل فین چلا کر سو جاتا اور صبح سویرے اٹھ کر واپس ہوسٹل آ جاتا۔ اس وقت نیو کیمپس بالکل اوپن تھا، کوئی چار دیواری تھی نہ خاردار تاریں۔ رہائشی اور تعلیمی کیمپس کے درمیان آنے جانے کے لیے نہر پر شاید کل تین پل تھے، جدھر سے چاہیں داخل یا خارج ہو سکتے تھے۔ ایک یا دو خوش نصیبوں کے پاس ہی موٹر سائیکل تھے ورنہ ویگنیں اور یونیورسٹی کی بسیں ہی ٹرانسپورٹ کا بہترین ذریعہ تھیں۔ نیو گارڈن کے مکان خال خال بن رہے تھے اور برکت مارکیٹ اور ملحقہ ویرانے کے آباد ہونے کا دور دور تک تصور ہی نہیں تھا۔ ایک سنگل سڑک موجودہ کلمہ چوک تک جاتی تھی جو فیروز پور روڈ سے گزر کر گلبرگ روڈ کی درختوں سے گھری ہوئی سڑک سے مل جاتی جہاں سے ہم لبرٹی یا مین مارکیٹ جا سکتے تھے۔ ایک بار موجود دوستوں کا مین مارکیٹ کے اور یگا سینما میں فلم دیکھنے کا پروگرام بن گیا۔ واپسی حسب معمول پیدل ہی ہوئی، جب ہم ہوسٹل نمبر چودہ پہنچے تو سحری کے لیے اعلانات ہو رہے تھے۔ موسم گرما کی تعطیلات کے دوران پہلی دفعہ نیو کیمپس میں کھانے پینے کی مطلوبہ سہولت کے فقدان کی وجہ سے رمضان المبارک میں بہت پریشانی لاحق رہی۔ 10 جون 1978 کو نظامت عامہ پنجاب (ڈی پی آئی) میں لیکچرر کی ایڈہاک تقرری کا انٹرویو ہو چکا تھا اور میرا نام منتخب شدہ امیدواروں کے پینل میں شامل کر کے مستقبل کے لیے فی الحال محفوظ کر لیا گیا تھا۔ یکم جولائی کے دن لیکچرار کے باقاعدہ اور مستقل انتخاب کے لیے بھی انٹرویو کال موصول ہو چکی تھی۔ اسی دوران میرے دو کلاس فیلو جاوید منیر احمد اور سید سیف اللہ بالترتیب تہران یونیورسٹی اور فردوسی یونیورسٹی مشہد میں داخل ہو چکے تھے اور ان کا ایک ایک خط بھی موصول ہو چکا تھا۔ نا جانے مجھے جاوید منیر احمد کے بارے میں سید سیف اللہ کے یہ تاثرات کیوں یاد آ گئے۔ انہوں نے خط میں لکھا کہ یہاں پر پی ایچ ڈی سے پہلے ایران والے پہلے اپنا ایم اے کراتے ہیں، جاوید منیر کو ایرانیوں نے ایم اے کرا کے واپس بھیج دینا ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ انقلاب ایران کے بعد دونوں کو واپس آنا پڑا۔)

فروری 1978 کے دوران یونیورسٹی میں بک فیئر منعقد ہوا۔ اب یہ معلوم نہیں کہ یہ پہلا کتاب میلہ تھا یا کہ دوسرا۔ ایک ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل علمی کتب خانہ لاہور کی شائع کردہ علمی لغت نئی نئی مارکیٹ میں

آئی تھی جس کی قیمت 120 روپے تھی، میں نے اس کتاب میلے سے یہ کتاب 100 روپے میں خریدی جو آج بھی میرے زیر استعمال ہے اور یونیورسٹی کے دنوں کی یاد دلاتی ہے۔ اس وقت بیس روپے بھی بہت بڑی رعایت محسوس ہوتی تھی۔ آئندہ اڑتیس سال تک کا تو معلوم نہیں تاہم 2016 کے دوران منعقد ہونے والی کتابوں کی نمائش سے کتب خریدنا بہت اچھا لگا۔ پنجاب یونیورسٹی کی اپنی کتب کا سٹال بہت اہم تھا جہاں یونیورسٹی کتب کے علاوہ یونیورسٹی کی ڈائری، ٹیبل اور وال کیلنڈرز خریدنا بہت اچھا لگا۔ پھر نجانے کیا ہوا یونیورسٹی میں طلبا کے باہمی سیاسی مناقشے اس کتاب میلے کو کھا گئے اور آئندہ آٹھ سالوں کے دوران کتاب میلہ نہ ہوسکا۔ 2024 کے دوران اس کا احیا ہوا مگر یونیورسٹی کے بک سٹال نے بہت مایوس کیا جہاں دو چار پرانی اور غیر اہم کتب کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ دو تین لوگ بے دلی اور مجبوری کے ساتھ یونیورسٹی کے سٹال پر موجود تھے۔ میں کہ یونیورسٹی پبلی کیشنز کے لیے خاص طور پر گیا تھا بڑی مایوسی کے عالم میں واپس لوٹا۔ جب 2025 کے کتاب میلہ کا اعلان ہوا تو میں نے کتاب میلے کے سیکرٹری ڈاکٹر ہارون عثمانی کو وائس میسج بھیجا کہ یونیورسٹی کی اپنی پبلی کیشنز کے سٹال کو بہتر بنائیں۔ انہوں نے میرے پیغام کو بہت سنجیدگی سے لیا اور اس بار یونیورسٹی کے تین بک سٹال لگائے گئے جن میں پچاس سال پرانی کتب بھی خریدنے کو ملیں۔

آخر یکم جولائی 1978 کا روز بھی آ پہنچا۔ میں نے اس انٹرویو کی باقاعدہ تیاری کی نا ہی اس کی ضرورت تھی۔ زیادہ سے زیادہ ایک پسندیدہ شاعر اور نثر نویس تیار کر لیے مگر انٹرویو میں مضمون کے حوالے سے عام قسم کے سوالات ہی پوچھے گئے۔ انٹرویو میں زیادہ تر شخصیت، طرز تکلم اور خود اعتمادی پر فوکس کیا گیا۔ میں اپنی طرف سے تو بہت مطمئن تھا لیکن جب تک مستند ذرائع سے معلوم نہیں ہوسکا تب تک ایک طرح کا دباؤ یا سٹریس رہا۔ ایک استاد کی مدد سے انٹرویو کے لیے آنے والے ایک ماہر مضمون سے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ادھر سے بتایا گیا کہ ماہرین مضمون کے مطابق تو نسیم بلوچ نامی امیدوار کو منتخب ہونا چاہیے لیکن اصل رزلٹ تو ٹیبولیشن کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا۔ میری گومگو کی کیفیت تو اسی طرح برقرار رہی۔ دوست عزیز غلام حسین ساجد نے بتایا کہ نثار بھٹی نامی ایک اسسٹنٹ پنجاب پبلک سروس کمیشن میں ان کے جاننے والے ہیں میں ان سے کہوں گا وہ جلد معلوم کر دیں گے۔ اگلے دن ساجد نے بتایا کہ بھٹی صاحب سے انہوں نے کہہ دیا ہے اس لیے وہ پرسوں ٹی ہاؤس میں آ کر بتائیں گے۔ اس کے بعد غلام حسین ساجد نے شرارتاً مجھے "پروفیسر" کہنا شروع کر دیا۔ دو دن کے بعد نثار بھٹی صاحب آئے مگر انہوں نے یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ فائل تک ان کی ابھی رسائی نہیں ہوسکی تاہم اگلے دو دن میں بتائیں گے۔ ایک ہفتے تک انہوں نے کچھ نہیں بتایا جب کہ ساجد مجھے اسی طرح شرارتی لہجے میں مجھے پروفیسر کہہ کر پکارتے رہے۔ ایک ہفتے کے بعد نثار بھٹی نے ساجد کو بتایا کہ

میری واقعی سلیکشن ہوگئی ہے تو وہاں پر موجود دوستوں نے مٹھائی کا مطالبہ کر دیا۔ میں نے شرط رکھی کہ ایک ہاتھ سے سیلیکشن لیٹر دے دو اور دوسرا ہاتھ میری جیب میں جائے گا اور مٹھائی منگوائی جائے گی۔ سیلیکشن لیٹر نے آنا تھا نہ آیا تو میں کمیشن میں بھٹی صاحب سے خود ملنے چلا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ آپ کا لیٹر میں نے رکھ لیا تھا سو وہیں مٹھائی منگوائی گئی اور مجھے سلیکشن لیٹر ملا مگر تقرر نامے کے اجرا میں بہت تاخیر ہوگئی۔ (تفصیل کے لیے "پاکستان میں کالج کے فارسی استاد کی سرگزشت" ملاحظہ کر لیجئے۔) میں یہاں یہ بتاتا چلوں کہ ایک روز ساہیوال میں میرے ایک دوست میاں اشتیاق احمد نے جب یہ پوچھا کہ آج کل کیا ہو رہا ہے، بتایا کہ سلیکشن ہو چکی ہے، تقرری کا انتظار ہے۔ کہنے لگے تقرری کہاں ہوگی۔ میں نے کہا کہ کسی دور کے شہر ہی ہو سکتی ہے۔ جواب میں انہوں نے کہا کہ اگر دور کے شہر میں ہو تو رحیم یار خان کرا لینا، وہ اچھا شہر ہے اور۔۔۔ 15 فروری 1979 کو جب میں لاہور کے تمام امور کو ختم (up wrap) کر کے پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس کی ہوسٹل نمبر 19 کو خدا حافظ کہہ رہا تھا تو میرے مستقبل کا پروانہ یعنی خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان کے لیے لیکچررشپ کا تقرر نامہ میرے ہاتھ میں تھا۔

11 مارچ 1974 کو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں میرا پہلا دن تھا اور 15 فروری 1979 کے آخری دن یہ مدت 5 سال اور چار دن بنتی تھی۔ مجھ ایک دیہات سے تعلق رکھنے والے نے جو خواب دیکھا تھا کہ وہ لاہور کے بڑے دھارے یا مین سٹریم سے اس وقت ہی نکلے گا جب تک اس کے نصب العین کا حصول ممکن نہیں ہو جاتا وہ پورا ہو چکا تھا۔ میں اپنے دیہات سے 10 فروری 1974 کو خالی ہاتھ بے یقینی مگر جذبے (passion) سے معمور ہو کر نکلا تھا اور پانچ سال بعد محنت اور استقامت کے ساتھ معاشرے کے لیے مفید اور کارآمد شخصیت اور تدریس کے باوقار پیشے سے وابستہ ہو کر جہاں سے آیا تھا وہیں واپس جا رہا تھا۔

میں نے 21 فروری 1979 یعنی آج سے چھیالیس سال قبل خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار میں جوائن تو کر لیا مگر لاہور کو ذہن و دل سے نکالنا اتنا آسان نہیں تھا۔ میں نے تو لاہور میں پانچ سال ایک نصب العین کے حصول کے لیے گزارے اور پہلی تقرری لاہور سے 600 اور ساہیوال سے 450 کلومیٹر دور ہوئی مگر میرے ساتھ فلسفے کے پرویز اقبال اور کیمسٹری کے ظفر عباس نقوی نے بھی جوائن کیا مگر وہ تو لاہور کے مقامی تھے، ان کو دیکھ کر حوصلہ ہوتا۔ ایک روز ہم تینوں لاہور کی جدائی میں غمزدہ تھے کہ پرویز نے نعرہ لگایا کہ چلو لاہور چلیں، اس کے دو گھنٹے بعد عصر کے وقت دستیاب کراچی ایکسپریس میں لاہور کے لیے ہم سوار ہو چکے تھے۔ لاہور پہنچے تو اس دوست اور مہربان شہر نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ ریلوے سٹیشن چھوڑنے سے پہلے دو روز بعد واپسی کے لمحہ جدائی کا فیصلہ کر کے رحیم یار خان کے لیے نشستیں بھی محفوظ کرا لیں۔ دو روز پلک جھپکتے گزر گئے

اور تیسرے روز ہم اپنی اپنی کلاسز میں موجود تھے۔ چند ماہ بعد پرویز اقبال جہلم اور ظفر عباس نقوی فورٹ عباس بھیج دئے گئے اور لاہور کی محبت میں مبتلا میں یہاں اکیلا ہی رہ گیا۔ مجھے بھی آتے آتے صبر آ گیا۔ اب جب بھی کبھی کبھار میں اپنے گھر ساہیوال جاتا تو لاہور سے بھی مل آتا۔ آئندہ برسوں کوئی ضروری کام ہی لاہور جانے کا سبب بنتا رہا۔ روزگار اور زندگی کی مصروفیات میں ایسا الجھا کہ لاہور کی جدائی اب کوئی تکلیف دہ امر نہ رہا۔ رحیم یار خان کے سولہ برسوں میں لاہور جانے کی اوسط دو بار فی سال رہی۔ جب نیو کیمپس میں قیام کے آخری ایام کے دوران ایک دن جنوب مغرب کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو بجلی کے کھمبے سر اٹھائے نظر آئے، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں ایک نئی آبادی فیصل ٹاؤن کا ترقیاتی کام ہو رہا ہے۔ نوتعمیر شدہ ہوسٹل نمبر 15 کے بعد یونیورسٹی کا ہوسٹلوں کے لیے وقف کردہ رقبہ ویران پڑا تھا۔ اس کے بعد روڈ مٹیریل ریسرچ سنٹر تھا اس کے بعد ٹھوکر نیاز بیگ تک دائیں بائیں ویرانہ تھا یا ایک دو گاؤں تھے۔ وحدت روڈ کے آخری بس سٹاف یا بھلیکھے وال، ملتان چونگی اور سکیم موڑ کی مثلث کے درمیان سولہ سوا یکڑ ہاؤسنگ سکیم میں گھروں کی تعمیر شروع ہو چکی تھی اور مون مارکیٹ بھی وجود میں آ چکی تھی۔ اس سکیم کی مین بلیوارڈ نے یونیورسٹی اور یتیم خانہ چوک کے درمیان فاصلہ کم کر کے ایک رابطہ سڑک کا کام کیا تھا۔ بند روڈ اور ملتان روڈ کے درمیانی ویرانے میں بھی اکا دکا تعمیراتی سرگرمیاں نظر آنے لگی تھیں۔ اس وقت وہ لاہور جس سے میں واقف تھا وہ گلبرگ، نیو کیمپس، کینٹ اور صدر کے علاوہ نہر اور دریائے راوی کے درمیان تھا۔ ابتدائی چند سال تک تو رحیم یار خان سے لاہو صرف ریل گاڑی ہی دستیاب تھی لہٰذا سٹیشن سے آئے اور یہیں سے واپس ہو لیے۔ اس دوران پہلے وفاقی کالونی کا اضافہ ہوا اور علامہ اقبال میڈیکل کالج 1990 میں وجود میں آیا۔ جناح ہسپتال 1994 میں شروع ہوا۔ جب ائر کنڈیشنڈ بسوں کا آغاز ہوا تو لاہور میں ان کے اڈے ریلوے سٹیشن کے قریبی علاقوں مثلاً شوبرا ہوٹل، بوہڑ والا چوک اور اردگرد کے علاقے میں تھے۔ 1987 میں نیو خان والوں نے 15 نشستوں والی ائر کنڈیشنڈ ویگن شروع کی تھی جو ملتان، مظفر گڑھ، علی پور، ہیڈ پنجند اور کے ایل پی روڈ کے راستے صادق آباد تک تھی۔ سب سے پہلی ایئر کنڈیشنڈ بس کا ٹرمینل ایجرٹن روڈ پر فلیٹیز ہوٹل تھا۔ اس کے بعد پھر ایسی بسوں کا نیٹ ورک پھیل گیا۔ لاہور داخل ہونیوالی بسیں ٹھوکر نیاز بیگ سے نیو کیمپس نہر کے راستے اور مال روڈ براستہ ڈیوس روڈ اور ایمپرس روڈ اپنے اڈوں پر پہنچتیں اور واپس بھی اسی روٹ سے جاتی تھیں اس لیے اس راستے میں آنے والی تبدیلیوں کا مشاہدہ ہوتا رہا۔ 1997 کے بعد ریلوے سٹیشن کے اردگرد کے علاقے میں واقع اے سی بسوں کے اڈے موجودہ جگہوں پر شفٹ ہو گئے۔ 2000 کے بعد جب بہاول پور میں ذاتی گاڑی آئی تو ریلوے اور پبلک ٹرانسپورٹ کو استعمال کرنے کے مواقع نہ مل سکے۔ تب سال میں چند بار لاہور آنے کا موقع ملتا رہا اور لاہور میں

تبدیلیاں رونما ہونے کے عمل کا مشاہدہ بھی ہوتا رہا۔ مجھے یاد ہے، ممکن ہے درست نہ ہو کہ نہر کنارے سب سے پہلی ہاؤسنگ سکیم کینال ویو (1988) تھی۔ بس جب نیو کیمپس سے گزرتی تو یہاں کی پرانی یادیں تازہ ہو جاتیں۔ 1991-92 کا ذکر ہے جب کوٹھے پنڈ ماڈل ٹاؤن والے فلیٹس نئے نئے بنے تھے تو ڈاکٹر ایوب ندیم نے ایک فلیٹ یہاں لے رکھا تھا اور میں نے وہاں دو تین دن قیام کیا تھا۔ یہ علاقہ ابھی پرہجوم نہیں ہوا تھا حتیٰ کہ ٹاؤن شپ اور گرین ٹاؤن دور دراز کے علاقے تصور کیے جاتے تھے۔ اس علاقے میں سڑکوں کا انفرا سٹرکچر بھی بہتر نہیں تھا۔ اس کے بعد لاہور نے چاروں اور پھیلنا شروع کر دیا بلکہ اس پھیلاؤ میں اگر اوپر اور نیچے کی سمتوں کو شامل کر لیں تو مناسب ہوگا۔ اس وقت شہر میں 372 رہائشی سکیمیں تو ایسی ہیں جس کی ایل ڈی اے منظوری دے چکا ہے۔ نامنظور چھوٹی بڑی سکیمیں اس کے علاوہ ہیں۔ اونچی اور زمین کے نیچے تک تعمیر ہونے والی عمارتیں یا مالز اور سڑکوں، چوکوں، انڈر پاسز اور اوور ہیڈ پلوں کا وسیع تر انفراسٹرکچر کا یہ شہر مکمل طور پر ایک نئے اور پہچانے نہ جانے والے شہر کا چولا پہن چکا ہے۔

2013 میں ریٹائرمنٹ کے بعد میری فراغت کا پہلا سال تھا جب ایک خاندانی فیصلے کے مطابق 13 نومبر 2014 کو لاہور مستقلاً منتقل ہونا پڑا۔ پہلے کرائے پر ایک گھر عسکری دس میں لیا اور وہاں تین سال کا عرصہ گزارا۔ میری سٹوڈنٹ لائف کے لاہور کا منظر نامہ مکمل طور پر تبدیل ہو چکا تھا مگر میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں پہلے والے لاہور کو دیکھنے کی خواہش میں مبتلا ہو گیا جس سے آغاز میں مجھے بہت پریشانی ہوئی کیوں کہ لاہور اب وہ لاہور نہیں رہا تھا۔ میں ایک طرح کے مغالطے اور رومانس میں مبتلا تھا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ شہر وقت کے ساتھ ساتھ مختلف حوالوں سے در آنے والی تبدیلیوں کو قبول کرتے اور بڑھتے اور پھولتے رہتے ہیں۔ مثلاً بہاول پور کو میں نے دس سال پہلے جہاں چھوڑا تھا اب وہ ویسا نہیں رہا تھا تو لاہور تو پھر لاہور ہے جہاں ہمہ جہت تعمیر و ترقی اور تغیر کا عمل ہمیشہ تیز تر رہا ہے۔ مجھے عسکری دس کی معاشرتی فضا پسند نہیں آئی۔ ریٹائرڈ فوجی افسران کے لیے مکمل طور پر ایک ہی طرز کے بنائے گئے مکانات چند برسوں سے سول لوگ بھی خرید رہے تھے جس سے ماحول فوجی تھا نہ سول۔ ایک طرح کی مجہولی (Passive) معاشرتی فضا تھی جہاں ایک دوسرے کو ملنے کی روایت مفقود تھی۔ چار سیکٹرز کی ہاؤسنگ سکیم میں صرف دو مختصر شاپنگ سنٹر ہیں جن میں سے ایک میں ایک چھوٹی سی ایس ڈی کینٹین بھی ہے۔ گراسری کے لیے قریب ترین جناح ہاؤس کے سامنے ایلیٹ کلاس کا مال آف لاہور اور مڈل کلاس کے لیے راحت بیکری اور قریب ہی بڑی سی ایس ڈی کینٹین کی سہولت موجود ہے۔ صدر کے شاپنگ سنٹر اور سٹور البتہ تنخواہ داروں اور اس قبیل کی کلاس کے لیے موزوں ہیں۔ صدر بھی اب وہ صدر نہیں رہا جسے میں نے ستر کی دہائی میں دیکھا تھا۔ میں نے ایک بات بطور خاص نوٹ کی کہ کینٹ کے

علاقے میں ٹریفک سگنلز اور حد رفتار کی مکمل پابندی کی جاتی ہے۔ وہاں سگنلز کبھی خراب نہیں ہوتے اور تمام اطراف کے سگنلز پر الٹی گنتی کے ٹائمر بھی لگے ہوئے ہیں جن سے سگنل پر رکنے اور چلنے کا وقت معلوم ہو جاتا ہے اور کوئی بے چینی نہیں ہوتی بل کہ اب تو کینٹ کی مختلف سڑکوں پر حد رفتار کو ماپنے کے لیے سپیڈ گنز بھی لگا دی گئی ہیں۔ میں عسکری دس میں تین سال تک رہا لہٰذا برکی روڈ، گجر پورہ چنگی، گلدشت ٹاؤن۔ بھٹہ چوک اور صدر کے علاقے میری دسترس میں تھے۔ ڈی ایچ اے کے تمام فیز اور ان کی مارکیٹیں میں کبھی بھی سمجھ نہ پایا گویا اس کے تمام راستے میرے لیے آج بھی نہ بوجھ پانے والی پہیلی ہیں۔ صرف ایک راستے سے کچھ آشنائی ہو سکی جو بھٹہ چوک سے کیولری گراؤنڈ تک آتا جاتا ہے۔ لاہور دراصل ایک شہر نہیں رہا بل کہ اس میں اب کئی شہر بستے ہیں۔ اس کے اندر موجود شہروں میں برانڈز کا ایک سیلاب ابلا پڑتا دکھائی دیتا ہے۔ ہر ایک برانڈ کی ایک طویل زنجیر (Chain) ہے جو 1772 مربع کلو میٹر رقبے اور ڈیڑھ کروڑ کی آبادی کے اس شہر اور اس میں موجود شہروں کے باسیوں کو اپنی خدمات مہیا کرنے میں مقابلے کی فضا میں برسر پیکار ہے۔ آسمان کو چھوتے ہوئے مالز، بیکریوں، میڈیکل سٹورز، ہوٹلوں، گارمنٹس کی متعدد برانچیں جا بجا بکھری نظر آتی ہیں۔ ایک بیکری ایسی بھی ہے جس کی یہاں دوصد برانچیں ہیں۔ ایک فارمیسی یا میڈیکل سٹور ایسا بھی ہے جس کی شہر بھر میں کل 35 برانچیں ہیں۔ یہ فارمیسی میڈیسن کمپنیوں سے براہ راست ادویات کی پوری لاٹیں اٹھا لیتے ہیں جس سے دیگر سٹورز پر ادویات کی عدم فراہمی سے مریضوں کو مشکلات پیش آتی ہیں۔ ہائپر سٹار، میٹرو، راجہ صاحب، رین بو، مال آف لاہور، کارفور، الفتح، نشاط ایمپوریم اور پیکجز اور ڈالمن جیسے دیوہیکل کئی منزلہ مال خریداری کے لیے درآمدہ اشیا اور مقامی برانڈز کے بہت بڑے مراکز ہیں۔

میں نے 1978 میں جب اس شہر کو چھوڑا تھا تو اس کی کل آبادی تیس لاکھ تھی اب 2014 میں واپس آیا تو اس کی آبادی میں ایک کروڑ افراد کا اضافہ ہو چکا تھا اور چاروں طرف آبادی اور رہائشی سکیموں کے پھیلاؤ (swell) نے اس شہر کو میرے لیے ناقابل شناخت بنا دیا۔ قدم قدم پر ملنے والی حیرتوں سے میری حالت اس گاؤں کے فرد کی سی ہو گئی جو کسی بڑے شہر میں پہلی بار آیا ہو۔ میری ساری یادیں اور رومانس تو نہر کے کنارے اور مال روڈ، لوئر مال، ملتان روڈ اور انارکلی کے ارد گرد بکھرا پڑا تھا۔ مجھے نیو کیمپس اور اولڈ کیمپس میں اپنے کمرے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ پہلے میں اونچی دیواروں اور خاردار تاروں میں گھرے ہوئے قلعہ نما پنجاب یونیورسٹی کی ہوسٹلوں کو دیکھنے گیا۔ تمام ہوسٹل چار دیواریوں کے اندر موٹر سائیکل سٹینڈز میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ میں ہوسٹل نمبر 19 کا 19 نمبر کمرہ دیکھنے گیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ دو چار پائیوں کی جگہ والی ڈارمیٹری میں چار فرشی بستر لگے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری گیا تو وہاں کوئی شخص جاننے والا

نہیں تھا۔ جب یونیورسٹی لائبریری اولڈ کیمپس میں تھی تو اکثر وقت وہیں گزرتا تھا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ پنجاب یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری اور شعبہ جاتی لائبریریوں کی تمام کتب کا کیٹیلاگ یونیفائیڈ صورت میں ڈیجیٹل کر دیا گیا ہے اور لائبریری کے اس کیٹالاگ سے دنیا کے کسی کونے سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر اولڈ کیمپس جانے کا موقع ملا تو سابق لا کالج کی ہوسٹل کے آغاز ہی میں گیٹ نے استقبال کیا۔ ہوسٹل کا نام تبدیل کر کے خالد بن ولید ہال رکھ دیا گیا ہے۔ اورینٹل کالج کے تاریخی وولنر ہوسٹل کی انفرادیت کو ختم کر کے اسے بڑے ہوسٹل میں ضم کر دیا گیا ہے اور کمروں کے نمبر بھی تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ اپنے پرانے کمرہ نمبر 46 میں جانے کا شوق پورا کیا مگر دو چار پائیوں کے علاوہ ترتیب و تنظیم کا کوئی نام ونشان نہیں تھا جیسے وہاں رہنے والے محض گزارہ ہی کر رہے ہوں۔ پاک ٹی ہاؤس جہاں 1974 سے 1978 تک کا بیشتر وقت گزرا، ایک طویل عرصے بعد اس کا پرانا سٹیٹس بحال ہو چکا تھا مگر وہاں جا کر بہت مایوسی ہوئی۔ فضا سگریٹ کے دھویں سے بوجھل تھی۔ شاعر اور ادیب تو کوئی نہیں مل سکا مگر یہ ضرور دیکھا کہ وہ اب ڈیٹنگ پوائنٹ بن چکا تھا۔ بعد میں اتوار کے روز حلقہ ارباب ذوق کے ہفتہ وار تنقیدی اجلاس میں کچھ عرصہ جاتا رہا۔ اس عرصے میں امجد طفیل اور غلام حسین ساجد نے بحیثیت سیکریٹری حلقے کو بہت فعال بنانے کی کوشش کی مگر ان کے بعد آنے والوں کے اقدامات سے حلقہ ایک اکتا دینے والی یکسانیت کا شکار ہو گیا۔ دوبارہ سے جنم لینے والے پاک ٹی ہاؤس میں پرانے ماحول، ادبی فضا اور ادیبوں کے ٹھکانے کے طور پر دیکھنا ایک مغالطے سے کم نہیں۔ 1978 کے تیس لاکھ کی آبادی والا یہ شہر اب ایک کروڑ تیس لاکھ کا ہندسہ عبور کر چکا ہے اور اس میں کئی شہر سما گئے ہیں تو فاصلے بڑھنے سے ادبی مراکز بھی تبدیل ہو گئے ہیں۔ اب تو الحمرا میں منعقدہ ادبی میلوں ہی میں شاعر و ادیب اکٹھے نظر آ جاتے ہیں۔ انارکلی میں کچہری روڈ والے چوک سے مال روڈ چوک سے پہلے تک اتوار کو پرانی کتب کا میلہ سا لگتا تھا مگر اب پاک ٹی ہاؤس کے سامنے اور مال روڈ چوک تک کا حصہ اتوار کو کتابوں سے سجایا جاتا ہے مگر اب کتابوں کے کباڑیے تول میں ملی ہوئی کتب کے نرخوں پر کوئی سمجھوتا نہیں کرتے بل کہ آدھے سے زیادہ سٹال نئی کتب کے لگائے جاتے ہیں اور ان کی نسبت کتب کی دکانوں سے زیادہ رعایت مل جاتی ہے۔ اب میں جہاں رہتا ہوں وہ کینال روڈ کے قریب ہے مگر وہاں سے انارکلی اور پاک ٹی ہاؤس تک جانے اور واپس آنے کا کل فاصلہ 50 کلومیٹر بنتا ہے لہٰذا میں کتب کی خرید کے لیے زیادہ تر ریڈنگز جا سکتا ہوں یا پھر قریب ترین ایکسپو سنٹر میں ایک سال کے بعد کتاب میلے کا انتظار کرتا ہوں بل کہ اس سے بھی زیادہ آسان طریقہ آن لائن خریداری کا ہے جس میں رعایت کا تناسب بھی معقول ہوتا ہے۔ ایک دوست نے بتایا کہ پاک ٹی ہاؤس کے سامنے والا علاقہ جہاں اتوار کو پرانی اور نئی کتب کا بازار لگتا ہے، بعض قبضہ گروپ اب اس کے درپے ہیں۔ اب

کتب فروش مختلف مواقع پر آن لائن کتب کی رعایت میں خاطر خواہ اضافے کا اعلان کرتے رہتے ہیں اور کتابوں کی دکانوں پر جا کر کتب کے دیکھنے کی بجائے ان کی ویب سائٹس پر دیے گئے مکمل کیٹلاگ ملاحظہ کر سکتے ہیں بل کہ کچھ کیٹلاگز میں ہر کتاب کے انڈیکس اور جائزے بھی دیے جاتے ہیں۔ لاہور میں کتب کے دو میلے بہت مفید اور معروف رہے ہیں۔ ایک تو لاہور انٹرنیشنل بک فیئر ٹرسٹ کا کتاب میلہ جس کا آغاز سینتیس سال قبل ہوا تھا۔ 2024 اور 2025 کے دونوں انٹرنیشنل کتاب میلے کتب فروشوں کے لحاظ سے اوسط درجے کے تھے جس کی بڑی وجہ محدود سائز کے بنیادی کیبن کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔ اسے معروف معنوں میں بین الاقوامی کتب میلہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ دوسرا بک فیئر پنجاب یونیورسٹی کا تھا جو 8 سال قبل طلبا کی باہمی سیاسی آویزشوں کا شکار ہو گیا اور انتظامیہ نے یہ سلسلہ بند کر دیا تاہم مارچ 2024 میں یونیورسٹی انتظامیہ نے ہمت کی اور 8 سال بعد اس کا کامیاب انعقاد کرایا گیا۔ 2025 کا کتاب میلہ کامیاب ترین تھا جس کی گونج دور دور تک سنی گئی۔

لاہور میں بسنا صرف لاہور کی شرائط پر ہی ہو سکتا ہے۔ جس طرح بعض لوگ اپنی شرائط پر دوستی کرنے کے قائل ہیں اسی طرح لاہور شہر بھی اپنی شرائط پر ہی نئے آنے والے کو یہاں بسنے کی اجازت دیتا ہے۔ نئے آنے والے کو اگرچہ شروع میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے مگر دیگر لوگوں کی طرح وہ بھی ان مشکلات کا عادی ہو جاتا ہے۔ ماضی بعید کے برعکس لاہو میں بسنا اور رہنا قطعاً آسان نہیں، یہ شہر اپنی قیمت وصول کرتا ہے۔ کیٹگری اے اور بی کی رہائشی سکیموں میں دس مرلے کا دو منزلہ نان فرنشڈ مکان کا ماہانہ کرایہ ایک لاکھ سے زیادہ ہے اور دس فیصد سالانہ یا تین سال بعد تیس فیصد اضافہ کے ساتھ ساتھ چار ماہ کا کرایہ ایڈوانس لیا جاتا ہے جو اس وقت واپس کیا جائے گا جب مکان خالی کیا جائے گا تاہم چار ماہ کی ایڈوانس رقم میں سے مکان کو استعمال کی وجہ سے پہنچنے والے نقصان کے ازالے کی رقم منہا کر لی جاتی ہے۔ کرائے پر مکان لے کر دینے والے پراپرٹی ڈیلر کا معقول کمیشن الگ سے دینا پڑتا ہے۔ مالک مکان ترجیحاً دونوں پورشن علیحدہ کرائے پر دینے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ زیادہ کرائے کا حصول ممکن ہو سکے۔ مجھے 1974 سے 1978 کا اپنی طالب علمی کا دور یاد آ رہا ہے۔ اس دور میں جیب میں اگر ایک روپیہ ہوتا تھا تو دو وقت کا بنیادی سطح کا کھانا کھایا جا سکتا تھا۔ چونی کا حلیم اور چونی کے دو نان اور پانی مفت، پیٹ بھر جاتا تھا۔ آج 35 روپے کے دو سادہ نان اور 50 روپے کا حلیم گویا کم از کم معیار کا ایک وقت کا کھانا ایک سو روپے سے کم میں نہیں آتا۔ پرانی انارکلی بازار میں بمبئے اور عزیز نامی دو ہوٹل تھے۔ مٹن قورمہ کی ایک پلیٹ ڈیڑھ روپے اور دو چپاتیاں پچاس پیسے کی گویا دو روپے میں ایک وقت کا بہت اچھا کھانا کھایا جا سکتا تھا اور آج یہی کھانا ایک سو پچاس سے دو سو روپے میں قابل دسترس

ہے۔ اتوار کے روز ہوٹلوں اور کھانے پینے کی اشیا کی دکانوں کے سوا تمام مارکیٹیں بند ہوتی تھیں اور اتوار کی ہفتہ وار تعطیل کا بھرپور احساس ہوتا تھا۔ اب چند مارکیٹیں تو شاید بند ہوتی ہوں مگر بیشتر برانڈز اور مالز کی سلسلہ وار شاخیں کھلی رہتی ہیں۔ اب تمام بڑے مالز اور سلسلہ وار میگا سٹور ایک ہی چھت کے نیچے تمام اشیا فروخت کرتے ہیں۔ سبزی، گوشت، گراسری، کراکری اور الیکٹرانکس اور فرنیچر ایک ہی چھت کے نیچے دستیاب ہوتے ہیں بل کہ چھ سات منزلہ ایسے میگا سٹور بھی ہیں جن کی ہر منزل ایک کیٹیگری کی اشیا کے لیے مخصوص ہے۔ بڑے بڑے دیوہیکل مال اور ہال جن کا میں نے اوپر کی سطور میں ذکر کیا ہے وہ دو یا تین ایکڑ یا اس سے بھی زیادہ رقبے پر مشتمل ہیں جن میں دنیا جہان سے درآمدہ اشیا خریدی جا سکتی ہیں جہاں مقامی آبادی سے لے کر دیگر شہروں سے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ ان میں ایک یا دو منزلیں صرف بچوں کی قیمتاً تفریحاتی سرگرمیوں اور ہر عام خاص کے لیے فاسٹ فوڈز کے درجنوں برانڈز کے لیے مخصوص ہیں۔ میں جب مستقل طور پر لاہور آیا تو پھل، سبزیاں اور گراسری کی اشیا کی قیمتوں سے بہت مضطرب تھا کیوں کہ میرے ذہن میں بہاول پور کے نرخ ابھی تازہ تھے۔ کچھ عرصے بعد مجھے اس اضطراب سے اس وقت نجات ملی جب میں نے بہاول پور کے نرخوں کی لسٹ اپنے ذہن یا یادداشت کی ہارڈ ڈسک سے اڑا دی البتہ یہاں پر پوش علاقوں اور پرانے لاہور کی آبادیوں کے درمیان نرخوں کا خاصا فرق بھی موجود ہے۔ سبزی یا پھلوں کی دکانوں پر پیدل، موٹرسائیکل سوار، کار سے اترے ہوئے گاہک اور کار میں بیٹھے بیٹھے آرڈر دینے والے گاہکوں کے لیے نرخوں اور دکان دار کے رویے میں خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ یہاں پر بھکاریوں کی بھی کئی اقسام ہیں۔ کسی چوراہے کے سگنل پر رکتے ہی منتظر گداگر گاڑیوں کے شیشوں پر دستک دیں گے۔ بناؤ سنگار کے ساتھ ٹرانس جینڈر "خواتین" کی اکثریت ایک دم حملہ آور ہوگی۔ پانی کی بوتل اور وائپر بردار فورس سے محفوظ رہنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ دودھ پیتے اور سوتے بچوں کو بغل میں دبائے خواتین اور خصوصی مرد وزن ان کے علاوہ ہیں۔ بھکاریوں کے ان تمام طبقوں کے اپنے ریٹس ہیں۔ دس روپے لے کر دعا دینے والے بھکاری شریف اور صابر ہوں گے جب کہ کئی ایک پچاس روپے سے کم قبول نہیں کریں گے۔ معاف کریں پر آپ کو کاٹ کھانے والی نظروں سے دیکھیں گے اور اگلے شکار کی طرف بڑھ جائیں گے۔ کئی ایک سو روپے مانگ کر رعب بھی ڈالیں گے کہ سو روپے سے کم انہیں قبول نہیں۔ کوئی بھکاری ناراض ہو کر یہ بھی کہتے ہیں کہ بیٹھنا کاروں میں اور دینے پچاس روپے یا یہ بھی کہ آپ اللہ کے نام پر دے رہے ہیں، ہم پر کوئی احسان نہیں کر رہے۔ کسی مارکیٹ میں گاڑی روکیں تو اترتے اور سوار ہوتے وقت گاڑی کا دروازہ کھولنے یا بند کرنے کے لیے اچانک کہیں سے گارڈ نما شخص آئے گا جس کے چہرے پر پیسے لینے کی خواہش یا سوال نظر آئے گا۔

بھٹو دور حکومت میں پنجاب میں صرف ایک ہی سرکاری یونیورسٹی تھی۔ستمبر و اکتوبر 1972 میں پاکستان بھر میں پرائمری سکول سے کالجز تک تمام نجی تعلیمی اداروں کو 15 مارچ 1972 کی حاضر سٹاف کی بنیاد پر قومی تحویل میں لے لیا گیا۔اس سے حکومت کے اثاثوں میں اضافہ ہوا اور نجی تعلیمی اداروں کے تمام سٹاف کی تنخواہوں کو قومی خزانے سے ادا کیا جانے لگا مگر اس اقدام سے ابتدا سے اوپر تک معیار تعلیم و تدریس اوسط درجے سے بھی نیچے چلا گیا۔ 1984 سے ایک صفحے پر مشتمل نجی تعلیمی ادارے کھولنے کا ایکٹ نافذ ہوا تو نجی تعلیمی اداروں کے قیام کا آغاز ہو گیا۔اس کے بعد ہر سطح کے تعلیمی اداروں کے کھلنے کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا کہ آج تک تھمنے کا نام نہیں لے رہا۔" پھیلتا پھولتا" لاہور مختلف برانڈز کے ناموں کے تعلیمی ادروں کا مرکز بن گیا اور ان برانڈز کے سلسلوں کو لاہور سے پنجاب میں بالخصوص اور ملک بھر میں بالعموم برآمد کیا جا رہا ہے۔ جب اوریجنل برانڈ مقبول ہوا تو اس کو سلسلے (chain) کی صورت میں دیگر شہروں تک پھیلا دیا گیا۔اس کے بعد ذیلی برانڈ تشکیل دیے گئے جن کو رائلٹی اور ایک ہی نصاب اور کتب کی بنیاد پر بیچا گیا۔تمام تعلیمی برانڈز کی کتابوں، کاپیوں اور یونیفارم کے لیے مخصوص دکانوں کا جال بچھایا گیا اور ان دکانداروں سے کمیشن اس طرح لیا گیا جس طرح ڈاکٹر لیبارٹریوں سے وصول کرتے ہیں۔اب یہ سلسلہ پھیل کر کھربوں روپے کا باقاعدہ کاروبار بن چکا ہے بل کہ ممکن ہے کہ ملکی جی ڈی پی میں اس کاروبار (investment) کا معقول حصہ ہو۔ حکومت پنجاب نے گورنمنٹ کالج لاہور کو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے نام سے چارٹرڈ یونیورسٹی بنایا، اسی انداز (pattern) پر پنجاب کے متعدد گورنمنٹ کالجوں کو یونیورسٹیوں کا درجہ دے دیا گیا۔اس سے دو قدم آگے بہاول پور میں اسلامیہ یونیورسٹی کی موجودگی کے باوجود سیاسی بنیادوں پر خواتین کے تاریخی صادق گرلز کالج کو خواتین یونیورسٹی بنا دیا گیا۔اس کے تمام اثاثے حکومت نے خواتین یونیورسٹی کو منتقل کر کے کالج کی تدریسی و غیر تدریسی سٹاف کو پہلے سے پرہجوم دو گورنمنٹ گرلز کالجوں میں شفٹ کر دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس خواتین یونیورسٹی میں بیشتر تدریسی اور انتظامی سٹاف مردوں پر مشتمل ہے۔ پنجاب میں ایسی متعدد مثالیں مل جائیں گی۔ 1974 میں پنجاب یونیورسٹی ہی گریجوایشن کے بعد کی تعلیم دینے اور پنجاب کے تمام کالجوں کے طلبا اور پرائیویٹ امیدواروں کے بی اے اور ایم اے کے امتحانات لینے کے لیے موجود تھی۔اس وقت پبلک سیکٹر میں 51 چارٹرڈ یونیورسٹیاں ہیں جن میں سے 15 صرف لاہور میں موجود ہیں جب کہ پرائیویٹ سیکٹر کی کل 31 یونیورسٹیوں میں سے 21 لاہور میں موجود ہیں۔ان کے سب کیمپسز کا نیٹ ورک لاہور اور تمام پنجاب بل کہ پاکستان میں پھیلا ہوا ہے۔ 1974 میں ایم اے کی ماہانہ فیس 20 روپے اور ہوسٹل میں کمرے کا ماہانہ کرایہ 12 روپے تھا جب کہ آج چار ماہ کے سمسٹر کی فیس لاکھوں روپوں میں ہے۔ ہائر ایجوکیشن کی ایک

رپورٹ کے مطابق لاہور میں کل ملا کر 58 یونیورسٹیوں میں کل 1238 سٹڈی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں جن میں 516 بیچلر، 455 ماسٹرز اور 267 پی ایچ ڈی پروگرام شامل ہیں۔ان حقائق کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ لاہور پاکستان میں تجارتی بنیادوں پر پرائمری سے اعلیٰ تعلیم تک کا مرکز (hub) بن چکا ہے اور ہر قسم کی تعلیم کو یہیں سے کنٹرول کیا جا رہا ہے۔

1882 میں قائم ہونے والی پنجاب یونیورسٹی میں 1974 تا 1978 کے دوران چار یا پانچ فیکلٹیز اور تین کالجز تھے اور آج اس یونیورسٹی میں 19 فیکلٹیز، آٹھ کالج اور 134 شعبہ جات، مراکز اور انسٹی ٹیوٹس ہیں۔ 2025 کی پہلی سہ ماہی تک اس کے 132 کانوکیشن منعقدہ ہو چکے ہیں۔اس کے کل پانچ کیمپس ہیں جن کا سال قیام اور رقبہ اس طرح ہے۔1- علامہ اقبال کیمپس (اولڈ کیمپس) 1882، 50 ایکڑ 3 مرلہ۔2- قائداعظم یا نیو کیمپس، 1958، 1781 ایکڑ۔3- خانسپور کیمپس 1964، 11980 مربع فٹ۔4- گوجرانوالہ کیمپس، 2006، دس ایکڑ ایک کنال۔5۔جہلم کیمپس، 2011، بتیس ایکڑ تین کنال، گیارہ مرلے۔اس وقت پنجاب یونیورسٹی کے 16 ہوسٹل برائے طلبا اور 12 ہوسٹل برائے طالبات ہیں جن میں رہائشی طلبا اور طالبات 8 ہزار کے قریب ہیں۔تین فیکلٹی بیچلر ہاسٹل اس کے علاوہ ہیں۔پانچوں کیمپسز کے 45 ہزار سے زائد طلبا و طالبات کا تناسب بالترتیب 49 اور 51 فیصد ہے۔ایک ہزار سے زیادہ ریگولر فیکلٹی اور بڑی تعداد میں وزٹنگ فیکلٹی یا جز وقتی اساتذہ اس سے وابستہ ہیں جب کہ 6 ہزار کے قریب غیر تدریسی سٹاف ہے۔

یونیورسٹی اعلیٰ تعلیم کا ایک ایسا ادارہ ہے جس میں معاشرے کے ہر طبقے اور کلاس کی نمائندگی ملتی ہے۔یونیورسٹی میں ایک ایسی معاشرتی اکائی وجود میں آتی ہے جہاں مخلوط سطح پر ہماری معاشرتی اقدار کا اظہار ہوتا ہے۔رہائشی اور ڈے سکالرز مل کر مخلوط نظام تعلیم میں مثبت یا منفی ایسی نفسیاتی فضا کی تشکیل کرتے ہیں جس میں ان کی شخصیت سازی اور ان کے باہمی روابط اور تعلقات کا رکا ارتقائی عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔چوں کہ ہمارے ہاں جینڈر کی بنیاد پر گھر سے لے کر یونیورسٹی تک تعلیم و تربیت اور شعور کا کوئی باقاعدہ نظام موجود نہیں اور پھر مالی وسائل میں عدم مساوات کا عامل یا معاشرتی کلاس سسٹم بھی دخیل ہوتا ہے اس لیے خالص، صحت مند، مثبت اور خود اعتمادی کی بنیاد پر شخصیت سازی کا عمل کمزور (fragile) ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ہر شعبے کا ماحول مختلف ہوتا ہے۔ہمارے وقتوں میں نفسیات اور فلسفے میں طالبات کی تعداد زیادہ تھی۔زیادہ تصنع اور بناوٹ نے ابھی زور نہیں پکڑا تھا۔طالبات میں دوپٹہ سر پر لینے اور متوازن حجاب کا رواج زیادہ تھا۔دوپٹہ گلے میں ڈالنے کا رواج تھا مگر بہت کم۔اکا دکا لڑکیاں سفید ایپرن پہنتی تھیں جب کہ یہ لباس تو طب

کے شعبے کے لیے مخصوص تھا۔ میں نے ایک ایسی ہی لڑکی سے ایپرن پہننے کی وجہ دریافت کی تو اس نے بہت متوازن جواب دیا کہ اس سے مجھے خوداعتمادی اور تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں میں ایک دلچسپ بات بتاتا چلوں کہ جس طرح بوائز کالجوں میں سائیکل پر آنے والے طلبا کے لیے سائیکل سٹینڈ فنڈ تھا اسی طرح گرلز کالجز میں برقعہ پہن کر آنے والی طالبات سے برقعہ سٹینڈ فنڈ لیا جاتا رہا ہے۔ خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اس وقت لباس اور گفتگو سے متاثر کرنے کی روایت بھی عام تھی لیکن طالبات میں ایک طرح کی اوریجنلٹی تھی کہ وہ چہروں پر غازے وغیرہ کا استعمال نہیں کرتی تھیں۔ سادگی کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اگر کوئی لڑکا یا لڑکی تین فٹ کے فاصلے سے بھی بات کرتے پائے جاتے تو لڑکے کو باقاعدہ چھیڑا جاتا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے جوہر عموماً کسی تفریحی ٹور کے وقت کھلتے مگر ہلکے پھلکے مزاح کی حد تک، جس طرح لڑکے اپنے یا دیگر شعبہ جات کی لڑکیوں کے بارے میں اپنی محافل میں ذکر کرنا پسندیدہ فعل تصور کرتے تھے تو لڑکیوں کے بارے میں بھی ایسی ہی رائے قائم کی جاتی تھی۔ بل کہ ان دنوں ایک لطیفہ بہت عام ہوا جس کا سوفٹ ورژن یہ ہے کہ چند دوست لڑکیاں لڑکوں کے بارے میں اپنی محفل میں باتیں کر رہی تھیں کہ ایک لڑکی نے پوچھا کہ کیا لڑکے بھی ہمارے بارے میں ایسی ہی باتیں کرتے ہوں گے تو سب نے ہاں میں جواب دیا تو وہ لڑکی کہنے لگی پھر تو بہت بدتمیز ہیں۔ ان باتوں کی روشنی میں یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ زیریں سطح پر دونوں جینڈر گروپس کے درمیان ایک عمومی قسم کی فرسٹریشن پائی جاتی تھی۔ اس کی ایک شہادت پیش ہے کہ جن دنوں میں نے یونیورسٹی کے آخری سال نیو کیمپس میں رہائش اختیار کی تو لڑکے ٹولیوں کی شکل میں عصر اور مغرب کے وقت باقاعدگی سے گرلز ہوسٹلوں کے باہر منڈلاتے رہتے تھے۔ ایک بار لاہور کے کسی مضافاتی شہر کے گرلز کالج کی طالبات تین بسوں میں لاہور کے تفریحی دورے پر آئیں تو اس شہر کی ایک یونیورسٹی طالبہ نے اجازت سے ان کے لیے گرلز ہوسٹل نمبر دو میں چائے کا انتظام کر رکھا تھا۔ جیسے ہی وہ بسیں گرلز ہوسٹل کے سامنے پارک ہوئیں تو نیو کیمپس کی ہوسٹلوں کے طلبا کو اس کی خبر ہو گئی اور کیا جماعتی یا غیر جماعتی، بیشتر طلبا ایک دم امڈ پڑے اور بسوں کا طواف کرنے اور خوب آوازے کسنے لگے تا آنکہ وہ روانہ نہیں ہو گئیں۔ اسے فرسٹریشن نہیں کہیں گے تو پھر اس کے لیے کونسی اصطلاح وضع کرنی چاہیے۔ ہمارے دور میں بھی جوڑے بنتے تھے مگر نہ ہونے کے برابر۔ پسندیدگی کی بنیاد پر بننے والے جوڑے زندگی کا فیصلہ والدین کے توسط اور رضامندی ہی سے طے کرتے تھے۔ یک طرفہ عشق کی روایت عام تھی لیکن ہمارا معاشرہ ابھی بولڈ یا کھلا نہیں تھا اس لیے فلرٹ کرنے کی روایت نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں یہ پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ ہماری ہوسٹل میں ایک پراسرار شخصیت تھی اور انہیں پیر جی کہہ کر مخاطب کیا جاتا۔ بااخلاق اور بے ضرر اس شخصیت کا اصل نام خالد مسعود رانجھا تھا جو اپنا تعلق شعبہ فلسفہ سے بتاتے تھے جب کہ وہ طویل

عرصے سے یہاں رہائش پذیر تھے۔ گرلز ہوسٹل نمبر دو کی ایک لڑکی سفید ایپرن پہن کر کیمپس میں اکثر دیکھی جاتی اور "میجر" کے نام سے معروف تھی۔ پیر صاحب اس کے یک طرفہ عشق میں مبتلا تھے اور صرف اسے دیکھنے کے لیے ہوسٹل نمبر 19 سے شاپنگ سنٹر کے درمیان سیر کرتے پائے جاتے حالانکہ وہ لڑکی ''پیر صاحب'' کے نام اور احساس سے واقف تک نہیں تھی۔

آج 2025 کی ابتدا میں اگر دیکھا جائے تو پورا منظر نامہ ہی تبدیل ہو چکا ہے۔ یہاں تک پہنچنے میں ہمارے معاشرے نے پینتالیس سال کا ایک ارتقائی سفر طے کیا ہے۔ گذشتہ 25 سال میں جدید ترین اطلاعاتی سہولتوں اور سوشل میڈیا نے گویا تبدیلی کے عمل کو ایک مہمیز لگائی ہے۔ ہمارے وقت پنجاب یونیورسٹی کے دو کیمپس تھے۔ تین چار فیکلٹیز تھیں جن کے 20 کے قریب شعبہ جات میں ایم اے اور ایم ایس سی ہوتا تھا یا پھر لا کالج میں ایل ایل بی اور ہیلی کالج میں بی کام اور ایم کام کے کورسز تھے۔ فارمیسی اور کیمیکل انجینئرنگ کے شعبہ جات بھی تھے۔ زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار سٹوڈنٹس تھے۔ اب 19 فیکلٹیز کے 45 ہزار سے زیادہ طلبا و طالبات گریجوایٹ سے پی ایچ ڈی کے 150 سے زیادہ کورسز یا مضامین میں زیر تعلیم ہیں۔ پہلے نیو کیمپس آئی ای آر کے ساتھ برآمدہ سے شروع ہو کر دائیں بائیں تمام شعبوں کو ملاتا ہوا موجودہ انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری سے پہلے ختم ہو جاتا تھا۔ یونیورسٹی کے بنیادی ماسٹر پلان کے مطابق اس کو بہت آگے تک جانا تھا اور اس کے دونوں اطراف میں مزید شعبوں کو تعمیر کیا جانا تھا مگر انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری نے اس کا راستہ روک لیا۔ نئے متعارف کرائے جانے والے شعبہ جات، کالجز، سنٹرز اور انسٹی ٹیوٹس کی عمارتیں چاروں اور پھیل گئیں۔ اب تو شوکت علی روڈ کی جانب سے جو مین گیٹ بنایا گیا ہے اس کی طرف سے داخل ہوں تو یونیورسٹی کے چیف انجینئر آفس کے سامنے اور اور دیگر اطراف میں جدید ترین مضامین کا ایک نیا کیمپس آباد ہو رہا ہے۔ یونیورسٹی کی ہوسٹلز کا ایریا ہوسٹلوں سے بھر چکا ہے۔ وہاں صرف نیو گارڈن ٹاؤن کے سامنے صرف دو گراؤنڈ ہی بچے ہیں۔ یونیورسٹی کا 1800 ایکڑ رقبہ شوکت علی روڈ تک بھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس روڈ کی دوسری جانب ٹیک اور پی سی ایس آئی آر سوسائٹیز کے پیچھے سیکڑوں کنال کا رقبہ ابھی خالی پڑا ہے۔ یونیورسٹی کا معاشرتی منظر نامہ مکمل طور پر تبدیل ہو چکا ہے۔ یونیورسٹی کو تعلیمی معیار کے لحاظ سے بڑی بڑی نجی یونیورسٹیوں سے سخت مقابلے کا سامنا ہے۔ اب اظہار میں آسانی اور بیبا کی زیادہ در آئی ہے، لاسلکی الیکٹرومگنیٹک آلات نے ہر قسم کی معلومات اور پیغام رسانی کے بیسیوں طریقے انسان کی گود میں ڈال دیے ہیں۔ اب یونیورسٹی میں گاڑی، موبائل اور لیپ ٹاپ کے ساتھ ساتھ فیشن کے سیکڑوں برانڈز اور ماڈلز معاشرتی مقام و مرتبہ متعین کرتے نظر آتے ہیں۔ سٹوڈنٹس زیادہ بولڈ اور پر اعتماد ہو گئے ہیں۔ ان آلات نے یونیورسٹی میں طلبا و طالبات کے معاشرتی اور باہمی

روابط کا قطعی طور پر ایک نیا سکرپٹ مرتب کیا ہے۔اب ہمارے زمانے کی فرسٹریشن اور یک طرفہ عشق کی روایات دفن کی جا چکی ہیں۔

شش جہات میں پھیلنے والے اس شہر نے پاکستان میں طبقاتی، معاشرتی اور تہذیبی اقدار کا قطعی طور پر ایک نیا منظر نامہ تشکیل دیا ہے۔ ہر طبقے کی اخلاقیات اور معاشرت کے اپنے اپنے معیار اور تقاضے ہیں۔بینکوں اور شورومز نے گاڑیوں اور چائنا نے موٹر سائیکلوں سے لاہور کو بے تحاشا بھر (Overdose) دیا ہے۔اس وقت لاہور میں 62 لاکھ گاڑیاں اور بیالیس لاکھ موٹر سائیکلیں ہیں اور روڈ انفراسٹرکچر پھیلنے کے باوجود سکڑتا جا رہا ہے۔کئی ایکڑوں کے فارم ہاؤس میں بنے گھر، کئی کنالوں میں زندگی کی بہترین سہولتوں سے مزین بنگلے، زندگی کی ہر آسائش اور آسودگی کے حامل مالز میں بنے ہوئے کروڑوں کے لگژری اپارٹمنٹس اور سٹو ڈیو لاجز، ایک کنال، دس، سات، پانچ، تین مرلوں تک کے گھروں پر مشتمل رہائشی کالونیاں، کچی آبادیاں (Slums) اور کھلے آسمان کے نیچے سونے جاگنے والے افراد غرضیکہ لاہور میں انسانی زندگی کا ہر رنگ اور ہر جہت موجود ہے۔ پنجاب کے پہلے اور پاکستان کے دوسرے بڑے شہر کی ٹریفک کے پیچیدہ مزاج کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔آپ کو شہر میں کسی بھی جگہ کسی بھی وقت بے ہنگم ٹریفک کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اس لیے معین منزل تک پہنچنے کے لیے خاصا وقت پہلے روانہ ہونا پڑتا ہے۔ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے آپ کو ٹریفک کے کئی رنگ دیکھنے پڑ سکتے ہیں۔لاہور کا انفراسٹرکچر جتنا بڑھا ہے یہاں کی ٹریفک میں اس سے کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔اگر کوئی گاڑی خراب ہو جائے تو اس کا ٹریفک پر اتنا اثر پڑتا ہے کہ دو تین کلومیٹر کی ٹریفک اس کے دباؤ کا شکار ہو جاتی ہے۔موٹر سائیکل بھن بھناتی مکھیوں کے چھتوں کی طرح تمام سڑکوں پر پھیلے پڑے ہیں۔یہ ہے 2025 کا لاہور، 1974 سے 1978 میں یہ ایک ہی شہر تھا اور آج یہ کئی شہروں کا شہر ہے گویا لاہور کے اندر کئی لاہور وجود میں آ چکے ہیں اس لیے وہ لاہور نہیں ملتا جس کی مجھے تلاش ہے اور جو میرے خوابوں کا حصہ رہا ہے۔

اب تو لاہور کے موسموں نے بھی چولا بدل لیا ہے اور اس لحاظ سے بھی لاہور اجنبی شہر لگتا ہے۔آج سے نصف صدی قبل یہ دوست موسموں کا شہر تھا جو اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگاتے تھے۔اس کی صبحیں اور شامیں روشن اور رومان پرور ہوتی تھیں۔اچھے موسموں کے انسانی مزاجوں پر اچھے اثرات مرتب ہوتے تھے۔ گرمیوں سردیوں میں اتنی شدت نہیں ہوتی تھی۔ میں جب یونیورسٹی میں داخل ہوا تو ہمارے ہوسٹل میں پنکھے تک نہیں تھے مگر گرمی کا احساس پریشان کن نہیں ہوتا تھا۔مون سون کی بارشیں بہت لطف دیا کرتی تھیں۔شدید بارشوں سے بھی زندگی کے معمولات میں تعطل نہیں آتا تھا۔ جولائی 1976 میں تین دن یعنی بہتر گھنٹے تک

مسلسل رم جھم پڑتی رہی مگر کوئی پریشانی دیکھنے میں نہیں آئی۔ سردیوں کا موسم تو سحر انگیز ہوتا تھا۔ روشن دن اور دھوپ مل کر موسم کا لطف دوبالا کرتے تھے۔ فروری کا تمام مہینہ آسمان رنگ برنگی پتنگوں سے سجا رہتا تھا۔ نیو کیمپس میں رات کو آسمان تاروں سے سجا نظر آتا۔ مینار پاکستان اور شاہی مسجد کے مینار سے پورے شہر کو واضح دیکھا جا سکتا تھا۔ اب سردیوں میں کئی کئی دن سورج ہی نظر نہیں آتا۔ فضا اتنی آلودہ ہو چکی ہے کہ تمام سردیاں آلودگی کا انڈیکس عروج پر رہتا ہے۔ بعض اوقات دن اور رات میں کوئی فرق ہی محسوس نہیں ہوتا۔ شدید بارش میں زندگی کے معمولات معطل ہو جاتے ہیں گویا لاہور کے موسموں کا حسن گہنایا جا چکا ہے۔ اگرچہ وہ لاہور لاہور نہ رہا اور وہ لوگ لوگ نہ رہے مگر بقول پطرس بخاری: ''لاہور کے کاٹے کا علاج نہیں، یہ ہم سب کا معشوق ہے اور معشوق ہی رہے گا۔''

یہاں پرانے معاشرتی ڈھانچے کی باقیات تک نظر نہیں آتیں۔ گذشتہ پینتالیس برسوں میں اس شہر نے کئی کروٹیں بدلی ہیں۔ شہر کے پھیلاؤ اور فاصلوں میں اضافہ انسانی تعلقات اور معاشرتی روایات پر بری طرح اثر انداز ہوا ہے۔ تعلقات و روابط کی کمرشلائیزیشن نے خلوص، محبت اور بھائی چارے کی روایات کو تہہ و بالا کر دیا ہے۔ انتہائی ناگزیر حالت اور مجبوری ہی اکثر ملاقاتوں کا سبب بنتی ہے ورنہ سوشل میڈیا کے ذریعے ہی کام چلا لیا جاتا ہے۔ لاہور آنے کے بعد چند پرانے دوستوں کو آواز دی مگر مکمل سکوت۔ چند ایک سے روایتی قسم کی ملاقاتیں ہی ہو سکیں۔ ہر کوئی زندگی کی بھاگ دوڑ میں اتنا مصروف ہے کہ ملاقات کا موقع پیدا کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ کسی سے ملنا طے ہو تو 50 سے 60 کلومیٹر دو طرفہ راستہ طے کرنا پڑتا ہے اوپر سے ٹریفک میں پھنس جانا معمولات میں شامل ہے۔ ان حالات میں گذشتہ دس برسوں میں بہت ہی محدود لوگوں سے ملاقات ہو سکی ہے۔ دوسری طرف کرونا نے دو سال کی مدت میں سارے سماجی ڈھانچے کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ بہت سے پیارے دوست پل بھر میں موت کے منہ میں چلے گئے جس سے ہر فرد رنج، دکھ اور درد کے احساس میں مبتلا ہو گیا۔ مالی سرگرمیوں کے شٹ ڈاؤن نے فرد کو نفسیاتی طور پر بہت متاثر کیا۔ میں نے گذشتہ دو برسوں میں معاشرتی سرگرمیوں میں خود کو فعال رکھنے کی کوشش کی۔ پہلے میں نے لاہور میں مقیم گورنمنٹ ہائی سکول ساہیوال کے کلاس دہم سیکشن سی سیشن 1969 کے دس سے بارہ کلاس فیلوز کو تلاش کیا اور ہم سب 53 سال بعد ائر فورس کلب میں پہلی بار ملے اور ایک اچھوتی مسرت سے ہم کنار ہوئے۔ ان کلاس فیلوز کے نام یہ ہیں۔ 1-سول انجینئر رانا سعید احمد ریٹائرڈ چیف انجینئر -2- انجینئر رانا محمد اکرم ریٹائرڈ (پاک عرب فرٹلائیزر ملتان)۔ 3- الیکٹریکل انجینئر نثار بزمی ریٹائرڈ ایکسین واپڈا 4- ٹیکسٹائل انجینئر سید قاسم رضا شاہ۔ 5- ڈاکٹر اعجاز احمد (پیتھالوجسٹ)۔ 6- محمد یاسین چودھری ریٹائرڈ ایگزیکٹو آفیسر الائیڈ بنک- 7- میجر ریٹائرڈ سمیع

انوری 8- طاہر بشیر سینئیر آفیسر ائرفورس پاکستان۔ 9- ایڈووکیٹ سید فضل محمود۔ اس کے بعد وٹس ایپ گروپ تشکیل دیا جس میں 1969 بیچ کے کیمبری ہینوسکول کے ساتھی بھی شامل تھے۔

میں 1974 میں لاہور آیا تھا اور 1978 میں اس سے جدا ہوا۔ 36 سال کے طویل ترین عرصے کے بعد 2014 میں دوبارہ یہاں شفٹ ہوا تو صاف ظاہر ہے یہ وہ لاہور تو نہیں ہوسکتا تھا جیسا میرے دور طالب علمی میں تھا۔ درمیان میں 36 برس کی طویل جدائی عملی زندگی کی مصروفیات میں گزر گئی۔ سروس سے ریٹائرمنٹ کے بعد یہاں شفٹ ہوا تو عملی زندگی کے تقاضوں سے فارغ ہو چکا تھا۔ دور طالب علمی اور سروس سے ریٹائر منٹ کے بعد دونوں ادوار میں کافی مماثلتیں ہیں۔ پہلا دور مثالیت پسندی (Idealism) پر مشتمل تھا جب پڑھنے لکھنے، آوارہ گردی، ادبی مجالس میں شرکت اور مستقبل کے حوالے سے خواب دیکھنے اور بے یقینی اور مالی بے فکری کا تھا۔ عملی زندگی کا سارا وقت لاہور سے باہر بیت گیا۔ اب جب دوبارہ یہاں منتقل ہوا ہوں تو عملی زندگی کے بعد کی ذہنی پختگی اور تجربہ تو ضرور ہے مگر مالی طور پر مکمل بے فکری کا دور ہے۔ البتہ جس مثالیت پسندی اور لاہور کی محبت میں دیکھے گئے خوابوں کی بنیاد پر میں یہاں آیا تھا وہ قدم قدم پر ٹوٹتے بکھرتے رہے۔ پہلے سے لاہور میں موجود کچھ پرانے دوست نئے معاشرتی منظرنامے میں حسب توقعات جواب نہ دے سکے۔ بہت سارے یہاں کی مصروفیات میں پھنسے دکھائی دیے۔ میں نے اپنے اضطراب کو ختم کرنے کے لیے توقعات کا باب بند کر دیا تو پرسکون ہو گیا۔ اب کچھ پرانے اور نئے دوستوں کی ایک مختصر تعداد ہے جن سے ہر سطح پر رابطہ رہتا ہے اور یوں زندگی رواں دواں ہے۔

آج سے 40 تا 45 سال قبل کے عرصہ کے دوران یونیورسٹی میں مختلف لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ کئی ایک سے گفتگو یا تبادلہ خیالات کی حد تک تعلق رہا۔ چند ایک سے تعلق کی ابتدائی صورت گری ہوئی مگر یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد پھر نام یاد رہ گئے، ملاقات نا ہوسکی۔ چند ایک سے بعد میں خطوط کے ذریعے رابطہ رہا جو کمزور ہوتا گیا۔ کچھ پتے صرف ڈائریوں میں لکھے رہ گئے۔ کچھ کو ابتدائی طور پر خط لکھے مگر جواب نہ آنے سے سلسلہ آگے نا بڑھ سکا۔ کچھ کے نام یاد رہ گئے۔ وہ دوست جن سے مستقل تعلق کی صورت برقرار رہی وہ اب بھی موجود ہیں۔ آئندہ سطور میں ان دوستوں، واقفوں اور آشناؤں کا ذکر کرنے جا رہا ہوں۔

سلیم اللہ خاں (ایڈووکیٹ، گوجرانوالہ): وولنر ہوسٹل میں مجھے کمرہ نمبر 19 الاٹ ہوا۔ اس میں پہلے سلیم اللہ خاں رہتے تھے۔ اونچے لمبے قد اور بہت اچھی شخصیت کے مالک تھے۔ رویے کے اعتبار سے بہت شفیق اور مہربان تھے۔ ان کے پاس ایک ریکارڈ پلیئر تھا اور پانچ چھ بہت اچھے اور مقبول گانوں کے ریکارڈ بھی تھے۔ میں اکثر ان گانوں کو سنا کرتا۔ اس سے اچھی موسیقی سننے کے میرے ذوق کو جلا ملی۔ ایک روز پرانی انارکلی

سے کھانا کھانے کے بعد انہوں نے پرانی انارکلی چوک کے دائیں کونے میں موجود دکان سے قلفی والا فالودہ کھلایا۔ پہلی دفعہ وہ لذیذ فالودہ کھانے کا لطف مجھے آج بھی یاد ہے۔ دو سال قبل جدید ذرائع کو استعمال میں لا کر انہیں تلاش کر لیا حالانکہ وہ سوشل میڈیا بھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ وہ لاہور میں شفٹ ہو چکے تھے۔ ان کی کسی عزیز ترین رشتہ دار خاتون کا انتقال ہوا جن کے شوہر سابق فوجی آفیسر خاوند عسکری 10 کے سیکٹر ایف میں رہائش پذیر تھے۔ خان صاحب نے فون پر اطلاع دی تو میں بھی اظہار افسوس کے لیے چلا گیا جہاں ان سے 43 سال کے بعد ملاقات ہوئی۔ گھر کی فضا سوگوار تھی لیکن ہم نے ایک دوسرے کے بارے میں تھوڑی بہت گفتگو کرنے کا موقع نکال لیا۔ ایک دفعہ ان کا فون آیا کہ میں کافی پینے کے لیے ان کے ہاں آؤں مگر میں شہر سے باہر تھا۔ اس کے بعد ملاقات نہیں ہو سکی۔

عبدالمجید (ایڈووکیٹ۔ از ہیڈ مرالہ۔۔ ضلع کچہری سیالکوٹ) وولنر ہوسٹل میں کمرہ نمبر 23 تھا۔ شعبہ اردو کے طالب علم تھے لیکن بن گئے وکیل۔ گذشتہ دو برسوں سے اکثر ان سے فون پر ملاقات ہو جاتی ہے۔ محمد یعقوب (آزاد کشمیر)۔ ہوسٹل فیلو اور شعبہ اردو کے طالب علم۔ ایک دو بار خطوط کے ذریعے رابطہ ہوا۔ گورنمنٹ کالج کوٹلی آزاد کشمیر میں اردو کے استاد تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا۔ یہ آزاد کشمیر کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جو بھارت کو زیادہ اہم اور فائدہ مند سمجھتے تھے اور پاکستان کے احسانات پر سوالیہ نشان لگاتے تھے۔ انوار قیوم نیازی۔ ہوسٹل فیلو اور اردو کے طالب علم جو سرکاری نوکری پر ذاتی کاروبار کو ترجیح دیتے تھے۔ ساہیوال سے ان کا تعلق ہے اور جہاں بھی ہوتے قہقہوں کی پھل جھڑیاں چھوڑتے رہتے۔ آخری بار نومبر 2017 میں ملاقات ان کے گھر ساہیوال میں ہوئی۔ ارشد باغی سے ظفر سیال سے ملاقات کرائی۔ اپنے نام کی طرح عام روش سے ہٹ کر تھے۔ جیالوجی کے طالب علم اور ہوسٹل نمبر 9 کے یہ رہائشی ایک فلمی رسالے "مصور" کے ایڈیٹر کے نائب ہونے کا فخریہ انداز میں اظہار کیا کرتے۔ بس یاد رہ گئے۔ پرویز کیانی شعبہ پنجابی بعد میں نیشنل بنک میں ملازمت اختیار کی۔ کسی نہ کسی طریقے سے وولنر ہوسٹل میں اپنے قیام کو طول دیتے رہے تب تک ملاقات بھی ہوتی رہی۔ نیشنل بنک پاکستان سے ریٹائر ہوئے تو درآمد شدہ معیاری کاسمیٹکس کا ذاتی کاروبار استوار کر لیا۔ بہت نرم خو اور خوش گفتار ہیں۔ کرونا نے ابھی اپنا تعارف ہی کرایا تھا جب ان سے طویل ترین عرصے کے بعد ملاقات ہوئی۔ فون پر رابطہ رہتا ہے۔

راشد متین۔ شاعر، ادیب، فلسفی۔ ان کی سیاسی وابستگی جماعت سے اتنی مضبوط تھی کہ ان کے نعرہ ساز کے طور پر سامنے آئے لیکن فکری اعتبار سے ہمارے ساتھ ہم آہنگ تھے۔ ایک دن میں نے ان کی پسندیدہ کتاب کے بارے میں پوچھا تو بتایا کہ "جمالیات کے تین نظریئے"۔ ان کے ساتھ مل کر کیمپس فورم بنایا تھا

جس کے تین چار اجلاس ہی ہو سکے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن میں تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر بنے، ڈاکٹریٹ کیا۔1986 کے دوران رحیم یار خان اپنے عزیزوں سے ملنے آئے تو مجھے بھی تلاش کرلیا یوں ان سے ملاقات ہوئی۔1997 کے دوران میں اسلامیہ یونیورسٹی کے طلبا وطالبات کے ہمراہ ایک مطالعاتی اور تفریحی دورے پر اسلام آباد میں تھا تو سٹوڈنٹس کی رہائشی سہولت کی درخوست کی مگر انہوں نے معذرت کر لی۔آخری ملاقات چولستان فورم بہاول پور کی ایک تنقیدی نشست میں ہوئی۔

سعید ظفر۔خانیوال سے تعلق۔والد وکیل، جماعتی ایسے کہ جماعت کے پینل سے یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے انتخابات میں جوائنٹ سیکریٹری منتخب ہوئے۔راشد متین سے ان کی جوڑی تھی۔دوستیاں ہم سے بھی تھیں۔ہوسٹل نمبر ایک میں رہائش پذیر تھے جہاں ان کے ٹیپ ریکارڈر پر باجماعت موسیقی سنی جاتی رہی۔سادہ اور معصوم بھی تھے۔جب انہی کے کمرے میں ممتاز کنول جیسے پھکڑ باز نے کہا کہ میں اپنے والد کے ایک پر کیف لمحے کا نتیجہ ہوں تو انہوں نے سر پیٹ لیا کہ کیا اتنی بولڈ گفتگو بھی ہو سکتی ہے۔بعد میں مقابلے کے امتحان میں ڈی ایم جی گروپ میں آئے، بہاول پور کی تحصیل یزمان میں اسسٹنٹ کمشنر تھے تو چولستان کی زمینوں کی الاٹ منٹ میں ان کا نام بھی آیا۔بہاولنگر میں ڈپٹی کمشنر بھی رہے۔بہاول پور کی ایک معروف شاعرہ سے ان کی دوستی کا چرچا بھی ہوا۔جب ان کے گرد انکوائریوں کا جال بُنا گیا تو جرمنی چلے گئے۔آج کل بھی کسی بیرونی ملک میں ہیں، ان سے آخری ملاقات ملتان میں ان کی بہن کی شادی پر ملتان میں بہاول پور کے دوستوں کے گروپ کے ساتھ ہوئی۔

محمد خالد ادیب، شاعر، نقاد غلام حسین ساجد کے اس بہترین دوست سے پاک ٹی ہاؤس میں مستقل ملاقات رہی۔اس وقت وہ خالد آفاقی تھے۔پنجاب کے محکمہ تعلیم کے کالج ونگ میں استاد بنے۔عبدالکریم خالد سے مل کر" مکتبہ خالدین" قائم کیا جو فائدہ بخش ثابت نہ ہو سکا۔میرا ان سے اس وقت فعال رابطہ ہوا جب میں گورنمنٹ کالج یزمان ضلع بہاول پور میں اور وہ گورنمنٹ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں پرنسپل تھے۔بہت بھلے مانس، صلح جو اور کم گو تھے۔صابر ایسے کہ اپنی بیشتر تخلیقات کو اشاعت پذیر نہ کر سکے۔کرونا کے پہلے وار کا نشانہ بنے اور اس دنیا سے اگلی دنیا کی طرف ترک مستقر کیا۔عاشق حسین انجم۔ہوسٹل فیلو، شعبہ اردو کے طالب علم۔تدریس کا پیشہ اپنایا۔زیادہ تر فیصل آباد اور لاہور کے کالجوں میں رہے۔طبیعت میں اضطراب اور عجلت ان کے بنیادی اوصاف ہیں۔پر خلوص اتنے کہ خلوص پیچھے رہ جاتا ہے اور یہ آگے نکل جاتے ہیں۔کسی دوست کا رابطہ نمبر نکالیں گے، ڈائل کریں گے تو رابطہ کسی اور سے ہو جاتا ہے۔بچھڑے دوستوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور انہیں دیگر بچھڑے دوستوں سے بھی ملاتے ہیں۔فون کی دوسری جانب اتنے رواں اور بلند آہنگ ہوتے ہیں کہ ان کو جواب

دینے کے لیے اور روکنے کے لیے اتنا ہی بلند آہنگ ہونا پڑتا ہے۔ گذشتہ دنوں اپنے بیٹے کے ولیمے میں بہت محبت سے بلایا۔ ہر وقت متحرک رہتے ہیں۔ فون پر رابطہ رہتا ہے۔

محمد رفیق بلوچ۔ ہوسٹل فیلو۔ شعبہ اردو۔ کامرس کالجز ونگ میں تدریس کا انتخاب کیا۔ کافی عرصہ اپنے علاقے جھنگ کے گورنمنٹ کامرس کالج کے پرنسپل رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور کا انتخاب کیا۔ ایک دن عاشق انجم نے انہیں بتایا کہ میں ان کی رہائش واپڈا ٹاؤن جی 3 بلاک کے قریب طارق گارڈنز میں رہتا ہوں۔ مجھے فون کیا کہ ابھی ملنا چاہتا ہوں۔ میں گھر نہ تھا لہٰذا مستقبل قریب میں ملنے کا وعدہ نبھوا مگر وہ ملاقات کبھی نہ ہو سکی کیوں کہ کرونا کے پہلے وار ہی نے انہیں ہم سے چھین لیا۔

میجر آفتاب ملک (ریٹائرڈ) میری جب ان سے 1975 کے دوران ساہیوال سے لاہور دوران سفر ملاقات ہوئی تو یہ کیپٹن تھے اور اس وقت نیلم وادی کے اٹھمقام پر ان کی پوسٹنگ تھی۔ میں نے انہیں بہت متاثر کن شخصیت، شفیق اور پرخلوص پایا۔ لاہور صدر میں جب بھی اپنے آبائی گھر آتے تو وہاں اور ہوسٹل میں ملاقات ہو جاتی۔ بہت انسپائر کرنے والی شخصیت ہیں، فوج سے پری میچور ریٹائرمنٹ لے لی۔ ان کے بیٹے نے ان کی وراثت کو آگے بڑھایا جو آج کل بہاول پور میں بریگیڈیئر تعینات ہیں۔ لاہور میں اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ غلام سرور: بہت خود ساز انسان جس نے اپنی صلاحیتوں سے بطور کسٹم انسپکٹر مقام بنایا۔ ایم اے کے کلاس فیلو ارشد بیگ نے تعارف کرایا۔ لاہور کے پہلے دور میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔

اب ذکر کچھ خاص دوستوں کا جن سے اب بھی رابطہ ہے یا جو ترک دنیا کر گئے وہ بھی میرے دل میں اسی طرح جاگزیں ہیں۔

ممتاز کنول شاعر اور ادیب، ایک مثالیت پسند اور خواب دیکھنے والا خوددار پنجابی اور اردو شاعر۔ اردو اور لا میں داخلہ فارم جمع کرائے مگر حالات نے لا کی طرف دھکیل دیا۔ زندگی کو اپنے ڈھب سے گزارنے والا۔ نیو کیمپس میں میرا روم میٹ بھی رہا۔ ادبی مباحث، ادبی مجالس و مشاعرے، پاک ٹی ہاؤس کے اجلاس، نیو کیمپس اور لاہور میں آوارہ گردیاں، ان سب کاموں میں اکٹھے رہے۔ ان کی دعوت پر دو بار فیصل آباد کے قریب ان کے گاؤں 209 / رب بھی جانا ہوا۔ 1984 کے دوران فیصل آباد جانے کا اتفاق ہوا تو ان سے میں خاص طور پر ملا۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ خطوط کے ذریعے البتہ رابطہ رہا۔ ایک خط میں انہوں نے اپنے جگر کی شدید بیماری کا ذکر کیا تھا۔ لاہور کے ایک انگریزی اخبار میں ان کی رحلت کی خبر پڑھی۔ ان کا ایک پنجابی شعر ہے۔ (نکی جیہی اک گل دا اوہنیں ایناں برا منایا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایڈا انکھاں والا سی اوہ فیر سفنے وچ نئیں آیا)۔ ڈاکٹر ناصر بلوچ: اردو کے استاد، شاعر و افسانہ نگار سرگودھا والے ساہیوال سے تعلق، میرے دوست

اور ہوسٹل فیلو۔ 1992 میں ان سے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں کافی عرصے بعد ملاقات ہوئی، اس وقت وہ ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھ رہے تھے۔ 2022 کا کوئی دن تھا میں ویلنشیا کیش اینڈ کیری میں موجود تھا کہ ایک صاحب اندر داخل ہوئے، ہماری جیسے ہی آنکھیں دو چار ہوئیں ہم گلے لگ کے ملے۔ یہ ملاقات تیس سال بعد ہو رہی تھی۔ اس کے بعد ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ حسن لطیف (موسیقار)۔ جا اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کے سو جا اور جس نے میرے دل کو درد دیا، اس شکل کو میں نے بھلایا نہیں جیسے لافانی گانوں کے موسیقار حسن لطیف سے میری ملاقات پاک ٹی ہاؤس میں ہوئی اور ان کے مطابق ان کا تعلق ماضی بعید میں ساہیوال کے ایک قریبی قصبے سے تھا، مجھے وہ سلیٹی بلوچ کہا کرتے۔ انہیں پلاؤ کھانے کا بہت شوق تھا اور تین چار مرتبہ وہ نیو کیمپس میں میرے ہوسٹل میں بھی آئے تو اپنی پسند کا پلاؤ کھا کر بہت خوش ہوئے بل کہ ان دنوں وہ ریڈیو سے وابستہ تھے اور منیر نیازی کی ایک غزل کی موسیقی ترتیب دے رہے تھے جس کو فریدہ خانم نے گایا تھا، وہ غزل فنی باریکیوں کی وضاحت کے ساتھ مجھے گا کر سنایا کرتے تھے۔ وہ غزل تھی (ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو۔۔۔ میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا۔) کیمپس فورم کے دو اجلاسوں میں بھی آئے۔ ذوالفقار علی بھٹو سے وہ جذباتی حد تک وابستہ تھے، ان کی سزائے موت پر عمل درآمد سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ اعصابی اور ذہنی انتشار کا شکار ہو گئے اور 54 سال کی عمر میں کراچی میں انتقال کر گئے اور ان کی تدفین بھی وہیں پر ہوئی۔

جیون سلطان (کالج کے استاد اور ٹی وی فنکار و گلوکار) ہوسٹل میں ان کا کمرہ میرے کمرے کے نیچے تھا، ان کی پیر فیملی جھنگ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کے درمیان واقع ایک معروف قصبے سے تعلق رکھتی ہے۔ ہمارے گاؤں میں کچھ لوگ اس فیملی کے مرید ہیں اور ان کے کزن آفتاب شاہ سال میں ایک بار اپنے ان مریدوں کے پاس آتے تھے۔ جیون سلطان کو اداکاری اور گلوکاری کا بہت شوق تھا۔ گانے کے پروگراموں کے علاوہ کچھ ڈراموں میں بھی انہوں نے کام کیا۔ ایک ڈرامہ تھا "جھوک سیال" اس میں اپنی ریکارڈنگ کے وقت مجھے بھی چند بار لے گئے۔ ان سے آخری ملاقات 1979 میں بہاول پور میں ہوئی جہاں ان کی پہلی تقرری ایس ای کالج میں ہوئی۔ ناصر بلوچ ان سے مستقل رابطے میں تھے، معلوم ہوا کہ وہ کرونا کی وجہ سے تین ماہ وینٹی لیٹر پر رہے اور اللہ نے کرم کیا اور وہ صحت یاب ہوئے۔

زبیر خان۔ ڈپٹی ڈائریکٹر آرٹس کونسل، ٹی وی ڈرامہ فنکار۔ میری ان سے ملاقت 1974 میں ڈسٹرکٹ کورٹس لاہور میں ہوئی، ٹوبہ ٹیک سنگھ کی تحصیل رجانہ کے قریب ہماری برادری کے بہت سے گاؤں ہیں۔ ان کا تعلق چک نمبر 84 /گ ب سے تھا۔ انہوں نے میری بہت رہنمائی کی۔ ایک بار میں نے ان سے کہا کہ میں لاہور سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتا ہوں تو کہنے لگے، " گھبراؤ مت، وقت آپ کا بہترین استاد ہے۔"

جیون سلطان سے مل کر انہوں نے پنجابی ڈراموں میں پنجاب کے مقامی اور باروالے کلچر کی شاندار عکاسی کی۔ ریٹائرمنٹ کے چند سال بعد گاؤں چلے گئے جہاں ان کا انتقال ہوا۔

زاہد مسعود (شاعر، مزاح نگار، تمغہ حسن کارکردگی) ایک دل بہار شخصیت، ان کے قہقہوں کا منفرد اُسلوب تھا۔ احسن محبوب اور ممتاز کنول کے ساتھ میری دوستی تھی اور ہم چاروں نے لاہور کی خوب خاک چھانی۔ کوئی مشاعرہ اور ادبی مجلس نہیں چھوڑی۔ لاکرنے کے بعد لیبر کے محکمے میں ملازمت اختیار کی اور 2019 کے دوران ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ جب ان کے قریبی دوست اور محکمہ خوراک کے افسر شرجیل انظر کی تعیناتی بہاول پور میں ہوئی تو بہاول پور آئے اور مجھے بھی ملے۔ بعد میں ایک بار اپنے دوست شاعر افضال نوید کے ساتھ رحیم یار خان جاتے ہوئے میرے گھر بہاول پور تشریف لائے۔ لاہور میں متعدد بار ملاقاتیں ہوئیں۔ سروس سے ریٹائرمنٹ کے بعد الزائمر کا مرض لاحق ہوا۔ 25 دسمبر 2024 کو ان کے انتقال کی خبر ملی، بہت دکھ ہوا۔

غلام حسین ساجد (کالج کے استاد اور شاعر وادیب) سب سے پرانے دوست ور ہنما۔ وولنر ہوسٹل سے شروع ہونے والا تعلق جس نے لاہور کے ادبی حلقوں سے متعارف کرایا۔ میاں چنوں سے تعلق۔ ہم دونوں پنجاب اور باروں کے مقامی کلچر اور تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں سکول ہی سے لکھنے لکھانے کا شوق تھا جس کو مہمیز لاہور میں ملی۔ لاہور کے ادبی حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت، ان کی شاعری اور نثر کی متعدد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ یونیورسٹی کے بعد ان سے ملاقات ملتان میں ہوئی جہاں وہ کالج میں استاد تھے۔ اب لاہور میں ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ جب بھی ملیں اپنی کتابوں کا تذکرہ خوب کرتے ہیں اور مجھے بھی ان سے لکھنے کی تحریک ملتی ہے۔ تین سال قبل حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری کی حیثیت سے اچھی روایات قائم کر کے خوب داد سمیٹی۔

ڈاکٹر اقبال شاہد۔ (یونیورسٹی کے استاد، محقق، شاعر) ان سے میرے تعلق کو پینتیس سال ہو گئے۔ 1988 میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے شعبہ فارسی سے منسلک ہوئے۔ ان سے پہلی ملاقات بورڈ آف سٹڈیز میں ہوئی۔ بھلے انسان لگے۔ بعد میں رحیم یار خان بھی تشریف لائے۔ فارسی مضمون کی اشاعت وترقی ہمارا مشترکہ نصب العین رہا ہے۔ فروری 1992 میں بورڈ آف سٹڈیز کا اجلاس تھا تو ملتان کے ایرانی ثقافتی مرکز میں یوم آزادی کی تقریب میں شرکت کے لیے اسلامیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی سربراہی میں ایک وفد نے شرکت کی، ڈاکٹر اقبال شاہد کی دعوت پر میں بھی ساتھ ہولیا۔ بہاول پور میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ جب میں بہاول پور منتقل ہوا تو یہ ڈاکٹریٹ کے لیے تہران یونیورسٹی جا چکے تھے۔ جب بھی پاکستان آئے ملاقات ضرور

ہوتی۔ جب میں اسلامیہ یونیورسٹی میں ڈیپوٹیشن پر آیا تو سب سے زیادہ خوشی انہیں ہوئی۔ واپس آئے تو اسلامیہ یونیورسٹی والوں نے ان جیسے سکالر کی قدر نہ کی اور انہیں پنجاب یونیورسٹی میں بلا لیا گیا۔ چند برس بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ فارسی سے بحثیت پروفیسر وابستہ ہوئے اور دو مدتوں کے دوران متعلقہ فیکلٹی کے ڈین بھی رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آج کل گورنمنٹ کالج ہی میں پروفیسر ایمریطس ہیں۔ ڈاکٹر اقبال شاہد بہت اچھے دوست، مقبول ترین استاد، بہترین انسان اور منفرد اسلوب کے اردو اور فارسی کے شاعر ہیں۔ لاہور میں انہوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور اپنے کالج میں مختلف مواقع پر متعدد بار مجھے بلا چکے ہیں۔ طبیعت میں مٹھاس اور موقع کی مناسبت سے جاندار قہقہہ بھی ان کی پہچان ہیں۔ ان کے بارے میں یہ کہنا بھی مناسب ہوگا کہ ''بالای سرش ز ہوشمندی۔۔می تافت ستارہ بلندی''۔ ان کی زیر تربیت ان کے چھوٹے بھائی غلام اکبر نے بھی ان کی پیروی میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور سے فارسی میں ایم اے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں اور آج کل گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں اور اپنے بڑے بھائی کی اتباع میں ان کی میراث کو لے کر چل رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمد سلیم مظہر (یونیورسٹی کے استاد، محقق): پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فارسی سے دسمبر 1988 میں وابستہ ہوئے۔ غالباً دو بار مختصر مدت کے لیے اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی میں ڈیپوٹیشن پر آئے۔ ان سے پہلی ملاقات ملتان جانے والے وفد میں ہوئی مگر ان سے ملنے اور ان کی شخصیت کے اسلوب سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں ان سے پہلے بھی کئی بار مل چکا تھا۔ اس کے بعد یہ تہران یونیورسٹی چلے گئے جہاں سے انہوں نے ایم اے فارسی کے بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ چوں کہ ان کے کریڈٹ میں مطلوبہ معیار سے کہیں زیادہ تحقیقی کام تھا اس لیے 1999 کے دو ماہ کے دوران ہی وہ اسسٹنٹ پروفیسر اور ایسوسی ایٹ پروفیسر لیے گئے۔ بعد میں پروفیسر ہوئے۔ طویل عرصہ صدر شعبہ فارسی اور اورینٹل فیکلٹی کے ڈین رہے۔ پرو وائس چانسلر اور قائم مقام وائس چانسلر کے طور پر بھی کام کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آج کل وہ ادارہ فروغ قومی زبان اسلام آباد میں ڈائریکٹر جنرل کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ جب بھی لاہور آنا ہوتا ان سے ملاقات لازمی ہوتی۔ وہ بھی کسی نہ کسی اسائنمنٹ کے بہانے بلاتے رہتے تھے۔ ڈیرہ غازیخاں اور راجن پور کے پسماندہ علاقے سے نکل کر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے فارسی کرنا، پی ایچ ڈی کے لیے ایران جانا، تحقیق میں نام پیدا کرنا اور لیکچرار سے پروفیسر اور پرووائس چانسلر سے اسلام آبار کے قومی زبان کے ایک مقتدر ادارے کے سربراہ بننے تک کا سفر کامیابی سے طے کرنا اس لیے ممکن ہوا کہ بقول سعدی شیرازی ''از عہد خردی آثار بزرگی در ناصیہ او پیدا'' ان کا اخلاق، انکساری اور محبت بھرا انداز ہر ایک کو اپنا گرویدہ بناتا رہا ہے۔

اب تین ایسے دوستوں کا تذکرہ جو لاہور کے دور طالب علمی میں ایک جان چار قالب تھے۔ ہمارا کلچر، تہذیب اور زبان ایک، خاندانی پس منظر ایک جیسا جس نے ہمیں جوڑے رکھا اور اب بھی ہم چاروں ریٹائرمنٹ کے بعد بھی لاہور میں ہیں اور ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں بل کہ ہم چاروں کی دوستی ہماری اگلی نسل یعنی ہمارے بچوں کی طرف بھی منتقل ہوئی ہے۔

ظفر علی خاں سیال۔ شورکوٹ کے قریب چناب کی دریائی پٹی میں واقع گاؤں "خاکی لکھی" سے تعلق رکھنے والا کل کا یہ نوجوان آج کا تجربہ کار قانون دان ہے جو کئی مشکلوں کو روندتا ہوا لاہور پہنچا تھا۔ "مومن" ہونے کی وجہ سے گفتار کا غازی ٹھہرا۔ اپنے قریبی رشتہ دار پروفیسر محمد فیض کی تربیت نے لاہور میں رہنا آسان بنا دیا۔ ملتان کے لا کالج سے پہلے سال کا امتحان پاس کیا مگر لاہور آ کر ایم اے اردو میں داخلہ لے لیا اور ہوسٹل نمبر 9 میں رہائش ملی۔ مالی طور پر مشکلات کی کربلا طے کرتے ہوئے اس نوجوان نے یونیورسٹی میں زیر تعلیم مومنین کو اکٹھا کیا اور امامیہ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (ISO) کی بنیاد رکھی اور اس کا بانی صدر قرار پایا اور بے حد مقبولیت سمیٹی۔ سماجی طور پر بہت فعال رویہ اختیار کیا۔ ایم اے اردو کے بعد یکم جون 1978 سے وزیر علی انڈسٹریز کے سیلز کے شعبے میں ملازمت اختیار کی جس میں بزنس ٹور زیادہ تھے۔ اس ملازمت سے مالی آسودگی ملی تو ایل ایل بی کا امتحان مکمل کیا اور وکالت کے پیشے کو ترجیح دی اور بطور ایڈووکیٹ لاہور کی بار کونسل میں مقبولیت ملی اور سماجی سطح پر واقفیت اور تعلقات اور مالی طور پر آسودگی میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ میں جب بھی لاہور آتا تو یہی میرے میزبان ہوتے۔ انفرادی تعلق بڑھ کر گھریلو تعلقات میں بدل گیا۔ پہلے کرائے کے مکان میں تھے۔ گلشن راوی میں ذاتی مکان کے مالک بنے۔ آج کل آثار بزرگی کی وجہ سے وکالت کے شعبے سے ان کی وابستگی کم ہے۔ پی سی ایس آئی آر ہاؤسنگ سوسائٹی کی جانب ایک کشادہ گھر میں رہتے ہیں۔ اپنی مادری زبان کو بہت مؤثر انداز میں بولتے ہیں اور دوستوں سے رابطہ رکھتے ہیں۔ میرے لاہور میں آمد کے بعد ہماری ملاقاتوں میں بھی اضافہ ہوا۔ زندہ دلی اور بہترین انداز بیان کے ساتھ گپ شپ کے ماہر ہیں۔

محمد علی بلوچ کا تعلق ایک زمیندار اور سیاسی خاندان سے ہے۔ سنٹرل ماڈل سکول کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے انٹر اور فارسی زبان و ادب میں بی اے آنرز کیا اور پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج سے ایم اے کیا جہاں ہماری ملاقات ہوئی اور کلاس فیلو ہونے کے ساتھ زبان اور کلچر کے اشتراک نے دوستی کی صورت اختیار کی۔ ان کے بڑے بھائی میاں ناصر علی بلوچ اس وقت پنجاب اسمبلی کے رکن تھے جن سے پیپلز ہاؤس میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں، بعد میں وہ قومی اسمبلی کے رکن اور وزیر بھی رہے۔ محمد علی کی براہ راست اے کلاس تحصیلدار تقرری ہوئی۔ بنیادی اور ضروری تربیت کے بعد ان کی پہلی پوسٹنگ چنیوٹ میں ہوئی۔ یہیں پر تحصیلدار، مجسٹریٹ اور

اسسٹنٹ کمشنر رہے۔مختلف مراحل میں ترقی کرتے ہوئے فیصل آباد میں اہم تعیناتیوں پر ہوتے ہوئے الحمرا آرٹس کونسل کے ایگزیکٹوڈائریکٹر کے طور پر کام کیا اور پنجاب کے ریونیو بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے مجھ سے ایک سال بعد ریٹائر ہوئے اور لاہور کینٹ میں گھر بنا کر مستقل رہائش اختیار کی۔کئی دفعہ ان کے گاؤں " کنجوانی" نزد تاندلیانوالہ جانے کا اتفاق ہوا۔ضرورت کے مطابق اردو بھی بولتے ہیں لیکن وہ عام طور پر اپنی مادری زبان کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت سنجیدگی اور شگفتگی کا اچھا امتزاج ہے۔

کرنل ریٹائرڈ ممتاز بکھر۔بھلوال کے قریب قصبہ للیانی سے تعلق رکھنے والے ممتاز بکھر سے ظفر سیال نے تعارف کرایا جو نیو کیمپس میں آنے کے بعد دوستی میں تبدیل ہو گیا۔ان کی طبیعت میں نرمی اور شریفانہ مزاج کے وصف نے بہت متاثر کیا۔ یہ نیو کیمپس کی ہوسٹل نمبر 14 اور میں ہوسٹل نمبر 19 میں رہائش پذیر تھے اور تقریباً ہر روز ہی ملاقات اور گپ شپ رہی۔ایم ایس سی ریاضی میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔1978 میں ان کی شادی میں شرکت کے لیے ان کے قصبے للیانی تحصیل بھلوال جانے کا اتفاق ہوا۔پاکستان آرمی کی ایجوکیشن کور کے لیے منتخب ہوئے۔بیچ میں ہمارا رابطہ منقطع ہو گیا مگر جہاں بھی سراغ ملتا خط کے ذریعے رابطہ ہو جاتا۔ان کی بڑی بیٹی قائداعظم میڈیکل کالج بہاول پور میں ایم بی بی ایس کی طالبہ تھیں تو کرنل ممتاز نے بہاول پور کور ہیڈ ہوارٹر میں جی ایس او 1 ایجوکیشن ٹرانسفر کرا لی اس طرح بہاول پور میں متعدد ملاقاتیں مع فیملی ہوتی رہیں۔چھوٹی بیٹی گرلز کالج میں میری بیٹیوں کی کلاس فیلو اور دوست تھی۔اس کے بعد لاہور چلے گئے اور وہیں سے ریٹائر ہو گئے۔عسکری 10 کے سیکٹر بی میں انہیں گھر الاٹ ہوا جس میں مستقل رہائش اختیار کی۔لاہور میں ہمیں بھی عسکری 10 میں مکان کرائے پر لے کر دیا جہاں ہم تین سال رہے۔

میں نے ان تین دوستوں کو ایئر فورس آفیسرز کلب میں کھانے کی دعوت دی جس میں میرے بیٹے وجاہت نسیم، کرنل ممتاز کے بیٹے شرجیل ممتاز اور محمد علی کے بیٹے سلمان نے بھی شرکت کی۔میرے بعد محمد علی نے اپنی کلب میں دعوت کا اہتمام کیا جس میں پہلی دعوت والے تمام دوستوں اور بیٹوں نے شرکت کی۔یوں ہی یہ دعوتیں ہوتی رہیں گی اور ہم ایک ہی زبان و ثقافت کے پچاس سال پرانے دوست ملتے رہیں گے۔

کم مئی 2013 میری ریٹائرمنٹ کا پہلا دن تھا۔اب میرے پاس زندگی گزارنے کی بہت سی ترجیحات تھیں جن میں سے میں نے خود کو مستعد رکھنے کا انتخاب کیا۔گھٹنوں کی خرابی کی چوتھی سٹیج مجھے مجہولی کیفیت سے دوچار کر سکتی تھی لیکن میں نے اسے اپنے اوپر سوار نہیں ہونے دیا۔ماضی کی طرح حسب معمول ایک کمرہ خاص طور سے تیار کیا جسے آپ "سٹڈی"

کا نام دے سکتے ہیں۔ابھی انٹرنیٹ کے ذریعے بہت زیادہ موادنہیں آیا تھا۔اس کمرے میں اپنی لائبریری کتب کوترتیب دیا۔سیٹلائیٹ ڈش کے پیکج حاصل کیے۔تفریح اور مطالعہ ساتھ ساتھ چلتا رہا۔لاہور آ گئے تو زیادہ ترقی یافتہ صورت میں ڈیجیٹل سہولتوں کا حصول ممکن ہوا جس میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔اب اتنا مواد (Content) ہے کہ " کیا دیکھیں اور کیا چھوڑیں" کا مسئلہ درپیش ہے۔کتب کی شکل میں لائبریری بھی بڑھتی رہی۔سوفٹ بکس بھی ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوگئیں مگر ہارڈ بکس والا لطف نہیں آتا۔ بلا مبالغہ ہزاروں دستاویزی فلموں تک رسائی ہے۔کوئی گانا،فلم یا ڈرامہ ایسا نہیں جو دسترس میں نا ہو۔تفریحی ومعلوماتی مواد کے بڑے وسائل یعنی ڈش ٹی وی، یوٹیوب، پرائم وِڈیو اور نیٹ فلکس ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ یوٹیوب پر دو چینلز بنائیں۔ایک چولستان ڈیجیٹل فورم جو بہاولپور کی تاریخ کے موضوعات پر تھا۔دوسرا چینل رینبو انفونیٹ ورک جس پر ''پرنسپلز ورک شاپ'' کے عنوان سے سات لیکچرز پوسٹ کیے۔ چونکہ میری دونوں چینلز انتہائی سنجیدہ اور تحقیقی نوعیت کی تھیں اس لیے ریکارڈنگ میں بہت محنت لگتی تھی اور وِڈیو ایڈیٹنگ کے بھی مسائل تھے اس لیے وہ جاری نہ رہ سکیں۔آؤٹ ڈور کے لیے ائرفورس (فالکن) کلب کی رکنیت حاصل ہے مگر رکنیت کے بعد معلوم ہوا کہ یہ کلب ہمارے معیارات سے ماورا ہے۔ابھی تک خود گاڑی چلانے کو ترجیح دیتا ہوں۔ڈیوٹی پر جانے والوں کی طرح ہر روز تیار ہوتا ہوں، آؤٹ ڈور یا سٹڈی روم، فیصلہ ایک دن پہلے کر لیتا ہوں۔ 2025 کے دوران کم از پانچ کتب کی اشاعت کا منصوبہ بنایا تھا۔ایک شائع ہو چکی۔ایک پریس میں جانے کو تیار ہے جب کہ تین پر تین چوتھائی کام مکمل ہو چکا ہے۔دستاویز کے مطابق یکم مئی 2025 کو عمر کا تہترواں سال شروع ہو چکا ہے،سانسوں کی ڈور سے بندھا یہ سفر جب تک قادرِ مطلق اجازت دے گا، رواں دواں رہے گا مگر آخر میں "جب لاد چلے کا بنجارا" کا مرحلہ آئے گا تو خوشی خوشی چل دیں گے۔اللہ تعالیٰ آخرت بخیر فرمائے!!!

ریت کے ذروں سے روشنی کی کرنوں تک

ہمعصر نسل کے ستر سال کی داستان

1950 کی دہائی میں پیدا ہونے والی میری ہم عصر اور تھوڑی بہت استثنا کے ساتھ ہم عمر نسل گذشتہ ستر سال کے دوران دنیا میں درآنے والی تبدیلیوں اور انقلابات کی چشم دید گواہ ہے۔ میری پیدائش سے بہت پہلے 1930 کی دہائی کے آخر اور 1940 کی دہائی کے وسط تک چھ سال اور ایک دن جاری رہنے اور لاکھوں افراد کو کھا جانے والی دنیا کے ستر ممالک کے درمیان ہونے والی جنگ عظیم دوم کے بعد دنیا کی نئی صورت گری ہو چکی تھی۔ ہولوکاسٹ میں 11 سے 17 ملین یہودی مارے جا چکے تھے۔ نوآبادیاتی عہد اپنے انجام کو پہنچ رہا تھا۔ چالیس کی دہائی میں ٹرانسسٹر ریڈیو ایجاد ہو چکا تھا جب کہ کمرشل ٹیلی ویژن، کوانٹم تھیوری اور نیوکلس فزکس، جیپ، جیٹ ائیر کرافٹ پر ترقیاتی کام جاری تھے۔ 1949 میں امریکی راکٹ میں بندر کی صورت میں ایک ممالیہ جانور کو خلا میں بھیجا جا چکا تھا۔ اسرائیل کا قیام اور عرب اسرائیل جنگ کے واقعات رونما ہو چکے تھے۔ امریکہ جاپان کی سول سوسائٹی پر ایٹم بم گرا کر انسانی تاریخ اور دنیا کا عظیم ترین المیہ لکھ چکا تھا۔ دنیا دو بلاکس میں تقسیم ہو کر سرد جنگ کا آغاز کر چکی تھی۔ برصغیر دوسری جنگ عظیم کے مابعد نتائج اور قرارداد لاہور کی روشنی میں تقسیم ہو کر آزاد ہندستان اور پاکستان کی صورت اختیار کر چکا تھا اور دونوں ممالک میں قتل و غارت کی داستانیں رقم ہو چکی تھیں اور پاکستان اپنی بقا اور سیاسی استحکام کی جنگ لڑ رہا تھا۔ بجلی کے ریڈیو عام ہو چکے تھے۔ گراموفون اور ریکارڈ پلیئر بھی متعارف ہو چکے تھے۔ فلم سازی کی روایت بھی مستحکم ہو چکی تھی۔ اگرچہ انڈیا میں 1937 کے دوران "کسن کنیا" سنی کلر پر بننے والی پہلی رنگین فلم تھی مگر چالیس کی دہائی میں رنگین اور سیاہ و سفید دونوں قسم کی فلمیں بن رہی تھیں۔ پچاس کی دہائی کے نصف اول میں میری پیدائش ہوئی اور 1958 میں سکول داخل کیا گیا اس طرح سے میری زندگی کی پہلی دہائی پچاس کی بنتی ہے۔ یہ دہائی بھی کئی اسباب سے اہم ترین دہائی تھی۔ اس دہائی کو "سرمایہ داری کا سنہری" دور کہا جاتا ہے جس میں سرمایہ دار نے بہت منافع کمایا اور مزدوروں کو شاندار اجرتیں نصیب ہوئیں۔ اس دور کو اٹامک اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے بھی یاد رکھا جاتا ہے۔ اس دہائی میں عرب اسرائیل تنازعہ، روس اور امریکہ کی سرد جنگ میں شدت، پہلی انڈو چائنا جنگ، سویز نہر کا بحران، کورین جنگ، جنگ ویتنام کا آغاز، فائیڈل کاسترو کا کیوبن انقلاب، ایران میں مصدق کی

حکومت کا خاتمہ، روس کے مصنوعی سیارے سپوتنک کی پرواز، پہلی پسنجر جیٹ سروس، پہلا کامیاب الٹرا ساؤنڈ ٹیسٹ، ماسکو میں پہلے نیوکلئیر پاور پلانٹ کا قیام، ناسا کی تنظیم، موسیقی میں راک اور رول کی مقبولیت، ٹی وی کی مقبولیت اور 50 لاکھ ٹی وی سیٹس کی فروخت، ہالی وڈ کی فلم بن حر کی مقبولیت اور گیارہ اکیڈمی ایوارڈز کی جیت اور امریکی صدر کینیڈی کی انتخابات میں جیت جیسے اہم واقعات پر مشتمل تھی۔ برصغیر پاک و ہند میں جو پارٹیشن کے وقت پانچ لاکھ لوگ مارے گئے تھے اور ایک بڑی تعداد مہاجرت کی اذیت سے گزر چکی تھی اس نے یہاں کے معاشرتی ڈھانچے کو ہلا کر رکھ دیا تھا جس کے اثرات دیر تک محسوس ہوتے رہے۔ ہندوستان نے تو 1935 کے آل انڈیا ایکٹ کی جگہ اپنا آئین 26 جنوری1949 کو منظور کر لیا جس کا نفاذ26 نومبر 1950 سے کیا گیا اور جاگیرداری کا مکمل خاتمہ کر دیا۔ پاکستان میں1956 تک سات وزرائے اعظم کا تجربہ کیا گیا اور جاگیرداری نے اپنے پنجے یہاں کی سیاست و معاشرت میں مضبوطی سے گاڑ لیے۔ 1950 کی دہائی میں ہندوستانی سینما نے شاہکار پیش کیے جن کی موسیقی بھی بہت پسند کی گئی۔ پاکستان میں بھی فلم انڈسٹری بہت پھلی پھولی اور پہچان بنائی۔ 50 کی دہائی میں کل 211 فلمیں بنائی گئیں جن میں 50 فلمیں پنجابی اور باقی اردو تھیں۔

یکم مئی 1958 سکول میں میرا پہلا دن تھا اور اس کے چھ ماہ بعد ایوب خان نے مارشل لا لگا دیا۔ اس کے چند ماہ بعد میں نے لوگوں کو جو کہتے سنا اس کا ایک مبہم سا تاثر میرے ذہن میں تازہ ہے۔ لوگوں نے گوشت کی دکانوں پر جالیوں کا لگنا، تولنے کے باٹ اور ماپنے کے پیمانوں کی چیکنگ کا عمل اور ماضی میں اغوا شدہ عورتوں کو مارشل لا کے حکم کے تحت واپس کیے جانے کو بہت سراہا۔ 1960 کے قریب ہمارے گاؤں کا ایک شوقین مزاج نور احمد بجلی والا ریڈیو خرید کے لایا تو گاؤں والوں نے اسے بہت حیرت سے لیا اور آواز کے آتے وقت وہ ریڈیو کے پچھلی جانب بولنے والے لوگوں کو جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرتے۔ اس وقت ریڈیو پاکستان کی مختلف وقفوں سے تین مجالس کی نشریات پیش کی جاتیں۔ پہلی مجلس صبح ساڑھے چھ سے ساڑھے آٹھ بجے تک ہوتی اور اس میں پاپولر میوزک کا شائبہ تک نا ہوتا۔ دن کو ساڑھے گیارہ بجے سے ڈیڑھ بجے کی مجلس ہوتی جس میں آدھ گھنٹے کے لئے فلمی گانے بھی پیش کیے جاتے۔ اس وقت ریڈیو کو تفریحی پروگراموں کے لیے ہی اہمیت دی جاتی اس لیے سیلون اور آل انڈیا زیادہ سنے جاتے تھے۔ ریڈیو پاکستان لاہور کی شام کی مجلس پانچ بجے کی خبروں سے شروع ہوتی اور رات نو بجکر تیس منٹ تک جاری رہتی۔ اس کے علاوہ اردو نشریات کہیں نہ سن پاتے۔ صبح اور شام کے اوقات میں ریڈیو سیلون سے بھارتی گانوں کے پروگرام سنے تو جاتے مگر شارٹ ویو پر اور ان کے ٹرانسمیٹر بہت کمزور ہوتے۔ شہروں میں شادیوں کے لیے لاؤڈ سپیکر کرائے پر ملتے جو ہارن

کے علاوہ ایک مشین اور وینائل ریکارڈ ز کے ایک باکس پر مشتمل ہوتے۔مشین کو بیٹری سے آن کیا جاتا اور ہر ریکارڈ پرنئی سوئی لگانی پڑتی جو ایک بار ہی استعمال ہوتی اور وقت بتانے والی گھڑی کی طرح ہر ریکارڈ چلانے سے پہلے چابی بھری جاتی۔گاؤں میں میرے نانا کے ہاں بجلی کا ریڈیو آیا تو کئی ایسے سٹیشن بھی ہوتے جن کی سمجھ نہیں آتی تھی مگر لوگ حیرت کے ساتھ انہیں بھی سنتے۔لاؤڈ سپیکر گاؤں میں شادیوں پر کرائے پر لائے جاتے۔ہم چھوٹے تھے اور کئی گانوں کو نہیں سمجھ پاتے تھے جیسے ''دیساں دا راجہ اور مل وکدا سجن مل جاوے۔لے لواں میں دل ویچ کے'' مجھے آج بھی یاد ہیں۔

1960 کی دہائی کئی اعتبار سے بہت اہم تھی۔فی الحال گاؤں میں چار یا پانچ عدد بجلی والے ریڈیو تھے۔ٹیلیفون کا تصور شہروں میں ابھی عام نہیں ہوا تھا۔بڑے شہروں میں چار اور باقی شہروں میں دو اور تین ہندسوں پر مشتمل فون نمبر تھے۔چھوٹے شہروں میں لوکل کال بھی فون آپریٹر کے ذریعے ملائی جاتی۔کسی دوسرے شہر میں بات کرنے کے لیے سادہ اور ارجنٹ کال کرنے کے لیے ٹیلیفون کے ایکسچینج میں کال کر کے کال بک کرانا پڑتی تھی جسے ٹرنک کال کہا جاتا تھا۔کال جلد ملوانے یا مفت کال کرنے کے لیے سفارش یا رشوت چلتی تھی۔ایکسچینج کے آپریٹر کی بہت اہمیت تھی۔کسی دوسرے شہر میں کوئی خوشی یا خصوصاً موت کا پیغام بھیجنے کو تار بھیجنا کہتے تھے۔ہر ٹیلیفون ایکسچینج میں ایک شعبہ تار اور ٹیلیگراف کا ہوتا تھا جہاں ایک یا زائد ٹیلی پرنٹر پڑے ہوتے۔پیغام کو ایک کاغذ پر لکھ کر فی لفظ کے حساب سے فیس ادا کرنا پڑتی تھی جسے ٹیلی پرنٹر پر ٹائپ کر کے مطلوبہ شہر کے ٹیلی پرنٹر پر بھیج دیا جاتا تھا۔ٹیلی پرنٹر سے ٹائپ شدہ پیغامات کا کاغذ علیحدہ کر کے ہر پیغام کو تار کے ایک فارم پر چپکا دیا جاتا اور ٹیلیفون کا ہرکارہ اسے متعلقہ پتے، گھر یا فرد تک پہنچا دیتا۔عموماً تار کو "موت کے پیغام" کے لیے زیادہ استعمال کیا جاتا۔اس دور میں اگر کسی کو ایسا خط ملتا کہ جس کا کونا کٹا ہوا ہوتا تو وہ اس بات کی نشانی تھی کہ خط میں کسی کی وفات کی خبر ہے۔عید کارڈز کے علاوہ عید کی تہنیت کے پیغامات بھی اکثر تار کے ذریعے بھیجے جاتے جس کے لیے اچھا اور خوبصورت چھپا ہو کاغذ استعمال کیا جاتا۔ہر اخبار کے نیوز سیکشن میں ایک یا ایک سے زائد ٹیلی پرنٹرز ہوتے تھے جس پر اندرونی اور بیرونی اخباری ایجنسیاں خبریں بھیجا کرتیں۔ٹیلی پرنٹرز کی ٹِک ٹِک کا بہت شور سنائی دیتا۔اردو کے اخبارات کی نیوز ڈیسک ٹیم ان خبروں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتی۔ان ایجنسیوں کو ایک خاص شرح سے اخبارات ادائیگی کرتے تھے۔مقامی نمائندگان اپنی خبریں بذریعہ ڈاک بھیجتے یا ٹیلیفون پر ہی لکھایا کرتے۔ہر نمائندے کو اس کی چھپنے والی خبر کے کالم کی پیمائش کے اعتبار سے ادائیگی کی جاتی۔پاکستان میں ریلوے اپنی ٹرینوں کے لیے ابھی سٹیم انجن ہی استعمال کرتی تھی۔اِکا دُکا لمبے روٹ کی ٹرینوں کے لیے ڈیزل انجن کا استعمال بتدریج شروع ہو چکا تھا۔پاکستان میں 1964 میں

پہلی بار ٹیلی ویژن نشریات کا آغاز ہوا لیکن یہ بہت محدود پیمانے پر تھا۔نشریات کا دورانیہ اور دائرہ کار بہت محدود تھا۔ چھوٹے سائیز کی ٹویوٹا کرولا کار کے ماڈل بہت مقبول ہوئے جن کی قیمت پندرہ ہزار روپے تک ہوتی ۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان 1965 کی جنگ سے پاکستانی قوم ایک نئے جذبے سے سرشار ہوئی۔اس کے بعد پاکستان میں ہندوستانی فلموں کی نمائش پر پابندی لگ گئی۔اس دہائی میں ملکہ ترنم نور جہاں اور مہدی حسن کی گائیکی کی نئی جہتیں سامنے آئیں۔اس دہائی کے دوران پاکستان میں ساڑھے سات سو فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں ساڑھے چارسو اردو، 65 پنجابی اور دیگر متفرق تھیں۔ پاکستان کی پہلی جزوی رنگین فلم منشی دل نے عذرا بنائی جس کے صرف گانے رنگین تھے لیکن پہلی مکمل رنگین فلم نائلہ تھی جو اسی کی دہائی میں ریلیز ہوئی۔ میں اس سے قبل پانچویں کلاس میں عارف والہ کی کچی ٹاکی میں "شیخ چلی" اور چھٹی کلاس میں گورنمنٹ کالج ساہیوال کی فلم کلب کے تحت "انارکلی" دیکھ چکا تھا مگر فلموں کی لت 69-1968 میں فلم چن مکھناں سے پڑی اور پھر تفریح کے اس ذریعے کو گھر والوں سے بچ بچا کر خوب استعمال کیا۔اسی دور میں گراموفون کی جگہ پر ریکارڈ چینجر اور ٹیپ ریکارڈر بھی عام ہونے لگا۔ پاکستان میں اس دہائی کے آخر میں ٹرانسسٹر ریڈیو بھی دکانوں پر بکنے لگا تھا۔ ہندوستان میں 1964 کے دوران پہلے اور طویل ترین مدت تک وزیراعظم رہنے والے پنڈت جواہر لال نہرو 27 مئی 1964 کو ہارٹ اٹیک سے فوت ہو گئے تو عارضی طور پر گلزاری لال نندا اور اس کے بعد ہندوستان کے دوسرے باقاعدہ وزیراعظم لال بہادر شاستری بنے جو تاشقند کے معاہدے کے اگلے دن فوت ہو گئے جس کے بعد 1966 میں نہرو کی بیٹی اندرا گاندھی پہلی خاتون وزیراعظم منتخب ہوئی۔ ہندستان میں یہ دہائی بہترین فلموں اور یادگار فلمی گانوں کے لیے تاریخ میں محفوظ ہو گئی۔

1960 سے 1969 تک کی دہائی کے بین الاقوامی سطح کے ایسے واقعات کا ذکر کر لیا جائے جنہوں نے کسی نہ کسی طور پر دنیا کو متاثر کیا، اس دہائی کو امریکہ اور یورپ میں "مروّجہ روایات سے بغاوت " (Counter cultural Decade) کا دور کہا جاتا ہے جس نے پوری دنیا کو بہت متاثر کیا۔اس تصور کے مطابق سماجی نظام، مُنشّیات، جنسی تعلقات۔ملبوسات، لباس، شہری حقوق، معاشرتی آداب ورسوم، موسیقی اور فوجی خدمات کے ضابطے اور تعلیم و تربیت میں انقلاب رونما ہوا۔ دیگر لوگ اس دہائی کی جن باتوں کی وجہ سے مذمت کرتے ہیں وہ یہ ہیں: اعتدال سے غیر ذمہ دارانہ تجاوز، شوخی و چنچلتا، بھڑکیلے لباس، سماجی نظام کے زوال، قدامت پرستی کے خلاف ردعمل، اقلیتوں اور خواتین کے لیے بے محابہ آزادی اور انسانی حقوق۔امریکہ میں اسے ثقافتی اور برطانیہ بالخصوص لندن میں اسے تنوع پذیر دہائی کا نام دیا گیا۔ان تمام عوامل کا نتیجہ "ہپی'' کلچر کی صورت میں ظاہر ہوا۔اس دہائی میں امریکہ کے چار صدور ہوئے جن میں سے صدر کینیڈی کا 1963

میں قتل ہوا جس سے دونوں سپر طاقتوں کے درمیان کشمکش اور سرد جنگ میں اضافہ ہوا۔1962 میں ماؤزے تنگ کے طویل مارچ اور 1966 میں ثقافتی انقلاب کا آغاز ہوا،مشرقی ایشیا اور افریقہ کے متعدد ممالک کو آزادی نصیب ہوئی۔اب ان سائنسی اختراعات کا اجمالی ذکر جو آج کی حیران کن ترقی کی نقیب یا تمہید ثابت ہوئیں۔اس دہائی کو خلائی دوڑ سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔پہلے روس نے انسان کو خلا میں بھیجا پھر امریکہ نے دو قدم بڑھ کر اپالو 11 کو 16 جولائی کو چاند پر بھیجا اور 20 جولائی 1969 کو ایک امریکی نے چاند پر قدم رکھ کر انسان کے کائنات میں کردار کی نئی تاریخ رقم کی۔اس دہائی کے ان اقدامات نے دنیا کا منظر نامہ بدل دیا۔ اکیسویں صدی میں امریکہ کی ہونے والی ترقی کی بنیاد دراصل اس دہائی میں سامنے آنے والے ان اقدامات کے تحت رکھی گئی۔☆امریکی فیڈرل ڈرگ اتھارٹی (FDA) نے برتھ کنٹرول گولی کی منظوری دیدی ☆ تیزی سے حساب کتاب کرنے والا کمپیوٹر ایجاد☆ پہلے صنعتی روبوٹ کی ایجاد☆ ٹیلی سٹار مصنوعی سیارے کے ذریعے پہلی بین الاوقیانوسی نشریات کا آغاز ☆ پہلی کمپیوٹر ویڈیو گیم کی تیاری ☆ زمین کے متوازی گردش کرنے والے مصنوعی مواصلاتی سیارے کی کامیاب لانچنگ ☆ خسرہ کی ویکسین ایجاد ہوئی ☆ ریلے 1 سیارے کے ذریعے بین بحرالکاہل نشریات ☆ ٹچ ٹون ٹیلی فون متعارف ☆ پہلے ویڈیو ریکارڈر کی ایجاد☆ برقناطیسی (Electro megnetic) لہروں کے پس منظر نے کائنات کے آغاز اور ارتقا کے بارے میں بگ بینگ کے نظریے کو بنیاد فراہم کی۔ ☆ دنیا کی تیز ترین ٹرین سروس کا آغاز☆ آٹھ ٹریک کا ویڈیو ٹریک فارمیٹ متعارف ☆ کمپیکٹ کیسٹ ☆ پہلا کامیاب منی کمپیوٹر ☆ پروگرامنگ زبان بیسکس BASICS متعارف☆ دنیا کا پہلا سپر کمپیوٹر متعارف ☆ یورپ میں PAL اور SECAM رنگین ٹیلی ویژن کا آغاز ☆ جنوبی افریقہ میں دل کی پہلی پیوندکاری کی گئی ☆ پہلی اے ٹی ایم کی ایجاد۔

1970 کی دہائی کئی لحاظ سے اہم تھی۔میں 1969 سے کالج میں داخل ہوا اور 1971 میں سال سوم کا طالب علم تھا۔1970 میں انتخابات ہو چکے تھے۔سقوط ڈھاکہ کے بعد ساری قوم اداس تھی اور فضا بھی بہت بوجھل محسوس ہوتی تھی۔میرے پاس فلپس کے ٹرانسسٹر ریڈیو کا ایک اچھا ماڈل آ چکا تھا جس پر زیادہ تر گانے سننے کو ہی ترجیح دی جاتی۔1965 کے دوران انڈیا ریڈیو سے اردو سروس شروع ہوئی تھی جس کی صبح سے رات تک تین مجالس میں بالترتیب آپ کی پسند،آپ کی فرمائش اور تعمیل ارشاد کے تحت سامعین کی فرمائش پیش کی جاتی تھی جس میں فرمائش کرنے والے سامعین کے نام بھی لیے جاتے تھے۔پہلے صرف کراچی ریڈیو سٹیشن سے کمرشل سروس نشر ہوتی تھی۔1967 کے دوران لاہور سٹیشن نے بھی دوپہر کی ٹرانسمشن میں کمرشل سروس شروع کر دی۔اسی دہائی میں پنجاب میں ملتان اور بہاول پور میں بھی ریڈیو سٹیشن قائم ہوئے۔پاکستان میں

ایک سال میں اوسط ایک سو سے زیادہ فیچر فلمیں بن رہی تھیں جو ریڈیو کے ساتھ ساتھ تفریح کا ایک مؤثر ذریعہ تھیں۔ ٹی وی بھی بتدریج مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔ لاؤڈ سپیکر کی مشین کو اگر چہ اب بھی چابی دے کے چلایا جا رہا تھا مگر ہر ریکارڈ پر سوئی تبدیل کرنا ترک ہو چکا تھا اور وینائل ریکارڈ کا سائز کم اور دونوں اطراف میں دو کی بجائے چار گانے ہوتے تھے۔ اسی دہائی میں دیہاتوں کی مساجد میں بھی لاؤڈ سپیکر آ گئے۔ یکم جنوری 1974 کو بھارتی شہر امرتسر میں ٹی وی سٹیشن کے قیام کے بعد ہفتے میں دو بھارتی فلمیں دکھائی جانے لگیں۔ چترہار کے نام سے ہفتے میں چار بار بھارتی فلمی گیت بھی ٹیلی کاسٹ ہونے لگے۔ لاہور کے مکانوں پر بالخصوص اور دیگر شہروں کے مکانوں کی چھتیں ٹی وی اینٹینا سے بھر گئیں۔ 1972 کے بعد جب پاکستان اور ہندوستان کے درمیاں پوسٹل رابطہ بحال ہوا تو بھارتی ریڈیو کی اردو سروس کے فرمائشی گیتوں کے پروگراموں کے لیے پاکستان بھر سے فرمائشی سامعین کا ایک سیلاب امڈ پڑا کیوں کہ گانے سے پہلے یا بعد میں فرمائش کرنے والوں کے نام اور شہر کا اعلان بھی کیا جاتا۔ پی ٹی وی نے بوسٹرز کے قیام کے بعد اپنی نشریات کا دائرہ وسیع کر دیا اور اس کے ڈراموں کو بہت پذیرائی ملی۔ 1976 میں جزوی طور پر رنگین نشریات کا آغاز ہو گیا جو ایک سال کے عرصے میں مکمل رنگین ہو گئیں۔ اپنے وقت کے کمپیوٹر کی ابتدائی صورت کیلکو لیٹر کا استعمال وسیع پیمانے پر شروع ہو چکا تھا۔ ہمارے گاؤں میں ایک صاحب نے بلیک اینڈ وائیٹ ٹی وی خریدا تو سر شام اسے دیکھنے کے لیے خواتین و حضرات جمع ہونا شروع ہو جاتے۔ پاکستان میں شہریوں کے لیے شناختی کارڈ جاری کرنے کا محکمہ قائم کیا گیا اور اس کے ضلع کی سطح پر دفاتر قائم ہوئے۔ پہلے تو یہ اقدام کچھ عجیب سا لگا بعد میں اس کے عادی ہو گئے۔ چینی دکانوں کی بجائے شناختی کارڈ دکھا کر سرکاری ڈپوؤں سے ملتی تھی۔ ٹی وی نے متحرک سماجی زندگی اور میل جول کو بہت متاثر کیا۔ نیشنل کے ٹیپ ریکارڈر بہت مقبول ہوئے۔ پری ریکارڈڈ آڈیو کیسٹس کا رواج عام ہونے لگا جس نے لاؤڈ سپیکر اور گراموفون کا تفریحی پہلو ختم کر دیا۔ اس دہائی میں پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد کو بیرونی ممالک خصوصاً مشرق وسطی میں مختلف شعبوں میں ملازمتیں مل گئیں تو انہوں نے الیکٹرونکس کی نئی اشیا سے اپنے گھروں کو بھر دیا جس کے اثرات معاشرتی طرز زندگی پر بھی پڑے۔ ایلیٹ کلاس خاندانوں میں اکائی کے آڈیو ڈیک، نیشنل کے فریج اور ائیر کنڈیشنر عام ہونے لگے۔ ہاتھ سے چلانے والے پروجیکٹر بھی آ گئے۔ لاہور ایکس چینج میں ٹیلیفون نمبر کے ہندسے پہلے پانچ اور دو سال کے بعد چھ کر دیے گئے۔ ماضی کی طرح اس دہائی میں بھی ساڑھے نو بجے سے صبح چھ بجے تک ٹرنک کال کے ذریعے بات کرنے کے نرخ آدھے رہے۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال میں 1961 سے قائم فلم کلب کے تحت ہر ہفتے انگریزی اور ہر ماہ ایک اردو فلم دکھانے کے لیے کالج کا خود کار پروجیکٹر موجود تھا۔ 1973 میں پاکستان کی پارلیمنٹ نے آئین منظور کر لیا

جس سے 1971 سے قوم کا رویہ زوال مورال بلند ہوا اور قوم میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ اسی دہائی کے آخر میں 1977 کا مارشل لا لگا کر آئین پر عمل درآمد روک دیا گیا۔ اس دہائی کے آخری سال یعنی اپریل 1979 کو ایک سازش کے تحت منتخب وزیراعظم کو پھانسی دے دی گئی۔

بین الاقوامی سطح پر دیکھا جائے تو کچھ ایسا منظر نظر آتا ہے۔ 1970 کی دہائی کو تبدیلی کا محور (Pivot of Change) قرار دیا جاتا ہے۔ یہ معاشی اتار چڑھاؤ کی دہائی بھی کہلاتی ہے جب جنگوں کے بعد کی معاشی تیزی اور عروج اختتام کو پہنچے۔ عالمی سطح پر اس دہائی کو متعدد بغاوتوں، اندرونی تنازعوں اور خانہ جنگیوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مغربی دنیا میں 1960 کی دہائی کے دوران شروع ہونے والی سماجی ترقی پسندانہ اقدار میں اضافہ ہوا جن میں بالخصوص سیاسی شعور کی ترقی اور عورتوں کی معاشی آزادی شامل تھی۔ پہلے تجارتی مائیکرو پروسیسر کے ظہور پذیر ہونے سے اس دہائی کو تکنیکی اور سائنسی ترقی کا دور بھی کہا جاتا ہے جس کی تفصیل پیش کی جارہی ہے۔ ☆ پلاسٹک سرجری کی دوسری جنریشن کی کوشش کی گئی جو عوام میں بہت مقبول ہوئی ☆ پہلا ایم آر آئی امیج شائع ہوا ☆ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے دنیا سے 1979 میں چیچک کے مکمل خاتمے کا اعلان کیا ☆ 1978 میں پہلا ٹیسٹ ٹیوب بے بی پیدا ہوا ☆ مسافروں کے لیے کنکارڈ نے دنیا کا پہلا سپر سانک تیار کیا۔ ☆ کمپیوٹنگ موڈم تیار ہوا جس کے تحت انٹل 4004 کے پہلے عام مائیکرو پروسیسر میں پیشرفت ☆ سی پروگرامنگ لیگویج کی تیاری ☆ ڈیٹا پوائنٹ 2200 کے متعارف ہونے کے ساتھ ابتدائی کمپیوٹر کی تیاری ☆ جیبی کیلکو لیٹر کی ایجاد ☆ پہلا ہوم ویڈیو کنسول ☆ 1978 میں سونی جاپان کے آڈیو انجینئر نے پہلا واک مین تیار کر لیا ☆ آئی ایم بی نے پہلی بار 8 انچ چوڑی فلاپی ڈسک تیار کر لی ☆ 1971 میں پہلی ای میل کی کامیاب ترسیل ☆ الیکٹرونک کاغذ کی تیاری ☆ 1973 کا زیروکس آلٹو پہلا کمپیوٹر تھا جس کے لیے ڈیسک ٹاپ کا استعاراتی نام استعمال ہوا اور جس کو ماؤس کے گرافیکل یوزر انٹرفیس (GUI) کے ساتھ چلایا گیا۔ اسی دہائی میں ان اشیا کی تیاری اور پیداوار کا آغاز ہوا۔ ☆ فائبر آپٹکس ☆ مائیکرو اوون کا تجارتی آغاز ☆ بیٹا میکس اور وی ایچ ایس وی سی آر ☆ ای کامرس ☆ 1978 میں ڈسکو ویژن۔ پہلی تجارتی آپٹیکل ڈسک سٹوریج میڈیم ☆ سیل فون پر پہلی کال 1973 میں کی گئی ☆ کارفون سروس کا آغاز ☆ 1976 میں ایپل کمپیوٹر کمپنی کی بنیاد رکھی گئی۔ ☆ برٹش ریل نے انٹرسٹی تیز ترین ٹرین متعارف کرائی ☆ ڈیزل اور الیکٹرک لوکوموٹو کی تیاری ☆ ہائی سپیڈ ٹرین کی رفتار 201 کلومیٹر تھی۔ 1970 کی دہائی نے سب سے زیادہ ارتعاش اور بحران بھی دیکھے جیسے تیل کا بحران، سعودی عرب کے شاہ فیصل کا قتل، عرب اسرائیل جنگ، ویتنام میں دس سالہ جنگ کا خاتمہ اور بہت سے ممالک میں بغاوتیں مگر ان کی تفصیل میں جانا میرا موضوع نہیں ہے۔ میں تو

اپنی عمر کے اعتبار سے اپنی نسل کے ستر سالوں میں انسانوں اور معاشروں میں تبدیلیاں لانے والے واقعات کے ذکر تک محدود ہوں۔

دراصل تمام سائنسی ایجادات امریکہ اور مغربی ممالک اور چین و جاپان کی مرہون منت تھیں۔ان کے اور ہمارے ہاں نئی ایجادات کی دستیابی اور استعمال میں کئی سالوں کا فرق ہوتا ہے۔گذشتہ دہائی کے آخر میں وینائل ریکارڈوں اور فونوگرام فون کی جگہ ٹیپ ریکارڈ اور آڈیو کیسٹس نے لے لی تھی اس میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا گیا۔1980 کی دہائی میں مختلف کمپنیوں نے چھوٹی بڑی ٹیپ ریکارڈز، آڈیو ڈیکس سے یہاں کی دکانوں کو بھر دیا۔پری ریکارڈ اور گانے ریکارڈ کر کے دینے والی دکانیں بازاروں اور گلی محلوں میں دیکھتے ہی دیکھتے کھمبیوں (Mushroom) کی طرح اگ آئیں۔ٹیلی ویژن کی نشریات کا دائرہ کار اتنا وسیع ہو گیا کہ وہ تمام گھروں میں گھس گیا، رنگین ٹیلیویژن کو معاشرتی مقام کی علامت سمجھا گیا۔اس دہائی کے آغاز میں ایک اور سائنسی ایجاد نے گھیر لیا اور وہ تھا وی سی آر جس کا ہم نے وہ حشر کیا کہ رہے رب کا نام۔کرائے پر بھارتی فلموں کی ویڈیو کیسٹس دستیاب ہونے لگیں۔ویڈیو کیسٹس کی فروخت اور کرائے کی دکانیں جگہ جگہ نظر آنے لگیں۔نئی یا پرانی کوئی انگریزی اور انڈین فلم نہیں ہوگی جس کی ویڈیو کیسٹ پاکستان میں دستیاب نہ ہو۔جن لوگوں کے گھروں میں بلیک اینڈ وائیٹ ٹی وی تھے وہ گھنٹوں کے حساب سے وی سی آر اور کیسٹ کے ساتھ رنگین ٹی وی بھی کرائے پر لے لیتے۔ہم نے وی سی آر کے ساتھ جو کچھ کیا اس ضمن میں یہ بات ہی کی جا سکتی ہے کہ کوئی چیز اچھی یا بری نہیں ہوتی، اس کا استعمال اسے اچھا یا برا بناتا ہے۔وی سی آر کے بارے میں اس مختصر بیان کو ہی بہت سمجھا جائے۔موسیقی کے حوالے سے ہر شخص کا اپنا منفرد شوق ہوتا ہے۔میں بھارتی اور پاکستانی گانوں کو یکساں پسند کرتا تھا۔کوئی اچھی اور بڑی آڈیو کیسٹس کی دکان مل جاتی تو وہاں سے اپنی پسند کے گانوں کی کیسٹس اس طرح تلاش کرتا جیسے کتابوں کی ایک اچھی اور بڑی دکان سے اپنی پسند کی کتابیں تلاش کرتے تھے۔رحیم یار خان میں تھا تو ریلوے روڈ پر طارق میوزک سنٹر واحد دکان تھی جہاں پہلے سے ریکارڈ کی گئی کیسٹس اور وینائل ریکارڈ اور لونگ پلے ریکارڈز بڑے منظم و مرتب انداز میں پڑے مل جاتے۔اس دکان پر دستیاب ریکارڈز کے البم موجود تھے جن سے اپنے پسند کے گانے ڈھونڈ کر ٹی ڈی کے کی ساٹھ یا نوے منٹس کی کیسٹس پر اوریجنل وینائل ریکارڈ سے ریکارڈنگ کراتے۔لاہور، ملتان، اسلام آباد، بہاول پور یا کراچی جاتے تو بھی کتابوں کی دکانوں کے علاوہ آڈیو کیسٹس کی دکانوں پر جانا بھی ترجیح میں شامل ہوتا۔رحیم یار خان میں تو ایسی دکانوں پر پسند کے گانے اور کیسٹس ڈھونڈتے پھرتے تھے۔اس کے ساتھ اچھی، کلاسیکل اور آرٹ فلموں کے ویڈیو کیسٹس بھی شوق کی فہرست میں شامل ہو گئے۔جب میں نے اپنا وی سی آر لیا تو اس کو ٹی وی سے منسلک کر دیا جس

سے میں نے پی ٹی وی کے ہر تان ہے دیپک اور رم جھم کے تمام پروگرام ریکارڈ کر لیے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میری آڈیو اور ویڈیو لائبریری میں بالترتیب پانچ 500 آڈیو اور تین سو سے زائد ویڈیو کیسٹس تھیں جن کو موسمی حالات کے مطابق رکھنا بھی ایک کام تھا۔ 1980 کی دہائی کو پاکستان کی حد تک وی سی آر کی دہائی کہا جا سکتا ہے۔ شادیوں کی تقریبات کی ویڈیو ریکارڈنگ لازمی قرار پائی مگر کیمرہ اور وی سی آر ابھی یکجا نہیں ہوئے تھے لہذا کیمرہ، وی سی آر اور لائیٹس کو علیحدہ علیحدہ اٹھانا پڑتا تھا۔ اب ٹیلیفون لگنے پر دیگ چڑھانے کا رواج کمزور پڑ رہا تھا البتہ ٹیلیفون والے اصرار کر کے "مٹھائی" ضرور لیتے تھے۔ اسی دہائی میں ڈائریکٹ ڈائلنگ شروع ہوئی جو پوری قوم کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ اب ٹیلیفون کو تالے میں رکھنے کی روایت پڑی۔ ڈائریکٹ ڈائلنگ کے بعد بھی رات ساڑھے نو بجے کے بعد کالز کے نرخ میں پچاس فیصد رعایت دی جاتی تھی۔

بین الاقوامی منظر نامے پر پرسنل کمپیوٹر (PC) نے 1980 کی دہائی میں حیرت انگیز ترقی کی جب اس نے کھلونے سے بڑھ کر صارف کی چیز (Consumer Pruduct) کا درجہ حاصل کر لیا۔ 1981 میں آئی ایم بی کا متعارف کردہ پی سی پیشہ ورانہ صارفین کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ کموڈور نے 8 اور 16 بٹ (BIT) کے مقبول ترین گھریلو کمپیوٹر بنائے۔ ایم ایس ایکس سٹینڈرڈ کے کمپیوٹر جاپان اور ایشیا کے چند ممالک میں بہت مقبول ہوئے۔ ایپل کمپیوٹرز نے اپنے ایپل 2 کی جگہ میکنیٹوش کمپیوٹر 1984 میں متعارف کرایا۔ یہ پہلا کامیاب کمرشل کمپیوٹر تھا جس میں ماؤس اور گرافیکل یوزر انٹرفیس استعمال کیا گیا۔ 1970 کی دہائی میں سونی جاپان کے ذریعے وجود میں آنے والا واک مین اس دہائی میں بہت مقبول ہوا۔ اینالاگ اور ڈیجیٹل ایچ ڈی ٹی وی 1980 کی دہائی میں متعارف ہوا مگر 2000 کے بعد ہی اس کا پھیلاؤ ممکن ہو سکا۔ اس دہائی کے دوران مائیکرو سافٹ نے یہ آپریٹنگ سسٹم متعارف کرائے۔ ایم ایس ڈاس (1981)، ونڈوز 0۔ 1 (1985)، ونڈوز 0۔ 2 (1987)۔ JNU پروجیکٹ 1983 اور فری سافٹ وئیر فاؤنڈیشن کا قیام 1985 میں عمل میں لایا گیا۔ 1989 میں امریکی فرم CERN میں کام کرنے والے کمپیوٹر کے سائنسدان نے ہائپر ٹیکسٹ کے نظریئے کو سامنے رکھ کر WWW کا تصور پیش کیا تا کہ محققین کو تازہ ترین اطلات مل سکیں۔ نومبر 1989 کے وسط میں برنرز لی نامی سائنسدان نے ہائپر ٹیکسٹ ٹرانسفر پروٹوکول (HTTP) اور انٹرنیٹ کے ذریعے رابطے کا کامیاب تجربہ کیا۔ آئندہ سالوں میں اس نے ایسا نظام وضع کیا جو www کے لیے بنیاد ثابت ہوا۔ اکتوبر 1982 میں بنیادی نوعیت کی سی ڈی (ڈیجیٹل آڈیو کمپیکٹ ڈسک) مارکیٹ کر دی گئی جس پر 74 منٹس کے ڈیجیٹل آڈیو گانے سنے جا سکتے تھے۔ ایم ٹی وی نے امریکہ میں اپنی نشریات کا آغاز کیا اور 1980 میں کیبل ٹیلی ویژن متعارف ہوا جب کہ امریکی دیہاتوں میں ڈش ٹی وی سے کام لیا گیا۔ اس دہائی

کے آخری سال یعنی 1989 کے دوران دیوار برلن گرا دی گئی جو دنیا کے نئے نقشے کی تمہید ثابت ہوئی یوں 1980 کی دہائی اپنے اختتام کو پہنچی۔

1990 کی دہائی کا دور حیرتوں کا دور تھا۔گزشتہ دہائی کے وسط میں میں رنگین ٹی وی اور وی سی آر کو ریموٹ سے چلانے کے خوشگوار احساس سے دوچار ہونے کا لطف میں اب بھی اپنی پوروں پر محسوس کرسکتا ہوں مگر نئی دہائی نے ہمہ جہت حوالوں سے حیرت انگیز نئے تجربات سے روشناس کرایا۔اس دہائی میں ویڈیو کیمرہ اور وی سی آر دونوں ایک ہو گئے جسے ویڈیو کیمرہ ریکارڈر کہنا چاہیے۔ٹیلیفون ڈیجیٹل ہو گیا اور اب پُش بٹن ڈائلر والے فون آ گئے جن کو تالا لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔مقامی،قومی اور بین الاقوامی کالز کی ڈائلنگ روکنے کے لیے صرف ایک کوڈ لگانا پڑتا تھا۔ بڑے شہروں میں ٹیلیفون نمبرز 7 اور ضلعی شہروں میں 6 ہندسوں کے ہو گئے۔ 1957 میں روس نے پہلا مصنوعی سیارہ سپوتنک-1 خلا میں بھیجا مگر وہ فوجی مقاصد تک محدود رہا۔ 1958 میں امریکہ نے ملٹری کے مقاصد اور آواز کی ترسیل کا دائرہ کار بڑھانے کے لیے مصنوعی مواصلاتی سیارہ خلا میں بھیجا جس سے امریکہ کے صدر کے پیغام کی پہلے سے ریکارڈ کی گئی یہ آواز سنائی گئی تھی۔"زمین پر امن اور ہر جگہ کے انسانوں کے لیے نیک خواہشات"۔اس کے بعد ترقی یافتہ ممالک میں مواصلاتی سیاروں کے خلا میں بھیجنے کی ایک دوڑ لگ گئی اور روز بروز ان میں بہتری آتی گئی۔ان سیاروں کو ریڈیو،ٹیلیویژن کا دائرہ کار بڑھانے اور دفاعی و سائنسی حکمت عملی کے مقاصد یا یوں کہہ لیں کہ ٹیلی کمیونیکیشن، براڈ کاسٹنگ اور ڈیٹا کمیونیکیشن کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔امریکہ اب تک 3415 مصنوعی موصلاتی سیارے خلا میں لانچ کر چکا ہے۔اس دوڑ میں چائنا، روس، جاپان اور برطانیہ بھی پیچھے نہیں رہے۔شالیمار ٹیلی ویژن نیٹ ورک (STN) نے لاہور اور شاید کراچی کی حد تک سی این این کی نشریات کو ریلے کرنے کا آغاز کیا اور پرائم ٹائم میں چند مقامی پروگرام بھی تیار کر کے پیش کیے۔گذشتہ دہائی کے دوران امریکہ کے شہروں میں کیبل اور دیہاتوں میں ڈش کا رواج عام ہو چکا تھا۔جنوبی ایشیا میں ایشیا سیٹ 1 پر پہلی بار عالمی سطح اور تجارتی بنیادوں پر پانچ مفت چینلز کا آغاز ہو گیا جنہیں چار فٹ کی ڈش پر ایک رسیور کے توسط سے دیکھا جا سکتا تھا۔1992 کے دوران پاکستان کی الیکٹرونکس مارکیٹ سیٹلائیٹ ڈشوں اور طرح طرح کے رسیورز سے بھری پڑی تھی۔ میں نے 1992 کے آخر میں ڈش سسٹم خریدا۔ایک سے زائد چینلز کو دیکھنے کا اختیار ایک حیرت انگیز تجربہ تھا۔کب سے پی ٹی وی کی ایک چینل ہی دیکھتے آ رہے تھے۔جب سیٹلائیٹ رسیور ریموٹ کے ایک بٹن سے پی ٹی وی کے علاوہ پانچ چینل تبدیل کیے تو حیرت اور خوشی کا احساس اب بھی کل کی بات لگتی ہے۔ وہ پانچ چینلز یہ تھیں۔ 1-پرائم سپورٹس 2-سٹار ٹی وی 3-ایم ٹی وی 4-بی بی سی 5-چینی زبان کا چینل۔بعد میں سی این این بھی شامل ہو گیا۔سب سے پہلے میں نے اپنے ایک دوست کے ہمراہ ایف ایف سی ماچھی گوٹھ کی کلب میں

سیٹلائیٹ ٹی وی کی نشریات دیکھی تھیں جہاں پر ایم ٹی وی پر وہاں بیٹھے لوگ ویڈیو سونگ دیکھ رہے تھے۔ ویڈیو سونگ کی صنف (genre) یہاں پر بالکل نئی تھی۔ ویڈیو سونگ پوری ایک کہانی ہوتا تھا۔ اس سے متاثر ہو کر انڈیا میں پوجا بیدی اور بابا سہگل کا پہلا ویڈیو سونگ بھی ایم ٹی وی سے ہی نشر کیا گیا۔ ان چینلز کو دیکھنے کے لیے دو بینڈز میسر تھے۔ ایک سی اور دوسرا کے یو دونوں کی LNB مختلف تھیں۔ جنوبی ایشیا میں فی الحال سی بینڈ کی چینلز میسر تھیں۔ اکتوبر 1992 میں انڈیا کا چینل زی ٹی وی فلم کنیادان دکھانے سے شروع ہوا اور خاصی دیر تک اس کی اجارہ داری رہی۔ ملک بھر کے شہروں اور دیہاتوں میں گھروں کی چھتیں جالی اور فائبر کی ڈشوں سے بھر گئیں۔ ڈش میں ایک پرزہ جو رسیور کو سگنلز بھیجتا ہے اسے LNB کہا جاتا ہے اور وہ اس وقت چار ہزار روپے کا آتا تھا، یہ چوری ہونے لگا۔ اس کے بغیر ڈش سسٹم بے کار تھا۔ آہستہ آہستہ چور منظّم انداز میں پورے محلے کی LNBs کی صفائی کرنے لگے تو لوگ اپنی ڈشوں کے ساتھ اس پرزے کو زنجیر سے باندھ کر محفوظ کرنے لگے۔ اب ایک ڈش پر سی اور کے یو بینڈ کی دو LNB لگا کر دوسرے بینڈ کی نشریات بھی دیکھی جانے لگیں۔ ڈش کی صنعت کو اتنا فروغ ملا کہ دیسی رسیور اور ڈشیں بھی تیار ہونے لگیں۔ یہاں اس صنعت نے ایک اور جست بھری۔ مقامی سطح پر گھومنے والی ڈشیں تیار ہونے لگیں جن پر ایک سے زائد سیٹلائیٹس کی سیکڑوں چینلز تک رسائی ممکن ہو سکی۔ میں نے 1995 میں ملتان سے ایک اعلیٰ قسم کا درآمدہ سیٹلائیٹ رسیور خریدا اور نئی چینلز تلاش کرنے کے لیے ٹیوننگ کرتا رہتا تھا تا آنکہ پروفیسر باسط نظامی نے اپنا ڈیزائین کردہ ڈش کو گھمانے والا سسٹم تحفے میں دیا جس سے پندرہ کے قریب سیٹلائیٹ تک میری رسائی ہو گئی۔ ایک تجربہ میں پہلے کر چکا تھا جب میں نے اپنے وی سی آر کے ذریعے پی ٹی وی کے گانوں کے دو سلسلہ وار پروگرام کی مکمل ریکارڈنگ کی تھی۔ اب کی بار میں نے اپنے وی سی آر کو سیٹلائیٹ رسیور سے منسلک کر دیا اور تین طرح کے گانے میں نے ریکارڈ کرنے شروع کر دیے۔ ایم ٹی وی سے انگریزی گانے اور انڈین چینلز سے آنے والی فلموں کے میڈیم اور نئے گانے الگ الگ ویڈیو کیسٹس میں اس نقطۂ نظر سے ریکارڈ کرتا گیا تا کہ میری کلیکشن بن سکے اور پھر نجانے ڈش پر یہ نہ مل سکیں۔ تینوں سلسلوں کی تقریباً 95 ویڈیو کیسٹس تیار کیں اور انگلش کی کلاسیکل اور بھارتی آرٹ فلموں کی کلیکشن بھی خریدتا گیا۔ کسی بڑے شہر میں جانا ہوتا تو اپنے ذوق سے ہم آہنگ آڈیو، ویڈیو کیسٹس اور کتابیں خریدنا ہی ترجیح ہوتی تھی۔ بہر حال اس وقت 126 ممالک کے بیسیوں کثیر المقاصد سیٹلائیٹس سے زمین کا مدار اور خلا بھرا پڑا ہے اور دنیا کے سو فیصد حصے تک سیٹلائیٹ نشریات کی رسائی ہے۔

26 دسمبر 1991 کو سوویت یونین ٹوٹنے کے بعد 15 نئے آزاد ممالک وجود میں آئے جس سے عالمی سیاست کا ایک نیا سکرپٹ تالیف ہوا جس میں امریکہ کو اکلوتی سپر پاور کا درجہ مل گیا۔ اس دہائی میں ٹیکنالوجی نے بہت ترقی کی۔ ورلڈ وائیڈ ویب (www)، پینٹیم مائیکرو پراسیسر کی ایجاد، دوبارہ چارج ہونے والی لیتھیم بیٹری، پہلی تجرباتی جین تھراپی اور کلوننگ جیسے اقدامات شامل تھے۔ انسانی جینوم کے منصوبے کا آغاز

بھی 1990 میں ہوا تھا۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی اور سوفٹ ویئر کے سلسلے میں جو نئی چیزیں سامنے آئیں وہ اس طرح ہیں۔ ☆1990 کی دہائی کے دوران ٹیکنا جی کی ترقی گویا انقلابی نوعیت کی تھی۔ 97-1990 کے درمیان امریکہ میں گھریلو کمپیوٹرز کی فروخت میں 15 فیصد سے 35 فیصد اضافہ ہوا۔ اس دہائی کے آغاز اور اس سے پہلے والے سیل فون بہت بڑے تھے اور ان کے فیچرز بھی بہت کم تھے اور یہ فون ترقی یافتہ ممالک میں بھی کم ہی استعمال کیے گئے۔ 1990 میں چند ملین لوگ ہی آن لائن خدمات سے استفادہ کر سکے۔ ☆۔16 اگست 1991 کو CERN نامی ایک یورپی تنظیم برائے نیوکلر ریسرچ نے www کا اعلان کیا، یہ وہی www تھی جس نے کمپیوٹر کی سلطنت پر کئی دہائیوں تک راج کرنا تھا۔ اگرچہ انٹرنیٹ کو ممکن بنانے والی تمام ایپلیکیشنز اور رہنما اصول دو دہائیوں سے موجود تھے مگر 1990 کی دہائی سے قبل یہ نیٹ ورک پبلک کی رسائی یا استعمال میں نہ آ سکا۔ ☆اسی دہائی میں Y2K (سال 2000) کے سلسلے کی یہ افواہ پھیلی کہ یکم جنوری 2000 سے تمام کمپیوٹرز خراب اور بیکار ہو جائیں گے لہٰذا اس کا کاروبار کرنے والی فرموں نے اپنی تمام پروڈکٹس کو سٹور کر لیا مگر 2000 کے پہلے دن کوئی انہونی نہیں ہوئی۔ ☆ کمپیوٹر موڈم، ISDN، کیبل موڈم اور DSL انٹرنیٹ کے تیز کنکشن کا باعث بنے۔ ☆ پہلے پینٹیم مائیکرو پروسیسر کو اس کے تیار کنندہ انٹل کارپوریشن نے متعارف کر دیا۔ ☆ای میل کو بہت مقبولیت ملی اور مائیکروسوفٹ کی ہاٹ میل سب کی فیورٹ تھی۔ ☆ کاروبار کے لیے ای کامرس کی ویب سائیٹس بنائی گئیں جن میں ایمیزون، ای بے، اے او ایل اور یاہو تیزی سے مقبول ہوئیں۔ ☆سستی سیٹلائیٹ ڈشوں اور ڈیجیٹل ویڈیو براڈ کاسٹنگ (S-DVB) نے دہائی کے وسط میں سیٹلائیٹ ٹیلی ویژن سروس میں اہم کردار ادا کیا اور ٹیلی ویژن چینلز کی تعداد 500 تک جا پہنچی۔ ☆1998 کے موسم بہار میں "ایم پی مین" کے نام سے پہلا ایم پی 3 پلیئر سامنے آیا۔ اس کی میموری 32 ایم بی تھی جو 2000 کی دہائی کے وسط میں 64 ایم بی ہو گئی۔ ☆ پہلے گلوبل سسٹم برائے موبائیل ایپلیکیشنز (GSM) کو فن لینڈ میں 1991 میں لانچ کر دیا گیا۔ ☆ ڈیجیٹل سنگل لینز ریفلیکس اور ریگولر ڈیجیٹل کیمرے تجارتی بنیاد پر استعمال ہونے لگے جنہوں نے 2000 کی دہائی کے وسط میں فلمی کیمروں کی جگہ لے لی۔ ☆IBM نے ایک انچ (25mm) چوڑی ہارڈ ڈرائیو 170 اور 340 ایم بی کی صلاحیت کے ساتھ متعارف کرا دی۔ ☆ایپل نے 1995 میں میک کمپیوٹر متعارف کرا دیا۔ ☆ سی ڈی برنر ڈرائیو بھی آ گئی۔ ☆اس دہائی میں سی ڈی روم ذاتی کمپیوٹر کا حصہ بن گئی۔ ☆DVD میڈیا فارمیٹ کو تیار کر لیا گیا جو فلیش میموری کارڈز کے ساتھ 1994 میں مقبول ہو گئی۔ ☆ پہلے پیجرز مقبول تھے لیکن 2000 کی دہائی میں موبائیل فون نے اس کی جگہ لے لی۔ ☆1990 کی دہائی کے آخر میں دستی سیٹلائیٹ فون بھی بازار میں آ گئے۔ ☆ تمام سیٹلائیٹ چینلز کا پیٹرن 24 گھنٹے کی نشریات میں بدل گیا۔ ☆1980 کی دہائی کے آخر میں پورٹیبل سی ڈی پلیئر آئے تو مقبولیت کے گراف میں بہت اونچے چلے گئے۔ ایم پی 3 پلیئر نے مقبولیت میں سی ڈی پلیئر کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ☆ جاپانی فرم

فیوجی سو(Fujitso) نے دنیا میں 21انچ کا مکمل رنگین ڈسپلے والا پلازما ٹی وی مارکیٹ کر دیا۔

اب ایک نظر ان سوفٹ ویئرز پر ڈالتے ہیں جو اس دہائی کی پیداوار تھے۔☆ مائیکروسوفٹ ونڈوز آپریٹنگ سسٹم IBM کے کمپیوٹرز سے پوری طرح ہم آہنگی اور مطابقت رکھتے تھے۔☆ مائیکروسوفٹ نے اس دہائی میں ونڈوز 3.01، ونڈوز95 اور ونڈوز98 مارکیٹ کیے تو بہت جلد مقبول ہو گئے۔☆ نیٹ سکیپ نیویگیٹر اور انٹرنیٹ ایکسپلورر جیسے ویب براؤزر نے www کے استعمال کو سادہ اور آسان بنادیا۔☆ براؤزر میں ملٹی میڈیا کے لیے میکرومیڈیا شاک ویوپلیئر 1995 میں ایجاد ہوا۔☆Winamp اور Quicktime میڈیا پلیئرز بالترتیب 1991 اور 1997 میں ریلیز ہوئے۔اب اس دہائی کی چند سائنسی خبریں کہ پہلے سے موجود سولر سسٹم سے باہر بھی پلینٹس (Extra solar Planets) دریافت ہوئے، برطانیہ میں پہلی کلون دودھیال بھیڑ ڈولی 26 فروری 1997 میں رپورٹ کی گئی۔ ہیومن جنوم پروجیکٹ پر کام شروع ہوا۔انسانی ڈی این اے کی شناخت کو برازیل، امریکہ، برطانیہ، روس اور ہالینڈ میں فوجداری قانون میں شامل کیا گیا۔ہبل سپیس ٹیلی سکوپ 1990 میں سامنے آئی جس نے پورے علم فلکیات کو بدل دیا۔ناسا کا خلائی جہاز پاتھ فائینڈر مارس پر اتر گیا۔جینیاتی طریقِ کار (Genetically Engineered) سے فصلوں کی پیداوار تجارتی مقاصد کے لیے کی گئی۔GPS نے پوری طرح کام شروع کر دیا۔ بین الاقوامی خلائی سٹیشن کی تعمیر کا آغاز 1998 میں ہوا۔اہم ویب سائیٹس مثلاً IMD، ای بے، امیزون، جیوسٹیز، نیٹ سکیپ، یاہو، ایلٹاوسٹا، اے آئی ایم، آئی سی کیو، ہاٹ میل، گوگل اور نیپسٹر 1990 کی دہائی میں سامنے آئیں۔ یوں یہ دہائی تقریباً مکمل ہوگئی۔

2000-2009 کی دہائی کے پہلے مرحلے میں ایشیا کے دوملک معاشی طور پر بہت نمایاں ہوئے اور وہ تھے انڈیا اور چائنا جن کی اس دہائی میں جی ڈی پی کی افزائش کی شرح دو ہندسوں میں آ گئی، آبادی کے لحاظ سے بھی یہ دنیا کے پہلے دوممالک تھے۔اس دہائی نے انٹرنیٹ کا عروج دیکھا جس میں دنیا کی آبادی کا 7۔6 فی صد سے 7۔25 فیصد تک اضافہ ہوا۔ دنیا اور اور اس کے گرد تیز ترین مواصلات کی وجہ سے دنیا میں عالمگیریت یا گلوبلائیزیشن کے تصور کو فروغ ملا۔انٹرنیٹ کے عام ہونے سے دنیا کے دور دراز لوگوں میں رابطے اور مکالمے کی سہولت میسر آئی جب کہ 11 ستمبر 2001 کے واقعات نے دنیا کی سیاست کا نقشہ بدل ڈالا۔ افغانستان اور عراق کو جنگوں میں دھکیل دیا گیا۔ درجہ حرارت میں اضافے نے گلوبل وارمنگ اور ماحولیاتی مسائل پیدا کیے۔کمپیوٹر سے تخلیق شدہ نقش گری (Imagery) کا فلم سازی میں وسیع پیمانے پر استعمال شروع ہوا۔2001 میں مصنوعی دل کی پہلی کامیاب پیوندکاری ہوئی۔2002 سے 2004 کے دوران کرونا کی ایک ابتدائی قسم سارس نامی بیماری 30 ممالک کے آٹھ ہزار لوگوں پر حملہ آور ہوئی اور 774 انسانوں کو نگل لیا۔ 2003 میں انسانی جینوم پروجیکٹ مکمل ہو گیا جس کے درست ہونے کی شرح 99۔ 99 فیصد تھی۔نیشنل جیوگرافک سوسائٹی اور IBM نے ایک جغرافیائی منصوبے پر مل کر کام کیا جس کا مقصد ہر زندہ انسان کے نسلی

سلسلے کے کسی ایک مرد جد امجد کی نشان دہی کرنا تھا۔ 2005 میں فرانس میں سرجنوں نے جزوی طور پر انسانی چہرے کی کامیاب پیوندکاری کا تجربہ کیا۔ زندہ مخلوق کی تخلیق سے وابستہ جینوم ڈیٹا اور دودھ دینے والے اجسام کے خلیوں اور جرثوموں کے بارے میں فیلڈ کے مشاہدات سے لیس حیاتیات کے ماہرین نے مخلوق کے تخلیقی عمل کو جاننے کی سرتوڑ کوشش کی۔ 2006 میں آسٹریلین سائنسدان یان فریزر نے سرویکل کینسر کا باعث بننے والی رسولی کی ویکسین تیار کر لی۔ 2007 میں RNA اور DNA کی مدد سے سیل اور اس کی تخلیق کے بارے میں پہلے سے موجود نقطۂ نظر کو اور بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔ 2009 میں سب سے پہلے میکسیکو میں وائرس کی ایک نئی نسل H1N1 کا کھوج لگایا گیا جو اسی سال دنیا میں سوائین فلو کا باعث بنا۔ عالمی سطح پر براڈ بینڈ انٹرنیٹ کے استعمال نے ایک اونچی جست بھری۔ صرف امریکہ میں 2000 میں انٹرنیٹ کے صارفین کی تعداد 6 فیصد تھی جس کے بارے میں اندازہ لگایا گیا تھا کہ 2010 تک یہ تعداد 62 فیصد ہو جائے گی مگر فروری 2007 میں ہی یہ تعداد 80 فیصد تک جا پہنچی۔ اس دہائی کے آخر تک وائرلیس انٹرنیٹ چھا گیا اور کمپیوٹر کے علاوہ موبائل فونز اور گیمنگ کنسولز میں بھی اس کا استعمال بڑھ گیا۔ فائل شیئرنگ سسٹم کے باعث Peer to Peer ٹیکنالوجی کو بہت مقبولیت ملی جس کے تحت صارفین آڈیو، ویڈیو، ڈیٹا فائلز اور ڈیجیٹل فارمیٹ کی چیزوں اور ایپلی کیشنز کا آسان تبادلہ ہوسکتا تھا۔ باہمی تحریری تبادلے کے ضمن میں ای میل ایک معیار بن گئی جس میں ہاٹ میل، جی میل اور یاہو میل کے پرکشش ای میل پتے دستیاب تھے۔ VPN عام پبلک کی رسائی میں آ گیا۔ موسیقی ڈاؤن لوڈ کو بہت عروج ملا۔ یو ایس بی فلیش ڈرائیو نے فلاپی ڈسک کی جگہ لے لی۔ فروری 2003 میں dell نے اعلان کیا کہ اس کے آئندہ آنے والے کمپیوٹرز میں فلاپی ڈسک نہیں لگائی جائے گی۔ اس دہائی میں ونڈوز 2000، ایکس پی مائیکروسوفٹ آفس 2003، ونڈوز وسٹا اور آفس 2007 اور بعد میں ونڈوز 7 تک آسان رسائی حاصل تھی۔ ونڈوز میلینیم ایڈیشن (ME) اور آفس ایکس پی بھی اسی دوران سامنے آئے۔ اوپن سورس سافٹ ویئر جیسے لینکس آپریٹنگ سسٹم، موزیلا فائرفوکس ویب براؤزر اور وی ایل سی میڈیا پلیئر نے بھی اپنی جگہ بنالی۔ ☆ ریزرویشنز، سٹاک ٹریڈنگ، موسیقی، آرٹس، لٹریچر، فلم، شاپنگ اور دیگر سرگرمیوں کے لیے انٹرنیٹ کا حصول بنیادی طریقِ کار اور معیار قرار پایا۔ اشیا، خدمات اور اطلاعات کے ضمن میں اس دہائی کے دوران بہت سی ویب سائیٹس اور سرچ سائیٹس کو بہت پذیرائی ملی۔ 2000 کی دہائی کی معروف ویب سائیٹس اور سرچ انجنوں میں گوگل، یاہو، وکی پیڈیا، ایمیزون، ای بے، مائی سپیس، فیس بک، ٹویٹر اور یو ٹیوب شامل ہیں۔ ☆ مختلف قسم کے کاروباری اداروں نے کاغذ کا استعمال ترک کر کے خدمات فراہم کرنے کا آغاز کیا۔ ☆ صارفین کو بل اور بینک سٹیٹ منٹس ویب انٹرفیس کے ذریعے ملنے لگے۔ ☆ میکڈونلڈز نے برطانیہ میں اپنے 12 سو ریسٹورینٹس پر 2007 کے آخر تک تیز ترین انٹرنیٹ کی فراہمی کا اعلان کیا۔ ☆ اس دہائی کے دوران جی پی ایس خودکار نیویگیشن سسٹم کے طور پر بہت مقبول ہوا۔ ☆ گرین لیزر پرنٹرز 2000

میں مارکیٹ میں آ گیا۔ کریڈٹ اور ڈیبٹ اے ٹی ایم کارڈز کے لیے بنکوں نے چپ اور پن کا طریقہ اختیار کرلیا۔ یورپ میں اے ٹی ایم جرائم میں اضافہ ہوا جو 2008 میں 423 ملین پونڈ تھا اور دہائی کے دوران اے ٹی ایم مشینوں پر حملوں میں 149 فیصد اضافہ ہوا۔ ☆ 2000 کی دہائی میں لیپ ٹاپ دیکھتے ہی دیکھتے مقبولیت کے عروج پر پہنچ گیا۔

اب 2010 کی دہائی کو لیتے ہیں۔ 2000 کی دہائی کے آخر میں آنے والے مالیاتی بحرانوں کے بعد 2010 کی دہائی ان بحرانوں اور معیشت کی بحالی کی دہائی تھی۔ افراط زر اور سود کے نرخ کم اور مستحکم رہے۔ اس دہائی میں عالمی جی ڈی پی میں اضافہ ہوا اور 2015 کے قریب عالمی معاشی بحالی کو مہمیز ملی۔ صارف کے مستحکم اخراجات سے انفراسٹرکچر کے کاروبار میں اضافہ ہوا اور نئی ٹیکنالوجیز کا ظہور تیز تر ہوا البتہ معاشی بحالی غیر ہموار انداز میں آگے بڑھی۔ دنیا کے بعض ممالک بالخصوص عرب دنیا میں سماجی اور معاشی بحران نے مصر، تیونس اور بحرین میں سیاسی انقلابات کو تیز تر کیا حتیٰ کہ شام، لیبیا اور یمن میں خانہ جنگی شروع ہوگئی، اس علاقائی مظہر (phenomenon) کو "عرب بہار" سے منسوب کیا گیا۔ سائنس وانفارمیشن ٹیکنالوجی میں یہ پیشرفت ہوئی۔ ☆ پہلی کوانٹم مشین کی ایجاد ☆ ایڈز کی روک تھام اور علاج کے لیے HPTN052 کا نظریہ پیش کیا گیا۔ ☆ ہگز بوسن یا ہگز پارٹیکل کی دریافت ☆ کینسر کے خلاف مدافعتی علاج کا آغاز ☆ جینوم ایڈیٹنگ طریق کار کا آغاز ☆ بلیک ہول کی پہلی تصویر منظر عام پہ آئی۔

2000 کی دہائی کے آخر میں موبائیل آپریٹنگ سسٹم میں گوگل نے انڈرائیڈ اور ایپل نے IOS متعارف کرایا تھا جسے بہت عروج ملا۔ 2010 کی دہائی میں ربوٹکس خصوصاً ڈرون کیمروں کا وسیع پیمانے پر تجربہ اور استعمال ہوا۔ 2016 میں موبائیل ڈیوائسز نے ڈیسک ٹاپ کمپیوٹرز کو پیچھے چھوڑ دیا۔ خودکار طریقے اور بجلی سے چلنے والی کاروں کی پیداوار اور فروخت میں اضافہ ہوا۔ اس دہائی میں سائبر سیکیورٹی کے واقعات میں ہیکنگ، حساس معلومات کی لیکیج اور چوری کے واقعات نے حکومتوں، کارپوریشنوں اور افراد کو بہت متوجہ کیا، ایڈز جیسی وبا جس نے 1980 میں دنیا بالخصوص سب صحارا افریقہ میں کئی ملین افراد کی جان لی، وہ قابل علاج مرض بن گیا، یہ دہائی سماجی تبدیلیوں کا عرصہ بھی ہے جس میں انسانی اوسط عمر میں اضافہ اور شرح پیدائش میں کمی واقع ہوئی اور بوڑھے لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوا جس کی وجہ سے ترقی یافتہ ممالک میں نیشنل اور سوشل سیکیورٹی پر بہت بوجھ پڑا۔ ماحولیات کے موضوع نے بھی دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ انٹرنیٹ نے تفریح، مواصلات، سیاست اور تجارت کے شعبوں میں خصوصاً نوجوانوں اور دولت مند ممالک میں تاریخ کا بہت بڑا کردار ادا کیا۔ ☆ 2011 میں دنیا کی آبادی سات ملین ہوگئی۔ ☆ 2010 کی دہائی کے دوران چائینیز ملٹی نیشنل ٹیکنالوجی کمپنی کی ویب سائیٹ BAIDU، سوشل ویب سائیٹ ٹویٹر (ایکس) اور انسٹاگرام بہت زیادہ دیکھی اور استعمال ہونے والی ویب سائیٹس کے طور پر سامنے آئیں جو ٹاپ دس میں

چوتھے، چھٹے اور آٹھویں نمبر کی اس دہائی کے آخر تک مقبول ترین سائیٹس تھیں جب کہ وکی پیڈیا 9ویں سے 5ویں نمبر پر آ گئی۔ اس اثنا میں یاہو کی مقبولیت کم ہوگئی اور یہ پہلے سے 9ویں نمبر پر آ گئی۔ گوگل، فیس بک، یوٹیوب اور روسی سرچ انجن یانڈیکس نے نسبتاً پہلی دس سائیٹس میں اپنی مقبولیت برقرار رکھی۔ 2010 کی دہائی کو ٹیلی ویژن کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ کثیر الجہات ٹی وی شوز کی کوالٹی اور اور ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز پیشرفت اور سٹریمنگ، کیبل ٹی وی اور آن لائن آؤٹ لیٹس پروگراموں کی مقدار اور کوالٹی کا باعث بنی۔ کیبل کے صارفین میں بہت کمی آ گئی اور ناظرین نے کم نرخوں پر آن لائن سٹریمنگ کو ترجیح دی جیسے نیٹ فلکس، امیزون پرائم، اور HULU وغیرہ۔ ٹیلیویژن اور سٹریمنگ سروسز سے متنوع شوز کو بہت پذیرائی ملی۔ ٹی وی چینلز کے ریئلٹی شوز بھی بہت مقبول ہوئے، پھر یوٹیوب ویڈیو سٹریمنگ سارے منظر نامے پر چھا گئی، اس نے نئے رجحانات کو متعارف کرایا۔ وی لاگنگ اور یوٹیوب چینلز متعارف کرائیں اور یہ بہت جلد دنیا بھر میں موسیقی، فلموں اور ویڈیو پوڈ کاسٹس اور مکالموں اور ہر قسم اور معیار کی ویڈیوز اور دستاویزی فلموں کا مرکز بن گیا۔

2020 کی دہائی کا آغاز کووڈ کی وبا سے ہوا اور وائرس کی پہلی رپورٹ جو 31 دسمبر 2019 میں شائع ہوئی وہ ایک ماہ پرانے کیسز کے بارے میں تھی۔ اس وبا نے عالمی معاشی کساد بازاری 70 کی دہائی کے بعد پہلی دفعہ عالمی سطح پر افراط زر میں مسلسل اضافہ اور عالمی سپلائی چین کے بحران جیسے عوامل کو جنم دیا۔ 5 جی تیزی سے پھیلا۔ تین ڈی پرنٹنگ کی سہولت 8k اور 4k یعنی الٹرا ہائی ڈیفینیشن ریزولیشن الیکٹرانکس کا ناگزیر حصہ بن گیا۔ جب کہ ایڈوبی فلیش پلیئر 31 دسمبر 2020 کو بند ہوگیا، 15 اکتوبر 2021 کو ونڈوز 10 کی جگہ 11 نے لے لی۔ ونڈوز 10 پر انٹرنیٹ ایکسپلورر 15 جون کو بند کر دیا گیا۔ ونڈوز سیون 8.1 اور ونڈوز آر ٹی کی سپورٹ 10 جنوری 2023 کو بند کر دی گئی۔ بی بی سی کی رپورٹ کے مطابق برقیاتی پیوند کاری کے ذریعے ریڑھ کی ہڈی مکمل کٹ جانے کی وجہ سے حرکت نہ کر سکنے والے مریض کا آپریشن کر کے اس کی ریڑھ کی ہڈی درست کر دی گئی۔ بجلی کی گاڑیوں کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ نومبر 2022 میں دنیا کی آبادی آٹھ بلین ہوگئی، آبادی میں اضافے، عمر میں طوالت اور شرح پیدائش میں کووڈ 19 کی وبا سے بہت کمی واقع ہوئی۔ انڈیا نے آبادی میں چائنا کو پیچھے چھوڑ دیا اور اپریل 2023 میں آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک بن گیا۔ 2020 کی دہائی سے پہلے تین سالوں کے دوران سٹریمنگ کمپنیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ یوٹیوب نے شہرت اور مقبولیت کی نئی بلندیوں کو چھو لیا اور آخری چھکا مصنوعی ذہانت نے لگایا کہ جس نے تمام انفارمیشن ٹیکنالوجی کا رخ ہی موڑ دیا۔

میں نے گذشتہ سطور میں گذشتہ تین دہائیوں کے دوران سماجی، سائنسی، طبی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی میں ہونے والی بے مثال ترقی کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ ہم سب محسوس کر سکتے ہیں کہ اس عرصے میں دنیا کیا سے کیا ہوگئی۔ میں گذشتہ ستر سال کا جب جائزہ لے رہا تھا تو میرے سامنے بہت سے موضوعات تھے مثلاً سماجی

تحریکیں، انسانی حقوق، سیاست اور جنگیں، دنیا کے بڑے تنازعات۔ بین الاقوامی جنگیں، خانہ جنگیاں، انقلابات اور بڑے احتجاج، نیوکلیئر افزائش، دہشت گردی کے واقعات، سیاسی رجحانات، بین الاقوامی تعلقات، عمومی مذہبی گروہ بندی، اینٹی اسٹیبلشمنٹ سیاست، جمہوریت اور جابریت، اموات، سازشیں، قاتلانہ حملے، غیر قدرتی اور قدرتی تباہیاں، ہوابازی اور اس کے بڑے واقعات، آگ سے تباہی، فضائی و ماحولیاتی آلودگی، ٹروپیکل سائیکلون، سمندری طوفان۔ زلزلے، سیلاب، لینڈ سلائیڈنگ، والکینو، وبائیں، قحط، معاشیات، سائنس وٹیکنالوجی، سائبر سیکیورٹی اور سائبر کرائم، صحت اور معاشرہ، عالمی ثقافت، انٹرنیٹ، فلم موسیقی، فن اور فنکار، ویڈیوٹیکنالوجی، ادب، سپورٹس، مگر میں نے ایسے ضروری موضوعات پر بات کی جو میری دلچسپی کے مظہر تھے اوران کے سرسری ذکر سے انسانی ترقی کا ایک مجموعی تاثر قائم ہوسکتا تھا۔

میں نے اپنی بات ڈش چینلز سے آنے والے گانوں کی ریکارڈنگ تک کی تھی۔ معلوم نہیں کیوں میرے ذہن میں یہ احساس جاگزیں ہوگیا کہ شاید یہ نیا خزانہ پھر سے فوری طور پر نہ مل سکے۔ میں جب رحیم یار خان میں تھا تو یہ بات عام تھی کہ رحیم یار خان کی نسبت صادق آباد سے اچھی اور سستی درآمدہ الیکٹرک اشیا مل جاتی تھیں، 1992 کے دوران میں نے ایک بچت سے صادق آباد کے ایک الیکٹرونکس سٹور سے سونی کا ایک چھوٹا ڈیک خریدا جس میں ریڈیو میڈیم ویو اور ایف ایم بھی تھا۔ ایک سپیکر پر مشتمل نیشنل کی ٹیپ اور ریڈیو سے سونی ڈیک پر منتقل ہونا ایک اچھا تجربہ تھا۔ انہی دنوں سونی کا واک مین نیا نیا آیا تھا جس پر آڈیو کیسٹ کو بہترین آؤٹ پٹ کے ساتھ سننا بہت خوشگوار لگا۔ 1998 تک ڈش چینلز ہی تفریح کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتی رہیں۔ اسی سال میں نے پیناسانک کا کارڈلیس فون خریدا جس میں یہ سہولت بھی تھی کہ فون اٹینڈ نا ہوسکنے کی صورت میں اپنا ہی ایک ریکارڈ شدہ پیغام آن ہو جاتا جو فون کرنے والے کو سنائی دیتا کہ "میں گھر پر نہیں ہوں۔ ایک لمبی بیپ کے بعد آپ اپنا نام اور پیغام ریکارڈ کرادیں'' بعد میں فون کرنے والوں کے پیغامات سن لیتا تھا۔ پاکستان کے محکمہ ٹیلیفون اور ٹیلی گراف کو ایک ایکٹ کے تحت 1991 میں پی ٹی سی ایل بنادیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان میں لینڈ لائن اور وائرلیس فون کے لیے دو کمپنیوں کو لائسنس دیے گئے جن کے نام انسٹا فون اور پاک ٹیل تھے۔ ان کمپنیوں نے بڑے شہروں میں اہم مقامات پر ٹیلیفون بوتھ قائم کیے جن کے ذریعے فون کرنے کے لیے مختلف مالیت کے کارڈ فراہم کیے گئے،، کارڈ کی رقم ختم ہونے کے بعد نیا کارڈ خریدنا پڑتا تھا۔ ان کمپنیوں نے موبائل کی آمد تک پاکستان میں کام کیا۔ جون 1994 کو موبی لنک کو 2 جی کے ساتھ گلوبل سسٹم آف موبائیل کمیونیکیشن (GSM) کا لائسنس ملا۔ پہلے کچھ سال اسے ابتدائی انفراسٹرکچر کے قیام میں لگ گئے اور بڑے شہروں میں موبائیل سروس کا آغاز کیا۔ بہاول پور میں یہ سروس 99-1998 میں آئی۔ اس وقت موبائل نمبر فوراً دستیاب نہیں ہوتا تھا اور موبائل کا دائرہ کار بھی محدود تھا۔ اس کی رینج صرف بہاول پور شہر تھا۔ صرف ایک ہی ٹاور تھا جو مغرب میں کراچی موڑ سے مشرق میں یونیورسٹی نیو کیمپس، شمال میں دریا کی پل

اور جنوب کی طرف یزمان روڈ پر چک 13 سولنگ تک کام کرتا تھا۔ جو موبائل فون اور نمبر کا کاروبار کرتے تھے وہ اپنی دکانوں میں ابتدائی قسم کے سیٹ رکھتے تھے اور ہر پندرہ روز یا ایک ماہ کے بعد ان کو پانچ نمبر کوٹے میں ملتے تھے جو وہ اپنے جاننے والوں کو دے کر احسان جتاتے تھے۔ پہلے ایک فارم مع تصویر مکمل کیا جاتا۔ سیکیورٹی فیس اور نمبر کا معاوضہ لیا جاتا اور طویل انتظار کے بعد نمبر ملتا۔ اس وقت ہر شہر کا پوسٹ پیڈ اور پری پیڈ نمبروں کے کمپنی کوڈ کے بعد پہلے تین نمبر یکساں ہوتے تھے جیسے بہاول پور میں پری پیڈ کے لیے 968 اور پوسٹ پیڈ کے لیے 868 کے ہندسے مقرر تھے، پرانے نمبر اسی طریقِ کار کی یادگار ہیں۔ اس وقت فون کرنے والے اور سننے والے دونوں کو کال کے پیسے پڑتے تھے۔ بنیادی یونٹ ایک منٹ کا تھا۔ بات ایک سیکنڈ کی ہو تو ایک منٹ شمار ہوتا اور اگر ایک منٹ ایک سیکنڈ ہو جاتا تو دو منٹ شمار ہوتے۔ میرے حصے کا نمبر مجھے 2000 کے آخر میں 968 ملا جو پری پیڈ تھا، بعد میں 868 والا ملا جو پوسٹ پیڈ کی نشانی تھا۔ میں ان دنوں روزانہ گورنمنٹ کالج حاصلپور جاتا تھا اور میرا بیٹا مجھے بس سٹینڈ تک چھوڑنے جاتا، واپس گھر پہنچ کر وہ مجھے پی ٹی سی ایل سے فون کرتا کہ وہ خیریت سے گھر پہنچ گیا ہے یوں مجھے اطمینان ہو جاتا مگر یہ فون یونیورسٹی کی حدود سے نکلنے سے پہلے کرنا ہوتا۔ میرا پہلا سیٹ نوکیا کا 3310 تھا جو اس وقت تک کا مقبول ترین ماڈل تھا۔ اب موبائل کو یہاں چھوڑتے ہوئے کمپیوٹر کی طرف آتے ہیں۔

جب پاکستان کے اردو روزنامہ جنگ نے لاہور سے اپنی اشاعت کا آغاز کیا تو انہوں نے نستعلیق رسم الخط میں ایک اردو سافٹ ویئر تیار کروایا جس کا ایک چوری کا ورژن بازار سے مل جاتا تھا۔ کئی اخبارات نے اس ورژن کو اپنایا۔ رحیم یار خان میں روزنامہ شہادت کے مالک ضیاءاللہ بھی یہ پروگرام لے کر آئے۔ اس وقت کمپیوٹرز میں ڈاس سسٹم ہی چل رہا تھا۔ مانیٹر کی سکرین پر ٹائپ کرتے وقت نسخ رسم الخط نظر آتا لیکن جب پیپر پر پرنٹ کیا جاتا تو وہ نستعلیق ہوتا۔ جو الفاظ پروگروم میں نہیں تھے انہیں وہ نسخ میں جوڑ دیتا۔ اس پروگرام کے اندر الفاظ کو بڑا چھوٹا کرنے کی سہولت نہیں تھی۔ سرخیوں اور پٹیوں کو علیحدہ پرنٹ کر کے متن کے ساتھ جوڑا جاتا۔ میں نے کالج گزٹ کے چار اور کالج میگزین کے دو شمارے وہیں سے کمپوز کرائے تھے۔ بعد میں یہ پروگرام مزید بہتر کیا گیا تو ایک ہی جگہ پر الفاظ کو چھوٹا بڑا کرنے کی سہولت میسر آئی۔ 1999 کے دوران حکومت پنجاب کے محکمہ تعلیم نے کالجوں میں انٹر کی سطح پر کمپیوٹر سائنس کا مضمون متعارف کرایا اور اس ضمن میں پالیسی کا اعلان کیا۔ اس وقت میں گورنمنٹ کالج بہاول پور میں وائس پرنسپل تھا۔ میں نے پرنسپل کو اس پالیسی کے تحت پبلک پرائیویٹ پارٹنر شپ کے تحت انٹر کی سطح پر کمپیوٹر کے مضمون کو متعارف کرانے کی تجویز پیش کی۔ اسی سال اس منصوبے پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ پرنسپل نے ایک ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر مع مانیٹر اور ڈاٹ پرنٹر اپنے آفس میں رکھوا دیا جس پر میں ہاتھ چلانے لگ گیا۔ ابھی تک مجھے کٹ اینڈ پیسٹ کا پتا نہیں تھا۔ میں کبھی کبھار کوئی سرکاری لیٹر یا سٹاف لسٹ اس پر ٹائپ کر کے ڈاٹ پرنٹر سے اس کا پرنٹ لے لیتا تھا۔ ایک دن ایک لیٹر

میں ایک پیراگراف کی سطور کی ترتیب مجھے پریشان کر رہی تھی تو میں نے رہنمائی کے لیے متعلقہ استاد کو بلایا۔ اس نے کنٹرول جے سے عبارت کو جسٹیفائی کر کے پیراگراف کو برابر کر دیا۔ اسی دن میں ایک دوست انصاری صاحب کے پرائیویٹ ریز کالج گیا اور میں نے ان سے کمپیوٹر کے چند بنیادی امور سکھانے کی درخواست کی۔ انہوں نے میری رہنمائی کے لیے بس یہی کہا کہ کمپیوٹر کی مبادیات سیکھنے کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے، کمپیوٹر کے متعلقہ پروگرام میں ہیلپ کا لنک اس کے جاننے کے لیے کافی ہے، کمپیوٹر آپ کو خود سکھائے گا۔ 2000 کے دوران میں نے گورنمنٹ کالج حاصلپور کے لیے کمپیوٹر خریدنے کا فیصلہ کیا تو رولز کے مطابق اس کے لیے کم از کم تین کوٹیشنز لینا ضروری تھا۔ اس وقت پاک کمپیوٹرز یونیورسٹی چوک بہاول پور کے علاوہ دو اور ایسی دکانوں کا علم تھا جہاں سے میں نے کمپیوٹر کی کوٹیشنز لیں۔ ان کے موازنے سے پاک کمپیوٹرز کی کوٹیشن کے نرخ کم از کم تھے تب میری ملاقات سید اسرار حسین شاہ سے ہوئی۔ اس ملاقات میں مجھے کمپیوٹر کے فنی حصوں سے متعارف کرایا جن کا کوٹیشن میں ذکر تھا۔ نیا کمپیوٹر خریدنے کے لیے اس کے مختلف حصوں سے واقفیت ضروری تھی مثلاً سنٹرل پراسیسنگ یونٹ (CPU)، ڈیسک ٹاپ ہوگا یا ٹاور، اس میں مدر بورڈ کون سا لگے گا، پراسیسر کون سا ہوگا، RAM کتنی ہوگی۔ مانیٹر، کی بورڈ، ماؤس، ویڈیو اور آڈیو کارڈ، موڈیم، آپٹیکل ڈرائیو، سپیکرز، اس وقت ان پرزوں کو دکان پر ہی جوڑا جاتا تھا۔ یو پی ایس اور بیٹری وغیرہ بھی کمپیوٹر کا حصہ تھے۔ انہوں نے ونڈوز اور آفس و دیگر اہم سوفٹ ویئر بھی انسٹال کر کے دیئے۔ آفس کے ڈرائیور فلاپیوں میں آتے تھے۔ شاہ صاحب نے پرنسپل آفس میں خود آ کر اس کمپیوٹر کو سیٹ کیا اور بنیادی ہدایات فراہم کیں۔ مجھے ابھی کوئی نیا پروگرام انسٹال کرنا نہیں آتا تھا۔ میرے علاوہ اسلامیات کے استاد پروفیسر عبدالحمید مفتی کمپیوٹر آنے پر بہت خوش تھے لہٰذا وہ اپنے شہر خیر پور ٹامیوالی سے کمپیوٹر کے ماہر کو بلا کر نئے آنے والے پروگرامز کو انسٹال کراتے حتیٰ کہ چھ ماہ بعد کمپیوٹر میں ٹیلیفون کی وائر سے انٹرنیٹ کی سہولت بھی مل گئی جو انتہائی نیا اور حیران کن تجربہ تھا۔ کالج کی ٹیلیفون لائن کا اس کی ڈی پی سے تقریباً اڑھائی کلومیٹر کا فاصلہ تھا تب بھی کبھی نہ کبھی کوئی سرچ انجن کھل جاتا تھا خاص طور پر یاہو اور کسی موضوع کو لکھتے تو بیش بہا معلومات ملتیں مگر انٹرنیٹ کی سپیڈ KBs میں تھی۔ بڑے صبر سے کام لینا پڑتا تھا مگر ایک مسئلہ تھا کہ جس دوران انٹرنیٹ لگا ہوتا تو فون مصروف ہو جاتا اس لیے انٹرنیٹ کو دفتری اوقات کے بعد کھولا جاتا۔

پرنسپل آفس کے لیے پینٹیم 2 پراسیسر والا کمپیوٹر خریدا گیا جس کی انٹرنل ہارڈ سک سیریل ATA ہارڈ ڈسک تھی جس میں 40 جی بی ڈیٹا کی صلاحیت تھی۔ پھر میں نے اپنا ذاتی کمپیوٹر پینٹیم 3 خریدا جس میں اسی قسم کی 80 جی بی کی ہارڈ ڈسک تھی۔ پھر ہارڈ دسک کی اور قسم آ گئی جسے ساٹا کہا جاتا تھا اور اس کی ڈیٹا صلاحیت 160 جی بی تھی۔ پھر پینٹیم 4 آیا جس کی کارکردگی بہت اچھی تھی اسی طرح RAM کی صلاحیت بھی بڑھتی گئی۔

ڈیٹا کی ایکسٹرنل سٹوریج کا واحد ذریعہ فلاپی ڈسک تھا جو کبھی کھلتی تھی اور کبھی نہیں۔اس کے اندر فولڈر بنا کر رکھنا کبھی کبھار کام کر جاتا تھا۔ایک سال کے دوران بہت سا دفتری کام مائکروسوفٹ آفس پر کیا جا چکا تھا کہ آفس کے تمام فائلیں چکور خانوں میں بدل گئیں۔ادھر ادھر سے پوچھا تو معلوم ہوا کی اسے وائرس کھا گیا ہے یا وائرس پڑ گیا ہے۔بہت دکھ ہوا مگر یہ خواہش بھی جاگی کہ کوئی موثر قسم کی ایکسٹرنل سٹوریج ہونی چاہیے۔نیشنل بینک کے ایک دوست عبدالجبار نے بتایا کہ 300 ایم بی کی ایکسٹرنل سٹوریج ڈیوائس آتی ہے وہ لے لیں مگر اس کی قیمت ہزاروں میں تھی۔ایک دن میں پاک کمپیوٹر پر گیا تو شاہ صاحب نے بتایا کہ سونی کی 124 ایم بی کی ایک ایکسٹرنل یو ایس بی ڈیوائس کے نمونے آئے ہیں،ایک آپ رکھ لیں،وہ ایک ناقابل فراموش تحفہ تھا جس کا میں منتظر تھا۔آفس کی فائلیں کے بی میں ہوتی تھیں،میں نے اس میں آفس کی تمام فائلوں کا بیک اپ بنالیا،یہیں سے اینٹی وائرس کا تصور کمپیوٹر کی دنیا میں درآیا۔2000 کی صدی کے آغاز کے حوالے سے یہ افواہ اڑی کہ دنیا کے تمام کمپیوٹر بیکار ہو جائیں گے مگر کچھ بھی نہ ہوا۔موسیقی اور فلموں کے لیے ابھی آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں کا راج تھا۔

2001 کے دوران ایک ایسی چیز پاکستان پہنچی جو وینائل کیسٹس کے دور کے اختتام کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور وہ تھی سی ڈی۔اب نئے سوفٹ ویئر کے ساتھ اس کے ڈرائیور اور مینوئیل کے لیے سی ڈی ساتھ آتی۔پھر سی ڈی برنر یا رائیٹر ڈیوائسز آ گئیں۔ایک سی ڈی پر 700 ایم بی تک کا ڈیٹا محفوظ کیا جا سکتا تھا بل کہ اب سی ڈی پر آڈیو گانے ریکارڈ کرنے کی سہولت بھی میسر تھی۔بڑے بڑے برانڈز نے ایسے ڈیک مارکیٹ کیے جن میں وینائل آڈیو کیسٹ کے ساتھ ساتھ تین سے پانچ سی ڈیز بھی پلے کی جا سکتی تھیں۔پہلے آڈیو فارمیٹ کے تحت ایک سی ڈی میں دس سے پندرہ گانے سننے کو مل جاتے جن کی آؤٹ پٹ شاندار ہوتی۔اس کے بعد ایم پی 3 فارمیٹ آیا جس میں فائل کا سائز چھوٹا تھا اور ایک سی ڈی میں دو سو سے زائد گانے آ جاتے اور ان کی کوالٹی بھی برقرار رہتی۔پورٹیبل آڈیو سی ڈی پلیئرز نے واک مین کو چلتا کیا۔گاڑیوں میں ٹیپ ریکارڈ کی جگہ سی ڈی پلیئر نے لے لی۔اس کے بعد ایم پی 4 فارمیٹ کی سی ڈی نے تو کمال ہی کر دیا،اس سی ڈی میں ڈیٹا،ٹیکسٹ،آڈیو اور ویڈیو فائلز بہترین کوالٹی کے ساتھ ریکارڈ ہو جاتیں۔آڈیو،ویڈیو سی ڈی کی دکانوں کی بھر مار ہو گئی۔تیس سے پچاس روپے میں آڈیو اور ویڈیو گانوں،فلموں اور نئے اور جدید ترین سافٹ ویئر کی سی ڈیز مل جاتیں۔آڈیو ویڈیو کیسٹس ایک سال کے اندر ہی غائب ہو گئیں۔اب میں سیکڑوں آڈیو اور ویڈیو کیسٹس کا کیا کرتا۔میں نے ایک کنورٹر کے ذریعے چند آڈیو کیسٹس کو سی ڈی پر منتقل کیا مگر یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔اب نشانی یا آرکائیو کے طور پر 100 کے قریب آڈیو اور ویڈیو کیسٹس ہی محفوظ ہو سکیں۔سی ڈی کی انتہائی ترقی یافتہ

شکل ڈیجیٹل ویڈیو ڈسک (DVD) اور اس کے پلیئر اور رائیٹر نے کوالٹی کے اعتبار سے ایک نیا معیار قائم کیا، ایم پی 3 اور 4 اس میں یکجا ہو گئے یعنی ڈیجیٹل آڈیو، ویڈیو، کسی بھی قسم کے سافٹ ویئر اور کمپیوٹر فائلز اس میں آ سکتے تھے۔ ایک معیاری ایک تہہ (Layer) اور یک طرفہ ڈی وی ڈی میں 7۔4 جی بی اور دو تہہ والی ڈی وی ڈی میں 6۔8 جی بی ڈیٹا کی گنجائش تھی۔ پھر ایچ ڈی کوالٹی کی ڈی وی ڈی آئی جس میں ایک تہہ والی میں 15 جی بی اور ڈبل تہہ والی میں 30 جی بی ڈیٹا سمونے کی اہلیت تھی۔

اب ذرا موبائیل کی طرف آ جائیں۔ موبائل آہستہ آہستہ اپنی جگہ بنانے لگا۔ ضلعی ہیڈ کوارٹرز کے شہروں میں اس کا رجحان رفتار پکڑ چکا تھا۔ میں اپریل 2003 میں بذریعہ ریل کراچی جا رہا تھا۔ ٹرین لیاقت پور سے گزری تو میرے موبائل سے میسج کی بیپ سنائی دی جس سے پتا چلا کہ چھوٹے شہروں میں بھی ٹاورز لگنے شروع ہو گئے ہیں۔ رحیم یار خان ریلوے سٹیشن سے میں نے ایک دوست کے پی ٹی سی ایل نمبر پر اپنے موبائل پر بات کی تو اچھا لگا۔ یوں موبائل کی سہولت آہستہ آہستہ تمام شہروں اور دیہاتوں تک پھیلتی چلی گئی۔ 2004 میں ٹیلی نار آ گیا۔ 2006 میں پی ٹی سی ایل کی نجکاری ہو گئی اور اتصالات انٹرنیشنل نے اس کے 26 فیصد حصص خرید کر اس کے انتظامی امور سنبھال لیے جب کہ 62 فیصد حصص حکومت کے رہے اور 12 فیصد عوام کو بیچ دیے۔ اس نے مقابلے کی فضا میں یوفون کی سروس شروع کر دی۔ 2008 میں پاک ٹیل نے زونگ کے نام سے موبائل فون سروس شروع کی اور 2014 میں 4 جی متعارف کرا دیا۔ ان چار موبائل کمپنیوں نے سارے پاکستان میں نت نئے پیکجز کے ساتھ موبائل کو پاکستان کے تمام شہروں اور دیہاتوں تک پھیلا دیا۔

ابتدا میں نوکیا کے کی پیڈ والے موبائیل کے مختلف ماڈل بہت مقبول ہوئے، 2000 کے بعد بلیک بیری متعارف ہوا۔ نوکیا کے چھوٹے سائز کے کی پیڈ کے ایک بٹن میں تین ہندسے یا حرف موجود تھے اور اس کے ماڈل ابتدا میں چار سے پانچ ہزار میں دستیاب تھے، بلیک بیری نے اپنے ماڈل میں مکمل کی پیڈ دیا اور اس میں ای میل کی سہولت بھی تھی۔ اس وقت یہ چالیس ہزار سے زائد قیمت میں آتا تھا اور یہ ایلیٹ یا بزنس کلاس کے موبائل کے طور پر معروف ہو گیا۔ بعد میں نوکیا نے بھی اپنا ایک مکمل کی بورڈ والا ماڈل متعارف کرا دیا۔ مختلف کمپنیوں کے درمیان موبائل ماڈلز کا مقابلہ چلتا رہا اور ملک بھر میں موبائل نیٹ ورک بھی پھیلتا رہا۔ موبائل کا اگلا دور سمارٹ فون کا تھا جس کا آئندہ ذکر کریں گے۔

پہلی ایکسٹرنل ڈیٹا سٹوریج کے لیے پہلی یو ایس بی 124 ایم بی کی تھی جو 256 ایم بی سے بڑھتی رہی اور بہت آگے جا کر 120 جی بی تک پہنچ گئی، اس کے متوازی مائیکرو کارڈ بھی دریافت ہو گیا جو 1 جی بی سے شروع ہوا اور 60 جی بی سے بھی بڑھ گیا۔ کارڈ ریڈر کے ذریعے کھلنے والے اس کارڈ نے بہت ترقی کی اور

اب یہ کارڈ تمام ڈیجیٹل ایچ ڈی اورالٹرا ایچ جی کیمروں میں استعمال ہو رہا ہے۔ میں نے پہلا ڈیجیٹل کیمرہ سونی کا 10.1 میگا پکسل ماڈل خریدا جس کے اندر اپنی سٹوریج تھی۔ 2006 کے دوران سونی کا ویڈیو کیمرہ خریدا جس میں ریکارڈنگ کے لیے منی ڈی وی ڈی استعمال ہوتی تھی، اس کے بعد جو ماڈل آئے سب میں ریکارڈنگ کے لیے مائیکر کارڈ استعمال ہونے لگے۔ اب UHD کو پروفیشنل قسم کے ویڈیو کیمروں کے لیے Proextreme کارڈ استعمال ہو رہے ہیں۔ اسی طرح جب پہلا کمپیوٹر خریدا تو انٹرنل ہارڈ ڈسک 40 جی بی کی تھی پھر یہ ٹیکنالوجی ترقی کرتی گئی اور بڑھتے بڑھتے یہ ایک ٹیرابائیٹ سے زیادہ کی ہوگئی ہے، ہارڈ ڈسک کے اندر ایک گھومنے والی تہہ دار ڈسک ہوتی ہے جس پر پلاٹینیم اور کاربن کی کوٹنگ کی جاتی ہے اور ایک سنگل یا ڈبل ہیڈ کام کرتا ہے۔ پہلے اس ڈسک کے گھومنے کی رفتار 5400 چکر فی منٹ تھی جو بڑھ کر 7400 فی منٹ ہوگئی۔ اسی ٹیکنالوجی میں ایکسٹرنل ہارڈ ڈسک بھی آ گئی جس میں ڈیٹا بطور بیک اپ سٹور کیا جا سکتا ہے۔ 500 جی بی سے شروع ہو کر ایک ٹیرابائیٹ سے ہوتی ہوئی چار ٹیرابائیٹ تک تو بازار میں عام دستیاب ہے تاہم اس کی سٹوریج کی صلاحیت 24 ٹیرابائیٹ سے بھی بڑھ چکی ہے جنہیں بڑی بڑی آئی ٹی کمپنیاں ڈاٹا سٹوریج کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اس میں چوں کہ میڈیا کام کرتا ہے لہٰذا اسے گرنے یا ٹھوکر لگانے سے سے ہر صورت بچانا پڑتا ہے۔ پہلے یہ یو ایس بی 2 میں آتی تھی، اب اس کی ڈیٹا منتقلی کی رفتار میں اضافہ کر کے یو ایس بی تھری تک پہنچا دیا گیا ہے۔ ذرا یاد کیجیے کہ 2000 میں ڈیٹا بیک اپ کے لیے 300 ایم بی کی سٹوریج ڈسک تھی جو اس وقت بہت مہنگی بھی تھی اور پہلی فلیش میموری یو ایس بی 128 ایم بی کی آئی تھی۔ اس ٹیکنالوجی میں کوئی میڈیا نہیں تھا بل کہ ایک سرکٹ پر مشتمل تھی۔ یہی ٹیکنالوجی ترقی کر کے سالڈ سٹیٹ ہارڈ ڈسک میں تبدیل ہوگئی۔ پہلے پہلے اس کی تیس جی بی کی میموری کو لیپ ٹاپ میں ونڈوز انسٹال کرنے کے لیے استعمال کیا گیا جس سے ونڈوز کھلنے اور بند ہونے میں پانچ سے دس سیکنڈ صرف ہوتے تھے۔ اب اسے مزید ترقی دے کر انٹرنل اور ایکسٹرنل ڈیوائس میں تبدیل کر دیا گیا ہے، اب یہ ایک ٹیرابائیٹ سے بھی زیادہ کی صلاحیت میں آتی ہے اور ونڈوز کے کھلنے، بند ہونے اور ڈیٹا منتقلی میں جادوئی اثر رکھتی ہے۔

اس موقع پر انٹرنیٹ کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔ جیسے جیسے انٹرنیٹ کی کوالٹی اور رفتار میں فرق پڑتا گیا اور اس نے وائرلیس کی صورت بھی اختیار کر لی تو ہر چیز اس کے گرد گھومنے لگی اور گویا انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ہر جہت کی ترقی کو پر لگ گئے۔ مجھے یاد ہے جب بہاول پور میں پی ٹی سی ایل نے نیٹ دیا تھا جسے ڈائل اپ نیٹ کہا گیا کیوں کہ اس میں ٹیلیفون نمبر درکار تھا تو میں نے ایک نیا ٹیلیفون کنکشن لگوا لیا تاکہ گھر کا پہلا فون مصروف نہ ہو۔ شاید اب کوئی یقین نہیں کرے گا کہ اس ڈائل اپ انٹرنیٹ کی رفتار 128 کلو بائیٹ فی سیکنڈ (KBPS) تھی اور اس کی رجسٹریشن فیس ایک ہزار روپے تھی اور اس کا پاس ورڈ ملتان سے ملتا تھا۔ اس کے بعد

وہ رفتار 256 کے بی پی ایس کر دی گئی۔ انہی دنوں میرا مکان تعمیر ہو رہا تھا تو میں نے ہر کمرے میں LAN کنکشن لگوایا جسے بعد میں وائی فائی نے بیکار کر دیا۔ سب سے پہلے سوشل چیٹنگ پلیٹ فارم یاہو میسنجر، ایم ایس این میسنجر اور ایم آئی آر سی تھے جس کے بعد آرکٹ آیا۔ انٹرنیٹ کی ڈائل اپ رفتار ایک ایم بی کی ہو گئی۔ ڈائل اپ کے خاتمے کے بعد انٹرنیٹ موڈیم آ گیا جس کے اندر ٹیلیفون کی تار لگتی تھی اور رفتار چار ایم بی ہو گئی اور موڈیم میں وائی فائی کی سہولت بھی آ گئی جو ایک بہت بڑی تبدیلی تھی۔ اسی دوران پاکستان میں ڈیسک ٹاپ کی جگہ لیپ ٹاپ آ چکا تھا جس میں وائی فائی کی سہولت بھی موجود تھی ڈاؤن لوڈنگ بھی ہونے لگی تھی۔ پھر فیس بک جیسا سوشل فورم آیا، مختلف قسم کی ویب سائیٹس آنے لگ گئیں تو انٹرنیٹ کے ذریعے نیا مواد (content) اتنی کثرت سے آنے لگا کہ " کیا دیکھیں، کیا سنیں اور کیا ڈاؤن لوڈ کریں" کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ لیپ ٹاپ میں مائیکرو پروسیسر کی ٹیکنالوجی کی پیش رفت نے اس کی کارکردگی میں اضافہ کیا۔ پراسیسر ڈبل کور اور کواڈ کور سے ہوتا ہوا آئی 3 5 اور 7 کی کیٹی گری میں آ گیا اور ریم میں بھی بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ پروسیسر کی رفتار اور کوالٹی نے لیپ ٹاپ کو عروج پر پہنچا دیا۔ Dell اور hp کے لیپ ٹاپس بہت مقبول ہوئے اور رسائی میں بھی تھے۔ جب اینڈرائیڈ ٹیکنالوجی آئی تو ٹیبلٹ کا استعمال ہونے لگا۔ ٹیبلٹ بنانے کی دوڑ میں بہت سی کمپنیاں شامل ہو گئیں۔ سم اور سم کے بغیر چلنے والی ٹیبلیٹس نے وائی فائی انٹرنیٹ کی بدولت ایک منی کمپیوٹر اور موبائل فون کا کام بھی کیا۔ میں نے پہلے سام سنگ کی ٹیبلٹ اور بعد میں آئی پیڈ کا استعمال کیا اور میرا بنیادی مقصد ان کے ذریعے پی ڈی ایف کتب کا مطالعہ تھا۔ ایپل اپنے لیپ ٹاپ میں IOS کے ذریعے میدان میں کود پڑا مگر اس کی قیمت عام آدمی کی رسائی میں نہ آ سکی۔ بہرحال اب جدید ترین لیپ ٹاپ کے پروسیسر کی ٹیکنالوجی کی تیرہویں جنریشن چل رہی ہے جس میں 16 جی بی کی ریم اور پانچ سو یا ایک ہزار جی بی سے زیادہ صلاحیت کی ایس ایس ڈی ہارڈ ڈیسک آ رہی ہے جس سے پانچ سیکنڈ میں لیپ ٹاپ آن یا آف ہو جاتا ہے بلکہ جدید ترین لیپ ٹاپ تو ہارڈ ویئر اور اینڈرائڈ کا امتزاج بھی ہیں جنہیں 360 ڈگری پر ٹچ پیڈ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

پہلے چھتوں پر ڈشیں ہی ڈشیں نظر آتی تھیں۔ ایک دم ان کا عہد بھی ختم ہو گیا اور کیبل ٹی وی کا آغاز ہو گیا جو تمام شہروں تک پھیل گیا اور ایک گھر میں ایک سے زیادہ ٹی وی چلائے جا سکتے ہیں۔ سیٹلائٹ کے ذریعے ڈش ٹی وی اور پھر ایچ ڈی ڈش ٹی وی کی ٹیکنالوجی آئی جس میں ایک دو فٹ کی ڈش اور رسیور کا استعمال ہوتا تھا۔ ماہانہ یا زائد کے پیکج پر انٹرٹینمنٹ، انفوٹینمنٹ اور کھیلوں کی 500 کے قریب سٹینڈرڈ اور ہائی ڈیفینیشن (HD) چینلز دستیاب تھیں۔ انڈیا میں ڈش ٹی وی کے علاوہ چند دیگر گروپ بھی اس ٹیکنالوجی کا استعمال کر رہے ہیں۔ پاکستان میں بھی اس تکنیک کے تحت دو فٹ کی ڈش اور رسیور کے ساتھ تین چار سو چینلز لانے کا فیصلہ کیا گیا لہٰذا انڈین ڈش ٹی وی پر پابندی کا اعلان کر دیا۔ انڈیا کا ڈش ٹی وی تو پاکستان میں چلتا رہا لیکن

پاکستان کے مجوزہ ڈش ٹی وی کی بیل منڈے نہ چڑھ سکی۔ پی ٹی سی ایل نے اپنے انٹرنیٹ پیکج کے ساتھ سمارٹ ٹی وی کا پیکج شروع کیا جس میں اب 200 قومی اور بین الاقوامی چینل دستیاب ہیں جو کسی پیکج میں فری بھی پیش کیا جاتا ہے۔ روائتی ٹی وی کی جگہ مختلف کمپنیوں نے ایل سی ڈی یا پلاز ماٹی وی مارکیٹ کیے جو 32 انچ سے 85 انچ کے درمیان مختلف سائزوں میں دستیاب ہونے لگے جو مقابلے کی فضا کے باعث اب مناسب قیمتوں پر دستیاب ہیں۔ ان میں مزید ترقی ہوئی اور ایل ای ڈی ٹیکنالوجی متعارف کرائی گئی اور اینڈ رائیڈ سسٹم کے ساتھ یہ ایل ای ڈی پہلے ایچ ڈی پھر یو ایچ ڈی یا 4000 کے اور اب 8000 کے میں بھی دستیاب ہیں مگر عام لوگوں کی دسترس میں نہیں ہیں۔ اینڈ رائڈ ٹی وی پر یوٹیوب مفت دیکھی جا سکتی ہے اس کے علاوہ ایمیزون پرائم اور نیٹ فلکس بھی انٹرنیٹ سٹریمنگ میں دستیاب ہیں جن پر ہر طرح کا ویڈیو مواد موجود ہے۔

128 اور 256 کے بی پی ایس اور پھر 1 ایم بی پر سے انٹرنیٹ کا آغاز کرنے والی پی ٹی سی ایل نے انٹرنیٹ کے انفرا سٹرکچر میں اضافے کا سفر جاری رکھا اور 2015 کے بعد اس کی کوالٹی کو بہتر بنایا۔ اگرچہ بہت سی نجی انٹرنیٹ کمپنیاں بھی انٹرنیٹ کی خدمات مہیا کر رہی ہیں لیکن پی ٹی سی ایل کے پاس دائرہ کار بہت وسیع تھا۔ پہلے پانچ، پھر دس اور اس کے بعد بیس ایم بی کے پیکیج متعارف کرائے۔ 2020 کے دوران اس نے اپنے انفرا سٹرکچر کو نئی اور جدید ترین ٹیکنالوجی پر منتقل کرنا شروع کر دیا جس کے انفرا سٹرکچر کے لیے فائبر آپٹک بچھایا گیا اور اسے فلیش فائبر کیا کا نام دیا گیا۔ جہاں جہاں یہ نیا نظام گیا وہاں پر پرانی کوپر کی تاروں کا پرانا سسٹم ختم ہوتا چلا گیا۔ فائبر آپٹک کی تاروں کی تنصیب کرنے کے بعد 50 سے 100 ایم بی کے پیکجز متعارف کرائے اور لیڈ یا سیسے سے بنی ہوئی آپٹک فائبر میں سگنلز روشنی کی رفتار سے سفر کرتے ہیں اور 128 کے بی پی ایس سے بطور کسٹمر سفر کا آغاز کرنے والے مجھ جیسے شخص کے لیے اتنا تیز رفتار انٹرنیٹ خواب سے کم نہیں ہے۔ انٹرنیٹ کا جب آغاز ہوا تو ایک پیج کافی ٹائم کے بعد کھل پاتا۔ جب بہاول پور میں 4 ایم بی ہوا تو میں بی بی سی اور اس کی طرح کے نشریاتی اداروں کی مختلف موضوعات کی دستاویزی فلمیں (documentaries) اور کلاسیکل قسم کی معروف ترین انگریزی فلمیں ڈاؤن لوڈ کرنے لگا مگر اس پر بہت وقت صرف ہوتا تھا۔ ایک بار فیصل آباد کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا تو وہاں انٹرنیٹ کی سہولت میسر تھی۔ میں ایک نامکمل ڈاکومنٹری کو ڈاؤن کرنے لگا تو اس کی ڈاؤن لوڈنگ رفتار 800 کے بی ایس سے زیادہ تھی جو ایک نیا تجربہ تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ جب کسی فلم یا ڈاکومنٹری کو کچھ بہتر رفتار سے ڈاؤن لوڈ کر سکیں گے اور آخر وہ وقت آ گیا کہ موجودہ فائبر نیٹ سے ناقابل یقین حد تک 8 ایم بی فی سیکنڈ کی رفتار سے ڈاؤن لوڈ کر چکا ہوں۔ بڑی سے بڑی فائل چند منٹوں میں حاصل ہو سکتی ہے، اسے خواب نہ کہیں تو پھر کیا کہیں۔

اور آخر میں دنیا کو دیکھنے کی سب سے چھوٹی اور آسان تر کھڑکی "موبائل فون" کا ذکر مکمل کیا جائے جو ایک بچے سے لے کر بہت بڑی عمر کے انسانوں کا ایسا محبوب ہے کہ سب اس کے چاروں اور گھوم رہے

ہیں۔نوکیا نے 3210 اور 3310 سے نئی متعارف شدہ موبائل ٹیکنہلو جی پر اپنی حکمرانی کا آغاز کیا۔جلد سونی اور سام سنگ کی صورت اس کے رقیب بھی خم ٹھونک کے میدان میں آ گئے مگر نوکیا نے اپنے نئے ماڈلز کے ساتھ ان کا مقابلہ جاری رکھا، جلد ہی بلیک بیری اس میدان میں کود پڑا مگر مکمل کی بورڈ والا یہ موبائل صرف کارپوریٹ سیکٹر کا موبائل کہلایا، اس کی طرح نوکیا نے بھی مکمل کی بورڈ والا ماڈل نکالا اور اپنی حکمرانی برقرار رکھی۔موبائل سروسز فراہم کرنے والی چاروں کمپنیاں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی دوڑ میں اپنے نت نئے پیکجز سے کسٹمرز کو لبھانے میں لگ گئیں۔2010 میں ایک دم ٹیکنہلو جی تبدیل ہوئی اور ایچ ٹی سی نے ٹچ سسٹم والا اینڈرائڈ فون لانچ کر دیا۔سوشل میڈیا بھی رو بہ عروج تھا۔ابھی یوٹیوب اور فیس بک کمپیوٹر تک محدود تھے۔ ایچ ٹی سی کی خراب آفٹر سیلز سروس اسے لے ڈوبی مگر اب نوکیا اور سامسنگ خود کو اینڈرائڈ پر شفٹ کر چکے تھے۔ ایک ایلیٹ کلاس کا موبائل فون جسے دنیا میں 2007 میں لانچ کیا جا چکا تھا، 2014 میں پاکستان آ گیا اور یہ تھا ایپل کا آئی فون۔نوکیا، سام سنگ بہترین مقابلہ کر رہے تھے کہ کیو موبائل نے سستے سمارٹ فون بنہ کر لانچ کر دیے اور سستے ہونے کی وجہ سے مقبول بھی ہوئے جس سے دیگر موبائل ساز کمپنیوں پر اثر بھی پڑا مگر اس کے مائیکرو پروسیسر اچھی کوالٹی اور کارکردگی میں نہ کام ہو کر مارکیٹ سے غائب ہو گئے۔نوکیا مائیکروسوفٹ نے خرید لیا مگر وہ کوئی اچھی مارکیٹ نہ بنہ سکا۔چائنہ کی کمپنی ہواوے نے بہت کم عرصے میں اپنا نام پیدا کر لیا مگر وہ بین الاقوامی سیاست کا شکار ہو گیا۔بڑی کمپنیوں نے اپنے پروڈکشن یونٹس چائنہ میں کھول لیے اور اپنے اپنے حصے کا مارکیٹ شئیر لینا شروع کر دیا مگر اس وقت بھی پاکستان میں مارکیٹ سام سنگ اور آئی فون کے پاس ہے۔ایپل اور سونی نے ایسی gadgets بھی نکال لیں جن کا تعلق ملٹی میڈیا سے تھا۔ان دونوں کمپنیوں نے ایم پی 3 اور ایم پی 4 پلیئر نکالے جو بہترین آؤٹ پٹ کے ساتھ سائیز میں کم از کم تھے۔ایپل نے 2 اور 4 جی بی اور ایک مربع انچ کا ایم پی 3 پلئیر نکالا جس کو ہیڈ فون کے ساتھ سنا جا سکتا تھا اور اس میں 200 گانے سمو سکتے تھے۔اسی طرح سونی نے بھی 8 جی بی تک کے مختلف ایم پی 3 پلئیر متعارف کرائے جن کا وزن شاید 20 گرام سے بھی کم تھا۔اتنے بڑے بڑے ڈیک، آڈیو اور ویڈیو کیسٹس اور وی سی آر اور اچانک اگ آنے والی سی ڈیز کی دکانیں اور سی ڈی پلئیر وغیرہ تو جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔اب یو ایس بی میں سیکڑوں گانے ڈالیں اور مختلف نئے ملٹی میڈیا پر سنتے جائیں۔

اب تک کی انفارمیشن ٹیکنالوجی کی جدید ترین ترقی نے جو تمام تر خصوصیات کا حامل 3X6 انچ کے موبائل فون کی صورت میں ایک "جادوگر" تخلیق کیا ہے اس نے تمام دنیا کو ہماری جیب میں ڈال دیا ہے۔ کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ کی تمام تر صفات اس کے اندر سمو دی گئی ہیں۔تصویر کشی، فلم بندی، صوتی وتصویری پیغامات کی سہولت اور دنیا جہان کا علم اور اس کے حصول اور سات سمندر پار چند ثانیوں میں ملاقات کے بصری اور سمعی طریقے اور ہر انداز میں اپنی ذہنی اور تخلیقی استعداد کے مطابق مختصر اور طویل ترین ویڈیو کلپ

بنانے کی صلاحیتوں کا اظہار اس کے ذریعے ممکن بنا دیا گیا ہے۔ اب یہ ہر علاقے کی تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار پر منحصر ہے کہ وہ اس جادوگر کا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ اس وقت سماجی میڈیا کی دنیا بھر میں 32 ویب سائیٹس ایسی ہیں جن کو اربوں لوگ ماہانہ بنیادوں پر استعمال کرتے ہیں ان میں سے فیس بک، وٹس ایپ، یوٹیوب، انسٹا گرام، ٹک ٹاک، میسینجر، سپاٹی فائی، لنکڈن اور گوگل سرچ کا بہت زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمیں کوئی بھی انفارمیشن چاہیے اسے گوگل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ گوگل میں موجود ہر چیز اور ہر انفارمیشن مصدقہ یا مستند نہیں ہوتی البتہ یہ ہماری رسائی ان ویب سائیٹس تک بھی ضرور کراتا ہے جو کسی تحقیق میں معاون ثابت ہوسکتی ہیں۔ فیس بک سماجی حوالے سے ایک ایسی جگہ ہے جہاں ان دیکھے دوست بنائے جاتے ہیں اور فیس بک کے کمیونٹی معیارات کے مطابق نئی پوسٹ یا پرانی لگا سکتے ہیں، دوسروں کی لگائی ہوئی پوسٹوں کے بارے میں پسند اور تبصرے کی صورت میں اپنے خیالات سے آگاہ کر سکتے ہیں، وٹس ایپ میں انفرادی یا اجتماعی طور پر ڈیٹا شیئرنگ اور آڈیو ویڈیو سلام دعا ہوسکتی ہے۔ انسٹا گرام اور ٹک ٹاک پر نجی سے لے کر اجتماعی موضوعات پر مختصر وڈیو کلپ پوسٹ کر سکتے ہیں۔ یوٹیوب موسیقی، ڈراموں، فلموں، ڈاکومنٹری، دنیا بھر کے ہر مضمون اور موضوع پر مکالموں، لیکچرز، وی لاگز، پوڈ کاسٹس، نیوز چینلز کا ایک ایسا خزانہ ہے جسے میں "حیرت کدہ" کہتا ہوں۔ انٹرنیٹ کے ذریعے مختلف ویب سائیٹس پر ایسی بولڈ اور ہمارے معاشرے کی اقدار کے برعکس ایسا سمعی و بصری مواد ملتا ہے جس نے ایک قطعی نئے کلچر سے متعارف کرایا ہے۔ فیس بک اور یو ٹیوب نے جب سے ویڈیو یا پروگرام دیکھنے اور پسند کرنے کی بنیاد پر مالی منفعت کو وابستہ کیا ہے لگتا ہے ساری قوم ہی اسے آمدنی کا ذریعہ بنانے پر تلی ہوئی ہے۔ اس وجہ سے جو مواد سامنے آ رہا ہے وہ تخلیقی کم اور لغو، ہزلیہ، فحش اور نقصان دہ زیادہ ہے جسے عموماً آزادی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات تو لگتا ہے کہ مادی تحریص اور معروف ہونے کے لیے ساری دنیا نے اپنے بیڈروم کی پرائیویسی کو سرعام نیلام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس سے ہمارے ہاں منتشر اور منقسم اذہان کی نسل تیار ہو رہی ہے۔ کسی گانے پر ایک فضول رقص یا کوئی غیر متوازن یا کسی گنوار مگر خوبصورت لڑکی کے بدن کے مختلف زاویوں کی ویڈیوز گھنٹوں میں معروف اور مالا مال کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی متعین معیار نہیں ہے۔ ایسے ایسے موضوعات پر بات ہو رہی ہے جو ہمارے تہذیبی اور معاشرتی ڈھانچے میں ممنوعہ (untouchable)

رہے ہیں۔ کیا شہر اور کیا گاؤں، ہر فرد ہی اداکاری کے جوہر دکھانے پر تلا ہوا ہے جس میں ابتذال، سوقیانہ اور غیر شائستہ عناصر کی بھرمار ہوتی ہے۔ بچوں کی سوچ اور اذہان پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں اس کے لیے ایک مختصر سی مثال یہ ہے کہ میرے ایک دوست کی پوتی جو پہلی کلاس کی طالبہ ہے اس کے ہوم ورک میں یہ سوال تھا کہ ایسی چیزوں کی تصاویر بنائیں جو آپ خدا سے مانگنا چاہیں گے۔ اس ننھی بچی نے جو لسٹ تیار کی وہ یہ تھی۔ 1- گڑیا 2- میڈل 3- ڈالر 4- مکہ 5- ڈائمنڈ 6- یوٹیوب کے پلے بٹن والی گولڈن ڈسک، 7۔ یوٹیوب

کے پلے بٹن والی سلور ڈسک!!!

اس کا دوسرا پہلو دیکھیں تو انٹرنیٹ ایک ایسی نعمت کے طور پر سامنے آتا ہے جس نے زندگی کو آسودگیوں سے دوچار کیا ہے۔ آپ پوری دنیا میں کسی سے کہیں سے بھی کسی نہ کسی سوفٹ ویئر کے ذریعے ویڈیو ملاقات کر سکتے ہیں۔ آپ اپنے پیغام کو ایک سیکنڈ میں ایک کلک سے کروڑوں لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ آپ بیرونی ممالک کے معروف ڈاکٹروں سے آن لائن طبی مشورہ لے سکتے ہیں یا مقامی سطح پر بیرونی ڈاکٹروں کی ویڈیو پر مشمل مدداور رہنمائی سے اپنے ڈاکٹرز کے ذریعے پیچیدہ سرجری کرا سکتے ہیں۔ آپ دنیا میں کہیں بھی میٹنگ میں شریک ہو سکتے ہیں۔ گھر بیٹھے آن لائن بزنس کر سکتے ہیں اور اسے پھیلا سکتے ہیں۔ ناگزیر حالات میں آپ گھر سے کام کی بنیاد پر دفتر حاضری دے سکتے ہیں، دنیا کی بہترین ہارڈ اور سافٹ کتابیں مفت اور قیمتاً حاصل کر سکتے ہیں، تحقیقی منصوبے کے لیے بڑی بڑی یونیورسٹیوں کے آن لائن جرائد اور کتب تک رسائی ممکن ہوگئی ہے۔ ایسی ایسی کتابیں اور ریفرنس کتب جنہیں خواب میں بھی دیکھنا ممکن نا تھا وہ مفت حاصل کی جا سکتی ہیں، دنیا کی عظیم لائبریریوں کے خزانوں تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ہر اچھی اور تاریخی لائبریری کے بک کیٹلاگ آن لائن دستیاب ہیں۔ اندرونی اور بیرونی یونیورسٹیوں میں داخلے کی تفصیلات اور داخلے کا پراسس جان سکتے ہیں، فیس وغیرہ بھی آن لائن ادا کر سکتے ہیں۔ کاغذ کے بغیر یعنی paperless بینکنگ کا رواج زور پکڑ رہا ہے۔ پوائنٹ آف سیلز پر تمام خریداری ڈیبٹ اور کریڈٹ کارڈ پر کی جا سکتی ہے۔ جیب میں پیپر منی رکھنے کی ضرورت نہیں، چھوٹی سے بڑی اشیا آن لائن خریدیں اور بل کی ادائیگی بذریعہ منی ٹرانسفر یا COD کریں۔ گھر میں بیٹھ کر گورنمنٹ کے واجبات، ٹیکسز، یوٹلٹی بلز بینک کی موبائل ایپ سے ادا کریں۔ سبزی یا گوشت گھر منگوا کر قیمت ٹرانسفر کر دیں تا ہم ان سب سہولتوں اور ترقی کو سائبر کرائمز نے گہنا دیا ہے، احتیاط بہر حال لازم ہے۔

ایک ویڈیو کلپ میں ماضی سے جدید نسلوں کی تقسیم کچھ اس طرح کی گئی ہے۔

''جو لوگ 1960 سے 1980 کے درمیان پیدا ہوئے انہیں'' جنریشن ایکس'' کہا جاتا ہے۔ 1980 سے 1996 تک پیدا ہونے والی نسل کو''جنریشن وائی'' اور اس کے بعد آنے والوں کو '' جنریشن زی'' کہتے ہیں۔ درحقیقت دنیا میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ تبدیلیاں جنریشن ایکس نے ہی دیکھ رکھی ہیں۔ وی سی آر سے لے کر اس کے ختم ہونے اور نیٹ فلکس آنے تک، آڈیو کیسٹ سے لے کر یو ایس بی تک، بلیک اینڈ وائیٹ نشریات سے رنگین اور پھر سمارٹ ٹی وی تک، ڈائل گھما کر ملانے والے پرانے ٹیلی فون سے لے کر جدید ترین سمارٹ فون تک، پتنگ بازی سے لے کر ڈرون جہاز تک، کتابوں اور رسالوں سے لے کر ٹیبلٹ تک کا سفر اپنے سینوں میں عروج، زوال اور تبدیلیوں کی ہزاروں داستانیں چھپائے ہوئے انسانوں کی یہ جنریشن بڑی قیمتی ہے''

اگر اس کو درست مان لیا جائے تو اس سے تیس سال قبل یعنی پچاس کی دہائی سے اب تک کی نسل نے

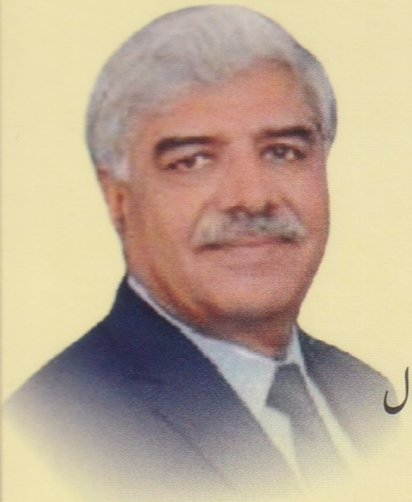
تو اب تک آنے والی تبدیلیوں کے عدم سے وجود کے تمام پراسیس کو ان کے ابتدائی نقوش اور انتہائی ابتدا سے دیکھا ہے تو اسے ''سپر نسل'' کہنا چاہئے جس کا جائزہ مندرجہ بالا تحریر میں لیا گیا ہے۔

تمام دنیا اور کائنات کی کل دانش، علوم مفیدہ و کثیفہ (Good and bad information) دنیا بھر کے ممالک اور معاشروں کی ظاہری اور باطنی جہتوں کے ایک جیب میں آ جانے کی کہانی خصوصاً ستر سال کی حیرت انگیز انسانی ترقی کا جو احوال بیان کیا گیا ہے، میری نسل ان تمام تبدیلیوں کی براہ راست گواہ ہے اور اکثریت ان تبدیلیوں کے تجربے اور مشاہدے کی بھی حامل ہے۔ میری ہم عصر نسل کے ایسے لوگ بھی مل جائیں گے جو نئے منظر نامے سے ہم آہنگ نہیں ہو سکے مگر بزرگ نسل کے وہ لوگ جنہوں نے نئے ادراک اور شعور کو خوش آمدید کہا ہے ان کے اور نئی نسل کے درمیان اجنبیت کی دیوار حائل نہیں ہے۔ بالخصوص گذشتہ تیس سال کی نسل نے جو حیرت انگیز آگہی کا سفر طے کیا ہے اس کے باعث اس نسل کے ساتھ مغائرت ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم نئے منظر نامے سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں مگر یہ ہم آہنگی موبائل ٹریپ یا اس کے نشے (Mobile addiction) کی بنیاد پر نہیں ہونی چاہیے۔ اب سوال یہ ہے کہ آئندہ کا کیا منظر نامہ ہوگا۔

آئندہ بیس سال کے دوران دنیا کا منظر نامہ آج سے کہیں زیادہ مختلف ہوگا۔ پیپر منی مکمل طور پر ختم ہو جائے گی۔ مکمل ڈیجیٹلائزیشن دنیا کو اپنی گرفت میں لے چکی ہوگی۔ مٹیریل سائنسز میں میٹا ٹیکنالوجی تمام نقشہ بدل دے گی۔ فزکس، کیمسٹری اور فارماسیوٹیکل غرضیکہ ہر شعبے میں ترقی اور تبدیلیوں کے ذریعے انسانی عمر کی اوسط میں غیر معمولی اضافے کے ساتھ انسانی عمر اور کائنات کے حوالے سے حیات اور بقا کے بارے میں پیشگوئی کے قریب پہنچ جائیں گے۔ انٹرنیٹ اور موبائیل کا زمینی انفراسٹرکچر کم از کم یا ختم ہو چکا ہوگا اور انہیں خلا میں موجود سیٹلائیٹس سے براہ راست کنٹرول کیا جائے گا۔ نئی ٹیکنالوجی دنیا کے تمام ممالک میں بیک وقت متعارف یا اَن باکس ہوا کرے گی۔ جیسے آج کل کہا جاتا ہے کہ ٹیکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی اور نئی ایجادات نے دنیا کی اس قدر کایا کلپ کر دی ہے اور معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی و علمی سطح پر ماضی کی نسبت ایک قطعی مختلف اور ایسا منظر نامہ مرتب ہوا ہے کہ اگر گذشتہ چالیس سال کا انسان زندہ ہو کر آ جائے تو وہ دنیا کو پہچان نہیں پائے گا تو آج سے صرف دس سال بعد بھی یہی بات ہو رہی ہوگی اور آہستہ آہستہ تبدیلی کی مدت کم ہوتی و جائے گی بل کہ اس سے بھی کم اور ایسا منظر بھی دیکھنے کو مل سکتا ہے کہ جب کہا جائے گا کہ اگر ایک سال پہلے دنیا کو چھوڑ کر جانے والے انسان کو ایک بار دنیا میں واپس بھیج دیا جائے تو وہ دنیا کو قطعاً نہیں پہچان پائے گا اور واپس قبر کی طرف بھاگ جائے گا۔

قصہ سانس لینے لگتا ہے

ریت پہ حرف تھے، وقت نے سب مٹا دیے
صرف وہ لمحے بچے، جو تم نے ہنس کے کہے تھے
ساہیوال کی صبحیں، لاہور کی شامیں
یادیں بن کے اب دل کی سانسوں میں جاگتی ہیں
کہیں کوئی درخت ہے، جو اب بھی مجھے جانتا ہے
رحیم یار خان کی گلی سے گزر کر آیا تھا میں
بہاولپور کی خاموشی، اک کتاب کی جلد سی ہے
ہر صفحہ کھولو، کوئی قصہ سانس لینے لگتا ہے
نہ ریت بولتی ہے، نہ ہوا جواب دیتی ہے
پھر بھی ان میں چھپی ہے اک پوری زندگی
وقت کے لوٹے ہوئے دن، ریت پر جیسے عکس ہوں
دھوپ پڑے تو نظر آئیں، چھاؤں میں کھو جائیں
یادوں کی چادر میں لپٹے کچھ ریتیلے گیت
جنہیں صرف دل سنتا ہے، زبان کبھی نہیں
نہ وہ گلی رہی، نہ وہ موسم، نہ وہ بات
پر اک پرانا سا پل اب بھی دل کے آنگن میں بیٹھا ہے
اک عمر ریت پر چلتے گزری ہے
اب خواب بھی ریت جیسے ہو گئے ہیں
تم نے جو پلٹ کر دیکھا تھا اک دن
تب سے ہر یاد وہیں سے شروع ہوتی ہے۔



پروفیسر نسیم بلوچ

جائے پیدائش: چک نمبر L-9/101 ساہیوال

تعلیمی ادارے:

- گورنمنٹ پرائمری سکول چک نمبر L-9/100 ساہیوال
- گورنمنٹ ہائی سکول ساہیوال 69-1964
- گورنمنٹ کالج ساہیوال 73-1969
- پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور 78-1974

تدریس:

- لیکچرار خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خاں 1979-2-21
- اسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج خان پور 1988-4-28
- وائس پرنسپل گورنمنٹ کالج بہاول پور 1994-9-28
- چیئرمین شعبہ فارسی اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور 97-1996

انتظامی:

- ایسوسی ایٹ پروفیسر 2000
- پرنسپل گورنمنٹ کالج حاصل پور 2004-2000
- ایگزیکٹو ڈسٹرکٹ آفیسر ایجوکیشن بہاول پور 2004
- پروفیسر/ پرنسپل گورنمنٹ کالج یزمان 2005

ملازمت سے ریٹائرمنٹ: 30 اپریل 2013

لاہور منتقلی: 14 نومبر 2014

9 789697 563913

بکس اینڈ ریڈرز

محمد پلازہ، سبزہ زار میٹرو سٹیشن، بوسن روڈ ملتان

Ph. 061-6210154, 0300-9634424

Email. booksnreaders1@gmail.com